سوغات

محمود ایاز

مدیر

محمود ایاز

معاون مدیران

خلیل مامون　　　　عزیز اللہ بیگ

پتہ:

۸۴ - تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر

بنگلور - ۵۶۰۰۳۸

فون: ــــــــ ۵۵۸۱۹۸۶

مارچ ۱۹۹۴ء

قیمت: اسّی رُوپے

بیرونی ممالک سے [امریکہ، انگلینڈ، کناڈا، سعودی، پاکستان]
بذریعہ ہوائی ڈاک دس ڈالر (امریکی) بارہ ڈالر (کنیڈین) سات پاؤنڈ
بذریعہ بحری ڈاک آٹھ ڈالر (امریکی) دس ڈالر (کنیڈین) چھ پاؤنڈ

کتابت:
حافظ لیاقت احمد قاسمی ۔ بنگلور ۶
کمپیوٹر کارپوریشن ۔ حیدرآباد

ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر: محمود ایاز

فہرست

نظمیں

خصوصی مطالعہ

سفرنامہ

مضمون

چچا عبدالباقی کی کہانیاں

مزاحیہ مضامین

تبصرہ

پیروڈی

خطوط

محمّد خالد اختر کے افسانے

افسانے اور تجزیے

بازگشت

نقشِ اوّل

اس شمارے میں پانچ افسانے شامل ہیں۔ تین افسانوں کے، افسانہ نگاروں کے نام مخفی رکھ کر، تجزیے کرائے گئے۔ محسن خان نے انور خان کے افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔ افسانہ اچھا ہے، لیکن تجزیہ غیرمشروط دادوتحسین سے آگے نہیں جاتا۔ اس سے تجزیہ نگار کی طبیعت کی نیکی تو ثابت ہوتی ہے لیکن افسانہ نگار اور افسانہ پڑھنے والوں کا کوئی بھلا نہیں ہوتا۔

جیلانی بانو نے "کھیل کا تماشائی" اپنے جانے پہچانے اسلوب اور انداز سے ہٹ کر لکھا ہے۔ عابد سہیل نے جی لگا کر اس افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے افسانے کے متن سے سروکار رکھا اور اپنے مزعومات یا ترجیحات کو بنیاد بنا کر افسانہ یا افسانہ نگار پر فیصلے نہیں صادر کئے ہیں۔ یہ کام وارث علوی نے کیا ہے۔

سید محمّد اشرف کے بہت اچھے افسانے "قربانی کا بکرا" کا جو تجزیہ وارث علوی کے قلم سے ہوا ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ ہمارے ہاں بہت پڑھے لکھے نقّادوں کی کوئی کمی نہیں لیکن وارث کی طرح ادب سے ایک جمالیاتی آسودگی اور مسرت اخذ کرنے والے نقّاد بہت کم ملیں گے۔ تخلیقی ادب کا مطالعہ وارث کے لئے ایک وجد آور تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں ان کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ نقّاد وارث اپنی زبان اور قلم کو مولوی اور مقرّر وارث کی دستبرد سے بچا نہیں پاتا۔ ان کمزوریوں کے باوجود وارث علوی اردو فکشن کے ایک معتبر نقّاد ہیں۔ لیکن سید محمد اشرف کے افسانے پر ان کے تجزیے نے بہت مایوس کیا۔ افسانہ پسند ناپسند کرنے کا حق اپنی جگہ لیکن اس کی جو وجوہ بتائی گئی ہیں اور فن افسانہ نگاری کے "اوامر و نواہی" کا جو بیان ہوا ہے

وہ بہت غیر ذمہ دارانہ ہے۔ تجزیہ پڑھنے کے بعد میں نے اس کی ایک نقل، وارث علوی کا نام نکال کر، سید محمد اشرف کو بھجوائی کہ اس پر ان کا ردِ عمل بھی معلوم ہو۔ وقت کم تھا اس لئے یہ اصرار بھی کیا کہ تین دن میں اپنا تبصرہ بھجوادیں۔ یہ واقعی زیادتی تھی لیکن مشکل یہ ہے کہ سوغات چھ ماہ میں ایک بار نکلتا ہے۔ جب تک دوسرے شمارے میں کوئی ردِ عمل آئے افسانہ اور تجزیہ دونوں پڑھنے والوں کے ذہن سے فراموش ہوجاتے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ اسی شمارے میں سید محمد اشرف کا تبصرہ بھی آجائے۔ اب افسانہ، افسانے کا تجزیہ اور تجزیے پر تبصرہ تینوں ایک ساتھ آگئے ہیں۔ پڑھنے لکھنے والوں کا اظہارِ خیال آئندہ شمارے میں ہوتا رہے گا۔ سید محمد اشرف ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے تو اپنی جگہ بنا چکا رہے ہیں لیکن ان کا تبصرہ پڑھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ توجہ دیں تو افسانے کے اچھے پارکھ اور نقاد بھی ہو سکتے ہیں۔

آصف فرخی کا افسانہ "بمبئی" تجزیہ طلب ہے لیکن میں نے سوچا کہ ایک آدھ افسانے کا تجزیہ مصنف کا نام مخفی رکھے بغیر بھی ہونا چاہئے۔ صلائے عام ہے ...۔

○

غلام عباس کے افسانوں پر فضیل جعفری کا مضمون ان کی زیرِ تحریر کتاب کا ایک باب ہے۔ غلام عباس ان خوش قسمت لکھنے والوں میں ہیں جنھیں ہر حلقے اور طبقے میں یکساں سراہا اور پسند کیا جاتا ہے۔ لیکن اس عام پسندیدگی کے باوجود اُن پر کوئی مستقل کام نہیں ہوا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ فضیل جعفری نے غلام عباس کو ایک کتاب کا موضوع بنایا ہے۔ اس کتاب کے دیگر ابواب بھی "سوغات" میں شائع ہوتے رہیں گے۔ فضیل جعفری نے "کمان اور زخم" کے بعد اردو تنقید میں بہت جلد اپنی ایک جگہ بنالی تھی لیکن اتنی ہی جلد وہ دوسری مصروفیات میں پھنس کر ادبی منظرنامے سے غائب ہوگئے۔ لیکن ان کے کچھ مضامین کی گونج اب بھی پڑھنے والوں کے ذہن میں موجود ہے۔ سلیم احمد پر ان کے مضمون کا بہت شہرہ رہا اور "بستی" پر اُن کا مضمون جو "اظہار" میں شائع ہوا تھا آج بھی انتظار حسین اور ان کے اس ناول پر لکھے جانے والے مضامین میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

○

حامد عزیز مدنی پر حمید نسیم کے مضمون کا عنوان ــ شاعرِ فردا ــ غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ انھوں نے مدنی کو روشن مستقبل کی بشارت دینے والے شاعر کی حیثیت سے نہیں پیش کیا ہے۔ جدید صنعتی شہر کی زندگی اور معاشرے کا جو تناظر مدنی کی شاعری میں ملتا ہے اور اس تناظر میں انھوں نے اپنے عہد اور اپنی روح کی روداد کے اظہار کے لئے جو شعری محاورہ وضع کیا اور جو پیرائے استعمال کئے وہ انھیں اپنے وقت کے لکھنے والوں سے آگے لے جاتے ہیں۔ اِنہیں معنوں میں حمید نسیم نے مدنی کو شاعرِ فردا کہا ہے۔ یہ مضمون ایک بچھڑے ہوئے یارِ عزیز کی یادوں کا قرضہ ادا کرنے کی کوشش بھی ہے۔ اور اسی لئے جذبات کے وفور نے کہیں کہیں اس جائزے کو "خالص تنقیدی مضمون" نہیں رہنے دیا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے یہ مضمون مدنی کی شاعری کا ایک خاصہ معروضی مطالعہ بھی پیش کرتا ہے۔ ویسے بھی جذبے اور اس کے اظہار سے بہت زیادہ ڈرتے رہنا ادھوری شخصیتوں اور نفسیاتی مریضوں کی مجبوری ہے۔

○

حمید نسیم کو دیکھے ہوئے تینتس ۳۳ برس ہوگئے۔ اسلم فرخی کا خاکہ "رقص کرنے والا بگولہ" پڑھا تو کئی یادیں تازہ ہوگئیں۔ یہ خاکہ کراچی میں حمید نسیم کے اعزاز میں منعقدہ ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا

○

محمد خالد اختر سے میرا پہلا تعارف ان کے سفر نامے "ڈیپلو سے نوں کوٹ تک" سے ہوا تھا۔ چاندنی رات میں صحرا کے سفر کی یہ روداد عجیب سحر زدہ فضاؤں میں لے گئی تھی۔ راستے کے مناظر کی تصویر کشی میں فنکارانہ مہارت، اندازِ بیان شگفتہ اور دلکش، تحریر میں پختگی۔ نام پہلے نہ سُنا تھا اور نہ پڑھا تھا لیکن پوری تحریر میں نوآموزوں کی سی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ سفر نامے کا اختتام جس واقعے پر ہوا اس کا بیان خوب لطف دیتا رہا۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ یہ اختتام والا موڑ محمد خالد اختر کے فن کا بنیادی عنصر ہے اور ان کا قاری اس سے کئی بار دو چار ہونے والا ہے۔

تقسیم کے چند برسوں بعد ایک طویل وقفہ ایسا گزرا کہ پاکستان کے رسائل اور کتابیں یہاں نایاب تھیں، کم از کم میرے شہر میں۔ کبھی کبھار بھول بھٹک کے کوئی رسالہ آجاتا تھا۔ "سویرا" میں

کئی چیزیں پڑھیں "دہقانی یونیورسٹی"، "مقیاس المحبت"، "بدھ کی مورت" وغیرہ۔ آذر ذوبی کے "شعور" میں "چاکیواڑہ میں وصال" کا ایک باب، چچا عبد الباقی کی دو ایک کہانیاں پڑھیں۔ اس کے بعد طویل وقفوں سے ان کی تحریریں ملتی رہیں۔ "چاکی واڑہ میں وصال" کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ فیض نے اسے اردو کا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ ("آگ کا دریا" اس وقت تک شائع ہو چکا تھا!) کوشش کی لیکن یہ ناول حاصل نہ ہو سکا۔ یہ تفصیلات جو غیر اہم ہیں صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں کہ میں محمد خالد اختر کا مدّاح تو بن چکا تھا لیکن ان کا مطالعہ میں نے اس طرح نہیں کیا ہے کہ ان پر اعتماد کے ساتھ لکھ سکوں۔

ایک بات جو اب ان کے اسلوب کا لازمی حصّہ سمجھی جانے لگی ہے، ذرا کھٹکتی تھی۔ جملوں کی ساخت بالکل انگریزی کے جملوں جیسی، نہ صرف جملوں کی ساخت بلکہ طرزِ بیان بھی۔ یہ بات آپ کو غلام عبّاس کے ہاں بھی ملے گی۔ بلکہ بعض معترضین غلام عبّاس پر انگریزی سے سرقے کا جو الزام لگاتے ہیں اس کی ایک سامنے کی وجہ تو یہی ہے۔ غلام عبّاس نے ممکن ہے کوئی افسانہ اس طرح چُرایا نہ ہو جیسے مکھّی پر مکھّی ماری جاتی ہے لیکن اپنے انگریزی کے مطالعے سے انھوں نے جی کھول کر کسبِ فیض کیا ہے۔ عبّاس کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ ان کے بے شمار جملے از خود آپ کے ذہن میں انگریزی میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔ خیر غلام عبّاس کی بات تو ضمناً آگئی لیکن واضح رہے عبّاس کے ہاں یہ صورت حال محمد خالد اختر کی طرح یہ تاثر نہیں دیتی کہ مضمون کا انگریزی سے ترجمہ ہوا ہے اور مترجم اردو کے اسلوبِ اظہار سے آشنا نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ مضامین پڑھے تو یہ مغالطہ باقی نہیں رہا کہ لکھنے والا اردو سے ناآشنا ہے لیکن ترجمے کا یہ انداز ناگوار ہی گزرتا رہا، گو اس کا بھی ایک لطف آنے لگا تھا۔ پھر چچا عبد الباقی کی کہانیاں پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہ اپنی معصومیت، سادہ لوحی، دھوکہ کھانے کی فطری صلاحیت اور ہر بار چوٹ کھانے کے بعد بھی اپنے آرزو مندانہ رجائیت سے باز نہ آنے والے کردار، جو نہ صرف اپنی روایت اور تہذیب سے کٹے ہوئے ہیں بلکہ کسی بھی اقدار کے نظام سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے، ان کی صحیح تصویر کشی اور تہذیبی دوغلے پن کو نمایاں کرنے کے لئے شاید یہ دوغلی زبان ہی مصنف کو مناسب معلوم ہوئی ہو۔ مثلاً بختیار کے باپ کو خود بختیار اور چچا عبد الباقی "بوڑھا آدمی" کہتے ہیں، جو ظاہر ہے OLD MAN کا ترجمہ ہے۔ اردو میں بڑی آسانی سے

بڑے میاں استعمال ہو سکتا تھا۔ انگریزی میں OLD MAN میں تضحیک یا تحقیر کا کوئی پہلو نہیں نکلتا لیکن اردو میں باپ کے لئے "بوڑھا آدمی" کا استعمال باپ بیٹے کے درمیان آج کے بدلے ہوئے رشتوں کا غماز بھی ہو سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میں نے اپنے طور پر محمد خالد اختر کے ترجمہ نما جملوں کا جواز پیدا کرلیا لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ جواز ان تحریروں میں کام نہیں آتا تھا جہاں یہ صورت حال نہیں پائی جاتی۔ فہمیدہ ریاض کہتی ہیں کہ "بعض اوقات ان کے جملوں کی ساخت انگریزی زبان جیسی ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے تو اردوئے معلّٰی میں لکھنے لگتے ہیں۔" لیکن اس "اردوئے معلّٰی" سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد خالد اختر سعی و ارادہ کریں تو ایسی نثر لکھ سکنے پر قادر ہیں لیکن ان کا نہ صرف اسلوب اور پیرایۂ اظہار بنیادی طور پر انگریزی اظہار و بیان سے متاثر و مستعار ہے بلکہ وہ سوچتے بھی انگریزی میں ہیں۔ ان کی تحریر ان کے ذہن میں پہلے انگریزی میں وجود لیتی ہے اور پھر اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ اردو میں کاغذ پر منتقل ہوتا ہے۔ لیکن یہ سارا عمل اتنے فطری اور غیر شعوری طور پر ہوتا ہوا نظر آتا ہے کہ چند ابتدائی دھچکوں کے بعد یہی تحریر جو کہیں کہیں اچھا ترجمہ بھی نہیں معلوم ہوتی، ہمیں اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے اور ہم اس کے مصنّف کو ایک منفرد صاحبِ اسلوب اور باکمال فنکار کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں۔ محمّد خالد اختر یہ جادو کیسے جگاتے ہیں اس کا کچھ اندازہ شاید ان تحریروں سے ہو سکے گا جو زیرِ نظر شمارے میں شامل ہیں۔

○

عزیز احمد کی غزلیں سرّور صاحب نے عنایت کیں۔ زندگی کے آخری ایّام میں لکھی ہوئی اس شاعری میں ایک کیفیت اور اثر تو ضرور ہے لیکن اس میں احساس اور فکر و فن کی وہ سطح نہیں ملتی جو موت کے سائے میں لکھے ہوئے ادب کے اعلیٰ نمونوں میں پائی جاتی ہے۔ ویسے بھی شاعری عزیز احمد کا جز وقتی مشغلہ تھی۔ "ماہ لقا اور دوسری نظمیں" کے عنوان سے جو مجموعۂ کلام ان کی جوانی کے دنوں میں شائع ہوا تھا وہ بھی ان کی شاعری کے بارے میں کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتا۔ غزلوں میں کچھ اچھے اشعار ضرور مل جاتے ہیں۔ نظموں میں "فردوسِ بریں" عزیز احمد کی سب سے اچھی کاوش ہے۔ "ماہ لقا" میں یہ نظم نسبتاً طویل ہے۔ "نیا دور" بنگلور میں عزیز احمد نے اسے کاٹ چھانٹ کر شائع کرایا تھا۔ سوغات میں یہ نظم اسی شکل میں نیا دور بنگلور سے نقل ہوئی

ہے۔ عزیز احمد کے کچھ خطوط بھی شامل ہیں۔ ان سب کی حیثیت "باقیات" کی ہے۔ خطوط کے حصے میں سرور صاحب کے نام رشید احمد صدیقی کا مکتوب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ رشید صاحب کے دیگر خطوط بھی اگر اسی نوعیت کے ہیں تو پھر سرور صاحب کے نام مکاتیب کا یہ مجموعہ ہنگامہ خیز ثابت ہوگا۔

محمود ایاز۔ بنگلور

یکم مارچ ۱۹۹۴ء

کچھ غیر اہم باتیں!

- سوغات کی اعزازی کاپیوں کی تعداد کم کر دی گئی ہے۔ لکھنے والے یقیناً علم و ادب کی خدمت کرتے ہیں لیکن سوغات کی طرح کے رسائل بھی محض تفریح کی خاطر نہیں نکالے جاتے۔ بہر حال اختلافِ خیال کی گنجائش کو تسلیم کرتے ہوئے عرض یہ کرنا ہے کہ از راہِ کرم سوغات خرید کر پڑھئے ــــ اگر آپ اسے پڑھنا چاہتے ہیں!
- خط جواب طلب ہے تو جوابی کارڈ یا لفافہ بھیجئے۔
- مسوّدہ واپس منگوانا ہے تو صرف ٹکٹ مت بھجوائیے (کچھ تو یہ زحمت بھی گوارا نہیں کرتے) مناسب سائز کا لفافہ بھجوائیے جس پر آپ کا پتہ درج ہو اور ٹھیک قیمت کا ٹکٹ لگا ہوا ہو۔

فضیل جعفری

غلام عباس کاافسانوی ادب
ایک تعارف

شاعروں کی طرح افسانہ نگاروں میں بھی ایک عام کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی ہے وہ لپنے آپ کو دوہرانے کے عمل میں گرفتار ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ بسا اوقات موضوعات کے ساتھ ساتھ پیش کش کے انداز میں بھی یکسانیت در آتی ہے ۔ اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں منٹو اور کرشن چندر اس سلسلے میں سامنے کی مثالیں ہیں ۔ کسی نہ کسی حد تک قرۃ العین حیدر پر بھی یہ مفروضہ صادق آتا ہے ۔ لیکن آخر یہی لوگ کیوں ۔ ۔ ؟ موپاساں اور مام جیسے اساتذہ، فن بھی اس کمزوری سے اپنا دامن نہیں بچاسکے ۔ چنانچہ میرے نزدیک یہ کمزوری بڑے اور اہم افسانہ نگاروں کے مجموعی قد وقامت پر چھینٹے اڑانے میں تو کامیاب ہو سکتی ہے لیکن ان کے قد کو گھٹانے کی قدرت نہیں رکھتی ۔ البتہ وہ افسانہ نگار جو اس کمزوری سے اپنا دامن بچا لیجانے کی سکت اور ہمت کے مالک ہوتے ہیں وہ یقیناً زیادہ فائدے میں رہتے ہیں ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسا وہی لوگ کر پاتے ہیں جو اچھا لکھنے کے ساتھ ساتھ نسبتاً کم لکھتے ہیں ۔ کم لکھنے کے اپنے الگ نقصانات ہیں ۔ اس تعلق سے نیز اردو افسانے کے مجموعی پس منظر میں راجندر سنگھ بیدی اور غلام عباس کے نام خصوصی طور سے لیے جاسکتے ہیں ۔

ان دونوں نے لپنے مشہور ہم عصروں کے مقابلے میں نسبتاً کم لکھا اور وقتی طور پر ہی سہی لیکن بہر حال خسارے میں رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے تک بیدی کا نام کرشن اور منٹو کے بعد ہی نہیں عصمت چغتائی تک کے بعد بھی لیا جاتا تھا اور یہ کام ہماشما نہیں بلکہ آل احمد سرور جیسے مشاہیر کرتے تھے ۔ جہاں تک بیدی کا معاملہ ہے ، گزشتہ پندرہ برسوں میں ان کی افسانوی حیثیت انقلابی حیثیتوں سے دوچار ہوئی ہے ۔ اس عرصے میں ان کے افسانوی فن کو پرکھنے اور سمجھنے کی نہ صرف سنجیدہ کوششیں کی گئی ہیں بلکہ نقادوں کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو انہیں منٹو ، کرشن اور عصمت پر ترجیح دیتا ہے ۔

اسکے برعکس غلام عباس پر نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ ممتاز شیریں سے لے کر وارث علوی تک فکشن کے سبھی اہم نقاد ، ان کا نام بیدی ، منٹو اور کرشن وغیرہ کے ساتھ لیتے رہے ہیں لیکن نہ تو ان کے بارے میں کسی نے تفصیل کے ساتھ کچھ لکھا اور نہ انہیں وہ عوامی مقبولیت حاصل ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے اور ہیں ۔ اس تعلق سے محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ چونکہ

غلام عباس اوسطاً سال بھر میں صرف ایک افسانہ لکھتے تھے اس لیے وہ اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح مقبول نہ ہو سکے۔

میری رائے میں عوامی سطح پر اس عدم مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد کا افسانوی ادب دو مرکزی دھاروں میں تقسیم ہو گیا۔ اپنی اپنی انفرادی خصوصیات کے باوجود اس وقت کے سبھی اور قابل ذکر افسانہ نگار یا تو سماجی حقیقت نگاری کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے یا پھر ان کے ہاتھ میں جنسی حقیقت نگاری کا جھنڈا ہوتا تھا۔ چنانچہ روایتی طور پر اگر بیدی، کرشن، قاسمی اور اشک وغیرہ کے نام پہلے گروہ سے وابستہ ہو گئے تو دوسری طرف منٹو، حسن عسکری، عصمت چغتائی اور عزیز احمد وغیرہ کو دوسرے گروہ کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ ویسے اس مفروضے کو قطعاً کسی منطقی کلیے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر منٹو کے بعض افسانے سماجی حقیقت نگاری کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں تو دوسری طرف بیدی نے اپنے کئی افسانوں میں نفسیاتی اور جنسی حقیقت نگاری کو ایک نئی افسانوی معنویت بخش دی ہے۔

غلام عباس ساری زندگی اپنے انفرادی جوہر پر زور دینے کے قائل رہے۔ انھوں نے ابتداء سے ہی اور بطور اصول، اپنے آپ کو کسی ادبی گروہ یا تحریک سے منسلک نہیں کیا۔ جہاں تک سماجی اور معاشرتی اقدار کا سوال ہے وہ ان کے افسانوں میں بھی بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اسی طرح نہ صرف یہ کہ انھوں نے جنسی مسائل کو اپنے لیے کبھی شجر ممنوعہ نہیں سمجھا بلکہ یہ بھی کہ انھوں نے ان مسائل کو اپنے کئی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ ان مسائل کی پیش کش میں منٹو کی طرح جذباتیت کی لہر پر بہہ جانے کے بجائے محتاط سست رفتار رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء کے بعد والے دور میں "سیاست" اور "صحتمند معاشرہ" ادب کی کلیدی اصطلاحیں ہوا کرتی تھیں۔ اس تعلق سے بحث کرتے ہوئے غلام عباس نے یوں لکھا ہے کہ۔

> "ہر ادیب صحتمند معاشرہ چاہتا ہے۔ وہ ادیب نہیں جو معاشرے پر تنقید نہ کرے لیکن تحریک بنا کر اس کے پیچھے پڑ جانا اصولی بات نہیں۔ ترقی پسندی ادب سے زیادہ سیاسی تحریک تھی"۔

اب یہ الگ بات ہے کہ غلام عباس خود اپنے وضع کردہ اس اصول پر سختی کے ساتھ عمل نہیں کر پائے۔ انھوں نے تنگ نظر پاکستانی اور مسلم لیگی سیاست کے زیر اثر "لیک" اور "او تار" جیسے جو افسانے رقم کیے انہیں سستے اور محدود سیاسی پروپگنڈے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ طے تھی کہ ان افسانوں کی سطحیت غلام عباس کے افسانوی ادب کی عمومی سطح کو مجروح نہیں کرتی۔

اپنے افسانوی رویے کی تشریح کرتے ہوئے غلام عباس ایک اور جگہ یوں رقمطراز ہیں۔

"میں لوگوں کے لیے نہیں لکھتا، اور نہ ہی بیرونی نظریات اور سیاست میرے پیش نظر ہوتی ہے۔ مجھے کبھی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری کہانی مقبولیت حاصل کرتی ہے یا نہیں۔ میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک ماہر موسیقار اسٹیج پر بھی ستار بجاکر ذاتی تسکین حاصل کرتا ہے ۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے سن کر دوسرے بھی تسکین حاصل کرلیتے ہیں یا کرسکتے ہیں"۔ (روزنامہ حریت کراچی۔ ۱۶جون۱۹۸۱ء)

یوں غلام عباس نے یہ بات ۱۹۸۱ء میں کہی لیکن سچ پوچھئے تو فن کے تعلق سے ابتداء سے ہی ان کا یہی رویہ تھا۔ اگر اس رویے کو ایک پرانے کلیشے کی مدد سے بیان کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ فنکار کا بنیادی کمٹ منٹ خود اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسی بات کو ہم قدرے مختلف انداز میں کہنا چاہیں تو پھر کہینگے کہ ہر حقیقی فنکار کے پاس زندگی اور اسکے مختلف مظاہرات کے بارے میں کچھ نظریات ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نظریوں کا احترام بھی کرتا ہے اور حسب ضرورت ان کا فنی اظہار بھی کرتا ہے لیکن نظریات کی تشہیر اسکا فنی مقصد نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح اس کے فن کا دائرہ محدود ہوجاتا ہے۔

فنکار کا اپنی ذات کے ساتھ کمٹ منٹ ہونے کا مطلب بے کراں وسعتوں سے ہم کنار ہونا ہوتا ہے۔ فنکار کی ذات چونکہ مجمع البحرین بھی ہوتی ہے اور مجمع الضدین بھی اس لیے اپنی ذات سے کمیٹڈ فنکار کے سامنے خیالات، موضوعات، لفظیات اور اسالیب کا پورا شہر کا شہر آباد ہوتا ہے اسکی نگاہیں کبھی کسی کھڑکی پر جم جاتی ہیں تو کبھی وہ دروازے کے پیچھے آباد دنیا کے اسرار و رموز کو دریافت کرتا ہے، کبھی اسے کسی عمارت کی بوسیدگی پسند آتی ہے تو کبھی وہ عمارت کے مکینوں کے دلوں میں جھانک کر ان اچھے، برے، شریفانہ اور غیر شریفانہ جذبات کو دیکھ لیتا ہے جو عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

اب جہاں تک "مقصدیت" کا سوال ہے وہ تو ہر فن پارے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے۔ غلام عباس نے بھی فن کی مقصدیت سے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ ان کا تو ایقان تھا کہ مقصد کے بغیر کوئی کہانی لکھی ہی نہیں جاسکتی۔ ہاں وہ جدید ادیبوں اور شاعروں کی طرح ہی ادب کی مقصدیت اور ادب کے ذریعے سیاسی پروپیگنڈے میں فرق کرنے کے قائل تھے۔ اسی لیے وہ کرشن چندر کو پسند بھی کرتے تھے اور ان کی خالص پروپیگنڈے والی کہانیوں کو ناپسند بھی کرتے تھے۔ انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ کرشن چندر کی بعض بیحد اہم کہانیاں مثلاً "کالو بھنگی" "بت جاگتے ہیں" اور "مہالکشمی کا پل" اپنے مجموعی فنکارانہ فریم ورک کے باوجود سیاسی پروپگنڈے کا شکار ہوکر رہ گئیں۔

(۳)

غلام عباس کی افسانہ نگاری کا آغاز اب سے تقریباً ۶۰ برس پہلے ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر بہ مشکل ۱۳، ۱۴ سال تھی۔ افسانوی ادب کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں اس دور میں حکیم احمد شجاع کے رسالے "ہزار داستان" کو خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی۔ عباس نے سب سے پہلے اسی رسالے کے لیے ٹالسٹائے کے مشہور افسانے "جلاوطن" کا ترجمہ کیا تھا۔ بقول ان کے ان کا پہلا طبع زاد افسانہ "مجسمہ" ماہنامہ کارواں کے سالنامے میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجھے ان کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آیا۔ بحیثیت افسانہ نگار، غلام عباس کو جس افسانے سے غیر معمولی شہرت ملی وہ ہے "آنندی"۔ انتظار حسین نے "آنندی" کو سماجی حقیقت نگاری کا نقطہ عروج قرار دیا ہے۔ بقول انتظار صاحب یہ افسانہ اس وقت لکھا گیا "جب اردو میں حقیقت نگاری کا شور تو بہت تھا لیکن رومانی افسانہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ لیکن غلام عباس تو رومانی افسانے کو بہت پہلے ہی نیا پرانا کر چکے تھے۔"

ن۔م۔ راشد کا خیال ہے کہ "آنندی" کی اشاعت کے ساتھ ہی غلام عباس کا شمار بڑے افسانہ نگاروں میں ہونے لگا تھا۔ راشد کے نزدیک اس عظمت کا حقیقی سبب یہ ہے کہ:

> "غلام عباس منٹو کی طرح زندگی کے بخیئے نہیں ادھیڑتا، وہ عسکری کی طرح کم عمری میں بالغ ہو جانے والے بچے کی طرح چھپے روزنوں میں سے زندگی کو نیم برہنہ نہیں دیکھتا، وہ عزیز احمد کی طرح ناکام معلم بن کر کسی فاسد انا کی تسکین نہیں کرتا۔" ۔۔۔۔۔ (دیباچہ۔ جاڑے کی چاندنی)

ایسا لگتا ہے کہ وارث علوی کی نظر سے راشد کی یہ تحریر نہیں گذری ورنہ وہ عزیز احمد پر اپنے مضمون (مطبوعہ سوغات شمارہ۔ ۴) میں نہ صرف اس مسئلے سے جم کر بحث کرتے بلکہ اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ میں سردست راشد کی مندرجہ بالا رائے پر کسی تفصیلی بحث کے موقف میں نہیں ہوں۔ میں محض یہ لکھ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ غلام عباس کو نہ راشد کی طرف سے عطا کی جانے والی خلعت فاخرہ سے کوئی فائدہ پہنچا اور نہ قارئین نے ان کی اس رائے کا کوئی نوٹس لیا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے مجھے راشد کی تمام تر شعری عظمت کے باوجود فکشن ہی نہیں خود شاعری کے بارے میں ان کی تنقیدی بصیرت خاصی مشکوک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں یہاں وہاں فراق، یگانہ اور کئی دوسرے شاعروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں پڑھ کر میرا یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے۔

افسانے کے بارے میں راشد کی تنقیدی بصیرت تقریباً صفر تھی۔ چنانچہ "جاڑے کی چاندنی" کے دیباچے میں انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کا

اصل مقصد غلام عباس کی تعریف و توصیف سے زیادہ منٹو، عسکری اور عزیز احمد سے (غالباً) اپنی کسی ذاتی رنجش کا انتقام لینا تھا۔ یہاں بر سبیل تذکرہ یہ بھی لکھدوں کہ عسکری صاحب غلام عباس کے دو تین سب سے زیادہ پسندیدہ افسانہ نگاروں میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مختصر افسانے کے استاذُالاساتذہ چیخف سے (اردو کی حد تک) یا تو وہ خود متاثر ہوئے ہیں یا پھر عسکری صاحب۔ اس بارے میں انتظار حسین کا کہنا ہے کہ چیخف تک تو غلام عباس اور عسکری ساتھ ساتھ چلے لیکن آگے چل کر دونوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ غلام عباس نے تو ایک وفادار شاگرد کی طرح چیخف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن عسکری صاحب راستے سے بھٹک کر مارسل پروست اور جیمز جوائس کی طرف نکل گئے۔

اس وقت اردو افسانے کی ننھی منی سی دنیا پر انتظار حسین کا جو رعب اور دبدبہ غالب ہے اس کے مد نظر یہ کہنے کی ہمت تو نہیں پڑتی لیکن بدرجہ مجبوری کہنا پڑتا ہے، ہمارے اس عہد ساز اور صاحب طرز افسانہ نگار نے چیخف، پروست اور جوائس کو ہی نہیں بلکہ غلام عباس اور عسکری کو بھی دل لگا کر نہیں پڑھا۔ بحیثیت افسانہ نگار عسکری صاحب اپنے سر سبز دنوں میں کچھ کم مشہور نہیں تھے لیکن چونکہ وہ اپنی شہرت کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھنے کے بجائے ہمیشہ اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے نیز نت نئے اصناف میں اضافہ کرنے کے قائل تھے اس لیے انہوں نے چند برسوں بعد ہی افسانہ نگاری ترک کر دی۔ افسانہ نگاری کے حوالے سے انہوں نے جوائس اور پروست کو اردو والوں سے متعارف ضرور کرایا لیکن خود ان کے افسانوی ادب پر ان مشاہیر کا کوئی قابل ذکر اثر نظر نہیں آتا۔

سچ تو یہ ہے کہ عسکری صاحب کے یہاں چیخف کا اثر ہی نہیں اسکی تقلید کا بھی رجحان دکھائی دیتا ہے جبکہ غلام عباس وسیع تر تخلیقی سطح پر چیخف سے متاثر ضرور ہوئے لیکن انھوں نے شعوری طور سے اس عظیم افسانہ نگار کی تقلید نہیں کی۔ دراصل انھوں نے کسی کی بھی تقلید نہیں کی۔ اور اسی حقیقت میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔

شمیم احمد نے اپنے مضمون "غلام عباس کے افسانے" (مطبوعہ "دائرے" کراچی جولائی۔ اگست ۱۹۹۱ء) میں جہاں غلام عباس کے افسانوی ادب سے متعلق سو طرح کی دوسری اوٹ پٹانگ باتیں لکھی ہیں وہاں یہ زبردست انکشاف بھی فرمایا ہے کہ پطرس، تاثیر، محمد حسن عسکری وغیرہ غلام عباس کے دوست ہی نہیں "ادبی مشیر" بھی تھے۔ یہ لوگ غلام عباس کو مختلف موضوعات دیا کرتے تھے جنکی بنیاد پر عباس صاحب افسانوی شہکار تو تخلیق کر دیتے تھے لیکن انہیں یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے اکثر افسانے کسی نہ کسی "مغربی تخلیق سے ماخوذ ہوتے تھے۔" شمیم احمد کا یہ الزام نہ صرف بچکانہ بلکہ بدنیتی پر محمول ہے۔ غلام عباس کا پہلا افسانوی مجموعہ "آنندی" ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں کل (۱۰) افسانے ہیں۔ دوسرے مجموعے "جاڑے کی چاندنی" (طبع

اول ۱۹۶۰ء) میں ۱۴ افسانے ہیں۔ تیسرا مجموعہ "کن رس" پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں صرف (۹) افسانے ہیں۔ بعد ازیں انھوں نے چند اور افسانے مثلاً "بندر والا" "روحی" اور "رینگنے والے" لکھے۔ ایک عام اندازے کے مطابق غلام عباس کے افسانوں کی مجموعی تعداد ۴۰ ۴۵ سے زیادہ نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو اس فہرست میں "گوندنی والا تکیہ" "دھنک" کو بھی شامل کر لیں۔

مطلب یہ کہ غلام عباس پر اتنا سنگین الزام لگانے سے قبل شمیم احمد کا فرض تھا کہ وہ اپنے مفروضے کے ثبوت میں قابل قبول شواہد فراہم کرتے۔ عباس صاحب کے افسانوں کی مختصر سی تعداد کے مدنظر یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ لیکن شمیم احمد نے اس پس منظر میں محض ایک افسانے "ناک کاٹنے والے" کا نام لیا ہے جو ان کے نزدیک مولیر کے کسی ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے میں بھی موصوف کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے مولیر کے ڈرامے کا نام نہیں بتایا۔ ہمارے نزدیک شمیم احمد کی یہ الزام تراشی ایماندارانہ ادبی تنقید کے منافی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے لکھنے والوں سے متاثر ہونے کی بات الگ ہے۔ غلام عباس نے قدیم اردو داستانوں سے لے کر جدید مغربی افسانوی ادب تک کا لغور اور بالا ستعیاب مطالعہ کیا تھا۔ وہ بھی درجنوں دوسرے اہم لکھنے والوں کے مانند موپاساں اور چیخف کو دنیا کے عظیم ترین افسانہ نگار سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ٹالسٹائے کے افسانے Death of Iran illyich جوائس کے The Dead لارنس کے The Woman who rode away اور آئیون بنن کے Gentleman from Fransisco کو بھی دنیا کے عظیم افسانوں میں شمار کرتے تھے۔ اسکے باوجود غلام عباس کی کسی تخلیق پر ان عظیم تحریروں کی کوئی قابل شناخت چھاپ نظر نہیں آتی۔

غلام عباس کے جو آدھے درجن کے قریب انٹرویوز میری نظر سے گذرے ہیں ان کی بناء پر آسانی کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اردو افسانے کو یورپی اور بین الاقوامی افسانوں کے معیار کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھنے کے قائل تھے۔ اس حد تک کہ اگر وہ اپنے لیے کسی موضوع کا انتخاب کرتے اور اتفاقیہ طور سے انہیں کسی مغربی زبان میں اس موضوع پر یا پھر اس سے ملتے جلتے ہوئے موضوع پر بھی کوئی افسانہ نظر آجاتا تو وہ اس موضوع کو فوراً ترک کر دیتے۔ اردو افسانوں کے تعلق سے بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے کسی ہم عصر کے کسی کامیاب افسانے کو سامنے رکھ کر کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ اس معاملے میں ان کی سخت گیری کا یہ عالم تھا کہ وہ اگر خود کسی موضوع پر ایک بار افسانہ لکھدیتے تو پھر متعلقہ موضوع خواہ کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو، وہ اسے دہرانا پسند نہیں کرتے تھے۔

افسانہ نگاری کے سلسلے میں غلام عباس کا ایقان تھا کہ افسانہ نگار کو وہی لکھنا چاہئے جو اسکے

اپنے تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہو۔ یہاں بطور وضاحت یہ عرض کر دوں کہ افسانوی ادب کے تناظر میں مشاہدے اور ذاتی تجربے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ہر واقعہ خود افسانہ نگار پر گذرا ہو تجربات وسیلہ در وسیلہ بھی افسانہ نگار تک پہنچتے ہیں۔ کسی کا سنایا ہوا کوئی واقعہ یا اخبار میں شائع ہونے والی کوئی خبر بھی تخیل کی مدد سے افسانہ نگار یا ناول نگار کا ذاتی تجربہ بن جاتی ہے۔

مثال کے طور پر بین الاقوامی شہرت یافتہ ناول نگار جوزف کونریڈ کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنا جنوبی امریکی ناول Nostromo اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر لکھا ہے۔ اب اگر منطقی طور پر دیکھا جائے تو کونریڈ ساری زندگی جنوبی امریکہ نہیں گیا۔ ہاں وہ نو عمری میں میکسیکو کے بندرگاہ تک ضرور گیا تھا جہاں کسی نے اسے ایک کہانی سنائی تھی۔ کونریڈ کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس کہانی کو بنیاد بنا کر جو ناول لکھا اسے پڑھ کر آپ جنوبی امریکہ کے بارے میں سب کچھ جان لیتے ہیں۔ اسی طرح ابھی حال ہی میں جیلانی بانو نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان کی کہانی "نرسیا کی باولی" کا ماخذ دراصل ایک اخباری خبر ہے جسے ان کے افسانوی تخیل نے ذاتی تجربے کی شکل عطا کر دی ہے۔

چنانچہ غلام عباس جب یہ بات بہ اصرار کہتے ہیں کہ ان کا ہر افسانہ ان کے ذاتی تجربے یا مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے یا یہ کہ وہ اپنی کہانیوں کا مرکزی کردار خود ہوتے ہیں تو اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کسی افسانے کے لیے زندگی کی جس "قاش" کا بھی انتخاب کرتے ہیں اس کا تعلق عمومی انسانی رویوں سے زیادہ ان کی اپنی انفرادی حسیت اور افسانوی تخیل و تجربے کی ندرت سے ہوتا ہے۔

جہاں تک لفظی معنی میں ذاتی تجربے کا تعلق ہے انھوں نے اپنے ایک افسانے "اوور کوٹ" کی بطور خاص نشاندہی کی ہے۔

بقول غلام عباس ...

> "اس کہانی کا خیال یوں سوجھا کہ دہلی میں ایک بار گئی رات، ہم ایک موٹر میں نظام الدین اولیاء رح کو جانے والی سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ مقصد محض تفریح اور گپ بازی تھا۔ کار پطرس بخاری چلا رہے تھے اور کار کے دوسرے مسافروں میں تاثیر، فیض، کرنل مجید اور خاکسار شامل تھا۔ میں نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ اوورکوٹ اور مفلر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ میں نے صرف پھٹا ہوا بنیان اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ موٹر چلی جا رہی تھی اور شعر و شاعری پر دلچسپ بحث ہو رہی تھی کہ اتنے میں سڑک کے بیچوں بیچ ایک ٹرک کچھ زیادہ تیز رفتاری سے سامنے آگیا۔ اگر پطرس صاحب جلدی سے موٹر ایک طرف نہ کر لیتے تو ٹکر ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔

مجھے خیال آیا کہ فرض کرو کہ اگر ٹکر ہو گئی ہوتی تو ہم سب لوگ مرے
پڑے ہوتے یا زخمی۔ ہمیں اس حالت میں اسپتال پہنچایا جاتا تو دیکھنے والے یہ
دیکھ کر حیران ہو جاتے کہ سب لوگ تو ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن ایک شخص نے
عجیب حلیہ بنا رکھا ہے کہ اوپر سے قیمتی کوٹ اور مفلر ہے اور اندر پھٹا ہوا
بنیان اور پاجامہ ہے۔۔"

غلام عباس نے اس مخصوص صورتحال کو افسانوی تخیل، استعاراتی بیانیہ اور حسی پیکر تراشی کی مدد سے ایک ایسی تخلیقی شکل عطا کر دی ہے جو متذکرہ بالا سیاق و سباق سے تھوڑی بہت یا یوں سمجھئے کہ اشاراتی مطابقت و مشابہت رکھنے کے باوجود ایک نرالی شان اور گہرے تاثر کی حامل ہے۔ یہ حقیقت اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ غلام عباس ان افسانہ نگاروں سے قطعاً الگ ہیں جو اپنے تجربات کو نہایت ہی معصومیت کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں اگل دیتے ہیں۔ عباس انسانی صورت حال کو نہ صرف بدل دینے پر قادر ہیں بلکہ اسے ہم عصر معاشرتی پس منظر میں بیان کر کے قاری اور تخلیق کے درمیان وہ داخلی ربط بھی قائم کر دیتے ہیں جو افسانے کو ذاتی دستاویز بنا دیتا ہے۔

"اوورکوٹ" کا بے نام اور نوجوان ہیرو بظاہر خاصا فیشن ایبل بلکہ ارسٹوکریٹ نظر آتا ہے۔ بادامی رنگ کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کا ایک عدد ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا ہے۔ کوٹ کے رنگ کی مناسبت سے سر پر سبز فیلٹ ہیٹ ایک خاص انداز میں میڑھی رکھی ہوئی ہے۔ گلے کے گرد سفید ریشمی گلوبند لپٹا ہوا ہے۔ یہ نوجوان ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں بید کی ایک چھوٹی سی چھڑی پکڑے ہوئے شہر کے مرکزی بازار سے گذرتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو گہری افسانوی معنویت عطا کرنے کی غرض سے غلام عباس نے ماحول کشی سے بلکہ خوبصورت اور موثر ماحول آفرینی سے کام لیا ہے۔ یہ پیراگراف ملاحظہ ہو•••

"اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس
کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے
عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو اس بہانے کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے۔
تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سے درغلائے جا سکتے ہیں۔ وہ اپنے کونوں
کھدروں سے نکل کر محفلوں، مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں۔ تاکہ
جسموں کے قرب سے گرمی حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال
پر کھینچ لائی تھی۔"

اوورکورٹ کا ہیرو اس طبقے کا نمائندہ ہے جسے کھل کھیلنے اور داد عیش دینے کے مواقع حاصل نہیں ہیں لیکن جو بہر حال زندگی کی گہما گہمی، چہل پہل، چھیڑ چھاڑ اور لذت پرستی سے لطف اندوز

ہونے کا خواہاں نظر آتا ہے ۔ یہ افسانہ غربت کا رزمیہ ہے اور نہ مرثیہ بلکہ یہ ایک ایسا سفر ہے جس کا انجام تو المناک ہے لیکن اس انجام تک پہنچتے پہنچتے قاری ایسے موڑوں سے ٹھٹکتا ہوا گذرتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے ہی سہی لیکن زندگی کی مایوسیاں اور ناکامیاں خوشدلی اور رنگینی کا روپ دھار لیتی ہیں ۔

نوجوان پہلے ایک پارک کی ایک خالی بنچ پر بیٹھتا ہے ۔ جیب خالی ہونے کے باوجود سگریٹ فروش لڑکے سے دس کا چینج مانگتا اور پھر نہ ملنے پر دل میں خوش ہوتا ہے اور اگنی کی سگریٹ خرید کر لطف اندوز ہوتا ہے ۔ اس کا اگلا پڑاؤ انگریزی موسیقی کی ایک دوکان ہے جہاں سے وہ تازہ ریکارڈوں کی فہرست طلب کرکے کوٹ کی جیب میں اڑس لیتا ہے ۔ دوکان سے نکلنے کے بعد وہ پھر مٹر گشتی پر روانہ ہوجاتا ہے ۔ دریں اثناء اسکے قریب سے ایک نوجوان جوڑا گذرتا ہے ۔ اس جوڑے میں اسے ایک عجیب لیکن مانوس سی کشش اور جاذبیت محسوس ہوتی ہے ۔ اسکا سبب شاید یہ ہو کہ خود اسے عورت کا ایسا قرب کبھی حاصل نہیں ہوا تھا ۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے ۔ ان کی بات چیت سے نوجوان پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ وہ دونوں غیر شادی شدہ "پریمی" ہیں ۔ لڑکی حاملہ ہوچکی ہے ۔ لڑکا اسے حمل ضائع کرنے کے لئے ورغلاتا ہے لیکن لڑکی کے اندر رچا بسا ہوا ممتا کا جذبہ اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ وہ نوجوان کی بات ماننے سے صاف انکار کردیتی ہے ۔

واضح رہے کہ "اوور کوٹ" آزادی سے پہلے اس خالص روایتی مشرقی معاشرے میں لکھا جانے والا افسانہ ہے جب ہمارے یہاں تو کیا مغرب میں بھی Permissi-eness کا وہ تصور موجود نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے ۔

نوجوان اس جوڑے کی گفتگو میں کچھ اس درجہ محو ہوجاتا ہے کہ اسے سامنے سے آتے ہوئے تیز رفتار ٹرک کا احساس تک نہیں ہوتا ۔ زخمی حالت میں جب وہ اسپتال پہنچایا جاتا ہے اور آپریشن روم میں جب اسکے کپڑے اتارے جاتے ہیں تو نرسوں اور ڈاکٹروں کو پتہ چلتا ہے کہ "نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر تو کیا سرے سے قمیص ہی نہیں تھی ۔ ایک بوسیدہ سوئٹر جو وہ پہنے ہوئے تھا اس میں جگہ جگہ سے سوراخ تھے ۔ اس کی جرابیں نہ صرف پھٹی ہوئی تھیں بلکہ ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے مختلف تھی ۔ "اسکے کوٹ کی جیب سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ یہ تھیں ۔

"ایک چھوٹی سی سیاہ کنگھی ، ایک رومال ، ساڑھے ٦ آنے ، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں مختلف لوگوں کے پتے لکھے ہوئے تھے نئے گراموفون ریکاڈوں کی ماہانہ فہرست ۔"

"افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران کہیں کھو گئی تھی اس فہرست میں

شامل نہ تھی"۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا لباس اور موسیقی سے لگاؤ کی حد تک تو غلام عباس نے اس نوجوان کو کسی حد تک خود سے شناخت کرنے کی کوشش کی ہے۔ باقی جو کچھ بھی ہے افسانوی تخیل اور ایجاد ہے۔ لیکن پورے افسانے میں قاری کو کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے پاتا کہ وہ حقیقت کے بجائے افسانے سے دوچار ہے۔ غلام عباس کا انسانیت پرست تخیل ہمیں متذکرہ بالا ماحول کا حصہ بنا دیتا ہے۔ افسانہ نگار کے معاشرتی مشاہدات ہمارے اپنے تجربات میں ڈھل جاتے ہیں۔ نوجوان کا انجام یقیناً المناک ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ نوجوان میں اپنے آپ کو بہلانے اور خوش رکھنے کی جو خواہش تھی وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار نے محض افسانے کو ختم کرنے کے لئے مرکزی کردار کو مار ڈالا ہے۔

پطرس بخاری نے غلام عباس کے کرداروں سے بحث کرتے ہوئے ایک جگہ بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

بقول پطرس ....

"ان کے کیریکٹر بڑے بے بضاعت لوگ ہوتے ہیں جنھیں راہ چلتے میں شاید آپ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ غلام عباس کو ان کی تنگ و تاریک زندگی میں طرح طرح کی دلچسپیاں نظر آتی ہیں اور ان کی صحبت میں انہیں ایک محققانہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ ان کی حقیر آرزوؤں کو بھی سمجھتے ہیں، ان کی کمزوریوں اور فریب کاریوں کو بھی جانتے ہیں لیکن ان پر برہم نہیں ہوتے، صرف مسکرا دیتے ہیں۔"

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کرداروں کی تشکیل، ان کے ارتقاء اور ان کی پیش کش کا سارا معاملہ براہ راست افسانوی تکنیک کا حصہ ہوتا ہے۔ موضوعات کے انتخاب کا تعلق بھی اسی تکنیک سے ہوتا ہے۔ کرداروں کے سلسلے میں غلام عباس نے وہ رویہ اختیار نہیں کیا جو ہمیں ان کے اہم ترین ہم عصروں یعنی منٹو، بیدی، کرشن اور عصمت وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ منٹو وغیرہ کے بیشتر افسانوں میں ہم واضح طور سے نشان دہی کر سکتے ہیں کہ افسانہ نگار کی ہمدردیاں کس کردار کے ساتھ ہیں اور کس کے ساتھ نہیں۔ انتہا ہی نہیں۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ بیدی، منٹو اور کرشن نے اپنے اپنے کرداروں میں اپنے جذباتی رہنما تلاش کر لیے تھے۔ اس سلسلے میں غلام عباس کا رویہ قطعاً مختلف ہے۔

ان کے کرداروں میں خواہ ان معنی میں گہرائی اور پیچیدگی نہ ملتی ہو کہ ہر کردار کی علامتی تشریح و تفہیم کی جاسکے یا پھر ان کے کردار اس سماجی ثقافتی طمطراق کے حامل نہ ہوں جو قرۃ العین حیدر کے کرداروں کا وصف ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام عباس کے بیشتر کردار اپنے

تمام معمولی پن کے باوجود افسانوی تناظر میں غیر معمولی ثابت ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی بھی کردار خواہ وہ بظاہر کتناہی چھوٹا اور معمولی نظر آئے ان کے مجموعی افسانوی فریم ورک کے اعتبار سے بیکار یا فالتو نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی سطح پر اسکا افسانوی ارتباط بہرحال قائم رہتا ہے۔

اردو افسانے کے قارئین کو پریم چند کے زمانے سے ہی مثالی کرداروں کی عادت پڑ گئی تھی۔ کرشن چندر اور منٹو کے یہاں بھی مثالی کردار وافر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ غلام عباس کے کردار اگر مثالی نہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر اپنے لیے عموماً بےحد معمولی طبقوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے انفرادی ڈائلما اور ان کے انفرادی مسائل کو منتخب کیا ہے۔ دراصل غلام عباس اس راز کو پاگئے تھے کہ کسی ایک عہد کے مخصوص سیاسی اور سماجی مسائل آنے والے زمانوں میں نہ صرف اپنا ارتباط کھو دیتے ہیں بلکہ ایک حقیقی فنکار کی حیثیت سے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نئے زمانے کے نئے لوگ بسا اوقات عہد گزشتہ کے سیاسی و معاشرتی مسائل کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔

اس صورت حال کے بر خلاف انسانی جبلتوں اور جذبات و احساسات کی عمومی اہمیت بہر طور برقرار رہتی ہے۔ انفرادی انسانی کرداروں کے رنگ کبھی پھیکے نہیں پڑتے۔ اس حد تک کہ بسا اوقات سماجی اور اخلاقی بحران بھی انہیں تبدیل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ "سیاہ، سفید" کی میمونہ "کن رس" کا فیاض "بھنور" کے حاجی شفاعت احمد "سایہ" کا سجان "اسکی بیوی" کا بے نام نوجوان ہیرو "غازی مرد" کی چراغ بی بی اور "بردہ فروش" کی جی ایسے ہی کردار ہیں جو متعلقہ افسانوں کے موضوع اور پلاٹ سے قطع نظر بھی قاری کا ساتھ نہیں چھوڑتے بلکہ برابر اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔

غلام عباس کے بیشتر افسانوں میں جو غیر معمولی داخلیت پائی جاتی ہے وہ ایسے ہی کرداروں کے توسط سے آئی ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار وہ جس طرح ایک کردار سے دوسرے کردار تک سفر کرتے ہیں اور اس سفر میں وہ جس طرح قاری کو نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ دو ایک قدم آگے رکھتے ہیں وہ چیز ان کے افسانوں کو خود بخود زیادہ موثر بنادیتی ہے۔ ان کے افسانوں کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کرداروں کی خارجی زندگی کا استعمال محض داخلی پہلوؤں کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کے مقصد سے کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں موجود آخری تفصیل تک قاری پر کوئی نہ کوئی اثر ضرور مرتسم کرتی ہے۔

مثال کے طور پر آیئے ان کے ایک نسبتاً کم مشہور افسانے "بردہ فروش" پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ "بردہ فروشی" کو عام طور سے دنیا کا قدیم ترین پیشہ سمجھا جاتا ہے۔۔ موضوع کے اعتبار سے بردہ فروشی ماہرین نفسیات و عمرانیات کا ہی نہیں فکشن نگاروں کا بھی محبوب موضوع رہا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے بھی اسکے مختلف پہلوؤں سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ منٹو کے تو کئی

فنکارانہ شاہکار بردہ فروشی کے ارد گرد ہی گھومتے ہیں۔ خود غلام عباس کے مشہور افسانہ "آنندی" کا مرکزی موضوع یہی ہے۔ لیکن آنندی میں غلام عباس کا بنیادی نقطہ نظر افسانوی سے کہیں زیادہ سماجی اور عمرانی ہے۔

اسکے برخلاف انھوں نے "بردہ فروش" میں ایسے کرداروں کے ذریعے جو بیک وقت قابل یقین بھی ہیں اور ناقابل یقین بھی، اس موضوع کو ایک بالکل ہی نئے زاویئے سے برتا ہے۔ افسانے کے آغاز کے لیے آدھی رات کے وقت کا انتخاب اس پیشے کے سرد و گرم سے علامتی مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن بہر کیف یہ ایک ضمنی بات ہے۔ افسانے کے پہلے پیراگراف میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے دیہاتی ریلوے اسٹیشن کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں آدھی رات کو کوئی پسنجر ٹرین آنے والی ہوتی ہے۔ پورے پلیٹ فارم پر دس، بارہ سے زیادہ مسافر نہیں ہیں۔ ان مسافروں میں دو ایسی عورتیں ہیں جو سب سے الگ تھلگ نظر آتی ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی دیہاتن ہے اور دوسری ایک نوجوان بنی ٹھنی ہوئی الھڑسی لڑکی۔ دونوں کی بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کا نام جمی اور لڑکی کا ریشماں ہے۔

بیانیہ کی الٹتی ہوئی پرتوں کے ساتھ قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ جب ریشماں کی عمر صرف ۵ سال تھی اسی وقت اس کا کسی نے اغواء کر لیا تھا۔ اس معصوم کو آخر تک یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ وہ کہاں کی رہنے والی تھی اور اسکے ماں باپ کون تھے۔ جیسے ہی اس نے جوانی کی سرحد پر قدم رکھا اغواء کرنے والے نے اسے جمی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جمی عام معنی میں بردہ فروش ہی نہیں بلکہ نہایت ہی پہنچی ہوئی شاطر ٹھگ بھی ہے۔ وہ ہمیشہ ایسے مالدار بوڑھوں کی تلاش میں رہتی تھی جن کی پہلی بیویاں مر چکی ہوتی تھیں۔ ایسے لوگوں سے وہ ریشماں کے من مانے دام وصول کرتی تھی۔
جمی نے ٹھگی کا جو طریق کار اپنایا تھا وہ یہ تھا کہ ریشماں کی "شادی" کے بعد بھی وہ اس سے تعلق قائم رکھتی تھی۔ دھیرے دھیرے جب ریشماں اپنے "شوہر" کے گھر میں موجود تمام نقدی اور زیورات کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتی تو جمی تمام دولت سمیت اسے کسی دور دراز کے مقام پر بھگا لیجاتی اور از سر نو وہی ڈرامہ دہرایا جاتا۔ جمی اور ریشماں کا موجودہ سفر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس بار جمی نے ریشماں کو کرم دین نامی جس بوڑھے کھوسٹ کے ہاتھ فروخت کیا تھا اسکے گھر میں زیورات بھی برائے نام تھے اور وہ ریشماں کو زد و کوب بھی بہت کرتا تھا۔

اب جمی ریشماں کو ۷۰ روپئے کے عوض جس ۶۰ سالہ شخص کے حوالے کرنے جارہی تھی اسکا نام گلاب دین تھا۔ چودھری صاحب کا جنسی جوش بھی تقریباً سرد پڑ چکا تھا اور وہ نماز روزے کے بھی پابند تھے۔ دوسری طرف ریشماں کے لیے جو ایک جسم سے دوسرے جسم کا سفر کرتے کرتے تھک چکی تھی جنسی تلذذ قطعاً کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ

اپنی باقی ماندہ زندگی گلاب دین کے گھر میں ہی گذار دیگی۔

چند ماہ بعد جب جی لوٹ کر آئی اور ریشماں کو اطلاع دی کہ اب زیورات اور نقدی کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلنے کا وقت آگیا تھا کیوں کہ اس نے ریشماں کے لیے ایک ایسا لمبردار ڈھونڈ لیا تھا جو دو ہزار دینے کو تیار تھا تو اس بار ریشماں نے سختی کے ساتھ جی کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ دونوں کی درمیان اچھی خاصی مار پیٹ بھی ہوئی۔

یہیں سے کہانی ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ انتقام کی آگ میں جھلستی ہوئی جی کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آتا تو وہ واپس جاکر کرم دین کو ریشماں کے موجودہ پتے سے آگاہ کر دیتی ہے۔ کرم دین یہ اطلاع ملتے ہی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ دونوں بوڑھوں میں زبردست جنگ ہوتی ہے۔ بردہ فروش جی ٹھگی سے کام لیتے ہوئے اچانک ثالث بن جاتی ہے اور دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے "اگر تمہیں وہ سارا روپیہ مل جائے جو تم نے اس پر خرچ کیا ہے تو کیا تم اسے مجھے دے دو گے۔"

دونوں کچھ دیر سوچتے رہے۔ اسکے بعد کرم دین نے کہا۔

"اگر میرے چار سو روپئے مجھے واپس مل جائیں تو پھر چاہے وہ بھاڑ میں جائے، میری بلا سے!"

"تم چار سو کے بجائے پانچ سو لے لینا۔ اور چودھری گلاب تم کیا کہتے ہو؟"

"اگر کرم دین کو اعتراض نہیں تو مجھے بھی اعتراض نہیں۔" چودھری نے دھیمے لہجے میں کہا۔ بالآخر جی ان دونوں شریف آدمیوں کا حساب بے باق کر کے ریشماں کو لیجاتی ہے۔ افسانے کے آخر میں غلام عباس نے ریشماں کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

" ریشماں اس خنک چاندنی میں ایک خواب کے سے عالم میں چلی جارہی تھی۔ نہ تو اس کے کان کچھ سن رہے تھے اور نہ یہ خبر تھی کہ قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔"

یہ انداز غلام عباس کا خاص اور منفرد افسانوی اسلوب ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو بسا اوقات ایسی صورت حال سے دوچار کر دیتے ہیں جہاں سے بھاگ نکلنا عام طور سے ممکن نہیں ہو پاتا۔ غلام عباس مسئلے کا حل پیش کرنے کے بھی قائل نہیں ہیں۔ لیکن بردہ فروش کا جو سماجی پہلو ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قاری افسانے کے اختتام پر اسکے عنوان کی ذو معنویت سے متعلق سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسکے سامنے سو سوالوں کا ایک سوال یہ اٹھتا ہے۔ حقیقی معنی میں بردہ فروشی کا کام جی جیسی عورتیں کرتی ہیں یا پھر گلاب دین اور کرم دین جیسے صوم و صلوٰۃ کے پابند وہ لوگ بردہ فروش ہیں جن کے لیے ان کی منکوحہ بھی چاول اور گیہوں جیسی اجناس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ غلام عباس کے تخلیقی میڈیم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور سے سطحی مشاہدات پر گہرائی میں جاکر بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے افسانوی جینئیس کو سطح پر تیرتے ہوئے نہیں دیکھا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اس وسیع، پیچیدہ اور گنجلگ

کائنات میں انسانی شعور کو اہم ترین اور واضح ترین قدر سمجھتے ہیں اور پھر اسی شعور کو پیمانہ بنا کر کرداروں کی بلندی یا ان کی سطحیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی کہانیاں شعور کے ذریعے زینہ بہ زینہ آگے بڑھتی ہیں۔ ہم جس انسانی شعور کی بات کر رہے ہیں اس کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ غلام عباس اجتماعی شعور کو اہمیت دینے کے بجائے انوکھے، تنہا اور سوچتے ہوئے شعور کو کھنگالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسائل سے بھری ہوئی اس دنیا کو سمجھنے اور پیش کرنے کا یہ ان کا اپنا منفرد طریقۂ کار ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو انہیں حقیقی معنی میں ہم عصر سماج کا نقاد بنا دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں خود ایک فریق بن کر نہ تو سماج کو اپنی براہ راست تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور نہ ہی ان کا معاشرتی بیانیہ اتنا سپاٹ ہوتا ہے کہ قاری پہلی ہی نظر میں آر پار سب کچھ دیکھ کر مطمئن ہو جائے کہ اس نے گنگا اشنان کر لیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ اپنے بیشتر افسانوں میں زوال پسند اور زوال آمادہ معاشرے کے کسی نہ کسی پہلو کو زیر بحث لے آتے ہیں، ایک فنکار کی حیثیت سے ان کا رویہ ہمیں الگ تھلگ (Detached) رہنے والا محسوس ہوتا ہے۔ اشیاء، مظاہرات اور افراد کا کبھی قدرے اور کبھی خاصے فاصلے سے مشاہدہ اور مطالعہ کرنے والی عباسی تکنیک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسکی تشریح کے لیے ہمیں علامتی اور استعاراتی میدانوں کی خاک چھاننی پڑے۔

سیدھی سادی سی بات ہے کہ سماج میں رہنے بسنے والے عام شہریوں اور اسی سماج میں رہ کر تخلیقی کام کرنے والے فنکار میں کچھ نہ کچھ تو فرق بہر حال ہونا ہی چاہیئے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ جس طرح کوئی بھی فن زندگی سے مکمل علحدگی اختیار کر کے پنپ نہیں سکتا بالکل اسی طرح کوئی بھی حقیقی فنکار اپنے شہری فرائض سے غافل یا ان کا منکر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس حقیقت کے ساتھ جو ایک دوسری یا اور زیادہ اہم حقیقت جڑی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تخلیقی عمل اپنی بنیادی سرشت کے اعتبار سے داخلی عمل ہوتا ہے۔ اگر کوئی فنکار زندگی کا آئینہ محض ہو کر نہیں رہ جانا چاہتا تو اسے دوران تخلیق خود کو زندگی کے عمومی رویے اور روزمرہ والے دھارے سے الگ رہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ایسا کیے بغیر آپ زندگی کو نہ تو معروض کے طور پر برت سکتے ہیں اور نہ ہی اسے معروضی انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

غلام عباس تکنیک کے اس گر سے اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، ہاجرہ مسرور اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ سے ہی زیادہ نہیں بلکہ کرشن چندر اور عصمت چغتائی سے بھی زیادہ واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تکنیک اس حد تک مکمل ہے کہ وہ اسلوب اور افسانوی ساخت و بافت کا جزو لاینفک ہونے کے ساتھ ساتھ موضوع، مواد اور بیانیہ کا بھی ناقابل تقسیم حصہ بن جاتی ہے اس تکنیک کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اگر ہم ان کے افسانوں میں پائے جانے والے انفرادی انسانی

رشتوں پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے متعدد افسانوں میں ان رشتوں کا ایسا ڈرامائی حلقہ تیار کر دیا ہے جس میں مختلف کردار ایک دوسرے سے قریب بھی نظر آتے ہیں اور دور بھی رہتے ہیں ۔ اس حلقے میں شامل ہر فرد ایک دوسرے کو ٹکڑوں میں تو سمجھ لیتا ہے لیکن پوری طرح نہیں سمجھ پاتا ۔ مزید یہ کہ غلام عباس کرداروں کے آپسی تعلقات کے استحکام یا ان میں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والی خارجی اور داخلی تبدیلیوں کے بارے میں کھل کر کچھ نہیں کہتے ۔

وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کرداروں کی دماغی اور ذہنی کیفیات کو بیان کرنا مجموعی افسانوی تاثر کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے ۔ اس پس منظر میں "حمام میں" میرے نزدیک ان کا ایک بیحد کامیاب اور موثر افسانہ ہے ۔ فرخندہ نامی ایک اٹھائیس سالہ عورت کے ارد گرد گھومنے والا یہ افسانہ کرداروں کی تعداد نیز واقعات کی کثیر الجہتی کے اعتبار سے دراصل ایک ناولٹ کا مرتبہ رکھتا ہے ۔ افسانے کے پہلے پیراگراف میں فرخندہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے ۔

" نام تو تھا اس کا فرخندہ بیگم مگر سب لوگ اسے فرخ بھابھی کہا کرتے تھے ۔ یہ ایک طرح کی رسم سی پڑ گئی تھی ورنہ رشتہ ناطہ تو کیا کسی نے اس کے مرحوم شوہر کو دیکھا تک نہ تھا ..... وہ چھوٹے سے قد کی ایک چھوٹی سی عورت تھی مگر اسکا چہرہ اسکے قد کے تناسب سے کافی بڑا تھا ..... اسکی عمر اٹھائیں برس کے لگ بھگ تھی مگر دیکھنے میں وہ اس سے کہیں کم عمر لگتی تھی ۔ پہلی ہی نظر میں جو چیز دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی وہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک تھی جس نے اس کے سادہ خدوخال کو حد درجہ جاذب بنا دیا تھا" ۔

یہ تعارفی جملے اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ فرخندہ ہر لحاظ سے ایک بیحد معمولی عورت ہونے کے باوجود غیر معمولی شخصیت کی حامل ہے ۔ شہر میں فرخندہ کا نہ تو کوئی رشتے دار تھا نہ سرپرست ۔ وہ کسی بھی معیار سے کوئی "ایسی ویسی" عورت بھی نہیں تھی ۔ اسکے باوجود اس کا گھر مختلف قسم کے لوگوں کے لیے ایک صاف ستھرے کلب یا پھر یوں سمجھئے کہ ذہنی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ اسکے یہاں مستقل آنے والوں میں پچاس سالہ ڈاکٹر ہمدانی بھی تھے ، ادھیڑ عمر والا بیمہ ایجنٹ بھٹناگر بھی تھا ، بے حد امیر باپ کا خوش رو اور شرمیلا ۲۲ سالہ بیٹا دیب کمار بھی تھا نوجوان انقلابی شاعر شکیبی بھی تھا ، ایک باکمال مصور اور فوٹو گرافر مسٹر سنگھا بھی تھے اور ان سب کے علاوہ فرخ کے گھر پر آٹھوں پہر پڑے رہنے والے ایک عدد مولانا صاحب بھی تھے ۔

ڈاکٹر ہمدانی طب یونانی ، ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی تینوں پیتھیوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے گو کہ ان کے پاس کسی بھی پیتھی کی کوئی باقاعدہ سند نہیں تھی ۔ ۲۲ سالہ دیب کمار " اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالسلطنت آیا تھا لیکن ایم اے میں فیل ہونے کے بعد نہ تو باپ کے بے شمار خطوں اور تاروں کا کوئی جواب دیا اور نہ گھر جانے کا نام لیا" ۔ مولانا صاحب کسی چھوٹے سے گاؤں سے فقہ اور حدیث کا درس لینے آئے تھے ۔ کچھ دن ایک مسجد میں پیش امامی بھی کی ۔ پھر ایک دن انھوں

نے بڑی مسجد کے مولانا صاحب کا وعظ سنا۔ خدا معلوم اس وعظ سے ان پر کیا بیتی کہ انھوں نے نہ صرف حدیث و فقہ سے بلکہ مسجد سے بھی، ہمیشہ، ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑ لیا۔ نوجوان شاعر شکیبی کے کچھ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ہاں افسانہ نگار قاسم نے گذر اوقات کے لیے ٹرام میں کنڈکٹری قبول کر لی تھی۔

کبھی کبھی وہاں ایک خان صاحب بھی آجاتے تھے جو عام طور پر سے نشے میں ہوتے تھے۔ وہ فرخندہ خانم سے کبھی گانا سنانے یا کبھی سنیما چلنے کی فرمائش کرتے جنہیں فرخندہ تو بحسن خوبی ٹال جاتی لیکن ان حرکتوں پر اس کے دیگر احباب بےحد ناراض ہوتے۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا یہ سارے لوگ کسی نہ کسی سطح پر سماج سے کٹے ہوئے ایسے آدھے ادھورے قسم کے افراد ہیں جن کے لیے فرخندہ کا گھر ذہنی اور روحانی پناہ گاہ ہے۔ یہ سب مل کر ایک دوسرے کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عجیب و غریب پورٹریٹ گیلری میں فرخندہ کو ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرخندہ آخر ہے کون؟ شریف گھرانوں کو چھوڑیے۔ اس طرح کی محفلیں تو پیشہ ور عورتوں کے یہاں بھی نہیں جما کرتیں۔ غلام عباس نے اس سوال کا جواب محسن عدیل کے حوالے سے دیا ہے جو کئی ناولوں کا مصنف ہے لیکن جسکا ایک ناول بھی منظر عام پر نہیں آسکا۔ عدیل فرخندہ کا سب سے پرانا دوست تھا" کوئی سال بھر پہلے جب وہ اپنے شوہر کی جوانمرگی کے بعد سسرال والوں کی سختیوں سے تنگ آکر بھاگ آئی تھی تو ریلوے اسٹیشن پر سب سے پہلے اسکی ملاقات عدیل سے ہی ہوئی تھی اور عدیل نے ہی اسے اس مکار بڑھیا کے چنگل سے چھڑایا تھا جو اسے کھاتے پیتے گھر میں استانی کی جگہ دلوانے کا لالچ دے کر نکال لائی تھی"۔

مطلب یہ ہوا کہ فرخندہ لاوارث اور غریب ہونے کے باوجود پڑھی لکھی اور ایک باعزت زندگی گذارنے کی خواہش مند خاتون تھی۔ اسٹیشن پر عدیل سے ملاقات فرخندہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ ایک ادیب ہونے کے ناطے عدیل جذبہ۔ انسانیت سے سرشار تھا۔ اس نے فرخندہ کو نہ صرف ایک ٹوٹا پھوٹا سا گھر کرائے پر دلوا دیا بلکہ اسکے لیے ایک سلائی مشین اور روزمرہ کام کاج کے لیے دس بارہ سال کے ایک چھوکرے کا بھی انتظام کر دیا۔

فرخندہ کی محفل میں شریک ہونے والے اسکی معمولی سی آمدنی میں برابر کے شریک تھے۔ تھوڑا بہت چندہ دے کر سب کے سب رات کا کھانا اسی کے یہاں کھاتے تھے۔ اوپر یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ فرخندہ جوان اور قبول صورت ہونے کے علاوہ بے سہارا بھی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اسکے یہاں آنے جانے والوں کے دلوں میں اسکے لیے جنسی جذبات کا جوار بھاٹا نہ اٹھتا ہوگا لیکن وہ سب کے ساتھ ایسی مادرانہ اور خواہرانہ شفقت سے پیش آتی کہ کسی کو بھی کبھی اس سے اظہار محبت کرنے کی جراءت نہیں ہوتی۔ خان صاحب مستثنیات میں سے تھے اور اسی لیے دوسرے لوگ

انہیں برادری سے خارج سمجھتے تھے۔

اسی درمیان چھوکرا غفار فرخندہ کے واحد ذریعہ۔ معاش یعنی سلائی کی مشین کے ساتھ غائب ہوگیا۔ مختلف احباب نے فرخندہ کی مدد کرنے یعنی نئی مشین خرید دینے کا وعدہ تو کیا لیکن کسی کو بھی اپنا وعدہ پورا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ہاں دوستوں کے آنے جانے اور فرخندہ کے گھر رات کا کھانا کھانے کا سلسلہ حسب دستور جاری رہا۔ دھیرے دھیرے اسکے سارے چھوٹے موٹے زیور ہی نہیں گھر کے برتن تک بک گئے۔

ایک شام جب محفل جمی ہوئی تھی مولانا اچانک ایک نووارد کے ساتھ داخل ہوئے۔ یہ نووارد فرخندہ کے تمام دوستوں کے مقابلے میں نہ صرف جداگانہ بلکہ رئیسانہ شان کا حامل تھا۔ " بلند و بالا قد، چوڑا سینہ، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں سرے کے ڈورے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں جن کو بل دیا ہوا، سر سے پیر تک دیہاتی امارت اور بانکپن کا نمونہ ....." سرخ بانات کی واسکٹ، سیاہ قیمتی شیروانی، طلائی گھڑی، چوڑی دار پاجامہ اور مخملی ٹوپی وغیرہ اس کی امارت کی ظاہری اور واضح نشانیاں تھیں۔ مولانا نے اہل محفل سے نووارد کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میر نوازش علی ان کے ہم وطن اور خاندانی رئیس تھے۔ کسی مقدمے کے سلسلے میں گاؤں سے شہر آئے ہوئے تھے۔ اچانک ان سے ملاقات ہو گئی اور وہ انہیں یہاں لے آئے۔

میر نوازش علی کی آمد سے پوری محفل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ حاضرین کے دل و دماغ پر ایک انجانا خوف سا چھا جاتا ہے۔ محسن عدیل اور دیب کمار میر صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے طنز و استہزا سے بھی کام لیتے ہیں۔ میر صاحب جیب سے پانوں کی ڈبیا نکال کر وہاں موجود لوگوں کو پان پیش کرتے ہیں لیکن کوئی بھی میر صاحب کو شکر گزار ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ آخر میں فرخندہ کو میر صاحب پر رحم آجاتا ہے اور وہ

"لائیے مجھے دیجئے"۔

کہتے ہوئے " ایک خاص ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے "ڈبیا لے لیتی ہے۔ اچانک مولانا صاحب کھانے کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ فرخ جھینپ سی جاتی ہے کیونکہ گھر میں کچھ کھلانے کے لیے موجود ہی نہیں۔ احباب مولانا کی اس سادہ لوحی پر ناراض ہو کر انہیں گھورنے لگتے ہیں۔ نوازش علی اس شام کی دعوت اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ محسن عدیل اور دیب کمار کھانے میں شریک نہیں ہوتے۔ بھٹناگر اور شکیبی وغیرہ فرخ کے کہنے سے دسترخوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس موڑ تک پہنچتے پہنچتے کہانی تقریباً اپنا آدھا سفر طے کر چکی ہوتی ہے۔ لیکن اب اس سفر کی سمت اچانک بدل جاتی ہے۔ میر صاحب ایک تجربے کار ورغلانے والے شخص Seducer کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ جہاں تک فرخندہ کا سوال ہے اسکا ماضی بھی تلخ

تجربات سے عبارت ہے اور اس کے حال کو بھی خوشگوار نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ وہ متاہل زندگی گذار چکی ہے اس لیے اسے معلوم ہے کہ ایک بھری پری عورت ہونے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ بھری پری ہونے کے لیے بھرپور زندگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اسکے یہاں آنے جانے والوں میں کوئی دم خم نہیں ہے۔ وہ سب کے سب کسی نہ کسی فرسٹریشن کا شکار اور سہارے کی تلاش میں ہیں۔

ہم نے یہ نتائج افسانوی بین السطور سے اخذ کیے ہیں۔ غلام عباس نے نہ تو فرخندہ کو یہ سب سوچتے یا کہتے ہوئے دکھایا ہے اور نہ ہی دوسرے کرداروں کے درمیان اس تعلق سے کوئی بات چیت ہوتی ہے۔ افسانے میں جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ورغلانے والا شخص یعنی seducer دو تین ملاقاتوں کے بعد منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ فرخندہ کے ساتھی سنگی کچھ عجیب سے مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف تو انہیں اس بات کی خوشی ہے کہ نوازش علی نامی بلا سے بہت جلد چھٹکارا مل گیا لیکن دوسری طرف وہ فرخندہ میں ہونے والی نمایاں تبدیلیوں کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ کہاں تو بننے سنورنے سے کوسوں دور بھاگتی تھی اور کہاں اب اس کے لباس اور چہرے سے طرح طرح کے عطریات اور غازوں کی خوشبوئیں پھوٹا کرتیں۔ اس نے گھر کے کام کاج کے لیے نوکرانی بھی رکھ لی تھی۔ گھر سے باہر قدم نہ رکھنے والی فرخندہ اب ہفتے میں دو تین دن دو دو تین تین گھنٹے غائب رہنے لگی تھی اگر کسی ایک چیز کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا تو وہ تھی نماز۔ نماز کے معاملے میں اسکا جوش و خروش پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔

اس دوپہر وہ گئی تو کافی تاخیر سے لوٹی۔ رات کے ۱۰ بج چکے تھے۔ اسکے سارے دوست شدت انتظار سے تلملا رہے تھے۔ لیکن وہ آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہیں سے آواز دی:

"مولانا صاحب! وہ ذرا پانی کا گھڑا تو اٹھا کر اندر رکھ دیجئے!" یہ جملہ سارے دوستوں کی پیٹھ پر تازیانہ بن کر پڑا۔ لیکن اگلے دن جب فرخندہ نہ کہیں باہر گئی اور نہ ہی اس نے سنگھار کیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر سبھوں کو کھلایا تو دوستوں کے دلوں سے گرد ملال چھٹ گئی۔ یہ سلسلہ چار دنوں تک چلتا رہا۔ سارے دوست خوش تھے کہ "وہ اپنی پچھلی حرکتوں سے تائب ہو کر پھر ان کی وفا شعار اور اطاعت گذار فرخ بھابھی بن گئی ہے"۔

لیکن پانچویں دن وہ پھر اچانک غائب ہو گئی۔ دس بج گئے۔ سب انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ اچانک ناول نگار محسن عدیل نے کروٹ بدلی اور مولانا سے دیگچے میں پانی بھر کر گرم کرنے کی فرمائش کی۔ مولانا کے استفسار پر اس نے سمجھایا "بات یہ ہے، اس دن وہ آئی تھیں نا رات کو، اور پھر غسل کیا تھا ناٹھنڈے پانی سے۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ میں نے سوچا بیکار

بیٹھے ہیں اور کچھ نہیں تو لگے ہاتھوں پانی ہی گرم کر دیں" ۔

یہ کہتے کہتے اس نے پہلو بدلا، اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں ۔ ان سطور کے ساتھ ہی کہانی "حمام میں" ختم ہو جاتی ہے ۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ زندگی کی طرح کہانی کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے ۔ غلام عباس یہ نہیں بتاتے کہ اس رات یا اسکے بعد فرخندہ گھر لوٹی یا نہیں، کیا وہ میر نوازش علی یا کسی اور کے ساتھ کہیں چلی گئی ۔ کیا اس نے شادی کر لی، وغیرہ ۔ ہاں اسکے سارے دوست کہانی ختم ہونے تک اسی گھر پر موجود رہتے ہیں ۔ اسکے باوجود کہ جو کچھ بھی ہوا وہ ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سبھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے ۔

غلام عباس بطور اصول نہ تو عورت اور مرد کے بیچ موجود نجی رشتے یا تعلقات کی حقیقی نوعیت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور نہ ہی رازہائے سربستہ پر سے پردہ اٹھاتے ہیں انہیں راز کو راز ہی رہنے دینے میں لطف آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیانیہ کی رفتار ہمیشہ مدھم اور سطح ہمیشہ پر سکون رہتی ہے ۔ ان کے بیشتر افسانوں میں اگر ایک خاص طرح کی رمزیت پائی جاتی ہے تو اس کا بنیادی سبب غلام عباس کا یہ ایقان ہے کہ معاشرتی اعتبار سے خواہ کوئی فرد کتنا ہی معمولی اور بے وقعت کیوں نہ نظر آئے اسکی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو، اس کا کوئی نہ کوئی مشاہدہ یا تجربہ یقیناً ایسا ہوتا ہے جو خالصتاً اس کا اپنا ہوتا ہے اور جس پر پوری طرح اس کی اپنی شخصیت کی چھاپ ہوتی ہے ۔ اسی وصف نے غلام عباس کو انسانی وجود میں پائے جانے والے مضمرات کا افسانہ نگار بنا دیا ۔ وہ عموماً فرد کے ظاہری اعمال سے زیادہ اسکی ذات میں پوشیدہ معنی کی دریافت پر زور دیتے ہیں ۔

اس طرح غلام عباس کے افسانوں کے تفصیلی مطالعے کے بعد ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ ہر فرد بجائے خود ایک جہان معنی کی سی حیثیت رکھتا ہے ۔ افراد کی انفرادیت کو انھوں نے ایسی چابکدستی اور فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے کہ ان کا ہر افسانوی کردار، ہر موضوع اور ہر تجربہ زندگی سے گہری مطابقت رکھنے کے باوجود عامیانہ (Common Place) نہیں بننے پاتا ۔

مثال کے طور پر عورت کی بے وفائی کے موضوع کو ہی لے لیجئے ۔ دنیا کی ہر زبان میں اس موضوع پر افسانے لکھے گئے ہیں ۔ اردو افسانے کے بابا آدم منشی پریم چند کے افسانے "نئی بیوی" کو اس سلسلے میں بطور مثال پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ صرف ایک جملے میں اس افسانے کا لب لباب پیش کرنا ہو تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک نوجوان عورت کی شادی ایک دولتمند لیکن ایسے معمر شخص کے ساتھ ہو جاتی ہے جو جنسی اعتبار سے اسے مطمئن نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ وہ عورت اپنے جسم کی آگ بجھانے کی خاطر گھر کے دیہاتی نوکر کی طرف راغب ہو جاتی ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی غیر فطری عمل نہیں ہے لیکن فنی برتاؤ کے لحاظ سے اسے کوئی غیر معمولی یا بےحد اہم افسانہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اسکے برخلاف اسی موضوع کو غلام عباس نے اپنے افسانے "اسکی بیوی" میں جس انداز میں برتا ہے وہ منفرد بھی ہے اور اچھوتا بھی۔

"اس کی بیوی" ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو شدید قسم کی نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہونے کے باجود کسی ذہنی یا جنسی پرورژن کا شکار نہیں ہونے پاتا۔ افسانے کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے۔

"دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے"۔

یہ تیسری منزل دراصل ایک تیسرا وجود ہے جو جسمانی طور سے موجود نہ ہونے پر بھی سوتے جاگتے ان دونوں کے درمیان موجود رہتا ہے۔ افسانے کا پچیس سالہ بے نام ہیرو نسرین نامی ایک پیشہ ور عورت کو چند دنوں کے لیے خرید لیتا ہے اور اسی کے گھر قیام کرتا ہے۔ نسرین نوجوان ہی نہیں بےحد خوبصورت بھی ہے۔ پھر اس کی پیشہ ورانہ ادائیں ستم بالائے ستم کا درجہ رکھتی ہیں لیکن نوجوان کو اسکی ہر ادا پر کسی اور عورت کی بالکل ویسی ہی ادا یاد آجاتی ہے۔ مثلاً اگر نسرین آئینے کے سامنے ایک طرز خاص سے بال سنوارتی ہے تو نوجوان اسے بتاتا ہے کہ نجمہ بھی ایسا ہی کیا کرتی تھی۔ اگر نسرین اسے گرویدہ کرنے کے لیے عطر حنا کا استعمال کرتی ہے تو وہ فوراً بول اٹھتا ہے کہ نجمہ کو بھی یہی خوشبو بہت پسند تھی۔

پہلی رات جسمانی اختلاط کے بغیر گذر جاتی ہے، جو کم از کم نسرین کے لیے غیر متوقع بلکہ انہونی قسم کی چیز ہے۔ صبح جب وہ اٹھتی ہے تو نوجوان کو غائب پاکر مطمئن ہو جاتی ہے کہ کوئی دیوانہ تھا جو مفت میں اتنی موٹی رقم دے کر چلا گیا۔ لیکن گھنٹے بھر بعد ہی نوجوان گوشت اور ترکاری کا تھیلا سنبھالے واپس آجاتا ہے۔ وہ ضد کر کے کھانا پکانے میں نسرین کا ہاتھ بٹاتا ہے اور شام میں اسے خالص گھریلو عورت کی طرح برقعہ پہنا کر اپنے ساتھ رکشہ میں شہر کی سیر کرانے لے جاتا ہے۔

دھیرے دھیرے ایک طرف اگر نسرین اسکے سنکی پن کی عادی ہو جاتی ہے تو دوسری طرف اسکے ذہن میں نوجوان کی ذاتی زندگی کے نہ خانوں تک پہنچنے کی خواہش بیدار ہو جاتی ہے کافی کرید نے کے بعد ایک رات نوجوان اس پر انکشاف کرتا ہے کہ اسکی بیوی نجمہ باوفا نہیں تھی وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ یہ بات اسے نجمہ کے نام آئے ہوئے اس خط سے معلوم ہوئی تھی جو اتفاقاً اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

"اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟" نسرین حیران ہو کر پوچھتی ہے۔

نوجوان، نسرین کو مزید بتاتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کی زندگی کے آخری لمحے تک اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اسکے راز سے واقف تھا، ہاں اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ نجمہ عالم نزع

میں اس سے کچھ کہنے اس سے کچھ بتلانے کے لیے بےچین تھی۔

اس افسانے کے آخری منظر میں غلام عباس نے بڑی مہارت کے ساتھ جنسی خواہش اور لذت پرستی کو خالص محبت کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ نسرین طوائف نہ رہ کر محض ایک عورت بن جاتی ہے۔ ساری کہانی سننے کے بعد جب وہ اسکی بغل میں لیٹتی ہے تو گہری نیند کے عالم میں نوجوان کو ایک بچے کے مانند اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی ہے۔ دوسری سطح پر اس رات نوجوان کو بھی نسرین سے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اپنی بیوی سے نہیں مل سکتا تھا اور جس کے لئے وہ ترس رہا تھا۔

افسانے کے اختتام پر ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر نجمہ نے مرنے سے پہلے عام حالات میں اپنے شوہر کو سب کچھ کیوں نہیں بتادیا۔ کیا اسے یہ خوف تھا کہ افشائے راز کے بعد وہ شوہر کی نظروں سے گر جائیگی۔ مزید یہ کہ کیا مرتے وقت اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ اب تک اپنے شوہر کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتی آئی تھی۔ کیا وہ اعتراف گناہ کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا اور سکون کی موت مرنا چاہتی تھی۔

غلام عباس ان میں سے کسی سوال کا جواب فراہم نہیں کرتے۔ سارا معاملہ قاری کے صواب دید پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس افسانے میں نہ تو نجمہ ایک مثالی عورت کے روپ میں ابھرتی ہے اور نہ اس نوجوان کو ایک مثالی مرد قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً ایک ایسی رومانویت پیدا ہو جاتی ہے جو افسانے کو ناقابل یقین بنادیتی۔

" سمجھوتہ " اسی سلسلے کا ایک نسبتاً زیادہ چونکا دینے والا افسانہ ہے۔ افسانے کا پہلا پیراگراف ہی قاری کو ششدر کر دینے کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو•••

> "پہلے پہل جب اسے پتہ چلا کہ اسکی بیوی بھاگ گئی تو وہ بھوچکا سارہ گیا۔ شادی کا پہلا ہی سال اور ایسی انہونی سی بات، کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، مگر جب بار بار اسکے کمرے میں جاکر اس کی چیزوں کو گم پایا، یہاں تک کہ اس کا بچپن کا فوٹو تک جس میں وہ ایک کبوتر کو اپنے ننھے منے ہاتھوں میں تھامے مسکرا رہی تھی، اسکی سنگھار میز پر سے غائب تھا تو شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔"

ظاہر ہے کہ یہ ایک خاصا متنازعہ فیہ بلکہ خطرناک قسم کا واقعہ ہے۔ شادی کے چند مہینوں کے اندر ہی ایک ایسے شخص کی بیوی کا بھاگ جانا، جس نے اسے جی جان سے چاہا ہو، جس کے بغیر وہ کسی پارٹی میں نہ شریک ہوا ہو اور جس کے لیے اس نے تمام پرانے دوستوں سے تعلقات منقطع کرلیے ہوں کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے۔ غلام عباس نے اس موضوع کو بڑے ہی معروضی اور غیر جذباتی انداز میں برتا ہے۔

ایک فنکار کی حیثیت سے ان کی ہمدردیاں نہ تو مرد کے ساتھ ہیں اور نہ ہی وہ عورت کو اسکی بے وفائی اور بد چلنی کے باوجود بے وقعت (Humiliate) کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جہاں تک مرد کا تعلق ہے وہ اس نازک صورتحال میں غیر معمولی نوعیت کی عملی عقل (Practical wisdom) سے کام لیتے ہوئے رشتے داروں اور دوستوں کو اس حادثے کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔

شروع شروع اسکے دل میں انتقام کی آگ بہت تیز رہتی ہے "وہ اکثر خیال ہی خیال میں اپنی بیوی کا گلا اس وقت دباتا رہتا جب تک اس کی آنکھیں باہر نہ نکل پڑتیں - پھر وہ اس بے جان جسم کو زمین پر پٹخ دیتا" ۔

لیکن دھیرے دھیرے اسے یہ سارا عمل مضحکہ خیز ہی نہیں حماقت آمیز بھی معلوم ہونے لگا ۔ ساتھ ہی ساتھ یا تو غم ہجر پر جنسی اور جسمانی دباؤ غالب آگیا یا پھر اس نے اپنی بے وفا بیوی سے انتقام لینے کی یہ ترکیب نکالی کہ قحبہ خانوں کے چکر کاٹنے اور ہر رات کسی نئی عورت کو خریدنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

چند دنوں بعد ایک صبح جب وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، کسی نے بہت ہی آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اس نے "کون ؟" کہکر درواز کھولا تو دیکھا کہ "اس کی مفرور بیوی سودائیوں کا سا حال بنائے کھڑی تھی ...."

وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی رہی ، پھر اچانک اس کے قدموں میں گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

"مجھے بخش دو ، مجھے بخش دو ..... میں جانتی ہوں اب تم مجھ سے سخت نفرت کرتے ہوگے ۔ میری صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوگے ۔ مگر میں تم سے محبت نہیں مانگتی .... میں اس لائق ہی نہیں ہوں .... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھ پر رحم کرو ، مجھے صرف اپنے گھر میں پناہ دو ، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی ۔ آہ! میں اندھی ہو گئی تھی ، مجھے بخش دو ، مجھ سے سخت فریب کیا گیا تھا ۔ "

اس کی یہ حالت دیکھ کر نوجوان کے دل میں ، بظاہر یہ تجسس بھی نہیں پیدا ہو تا کہ وہ آخر کہاں اور کس کے ساتھ بھاگی تھی ۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ عورت مکاری یا عیاری سے کام لے رہی تھی یا پھر کوئی فریبی واقعی اسے ورغلانے میں کامیاب ہو گیا تھا ۔ ان سارے سوالات کو ، بیوی کے ساتھ ہی وہ گھر کی دہلیز پر چھوڑ کر دفتر چلا جاتا ہے ۔

اسکے بعد اسکی بیوی ہر طرح اس کا خیال رکھنے لگی ۔ ہر صبح میز پر ، تازہ پھول گلدان میں سلیقے سے سجے ہوئے ملتے ، وہ غسلخانے سے نکل کر ڈریسنگ روم میں جاتا تو نیا جوڑا کیل کانٹے سے

لیس ملتا۔ رات کے کھانے پر اسکی پسندیدہ سبزیاں موجود ہوتیں۔ وہ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سوچتا کہ شاید اسے ایک بار پھر رام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن اس نے شب گردی اور عیش پرستی والا اپنا طریقہ نہ چھوڑا۔ دھیرے دھیرے تین ماہ گذر گئے۔

ایک صبح جب وہ دفتر کے لیے نکل رہا تھا تو "ایک خاتون بنفشی ساری میں ملبوس فضاؤں کو مہکاتی ہوئی اچانک اس کے پاس سے گذر گئی" یہ اس کی مفرور بیوی تھی۔

اس دن وہ صبح سے ہی کسی طوائف کے یہاں جانے کے لیے بیچین تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کی جیب بالکل خالی تھی۔ پیسوں کے لیے اس نے یوں تو کئی دوستوں کو فون کیا لیکن سبھوں نے مہینے کی آخری تاریخوں کا بہانہ بنادیا۔ وہ رات گئے تک یونہی بازار کی سیر کرتا رہا۔ اچانک اسکے ذہن میں یہ خیال کسی کوندے کے مانند لپک اٹھا کہ اسکی بیوی بے وفا ہونے کے باوجود صورت شکل کے اعتبار سے ان طوائفوں سے بہتر تھی۔ اس نے سوچا:

یہ سچ سہی کہ میری بیوی باعصمت نہیں لیکن آخر وہ عورتیں بھی کون سی عفیفہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش ہوگیا اور جن سے ملنے کے لیے میں آج بھی تڑپ رہا ہوں"۔ اسی سوچ میں غلطاں وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کی بیوی ابھی جاگ رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر جاکر لیٹ گیا۔ "اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سیڑھیوں پر سہج سہج قدم دھرتا اسکے پاس آرہا ہو"۔

اس جملے کے ساتھ ہی افسانہ ختم ہوجاتا ہے۔ آخری منزل ظاہر ہے کہ " سمجھوتہ " کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اتنے نازک موضوع پر غلام عباس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اتنا کامیاب اور موثر افسانہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا سمجھوتہ کے آغاز اور انجام دونوں میں زبردست ڈرامائیت پائی جاتی ہے۔ غلام عباس کی دوسری بہت سی کہانیوں کی طرح اس کہانی کی کامیابی کا راز کرداروں کی غیر معمولی انفرادیت میں مضمر ہے۔ سمجھوتہ کے میاں بیوی دونوں اپنی اپنی ذات میں اس حد تک منفرد ہیں کہ سماج میں ایسا "جوڑا" ڈھونڈے سے بھی نہیں مل پائے گا۔ افسانوی عمل اتنا گتھا ہوا اور اس حد تک داخلیت آمیز ہے کہ قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتا ہے کہ دونوں میں سے کس کردار کو "ہیرو" سمجھے اور کسے ولن!

جس انداز میں اور جن حالات میں میاں بیوی سمجھوتے پر مجبور ہوجاتے ہیں وہ تو سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن اس طرح کے سمجھوتے کا کوئی منطقی جواز فراہم کرنا مشکل ہے۔ غلام عباس کے بیشتر افسانوں کے مانند سمجھوتہ میں بھی کرداروں کی تعداد بیحد محدود ہے۔ سچ پوچھئے تو اس افسانے میں صرف دو ہی کردار ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ تعداد خاصی اہم ہے۔ اگر سمجھوتہ میں کوئی ایک بھی اور کردار ہوتا تو پورا افسانوی برتاؤ بدل جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ تاثر کی وحدت بھی ختم ہوجاتی۔ افسانے میں ہمیں تاثر کی جو وحدت اور شدت نظر آتی ہے اسکا واحد سبب یہی ہے کہ پورا معاملہ

میاں بیوی کے درمیان ہی محدود رہتا ہے۔

لٹی لٹائی حالت میں رحم کی بھیک مانگتی ہوئی عورت کا گھر واپس آجانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ جس سفر پر دانستہ یا ورغلائے جانے (Seduction) کے نتیجے میں روانہ ہوئی تھی وہ سفر بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ پھر شوہر جس غیر جذباتی اور پر سکون انداز میں گھر میں رہنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ اسکے مدنظر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسانی جذبات و اعمال کسی بندھے ٹکے فارمولے کے پابند نہیں ہوتے۔

بالکل یہی بات غلام عباس کے مجموعی افسانوی فن کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر "اس کی بیوی" اور "مجھوتہ" دونوں کا موضوع عورت بلکہ بیاہتا عورت کی بے وفائی ہے۔ لیکن دونوں کے برتاؤ میں بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ مجھوتہ میں اگر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جبلت، محبت سے زیادہ طاقتور محرک ہے تو "اسکی بیوی" کا مرکزی خیال جبلت یا جسمانی خواہش کے بجائے محبت سے عبارت ہے۔ اسکی بیوی کا مردہ کردار بے وفا بیوی کے انتقال کے بعد بھی اس کی یادوں کو حقیقت میں بدلنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کی طرح غلام عباس نے بھی اپنے کئی افسانوں میں عورت کو بطور موضوع برتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ہمیشہ مثالی کرداروں کے بجائے افراد پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں بے مثال موضوعاتی تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ ویسے ان کا بنیادی رویہ ایک انسانیت پرست (Humanist) کا رویہ رہتا ہے۔ انھوں نے بڑی محنت سے اپنے لیے ایک ایسا افسانوی تناظر تخلیق کیا ہے جس کی مدد سے مختلف صورت حال میں مختلف عورتوں کے دکھ سکھ، ان کے سوچنے سمجھنے کے طریقوں، ان کے مصائب، خواہشات اور تجربات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عورتوں کے جنسی استحصال کے تعلق سے غلام عباس کے افسانے "بردہ فروش" کا مفصل ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ "سایہ" اس روایتی معاشرے کی کہانی ہے جہاں عورتیں بے زبان گایوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بچپن سے ہی لڑکیوں کی پرورش و پرداخت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ زندگی کی اہم ترین قدر سمجھنے لگتی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم بھی ان لڑکیوں اور عورتوں میں وہ اخلاقی جراءت نہیں پیدا کر پاتی کہ وہ اپنے اچھے برے سے متعلق خود سوچ سکیں یا کوئی فیصلہ کر سکیں۔ ان کی سرشت میں احتجاج نام کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

"سایہ" شہر کے ایک ممتاز لیکن نودولیتے قسم کے وکیل اور ان کے اہل خاندان خصوصاً بڑی صاحبزادی کی کہانی ہے جو سبحان نامی اس غریب، شریف اور بوڑھے خوانچہ فروش کی زبانی بیان کی گئی ہے جو وکیل صاحب کی کوٹھی کے زیر سایہ خوانچہ لگاتا تھا۔

پانچ برس کے عرصے میں وہ وکیل صاحب کے کنبے سے ہی نہیں ان کے دور و نزدیک کے

رشتہ داروں سے بھی بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ اسے ان کے بارے میں ایسی باتیں بھی معلوم تھیں جو وکیل صاحب کے ہر وقت کے ملنے جلنے والے اور جگری دوست تک نہیں جانتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ اس راز سے بھی واقف تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد بڑ قصاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر انھوں نے یہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ "پردے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ، ان کی سیرت اور ان کا سبھاؤ اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں کیونکہ دوسری چھاتی میں دودھ نہیں اترتا۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نہ تو سبحان کو تاک جھانک سے دلچسپی تھی اور نہ ہی چھپا کر دوسروں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ یہ ساری تفصیل اسے گھر کی بوڑھی ملازمہ فرصت کے اوقات میں آکر سنا جایا کرتی تھی۔ باقی سب کچھ سلطان کا اپنا مشاہدہ تھا۔

سبحان آئے دن دیکھتا کہ وکیل صاحب کے کالج میں پڑھنے والے دونوں بیٹوں مختار اور شمشاد کے ساتھ ان کا ایک دوست ریاض بھی آتا اور گھر کے عین مقابل کھڑے ہو کر تینوں غپ شپ کرتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا لیکن رخصت نہ ہو پاتا، "اس دوران وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا بار بار ایک رنگین سایہ چقوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا تھا جسے سبحان کی کن انکھیوں کے سوا کوئی آنکھ نہ دیکھ پاتی۔"

"سایہ" خاصہ طویل افسانہ ہے۔ لیکن پورے افسانے میں ریاض اور بڑی صاحب زادی کے درمیان انسیت یا محبت کے بارے میں اس جملے کے علاوہ کوئی دوسرا جملہ نہیں ملتا۔ یہ اشاراتی اختصار دراصل غلام عباس کا طرہ امتیاز ہے۔ ویسے یہ ایک جملہ بھی صورتحال کی عکاسی کے لیے بہت کافی ہے۔ لفظ "سایہ" کے ساتھ "رنگین" کی صفت کا استعمال بڑی صاحبزادی کے جذبات کا غماز ہے جبکہ ریاض کا بار بار خدا حافظ کہنے کے باوجود وہاں سے نہ جا سکنا اس کے مثبت رد عمل کی نشاندھی کرتا ہے۔ لیکن دونوں کے بیچ مشرقی تہذیب، قدیم روایات اور اس زمانے کے معیار سے خاندانی وقار کی چقیں پڑی ہوئی ہیں۔

نہ تو ریاض بڑھ کر "چق اٹھانے" کی سکت رکھتا ہے اور نہ ہی بڑی صاحبزادی میں اتنی ہمت ہے کہ وہ خود چق سے باہر آجائیں۔ مختار اور شمشاد یوں تو گھنٹوں ریاض کے ساتھ افلاطون اور ارسطو کے فلسفے پر دھواں دھار بحث کرتے ہیں لیکن انھیں اپنی ناک کے نیچے کی صورتحال کی خبر نہیں لگ پاتی۔

ایک دن فرط مسرت سے سرشار بڑی بی سبحان کو اطلاع دیتی ہیں کہ بڑی بٹیا کی منگنی طے ہو گئی ہے۔ وکیل صاحب کے ہونے والے سمدھی ڈاکٹر ہیں اور یہ کہ لڑکا جس کا نام صغیر احمد ہے لیاقت کے اعتبار سے بی اے ہے۔

جلد ہی سبحان کو بڑی بٹیا کی طبیعت کے ناساز ہونے کی اطلاع ملی۔ پھر ایک دن علی الصبح

سجان کی نظر شمشاد پر پڑی جو کاندھوں پر سائیکل اٹھائے ہوئے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ اس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا اور ابھی ڈاڑھی بھی نہیں مونڈھی تھی۔ پتہ چلا کہ وہ ڈاکٹر کو بلانے جارہا تھا۔

"سجان کا ماتھا ٹھنکا۔ چھوٹے صاحبزادے جب اسکول جانے لگے تو پتہ چلا کہ رات سے باجی کی طبیعت خراب ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سرسام ہو گیا ہے"۔

اس دن شمشاد اور مختار کالج سے جلد گھر آگئے۔ شام کو حسب معمول ہاکی کھیلنے بھی نہیں گئے۔ اسی طرح نہ تو وکیل صاحب اس روز کچہری گئے اور نہ ہی چق کے پیچھے سایہ نظر آیا۔ دن ختم ہو گیا۔ سجان نے رات گئے تک ٹھیلا نہیں اٹھایا، آدھی رات کے بعد گھر گیا بھی تو نیند نہیں آئی۔ صبح تین بجے کے قریب جب ذرا اونگھنے لگا تو اچانک ایک سمت سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور وکیل صاحب کے مکان کی طرف بھاگا مگر گھر میں بدستور خاموشی تھی۔ اس نے پتھر مار کر کتے کو بھگادیا۔

چونکہ غلام عباس اپنے عمومی افسانوی طریق کار کے اعتبار سے "صفر انجام" (Zero Ending) کے قائل تھے اس لیے اس افسانے میں بھی وہ قاری کو یہ نہیں بتاتے کہ اس صبح کے بعد کیا ہوا۔ گھر والوں کو بڑی بٹیا کی بیماری کے حقیقی سبب کا علم ہو پایا یا نہیں، اسکی شادی آخر کار کس کے ساتھ ہوئی۔ البتہ افسانہ نگار نے افسانے کے آخر میں دو ایسے اہم اشارے ضرور کیے ہیں جن سے قاری اپنے طور پر کچھ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ علی الصبح کسی گھر کے سامنے کتے کا بھونکنا بدشگونی کی علامت ہے۔ روایتی عقیدے کے مطابق اسے موت کا اعلان بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن افسانے کی آخری سطر میں چونکہ سجان کتے کو پتھر مار کر بھگادیتا ہے اس لیے بظاہر یہ خطرہ ٹل جاتا ہے۔ دوسرا اشارہ "سرسام" نامی بیماری ہے جس کا بڑی بٹیا کے لیے انتخاب کر کے غلام عباس نے زبردست فنی مہارت اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ "سرسام" کا مریض مسلسل بڑبڑاتا رہتا ہے اور غیر شعوری طور سے شعور اور لاشعور میں موجود تمام رازوں کو اگل دیتا ہے۔ اس طرح ان کی شادی صغیر کے ساتھ ہوئی ہو یا نہیں لیکن ان کے گھر والے بیماری کے دوران ان کے حقیقی جذبات سے ضرور واقف ہو گئے ہونگے۔ بڑی صاحبزادی کی بیماری کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ریاض کی محبت میں مبتلا ہونے کے باوجود لمحے بھر کے لیے بھی ماں باپ کے تئیں مکمل اطاعت گذاری اور خاندانی وقار کے مطالبات کے تعلق سے اپنی اخلاقی ذمے داری کو فراموش نہیں کر پاتی۔ اس کی بیماری اپنی داخلی حسیت اور اپنے دلی جذبات پر شعوری قابو پانے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس کے دل میں ریاض کے لیے جو جوار بھاٹا اٹھتا ہے اسے اس کی نسوانیت دبادیتی ہے۔ وہ خود اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ بے ایمانی کی مرتکب ہوتی ہے لیکن اسے ماں باپ کا دل دکھانا منظور نہیں ہے۔

"سیاہ و سفید" بھی روایتی مسلم معاشرے سے وابستہ اخلاقی نظام کی کہانی ہے۔ میمونہ بیگم ایک چھوٹے سے قصبے کے اسکول میں استانی ہے۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اسکے قریبی عزیزوں میں صرف ایک بڑی بہن ساجدہ ہے جو دور دراز کے کسی مقام پر اپنے شوہر اور بال بچوں میں مگن ہے۔ ادھر میمونہ کے بالوں میں چاندی کا اضافہ ہونے لگتا ہے۔ وہ آئے دن بڑے انہماک کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سر سے نقرئی بالوں کو اکھاڑتی رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ میمونہ کے جذبات ابھی تک سرد نہیں ہوئے اور اسکے دل میں گھر بسانے کی لگن موجود ہے۔ یہی لگن اسے چھٹیوں میں بڑی بہن کے پاس دہلی لیجاتی ہے۔

ایک شام جب وہ تنہا کناٹ پلیس پر گھوم رہی ہوتی ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ ایک شریف صورت نوجوان کچھ فاصلے سے اسے گھور رہا ہے۔ وہ جدھر جدھر جاتی ہے نوجوان پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ میمونہ بھی اس میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ لیکن اگلی شام جب وہ پھر اسی مقام پر پہنچتی ہے تو وہی بظاہر شریف صورت نوجوان اپنے لچے لفنگے قسم کے دوستوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ میمونہ کو دیکھتے ہی وہ جس قسم کی اوباش حرکات و سکنات کا مظاہرہ کرتا ہے اس سے میمونہ سہم جاتی ہے اور تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹنے لگتی ہے۔ نوجوان آہیں بھرتا اور فحش جملے چست کرتا ہوا اسکا پیچھا کرتا ہے۔ گرتی پڑتی میمونہ کسی طرح گھر تو پہنچ جاتی ہے لیکن دوسرے ہی دن دہلی سے اپنے گاؤں روانہ ہو جاتی ہے۔

اس کے باوجود کہ ہم میمونہ کو مثالی یا ماڈل نہیں کہہ سکتے۔ وہ یقیناً اس متوسط طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جس کی اکثریت طبعی لحاظ سے "نروس" ہوتی ہے۔ اس طبقے کے لوگ ساری زندگی جدوجہد کرتے ہیں۔ بیشتر ناکام رہتے ہیں لیکن کسی بھی حال میں ذاتی وقار (Grace) کا دامن ہاتھ نہیں چھوڑتے۔

متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افسانوں مثلاً "بحران" "جوار بھاٹا" "غازی مرد" "ہمسائے" "فینسی ہیئر کٹنگ سیلون" وغیرہ یوں تو سب کے سب کسی نہ کسی پہلو سے منفرد ہیں اور روٹی کپڑا اور مکان سے ہٹ کر بھی اس طبقے کے افراد کو درپیش مسائل سے بحث کرتے ہیں لیکن ان افسانوں میں "کتبہ" کو یقیناً خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک سیدھا سادہ اور براہ راست قسم کا افسانہ ہے۔ غلام عباس نے اپنی افسانوی عادت کے مطابق "کتبہ" میں متوسط طبقے کی بے کسی، ناکام آرزوؤں، دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جانے والی خواہشوں اور مجموعی اعتبار سے بے کیف و بے لطف زندگی کو جس دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے، اسے سبھی نقادوں نے بجا طور پر سراہا اور اسکی داد دی ہے۔

"کتبہ" شریف حسین نامی اس کلرک کی کہانی ہے جس کی ماہانہ تنخواہ سے بیوی بچوں کے لیے دو وقت کی روکھی سوکھی کا تو کسی طرح انتظام ہو جاتا ہے لیکن جب مہینے کے ابتدائی چار پانچ

دنوں کو چھوڑ کر جب وہ منی سواری والے تانگے میں بیٹھ کر خوش ہولیتا ہے، سارا مہینہ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک کی خاصی طویل مسافت پیدل طے کرنی پڑتی ہے۔

اسی درمیان ایک دن جب اسکی بیوی معہ بچوں کے اپنے مائکے گئی ہوئی تھی اور اسے گھر پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور نہ ہی گھر میں کوئی ایسا اثاثہ تھا جس کی حفاظت کی فکر اسے لاحق ہوتی وہ شام میں دفتر سے چھوٹ کر خراماں خراماں ٹہلتا ہوا گھر جارہا تھا۔ جامع مسجد سے گذرتے ہوئے اسکی نظر اچانک سنگ مرمر کے ایک صاف و شفاف اور خوبصورت ٹکڑے پر پڑگئی جو ایک کباڑی کی دوکان پر رکھا ہوا تھا۔ شریف حسین نے یونہی شوقیہ اس ٹکڑے کے دام پوچھ لیے۔

"تین روپئے!" سنکر وہ آگے بڑھ گیا لیکن کباڑی کے یہ کہنے پر کہ "کیوں حضرت! چل دیے؟ آپ بتادیجئے کیا دیجئے گا!" اسکے قدم رک گئے۔ ہماشما جانتے ہیں کہ متوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی عزت کا کچھ زیادہ ہی خیال ہوتا ہے۔ شریف حسین نے بھی اس "خوف" سے کہ کہیں کباڑی اسے کنگال نہ سمجھ لے "ایک روپیہ!" کہہ دیا۔

شریف حسین کو یقین تھا کہ کباڑی اتنے کم دام قبول نہیں کرے گا اور اس طرح وہ وہاں سے اپنی عزت بچاکر بھاگ لینے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن شومئ قسمت سے کباڑی سنگ مرمر کا وہ ٹکڑا ایک روپئے میں ہی دینے کو تیار ہوگیا۔ اسے طوعاً و کرہاً خریدنا پڑا۔ اسکے ساتھ ہی شریف حسین کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ وہ اس ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرالے اور اسے اپنے گھر کے باہر "نیم پلیٹ" کے طور پر لگادے۔ قریب ہی ایک سنگ تراش کی دوکان تھی جہاں چند آنوں میں یہ کام بھی ہوگیا۔

گھر پہنچنے پر شریف حسین پر پہلی بار "یہ انکشاف ہوا کہ اسکے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ نہیں کہ اس پر بورڈ لگایا جاسکے"۔ چنانچہ اس نے اپنی کوٹھری کی اس واحد الماری میں جس کے کواڑ بھی نہیں تھے۔ اس مرمریں ٹکڑے کو ڈال دیا۔ شریف حسین ساری عمر یہ خواب دیکھتا رہا کہ کسی طرح اسے ساجھے کے اس گھر سے نجات مل جائے اور وہ چھوٹا موٹا ہی سہی لیکن اپنا ذاتی مکان بنوالے جس پر وہ اپنے نام کی تختی چسپاں کرسکے۔ یہ سوچتے سوچتے شریف حسین بڈھا ہوکر ملازمت سے سبکدوش ہوگیا لیکن مکان بنوانے کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔

پنشن کے کوئی تین برس بعد نمونیا کی بیماری میں شریف حسین کا انتقال بھی ہوگیا۔ اس کی موت کے بعد جب اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرارہا تھا تو اسکی نظر اچانک اس مرمریں ٹکڑے پر پڑگئی جس پر اسکے باپ کا نام کھدا ہوا تھا۔ بیٹے کی آنکھ میں آنسو آگئے۔

"اگلے روز وہ کتبہ کو ایک سنگتراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کردیا"۔

ایک کلرک کا کلرک بیٹا اپنے متوفی باپ کے لیے اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

"کتبہ" میں غلام عباس نے متوسط طبقے کے مصائب اور مسائل کی بھرپور ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ کس طرح اس طبقے کے افراد ساری عمر بہتر اور نسبتاً خوشحال زندگی کے خواب دیکھنے اور اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کی جد و جہد کرنے میں بسر کر دیتے ہیں۔ لیکن بالآخر موت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بسا اوقات یہ سلسلہ نسل در نسل ایک ہی انداز میں چلتا رہتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ عام طور پر اپنے بچوں کے لیے غربت اور بیکسی کا ورثہ ہی چھوڑ پاتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم شریف حسین کو انفرادی کردار کے علاوہ ایک ایسا مثالی کردار بھی کہہ سکتے ہیں جو اپنے طبقے کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

"کتبہ" اپنی افسانوی تکنیک میں غلام عباس کے زیادہ تر افسانوں سے الگ ہے۔ اس افسانے میں تاثر پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے پوری بات گھڑی ہے۔ بصورت دیگر یعنی عام طور سے، وہ اپنے استاد معنوی یعنی چیخف کی طرح اپنے کرداروں سے متعلق مسائل کا بیان تو نہایت ہی گٹھے ہوئے (Compact) انداز میں کرتے ہیں، لیکن مسائل کا حل نہیں بتاتے اسی طرح واقعات کے بیان میں وہ کہیں بھی اپنی مصنف والی حیثیت کا فائدہ اٹھاکر دخل در معقولات سے کام لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ کرداروں کے ارتقا اور انہیں خاطر خواہ موثر بناکر پیش کرنے پر اپنی پوری فنی مہارت صرف کرنے کے قائل ہیں لیکن نہ تو وہ کرداروں کو اپنی مرضی کے مطابق سانچوں میں ڈھالتے ہیں اور نہ ہی ان کے راستوں یا ان کی منزل کا تعین کرتے ہیں۔ کرداروں کے تعلق سے ان کا رویہ ہمیشہ ایک غیر جانب دار مشاہد کا رویہ ہوتا ہے۔ اس معاملے میں وہ اپنے تمام مشہور ہم عصروں سے بالکل الگ اور منفرد نظر آتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ انھوں نے قبولیت عام کو مد نظر رکھتے ہوئے افسانے نہیں لکھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انھوں نے لکھتے ہوئے شعوری طور پر کبھی بھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ بازار میں کس طرح کی کہانیاں زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔

مثال کے طور پر تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات بیشتر افسانہ نگاروں کے لیے مصرع طرح کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس طرح طرحی مشاعروں کے لیے لکھی گئی بعض غزلیں بے حد کامیاب ثابت ہوئی ہیں بالکل اسی طرح بیدی (لاجونتی) منٹو (کھول دو) اور کرشن چندر (ہم وحشی ہیں) اس موضوع پر لازوال افسانے سپرد قلم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن غلام عباس اپنی تمام انسانی ہمدردی کے باوجود اس طرحی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ آگے چل کر جب انھوں نے بقول شمیم احمد پاکستانی حکام یا پھر پاکستانی عوام کے ایک مخصوص طبقے کو خوش کرنے کے لیے "سرخ جلوس" "چکپ" "اوتار" اور "دھنک" جیسی کہانیاں لکھیں بھی تو انہیں زبردست ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ چاہیں تو اسے غلام عباس کی کمزوری کہہ لیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہنگامی مسائل پر فنی مہارت کے ساتھ لکھنا نہ تو ان کے بس کی بات تھی اور نہ ہی یہ ان کا میدان تھا۔ اس

خاص تناظر میں ،بیدی اور منٹو یقیناً غلام عباس کے مقابلے میں بڑے افسانہ نگار ہی نہیں بڑے فنکار بھی ہیں ۔

مندرجہ بالا سطور میں ،ہم یہ بات ایک سے زائد بار کہہ چکے ہیں کہ غلام عباس کے کردار اپنی تمامتر انفرادیت کے باوجود بیحد عام اور معمولی ہوتے ہیں ۔ ان کا تعلق روزمرہ کی عام زندگی سے ہی ہوتا ہے ۔ ان کے افسانوں کے واقعات بھی عام زندگی سے ہی ماخوذ ہوتے ہیں ۔ چونکہ وہ اپنے کرداروں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے اس لیے ان کے بعض کردار فنتاسی کی پیداوار نہ ہونے کے باوجود انفرادی سنکی پن کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ غلام عباس کا کمال یہ ہے کہ وہ اس سنکی پن کو بھی فن کی اعلیٰ بلندیوں تک پہنچانے پر قادر تھے ۔ مختلف اقسام کی سنک بھی ،بہر حال عام زندگی کا ایک اہم پہلو ہی ہے ۔ مثال کے طور پر "بھنور" کے حاجی شفاعت احمد جن کے یہاں طوائفوں کی اصلاح کرنے اور انہیں سدھارنے کا شوق جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ اپنے مشن میں زمین ،جائیداد ،مکان ،کھیت ،سب کچھ کھو کر بھی اس "بھنور" سے نہیں نکل پاتے ان کا تعلق بھی حقیقی دنیا سے ،بہر حال برقرار رہتا ہے ۔ اس عمل میں جس طرح طوائفیں شفاعت احمد کا تمسخر اڑاتی ہیں اور ان سے لپٹتی جھپٹتی ہیں اس پر سنجیدہ سے سنجیدہ قاری بھی زیر لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ مگر اس سے ،بہر حال ان اقدار کی اہمیت کم نہیں ہوتی جن کے لیے حاجی صاحب نے اپنا سب کچھ گنوا دیا ۔ بھلے ہی حاجی شفاعت احمد جیسے لوگ انجام کار مایوسی اور ناکامی کا شکار ہو جائیں لیکن غلام عباس کے یہ افسانے یقینی طور سے ،ہمارے تجربات و مشاہدات میں اضافے کے مترادف ،ہیں ۔

غلام عباس کے افسانوی ادب میں "آنندی" کو جو حیثیت حاصل ہے اس سے افسانے کے سبھی قارئین واقف ،ہیں ۔ اس افسانے کے تعلق سے انتظار حسین کی رائے مضمون کی ابتداء میں نقل کی جا چکی ہے ۔ میں نے جان بوجھ کر آنندی سے ،بحث نہیں کی ہے ۔ ویسے میری ناچیز رائے میں ان کا افسانہ "کن رس "آنندی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر تخلیق ہے ۔ ممتاز شیریں نے اپنے مضمون "تکنیک کا تنوع ۔۔۔ ناول اور افسانے میں" میں "آنندی" کا تنقیدی خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

> "آنندی میں ایک اجتماعی احساس اور وسعت ہے ۔ اس میں ایک یا دو کردار نہیں ،بلکہ پورا شہر آنندی کا کردار ہے اور غلام عباس نے اسے اپنی ساری گہما گہمی کے ساتھ رستا بستا دکھایا ہے ۔ یہ شہر اجڑ کر دوسری جگہ بس جاتا ہے ۔ اس بسنے میں مجموعی نقل مکانی نہیں ہے ،بلکہ آہستہ آہستہ یہ شہر بستا ہے ۔" بازار حسن "کے مرکز کے اردگرد ایک بارونق شہر کے بننے میں بیس سال لگ جاتے ہیں ---- شہر کے بس جانے پر کہانی ختم نہیں ،ہوتی ،بلکہ ایک پورے دائرے

میں گھوم کر پھر نقطہ آغاز پر آجاتی ہے۔ اس نئے شہر کے بلدیہ میں بھی ایک ریزولیوشن پیش ہو رہا ہے کہ زنان بازاری کا عین وسط شہر میں رہنا برے اثرات پیدا کر رہا ہے، اور انہیں شہر بدر کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ اس بار جو قطعہ زمین ان کے لیے تجویز کیا گیا وہ پہلے سے دگنے فاصلے پر تھا۔ اور پھر فنکار نے آخری جملے میں یہ اشارہ بھی چھپا رکھا ہے کہ خواہ یہ فاصلہ اس سے دس گنا بڑھ جائے لیکن یہی داستان ہر دفعہ دہرائی جائیگی۔ اور یہ قطعہ بازار حسن کو وسط میں لیے ہوئے پھر ایک بار رونق شہر میں تبدیل ہو جائے گا۔"

آنندی دراصل افسانے سے زیادہ ایک طرح کی عمرانی تاریخ ہے۔ افسانے کے ذریعے غلام عباس نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ روایتی اخلاقی معیارات کے مطابق نیکی اور بدی کے جو تصورات ہیں وہ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بسااوقات بدی نیکی کے مقابلے میں زیادہ پر کشش ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی اخلاقیات کے ٹھیکے دار بار بار بازار حسن کو شہر کے وسط سے دور لیجاکر بساتے ہیں لیکن ہر بار وہ جگہ ایک بار رونق شہر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کا خالص سکولر عمل ہے۔

چونکہ ہمارے آپ کے دور کا قاری اجتماعی نفسیات پر انفرادی مسائل اور الجھنوں کو ترجیح دیتا ہے اور چونکہ فی زمانہ سماجی منظر نگاری کے مقابلے میں انفرادی ذات کی کشمکش زیادہ اہمیت کی حامل ہے اس لیے فطری طور پر ہمیں "کن رس" میں زیادہ افسانوی کشش محسوس ہوتی ہے۔

عام طور پر غلام عباس اپنے افسانوں کے عنوانات اور موضوعات کی تشریح سے گریز کرتے ہیں۔ بہت سے افسانوں میں تو آخری پیراگراف یا آخری سطر پڑھنے کے بعد ہی قاری پر عنوان کا بھید کھلتا ہے لیکن چونکہ "کن رس" کی اصطلاح عام فہم نہیں ہے اس لیے غلام عباس نے اس افسانے کا آغاز یوں کیا ہے۔

"بعض لوگوں کو گانے بجانے سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ خود چاہے بے سرے ہی کیوں نہ ہوں مگر سریلی آواز پر جان دیتے ہیں۔ راگ ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں جیسے کسی کو کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحب ثروت ہوئے تو عمر بھر گونیوں کی پرورش کرتے رہے نہیں تو استادوں کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی اپنے ذوق کی تسکین کر لی۔ دراصل انہی لوگوں کے لیے موسیقی روح کی غذا کی مصداق ہوتی ہے"۔

غلام عباس کو بذات خود موسیقی سے زبردست اور فطری لگاؤ تھا۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے اوائل عمری میں ہی موسیقی میں ایسی مہارت پیدا کر لی تھی کہ انہیں ۱۰۰ روپئے

ماہانہ پر وائلن سکھانے کی نوکری مل گئی تھی لیکن موسیقی کے شوق پر ادب کا ذوق غالب آگیا اور انھوں نے سو روپئے کی نوکری گنوا کر ۴۰ روپئے ماہانہ پر ایک رسالے کی ادارت قبول کر لی۔

میرے نزدیک "کن رس" کے ہیرو فیاض کو غلام عباس کا Protoypeسمجھنا یا کہنا تو مناسب نہیں ہو گا لیکن اس افسانے کے توسط سے انھوں نے موسیقی کے شوق کو انتہائی عروج پر ضرور پہنچادیا ہے۔ فیاض کا المیہ یہ تھا کہ وہ ایک بے حد غریب گھرانے میں ہی پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا گھرانہ بڑا مذہبی اور صوم و صلوۃ کا پابند تھا۔ فیاض کو بچپن سے ہی حمد اور نعت ترنم سے پڑھنے کے علاوہ قوالی کی محفلوں میں شریک ہونے کا شوق تھا۔ چوری چھپے وہ کبھی کبھار ایسے پارسی ڈرامے بھی دیکھ لیتا تھا جس میں شروع سے آخر تک گانے ہی گانے ہوتے تھے۔ فیاض ابھی کالج میں ہی تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ پھر اس کی شادی بھی ہو گئی۔ تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد اسے محکمہ آبکاری میں ملازمت مل گئی اور وہ موسیقی کو یکسر فراموش کر کے ایک روایتی شریف آدمی کی زندگی جینے میں مصروف ہو گیا۔

> "ایک دن وہ اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں کسی ساز کے بجنے کی دھیمی دھیمی آواز پڑنی شروع ہوئی۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس نے بجلی کے ہنڈے کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے قریب ہی باغ کے ایک گوشے میں کوئی شخص فقیروں جیسی گدڑی اوڑھے ایک بڑا سا ساز بجا رہا ہے۔"

یہ استاد حیدری خان تھے جو اپنے تمام کمال کے باوجود زمانے کی ناقدری کا شکار ہو گئے تھے۔ فیاض کے وجود میں سرایت کیا ہوا موسیقی کا شوق اچانک کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔ وہ خاں صاحب کو اپنے گھر لے آیا۔ ہر رات دفتر سے واپسی پر سرود سیکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فیاض کی بیوی نے ابتداء میں یہ کہکر احتجاج کیا کہ "یہ ایکایکی کیسا شوق لگ گیا ہے تمہیں۔ ڈوم دھاڑی بنو گے۔؟" لیکن فیاض کا شوق رفتہ رفتہ جنون میں بدل گیا۔ اس حد تک کہ حیدری خان کے کہنے پر اس نے اپنی بیٹیوں نجمہ اور سلیمہ کو رقص کی تعلیم دلوانی شروع کر دی۔ وہ شریفوں کا محلہ تھا اور فیاض کے گھر پر جو بھی ہو رہا تھا وہ شرفا کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ آخر ایک دن محلے کی مسجد کے پیش امام صاحب نے نہایت ہی نرمی کے ساتھ فیاض سے مکان خالی کر دینے کی درخواست کی۔

استاد حیدری خاں نے دو چار دنوں کے اندر ہی فیاض کو یہ خوشخبری سنائی کہ انھوں نے ایک ایسے علاقے میں اس کے لیے دو کمروں کا فلیٹ ڈھونڈ لیا ہے جہاں اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو گا۔ فیاض، اصغری، نجمہ اور سلیمہ، استاد حیدری خان کی رہنمائی میں فوراً ہی اس فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ استاد فیاض کو یہ کہہ کر کہ "اندر سے کنڈی لگالینا ۔ ۔ ۔ جب تک میں نہ آؤں کنڈی

نہ کھولنا۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں" الٹے پاؤں سیڑھیاں اتر گئے"

چونکہ چاروں بیحد تھکے ہوئے تھے اس لیے فوراً ہی سو گئے اور دو ڈھائی گھنٹے بے خبر خراٹے بھرتے رہے۔ سب سے پہلے فیاض بیدار ہوا۔ بیدار ہوتے ہی فیاض نے "خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ مگر اس خیال سے اس نے روشنی نہ کی کہ کہیں اصغری اور بچیوں کی نیند نہ اچٹ جائے۔ وہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بالکونی کی طرف گیا اور اس کے اپنی کٹہرے پر جھک کر اس نواح کی سیر دیکھنے لگا۔"۔

اب فیاض نے جو نقشہ دیکھا وہ خاص حیران کن تھا۔ آس پاس کے تمام فلیٹوں میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے والے کمرے میں اجلی چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا باندان، خاصدان، تپچوان سب سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہاں کسی پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مکینوں اور مہمانوں کا البتہ ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا۔

فیاض نے جب کمرے سے نظر ہٹا کر نیچے کی طرف دیکھا تو اسے اور بھی حیرت ہوئی۔ وہ دو کانیں جن میں اس نے سہ پہر کو آٹا، دال، چاول، گوشت اور سبزی فروخت ہوتے ہوئے دیکھا تھا بند ہو چکی تھیں۔ ان کے بجائے کہیں پھولوں کے گجرے دکھائی دیے تو کہیں عطر کی رنگ برنگی شیشیاں نظر آئیں۔ کسی دوکان کے سامنے انواع و اقسام کی مٹھائیوں کے تھال سجے ہوئے تھے تو کہیں نظر بندی کا تماشا ہو رہا تھا۔ غرض کہ پوری گلی میں میلے کا سا سماں تھا۔

"فیاض کو اپنے فلیٹ کے سامنے جو کمرہ خالی نظر آیا تھا اب اس میں چہل پہل ہونے لگی تھی لوگ آتے جاتے تھے اور گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھتے جاتے تھے۔ یکبارگی طبلے پر تھاپ پڑی اور ایک غیرت ناہید روپہلی پیشواز پہنے چھم سے محفل میں کودی اور نرت کرنے لگی۔۔۔۔"

"فیاض ایک حیرت" کے عالم میں بالکونی پر کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں کوئی سایہ سا اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ فیاض کچھ لمحے ساکت و جامد کھڑا رہا۔ سائے نے بھی حرکت نہ کی۔ آخر اس نے گردن پھیر کر دیکھا تو وہ اس کی بیوی اصغری تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "کن رس" کے آخری مراحل سے گذرتے ہوئے ہمیں "آنندی" یاد آجاتا ہے۔ لیکن تکنیک اور برتاؤ دونوں اعتبار سے "آنندی" اور "کن رس" میں کافی فرق ہے۔ آنندی کا بنیادی تعلق اجتماعی نفسیات اور شہری اخلاقیات کے ایک مخصوص پہلو سے ہے جبکہ "کن رس" ایک ایسا غنائی المیہ Lyrical Tragedy، جس کی ہر سطر کسی غمگین اور دل ہلا دینے والی دھن سے مشابہت رکھتی ہے۔

غلام عباس نے شروع سے آخر تک افسانے کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ موسیقی کے تعلق سے فیاض کے فطری لگاؤ کی تکمیل استاد حیدری خان کی شکل میں ہوتی ہے۔ اسے بجا طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا دیرینہ خواب شرمندہ، تعبیر ہو گیا ہے۔

حیدری خان کے طور طریقوں (Mannerism) کو غلام عباس نے بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے ۔ اصغری ایک ایسی مشرقی عورت کی علامت ہے جس کے بدن پر ہی نہیں روح پر بھی اس کے مجازی خدا کی حکمرانی ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں تو وہ فیاض کے بدلے ہوئے رویے کے خلاف احتجاج کرتی ہے لیکن بھرپورے خلوص کے ساتھ شوہر کے سامنے سپرڈال دیتی ہے ۔ نجمہ اور سلیمہ دونوں بچیاں معصومیت کے جیتے جاگتے پیکر ہیں ۔ وہ جس خشوع و خضوع کے ساتھ کلام پاک پڑھتی ہیں بالکل اسی انداز میں ناچ گانے کی تعلیم بھی حاصل کرتی ہیں

اگرچہ کہ فیاض اپنے شوق اور استاد حیدری خان کی بدولت شرفاء کے محلے سے اٹھ کر بازار حسن میں آجاتا ہے لیکن پورے افسانے میں ایک بھی جملہ ایسا نہیں ہے جو خان صاحب کی بدنیتی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ وہ جس طبقے کے نمائندے ہیں اس کے مطابق غریب خاندانوں کی لڑکیوں کا مستقبل اسی طرح سنوارا جاسکتا ہے ۔

فیاض کا پورا سفر اگرچہ کہ معنویت سے بے معنویت کی طرف ہے لیکن دراصل وہ ایک سحرزدہ زندگی بسر کررہا ہے ۔ یہ سحر آخرکار ڈھائی گھنٹے کی نیند کے بعد ٹوٹا جب وہ سوکر اٹھا اور "خود کو گھٹاٹوپ اندھیرے میں پایا" ۔ یہ جملہ درحقیقت افسانے کا کلیدی جملہ ہے ۔ جس محلے میں چاروں طرف روشنیاں ہی روشنیاں ہوں وہاں فیاض کا خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پانا اس بات کا ثبوت ہے کہ واقعی اس کی آنکھ کھل چکی ہے ۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ غیرارادی اور غیر رضاکارانہ طور سے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے افراد خانہ کی بربادی کا سبب بھی بن چکا ہے ۔ مستقبل اچانک اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر آکھڑا ہوتا ہے ۔

فیاض کی بیوی اندھیرے میں سائے کی طرح اس کے پیچھے آکر کھڑی ہوجاتی ہے ۔ دونوں خاموش ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے احساسات کو کچھ ہی نہیں سن بھی سکتے ہیں ۔ اگر اس کے بعد غلام عباس ایک جملہ بھی لکھ دیتے تو افسانے کا تاثر مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکتا ۔ فیاض اور اصغری کی خاموشی حالات کے سامنے سپرڈالدینے کی علامت نہیں بلکہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خود کو اور اپنی بچیوں کو اس اندھکار سے نکالنے کی بابت سنجیدگی سے غور کررہے ہیں ۔

غلام عباس خواہ "کن رس" جیسا دردمندی سے بھرپور افسانہ لکھیں یا "کتبہ" "سیاہ و سفید" اور "اندھیرے میں" جیسے افسانوں میں متوسط طبقے کے مسائل و مصائب کو پیش کریں "ایک دردمند دل" میں ان غیرملکی مہاجرین (N.R.I.S) کے مسئلے سے بحث کریں جن پر وطن سے بے وفائی کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ یا "بامبے والا" اور "جواری" جیسے ہلکے پھلکے مزاحیہ کرداروں کی تصویر کشی کریں وہ حالات و واقعات سے زیادہ انسانی احساسات اور انسانی جبلتوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں ۔

حالات اور واقعات کے رخ وقت اور آگے بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن احساسات و جذبات اور انسانی جبلتوں کا ارتباط ہر زمانے میں یکساں طور سے قائم رہتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غلام عباس کے وہ افسانے بھی جنہیں لکھے ہوئے پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے ،ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے مربوط نظر آتے ہیں ۔ غلام عباس ایک بڑے افسانہ نگار ہی نہیں ایک بڑے فنکار بھی تھے ۔ یہی بات بیدی اور منٹو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے ۔ افسانہ نگاری تو افسانہ نگار کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے ،فنکاری کا تناظر ہر دور میں بدل جاتا ہے لیکن اس کی تازگی اور شادابی میں فرق نہیں آتا ۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانے آج بھی ،ہمیشہ کی طرح تازہ اور شاداب نظر آتے ہیں ۔

-•-•-•-•-•-•-•-•-•-•-•-

حمید نسیم

عزیز حامد مدنی۔ شاعر فردا

عزیز حامد مدنی ریڈیو پاکستان میں ۱۹۵۰ء کے فیڈرل پبلک سروس کے مقابلے میں پروگرام ایگزیکٹو کی اسامی کے لئے منتخب ہوئے۔ علاؤ الدین کلیم مرحوم بھی جو باصلاحیت شاعر تھے مدنی کے ساتھ اس نوکری کے لئے چنے گئے۔ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر منتخب ہوا۔ اور سارے سینئر اسسٹنٹ ڈائرکٹروں سے میرا نام اوپر تھا۔ مدنی کراچی اسٹیشن پر لگائے گئے جو ابھی انٹیلی جینس اسکول میں تھا۔ اور میں بندر روڈ والی عمارت میں آگیا تھا کہ خارجی نشریات کا شعبہ جس میں مجھے بھیجا گیا اور سنٹرل نیوز آرگنائزیشن جہیں سے اپنے پروگرام اور خبریں نشر کرتے تھے۔ دو عارضی اسٹوڈیو یہاں بنا دیے گئے تھے سو کام چلتا رہا۔ میں ۱۹۵۱ء میں ترقی پاکر ڈائرکٹر پروگرامز کی حیثیت سے صدر دفتر میں چلا گیا۔

۱۹۵۱ء میں جب کراچی اسٹیشن موجودہ بلڈنگ میں منتقل ہوا تو مدنی اور کلیم کا پشاور ٹرانسفر ہوگیا۔ سو میں مدنی سے پہلی بار ۱۹۵۴ء میں ملا۔ ایک دن میں بخاری صاحب کے ساتھ کسی محکمانہ میٹنگ کے لئے ریڈیو اسٹیشن گیا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک خوش چہرہ نوجوان نظر آیا۔ بخاری صاحب نے کار سے سر باہر نکالا اور اپنی نہایت دلکش اور توانا آواز میں شعر پڑھا:

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

میں شعر سن کر تڑپ گیا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟ بخاری صاحب کہنے لگے اس نوجوان کا جو ہماری طرف آرہا ہے۔ بڑا جاذب، نظر جوان تھا۔ ذہانت اور وجدان کی ایک نیم نمایاں مستقل کیفیت، آنکھوں کی تیز روشنی میں اندرونی اضطرار کی ایک رو۔ غیر معمولی شخصیت کا برملا تاثر دے رہی

تھی ۔ میانہ قامت ، ابھی جسم بھرا نہ تھا ۔ قریب آکر اس نوجوان نے بڑی شائستگی مگر فطری دوستداری سے آداب کہا ۔ بخاری صاحب نے فرمایا یہ عزیز حامد مدنی ہیں ۔ پشاور سے تبدیل ہو کر بطور اے آر ڈی کراچی اسٹیشن پر آگئے ہیں ۔ سو اب ان سے تمہاری ملاقات ہوتی رہے گی ۔ پھر مدنی سے کہا یہ حمید نسیم ہیں ۔ مدنی نے کہا جی نام سے واقف ہوں ۔ میں کار سے نیچے اتر آیا تھا ۔ آگے بڑھ کر ان سے معانقہ کیا اور کہا جو ایسا بڑا شعر کہہ سکتا ہے وہ یقیناً عظیم جوہر لے کر آیا ہے ۔ آپ سے نیاز مندی کی نسبت میرے لئے وجہ اعزاز ہوگی ۔ کیسا معصوم آدمی تھا ۔ میری بات سن کر شرما گیا ۔ اس ادائے شرم میں نوخیز راجپوت لڑکی کی سی سچائی تھی ۔ میرے دل نے کہا شاعر تو کرشمہ ساز ہے ہی ۔ اس کے اندر کا آدمی بھی بہت خوبصورت ہے ۔

عزیز حامد مدنی سے ایک عمیق تعلق خاطر ۔ التفات و گریز کا انداز لئے ہوئے (اس کی طرف سے) ایک رفاقت اسی لمحے قائم ہو گئی اور جب تک وہ زندہ رہا وہ پہلے دن کی ہم نفسی اور ہم نظری کی سطح برقرار رہی ، نہ کم ہوئی نہ آگے بڑھی ۔ مدنی اپنی تمام وحشتوں اور اپنی اچانک رم آمادگی کی خو کے باوصف بہت وضعدار آدمی تھا ۔ اس روایت ، اس طرز زندگی کی ، ان آداب کی زندہ تصویر جنہوں نے ہماری ثقافت اور معاشرت کو وہ حلاوت وہ دلاویزی عطا کی تھی جو اس برصغیر کے مسلم سماج کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی ۔ میں اپنی طویل زندگی میں دیس بدیس پھرا مگر ہماری یہ خاص ریت ہمیشہ دامن کش دل رہی اور کسی اور دیس میں میرا جی کبھی نہیں لگا ۔

مدنی عمر میں مجھ سے ڈیڑھ برس چھوٹا تھا اور ملازمت میں جونیئر تھا ۔ شاید یہ فرق برابر کی سطح پر ملنے میں حائل رہا ۔ میں مدنی کا بہت احترام کرتا تھا ۔ اس سے پیار بھی مجھے بہت تھا ۔ وہ ان دونوں باتوں سے پوری طرح باخبر تھا ۔ لیکن اس نے کبھی اشارتاً بھی یہ تاثر نہیں دیا کہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کے منفرد جوہر کا دلدادہ ہوں ۔ اس پہلی ملاقات کا حجاب ہمیشہ قائم رہا ۔ میں نے اپنی سی پوری کوشش کر دیکھی مگر اس حجاب کو بیچ سے اٹھانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا ۔ ایسے مواقع بہت کم ہوں گے اس قریب قریب ۳۵ سال کے تعلق خاطر میں جب اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے بات کی ہو ، یا کوئی تازہ شعر سنایا ہو ۔ اس کے اس رویہ کی بنا پر میں نے وہ التفات و گریز کی بات ابھی ابھی کی تھی ۔ مدنی میری طبیعت سے واقف تھا کہ وہ راست دل کے نہاں خانے تک پہنچ جانے والی نگاہ تیز رکھتا تھا ۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے منافقت نہیں آتی ۔ یہ بھی جانتا تھا کہ میں اسے دل سے بہت قریب رکھتا ہوں ۔ اور اس کے تخلیقی مقام کمال کا معترف ہوں ۔ چنانچہ اس کا دل میری طرف کھنچتا بھی تھا ۔ مگر اس بات کو کبھی اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا ۔ کبھی کبھی آنکھیں دوسری طرف کرکے ایسی بات بھی کہہ دیتا تھا جس میں ایک گلہ مندی کا اور ڈانٹنے کا سا انداز ہوتا تھا ۔ لیکن وہ گلہ مندی مجھ سے نہیں ، ہمارے ادبی ماحول سے ہوتی تھی ۔ پھر یکایک مسکرا کر نگاہیں نیچی کرلیتا اور کہتا ۔ رات یونہی کچھ اشعار ہوگئے تھے ۔ میں سراپا اشتیاق

ہو جاتا ۔ وہ شعر سناتا اور ساتھ ہی ساتھ منہ دوسری طرف کئے کنکھیوں سے میرا چہرہ بھی پڑھتا جاتا تھا ۔ کہ وہ میرے ستائشی فقروں سے زیادہ میرے چہرے سے یہ اندازہ کرتا تھا کہ کون سا شعر مجھے زیادہ پسند آیا ہے ۔

مجھے اردو کے عصری مشاہیر سے شکایت ہے ۔ بہت پرانی اور سخت شکایت کہ مدنی مرحوم کی زندگی میں انہوں نے اسے وہ اہمیت وہ تکریم نہیں دی جو اس کا حق تھی ۔ اسے کبھی یہ تاثر ادب کے کسی زعیم سے نہیں ملا کہ پاکستان کے اہل الرائے نقادان ادب اسے اس عصر کا نمائندہ اور زندہ رہنے والا شاعر سمجھتے ہیں ۔ میں تو پورے تین عشرے پاکستانی ادب سے غیر حاضر رہا ۔ لیکن جب کسی محفل میں معتبر اور مستند شاعروں، نقادوں اور ادیبوں سے ملاقات ہو جاتی میں پوری شدت سے اس بے اعتنائی کے خلاف شکایت ہی نہیں احتجاج کرتا تھا ۔

مدنی کو ہمیشہ مجھ سے بھی ایک شکایت رہی ۔ یہ کہ میں اس کی غزل کے شعر اس کے سامنے بھی اور غیاب میں بھی پڑھ کر لطف لیتا ہوں، اور اس کے منفرد اسلوب تغزل اور ان کی غزل کی معنوی تہ داری کی بات کرتا ہوں لیکن کبھی اس کی نظم پر کوئی قابل لحاظ بات نہیں کرتا ۔ یہ کمی بھی ایک دن پوری ہو گئی ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ میری اس سے آخری ملاقات ہے ۔ اس نے ریڈیو پر عزیزی رضی اختر شوق کے کمرے میں اپنی تازہ طویل نظم "مرزا باقر علی ۔ داستان گو" سنائی ۔ وہ تہ دار نظم سن کر میرا فوری تاثر مسرت آمیز حیرت کا تھا ۔ میں نے کہا ۔ مدنی صاحب یوں لگتا ہے ۔ یہ نظم آپ کی The Wasteland ہے یا مابرلی (ایزرا پاؤنڈ کی عدیم النظیر طویل نظم) ۔ اس کا چہرہ معاً تازہ گلاب کی طرح کھل اٹھا ۔ کیوں کہ اس سے پہلے میں نے اس کی کسی نظم کی یوں برجستہ اور بیساختہ تفصیلی سطح پر تعریف نہیں کی تھی ۔ میں اب کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ بات میرے رب نے مجھ سے کہلوا دی ۔ کہ اسے تو معلوم تھا کہ مدنی اب کوئی دن کا مہمان ہے اور یہ میری اس سے آخری ملاقات ہے ۔ وہ چاہتا تھا کہ مدنی میری طرف سے کاملاً خوش اور مطمئن جائے ۔ اسے دم آخر یہ احساس ہو کہ کم از کم ایک آدمی نے جس کے علم اور ذوق کو وہ معتبر سمجھتا تھا اسے وہ مقام دے دیا ہے جس کا اس نے ساری عمر انتظار کیا ۔ اس نظم پر تو بات اس کے مقام پر ہو گی ۔ میں مدنی کو بڑا غزل گو مانتا ہوں ۔ اب سے نہیں ۱۹۶۰ء سے ۔ مگر وہ نظم کے شاعر کے لحاظ سے بھی اپنا ایک مقام سب سے الگ رکھتا ہے ۔ اس مقام کی علامتی نشاندہی میں نے اسے "شاعر فردا" کہہ کر کر دی ہے ۔ میں اس مقالے میں مدنی کے فن اور اسلوب کا ہر سطح پر جائزہ لوں گا ۔ پورے تخلیق کار کے پورے تخلیقی عمل کا احاطہ کروں گا ۔ اور اس کی مجموعی سطح پر Evaluation اس کے تینوں مجموعوں کے جائزے کی تکمیل تک اٹھا رکھوں گا ۔

مدنی کا پہلا مجموعہ "چشم نگراں" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ۔ ان دنوں مدنی خارجی نشریات کے شعبے میں اسسٹنٹ ڈائر کٹر تھا ۔ جہاں چند ماہ قبل تک میں ڈائر کٹر رہا تھا ۔ اور پورے دو سال مدنی

سے بھرپور ملاقات رہتی تھی۔ ہمارے کمروں میں پندرہ بیس قدم کا فاصلہ تھا۔ ریڈیو پر مدنی نے کتاب کا پہلا نسخہ جسے دیا مجھے فخر ہے کہ وہ میں تھا۔ میں نے مدنی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مدنی منہ دیوار کی طرف کیے میز کی طرف بڑھا قریب آیا تو منہ اسی طرف رہا۔ کہا مجموعہ شائع ہو گیا۔ ناشر نے کل کچھ نسخے دیے تھے۔ مجتبیٰ حسین ملنے آئے تھے۔ کل رات پہلا نسخہ وہ لے گئے۔ یہ دوسرا نسخہ ہے جو آپ کے لیے ہے۔ میں اپنے عزیز دوست اور شوریدہ مزاج تخلیق کار کا اداشناس تھا۔ جان گیا کہ رو بہ دیوار کچھ اس اہم لمحہ کے پیدا کردہ اضطرار کے باعث ہے۔ کچھ تخلیق کار کی منزل رسیدگی کا پندار ہے۔ کچھ ایک نو یافت متاع گراں بہا پر Excitement ہے۔ جو وہ نہیں چاہتا کہ مجھ پر ظاہر ہو۔ میں نے کتاب کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور کہا۔ مبارک ہو۔ یقیناً یہ مجموعہ زندہ و پائندہ کلام کا امین ہے۔ اس سے ہمارے شعری ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ مدنی نے کہا جی یونہی سا ہے۔ بس چھپ گیا۔ سو لے آیا ہوں۔ یہ کہا اور جلدی سے دروازے کی طرف لپکا۔ کہا۔ "پھر آوں گا" اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اب یہاں ایک اعتراف کا ہنگام ہے۔ میں اس کوشش میں رہتا تھا کہ مدنی اپنی تازہ غزل کے اشعار سنائے۔ وہ میرے اس انداز سے کچھ چڑ سا گیا تھا۔ سو نظم کبھی نہیں سناتا تھا۔ اسے غالباً یہ گمان تھا کہ چونکہ میں خود صرف غزل کہتا ہوں (اور ان دنوں میں غزل باقاعدگی سے کہہ رہا تھا اور آمد کا یہ دور کئی برس جاری رہا تھا) سو نظم مجھے طبعاً پسند نہیں۔ اس بناء پر معاف بھی کر دیتا تھا۔ یہ اعتراف یہاں اس لئے کیا ہے کہ اس رات میں نے "چشم نگراں" کی ورق گردانی از اول تا آخر کر ڈالی۔ صرف نظمیں تھیں۔ ایک غزل بھی اس مجموعہ میں شامل نہیں کی تھی۔ پھر سونے سے پہلے میں نے دو ایک نظمیں ذرا توجہ سے دیکھیں۔ چند ماہ بعد دو چار اور نظمیں یہاں سے وہاں دیکھیں زیادہ یکسوئی سے۔ پھر میں چار مہینے کے لئے امریکہ چلا گیا۔ واپسی میں ایک ماہ لندن میں دوستوں سے ملنے کے لئے ٹھہر گیا۔ پانچ ماہ بعد کراچی واپس آیا تو صدر دفتر میں بلا لیا گیا۔ یوں مدنی سے روز کی ملاقات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب کبھی مہینے دو مہینے میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ مگر مختصر۔ ایسی نہیں جس میں اس سے قربت کی سطح پر بات ہو سکے۔ میں نے ایک آدھ بار مدنی سے کہا کہ آپ اپنی نظموں میں روایت سے ہٹ کر کاملاً نامانوس جدید چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس انداز سے کہ وہ نامانوس نہیں لگتا۔ انہوں نے میری طرف نگہہ تیز سے دیکھا اور کہا۔ جی!!! مجتبیٰ حسین اور عمر مہاجر کے سوا کسی نے اتنی بات بھی نہیں کی۔ چھوڑیے۔ کیا رکھا ہے اس قصہ میں۔ اور پھر ایک لمحہ چپ رہے۔ پھر ڈبیا سے پان نکال کر کلے میں رکھا۔ وہ تیزی دھیمی ہو گئی۔ پھر یکایک کھل اٹھا۔ باتیں شروع کر دیں۔ شاعری کی نہیں۔ ادھر ادھر کی۔

پھر میں پی۔ آئی۔ اے میں چلا گیا۔ شومی تقدیر سے۔ چھ سال بعد یہ حال ہوا کہ نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ ریڈیو سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ PIA کو میری ضرورت نہ رہی۔

اور میں کھوٹے پیسے کی طرح پھر پرانے مالک کے پاس لوٹ آیا۔ ریڈیو پاکستان میں ماہانہ کنٹریکٹ پر۔ مدنی اسلام آباد جاچکا تھا۔

۱۹۸۲ء میں شاید، جون میں، وہ ریٹائر ہو کر کراچی واپس آگیا تو گاہ بہ گاہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور وہ پرانا التفات و گریز کا رشتہ پھر بحال ہو گیا۔ انہی میں سے ایک ملاقات میں مدنی نے اپنی وہ آخری نظم سنائی تھی جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں۔ پھر اس کے گلے میں خراش سی رہنے لگی کچھ دن پروانہ کی۔ تکلیف بڑھی تو ڈاکٹروں سے معائنہ کروایا۔ دنوں میں تکلیف شدید اذیت میں بدل گئی۔ معلوم ہوا گلے کا سرطان ہے۔ ادھر میں جو مسلسل بیماری سے دھان پان ہو کر رہ گیا تھا ایسا بیمار ہوا کہ گھر سے نکلنا ممکن نہ رہا۔ پھر آپریشن ہوا۔ مرتے مرتے بچا۔ گھر آگیا۔ مگر ابھی حد سے سوا کمزور تھا کہ اچانک ٹیلی فون پر بعد از ظہر اطلاع ملی کہ مدنی انتقال کر گیا ہے۔ میں گرتا پڑتا جنازے میں شامل ہوا۔ اور پھر اسے دفنا کے گھر لوٹ آیا۔ اس رات میرے احساس شکست کی تکمیل ہو گئی جب ۹ بجے شب کے ٹیلی ویژن کے خبرنامے میں مدنی کی موت کو جگہ نہ دی گئی۔ میرے دل نے کہا قوم تک نہ پہنچ سکی ترکستان جا پہنچی ہے۔ سیاست اور بیورو کریسی کے بونوں کی فرضی کارگزاریوں کی طویل داستانیں تو شہ سرخیوں کے ساتھ نشر ہوتی ہیں۔ ایک عہد ساز شاعر اور نقاد ادب اور برتر سطح کے دانشور کی موت کے لئے دس سیکنڈ Spare نہ کیے جاسکے۔ دل یکایک بہت اداس ہو گیا۔ پھر عرصہ جاں کے دور کسی گوشے سے آواز آئی۔ مدنی کا پیکر فانی آج سپرد خاک ہوا ہے۔ مدنی کا فن لافنا ہے۔ بلھے شاہ صاحب کا ایک شعر میں نے اپنی تحریروں میں ایک اور جگہ بھی نقل کیا ہے۔ لیکن وہ یہاں زیادہ برمحل ہے۔

بلھیا اساں مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہور رائے

میں نے تیس برس کے وقفہ کے بعد مدنی کے کلام کو پھر اس یکسوئی اور انہماک سے پڑھا جس انہماک اور یکسوئی سے میں اس کے اشعار اس کی زبان سے سنا کرتا تھا۔ گزشتہ پندرہ دن رات میں مدنی کی دنیا کی زیارت کرتا رہا ہوں۔ کتاب کیسے پڑھی جاتی ہے، یہ راز مجھ پر میرے مرشد معنوی رومی کے اس بیت سے آشکار ا ہوا۔

چونکہ باقرآن حق آویختی بارِ وانِ انبیاء آمیختی

اللہ کے کلام کو سمجھنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ جب موسیٰ اور ہارون اللہ کا پیغام لے کر فرعون کے دربار میں پہنچتے ہیں۔ تو مجھے یوں لگا کہ میں ہمہ ادب شاگرد ہوں اور کلیم اللہ کا دامن تھامے پیچھے کھڑا ہوں۔ پھر وہ سارا واقعہ میری روح میں پیش آتا ہے۔ جب نمرود کی آگ میں اللہ کے خلیل کو کود جانے کا حکم ملتا ہے تو وہ قلب مطمئنہ کے ساتھ آگ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ میں بھی اپنی روح میں ان کے ساتھ آگ کے شعلوں میں بیٹھ جاتا ہوں۔ اور میری روح یہ فرمان الٰہی سنتی ہے۔ اے آگ ٹھنڈی ہو جا۔ اور میں شعلوں کو اپنے اندر پھول بنتے دیکھتا ہوں۔ سیر کس

Serious ادب کو پڑھنے کا بھی صرف یہی طریقہ ہے۔ مدنی کے کلام کو دل پر وارد کرنے کے لئے میں نے پہلی بار اب یہ طریقہ اختیار کیا۔

سب سے پہلی بات "چشم نگراں" کے ماحول میں پہنچ کر یہ محسوس کی کہ اس کے اشعار کے مطالعہ سے پہلے اس خیال افروز مقالہ کو پڑھنا ضروری ہے جو اس نے "آزادی کا افق" کے زیر عنوان بطور تعارف لکھا ہے۔ یہ مقالہ پڑھ کر مجھے یہ علم حاصل ہوا کہ مدنی نوعی سفر کی ان رنگا رنگ پرتوں سے سطح حکمت پر آگاہ ہے جو مل کر نوعی نفس کو ایک نامیاتی کل بناتی ہے۔ اقوام کی اساطیر، ان کے عقاید، ان کے توہمات، ان کا فکری تجسس، ان کی روحانی، جمالیاتی، عمرانی اور سیاسی اقدار ان کی، اختراع و ایجاد کی مساعی۔ مدنی نے صرف برصغیر کی دو اہم اقوام کے اپنے اپنے مزاج ہی کا پورا علم حاصل نہیں کیا۔ وہ انسانی تاریخ کے تمام ادوار اور راہ کے مختلف مراحل کی کیفیتوں اور نوعیتوں سے بھی پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ صرف عالمی ادب ہی کا نہایت عمیق ادبی شعور رکھنے والا طالب علم نہیں۔ علم الانسان کی ساری دھاریوں سے یوں باخبر ہے جیسے میں اپنے ہاتھ کی لکیروں سے ہوں۔ ایک چھوٹا سا اقتباس مضمون کے ابتدائی حصہ سے ہے اسے غور سے پڑھیے۔ اپنی زبوں حالی میں مطمئن غلام اقوام کا جو تغیر کی تازہ ہوا سے ڈرتی ہیں ذکر کرتے ہوئے مدنی کہتا ہے۔

"علیل زندگی اپنے حجرے کا ایک روزن بھی کھلا چھوڑنا برداشت نہیں کرتی۔ ہو سکتا ہے کہ ذہنیت کا یہ جبس محکومی کی فضا سے پیدا ہوا ہو۔ مگر ادب کا کوئی دور جو فکر کے لئے نئے موڑ کا مظہر ہے سرتابی کی صدا سے خالی نہیں۔ غالب کی شخصیت میں بھی ایسے عناصر موجود تھے جو رسم و رواج کے بند پنجے میں نہیں آسکتے تھے۔ اقبال کی آواز کتنی کھلی ہوئی آواز ہے، دور جدید نے سرتابی کی تو کیا برا کیا۔"

از کار رفتہ روایات سے منسلک رہتے ہوئے احتجاج کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، مدنی کہتا ہے۔

"جدید تہذیب جسے میں بغیر سائنس اور ٹیکنالوجی کے سوچ ہی نہیں سکتا، ایک نئے آدمی کا تصور پیش کرتی ہے۔ اس تہذیب نے نقد و نظر کی جو منزلیں طے کی ہیں وہ کسی تہذیب نے اتنے کم عرصے میں اتنی تیز رفتار سے طے نہیں کی تھیں۔ رفتار، عمل، تلاش، توازن کے اس دور میں لکھنے والا ایک ایسے کاغذ پر لکھ رہا ہے جو شش جہت کی ہواؤں کی زد میں ہر نفس پیچ سے مڑ جاتا ہے۔ لکھنے کی اتنی تیز رفتار سمجھ کی اتنی وسعتیں آدمی کہاں سے لائے"

اس اقتباس میں بڑی سطح دانش سے بات کی گئی ہے۔ یہ تعارف ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا۔ اور مجموعہ میں شامل بیشتر کلام ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء کے تک کے زمانے میں تخلیق ہوا۔ صرف آخری نظم ۱۹۵۳ء میں کہی گئی تھی۔ ظاہر ہے جو باتیں مدنی نے ۱۹۵۳ء میں کہیں وہ اسے اس صراحت سے

۱۹۴۲ء میں معلوم نہ تھیں جب وہ ایک ایسا شاعر تھا جو جوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ ابھی بیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایک بے تابی سی ایک بے اطمینانی سی اس وقت بھی اس کی روح میں تیز ہوا کی طرح چل رہی تھی۔ وہ ابھی چودہ پندرہ برس کا لڑ کا تھا جب جرمنی کی نازی نسل پرستی اور اٹلی میں گہری سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے فاشسٹ آمر مسولینی کی بلیک شرٹ تحریک ایک نئی ملوکیت بن کر سامنے آگئی تھی۔ اٹلی نے حبشہ پر جارحیت کر کے قبضہ کر لیا تھا اور نام نہاد لیگ آف نیشنز صرف زبانی احتجاج کر کے خاموش ہو گئی تھی۔ یورپ میں ان نئے خطرات کے پیش نظر رومن رولاں، گورکی اور دوسرے اہم مغربی تخلیق کاروں اور دانشوروں نے ایک کانفرنس بلائی جس میں ہندوستان کے انگریزی زبان میں لکھنے والے ناول نگار ملک راج آنند بھی شریک ہوئے اس کانفرنس کے کچھ دنوں بعد لندن میں ہندوستانی ادیبوں نے جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور میرے استاد ڈاکٹر تاثیر بھی شامل تھے ترقی پسند مصنفوں کی انجمن بنائی جس کے زیر اثر ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز ہوا۔ پنجاب میں اردو کے ادیبوں شاعروں میں ڈاکٹر تاثیر اور فیض احمد فیض اس نئے نظریاتی ادب کی روح رواں تھے۔ بعد میں احمد ندیم قاسمی بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ ڈاکٹر تاثیر پانچویں عشرے کے اوائل میں سری پرتاب کالج سری نگر کے پرنسپل ہو کر چلے گئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ ترقی پسندی سے ان کی وابستگی کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں صورت یہ مرتب ہونے لگی کہ میراجی کا نفسیاتی ادب کا مکتب نئے ادیبوں میں یکایک قبول عام پا گیا اس زمانے کے تین اہم شاعر راشد، فیض اور میراجی تھے۔ ان میں صرف فیض صاحب ترقی پسند تھے۔ پنجاب کی جغرافیائی سرحد سے ادھر ترقی پسند تحریک بہت جلد زور پکڑ گئی کیونکہ اسے منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی جیسے اہم بزرگوں کی سرگرم حمایت حاصل تھی۔ یوں بھی یوپی، سی پی، بمبئی اور مدراس میں نوجوان طبقہ سیاسی شعور میں ہمارے علاقے سے بہت آگے تھا۔ میں چوتھے عشرے کے آخری برسوں میں ابھرتے ہوئے شاعروں میں پیش پیش تھا مگر ہماری نسل میں صرف ساحر لدھیانوی نے ترقی پسند تحریک کو دل و جان سے قبول کیا۔ لیکن ادھر فیض صاحب کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا ایک پورا قبیلہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گیا تھا۔ مخدوم محی الدین اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری غور سے دیکھو تو ساری کی ساری ادیبوں شاعروں کی نئی نسل برطانوی سامراج کی ملوکیت اور اپنے سماج کے روح کو کچل دینے والے توہمات اور رسم و رواج کے خلاف صف آرا ہو گئی تھی۔ ان شعراء سے ذرا جونیئر لیکن مجھ سے سینئیر لوگوں میں اختر الایمان بھی ترقی پسند شاعر تھے۔ ان سب کے کلام کو اب غور سے دیکھو تو اس پر ایک نہ ایک سطح پر جوش کے لہجے اس کی فکر اور اس کے بیانہ انداز سخن کی چھاپ نظر آتی ہے۔

میں نے اپنے علاقے کے افسانہ نگاروں کی بات نہیں کی۔ کرشن چندر اور راجندر سنگھ

بیدی کی ۔ کہ یہ تحریر ایک قد آور شاعر کے بارے میں ہے ۔ پورے اردو ادب کے بارے میں نہیں ہے ۔ سو میں نے ڈاکٹر رشید جہاں اور صاحبزادہ محمود الظفر اور سبط حسن کا نام بھی نہیں لیا ۔

میرے اس بیان کی تصدیق " چشم نگراں " کی پہلی نظم سے ہو جاتی ہے ، جس کا عنوان " انتساب " ہے ۔ اس نظم میں چار چار مصرعوں پر مشتمل چار بند ہیں ۔ دوسرے بند پر ایک نظر ڈالیے ۔

تجھے خبر ہے مری لے ہے ایک مدت سے
ہجوم کاہ میں مانند آتش چقماق
اسی خزاں میں جو موج نفس کے ساتھ گئی
ملیں گے صوت و صدا کے ہزار ہا اوراق

اس بند کے دوسرے مصرعے میں جوش کی واضح اور Loud بیانیہ کی گونج صاف سنائی دے رہی ہے ۔ جوش کی خاص شناخت اس کے فرہنگ کا طنطنہ اور بلند آہنگی ہے ۔ یہاں بھی ہجوم کاہ اور آتش چقماق میں ضبط فغاں کے بجائے لہجے کی تیزی نمایاں ہے ۔ چقماق سے چنگاری نکلتی ہے بہت آتشیں ہو تو ایک ننھا سا شعلہ اچھلتا ہے ۔ آتش کی سطح اس میں کبھی نہیں آتی ۔ کہ آتش کا لفظ ہمارے ہاں آتش نمرود اور مجوسیوں کے آتش کدوں جیسی صورتوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ آگ بھی اسی سطح پر استعمال ہوتی چلی آئی ہے ع آگ اس گھر کو لگی ایسی کی جو تھا جل گیا ۔ اور ع یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں ، اور ع آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے ۔ مومن کی غیرت ناہید کی آواز بھی آگ نہیں شعلہ ہے ۔ یہاں آتش کی جگہ شعلہ آسکتا تھا کہ دونوں ہم وزن لفظ ہیں ۔ لیکن مدنی کا ماڈل غالب اور میر نہیں جوش تھا جو اپنے فرہنگ کی بیکراں وسعت اور رنگا رنگی کے باعث سارے ہندوستان میں بجز پنجاب ایک دیو قامت Colossus کی طرح حاوی تھا ۔ دوسری نظم کا عنوان " زندانی " ہے ۔ اس کے پانچویں بند میں بھی جوش کی بلند آہنگی کا سایہ پڑتا نظر آتا ہے ۔

یہ نظر اب بھی جو اٹھتی ہے ستاروں کی طرف
رنگ دنیا لیے گردوں کے نظاروں کی طرف
دور جائے گی اگر تیرہ غباروں کی طرف
ان غباروں میں کئی بھوت نظر آتے ہیں
دل کا در توڑ کے کم بخت یہ در آئیں گے

آخری مصرعہ کا لہجہ جوش کا سا ہے ۔ یہاں میرے خیال میں غباروں کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے ۔ زبان اور علامت میں مدنی ایسے تصرفات کرتے رہے ہیں ۔ کئی جگہ " ع " ثقیل صوت کے بعد یعنی ق ظ یا ل م کے بعد الف کی طرح آتا ہے ۔ عین کی پوری صوت نکالو تو مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے لیکن یہ بہت چھوٹی باتیں ہیں ۔ مدنی زبان میں اس تصرف کا حق رکھتا تھا اور

یہ تو بہت ابتدائی زمانے کا کلام ہے ۔ اور ایک مثال دوں گا جو اس زمانے کے جمنا سے ادھر کے سارے شاعروں میں بلا استثنا ملتی ہے اور جوش ملیح آبادی کا فیض ہے ۔
نظم "نئے نام" کا دوسرا بند یوں ہے ۔

علم و عرفاں کی غلط بینی پیہم کا نظام
ذرے ذرے میں ہے افسون روایات کا دام
کس قدر خوار یہ ہنگامہ عالم ہے تمام
ایک ذرہ بھی زمیں کا نہیں بیدار ابھی
اپنی نیند میں ہے خاک پراسرار ابھی

"علم و عرفان کی غلط بینی" تو بال جبریل سے مستعار ہے ۔ "رقابت علم و عرفان میں غلط بینی ہے منبر کی" ۔ بات مشکل تھی سو اقبال سے مدد لینا جائز تھا ۔ جوش کی فکر کی اساس قومی روایت علم کو از کار رفتہ قرار دے کر جدید علوم کے حصول کی تاکید ہے ۔ وہ ترقی کی راہ میں حائل کہنہ رسم و رواج کو فوراً ترک کرنے (Discard) کر دینے کے حق میں ہے ۔ سو یہاں لہجہ اور فکر دونوں جوش کی تقلید کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ ایک اور انداز نظم کی ابتدا کے لئے اس زمانے میں ادھر وہ تھا جس کی سب سے مشہور مثال اختر الایمان کی نظم کی پہلا مصرعہ ہے ۔ " اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا" ۔ وہ نظم جس طرح اختر الایمان نے Construct کی ہے اس پر جوش کی چھاپ نمایاں ہے ۔ مدنی اپنی نظم "تصویریں" کی ابتدا اس مصرع سے کرتا ہے ۔ "میں نے سوچا ہے کہ خورشید کا ماتم نہ کروں" ۔ سامع یا قاری کو زبان کھولتے ہی اپنے مستقبل کے عزائم سے ایک مصرع میں مطلع کر دینا یوپی ، سی پی کے نوجوان شاعروں کا پسندیدہ اسلوب تھا ۔ اور یہ بھی جوش صاحب کی دین ہے کہ وہ ابتدا میں اکثر اختصار سے کام لیتے ہیں ۔ زور بیان اور قدرت کلام خبر میں دکھاتے ہیں ۔ اور خبر علم کی کمی کے باعث زیادہ موثر اور کارگر نہیں ہوتی ۔ اور ۔ پھر جوش صاحب کا بیانیہ کم ہی کبھی نظم کو ایک نامیاتی اکائی بننے دیتا ہے ۔ بیشتر کلام فہرست مضامین سے زیادہ نہیں ۔ زبان میں کھنک ، لہجے میں چمک اور فرہنگ کی بیکراں وسعت ان کے کلام کی وہ امتیازی خصوصیتیں ہیں جو جوش کو ایک قادر الکلام اور منفرد لہجے والا شاعر بناتی ہیں ۔

جوش کے بارے میں یہ مختصر معروضہ یہاں رقم کرنا ضروری تھا کہ مدنی جوش کا مداح ہی نہیں معنوی شاگرد بھی تھا ۔ مگر قدرت نے اسے بڑا جوہر عطا کیا تھا ۔ وہ اپنے اس شعری سفر کے آغاز میں یہاں وہاں ایک بلند قامت شاعر سے اثر پذیری کا تاثر دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ وہ ایک سب سے الگ طبعیت اور جدید شعور لے کر آیا ہے ۔ میں نے جن نظموں سے اقتباس اوپر نقل کئے ہیں ان کا بیشتر حصہ مدنی کا اپنا ہے جو اس کے سوا اور نہ کسی نے کہا نہ کوئی کہہ سکتا تھا ۔ اس کی سوچ دوسروں کی فکر سے مختلف تھی ۔ "انتساب" کا پہلا بند دیکھئے ۔

ہزار درد خریدے ہیں میں نے دل کے لئے
ابھی یہ پردہ جاں ہے کہ ایک پردہ ساز
ہر اک افق سے پلٹتی ہوئی بکھرتی ہوئی
تجھے ہی ڈھونڈ رہی ہے ابھی مری آواز

مدنی بہت جلد فکر اور اسلوب دونوں میں اپنے پاؤں پر جم کر کھڑا ہو گیا کہ وہ بڑا جوہر اور سوچ کی گہرائی اور لفظ کے جمال کی فراواں حس اپنی فطرت میں لے کر آیا تھا۔ اور آغاز تدریس و تعلیم ہی سے مطالعہ اس کی کل وقتی لگن بن گیا تھا۔ اس نے پڑھا بھی بہت اور جو پڑھا اس کو سوچا بھی بہت۔ اور اس کے مطالعہ میں اپنا سارا مشرقی سرمایہ علم و ادب، حافظ، سعدی، عرفی، نظیری، ولی دکنی، میر و مرزا، آتش و مومن، غالب اور اقبال، اور عصری سطح پر سب سے اہم جوش، بھارت سے کالی داس اور اپنشد اور گیتا، بھارت کی دیومالا، رامائن اور مہابھارت، بھارت کی مصوری اور اس کا فن تعمیر، اجنتا کے غار اور سرنگاپٹنم کی اسلامی عمارتیں۔ مغرب سے برطانیہ اور فرانس اور جرمنی کے وہ شاعر جن کا کلام ہم تک پہنچ چکا تھا۔ تازہ ترین طبعیاتی، کیمیاوی تحقیق، علم الانسان اور عمرانیات کا سرمایہ، فریزر کی The Golden Bough اور ڈارون کا نظریہ ارتقا، یونانی فلسفہ اور یونانی کلاسیک ڈراما، پہلی جنگ کے اثرات مابعد، دوسری جنگ میں ملوکیت اور نوع انسان کے جذبہ حریت کی خونیں ستیز جو انسانیت کو مرگ کل کے کنارے پر لے آئی تھی ہٹلر کی طرف سے یہودیوں اور روسیوں کی نسل کشی۔ بیسویں صدی میں Genocide اس وسیع پیمانے پر۔ گیارہ برس کی یہودی لڑکی فرینک این کی گیس چیمبر میں ہلاکت سے پہلے کے زمانہ قید کی ڈائری، یہ سب کچھ پڑھ لیا تھا اور اس کے Receptive ذہن نے اس سب کو بہم آمیز کیا اور ایک خاص زاویہ نگاہ نوع زندگی کی بحالی اور ترقی و تعمیر کے لئے بنالیا۔ ایک بات شروع ہی میں نظر آگئی تھی کہ مدنی آزردہ جاں، بار مان لینے والا شخص نہیں۔ وہ راستے کی صعوبتوں، جانگسل مشکلات اور خطرات سے آگاہ ہے۔ مگر اسے نوعی اہلیت بقا پر مکمل اعتبار ہے۔ سو اس کی فکر کی اساس ایک توانا ہمہ گیر رجائیت ہے۔ اور اسی رجائیت نے اسے جدید سائنس سے قریب تر کر دیا ہے۔ وہ ٹیکنالوجی پر مبنی ایک عالمگیر معاشرے کے خواب دیکھتا ہے اور سائنسی تہذیب نو پر مبنی وحدت انسانی پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن نوع اپنے بیش بہا سرمایہ اظہار کو رد نہیں کر دے گی۔ ہومر، درجل، سوفوکلیز، ارسطو، افلاطون، دیکارت، ہیگل، کانٹ، ڈارون، حافظ و سعدی، رومی و عطار، ابن رشد اور ابن خلدون، کالی داس اور گیتا اور شاہنامہ فردوسی اور پنج گنج نظامی کو ساتھ لے کر چلے گی۔ نئی تہذیب انسانی زندگی کو نئی ایجادات اور علوم جدید سے میراث بزرگاں کو ملا کر ایک زندہ اور مثبت اور خوشنما خوش آیند کل بنا دے گی۔ یہی بات وہ نئے نئے استعاروں میں نظم میں بھی کہتا چلا گیا۔ ریل، ہوائی جہاز، راڈار، جوش صاحب

کے ہاں بھی یہ لفظ ملتے ہیں ۔ مگر وہاں وہ محض فہرست اشیا ہیں ۔ نامیاتی کل کا حصہ نہیں ۔ جیسے " لینن خدا کے حضور میں " علامہ اقبال نے زندہ کرداروں کے طور پر استعمال کئے ہیں ۔ مثال دیکھئے ۔

محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

اقبال نے " بینائے کواکب " کی ترکیب وضع کی ۔ اس عمل کے لیے مدنی نے " رصد گاہ " کو علامت بنایا ۔

اب دو شعر اور اس نظم کے دیکھیے ایک بڑا شاعر دانش حاضر کو اپنے اسلوب میں کیسے بروئے کار لاتا ہے ۔

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات

نئے فکر و عمل ، نئے یقین و ایمان کی ضرورت کو اقبال یوں بیان کرتے ہیں ۔ یہ اسلوب اب سے سو برس پہلے اردو شاعر کے لئے ممکن نہ تھا ۔

یہ وحی دہریت روس پر ہوئی نازل کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

مدنی نے تہذیب حاضر کے ان Implements اور Instruments کو جو ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئے ہیں ، اپنے نظموں پر کرداروں کی طرح استعمال کیا ہے ۔ کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس نے ان کلوں ، ان اختراعات و ایجادات کو صرف جدید کہلانے کے لیے استعمال کیا ہے ۔ وہ فکر کے لازمی حصے کی طرح کلام میں آئے ہیں اور سننے والے کو نامانوس نہیں لگتے ۔ دیکھئے ابتدا بہت دھیمے ، خفی ، غیر محسوس طریقے سے ہوتی ہے ۔ اپنی نظم " گوتم کی سرزمین " میں کہتے ہیں ۔

تیرگی جاگ اٹھی
اور اک صفر کے بے جان افق سے اٹھ کر
ان خداؤں کے قدم
جن کے سنگین بتوں کے سائے
وقت کی سوئی سے لپٹے ہوئے سورج کے اجالے بھی

اور آخری دو مصرے ہیں ۔

اجنبی سے کوئی شکوہ تو نہیں
تیرہ و تار روایات کی باہنی سے عبارت ہے یہ گوتم کی زمین

دیکھئے ہمارے ہاں غزل ہو کہ نظم ، وقت گزراں کے لئے شیشہ ساعت ہی علامت رہا ہے صائب تبریزی کہتے ہیں ۔

غم عالم فراوان است و من یک غنچہ دل دارم چساں در شیشہ ساعت کنم ریگ بیاباں را

لیکن مدنی نے وقت کی سوئی کہا۔ ہمارے سماج میں اب قریب قریب ہر گھر میں لوئر مڈل کلاس گھروں میں بھی ٹائم پیس ہوتا ہے۔ سو ہم اپنی گفتگو میں وقت کی سوئی استعمال کرتے ہیں۔ مدنی نے جب اسے استعمال کیا تو یہ اپنی ندرت کے باوصف کانوں پر گراں نہیں گزرا۔ ایک بات کی طرف چلتے چلتے یہاں اشارہ کردوں۔ تفصیل سے اس موضوع پر بات اس کے اپنے مقام پر ہوگی۔

آخری مصرعے میں روایات کی تیرہ و تار بانبی کا ذکر ہے۔ اس جانب سے جہل اور پس ماندگی کی ناگن رہ رہ کر باہر آتی ہے اور سماج کو جو مسلسل اندھیرے میں ہے ڈستی رہتی ہے۔ کیسے کامل استعارے میں بات کی ہے۔ اتنا عمق ان کے جمنا پار کے ہم عصر نوجوانوں میں ہی نہیں بزرگوں کے کلام میں بھی کم ہی نظر آتا ہے۔ نظم "موسم کے تغیر" میں نئی علامت یوں آئی۔

در پئے تغییرؔ ہے اک انقلاب تیز گام
شیشۂ ساعت میں آوارہ بگولوں کا خرام
اک نئی مٹی میں گوندھے جارہے ہیں صبح و شام
اب رصد گاہوں کے پیمانوں میں لو دینے لگا
ایک موسم کا تغیر کروٹیں لینے لگا

یہاں وقت کی سوئی نہیں۔ پرانی علامت شیشۂ ساعت ہی آئی۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں بگولوں کا خرام دکھانا تھا۔ بگولے دھول سے یا ریت سے بنتے ہیں۔ سو شیشۂ ساعت ہی مناسب علامت تھی۔ نئی بات یہ ہے کہ اس شیشہ میں اب ریت ایک ہی رفتار سے نیچے نہیں گرتی۔ اس رو میں باقاعدگی اور نظم نہیں۔ اب اس میں بگولے اٹھنے کو ہیں۔ اقبال نے "بینائے کواکب" کہہ کر سائنس کو اپنی فرہنگ اور فکر میں شامل کر لیا۔ مدنی آگے بڑھتا ہے۔ اور اسے موسم کا تغیر رصد گاہ Observatory کے پیمانوں میں نظر آنے لگا ہے۔ مدنی اور آگے بڑھے گا، معملوں۔ راڈار اور دوسری جدید ایجادات کو اپنے اسلوب کا داخلی جزو بنالے گا۔ لیکن "چشم نگراں" میں وہ "وقت کی سوئی" سے آگے نہیں بڑھا۔ بیشتر نظمیں رومانی ہیں۔ کسی محبوب خیالی سے رہ و رسم آشنائی کے تمام مراحل خیال میں طے کر لیے ہیں۔ شروع کی نظموں میں محبوب سے گفتگو میں غم عالم کا ذکر بھی ہے۔ نظموں کی فضا ایسی ہے جو فیض صاحب کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور جاں نثار اختر اور مخدوم محی الدین کی رومانی نظموں میں تھی لیکن لہجہ ذرا الگ سا ہے

تم سمجھتی ہو کہ یہ نور شبستاں ہے بہت
نازِ ابرو ہے بہت، جنبش مژگاں ہے بہت
کوئی طوفاں ہو نظر میں تو یہ طوفان ہے بہت

اک حسیں خواب میں دنیا کا جنوں گم ہے ابھی
تم ہو اور شام و سحر ایک تبسم ہے ابھی

اور یہ کہ۔

پھول برساتی گزرتی ہیں ہوائیں تم پر
مہرباں ہیں ابھی دنیا کی فضائیں تم پر

یہاں خفی سی آواز مجاز کی سنائی دیتی ہے۔ گو دور سے۔

لیکن "نہ ہو نگار کو فرصت" میں ہم آغوشی اور عیش وصال کا بہت کھلا بیان ہے۔ یہ موضوع بہت جلد مدنی کے کلام سے ناپید ہو گیا۔ اگر عنفوان شباب میں بھی شعر عفت مآب ہی رہتا تو وہ غیر فطری بات ہوتی۔ اس مجموعے میں مجھے ایک "علامت" نظر آئی۔ جو گزشتہ دو تین برسوں سے اردو نظم اور غزل میں اتنی کثرت سے استعمال ہوئی ہے جاو بے جا کہ کلیشے بن گئی ہے۔

میں نے سوچا ہے کہ خورشید کا ماتم نہ کروں
شب کی آغوش میں مے خانے ہیں سیارے ہیں
جن کا پرتو مری بے خواب نگاہوں میں رہا
ابھی افلاک کی محراب میں وہ تارے ہیں
جو خلاؤں میں لٹاتے رہے کرنوں کی ضیا

مدنی نے محراب کو مسجد سے نکال کر افلاک میں سجا دیا ہے۔ اور اس محراب میں تاروں کا جھرمٹ ہے۔ اور یہ دیکھئے۔

یہ شب تار یہ محراب صد آثار کہن   آہ یہ کژدم و خفاش کا پرہول وطن

یہ محراب بھی ماضی کے مردہ آثار کا ہے۔

"چشم نگراں" میں صرف چار نظمیں ایسی ہیں جو رائے پور سے پاکستان آجانے کے بعد کہی گئیں۔ "انتساب" جو مدنی نے ۱۹۵۹ء میں کہی اور آخری تین نظمیں جن میں "دست حنائی تک" جو شاہد مدنی کے قیام پشاور کے دوران میں تخلیق کی تھی۔ باقی سارا کلام پاکستان آنے سے پہلے کا ہے۔ اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک کے زمانے پر محیط ہے۔

مدنی کے اس دور کی شاعری کی سب سے اہم بات اس کی لفظی تصویر کشی یعنی WordPicture بنانے میں پوری قدرت اور Perception کی منفرد نوعیت ہے۔ چند مثالیں پیش کر کے "چشم نگراں" کی سیر مکمل کر دوں گا۔

نظم "رات کی قبر" کے دو بند دیکھئے۔ دوسرا اور تیسرا:

خامشی رات کی بانہی سے نکل آتی ہے   شہر کے شور کو، جاگے ہوئے میخانوں کو
سائبانوں کو، در و بام کو، ایوانوں کو   اک ذرا دیر میں ڈس جائے گی دھیرے دھیرے

ہمارے ہاں کہاوت ہے ۔ سانپ کا کاٹا سوئے ۔ سو رات کی قبر کے مضمون میں پھیلتی اور مسلط ہوتی چلی جانے والی خامشی کے لئے یہ استعارہ کتنا موثر ہے ۔

پر سمیٹے ہوئے بیٹھی ہے ہوا کی لرزش ۔۔۔ ساز کے راگ ، دم حرف لبوں کی جنبش

اس شب تار کے اسرار کھلے جاتے ہیں ۔۔۔ تم مرے پاس ہو لیکن یہ ہواؤں کا سکوت

جیسے ہم دونوں خموشی میں گھلے جاتے ہیں

نظم " وقت " کے آخری تین بند:

جستجو کی یہ فضائے بے چراغ
اک ہوا سے شاخ گل ہے بے دماغ
اک کرن ہے چاند کے سینے میں داغ
ایک پرتو کا خرام بے حذر
آئینوں سے آئینوں تک ہے سفر

تشنہ و سیراب اجزا کا لہو
ایک ہی زنجیر میں مرگ و نمو
ہر نفس الجھے ہوئے سے تار و پو
خامشی آواز سے ملتی ہوئی
انتہا آغاز سے ملتی ہوئی

وقت کی یہ تصویر ایک غلام ملک کی بے علم پس ماندہ قوم کے ایک حساس طبع تخلیق کار نے کھینچی ہے ۔ یہ بڑی شاعری نہیں کسی اعتبار سے ۔ مگر یہ مدنی کے جوہر کا تشکیلی Formative زمانہ ہے ۔ اس دور کی شاعری سے ایک تابدار " آئندہ " کے امکانات اور آثار پوری طرح نظر آرہے ہیں ۔ یہ بات بھی اس کے چند دنوں کے مطالعے سے مجھ پر آشکار ہوئی کہ جدید تر نسل کے شاعروں نے مدنی کے کلام سے کئی علامتیں مستعار لیں اور سب نے بھیڑ چال چل کر انہیں بے جان لاشوں کی طرح بنادیا ۔ وہ ایسے کلیشے بن گئیں جو جہاں نظر آتی ہیں طبیعت میں گھٹن پیدا کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتیں ۔ کبھی کبھی تو ان کے استعمال سے گھن آنے لگتی ہے ۔ مگر وہ مدنی کے ہاں تازہ و شاداب ہیں اور ہمیشہ رہیں گی ۔ صرف بھک منگوں کے کلام کو کھا جائیں گی ۔

ایک بات میں یہاں یہ جائزہ سمیٹنے کے لئے کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں ۔ مدنی کی نظمیں " چشم نگراں " میں ایک اپنی مطلوبہ فضا تو بڑی کامیابی اور فسوں کاری سے پیدا کر دیتی ہیں ۔ مگر شاذ ہی کوئی نظم ایسی ہے جو ایک " مربوط کل " کی حیثیت رکھتی ہو ۔ ایسی کوئی نظم نہیں جس کا ہر جزو جزو لاینفک ہو ۔ اس مجموعہ کی کوئی نظم بڑی نظم بھی نہیں ہے ۔۔ بہر طور اس مجموعے سے مدنی

ایک منفرد اسلوب رکھنے والے صاحب جوہر شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری کی Mainstream میں شامل ہو گیا۔

مدنی کا دوسرا مجموعہ "دشت امکان" ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ "چشم نگراں" کے دو سال بعد اس مجموعہ میں ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۶۳ء تک کا کلام شامل ہے۔ نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔ اس مجموعہ کے ساتھ مدنی جدید اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہو گیا۔ اس کی کئی نظمیں "رصد گاہ"، "آپریشن تھیٹر"، "آخری مراسم" اپنی خاص نوعیت اور صنعتی دور کی جداگانہ معاشرت کی نئی علامتوں سے تصویر کشی کی بنا پر کلاسیک ہو گئیں۔ اور "دشت امکاں" میں مدنی کی غزل یوں آئی کہ وہ اس صنف میں صاحب عہد شاعر ہو گیا۔ غزل میں فکر کی رفعت، تہ داری اور کثیر الجہتی کے ساتھ ساتھ نئے لہجے تازہ تر علامتوں اور کرداروں کو کمال صنعت گری سے مصرف میں لاکر مدنی نے اپنے لیے سب ہم عصروں سے الگ ایک منفرد سطح حاصل کر لی۔ "دشت امکاں" میں مدنی اپنے فن اور جوہر کی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا۔ زاں بعد وہ اس سے آگے کبھی نہیں گیا۔ کہیں کہیں پیچھے ضرور ہٹتا نظر آیا۔

"چشم نگراں" میں شامل نظموں پر بات کی ابتدا کرنے سے پہلے میں نے اس کے "تعارف" سے دو ایک اقتباسات پیش کیے تھے۔ کہ میرے خیال میں مدنی ادب و شعر کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ رکھتا ہے اور خود اعلیٰ فکری اور علمی سطح پر بات کر سکتا ہے۔ "دشت امکاں کے لئے بھی مدنی نے ایک خیال افروز ابتدائیہ لکھا ہے۔ "دانش حاضر کے سواد میں" جس کو پوری طرح سمجھے اور Own کئے بغیر صاحب ذوق قاری بھی مدنی کے تخلیقی عمل اور اس ارژنگ کی (جو اس کا وجدان ہے) وسعتوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ میں نے "چشم نگراں" کے مختصر جائزے کے آخر میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ مدنی کی نظم نامیاتی اکائی شاذ و نادر ہی بنتی ہے۔ ایک بے ترتیبی کا فنی اور تکنیکی سطح پر تاثر قائم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوصف مدنی جذبے اور فکر کی جو فضا قاری کے احساس و شعور تک پہنچانا چاہتا ہے وہ پوری طرح پہنچ جاتی ہے۔ میں نے ادب و شعر پر کئی دفعہ مدنی سے طویل گفتگو کی۔ وہ ادب اور مصوری کے فن کی تمام جدید تحریکوں سے باخبر تھا۔ سرئیلزم Surealism سے Absurd literature تک۔ اور اس نے کئی دفعہ بڑی صراحت سے کہا کہ جدید زندگی انتہائی پیچیدہ ہے۔ نت نئے انکشافات، نئی ایجادات اور صدیوں کی روایت سب ایک ساتھ موجود ہیں۔ سو زندگی عمرو عیار کی زنبیل بن کر رہ گئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ اپنی نظم میں بڑے چوکس ذہن سے ایسی پٹارے کی سی فضا قائم کرتا تھا کہ نظم غیر مرتب اور Disjointed نظر آتی ہے۔ شاید یہی وہ تاثر تھا جو وہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اور کئی جگہ بات آدھی کہہ کر آگے نکل جاتا تھا۔ گرامر بھی غلط ہو جاتی تھی کہ فقرہ نامکمل رہ جاتا تھا۔ اب مدنی کے علم اور مسائی سے ایسا بدگمان ہونا تو ممکن نہیں کہ اسے اپنی نظم میں وہ مبتدا بغیر خبر کے نظر

نہیں آیا تھا۔ تو اس نے اسے نامکمل کیوں رہنے دیا؟ مجھے یقین ہے اس لئے کہ وہ ناتمامی اور بے ترتیبی جو ہمارے چاروں طرف ہے اس کا عکس قاری کے ذہن پر محیط کرنا چاہتا تھا کہ وہ آدھے فقرے کو دیکھ کر پریشان ہو جائے۔ بات بے تعلق ہے ادب سے مگر برتر علم کی ہے۔ اس لئے کہے دیتا ہوں۔ مشہور امریکی فلسفی والٹر کاف مین نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف A Critique of Philospphy and Religion میں مہاتما بدھ کا ایک قصہ بیان کیا ہے۔ اس کی ایک صدیقہ کسی اقلیم کی مہارانی تھی۔ مہاراجہ اس مہارانی کا شوہر اپنی بیوی کی مہاتما بدھ سے عقیدت پر حیران تھا۔ اس کے پردھان منتری نے ایک دن اسے مشورہ دیا کہ مہارانی سے کہئے کہ مہاتماجی سے فلاں بات پر ان کی رائے پوچھیں۔ وہ معاملہ روزمرہ زندگی کا تھا اور اہم بھی نہ تھا۔ مہارانی نے ایک پرستار مومن کی زبان میں مہاتما کو خط لکھا جس میں سوال کا جواب بڑے ادب سے پوچھا تھا۔ سفیر نے جاکر خط دیا۔ مہاتما نے پڑھا اور سفیر سے کہا۔ میرا جواب لکھ لو۔ اب مہاتماجی نے بیس صفحات لکھوا دیئے۔ ہر فقرے کے بعد سوال کو دو تین دفعہ دہرایا گیا۔ حیران و ششدر سفیر جواب لیکر دربار میں پہنچا۔ اور مہاراجہ صاحب کے حکم پر جواب پڑھ کر سنانے لگا۔ آدھا خط ختم نہیں ہوا تھا کہ مہامنتری سو گئے۔ دو چار فقرے بعد مہاراجہ صاحب نے سر پیٹ لیا اور کہاں بس کرو راج دوت جی۔ میں جان گیا۔ میں جان گیا۔ یہ کہا اور جلدی سے راج سنگھاسن چھوڑ کر سامنے روشوں پر افتاں خیزاں ٹہلنے لگا۔ صرف صدیقہ نے بات سمجھ کر سجدہ کر دیا۔ شکرانے کا

مدنی چوکس فنکار تھا۔ کئی دفعہ وہ قاری کے شعور میں بے اطمینانی اور بیزاری کی کیفیت پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے ایسے بے ترتیب اور Disintegrated بیان کو وسیلہ بناتا تھا۔ جب میں نے یہ بات جان لی تو وہ خامی نہیں صناعی بن کر دکھائی دینے لگی۔

میں ماہرین فن تنقید کو نہیں، اپنے جیسے ادب کے بتدی شائقین کو پوری ذمہ داری سے یہ مشورہ دوں گا کہ وہ "دشت امکاں" کی غزلیں اور نظمیں پڑھنے سے پہلے "دانش حاضر کے سواد میں" کو ایک بار نہیں بار بار پڑھیں تاآنکہ جو باتیں مدنی نے اس میں کہی ہیں وہ پوری طرح ان کے ذہن کی گرفت میں آجائیں۔

دیکھئے مدنی ابتداہی میں کہتا ہے: "ہر دور میں تہذیب و ثقافت کے نیک و بد کو، سیاہ و سفید کو، ساز کے پردوں میں کوئی آہنگ، حرفوں کی اوٹ میں کوئی موج نفس التی پلٹتی رہتی ہے۔ ادب کی یہ خوئے سینہ شگافی بہت پرانی ہے۔ دور جدید میں بعض لوگوں کے لئے یہ دل آزاری کا باعث ہو گئی ہے۔ مگر یہ ملال بے وجہ ہے۔۔۔ آج کی دنیا کی ساری فضا ایک اندرونی پیکار میں مبتلا ہے۔ ایسے ماحول میں یہ سوچنا ضرور چاہئے کہ آدمی کن راہوں پر گزر رہا ہے۔ اور اس کی منزل کیا ہے۔" ذرا آگے چل کر کہتا ہے۔ "ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہونے والی زندگی کے

کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ لباس کی تراش، زبان کے نئے مفہوم، فکر کے تازہ سواد تلاش کرتی رہتی ہے۔ اس تلاش کو ادب اپنی روح سمجھتا ہے۔ اس کے اشارے، استعارے، علامتیں، روایات سے منسلک ہو کر بھی ایک نئے آہنگ معنی میں سامنے آتی ہیں۔ اس صدی کے ادب میں انسانی روح کے اضطراب کی وہ حیرت انگیز تازہ شکلیں ملتی ہیں جو خود ادب کے طالب علم سے ایک عمر کے مطالعے کی طالب ہیں۔"

قاری کی سطح پر یہ عمر بھر کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ ظاہر و باطن میں جدید فکر ایک سیل بے کراں ہے۔ اس سیل میں سیاسی، نفسیاتی، جنسی بلاخیز موجوں کا دیوانہ پن ہے۔

آگے چل کر شاعر کے اندر کا صنعت گر الفاظ کہتا ہے۔ "سچ پوچھئے تو ادب کے اٹھائے ہوئے سوالات اتنے الگ، ان کے تعلقات اتنے پیچیدہ، ان کی زبان اتنی اجنبی ہے کہ وہ اپنے مفہوم کی پوری ادائیگی کے لئے ایک نیا شعور یا تاریخ کا ایک نیا رویہ چاہتی ہے۔ بیسویں صدی سخن گسترانہ باتوں کی صدی ہے (ہر صدی ایسی ہوتی ہے۔ حمید نسیم)۔ آج کا آدمی نیا ہے۔ اس کے آداب و اطوار، اس کی تعلیم و تربیت، اس کی تہذیب و ثقافت کا راستہ جدا ہے۔ ہر زمانہ حال کے الگ وجود کو عارف و عامی روح عصر بھی کہتے ہیں۔"

"ادیب روح کی پیچیدگیوں کو سمجھتا ہے۔ مگر ادیب ماہر نفسیات نہیں ہوتا۔ سیاسی مفکر نہیں ہوتا۔ رہبر و صوفی نہیں۔ وہ زندگی کی مایوسیوں کو اس کی سرخوشی، اس کے پیچ و تاب کو ایک اپنی زندگی کا حصہ سمجھ کر دبی زبان میں کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے۔ شعر میں سب سے گہرے دکھ اور سب سے گہری سرخوشی کا انکشاف ہوتا ہے۔ انکشاف اپنی تمامتر معنویت کے ساتھ۔ دل کی زرخیز مٹی میں پڑے ہوئے کسی بیج سے پھوٹتی ہوئی شاخ گل سے شاعر کے سر کا تاج بھی بنتا ہے اور اس کے کفن کی چادر بھی۔"

اب ایک آخری مختصر سا اقتباس دے کر مدنی کے نظریہ فن اور اس کے جہانِ معنی کا تعارف ختم کرتا ہوں۔

"جدید فکر کی فضا سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا اور شعر و ادب کا ماحول کوئی الگ چیز ہی نہیں رہ گئی ہیں۔ شعری وجدان میں اتنی سکت ہونی چاہئے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ سکے۔"

مدنی نے بہ صراحت کہا ہے کہ شاعر رہبر و صوفی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ آج کی فضا سائنس اور ٹیکنالوجی کی فضا ہے۔ تو اب یہ ظاہر ہو گیا کہ مدنی کے اندر کا تخلیق کار رومی و عطار حافظ، نظیری و عرفی، بیدل اور صائب، میر اور غالب کے جہان معنی جیسا جہان نہیں رکھتا۔ اس کی فکری اور وجدانی دنیا جدید تر ٹوکیو، لندن، نیویارک، لوس اینجلز اور نیو آرمز کی دنیا ہے۔ اس کے ساتھ تتمے کے طور پر مشرق کے ترقی پذیر ملکوں کے بڑے شہر کراچی، بمبئی، طہران اور قاہرہ،

سمرقند و بخارا بھی ہیں ۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں آواز سے تیز مسافر بردار اور جنگی طیاروں کی کانوں کو زلزلا دینے والی آواز، ہوور ریل گاڑیاں (ہوا کے دبیز گدے پر چلنے والی) فولاد سازی کے کارخانے، بڑی ملیں، بڑی شاہراہوں پر صبار فتار لگژری موٹر کاریں ہیں، دھواں ہے ۔ جس میں امیرزادیوں کے بیش بہا پرفیوم کی خوشبوئیں بھی شامل ہیں ۔ شبانہ رقص گاہوں کے طرب و نشاط کی خریدی ہوئی سرمستی بھی ہے ۔ ہاں کوئی ایک آدھ میرے جیسا مریل انسان بھی ہے جو ابھی رومی حافظ کو میر و مرزا کو حرزِ جاں بنائے ایک اجنبی نووارد کی طرح پھرتا ہے ۔ جس تس کا منہ تکتا ۔

مہ و سال کی گردش کی لائی ہوئی یہ تبدیلی زندگی کا جبر ہے ۔ مدنی اسے انسانی سفرِ آگہی کی ایک فتح مندانہ پیش قدمی قرار دیتا ہے اور وہ اس آنے والی اجتماعی ہیئت کی بشارت دیتا ہے جب ہر آدمی اندر باہر پوری طرح آزاد ہوگا ۔ یہ آزادی علم اور ذوقِ نمود کے وصال سے حاصل ہوگی سو خوش آیند ہوگی ۔ مادر پدر آزادی نہیں ہوگی ۔

مدنی کی شاعری اس تابناک فردا کا، اس عصر کے شعور، اس کی آگہی، اس کے احساس کی تہذیبِ نو کا پیغام بھی ہے اور وسیلہ بھی ۔ "دشتِ امکاں" جیسا کہ دوسرے مجموعہ کا نام گواہی دیتا ہے زندگی کے نو بہ نو عیش و ملال کا غم و خوشی کے بے انت امکانات کا دشت ہے ۔ اور انسان آج کا انسان اس دشت کا مسافر ہے ۔ بات ذرا سی بدل کر کہوں تو زیادہ مناسب ہوگی ۔ یہ "دشتِ امکاں مدنی کے علم اور اس کی تخلیقی وجدان نے یک جان دو قالب ہو کر تخلیق کیا ہے اور اس کا مسافر کہو رہرواں کہو، زائر کہو، خود عزیز حامد مدنی ہے ۔ ہم اس دشت کے مناظر مدنی کی شاعری میں دیکھیں گے ۔

کتاب کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے ۔ یہ بھی پرانے مدنی کی ہے ۔ ۱۹۴۸ء میں کہی ہوئی نظم ۔ اب مدنی بھارت سے پاکستان آچکا ہے ۔ اور یہ ہجرت ہمہ شوق ہمہ امید ہی نہ تھی ۔ اپنی ساری روایات اپنے فکری اور مادی سرمایۂ اعصار کو تج کر نئی دنیا کی طرف ہجرت بھی ہے ۔ یہ نظم اپنا زمانی محل خود معین کر دیتی ہے کہ اس میں ترقی پسند مکتب کے شعر کا اسلوب موجود ہے ۔ میں مرحوم ظہور عالم شہید کے ساتھ دلی کے کالجوں میں سالانہ مباحثوں میں شرکت کے لئے گیا ۔ ۱۹۴۲ء کے آخر میں، اینگلو عربک کالج میں مباحثہ تھا ۔ اس میں شرکت کے لئے اخترالایمان بھی موجود تھے ۔ ابھی مہمان خصوصی کا انتظار تھا ۔ سو یونین کے منتظموں نے اعلان کیا کہ اس مباحثے میں شرکت کرنے والوں میں کچھ شاعر بھی آئے ہیں ۔ مباحثہ کے آغاز میں ابھی کچھ دیر ہے سو ان کا کلام سننے کا موقع مل گیا ہے ۔ پہلے اخترالایمان کا نام پکارا گیا ۔ وہ آئے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا ۔ انہوں نے نظم شروع کی جس کا دوسرا یا تیسرا مصرع کچھ یوں تھا ۔ جس طرح اک فاحشہ عورت کو شوہر کا خیال اس "فحاشی" پر انہیں نظم ختم کرنے کا حکم دیا گیا اور اسٹیج سے اتار دیا گیا ۔ میرا نام پکارا گیا ۔ میں نے کہا اتنے اچھے شاعر کی آپ نے ایسی توہین کی ہے اس کے بعد مجھے شعر خوانی کے لئے بلانا نہ صرف

بد اخلاقی ہے بلکہ جہل محض بھی ہے ۔ اس پر عزیزی جمیل الدین عالی نے ۔ کیا خوبصورت لڑکا تھا مباحثہ تلپٹ کر دیا اور کالج میں ہڑتال کروادی ۔ یہ واقعہ تو مجرد تنقید کی خشکی دور کرنے کے لئے بیان کر دیا ہے ۔ کہنا مجھے یہ تھا کہ ایسی باتیں ایسے مضامین ، ایسی تشبیہیں اس زمانے کی ترقی پسند شاعری میں عام تھیں ۔ جیسی اس بند میں ہے جو میں اب نقل کرنے کو ہوں ۔

بیضوی ماہتاب ۔ سوئے افق
ایک یرقاں زدہ ۔ مریض کی آنکھ

چاند کو زردرو اقبال نے بھی کہا ہے ۔ روح کی دنیا سے تعلق رکھنے والے اور سائنس کی معملات کے ناظر کا فرق یہاں نظر آجائے گا ۔ اقبال کہتے ہیں ۔

یہ پچھلے پہر کا زردرو چاند ----- بے راز و نیاز آشنائی
تارے آوارہ و کم آمیز --- تقدیر وجود ہے جدائی

مدنی ۱۹۴۸ء میں اقبال کو پڑھ چکے تھے ۔ اور اقبال کی یہ عظیم غزل انہیں زبانی یاد تھی ۔ انہوں نے اقبال کے زردرو چاند کو " کسی یرقاں زدہ مریض کی آنکھ " کہا ہے ۔ ایسی تشبیہیں بڑے شہروں کی پسماندہ بستیوں Slums میں بسنے والے لوگوں کو اکثر سوجھتی ہیں کہ وہ پیدا ہی بیمار ہوتے ہیں ۔ اور بھوک اور افلاس کی شدت قدرت کے جمال کو بھی گھنا دیتی ہے ۔ زشت رو بنا دیتی ہے ۔ ابھی شاعر مصرعوں میں ایک سطح آہنگ کی قائم رکھنے کی منزل پر نہیں پہنچا ۔ اس شعر کے فوراً بعد یہ بند آتا ہے ۔

رات کا طنز روشنی کا ہدف
ریگ ساحل سے پر غلیظ صدف
مبتلائے فریب دیدہ وری
جہد شورش اسیر خودنگری
محو صد شیوہ ہائے بال و پری

یہ پانچوں مصرعے پچھلے پہر کے چاندی کے بارے میں ہیں ۔ یہاں سارے الفاظ " بال جبریل " کے نظر آتے ہیں ۔ دیدہ وری ، خودنگری ، بال و پری کہ اقبال انہیں بڑی کثرت سے استعمال کرتے ہیں ۔ جوش نے اقبال کی لغت استعمال کرنے سے میرے خیال میں دانستہ احتراز کیا تھا ۔ ان پانچ مصرعوں میں سچے احساس کی لو صرف دوسرے مصرعے میں ملتی ہے ۔ وہ یرقاں زدہ آنکھ ، ریگ ساحل سے پر غلیظ صدف کے مانند بھی نظر آتی ہے ۔ باقی چاروں مصرعے غیر مربوط ہیں اور مطلوبہ تاثر سے بالکل مختلف تاثر ادب آشناقاری پر قائم کرتے ہیں ۔

اس دور کی یہ پہلی نظم ہے سو اس کا بند بہ بند احاطہ کرنا ضروری ہے ۔ کہ یوں اس نوع اس سطح کی باقی نظموں پر بات کرنا ناگزیر نہیں رہے گا ۔

تیسرا بند ہے۔

ایک بے خواب دھند میں مستور
اک معلق بجھا ہوا سا تنور
اک گرہ خوردہ دور ماہ و سال
ربط کی سعی میں بین ماضی و حال
پارہ ۔ گوشت برسر چنگال

پہلے تین مصرعے چاند کا منظر وسیع تر ماحول میں معین کرتے ہیں۔ بے ضو چاند فضا میں معلق، دھند میں نیم مستور، اس تنور کی طرح ہے جو ابھی پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا۔ چوتھا مصرعہ شاعر کے باطن کے بارے میں ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وقت، کہ ماہ و سال کا دائرہ ہے، اس چاند کو ازل سے لے کر چند سال پہلے تک کے زمانے کے چاند سے ملا کر دیکھ رہا ہے۔ دونوں میں ایک تسلسل ایک ربط قائم کرنا چاہتا ہے۔ پانچواں مصرع شاید یہ بتاتا ہے کہ وہ سعی ربط ناکام ہوئی اور اندر سے گئے وقت نے صدا دی کہ یہ چاند تو نہیں یہ تو کسی درندے کے ہاتھ میں گوشت کا ٹکڑا ہے۔ کسی شکار تازہ کے جسم سے کاٹا ہوا ٹکڑا۔ یہ چاند گوشت کا ٹکڑا کیسے ہو گیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کسی بھی تلازمہ۔ خیال سے زرد رو چاند درندے کے چنگال میں پارہ گوشت نظر نہیں آسکتا۔ کسی فرنگی چرس یا افیون کے تند و تیز نشہ کے عادی شاعر نے ایسا انتقال ادراک یا تغیر حسن بیان کیا ہو اور مدنی صاحب کے ذہن میں وہ کہیں سے آکر ٹک گیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ جتنا عالمی ادب اور مشرق کا ادب میں نے پڑھا ہے اس میں چاند کو گوشت کا لوتھڑا یا ٹکڑا کہیں نہیں دیکھا۔ گوشت تازہ ہو تو رنگ تازہ لہو کا سا چمکتا سرخ ہو گا۔ یہ زرد رو چاند ایسے یکایک تازہ سرخ لہو کیسے ہو گیا۔ میری فکر سے یہ بات بہت آگے کی ہے۔ ہو سکتا ہے نوجوان تخلیق کار ندرت کی تلاش میں جنگل کے کسی خونین منظر تک پہنچ گیا ہو مگر مجھے یہ مصرعہ یہاں زائد اور بے ربط نظر آیا آسکر وائلڈ کے ڈرامے "سلومی" میں سلومی رقص کرنے کے بعد بادشاہ کے اس ارشاد پر کہ جو مانگنا ہو مانگو۔ یحییٰ نبی کا سر طشت سیمیں پر مانگتی ہے۔ محل کے باہر دو محافظ سپاہی چاند کے ضرورت سے اور معمول سے کہیں زیادہ بے ضو اور بے رنگ ہونے کا ذکر کرتے ہیں اس میں کئی مثالیں چاند کے لئے ملتی ہیں۔ لیکن ہونے والے قتل کی رعایت سے بھی کٹا ہوا سر یا گوشت کا ٹکڑا چاند کو نہیں کہا گیا۔

اگلا بند دشت سے اک گونہ ربط تو رکھتا ہے۔ مگر Weird ہے۔ کچھ ژولیدہ فکری کے سے آثار آگے آنے والی تمثیل میں نظر آتے ہیں۔

نیند نے ڈال دی ہے اپنی کمند
سو گیا ایک ریچھ کے مانند

اوڑھ کر برف کا مہیب غلاف
ران شانے کھلے ہوئے موباف
اک خلش رہ گئی ہے زیرِ ناف

بات تو چاند کی ہو رہی ہے ۔ شاعر کی فکر میں کسی دھوئیں سے معمور قلاش بستی کا ماحول ہے ۔ جہاں تیرگی اور تپ‌جھلے پہر کی کہر اور دھوئیں سے بچ نکلنے والی نیم مردہ چاندنی ایک نہایت دہشت انگیز سماں پیدا کر رہی ہے ۔ اور اگر چاند ہے جو سو گیا ہے تو تیسرے سے پانچویں مصرعہ تک بیان چاند کا نہیں ، اس منظر کا ہے جہاں سے یہ چاند اس عالم میں دکھائی دے رہا ہے ۔ زیرِ ناف خلش سی رہ جانا ۔ ران اور شانے اور موباف کا کھلا ہوا ہونا یہ اس نیم آباد و نیم ویران بستی کی ظاہری کیفیت ہے ۔ تپ‌جھلے پہر کا چاند گہری کہر میں ریچھ سا نظر آنے لگا تھا ۔ ہمارے علاقے کا سیاہ ریچھ نہیں ۔ برفانی علاقے کا بسکٹ رنگ کا ریچھ ہے ۔

چوتھا بند چاند اور چاند کے دیکھنے والے کا ربط بیان کرتا ہے ۔

خشت بے جاں بنانے والے ہیں
اس کی ضو کو بجھانے والے ہیں
تنگ دل تیرگی کا اک درپن
سرخ ہیں اس کے خواب کے دامن
قصر و ایوان ہیں یا قبا و کفن

یہ بند بھی خاصا ابہام رکھتا ہے ۔ پہلے تین مصرعے تو صاف ہیں ۔ یعنی یرقان زدہ زردی جو کہر میں سے جھانکتے بجھے بجھے سے چاند میں نظر آ رہی تھی وہ بھی اب بجھا دی جائے گی ۔ چاند ایک مردہ بے رنگ گول اینٹ بن جائے گا ۔ اس کی جاں بلب ضو بجھ جائے گی ۔ اور اسے بجھائے گا Slum یعنی تیرہ جاں اور سیاہ پیکر بستی کا درپن جہاں گھٹن اور دل تنگی کے سوا کچھ نہیں ۔ وہ آئینہ جو اب تک اس ضو کا عکس دکھا رہا تھا ۔ یرقان کے مریض کی آنکھوں کا سا ۔ اب وہ آئینہ کہر سے اور بے جلا ہو گیا ہے ۔ سو اس کی تیرگی اس چاند کو جلی مٹی کی اینٹ بنا ڈالے گی ۔ اس اجڑے آباد بن کے آئینے کے کنارے شب بیداری کی جلن سے سرخ ہو رہے ہیں ۔ شاید یہاں "سرخ دامن" لگا کر شاعر پہلے آنے والے پارہ ۔ گوشت بر سرچنگال کی تمثیل سے ربط اور اس کا نفسیاتی جواز پیدا کر رہا ہے ۔ یہ درپن خواب سے بوجھل سرخ آنکھ ہے اس اجڑی بستی کی ۔ آخری مصرعہ زمین کے اس حصہ کے بارے میں ہے جو اب تک چاند کی یرقان زدہ ضو کو وصول کر رہا تھا ۔ اگر یہ Slum ہی کا ذکر ہے ۔ بمبئی یا کراچی کے غریب لوگوں کی بستی کا تو "ایوان" کا لفظ ذرا زیادہ مکرم و معظم ہے ۔ ایوان تو بادشاہوں اور امیروں کے ہوتے ہیں ۔ اور روشن و تاباں ہوتے ہیں ۔ چلو یہ بھی جائز سمجھو کہ شاعر فضا میں بے ترتیبی سی پیش کرتا ہے ۔ تو اس بستی کی "قبریں" اور اس کی زندہ لاشوں

کو پناہ دینے والے "ایوان" کا ذکر کیا ہے اب یہ قبریں اور یہ ایوان قبا و کفن ہیں اس سارے منظر کے لیے۔

شاعر مسافر ہے۔ اجنبی دیس میں آیا ہے۔ تنہا ہے۔ کشتی نوح امید نجات اور نئی زندگی کے آغاز کے لیے علامت ہے۔

کچھ نہ پایا تھا گیا عدم کے لیے
اک ترازوئے کیف و کم کے لیے
کیا یہ آوارہ و فسردہ روح
اک جفائے سفر سے ہے مجروح
راہ میں مل سکی نہ کشتی نوح

یہ مسافر تو حضرت یونس کی طرح دہان ماہی سے موج آب کے ساتھ باہر آیا اور اس ویران بستی میں پھینک دیا گیا۔ آخری بند ہے۔

چند الجھے ہوئے غباروں سے
اور دھندلکوں کے کوہساروں سے
ماہتاب آور ہم کنار ہوا
میں بھی کیا کیا ذلیل و خوار ہوا
آج سورج کا اعتبار ہوا

پہلے تین مصرعے اب تک کے بیان کئے ہوئے منظر کو سمیٹتے ہیں۔ یہ غبار، کہرا، دھواں اور ان کے پیچھے دھندلکے کے کوہسار چاند اور ہوا جو مسلسل ہم کنار رہی وہ سمندر کی ہوا ہے۔ بلا توقف آرہی ہے۔ اس منظر نامے میں "میں" خود کو بہت آزردہ و آشفتہ محسوس کرتا ہے۔ چونکہ ایسی بے مہر تنہائی کا عادی نہیں سو بعد سفر" اپنے اندر ایک اجنبی ماحول میں" ذلت و خواری کے احساس تلے دب جاتا ہے۔ لیکن پھر اس کے اندر Compulsive Optimism کہتی ہے کہ ایسی مہیب تنگدل تیرگی جو چاند کی قبر بن گئی۔ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس گرد و نواح میں۔ یہاں گرد و نواح لازماً شہر کا نہیں۔ زمانی گرد و نواح بھی ہو سکتا ہے۔ سورج لازماً موجود ہے۔ اور بالآخر طلوع ہو گا۔ اور یہ کہسار یہ ربجھ جیسی تیرہ نصیب چاندنی جو آخر بجھ جاتی ہے ایک نہ ایک لمحے طلوع سحر کے لئے جگہ خالی کر دے گی۔

ہو سکتا ہے میں نے نظم کو سرے سے سمجھا ہی نہ ہو۔ بہر حال میں جو بھی ان مصرعوں میں ڈھونڈ سکا، جو وحدت خیال میں پیدا کر سکا وہ میں نے کر دی ہے۔ میرے خیال میں مدنی کی نظموں کی بظاہر بے ترتیبی ایسی ہی سعی توضیح و ترتیب چاہتی ہے۔ شاید کسی برتر فہم شعر رکھنے والے سخن شناس سے۔

اس کے بعد ایک مختصر نظم ہے ۔ " انتظار " ظاہر ہے دل زدہ شاعر اپنے اس محبوب کا انتظار کر رہا ہے جو نہیں آئے گا ۔ اور اس انتظار کی بے مثال تصویر فیض احمد فیض اپنی نظم " تنہائی " میں پیش کر چکے ہیں ۔ مدنی کی اس نظم کا میں صرف ایک بند نقل کروں گا ۔ جس میں Blurred Vision کی بہت اعلیٰ مثال موجود ہے ۔ ایسی دھندلی تصویر جس میں سب چیزیں اپنی شکل کھو دیتی ہیں ۔ رنگ اور خدوخال گڈمڈ ہو جاتے ہیں ۔ سب سے پہلے حسی نادرہ کاری Perception کا یہ رخ رامبو نے اپنی عدیم النظیر شعری تخلیق Illuminations میں کیا تھا ۔

اوس کھڑکی کے کھلے شیشے پر
برص کے داغ کی صورت تارے
طنزاک رات کے آئینے پر

کھڑکی میں شیشے ہیں ۔ کھڑکی کے پٹ بند ہیں ۔ باہر اوس بھی پڑ رہی ہے ۔ اور دھند بھی اپنی نم چادر شیشے پر ڈال رہی ہے ۔ اب تاروں کی روشنی جب اس کہر اور اوس کے نم سے چھن کر اندر پہنچے گی تو وہ واقعی جھلمل نہیں برص کا سا داغ نظر آئے گی ۔ میری حسِ جمال ایسی کراہت انگیز تصویروں سے بہت گھبراتی ہے ۔ لیکن میں پرانی وضع کا آدمی ہوں ۔ اب ساری دنیا کے شاعر اور ناول نگار اور کہانی لکھنے والے اور مصور پیچیدہ اور کئی سطحوں پر ناپسندیدہ Reality کو ویسے پیش کر رہے ہیں جیسے ان کی احتجاجی نگاہ انہیں دیکھتی ہے ۔ ڈبڈبائی آنکھیں محبوب کے چہرے کے جمال کو اب صاف نہیں دیکھ سکتیں ۔ وہ دلآویز جمال بھی گڈمڈ ہوتا ہے ۔ مگر میں اپنے محبوب کو مدتوں بعد ملوں اور میری آنکھوں میں آنسو امڈے ہوئے ہوں تو میں اسے یہ نہیں کہوں گا کہ پیاری یوں لگتا ہے تیرے چہرے کو برص کے داغوں نے گھناؤنا بنا دیا ہے ۔ لیکن امریکہ سے لے کر چلی اور برطانیہ اور فرانس اور سارے مغرب و مشرق کا جدید ادب ایسی ہی تماثیل پیش کر رہا ہے ۔ سو مدنی موردِ الزام نہیں کہ غزل میں اس نے بہت دلفریب نظارے بھی دکھائے ہیں ۔ اب میں ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کی ساری نظموں سے صرف نظر کرتا ہوں کہ اس دور کی ساری نظموں میں ابھی تک رائے پور سے آئی ہوئی ذہن کی رو جو بھارت کے ترقی پسند ادب کی روایت سے وابستہ تھی ابھی تک جاری و ساری ہے اور سطح میں پستی یا بلندی نمایاں نہیں ۔ ایک ہی نہج ایک ہی جمالیاتی قدر Value سب میں مضمر ہے ۔

اب میں ایک طویل نظم پر بات کروں گا ۔ " صلیبوں کی اوٹ " یہ میری نظر میں مدنی کے شعری سفر میں بالخصوص نظم کی حد تک ایک اہم سنگِ میل ہے کہ وہ پرانی مانوس تراکیب، تشبیہیں، استعارے، مصرعے کی بناوٹ کے اسلوب جو تمام ترقی پسندوں میں مشترک تھے اور بہت جلد کلیشے بن گئے تھے ، جیسے آج کل نصاب / ہجرت / ہجرتیں / اوڑھنے / اوڑھنا / اوڑھے ہونا /

زر / پانی جدید تر شاعری میں کلیشے بن گئے ہیں، اس نظم میں کاملاً غائب ہیں۔

"صلیبوں کی اوٹ میں" کا پس منظر دوسری عالمگیر جنگ ہے۔ اس کی ہولناکی، شہروں میں بے گناہ شہریوں کا بچوں، بوڑھوں، حاملہ عورتوں کا قتل عام، ہوائی بمباری سے، وی راکٹوں سے، ٹینکوں کا شہروں بستیوں کو پلک جھپکتے میں ویرانہ بنادینا، سمندر کے پانیوں کا انسانی لہو سے سرخ ہوجانا سب شاعر نے بیان کیا ہے۔ اور پھر کہا ہے کہ اس جانکاہ نوعی سانحے کے بعد جو ایک خونیں رات کی طرح آیا طویل خوں رنگ رات بن کر اب اس کے پیچھے سے صبح کی نرم ضو کرنیں نمودار ہونے لگی ہیں۔ اب میں بند بہ بند نظم کی توضیح نہیں کروں گا۔ کہ یہ ناقدانہ جائزہ ہے مکتب کا درس نہیں۔ صرف نئے اسلوب نئی تشبیہوں اور نئے لہجے کی مثالیں پیش کروں گا۔ تاکہ قاری مدنی کی شاعری میں اس اہم موڑ کو ذہن نشین کر سکے۔ "صلیبوں کے اوٹ میں" نام اس لئے رکھا کہ ایک تو صلیب دورِ قدیم سے اہل حق کی قربانی اور نذرِ جاں کے لئے علامت رہی ہے۔ اور پھر یہ کہ مغرب کی ساری بر سر جنگ اقوام کے لئے صلیب ایک مقدس علامت ہے کہ حضرت مسیح کی Crucifixion سمبل ہے۔ حضرت مسیح نے صلیب پر چڑھ کر ساری نوع انسانی اور آدم کے گناہ اول کا مسیحیوں کے عقیدے کے مطابق کفارہ ادا کر دیا تھا۔ جہاں جہاں بھی یہ افواج لڑیں، برما میں کہ سنگاپور اور ملایا میں کہ فلپائن میں کسی ساتھی کو کسی رفیق کو دفن کرنے کا وقت ملا تو اسے دفنا کر اوپر صلیب گاڑ دیتے تھے۔

پہلا بیت ہی سابقہ اسلوب سے روگشی کا مظہر ہے "ہوا کی رو میں لرزتا پرچم، سکون و شورش کا ایک سنگم" قومیں اپنا پرچم ہمیشہ سربلند رکھتی ہیں۔ عالم آشتی میں علم ترقی و تعمیر اور قومی یک جہتی کی علامت ہے اور پر آشوب زمانوں میں عزم و ہمت جرات و شجاعت کا۔ نیز یہ پوری اجتماعی سائی کے کا سمبل ہوتا ہے۔ اور افتخار قومیت کا بھی۔ یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ ہوا مدنی کا اہم شعری کردار ہے۔ ہوا تغیر کی رو ہے۔ ہوا پرانی رسوم کو اڑا کر عدم کی طرف لے جانے والی اور تازہ بشارتوں اور صباحتوں نئے اقدار کو لانے والی قوت بھی ہے۔ یہ ایک کثیر المعانی علامت ہے۔

پہلے دو مصرعے پرچم پر ہوا کے اثر کا بیان ہیں۔ ان میں صرف ایک املا کی غلطی ہے۔ نظم کا وزن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن ہے۔ ہر ایک جنبش کھلی ہوئی شاہراہ ہے بیتاب آہٹوں کی۔ راہ کو پوری طرح ادا کریں تو مصرع خارج از بحر ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ رہ گزر بھی آسکتا تھا۔ ہر ایک جنبش کھلی ہوئی رہ گزر ہے بیتاب آہٹوں کی۔ جنبش اور آہٹوں کے لئے ویسے بھی شاہراہ غلو کا حامل لفظ ہے۔ آہٹیں بہت نرم ہوتی ہیں۔ جنبش بھی بگولا یا تند ریلا نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں شاہراہ کا لفظ ابھی جوش کے بلند بانگ اسلوب کی جلد غائب ہو جانے والی گونج ہے۔

آگے کے مصرعے اہم ہیں۔

کواڑ ہیں بند اور حویلی میں شمع کی کوئی لو نہیں ہے

غبار رہ سے اٹی ہوئی کھڑکیوں میں جنبش کی رو نہیں ہے

کتنا تاریک اور کیسی گھٹن کا عالم ہے۔ کوئی جنبش نہیں۔ کوئی آہٹ نہیں۔ کواڑ قوت سے بند کیے ہوئے ہیں۔ بتی بھی نہیں جلائی کہ پناہ گاہ دور سے نظر نہ آجائے۔ بڑھتی فوج کو یا دشمن کے ہوائی جہازوں کو۔

اب آگے کے مصرعے دیکھیے۔

مٹھے ہی جاتے ہیں سرد جھونکے مگر اسے، اس کے ہر نفس میں
یہ روح آزاد ہے قفس میں

جو یہاں کواڑ بند کیے بیٹھا ہے، وہ جی ہارا ہوا، سہما ہوا شخص نہیں ہے۔ دل آزاد رکھنے والا ہے۔

اب یہاں تمام دنیا پر روئے زمین پر محیط آتش و آہن کا سیل اور آگ کے سمندر کا طوفان بند بہ بند بیان کیا ہے۔ آرزوؤں اور خدشوں کو خلط ملط کیا ہے۔ ایک باشعور صناع کی طرح۔

یہ اک مقفل کواڑ پر دستکوں کی اک خونچکاں کہانی
یہ ربط لوح و قلم سے اک حرف زندہ افکار کی جوانی
یہ اک مہکتا ہوا سمندر ہے جزر و مد اس کا کس کے بس میں
یہ موج طوفاں کہ محو بازی گری ہے انبار خار و خس میں
یہ ایک کشتی کہ اپنے دامن میں امن ساحل لیے ہوئے ہے
سکون منزل لیے ہوئے ہے

پہلے دو مصرعوں کا موضوع فرانس کی انڈر گراونڈ مزاحمتی تحریک Resistance Movement کی بند حویلی لگتی ہے۔ جہاں ہر لمحہ شبخون کا، گسٹاپو کے اچانک پناہ گاہ ڈھونڈ لینے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی پناہ گاہوں میں ژاں پال سارتر، سموں ڈی بوار، البرٹ کامو اور دوسرے تخلیق کار، فلسفی، دانشور اخبار نکالتے تھے۔ ہاتھ سے چھاپتے تھے۔ راتوں رات تقسیم بھی کردیتے تھے۔ جس سے گوریلا فوج کو مخفی کوڈ میں ہدایات بھی دی جاتی تھیں۔ ایسے ہی ایک تخلیق کار پال ایلوآگ کا کتاب کے شروع میں ذکر ہے جس کے ابیات حریت کو یہ کتاب معنون کی گئی ہے۔ دیکھو طاغوت آتش و آہن کا خونیں کھیل کھیل رہا ہے اور بستیاں، شہر، انبوہ آدم اس کے لئے بازی گاہ خار و خس سے زیادہ نہیں۔ بس ایک کشتی عزم انسانی کی ہے۔ جو اس بلاخیز سمندر میں رواں ہے۔ بے خطر۔ جو اپنے اندر Inner Core میں امن ساحل کی نوید ہے۔

آگے جنگ کا دل دہلا دینے والا بیان ہے۔

اداس راہوں میں بادلوں کی طرح اندتی شکستگی سے
جگا رہی ہے فسردگی جہاں کو اک خواب آہنی سے
قدم پکڑتی ہوئی یہ مہماں نوازی ویرانیاں ہر اک سو

وہ سرد ٹوٹی ہوئی چٹانوں پہ تیز گند ھک کی رینگتی بو
کبھی کبھی سامنے لپک کر یہ راہ کھوئی بھی کر چکی ہیں۔
یہ رنگ نشتر اتر چکی ہیں۔

گند ھک کی بموں سے ٹوٹی چٹانوں پر رینگتی بو مقام Locale کو متعین کر رہی ہے۔ یہ مہمان نواز ویرانیاں کبھی لپک کر راہ میں آجاتی ہیں۔ راز فاش ہو جاتا ہے۔ تو نتیجہ ہلاکت اجتماعی ہوتا ہے۔ مزاحمتی گروپوں کے لیے۔ آگے کے بند بہت خوبصورت ہیں۔ قاری خود توجہ اور پورے وجود کے ارتکاز سے پڑھے۔ بیچ میں برہمن کا لفظ دو دفعہ آیا ہے۔ وہ صرف انسان کے اندر پرانی قدروں کے پنہاں پرستار کے لئے علامت ہے۔ اس نظم کے منظر اور ایکشن میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اب آخری بند دیکھئے۔ جو اتنی ہلاکتوں، اتنی جاں نثارانہ مزاحمت، اتنے زیانِ جاں کے بعد آتا ہے۔

سمٹ کے سرگوشیاں سی کرتی رہی ہے شبخون کی حزیں رات
وہ جس کے جابر سکوت کی منتظر تھی روحِ مسیح و سقراط
یہ اک طلوعِ سحر صلیبوں کی اوٹ سے، زہر کے سبو سے
افق افق اک نوائے تازہ نفس سی ہے ساز کے لہو سے
یہ دور شبخوں طلوعِ مہر و ندائے شعلہ نفس کی موجیں
یہ نرم جاں روشنی کی فوجیں

ہر شبخوں۔ مزاحمتی گروہوں کا چھپ کر غنیم کے اسلحہ خانوں کو ہوائی اڈوں کو تباہ کرنا۔ جب کامیاب ہوتا ہے تو اس حملہ سے پہلے تیاری کے مشوروں کے دوران میں درپیش خطرات کا اندازہ، تدبیر شبخوں کی تفاصیل کو آخری شکل دینا ہتھیلی پر جاں رکھ کر چپ چاپ دلاوروں کا نکلنا کتنی تیاری چاہتا ہے۔

تو دیکھو کیسی موثر تصویر ہے اب بلند آہنگ نہیں (کہ مبالغے کی بلند آہنگی، وجدان اور فکر کی پختگی کے فقدان کی علامت ہوتی ہے اور اب شاعر کی فکر Mature اور اسلوب ایک منفرد لہجے اور فرہنگ والے شاعر کا ہے) کیسی دھیمی لے میں بات ہو رہی ہے۔ آخری تین مصرعے نئے مدنی کی آواز ہیں۔ دلپذیر اور پر تاثیر، فکر اور آہنگ میں کامل مطابقت حاصل ہو گئی ہے۔

آخری تین مصرعے پڑھو اور ان کا مقابلہ "چشم نگراں" کی نظموں اور "دشت امکان" کی پہلی دو تین نظموں سے کرو۔ اب ایک تازہ فکر رکھنے والا شاعر اپنے لفظ آپ تلاش کر کے انہیں اپنے وجدان کے مطابق جوڑ کر نئی نظم تخلیق کر رہا ہے۔ اب لفظوں میں دھیرج اور رچاؤ آگیا ہے۔ مدنی کو پاکستان آئے ہوئے اب ایک سال گزر چکا ہے۔ سو ذہنی رشتہ بھارت کی ترقی پسند اردو شاعری سے اب منقطع ہو چکا ہے۔ اب آواز فیض، راشد، مختار صدیقی کی آواز سے قریب آرہی ہے

وہ اسلوب جو کلیشے ہو چکے تھے اب قصہ ۔ پارینہ ہو چکے ہیں ۔

"دشت امکاں" کے حصہ اول کا جائزہ شاید ایک مختصر نظم کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے اس نظم کا فارمیٹ پابند نظم کا ہے ۔ بحر سست روی اور سکوت کی ہے ۔ مفعول مفاعلن فعولن / فعولان ۔ بحر کی آزردگی ۔ نومیدی اور دل شکستگی کے لئے موزوں ہے ۔ اس کا لہجہ "چشم نگراں" کی ساری ان نظموں سے مختلف ہے جو محبت کے مختلف احوال کی تصویر کشی کرتی ہیں ۔ پہلے بند میں اگرچہ بے کیف فضاؤں میں آوارہ بگولے بجھے بجھے ہوئے ارمانوں اور خوابوں کے نرت کرتے دکھائے گئے ہیں اور گل و سمن کی ترتیب بھی برہم ہو چکی ہے اس سب کے باوجود کہیں تیزروی یا فعال اندرونی واردات کا ذکر نہیں ۔ فضا افسردہ خزاں کی ہے ۔ اور جتنا کچھ رقص دل زدگی ہے وہ اندر کی آنکھ دیکھ رہی ہے ۔

دوسرے بند میں کیفیت بظاہر خارجی ماحول میں تیزی کی ہے ۔ راتیں تند و تیز ہیں اور وقت کے پیرہن کا اڑتا ہوا رنگ مظاہر کی تباہی پر خندہ زن بھی ہے لیکن یہ سب شاعر کے وجدان میں ہو رہا ہے ۔ کہ تیسرا بند اس بات کو واضح کر دیتا ہے ۔

یہ ربط جسم و جاں کہاں ہے
ہر چند ہے محو میزبانی
نم دیدہ تھکی ہوئی جوانی
لرزاں ہے سکوت انجمن میں
پروانے کی خاک ہے لگن میں
اک نشے کا ٹوٹنا عیاں ہے

پہلا سا ربط جسم و جاں جس سے زندگی میں چہل پہل ہوتی ہے نا امیدی سے قائم نہیں رہا غم دیدہ جوانی مایوسی کے تسلسل سے تھک گئی ہے ۔ اور ویران انجمن میں صرف سکوت لرزاں ہے ' اس بسیط سکوت میں لرزش بھی تھکے ہوئے جسم و جاں کو اپنے تعلق سے محسوس ہو رہی ہے کہ جسم و جان تو تھکن سے چور ہیں ۔ شباب اور شوق کے نشے کا خمار جسم و جاں میں آہستہ آہستہ سرایت کر گیا ہے ۔ اور ساری شخصیت ٹوٹ کر رہ گئی ہے ۔

یہ نظم اپنی نامیاتی وحدت اور لفظیات کے اعتبار سے ایک ایسے شاعر کی تخلیق ہے جو ایک نیا ڈکشن نیا اسلوب اپنے لئے ایجاد کر چکا ہے اور بحر اور اصوات کی ترتیب کو پوری قدرت سے حسب ضرورت استعمال کرنے میں ایک معتبر صناع کی سطح پر آگیا ہے ۔

دوسرے حصہ کی دوسری نظم کا عنوان ہے "نیند" ۔ میں نے نظم کو پڑھا تو یہ نیند بے خوابی سے سلگتی آنکھوں والے بجز نصیب فرد کی نیند نہیں جس سے پلکیں بوجھل ہیں مگر نیند ہے کہ آتی ہی نہیں ۔ یہ نیند ایک پوری قوم ایک پوری نسل کی ہے ۔ بحر فاعلاتن مفاعلن فعلن بھی اپنی

نہاد میں سوچ اور نیم سوز حزن کے لئے مختص ہے کہ اس کا مزاج بہت نرم ہے ۔ فا دو حرف کا ہموار سبب ہے ۔ علاوتد مفروق ہے تن سبب خفیف ہے ۔ مفاعلن دونوں وتد ہیں ۔ لیکن مفاکی صوت بحر کو کبولت دیتی ہے ۔ علن وتد مفروق ہے ۔ اور پھر فعلن میں دو سبب ہیں پہلا سبب فع پر زبر ڈالدو تو ثقیل ہے نہیں تو خفیف ۔ لن سبب خفیف ہے ۔ ان ارکان کا مجموعی صوتی تاثر بہت نرم بہت سبک ہے ۔ "وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں" "کوئی امید بر نہیں آتی" "حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا ۔" "میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا" ۔ مزاج یہ ہے ۔ ویسے بڑے شاعروں نے اسے تیز تر کیفیتوں کے لئے بھی کامیابی سے استعمال کیا ہے ۔ ولی دکنی کی ساری غزل ۔ دل کو لگتی ہے دلربا کی ادا ۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اس کا اپنا داخلی Intrinsic مزاج نرم کیفیات حزن و ملال یا کم ضو امید جیسے مضامین کے لئے سازگار ہے ۔ مومن نے کہا ۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا ۔ ایک محویت کی باطنی کیفیت ہے جس میں آدمی خود تصویر بن جاتا ہے ۔ داغ جیسا حسن پرست بھی اس بحر میں ایسی بات کرتا ہے تو اچھی لگتی ہے ۔ لوگ کہتے تھے چپ لگی ہے تجھے ۔ حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا ۔

اب مدنی کی نظم "نیند" کو دیکھئے ۔

نیند کے حاشیے یہ افسانے شپرک کی طرح ہیں آویزاں
چند بے برگ و بار ویرانے بادلوں کی طرح ہیں چھائے ہوئے
چند اترے ہوئے خنک چہرے ایک بار سکوت اٹھائے ہوئے
پتھروں کے مہیب گرز گراں استخوانوں کے چند دھندلے ڈھیر

یہ نظم میں نے مدنی کے اسلوب اور اس کی لفظیات میں انقلابی تبدیلی قاری پر آشکار کرنے کے لئے چنی ہے ۔ نیند کے حاشیے شپرک کی طرح آویزاں ہیں ، ذہن کی تیرہ و تار چھت سے اور عرصہ ، جاں پر بے برگ و گیاہ ویرانے یوں محیط ہیں جیسے ویرانے پر سوکھے بادل چھائے ہوئے ہیں جن میں نہ بجلی کی چمک ہوتی ہے نہ گھٹاؤں کے ٹکرانے کی گرج ۔ یہ نیند اجتماعی ہے جو اترے ہوئے چہرے دکھائی دے رہے ہیں بے جان ہیں ۔ آس امید ، ذوق و شوق کی آنچ سے محروم ہیں ۔ اس لئے ٹھنڈے اور بے رنگ ہیں کہ چہرے پر تازگی اور رنگ تو اندر کی تاب سے آتے ہیں اگلے تین مصرعے اس منظر کی تکمیل کرتے ہیں ۔ ویرانی گراں تابہ گراں اور جامد سوچ ۔ ویران آنکھیں ، بے رنگ بے جان چہرے اور اس منظر وجود کے افق پر ایک دھواں سا جو ذرا سی ہوا لگے تو کرلبنے کا تاثر دیتا ہے ۔

دوسرا بند اس ویرانی جاں کا پس منظر اس کی تاریخی Background بیان کرتا ہے کوہ و دشت کے سینے میں بے شمار بے مقصد گزری ہوئی صدیوں کی راکھ ہے ۔ کچھ صلیبوں سے خون ٹپکتا دکھائی دیتا ہے ۔ یہ خون ، حسین بن علی کا منصور حلاج کا ، سرمد کا ، فرید الدین عطار کا ،

سقراط و مسیح کی راہ پر چلنے والے حق پرستوں کا ہے جو خون رایگاں نظر آتا ہے۔

وقت ہی اک سوال کی صورت
جسم کے کرب میں لٹکتا ہوا

کیا بے مثال تصویر ہے۔ وقت نوعی جسم میں اک سوال کی صورت لٹک رہا ہے۔ یعنی حیرت میں منجمد ہو گیا۔ ایک پوری قوم ایک پوری نسل گزشتہ محرومیوں کو اپنی تاریک جانوں میں سمیٹے زندگی کی تپش سے محروم ساکت ہے اور اس فضا میں وقت بھی جو ایک سوال کی صورت آیا تھا لٹک کر رہ گیا ہے۔

اب آخری بند دیکھئے۔

چاند پچھلے پہر نکلتا ہوا اک اجالا اداس ، آسیبی
وقت کے دامنوں پہ چلتا ہوا خشکیوں کی حدیث کہتی ہوئی
وقت کی خفتہ چاندنی جیسے بے جہت بے خرام بہتی ہوئی

چاند بھی نکلا وقت کے گزرنے کا تاثر لے کر مگر اس کا کم تاب اجالا بھی اداس ہے۔ آسیبی سا ہے۔ ہول انگیز، یہ چاند وقت کے پھیلے ہوئے دامن پر رینگ رہا ہے۔ اور وقت کی ندی جو خفتہ پا ہے۔ پاؤں سو جائیں تو قدم اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ تو وقت کی ندی اس زندگی کی تب و تاب سے محروم دنیا میں خفتہ نصیب انسانوں کی اس نگری میں خفتہ پا بے خرام بہتی ہے۔ یعنی اس کے بہنے میں کوئی تاثر حرکت کا نہیں۔ یہ بے خرام ندی ہے۔ وقت کا آب رواں بہاں ٹھہر گیا ہے نہ کوئی سمت ہے، نہ غایت، نہ جہت۔

میرے خیال میں یہ ایک بڑی کامیاب نظم ہے۔ مدنی اپنی ساری جدیدیت کے باوصف مسلمان امت سے گہری وابستگی رکھتا تھا۔ اور اپنی معاشرتی اخلاقی اور روحانی روایت سے پوری طرح وابستہ تھا۔ یہ نظم ایک نوحہ ہے۔ ایک حساس شاعر کا جو دنیا میں تغیر اور انقلاب تازہ کو بڑی تیزی اور توانائی سے کار فرما دیکھ رہا ہے۔ اور جب اپنی قوم کو دیکھتا ہے تو ایک آخری تیرگی، ایک تیرہ و تار حویلی اس کی چشم تصور کے سامنے آجاتی ہے جس کی جالے سے اٹی چھت سے شپرک اور چمگاڈریں لٹک رہی ہیں۔ لٹکتی چمگاڈریں کامل ویرانی کی علامت ہیں۔ بہت کامیاب علامتی نظم ہے ایک ماہر صناع کا بنایا ہوا ویرانی کا خستگی کا Landscape ہے۔

دیکھئے ابھی تک "دشت امکان" میں بھی وہ تمثیلیں جدید زندگی کی سائنس کی حیرت انگریز ترقی کی نہیں آئی ہیں جو بعد میں مدنی کے فن کی خاص شناخت بن گئی تھیں۔ اگلی نظم "رم خوردہ دریا" میں "وقت کی سوئیاں" سے جدید علامتوں کے استعمال کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نظم امریکہ کی کوریا میں برہنہ جارحیت کے زمانے میں لکھی گئی۔ یوں سمجھیے جب جنگ کوریا ختم ہوئی لاکھوں انسانوں کی موت کے بعد۔ موت جو Napalm بموں سے۔ آگ کی موج رواں پھیلنے والی

توپوں سے بھڑکایا ہوا سیل آتشیں ہے۔ ہزاروں بمبار طیاروں کی بمباری سے پھیلایا ہوا آگ کا سمندر ہے۔

اس کا پہلا بند من وعن نقل کرتا ہوں۔ تاکہ فضا قائم ہو جائے۔

جان من سوئیاں ساعت تازہ دم کی
ایک رم خوردہ دریا کی موجیں ہیں
ان کی سفاک جنبش کی رہ میں شبوں کے گرہ بستہ در ہیں
رشتہ ، شوق کے سینکڑوں سلسلے
نیند آدم کی ٹوٹی تھی جس کی گھنی چھاؤں میں اس شجر تک
پیچ در پیچ بکھرے ہوئے فاصلے
خار و خس کا ایک انبار ہیں۔

یہ رم خوردہ دریا ہے۔ جس نے اپنی راہ بدل دی۔ اس دریا کی روانی تو خشک زمین کو سیراب کرنے، نئے گلزار سجانے، نئے رنگ اور خوشبوؤں کی فضا کو تر و تازگی عطا کرنے کے لئے تھی۔ اس نے راستہ بدل دیا۔ اور نور و نکہت کی جگہ ویرانی اور تباہی اور جلی سڑی لاشوں کی سڑاند لئے گزر رہا ہے۔

اب شاعر اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یہ رم خوردہ دریا تیرے چہرے کی تازگی تری آنکھوں کی تاب تیرے عارض و لب کا جمال ختم کر دے گا کہ:

یہ خطاؤں پشیمانیوں میں الجھتی ہوئی ایک دوری کہ کب سے
ہے بے میل و فرسنگ
ایک رم خوردہ دریا کی آخر ہدف ہے

یہ خطائیں یہ پشیمانیاں میسر ساعتوں کو بیکار پس و پیش میں ضائع کر دینے کا نتیجہ ہیں اور اب وہ ناکردہ کار زندگی اس طوفانی راہ بدلتے ہوئے دریا کا ہدف ہے۔ وقت کی سوئیاں اب خشمناک موجیں بن چکی ہیں۔ یہ ہماری زندگیاں ان کے لئے بے لذت شب و روز، یہ آزردگی اور برہم زدہ خوابوں کے سواد، ان سوئیوں کے تند گرداب کے لئے تنکے سے بھی کم تر ہیں۔ ایک چکر میں سب کچھ ناپید ہو جائے گا۔ کہ ان موجوں کے سامنے تو شہر اور ملک خار و خس کے انبار سے زیادہ نہیں۔ یہ اخبار جن میں ہزاروں بچوں عورتوں کی جلی بھنی مسخ شدہ لاشوں کی تصویریں اور تذکرے تھے وہ بھی اس طوفان کے سیل میں بہہ جائیں گے۔ وہ بے وطن سپاہی جو سات سمندر پار سے یہاں آئے تھے۔ ان کی لاشیں جو بے کفن رہیں تو وہ بھی بہہ جائیں گی۔ وہ سپاہی جب زندہ تھے تو اپنے بہت دور وطن میں اپنی محبوباؤں اپنی منگیتروں کے نرم بازوؤں کے مضبوط تنگ ہوتے ہوئے حلقے، شوق اور طلب سے نیم سوز بوسہ ہائے لب یاد کر کے آشفتہ ہو جاتے تھے۔ وہ سب

یادیں بھی بہہ گئیں ان موجوں میں۔ صرف یہ اجڑے شہروں کے در و سقف و بام ہی نہیں، زہر و تریاق پر تحقیقی مقالے، معمل میں کیمیا گر کے آلات نلکیوں میں مٹی اور کیمیاوی مواد، تیزابوں کی آزمائش کے اہتمام، وقت کی سوئیوں کے برپا کردہ طوفان میں بہہ گئے ہیں۔

اب شاعر اپنی محبوبہ سے اپنے براعظم یعنی ایشیا کے امروز و فردا کی بات کرتا ہے۔

جان من ، سوئیاں ساعت تازہ دم کی
ایک رم خوردہ دریا کی موجیں ہیں
ایشیا کی ہر اک ساعت خواب آلودہ کی سوئیاں ہیں
مگر آج بے آب دریاؤں کی طرح محروم اک تندی سیل سے
ایک بے آب دریا کے بے حس کنارے پر بکھری ہوئی ریت
کا ایک ذرہ ہے یہ حسن تیرا
ایک بے آب دریا کا بے حس کنارہ کہ دامن میں اس کے
نہ شبنم نہ باد صبا ہے اور نہ ایسا شجر کوئی جس کے
ثمر میں جزا اور سزا ہی کی نیرنگیاں ہیں
مگر کوئی دریا تلاطم بدوش اور کف در دہاں
آج بھی میری بے خوابیوں اور تری نیند کے درمیاں
ایک دستک سی دیتا ہے۔
جان من ، سوئیاں ساعت تازہ دم کی
ایک رم خوردہ دریا کی موجیں ہیں۔

لتنے بڑے Landscape کے بعد جو تاریخ انسانی کے بدلتے رخ کو سامنے لارہا ہے شاعر اب اپنی ذات کے حوالے سے اپنی محبوبہ کو وقت کی سوئیوں کی حرکت کے ناقابل قیاس ہونے کی اطلاع دے رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ تیرا حسن تری ذات اس سارے منظر میں اک ذرہ سے بھی کم ہے۔ میں بھی ایک ذرہ کم مایہ سے کم تر ہوں اور ہمارا دریا بے آب ہے۔ اس کے منظر میں نہ شبنم ہے نہ ہوا کے تازہ خنک ہلکورے ہیں۔ نہ کوئی درخت ہے جو سزا اور جزا کا ثمر لائے۔ اس بے آب دریا کا بے حس کنارہ دستک دے رہا ہے اور اے جان اتنا بتا رہا ہے کہ بے خوابی سے جلتے پپوٹوں اور تیری نیند سے بوجھل نشیلی آنکھوں کے درمیان وقت کی تازہ دم سوئیاں مستعدی سے حرکت کر رہی ہیں۔ ہم اپنے اپنے مقام پر چور اور آزردہ ہیں اور وقت کے رم خوردہ دریا کی سوئیاں تازہ دم ہیں۔ ہمیں خبر بھی نہ ہوگی کہ ہماری مہلت زندگی ختم ہو چکی ہوگی۔ یہلئے یہ وعید اس لئے نہیں کہ محبوب وصل پر آمادہ ہو جائے۔ یہ وعید اس امر کی ہے کہ ایشیا شاید اپنی غفلت کی نیند میں بے سدھ سویا رہے اور وقت گزر جائے۔ اس کی ساری Opportunities ختم

ہو جائیں۔

میں نے اب ۳۰ برس کے بعد مدنی کی "دشت امکاں" میں شامل نظموں کو غور سے پڑھا تو مجھے وہ بے ترتیب نظر نہیں آئیں۔ جب میں نے انہیں پہلے پہل پڑھا تو شاید ان پر توجہ نہیں کی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا وہ پہلا تاثر غلط تھا۔ ان نظموں میں ایک عمیق تر وحدت ہے۔ شدت احساس کا ایک رشتہ سب ظاہری بے ترتیبیوں کو ایک نامیاتی اکائی بنا دیتا ہے۔ میرے خیال میں نظم "رم خوردہ دریا" پائندہ نظم ہے۔ اس نظم میں "کیمیاگر کے آلات" اور "فلکیوں کے سبک جسم" بڑی سجل چابکدستی سے لائے گئے ہیں۔ جنہوں نے نظم کے تاثر کو اور عمق عطا کیا ہے۔

اب میں ایک ایسی نظم پر بات کرنے کو ہوں جس کا عنوان، ایک جدید سائنسی لفظ ہے ترکیب ہے۔ رصد گاہ۔ رصد گاہ سائنس کا لفظ ہے ادب کا نہیں۔ ہمارے دور تر اسلاف نے اندلس، بغداد، نیشاپور اور دوسرے ملکوں اور شہروں میں رصد گاہیں قائم کیں۔ عمر خیام نے اپنی رصد گاہ میں بیٹھ کر دور بین شیشوں سے مشاہدہ کر کے علم ریاضی کو بروئے کار لاکر جو نتائج مرتب کئے وہ سائنس کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ مگر عمر خیام نے اپنی رباعیات میں ان تجربات کا ذکر نہیں کیا۔ وہاں وہ نمائشی زہد اور رندوں کی آزادہ روی اور کشادہ دلی کا ذکر کرتا رہا دنیا کی بے ثباتی کو یوں آنکھوں کے سامنے لاتا رہا کہ حساس قاری کا دل پڑھ کر گداز ہو جائے۔ یہ پیالہ جو تیرے ہاتھ میں ہے اور جسے تو اپنے لبوں کے قریب لے جا رہا ہے ہو سکتا ہے یہ کسی نگار حور شمائل کے لب و عارض کی خاک سے بنا ہو۔

مدنی نے عنوان نظم کا رصد گاہ رکھا ہے۔ لیکن اس میں خلا و ملاء کے مشاہدے اور ستاروں اور سیاروں کی دنیا کا احوال بیان نہیں کیا۔ شاعر کے فن کا ویرانہ فسردہ و ملول ہے۔ اور اس میں گزرے لمحوں کے بے شمار سائے لرز رہے ہیں۔ اب دیکھئے کیا منفرد لہجے میں بات کی ہے

در سکوت پہ اس کے فضا نے حرف لکھے ۔۔۔ سمجھ میں آنے لگا کچھ نہ کچھ کنایہ وقت
ٹھہر ٹھہر کے وہ کلک ہوا نے حرف لکھے

یہ وجدان کی رصد گاہ ہے۔ اس کے چپ اور بے حرکت دروازوں اور سقف و بام پر فضا نے حرف لکھے ہیں۔ شاعر وقت کے کنایے کو سمجھنے لگا ہے کہ اس نے دیکھ لیا ہے کہ ہوا کا قلم ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ حرف لکھ رہا ہے۔ سو بات جشن کی۔ ساعت سعید کی، رقص و نغمہ کی نہیں ہو سکتی۔

اب دیکھئے آگے کیا لہجہ کیسی فرہنگ سامنے آتی ہے۔ یہ کھنڈر ہے اس محبت کے نگر کا جو بسنے سے پہلے ہی ویران ہو گیا۔ یہ وہ بے در و دیوار گھر ہے جس کا نقشہ شاعر نے اپنے ذہن میں بنایا

تھا۔ کہتا ہے یہاں سادہ لوحِ وقت پر جہاں کچھ نہیں لکھا گیا کوئی نقش نہیں بنا۔ حرفوں کے ادھ کھلے روزن ہیں۔ یہاں ایسی خلوتیں بھی ہیں کہ ان کی قنائیں نیند کی ہیں۔ خلوتیں تو محبوب مہمان کے آنے کے لئے لازمہ ہیں۔ اس فضا میں شاعر کا دل بھی فضا کی لرزش بھی محبوب کے نام سے سرگوشیاں کرتی ہے۔

اس رصد گاہ میں ہر نفسِ درد کی ایک سبک خرام رو ہے اور ہر گزرتے لمحے کی اوٹ سے بہت دور تیرے چہرے کا ایک پرتو سا نظر آتا ہے۔

یہ زاویے ترے رخ کے یہ فاصلوں کا قیاس
بسا رہے ہیں اک اسلوبِ تازہ سے سن وسال
نئی نئی سی کئی بستیاں سرِ قرطاس
کہیں کہیں ترے قدموں کی آہٹیں اب تک
حروفِ سادہ میں لیتی ہیں کروٹیں اب تک

کیسا بھرپور ابلاغ ہے۔ لفظ کیسے بچ کر آئے ہیں۔ اور ایک وجدانی رصد گاہ کی فضا قرطاسِ احساس پر قائم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اگلے بند میں محبت کے بدلتے موسموں اور زندگی کے نو بہ نو تغیرات کو بہم آمیز کیا ہے۔ شاعر نے ایک شہرِ وصال دنیائے خیال میں بسا لیا ہے۔

یہ تیری یاد سے پرچھائیوں کا ایک ہجوم
یہ موسموں کے بدلتے ہوئے سے خواب و خیال
خنک ہوا میں ہیں آثار ابر و باراں کے
سمو رہا ہے ابھی وقت ان فضاؤں میں
کچھ آنے والے جو موسم ہیں عہد و پیماں کے
ہوائے درد بھی ہے اک محاورہ اے دوست
یہ تیرا درد بھی ہے اک محاورہ اے دوست

بات بڑے سلیقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اندر اور باہر کے موسم میں ایک مطابقت سی، اک اشتراک سا ہے۔

آخری بند بہت خوبصورت شاعری ہے۔ اس لہجے اور اس مزاج کی شاعری اردو زبان میں مدنی سے پہلے کسی نے نہیں کی تھی۔

فضائیں دشمنِ جاں ہیں، ہوا حریفانہ
مزاجِ وان تغیر رہا ہے برسوں سے
یہ میرے فن کا فسردہ ملول ویرانہ
سمندروں کا مد و جزر دشت و در کا غبار
قلم سے الجھے ہوئے صد ہزار تشنہ سوال
رم و سکون و طلوع و غروب کی پیکار۔
حدیثِ دل میں ہوئی کس جتن سے صرف نہ پوچھ
سمو رہی ہے ابھی نیک و بد کے ہنگامے
کن آئینوں میں رصد گاہِ صوت و حرف نہ پوچھ

ادب کا قاری خود برتر حسِ جمال رکھتا ہے۔ سو مجھے اس بند کی توضیح اور اس کے فنی تکنیکی اور تخیلی جمال کی صراحت ضروری معلوم نہیں ہوئی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس بند نے ثابت کر دیا کہ اس نظم کے لیے رصد گاہ سے بہتر کوئی عنوان اردو زبان میں نہ تھا۔ میرا دل یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ اس بند کا آخری شعر ہماری سائیکی کا حصہ بن جائے گا اور یہ اگلی نسل کو ایک سعدیانہ ضرب المثل کے طور پر منتقل کیا جائے گا۔

سمو رہی ہے ابھی نیک و بد کے ہنگامے
کن آئینوں میں رصد گاہِ صوت و حرف نہ پوچھ

اس کے بعد ایک نہایت جاذب دل و جان نظم ہے۔ "سرما کی ایک رات" اس نظم کا صرف پہلا بند نقل کروں گا۔ باقی نظم قاری خود ہمہ جذب و شوق ہو کر پڑھے۔

اس شہر میں رات کا گزرنا مجرم کی طرح خموش بستی
کہتی ہے کہ آئے ہو تو ٹھہرو ہر چند محال ہے ٹھہرنا
اے جان وفا اجڑ گئے ہیں افسردہ مکان کے در و بام
غرفوں میں شگاف پڑ گئے ہیں سرما کے بھی تیخ زدہ سے ناخن
شاخوں کے سڈول بازوؤں میں پیوست ہوئے ہیں۔ گڑ گئے ہیں

اب اس کے قوافی کی ترتیب دیکھو، یہ خالص مغربی نظموں کی Rhyming Scheme ہے۔ الف۔ب۔ج۔ الف۔ہ۔د۔ہ۔ح۔ط۔ہ۔ یعنی پہلا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہیں۔ اور پانچویں، ساتواں اور دسواں مصرع ہم قافیہ ہیں۔

اب بیان پر غور کرو۔ اجنبی مسافر کو جو پردیس کے ایک شہر میں آیا ہے۔ قیام کی دعوت فضا سے ملتی ہے۔ یہ بستی کہ مجرم کی طرح لب بستہ ہے کہتی ہے کہ گو یہاں رات کا گزارنا آسان نہیں۔ مگر اب آئے ہو تو ٹھہر جاؤ۔ مدنی کراچی سے پشاور تبدیل ہوا تو وہاں کی معاشرتی اور ثقافتی فضا اس کے لیے بالکل نامانوس تھی۔ میں ۱۹۴۴ میں گیا تھا تو مجھے بھی وہ شہر پردیس محسوس ہوا تھا۔ اب وہ اپنے تصور میں اپنی محبوب سے جس سے وہ بچھڑ گیا ہے کہتا ہے کہ میرے مکان کے در و بام دل کی افسردگی سے اجڑ گئے ہیں۔ طاقچوں میں ہوا کی تندی سے شگاف پڑ گئے ہیں۔ اور جاڑوں کی تیخ رت کے تیز ناخن درختوں کی شاخ شاخ میں گڑ گئے ہیں۔ شاخوں کے سڈول بازوؤں میں۔ تیخ ہوا کے ناخنوں کا پیوست ہو جانا بہت بیدار حسن جمال کی سطح پر مشاہدہ ہے۔ گڑ گئے زاید نہیں، کہ وہ موسم کی شدت کی پوری شدت سے قاری کے سامنے لانا چاہتا ہے۔ پیوست ہونے کے بعد جب گڑ گئے کا لفظ آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے چیتے کے ناخن میرے بازوؤں میں گڑ گئے ہیں۔ اگرچہ میرے بازو سڈول نہیں۔ اعلیٰ سطح کی یادگار نظم ہے۔

ہر چند کہ پھول ہیں نہ پھل ہیں لیکن ہے لگن سی کوئی باقی
ہر بیج میں جنبش نمو ہے وہ برف کی سل سے وحل سکے گی

ہر لمحہ زندگی ہے جنباں ہر بطن میں اک خموش تاریخ
کروٹ سی ابھی بدل رہی ہے اس خیمہ برف و باد میں بھی
اب تک پس پردہ تغیر اک شمع مدام جل رہی ہے
آئین وصال و موسم گل کروٹ کا تری ہے دوسرا نام
موسم ہے تو سد راہ کب تک کانٹوں میں پلی ہے رات سوجا
مانا کہ حریف کا ہے خنجر ڈھلتی ہی چلی ہے رات سوجا

یہ ٹکڑے نظم میں سے نکال کر صرف اسلوب کی نزاکت اور نظم کی وجدانی فضا کو قاری کے سامنے لانے کے لئے رکھے ہیں۔ پوری نظم میں تسلسل اس طرح ہے جس طرح زندہ جسم میں جان ہوتی ہے۔ اور کہیں ایک لفظ ایسا نہیں آیا جو تنہائی کی یخ رات کے مزاج سے مختلف ہو۔ ایک بند جو اوپر لکھے ہوئے مصرعوں سے پہلے آتا ہے میں نے عمداً اب تک نہیں لکھا تھا۔ اسے اب لکھ رہا ہوں کہ نظم کی فضا بقول مدنی قاری کی آنکھوں میں پگھلا ہوا موم ہو جائے۔

طاری ہیں ڈرے ہوئے سے انداز
اک ربط کی آرزو میں باتیں
اچٹی ہوئی نیند کی ہیں غماز
اک سلسلہ غم میں کھو گیا ہے
آنکھوں میں تری ہر ایک لمحہ
پگھلا ہوا موم ہو گیا ہے

شاعر سرما کی زمہریری سی رات میں تنہا ہے۔ سو یہ باتیں یا خیال میں محبوب کو روبرو لا کر اس سے سرگوشی میں کی جا رہی ہیں یا یہ شاعر کی خود کلامی ہے۔ مخاطب جو بھی ہے۔ خطاب معتدل دھیمی مسلسل بارش کی طرح ہے جو جل تھل نہیں کرتی۔ زمین میں رستی چلی جاتی ہے۔ اور زمین کی سطح کے نیچے سمندر جمع کر دیتی ہے۔

اب میں ایک اور مختصر نظم کی بات کروں گا جو ایک انوکھے استعارے پر Construct کی گئی ہے۔ شاعر کا زاویہ نگاہ بھی بالکل نیا ہے اور اسلوب بھی رائج اسالیب سخن سے مختلف ہے۔ میں اس کی بند بہ بند توضیح نہیں کروں گا۔ ذہین قاری شاعری کی فکر کی رو کے ساتھ خود بہنے لگے گا۔ نظم کا عنوان ہے "چوہا" یہ چوہا وہ غریب انسان ہے جو تیرہ و تاریک بل جیسے خستہ اطاق یا جھونپڑی میں رہتا ہے اور اس کا پیٹ بالعموم خالی رہتا ہے۔ سو اس کے وجود میں ایک لگن ہے اور وہ لگن پارہ نان کی تلاش ہے۔

مختصر نظم ہے جو پوری کی پوری لکھ رہا ہوں:

مونس شب رو یہ دزدانہ خرام
پارہ ہائے نان کی پیہم تلاش
ہر نفس الجھی ہوئی فکر معاش
عجز ہے تیرا کوئی خالی نیام
روح کی شمشیر جوہردار سے
شب سے ہیں محروم تیرے صبح و شام
روح تاریکی میں پلتی ہی نہیں

جذب کرلیتی ہے سفاکی کے ساتھ
تیرگی ، ادراک کا جغرافیہ
یہ ندی رخ تو بدلتی ہی نہیں
مفلسی کا سرد اندھا آئینہ
دیکھنے دیتا جو چہرے کی خراش
جسم میں مانند برف بے اماں
روح کی شمشیر کا جوہر کہیں
ٹوٹ سکتی تھیں بہت پابندیاں
تجھ سے وابستہ بلوں کی تیرگی
تیرگی میں اک گراں حبسِ دوام
جانکنی کی گود میں سمٹا ہوا
نکبت و افلاس کا جغرافیہ
ایک خود روباس میں لپٹا ہوا

میں کہ میرا بیشتر وقت نان جویں کی تلاش میں صرف ہوتا چلا آیا ہے نصف صدی سے اور میں جو ایک تنگ تاریک اونچی چھ منزلہ عمارت کی گراونڈ فلور میں ایک بل جیسے فلیٹ میں رہتا ہوں جہاں لوڈ شیڈنگ سے جو اکثر رات رات بھر جاری رہتی ہے نڈھال رہتا ہوں ۔ اس نظم کے آئینے میں مجھے اپنا چہرہ اپنا وجود نظر آیا اور مجھے یوں لگا کہ مدنی نے میرے جیسے کروڑوں انسانی چوہوں کے نکبت و افلاس کا جغرافیہ بڑے دکھ اور احساس کی صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اب دیکھو مدنی کیسا سچا اور کیسا منفرد اسلوب فکر و اظہار رکھنے والا تخلیق کار بن چکا ہے ۔ اور دیکھو ایک ہی جدید تر علامت میں ان گنت نسلوں کی زندگی کا جغرافیہ اس نے کس عدیم النظیر جامعیت اور صناعی سے نقشبند کر دیا ہے ۔

" چوہے " کے فوراً بعد آنے والی نظم کا عنوان ہے فرس ٹراجن The Trojan ۔ Horse یہ ہومر کے شعر حماسہ کے ایک منظوم Episode پر نظم ہے ۔ یہ نظم میرے نزدیک خالص شاعری ہے Pure Poetry ۔ میں صرف اس کا ابتدائی بند یہاں نقل کرتا ہوں ۔ مدنی کے اسلوب کے تنوع اور اس کی لفظیات کی وسعت کی مثال کے طور پر :

دھوئیں میں گم تھے ہزاروں جری سر میداں
ابھی کھنچی ہوئی تیغیں تنے ہوئے نیزے
خدائے جنگ کی موج نفس کے تھے ، ان
پرے حریفوں کے جب توڑ کر نکلتی تھیں

لہو میں ڈوب کے پرچھائیاں اچھلتی تھیں

جوش سے ذہنی قرب سے مدنی کو ایک فائدہ پہنچا کہ اس کی لغت بہت وسیع اور متنوع ہو گئی۔ اور اب اسے وہ جوش کی طرح محض بیانیہ کے لئے استعمال میں نہیں لاتا۔ نازک مقامات سے بھی بہت آسانی کے ساتھ الفاظ پر اپنی قدرت کے بل پر گزر جاتا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ مدنی کے وجدان کے ابعاد اور اس کے مضامین کا تنوع قاری کے سامنے لے آؤں۔ مدنی کے اسلوب پر بھی بات ہو چکی ہے۔ اب صرف دو اور نظموں کا ذکر کروں گا اور پھر اس کی غزل کی فکر و اسلوب کی تازگی پر بات کر کے اس جائزے کو مکمل کر دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس جائزے سے مدنی کی شاعری کی ساری جہتیں اور اس کی ندرت و رفعت سب کی تسلی بخش Evaluation ہو جائے گی۔

"آپریشن تھیٹر" مدنی کے خاص اسلوب اور اس کی جدید تر فکر کی نمائندہ نظم ہے۔ اور اس کی اس صنف کی شاعری میں اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ نظم کے پہلے بند ہی سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ایسا اسلوب آج تک کسی شاعر کا نہیں ہوا۔ اقبال، جوش، راشد، فیض کسی کا نہیں۔ جن کے میں نے نام لئے ہیں وہ بیسویں صدی کے اردو شاعری کی سطح معین کرنے والے تخلیق کار ہیں۔ فراق کا نام میں نے نہیں لیا کہ وہ غزل کا شاعر ہے اور یہاں اس شاعری کی بات ہو رہی ہے جو بیشتر صنف نظم سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں سے بیشتر شعرا نے غزل بھی کہی ہے۔ مگر ان کا بیشتر کلام نظم کی شاعری پر مشتمل ہے۔ بہ استثنائے راشد کہ اس نے فقط دو تین غزلیں کہی تھیں، جو اس کے معیار کی نہ تھیں۔

اب اس نظم کا پہلا بند دیکھئے:

زخم کو آئنہ دکھاتی ہوئی
نیم گرداں ہے قرص نور افگن
جسم پر زاویے بناتی ہوئی
دست جراح سے لپٹتی ہوئی
محو اک انقطاع درد میں ہے
تیز نشتر کی رو کھنچتی ہوئی
زخم کی تیرگی کو دھوتا ہوا
درد درمان درد ہوتا ہوا

میری طرح مدنی نے بھی اپنی آخری بیماری سے پہلے آپریشن تھیٹر صرف فلم کے سکرین پر دیکھا تھا۔ لیکن دیکھئے کیسی کامل تصویر کشی ہے۔ کیسا منفرد بیان ہے اور لفظوں میں کفایت اور جامعیت دیکھو۔ کم سے کم لفظ استعمال کئے ہیں۔ اور "سفاک مسیحا" نشتر سے زخم کو یا بیمار حصہ

کو کاٹتا ہے۔ یہ عمل شدید درد پیدا کرنے کا ہے۔ اب تو اللہ کا شکر ہے کہ ذہن انسان نے اس کی عطا کردہ توفیق کو استعمال کر کے کلورو فارم ایجاد کر لیا ہے۔ سارے مصرعے ایک دوسرے سے کاملاً جڑے ہوئے ہیں۔ ایک لفظ غیر ضروری نہیں۔ نکال دو تو نظم بے معنی ہو جائے گی۔ مدنی یہاں باکمال تخلیق کار ہے۔ روشنی جو نشتر والے ہاتھ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اور تیز نشتر کی رو انقطاع درد کے لئے چلتی ہے کشتی ہے اور یہ آپریشن کیا ہے۔ زخم کی تیرگی کو دھوتا ہوا درد درمان درد ہوتا ہوا۔ اردو زبان میں یہ لہجہ اب سے پہلے موجود نہ تھا۔ نہ ایسے مضامین کے لئے کسی شاعر کا جوہر تیار تھا۔ مدنی نے بعد یہ مناظر حیات کی تصویر کشی میں دن رات صرف کیے اور اب وہ توفیق حاصل کر لی ہے ParExcellence ۔ ایسے نئے اور نامانوس موضوعات کو موثر اور دلنشین نظم کا لباس پہنانے کی۔

دوسرے بند کا آخری شعر آپریشن ابھی جاری ہے۔ ماہر جراح جراحی کے عمل کو کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں سراپا انہماک ہے۔

نقش مبہم بنا رہا ہے کوئی
درد کی حد بتا رہا کوئی

اب چوتھا بند۔ درد جراثیم سے زہریلے کرم سے، دست قاتل کے لگائے ہوئے زخم سے نمو پاتے ہیں۔ اس مقام تک مہلک ہو جاتے ہیں کہ جراح کے نشتر کے سوا کوئی چارہ کار بیمار کی درد سے نجات کا نہیں رہتا۔

ہو چکے ہیں ہزار ہا ناسور
مہر تاریخ کا ثبات لیے
زندگانی کا ہے لکھا دستور
ہر نفس اک ہدف ہے تیروں کا
یہ حدیں زخم کی، یہ حد حیات
سلسلہ درد کے جزیروں کا
زندگانی پہ بند ہیں راہیں
سرد کیڑے ہیں اور کہیں گاہیں

یہاں آپریشن کے تھیٹر سے نکل کر شاعر اب خارجی دنیا میں آگیا ہے جس کے جلاد اسباب و علل مریض کو قرص نور کے نیچے جراح کے نشتر کی مسیحائی کے لئے لٹا دیتے ہیں۔ اب نظم کے آخری دو بند جو موضوع کو وسعت دیتے ہیں اور شاعر کی غایت کو مقام تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ Climax تک۔

جنگ، افلاس، قحط، بیماری

بے حسی کی فصیل اور انساں
حادثوں کی یہ تنگ دیواری
دور تک اک محاذ خاموشی
تیر جوڑے ہوئے غنیموں کے
چار سو خندقوں میں روپوشی
درد کے سیل بے پناہ میں ہے
ہر جری ایک رزم گاہ میں ہے

تیغ کی دھار موڑ دیتی ہے
ضرب ہر کرم زہر آگیں کی
آہنی ڈھال توڑ دیتی ہے
ایک ذوق طلب سے جلتا ہے
سینۂ زندگی کا زخم ابھی
سبب بے سبب سے جلتا ہے
قصہ زخم و اندمال نہ پوچھ
جنگ جاری ہے، ہم خیال نہ پوچھ

ابھی ایک بڑی جنگ جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی ۔ شاید آخری لمحہ زندگی تک ، نوعی زندگی کے اختتام تک کہ اس زخم کا اندمال کسی جراح کے مسیحا نشتر کے پاس نہیں ۔ اس زخم کی ماہیت کیا ہے اور اس کا اندمال کیونکر ہو یہ ایسی بات ہے جو شاعر نہیں کہہ سکتا کہ یہ نکتہ خاص لفظ میں اتنی گنجائش نہیں کہ اسے اپنے اندر پوری طرح سمیٹ کے اس کا اعلان کر دے ۔ میری عاجزانہ حد فہم کے مطابق یہ بڑی نظم ہے ۔ اور اردو شاعری میں دور بہ دور زندہ رہے گی ۔ اس اعلان کے ساتھ کہ اس نظم سے مدنی نے برتر مفاہیم کو جدید تر Symolism اشاریت اور رمزیت کے ساتھ کمال مہارت سے بیان کر کے ایک نئے شعری اسلوب کی بنا رکھ دی ۔ آگے کئی نظمیں اچھی ہیں ۔ لیکن میں سب کا تجزیہ نہیں کر سکتا ۔ اب میں اس -- کتاب کی ایک اور نظم کا حوالہ دونگا اور پھر آخری حصہ کی ایک نمائندہ نظم کا مختصر جائزہ پیش کروں گا ۔ جس سے میرے خیال میں مدنی کی نظم کی اعلیٰ ترین سطح معین ہو جائے گی ۔

اس دور کی آخری نظم کا عنوان ہے "آخری ٹرام" ۔ کراچی میں شروع شروع میں ٹرام ہی میرا وسیلہ سفر تھی ، لارنس روڈ کے اس سرے سے جہاں گاندھی گارڈن کی سڑک اس کو قطع کرتی ہے ، بولٹن مارکیٹ تک ، وہاں سے روز صبح کو انٹیلی جینس سکول تک پہنچنے کے لئے پیڈل رکشا لیتا

تھا۔ ٹرام کا کرایہ ایک آنہ ہوتا تھا۔ سان فرانسسکو اور دوسرے ترقی یافتہ شہروں میں ٹرام میں یا سیاح بیٹھتے ہیں یا بچے تفریح طبع کے لئے یا کھلنڈرے نوجوان اور دوشیزائیں۔ میں نے بھی اپنی ایک دوست خاتون کے ساتھ ٹرام کا "جھوما" لیا تھا۔ اس خاتون کا ذکر "ناممکن کی جستجو" میں تفصیل سے آچکا ہے۔ کراچی میں ٹرام سے میرے جیسے کم آمدنی والے مزدور، محنت کش، کلرک وغیرہ آتے جاتے تھے۔ ملک امیر لوگوں کے ہاتھ میں آگیا تو کراچی شہر کی اس سستی سواری کو ختم کر دیا گیا۔ اب اس کی جگہ بلٹ بسیں Bullet Busses چلا کریں گی! میں نے یہ تمہید زیب داستاں کے لئے نہیں باندھی۔ جو کچھ میں نے کہا ہے مدنی کے وجدان کے پیچھے تحت الشعور میں ایسے ہی خیالات اضطرار انگیز تھے۔ نظم میں کوئی بات اوق نہیں۔ نظم ایک وحدت کی طرح مصرع اول سے مصرعہ آخر تک چلتی ہے اور اپنی رفتار میں مختلف اضطراب انگیز خیالات کے Crisscross سے ٹرام کی رفتار کی خستگی کا منظر بحد کمال قاری کی آنکھوں کے آگے بچھا دیتی ہے۔ مجبور ہوں اس نظم سے ایک مصرع حذف نہیں کر سکتا۔ مضمون میں طوالت ناگزیر ہے اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

آخری ٹرام لڑکھراتی ہوئی
شل پریشان نیند سے بوجھل
شیڈ کے بازوؤں میں جاتی ہوئی

(یہ انتقال احساس کی بات ہے۔ شل پریشان اور نیند سے بوجھل شیڈ کی دیوار ہی نہیں، کارندے بھی ہیں جو دن کا حساب مکمل کر کے دروازہ بند کریں گے اور پیدل گھروں کو چل دیں گے)

زنگ آلود بریک کی فریاد
کر گئی چند ساعتوں کے لئے
رہ گزر کے سکوت کو آباد
کاسہ ء یک خیال کے مانند
نیم روشن سی ایک بالکنی
اک نشان سوال کے مانند
پوچھتی ہے حساب طرز و معاش
اک ہوا ہے جو اس اندھیرے میں
راز فطرت کو کر رہی ہے تلاش
دور پرچھائیوں کا اک بن ہے
راہ کی ناف سے سرکتا ہوا

اک طرف روشنی کا دامن ہے
اک طرف عافیت کا سرد حصار
گوشہ چشم پاسباں کی طرح
عصمت زر پہ بنک کی دیوار
دشت و در میں مہیب شور سگاں
بے ضمیری ہوا کی کیا کہئے
بے محافظ ہے عصمت انساں

آخری ترام چوہوں کی دوڑ میں مبتلا ایک بڑے شہر کی ہوس زر کی شکار غریب آبادی کے لئے بڑا بلیغ سمبل ہے۔ شہر کے نودولیتوں کی تاخت و تاراج وسائل اور حرام کی کمائی سے عصیاں کی گرم بازاری مصرعوں کے پیچھے سائے کی طرح ساتھ چل رہی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ہوا مدنی کے ہاں ہر طرح کے تغیر کے لئے ایک استعارہ ایک کردار ہے۔ نئی دریافتوں اور ایجادوں کی بدولت قریب تر آزادی، ذہنی آزادی اور بالیدگی کی علامت بھی ہے۔ آفات اور سانحوں کی وعید بھی ہے۔ یہاں ہوا چوہوں کی خصلت رکھنے والے بے ضمیر چور بازاری کرنے والے تاجروں نمک مرچ میں ملاوٹ کرنے والے آڑھتیوں، رشوت لینے والے ٹریفک اور تھانے کے سپاہیوں اور تھانیداروں، بے ضمیر سیاست کاروں، عمائدین حکومت سے لائسنس لے کر چور بازار میں بیچنے والے بدقماش پتھاری داروں کی لائی ہوئی معاشرتی زبوں حالی کی علامت ہے۔ کیا لاجواب Climax بنایا ہے!

بے ضمیری ہوا کی کیا کہئے بے محافظ ہے عصمت انساں

ہمارا تغیر بے ضمیری پر مبنی ہے سو انسان کی باطنی عفت و عصمت تک محفوظ نہیں۔ جسم تو پہلے ہی چور ہو چکے ہیں۔

مدنی اب منفرد اسلوب کا باکمال نظم گو ہے۔ اس کی لفظیات بھی کاملاً معین ہو چکی ہے جو نئی ہے اور وسیع ہے۔ اوزان پر اسے مکمل قدرت حاصل ہے۔ اصوات کو مختلف بحور کی حد بندی میں اپنی غایت کے مطابق آہنگ عطا کرنا اب اس پر آسان ہو گیا ہے۔ میں اپنے دل میں مدنی کی روح سے معافی کا طالب ہوں سو میں لکھ رہا ہوں تو اس کا چہرہ میرے دل کی آنکھ کے سامنے ہے میں اس سے شرمسار ہوں کہ میں نے اس کی نظموں کو اس یکسوئی اور توجہ اور انہماک سے نہیں پڑھا تھا۔ اور جب تک وہ زندہ رہا آخری ملاقات سے پہلے تک اسے جائز طور پر یہ شکایت مجھ سے رہی کہ میں نے اس کی نظموں سے انصاف نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے وہ جہاں ہے میری اس عفو طلبی پر منہ دوسری طرف کر کے کہے گا۔ جی!!! اب آنکھ کھلی!!! پھر وقفہ دے گا۔ اور اپنے معصومانہ انداز سے ہنس کر کہہ دیگا۔ چلئے اور تو یہ کسی نے نہیں کہا نا؟

"دشت امکاں" میں اور کئی نظمیں اس سطح کی موجود ہیں "خود کلامی" "سمندر کا بوڑھا خدا" "کوئی شاخ آشنا" "آخری رات" "ایک ایک آدھ آدھ بند کچھ نظموں کا بہاں مدنی کے اسلوب کی سطح کی دھیرے دھیرے رفعت پذیری کی جھلک دکھانے کے لئے!

خود کلامی!

تیرے چہرے پہ خط ساعت شام
آرزو کا ہے کوئی حلقہ ۔ ثقل
جسم و جاں زیر اثر اس کے تمام
آتشیں بیل ہیں زلف و موباف
تیرے احساس کی بے تابی سے
کچھ مری تازہ دمی کا ہے گراف
روح اسرار پہ خاموشی ہے
چہرہ و زلف کی آمیزش میں
حال و فردا کی ہم آغوشی ہے

بے حسی سے کبھی چالاکی سے
مرتبانوں میں دلوں کے پودے
رکھ دیے جاتے ہیں سفاکی سے
آگہی کا وہ صنم خانہ ہے
آدمی برگ بریدہ کی طرح
معمل زیست کا نذرانہ ہے
دل رقیب غم ادراک بھی ہے
خورد بینوں کی نگاہوں کا حریف
عشق کا دیدہ ۔ نم ناک بھی ہے ۔

تازہ دمی کا گراف، حال و فردا کی ہم آغوشی، آدمی برگ بریدہ، معمل زیست، رقیب غم ادراک، کیسی نادر کیسی خیال افروز تراکیب ہیں۔

"سمندر کا بوڑھا خدا" ۔ یہ نظم ۱۹۶۰ء میں لکھی گئی ۔ اس کی ایک علامت کو گزشتہ دو تین برس سے جدید تر شعر گو بری طرح پامال کر رہے ہیں:

میں بھی ناقد ہوں تیرے وطن کا مگر
تو مرے ملک میں ایک ہجرت زدہ طائر اجنبی کی طرح آشیاں ساز ہے

میں پرندے کی ہجرت کا شاکی نہیں
آشیاں کو ملیں صبح کے نور سے گرمیاں
باد صرصر میں تیرا نشیمن رہے
سبز و شاداب ہمت اوراق کے درمیاں
اک ہیۓ کے سبک گھونسلے کے لیۓ آج بھی باغ میں کتنے اشجار ہیں

"کوئی شاخ آشنا":

دور تاریکی کی چادر سے شرر اڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریلوے کی ورکشاپ
اک دھوئیں میں آہنی فیلوں کے دل مڑتے ہوئے

اس فضا میں وقت درد ہجر و آغوش وصال
اک ثمر جو نصف تازہ نصف گرم آلودہ ہے
اک حقیقت طالب قرب اوراک دوری کا جال
چٹمک اوراک کے خواب جنوں کے مرحلے
طعنہ ۔ نایافت دیتی ایک روح ابرو بار
مرگ کی قوسیں تغیر کے ہزاروں سلسلے

"آخری رات:"

حرف صداقت لکھوا تی ہے
تختی لکھنا کھیل نہیں ہے
دل کی طاقت لکھواتی ہے
دل رکھے تو ہمت رکھے
جرم عشق کیا ہو جس نے
وعدہ ۔ یار کی عزت رکھے
عشق پہ ہے تعزیر پرانی
میرے لب سے کیوں رسوا ہو
اندھوں میں سچ کی عریانی

رات اندھیری ہے اے دلبر
لیکن جب تک آنکھ لگی ہے

کوئی کرن سا نازک خنجر
دل کے اندر گھوم گیا ہے
دست ستم سے پہلے آکر
میری چوکھٹ چوم گیا ہے۔

آہنی فیلوں کے دل، طعنہ نایافت، روح ابرو بار، مرگ کی قوسیں یہ نئی تراکیب ہیں۔ ایسے بے مثال نغمگی فعلن فعلن فعلن میں ایسی مشکل بات میں نے اب تک نہیں دیکھی تھی اور دیکھو کہ یہ لہجہ بالکل نیا ہے۔ کسی پرانے یا نئے شاعر سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔
اب اس مقام پر حصہ غزل کے بعد آنے والی نظموں میں سے ایک نظم "اے گھومتی لمحوں کے چاک" سے صرف چند مصرعے تاکہ قاری کے سامنے مدنی کے وجدان کا سارا دشت امکاں اپنی بیکراں وسعت کے ساتھ آجائے۔ دل کی آنکھ تو چودہ طبق کی وسعت دیکھ لیتی ہے۔ پلک جھپکنے سے پہلے، سو ادب سے شغف رکھنے والا قاری ان مثالوں سے اس محیط تاباں کی تمام پہنائی کو دیکھ لے گا۔ کہ اس میں کیسے رنگارنگ کیسے دل کو بجھانے، تڑپانے بھڑکتے شعلوں میں جلانے والے منظر ہیں۔

دور اک واماندہ شب خستہ سگنل کے قریں
اک پرانے پوسٹر سے جھانکتی ہے روح شہر
اک متاع دست گرداں، بے تعلق بے یقیں

بلیک کے سودوں میں روح تاجری ہے بے لباس
چور دروازے حسابوں کے ہوئے ہیں نیم وا
کھنچ رہے ہیں نرخ کے فیتوں پہ کچھ خط قیاس

ساعت جولاں ہے گویا فرصت تعبیر وقت
اک صفر ناطاقتی کا اک صفر پیدائی کا
اک تغیر اک اجل، اک درد اک تقدیر وقت
زندگی کو ہو متاع نا رسیدہ کی تلاش
روح فردا کو ہے اندیشوں کی اس پہنائی میں
اک سہی قد پیکر نا آفریدہ کی تلاش

اس میں نئی تراکیب دیکھو، واماندہ شب، خستہ سگنل، متاع دست گرداں، روح تاجری، روح بے لباس، حسابوں کے نیم وا چور دروازے، نرخ کے فیتوں پر خط قیاس، فرصت

تعبیر وقت، صفر پیدائی کا ناطاقتی کا سفر، متاع نارسیدہ، اندیشوں کی جسمانی، یہی قد پیکر ناآفریدہ۔
میں نے جستہ جستہ کچھ بند مختلف نظموں سے بغیر کسی تجزیے یا توضیح کے لکھ دیے ہیں کہ میں مدنی کے فکر کے اجزا اور اس کے اسلوب کا تنوع ایک مقالے کی حدوں میں رہتے ہوئے بیان کر چکا ہوں۔ میرا کام یہ تھا کہ میں مدنی کے جہاں کی سیر کا شوق ایک ذوق تجسس رکھنے والے قاری کے دل میں پیدا کر دوں، مجھے امید ہے کہ اپنی توفیق بیان اور شعر فہمی کی حد تک جو کچھ میں کر سکتا تھا میں نے کر دیا ہے۔ اب صرف ایک نظم پر بات باقی رہ گئی ہے۔ "مرزا باقر علی۔ داستان گو" یہ نظم میں نے مدنی سے آخری ملاقات میں سنی تھی۔ اس کا ذکر یوں بھی اب مدنی کی غزل کے تذکرے کے بعد میں ہونا چاہیئے کہ وہ شاید اس کی آخری اہم تخلیق تھی۔

O۔O۔O۔O۔O۔O۔O

"وحشت امکاں" میں مدنی کی غزل ہماری روایت غزل میں ایک اضافہ ہے۔ نہ اس سے پہلے کسی شاعر نے اس لہجے میں غزل کہی تھی نہ وہ اعلیٰ اور وہ اپنی توفیق شاید بہت دنوں تک اور کسی شاعر کو مل سکے۔ بیسویں صدی میں حالی کے بعد بڑی غزل صرف فانی نے کہی۔ یاس یگانہ دو چار برتر اشعار کا شاعر ہے۔ حسرت موہانی رئیس المتغزلین کہلائے۔ میں مجاہد اور مرد حر کی حیثیت سے ان کا بہت ادب کرتا ہوں۔ لیکن شاعری میں ان کا کل سرمایہ دو غزلیں اور چند ابیات ہیں۔ اور وہ بھی عاشقانہ غزل کے، ان میں کرب ذات حقیقت کائنات اور سر کائنات سے ہم آمیز نہیں ہوا۔ سو میں حسرت کو بڑا غزل گو تسلیم نہیں کرتا۔ فانی نے موت کی شاعری سے، جسے جدید تنقید نے Graveyard کی شاعری کہا، ہٹ کر بھی بہت بلند پایہ غزلیں کہی ہیں جو حالی اور داغ اور آتش کی برتر سطح تک پہنچتی ہیں۔ فانی کے بعد صاحب عہد غزل گو عزیز حامد مدنی ہوا ہے۔ میرے اس بیان پر بہت سے شاعر اور بہت سے "غالب کے طرفدار" بہت برہم ہوں گے۔ کیوں کہ بہت سے ادبی گروہ بہت سے "بت بچے" سروں پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں جو غزل کے خوش گو شاعر گزشتہ نصف صدی میں ہوئے۔ ان سب میں اپنی اعلیٰ ترین سطح پر شکیب جلالی تھا۔ وہ بہت جلد مر گیا، اور اس کا کلام زیادہ نہیں۔ مگر معیار اور شاعر کی سطح معین اس کے بہترین کلام پر کی جاتی ہے۔ مجھے دو چار شعر اس کے ہاں اس سطح کے نظر آئے جو نہ فراق میں ہیں نہ اور کسی شاعر میں، تین چار شعر سطح معین کرنے کے لئے یہاں لکھ رہا ہوں۔

اگر گرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر — تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
مجھ کو گرنا ہے تو میں اپنی ہی قدموں میں گروں — جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے
تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں — آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ، مجھے ڈوبتا بھی دیکھ
صحرا میں آسمان نظر آتا تھا بے کراں — شہروں میں آگیا ہے تو خانوں میں بٹ گیا

اس سطح کی دلدوگی، اس سطح کا نیم سوز جہاں اور کسی کے ہاں نظر نہیں آیا۔ فیض صاحب نے اچھی غزل کہی۔ روز ابر و شب ماہتاب میں متعلقہ لوازم کے ساتھ ان غزلوں کو پڑھو یا مغنیہ

سے سنو تو بہت اچھی لگیں گی۔ لیکن ان میں وجدان برتر سطح سے محروم ہے۔ ناصر لفظ سجانے کا بہت نازک اور نادر ڈھب رکھتا ہے۔ بہت خوبصورت لفظ لاتا ہے۔ لیکن بیشتر کلام میں خیال لفظ کے جمال کی سطح کا نہیں ہوتا۔ اس کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔ وقت بے قید مکاں تھا پہلے، اور ایک اور پوری کی پوری غزل ہے جو بہت ہے۔ لیکن یہ غزلیں عظیم نہیں۔ ناصر بھی بیشتر انسانی روابط کا شاعر تھا۔ اس سے آگے وہ نہیں جاسکا۔ اس کے زندہ و جاوداں اشعار میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے	دل عجب گنج اماں تھا پہلے
سفر شوق کے فرسنگ نہ پوچھ	وقت بے قید مکاں تھا پہلے

اور

دائم آباد رہے گی دنیا	ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا
شعاع حسن ترے حسن کو چھپاتی تھی	وہ روشنی تھی کہ صورت نظر نہ آتی تھی
آتش غم کے سیل رواں میں نیندیں جل کر خاک ہوئیں	پتھر بن کر دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو

یہ سطح عظمت کے اشعار ہیں، ادب کے دیانت دار نقاد جو Poetic Process سے پوری طرح باخبر ہیں وہ مجھ سے اتفاق کریں گے۔ باقی بیشتر شاعری خوبصورت ہے، گانے کے لئے بہت اچھی ہے، تازہ فضا والی شاعری ہے۔

میں مدنی کو صاحب عہد غزل گو قرار دیتا ہوں تو اس کے بہت اشعار اس سطح کے سنا سکتا ہوں جو میر و مرزا غالب سے دو پایہ نیچے ہیں مگر باقی ہر نامور استاد کی اعلیٰ ترین سطح کے ہم پلہ ہوں گے۔ نظم میں سے تو دو کردار اور علامتیں میں پیش کر چکا ہوں جو اب اردو شاعر اپنے کلام میں صبح و شام استعمال کر رہے ہیں اور جو بار اول مدنی نے جدید تلازمے کے ساتھ متعارف کروائے تھے۔

مدنی نے پہلی غزل ۱۹۵۰ء میں کہی۔ یہ غزل برتر کلام نہیں، لیکن مستقبل کے آثار اس میں جھلکتے ضرور دکھائی دیتے ہیں گو دھیمے دھیمے سے۔

اک ایسا تغافل ہے وہ یاد آہی گیا ہے	اک وعدہ فردا ہے وہ بھولا بھی نہیں تھا
کہہ سکتے تو احوال جہاں تم ہی سے کہتے	تم سے تو کسی بات کا پردہ بھی نہیں تھا
پہلے مری وحشت کے یہ انداز بھی کم تھے	پہلے مجھے اندازہ صحرا بھی نہیں تھا
اب یہ ہے کہ تھمتا ہوا دریا ہے تری یاد	بے فیض یہ دریا کبھی ایسا بھی نہیں تھا
مجنوں کے سوا کس سے اٹھی منت دیدار	آخر رخ لیلیٰ ہے تماشا بھی نہیں تھا

یہ پانچ شعر پہلی غزل کے ہیں۔ انہیں مدنی کے ہم عصر غزل گو شعرا کے برتر کلام کے ساتھ رکھ کر دیکھو۔ انصاف شرط ہے۔ اس کے وجدان اور وقت و مکان سے پیوستگی کے رنگ کو جیسا کہ وہ نظر آتا ہے تقابلی نظر سے دیکھو۔ دوسرا تیسرا اور چوتھا شعر فکر انگیز غزل کے اعلیٰ پایہ کے اشعار ہیں جو اکثر نامور شعرا کو ساری زندگی کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتے۔ آخری شعر میں مجنوں اور لیلیٰ اردو کے دو اہم شعری کرداروں کو استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ مجنوں لیلیٰ نئے معنوی تناظر

میں آئے ہیں ۔ تناظر کائناتی سطح ہے ۔ حسن بھی جہاں افروز ہے اور مجنوں بھی پر اما مجنوں نہیں ۔ جو دیوار دبستان پر لام الف لکھتا تھا ۔ یہ مجنوں جلوہ ذات کو دیکھنے کی ہمت اور تاب رکھتا ہے ۔
دوسری غزل بھی عمیق فکر اور عاشقانہ روایت کے مکمل امتزاج کی آئینہ دار ہے ۔

کبھی تسکین خاطر موج دریا ہے کبھی شبنم ۔۔۔ تلون کو غنیمت جان کر چپ ہو گئے ہیں ہم

یہ تلون فرد کا نہیں ۔ نوعی سطح پر ایک Safety Valve ہے جو پہلے جہد بقا کے دوران میں باقی انواع پر "بشر نما" کے غالب آنے میں ممد ثابت ہوا تھا ۔

وفا کی داستانیں سننے والا کون تھا لیکن ۔۔۔ خدا کا شکر ہے دو چار آنکھیں ہو گئیں پر نم
بہت نازک ہے اس نوخیز کا آئین آرائش ۔۔۔ حیا پہلے سے بڑھ کر اور سرناخن حنا کم کم
خفا بھی بے سبب اور خوش بھی وہ بے وجہ رہتا ہے ۔۔۔ وفا کا بھی وہی عالم جفا کا بھی وہی عالم

اور اب اوپر کے دوسرے شعری سطح کے دو بہ حد کمال وجد انگیز اشعار آتے ہیں ۔

ترے آنے سے غم کا کوئی عنوان تو نکل آیا ۔۔۔ مزاج عشق میں بھی ایک امکاں ہے تغیر کا
وگرنہ وقت ہی اک زخم تھا اور وقت ہی مرہم ۔۔۔ کچھ اس کی زلف برہم کچھ زمانے کی ہوا برہم

میں سمجھتا ہوں پوری دیانت سے اور کامل وابستگی رکھنے والے عالمی ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہ غزل کا یہ مزاج حالی کے بعد ہمارے ادب میں غائب ہو گیا تھا ۔ فانی کائناتی تناظر میں شعر کہتا تھا ۔ مگر اس میں گہری یاسیت تھی جس سے شاعری میں یک رخا پن آگیا تھا ۔ مدنی کی غزل اس شاعر کی ہے جو غم بھی سہتا ہے ۔ خوش بھی ہو جاتا ہے ۔ دنیا سے گریز نہیں کرتا اور خالق دنیا کو بھی فراموش نہیں کرتا ۔ یعنی اس میں وہ جوہر ہے جو انسان کی پوری فطرت کو تابناک بنا دیتا ہے ۔ ایک فعال کل ، جو عیش کوش بھی ہے غم آشنا بھی ، بت شکن بھی ہے اور ہمہ ادب بندہ بھی ، جو ٹوٹ کے محبت کرتا ہے ، اور اپنی ذات کو فنا ہونے سے بچانے کا ڈھنگ بھی جانتا ہے مدنی کی یہ شخصیت ان دو غزلوں کے اوپر نقل کئے ہوئے اشعار میں صاف نظر آرہی ہے ۔ ترتیب وار تیسری غزل میں یہ شعر دامن کش دل ہوئے ۔

ادھر ادھر سے حدیث غم جہاں کہہ کر ۔۔۔ تری ہی بات کی اور تیری بات کی بھی نہیں
یہ زندگی ہی تلون مزاج ہے اے دوست ۔۔۔ تمام ترک وفا تیری بے رخی بھی نہیں
تعلقات زمانہ ہی اک کوی کے سوا ۔۔۔ کچھ اور یہ ترا پیمان دوستی بھی نہیں

یہ آخری شعر دیکھئے ۔ یہاں مدنی اپنے جبلی تقاضوں کی تہذیب یافتہ شائستہ سطح کو بھی جسے محبت کہتے ہیں دوستی کہتا ہے یعنی اسے اس کے صحیح تناظر میں دیکھتا ہے ۔ تعلقات زمانہ انسان کی فطری ضرورت ہیں ۔ پہلے ماں باپ بھائی بہن ، پھر ہم مکتب ، پھر بدن بیدار ہوا تو وہ جبری اضطراری کشش جسے انگریزی میں CalfLove اور غالب کی زبان میں "خواہش" کہتے ہیں ۔ اور اس سے آگے بڑھا تو وہ باہمی تعلق جسے کتاب پیدائش میں یوں بیان کیا گیا ۔ "اور وہ ایک تن

ہوں گے ۔"

ظاہر ہے جو ایک تن ہوں گے ان کا رشتہ باقی سب رشتوں سے زیادہ محکم اور عمیق ہے مگر ہے تو تعلقات زمانہ ہی کا ایک رخ، مانا کہ سب سے اہم رخ ہے ۔ لیکن انسان کے وجود اور اس کی سوچ اور اس کے احساس کے اور بھی بہت تقاضے ہیں مرئی اور غیر مرئی Tangible اور Intangible اور میں یہاں یہ اساسی اہمیت کی ناقدانہ بات بڑی صراحت سے کہنے لگا ہوں ۔ کوئی ادب عظیم نہیں ہو سکتا جو صرف انسانی تعلقات ہی تک محدود رہے ۔ پابلو نرودا، گورکی، ڈی ایچ ،لارنس اور جیمز جوائس، سوخولوف بڑے لکھنے والے ہیں مگر شکسپیئر، گوئٹے ،ٹالسٹائے، ڈرائی ڈن ۔ پشکن، براؤننگ، ایٹس، ایلیٹ، رومی، عطار، بیدل، میر اور غالب کی سطح پر نہیں پہنچتے ۔ فراق اور فیض خوش گو شاعر ہیں ۔ مگر وہ Intangible سے قریب قریب بے تعلق رہے سو وہ تو غزل میں حالی اور فانی کی سطح پر بھی نہیں آتے ۔ مدنی یہاں محبت اور دوستی کو ویسے ہی حکمت کی سطح پر دیکھ رہا ہے جیسے غالب نے انسان کی جنسی کشش کو ایک شعر میں ہمیشہ کے لئے سطح عظمت سے کم تر سطح پر لاکر قائم کر دیا ۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

خواہش جب عمیق تر اور فرد واحد پر مرکوز ہو جائے ۔ دائماً تو وہ محبت ہے اور محبت انسانی تعلقات کی سب سے عظیم سطح ہے ۔ اس کے بعد سچی اور بے لوث دوستی ہے ۔ میں خوش نصیب ہوں میں نے محبت اور دوستی دونوں کو ان کی ارفع ترین سطح پر اپنی ذات کے حوالے سے دیکھا ہے ۔ میں ان رشتوں کے تقدس کے تحفظ میں اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن میرے دل نے بہت پہلے گواہی دے دی تھی کہ کچھ نادیدہ ناشیندہ حقیقتوں کی کشش ہے، جو ان مقدس رشتوں سے بھی برتر ہے اور پورا آدمی اور پورا شاعر وہی ہوتا ہے جو محبت اور دوستی کا بھی بھرپور تجربہ رکھتا ہو اور ان دیکھے ان سنے جمال کی لگن بھی دل میں رکھتا ہے ۔ جو کائنات میں اپنے انفرادی اور اجتماعی مقام کی آگہی کے حصول کے لئے بھی ذہن اور قلب دونوں کو مرتکز کر کے سعی کرتا ہے ۔ ایسا کرنے والا عطار اور رومی ہوتا ہے، شکسپیر اور دانتے ہوتا ہے، میر تقی میر غالب اور بیدل ہوتا ہے مصحفی اور مومن اس سطح پر نہیں آتے ۔ اور ہمارے انسانی رشتوں کے شاعر تو ابھی تک جرات کی "چوما چاٹی" سے بھی آگے نہیں گئے ۔

اور اب ایک برتر غزل آگئی ہے ۔ مدنی اپنے مقام عظمت کی طرف گرم جولاں ہے ۔

کیا ہوئے باد بیاباں کے پکارے ہوئے لوگ چاک در چاک گریباں کو سنوارے ہوئے لوگ

وحشت اور جنوں میں بھی، سچے عشق میں، ایک تہذیب ایک سلیقہ ایک شائستگی ہوتی ہے ۔ جب ندا آئے تو یہ وحشی یہ دیوانے اپنی شائستہ وحشت اور اپنے سلیقہ مند جنوں کے ساتھ تیار ہوتے ہیں ۔ مدنی نے اپنے سفر علم میں ان لوگوں کو سوچا ان کے بارے میں معلومات حاصل

کیں۔ عطار کیسے شائستگی کے ساتھ قتل ہوئے۔ حسین بن منصور کو دیکھو۔ رسن و دار کی نذر ہونے سے پہلے کیسے اپنے چاک در چاک گریباں اپنے جنوں کی تمام شوریدگیوں کو ایک لمحہ میں سمو کر شائستگی عشق کا نظارہ دکھا گئے کہ پہلے دو رکعت نفل نماز ادا کی اور سورہ فاتحہ کے بعد جو آیات تلاوت کیں ان میں وہ آیات تھیں جو آزمائش کے وقت شکر رب ادا کرنے کے لئے اہل عشق کو عطا کی گئی ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ ان تمام اشعار کو قاری میری ہی نظر سے اور میرے ہی دل کی صداقت سے پڑھے گا۔

خوں ہوا دل کہ پشیمان صداقت ہے وفا — خوش ہوا جی کہ چلو آج تمہارے ہوئے لوگ
خط معزولی ارباب ستم کھینچ گئے — یہ رسن بستہ صلیبوں سے اتارے ہوئے لوگ
ان کو اے نرم ہوا، خواب جنوں سے نہ جگا — رات میخانے کی آئے ہیں گذارے ہوئے لوگ

آخری شعر میں کلید شعر "نرم ہوا" ہے جو عام طور سے جگاتی نہیں ہے۔ اب یہ بات ذہن میں رکھ کر اس شعر کی عظمت پر غور کرو۔ اچھی زمین ہے۔ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن کی بحر ہے زندگی آخر، سپردگی آخر

دو تین بہت دلنہ از شعر ہیں

کوئی بتاؤ کہ ہے بھی تو اس قدر کیوں ہے — ہوا کو میرے گریباں سے دشمنی آخر

یہاں ہوا کو مدنی کے خاص شعری کردار کی سطح پر دیکھو اور شعر کے معانی پر غور کرو۔ گریباں، معمول کی باقاعدہ زندگی کی علامت ہے۔ یہ سلامت ہے تو آپ اور میں معاشرے کے کارآمد فرد ہیں۔ چاک چاک ہو گیا تو دیوانے ہیں۔ کیا یہ ہوا وہ موج تغیر ہے جو مدنی کے عصر کو نسل در نسل کے فرسودہ ضابطہ۔ معمولات ترک کر دینے پر مجبور کر رہی ہے کہ بس ہولی یہ زندگی، اب نیا زمانہ ہے۔ نئے تقاضے ہیں۔ نیا لباس نئی وضع قطع نئی ذہنی توانائی اور وابستگی

ترے خیال نے سو رخ دیے تصور کو — ہزار شیوہ تھی تیری سپردگی آخر

یہاں سرسری نظر سے دیکھو تو آخر کا جواز نظر نہیں آئے گا۔ لیکن عاشق نے ساری عمر اس لمحے کا انتظار ہے۔ اس کا تصور تو کچھ اور تھا۔ یہاں حسن کا ایک اپنا جہان خوب و ناخوب ہے۔ اس کے اپنے دلارائی کے اطوار ہیں۔ اپنے اردگرد جمال فطرت کے رنگ دیکھو۔ کوئی شمار کوئی انت ہے ان کی بو قلمونی کا۔ یہ مثال تو خالق جمال کی سطح پر تھی۔ اسے ذرا نیچے لے آؤ۔ ہیر ہو کہ سوہنی ہو کہ لیلیٰ ہو کہ شیریں۔ اس سطح کے صاحب جمال میں بھی نزہتوں اور صباحتوں اور نفاستوں کے گوناگوں قرینے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچ کی راہ دکھادی ہے۔ باقی اس شعر کی جمالیاتی سطح سے اکتساب فیض و لطف میں قاری پر چھوڑتا ہوں۔ اور دیکھیے کیا شعر کہا ہے۔

حنائے پا سے کھلا اس کا شوق آرائش — نکل چلی تھی دبے پاؤں سادگی آخر

اور دوسری نوع کا ایک اور عظیم شعر،

ہزار اس کے تغافل کے داستانیں ہیں — مگر یہ بات کہ وہ بھی ہے آدمی آخر

صلیب و دار کے قصے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
قلم کی جنبشوں سے سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں
یہ شاخ گل ہے آئین نمو سے آپ واقف ہے
سمجھتی ہے کہ موسم کے ستم ہوتے ہی رہتے ہیں
کبھی تیری کبھی دست جنوں کی بات چلتی ہے
یہ افسانے تو زلف خم بہ خم ہوتے ہی رہتے ہیں
ہجوم لالہ و نسریں ہو یا لب ہائے شیریں ہوں
مری موج نفس سے تازہ دم ہوتے ہی رہتے ہیں
مرا چاک گریباں چاک دل سے ملنے والا ہے
مگر یہ حادثے بھی بیش و کم ہوتے ہی رہتے ہیں

زندگی میں چند اصولوں کا استمرار، چند قوانین فطرت کا ابرام، انسانی فطرت کا چند آزمائشوں میں سطح عظمت پر ایک سا اظہار، یہ بات کسی نے اب تک اس صراحت اور اس حسن سے نہیں کہی تھی۔ دوسرے اور آخری شعر کا انداز مدنی کے تغزل کا ایک خاص اسلوب ہے، اور معنوی تسلسل بھی ہے۔ یہ بات قاری کو مدنی کی غزل کے بارے میں اچھی طرح دل میں محفوظ کر لینی چاہیے۔ چار غزلوں پر بات کر کے غزل میں مدنی کے اسلوب کے ارتقاء اور اس کی تزئین کے مدارج کا کچھ تعارف ہو گیا ہے۔ اور اب وہ غزل آتی ہے جو شاید گزشتہ چالیس برس کی غزل کی شاعری کا نقطۂ معراج کمال ہے۔ اس غزل کے ایک شعر سے مجھے مدنی سے تعارف کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس کا ذکر میں شروع میں کر آیا ہوں۔ اب ساری غزل دیکھیے۔ اس کے اسلوب کی تازگی اور تراکیب کی اختراع میں مدنی کی مہارت اور ندرت کا اسلوب، اردو کی سو غزلیں منتخب کرو۔ یہ غزل لامحالہ اس انتخاب میں شامل ہوگی۔

فراق سے بھی گئے ہم وصال سے بھی گئے
سبک ہوئے ہیں تو عیش ملال سے بھی گئے
جو بکدے میں تھے وہ صاحبان کشف و کمال
حرم میں آئے تو کشف و کمال سے بھی گئے
اسی نگاہ کی نرمی سے ڈگمگائے قدم
اسی نگاہ کے تیور سنبھال سے بھی گئے
وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزم خیال سے بھی گئے
چراغ بزم ابھی جان انجمن نہ بجھا
کہ یہ بجھا تو ترے خط و خال سے بھی گئے

"دو شعر باقی اشعار سے کم تر تھے۔ وہ میں نے نکال دئے ہیں۔ جو شعر رکھے وہ سطح عظمت پر رکھے جانے کے ہر اعتبار سے اہل ہیں۔ یہ غزل اپنے پانچ اشعار کے ساتھ ہمارے تغزل میں ایک بے بہا اضافہ ہے۔ انہان میں کیسی دل افروزی ہے۔ سبک ہوئے ہیں تو عیش ملال سے بھی گئے۔ یہ "عیش و ملال" کیا ہے اسے نفسیات کا برتر علم رکھنے والے، رہ و رسم عاشقی کی برتر سطح سے آشنا اور لفظ کے جمالیاتی پہلو کی پوری آگہی رکھنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ گہر تاب ترکیب ہے۔ ان گنت مفاہیم اور تلازمات سے مالامال۔ اب ایک کے بعد ایک اونچی غزل آ رہی ہے۔

ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
ہم ایک حلقہ، وحشت اثر میں ہوتے ہیں

یہ غیر مرئی جمال کو مرئی صورت میں پیش کرنے کی نازک بات ہے۔

وہی ہیں آج بھی اس جسم نازنیں کے خطوط
جو شاخ گل میں جو موج گہر میں ہوتے ہیں
کھلا یہ دل پہ کہ تعمیر بام و در ہے فریب
بگولے قالب دیوار و در میں ہوتے ہیں

(یہ اردو غزل کے عظیم ترین اشعار میں سے ایک شعر ہے) اور کیا خوبصورت شعر ہے خالص غزل

کا۔
گزر رہا ہے تو آنکھیں چرا کے یوں نہ گزر   غلط بیاں بھی بہت رہگذر میں ہوتے ہیں
اور یہ بھی ہماری ادبی روایت میں شامل ہو جانے والا شعر ہے۔
سرشتِ گل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش و نگار   ہنر یہی تو کفِ کوزہ گر میں ہوتے ہیں
اور بے مثال آخری شعر ہے۔
طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش   ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

اگر آپ اس سفر کے مفاہیم پہلے مصرعہ کے تعین کے بعد بھی نہیں سمجھے اور آپ تک یہ بات نہیں پہنچی کہ یہ نوعِ انسانی کا روحانی اور جمالیاتی سفر ہے۔ تو آپ کو ادب سے کنارہ کش ہو کر کوئی اور شغل اختیار کر لینا چاہیئے۔ یہ مشورہ میں بہت دنوں سے چند ہمہ دان ادبی کالم نگاروں کو دینے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ وہ حسنِ اتفاق سے مل گیا۔ مدنی ساری عمر اپنی پی آر سے بے پروا رہا تھا۔ مشاعرہ میں کوئی بلا لیتا تو شعر یوں سناتا جیسے سر سے بلا ٹال رہا ہو۔

ایک نازک سلسلہ احساس و خیال کی ترجمان غزل
وحشتِ تیز میں جس زخم کی گہرائی ہے   میرے سینے میں وہ پہلے سے اتر آئی ہے
میں نے اب گھر کی بھی زنداں سے ملادی ہیں حدیں   یوں الگ بیٹھ کے چھپنے میں بھی رسوائی ہے
ربطِ یک سلسلۂ کار ہم آہنگی ہے   عشق کو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہرجائی ہے
کس سے کہئے کہ عبادت گہِ اربابِ نظر   سنگِ طفلاں ہے کہ زخمِ سرِ سودائی ہے
ختم پر سلسلۂ عہدِ بہاراں آیا   گرم اک صورتِ ہنگامۂ پیدائی ہے
اس شبِ تار میں مستوں کا سبو بھی ہے چراغ   رات ایک شعلۂ آفاق چرا لائی ہے
کل سے کچھ اور تھا اندازِ غبارِ صحرا   شہر میں آج کوئی تازہ خبر آئی ہے

میں علاقہ کی تخصیص نہیں کرتا۔ ادب کا ہر باقاعدہ طالب علم رائج اسالیبِ غزل سے آشنا ہے۔ میں جو مثالیں پیش کر رہا ہوں انہیں وہ یاد کرے اور پھر دیکھے کہ کیسے کیسے نامور شاعر مدنی کی غزل سے مضمون اور تراکیب بغیر اعتراف کئے ہوئے اپنے کلام میں اپنی تخلیق کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ ایک بات اور قاری کو ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ کہیں کہیں مدنی کا محبوب وہ بھی ہے جس کے بارے میں کتاب پیدائش سے اقتباس دے رہا ہوں۔ "اب وہ ناری کہلائے گی کہ نر سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد ماں باپ کو چھوڑے گا"۔ مگر بیشتر وہ محبوب، میں کہتے ہوئے ڈرتا ہوں مگر بات یہی ہے کیونکہ مدنی نے اپنے بچپن اور آغازِ جوانی میں اس علاقے کے ایک عظیم قلندر کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے جن میں سے کچھ مجھے سنائے بھی تھے۔ وہ تجربے مدنی کے لاشعور میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ سو وہ جسے بالعموم بطور محبوب پیش کرتا ہے وہی ہے جو رومی و عطار کا حافظ و صائب کا بیدل میر اور غالب کا محبوب ہے اور یہ غزل اسی سے مخاطب ہے۔ میں تو

عصری ادب سے بہت دیر تک Out of Touch رہا مگر اس سے پہلے یہ غزل تمام ذوق ادب رکھنے والوں کو یاد تھی اور محفلوں میں اکثر اس کا ذکر ہوتا تھا۔

دلوں کی عقدہ کشائی کا وقت ہے کہ نہیں ۔ یہ آدمی کی خدائی کا وقت ہے کہ نہیں
کہو ستارہ شناسو فلک کا حال کہو ۔ رخوں سے پردہ کشائی کا وقت ہے کہ نہیں
ہوا کی نرم روی سے جواں ہوا ہے کوئی ۔ فریب تنگ قبائی کا وقت ہے کہ نہیں
خلل پذیر ہوا ربط مہر و ماہ میں وقت ۔ بتا یہ تجھ سے جدائی کا وقت ہے کہ نہیں
الگ سیاست درباں سے دل میں ہے اک بات ۔ یہ وقت میری رسائی کا وقت ہے کہ نہیں
دلوں کو مرکز اسرار کر گئی جو نگاہ ۔ اسی نگہ کی گدائی کا وقت ہے کہ نہیں
تمام منظر کون و مکاں ہے بے ترتیب ۔ یہ تیری جلوہ نمائی کا وقت ہے کہ نہیں

میرے کہنے میں کسی کو شک تھا تو یہ آخری شعر اس کا ازالہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

میرا خیال ہے اب میں نے مدنی کی غزل کی فضا بھی اس تحریر میں قائم کر دی ہے۔ اب میں غزل بہ غزل مطلع لکھ کر شعروں کے نمبر دیتا جاؤں گا۔ کہ وہ برتر سطح کے شعر ہیں اور قاری انہیں زیادہ توجہ سے پڑھے۔ مدنی کی غزل میں فکر کی متانت اور گہرائی جدید غزل سے اسے ممیز کرتی ہے۔ وہ فکر کی تہ داری میں میر (اسلوب کی نہیں) مرزا سودا، آتش اور غالب کی روایت سے منسلک ہے اس کی فکر میں عمق حالی اور فانی سے بھی زیادہ ہے۔ یاس یگانہ میں فکر کم اور لہجے کی ندرت زیادہ تھی۔

اب غزل ہے۔

حرم کا آئینہ برسوں سے دھندلا بھی ہے حیراں بھی ۔ اک افسون برہمن ہے کہ پیدا بھی ہے پنہاں بھی

یہ شعر تو ہمارے علمائے دین اور عمرانی فلسفہ کے ماہروں کے لئے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ہم نے دین اور زبان کے اختلاف کا نام لے کر ایک ملک تو اپنے لئے حاصل کر لیا۔ لیکن ہمارا اسلام اور ہماری مدنیت پہلے سے بھی زیادہ آج زنار پوش ہے۔ اور یہ بات مدنی نے اس لئے کہی کہ وہ نوعی علمی اور روحانی اور معاشرتی تاریخ سے پوری طرح واقف تھا۔ یہ بات کم تر سطح کا شاعر نہیں کہہ سکتا تھا۔ معافی چاہتے ہوئے یہ شعر فیض صاحب نہ ناصر کاظمی نہ ان سے پہلے یاس یگانہ کہہ سکتے تھے کہ ان کی علمی سطح اپنی انتہائی رفعت پر بھی کالج کے لکچرار یا ایک باخبر اخبار بین سے آگے نہیں پہنچی تھی۔ یہ ساری کی ساری غزل انتخاب ہے۔ مدنی کی اعلیٰ ترین سطح سے ذرا کم تر ہے لیکن گذشتہ سو برس کی غزل میں یہ بھی معتبر قرار پائے گی۔ اس کے بعد کی دو غزلیں رواجی ہیں۔ مدنی کی دنیائے شعر کے مناظر میں قاری ان سے صرف نظر کرے تو کوئی زیاں نہیں ہوگا۔

دوسرے حصہ، غزل میں، جس کا آغاز ۱۹۵۷ء کی غزل سے ہوتا ہے، پہلی غزل اتفاق سے ایسی زمین میں ہے جو میں نے اپنے خیال میں خود اختراع کی تھی کہ "دشت امکاں" کا نسخہ مجھ سے ۱۹۶۴ء میں کھو گیا تھا۔ سفر امریکہ کے وقت گھر کی الٹ پلٹ میں۔ اس تحریر کے لئے میں نے

"دشت امکاں" کا نسخہ عزیز مکرم قمر جمیل صاحب سے لیا ہے۔ جس پر ابتدا میں دو نام لکھے ہیں۔ یعنی اس کتاب پر دو عزیزوں کے مالکانہ حقوق ہیں۔ قمر جمیل صاحب کے اور پاکستان کے نامور اداکار عزیزی طلعت حسین کے۔ مطلع یہ ہے۔

بوئے گل تو سفر خود ہے ہوا کے مانند — کون اس راز کو سمجھے گا صبا کے مانند

بہت رواں غزل ہے۔ تہ دار اور پائندہ

دوسرا شعر مجھے پسند آیا

کوئی افسوں نہیں اس نیم نگاہی کے سوا — کوئی جادو نہیں اس زلف دوتا کے مانند

یہ شعر بھی عاشقانہ سطح پر بہت دشوار ہے۔

اس نے کچھ پچھلے پہر گوش محبت میں کہا — نرم شبنم کی طرح شوخ صبا کے مانند

باقی اشعار قاری پوری توجہ سے پڑھے۔ کہ ہر شعر ایک نہ ایک پہلو جاذبیت کا لیے ہوئے ہے۔

اس کے بعد کی غزل۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن کی بحر میں ہے۔ حزیں بہت، آتشیں بہت۔

مطلع مدنی کے رنگ کا ہے۔ چوتھا شعر بھی۔ باقی شعر عام سطح کے ہیں۔ مدنی کی سطح کے نہیں۔ ظاہر ہے کوئی تخلیق کار ایک ہی سطح ہمہ وقت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ کہیں بہت تابندہ شاہکار نظر آئے گا۔ کہیں برتر سطح سے کم تر بات ہوگی۔۔ بہر حال بڑا تخلیق کار کتنی ہی رواروی اور بے توجہی سے کچھ لکھے کوئی نقش بنائے وہ عام تخلیقی سطح اور Norm سے بہر حال بہتر ہوگا۔

"دشت امکاں" کے صفحہ ۱۱۶ پر جو غزل ہے فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن اس کا مطلع دوسرا شعر اور مقطع رنگ مدنی میں تو ہے مگر اس کی دلپذیری عام سطح سے فروتر ہے۔ باقی سارے اشعار بہت اچھے ہی نہیں مدنی کی باکمالی کے آئینہ دار ہیں۔

کل کوئی تذکرہ زندہ دلاں نکلا تھا — کل بہت یاد حریفان کہن آئی ہے

یہ بھی کم فرصتی دل کا فسانہ تو نہیں — یہ جو اک روزن زنداں سے کرن آئی ہے

وقت کی رو جو سر دشت وفا دھندلی تھی — کس قدر صاف سر دار و رسن آئی ہے

میں بڑی صراحت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آخری شعر مدنی کے سوا اور کوئی ہم عصر شاعر نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس میں اپنی روایت اور جدید ادبی مزاج کا دل افروز وصال ہوا ہے۔ اور دیکھیے مدنی کا خاص اسلوب اس غزل میں کیسا نکھر کے آیا ہے۔ اس غزل میں مجھے صائب تبریزی اور بابا فغانی دونوں کی خوشبو ایک تازہ مہک بن کر دل و جاں کو سوادِ صبا بناتی محسوس ہوئی۔ میں کسی شعر کو اس غزل سے حذف کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا ہوں۔ اور اسے من و عن نقل کرتا ہوں تاکہ آئندہ نسلوں کے لئے ایک گواہی اس دور اس اعتراف کی موجود رہے کہ مدنی نے غزل کی پھلواری میں ایسے پھول کھلائے ہیں جو اس سے پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھے تھے۔ اس

سے بہتر اور زیادہ خوش جمال جواہر پارے ہمارے پرانے شعراء کے ہاں ملیں گے اور ان گنت۔ مگر مدنی نے جو بات جس ڈھنگ سے کہی ہے وہ اس کی اپنی ہے۔ اس پر کسی بڑے استاد کی کوئی گونج کوئی چھاپ نہیں۔

نظر میں سلسلہ روشنی فردا سے — ہوئے ہیں تابہ افق کچھ سواد پیدا سے
ہزار حیف کہ اب میکشوں کو یاد نہیں — روایتیں جو عبارت تھیں جام و مینا سے
مئے کہن کو فسون مسیح دے ساقی — کہ گفتگو ہے حریفان بادہ پیما سے
اک اور موج بلا کا سرود غرقابی — مرا سفینۂ غم چاہتا ہے دریا سے
انہیں بھی گردش پرکار آرزو جانو — وہ دائرے جو کھنچے میری لغزش پا سے

(یہ خیال بالکل نیا ہے۔ اور اس لہجے میں اب تک کسی غزل گو نے بات نہیں کی تھی)

اک اور مرحلہ قرب میں ہے عشق کی رات — شب وصال کے بعد اب تری تمنا سے

دل کشادہ لیے جو قاری مدنی کا یہ کلام پڑھے گا وہ لازماً میرے معروضات سے اتفاق کرے گا۔

اور اب وہ غزل آتی ہے جس نے کئی برس تمام ادبی حلقوں میں ایک غلغلہ ستائش برپا رکھا۔ اس میں دور نو کا نقیب کھل کر سامنے آیا ہے۔

تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی — پائے جنوں سے حلقۂ گردش حال لے گئی
جرأت شوق کے سوا خلوتیان خاص کو — اک ترے غم کی آگہی تابہ سوال لے گئی

دیکھو کس انداز سے بات کہی ہے۔ حسن بھی، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ، تنہائی سے دل زدہ ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی حرف نیاز سنے۔ کوئی اس کے سامنے التفات کا سائل ہو کر آئے۔ پرانی مقدس کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ وہ تنہا تھا اس نے، چاہا کہ وہ جانا جائے تو اس نے یہ جہاں تخلیق کیا اور اس میں ایک نوع حیات ایسی بنادی جو حسن کی متلاشی بھی ہے اور دید کی تاب اور رسم و راہ کی جرأت بھی رکھتی ہے۔ بار امانت بڑھ کر اٹھالیتی ہے کہ ظلوماً جہولا ہے۔ دیکھو اس ظلوماً جہولا میں کتنا انس کتنا تلطف ہے۔

تیز ہوا کی چاپ سے تیرہ بنوں میں لو اٹھی — روح تغیر جہاں آگ سے فال لے گئی
نرم ہوا پہ یوں کھلے کچھ ترے پیرہن کے راز — سب ترے جسم ناز کے راز وصال لے گئی

میں نے وہ شعر لکھ دیے ہیں جو مجھے اکثر راتوں کی تنہائی میں یاد آتے ہیں جب مرے اس یار طرحدار کی شبیہ میری آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ اس کے بعد آنے والی غزل بھی خالص مدنی کے رنگ اور مزاج کی ہے۔ "فال لے گئی" مدنی سے لے کر راشد صاحب نے اپنی ایک نظم میں اسی تلازمے سے استعمال کی ہے۔

کچھ کرم ہم گوشہ گیروں پر بھی فرمایا کرو — شہر میں آتے تو رہتے ہو ادھر آیا کرو
ساکنان شہر میں ہی میکدے کی جان ہوں — کچھ مرے حق میں دعائے خیر فرمایا کرو
دوزخ و جنت ہے آپ اپنی لب لعلیں کی آگ — نیک و بد کی بحث میں اس کو نہ الجھایا کرو
روح صد آوارگان ابر و باد آوارہ ہے — اس فضا میں شام سے پہلے ہی گھر آیا کرو

اگلی غزل بھی برتر سطح کے ہیجان فکر و وجدان میں تخلیق ہوئی۔ سارے شعر نقل نہیں کرتا۔ صرف ذائقہ چکھا دیتا ہوں۔ قاری اس کے ساتھ خود وقت گزارے کہ اس کی فضا نکھر کر اس کے عرصہ جاں میں رچ جائے۔

وہی داغ لالہ کی بات ہے کہ بنام حسن ادھر گئی — کوئی کیا کہے کہ کہاں کہاں ترے خال رخ کی خبر گئی
کوئی ہاتھ وشنہ۔ جانستاں کوئی ہاتھ مرہم پرنیاں — یہ تو ہاتھ ہاتھ کی بات ہے کوئی وقت پا کے سنور گئی
وہی ایک سود و زیاں کا غم جو مزاج عشق سے دور تھا — وہ تری زباں پہ بھی آگیا تو گلی گلی کی بکھر گئی
یہ شکایت در و بام کیا یہ رباط کہنہ کی بات کیا — کوئی ہے چراغ شب وفا ترے شہر میں بھی گزر گئی
وہ ہزار شوق کی لغزشیں مگر ایک لذت نارسی — مری آشنائے طرب نظر ترے رخ پہ آکے ٹھہر گئی

چند نظموں کے بعد پھر ایک غزل آئی ہے۔ اس میں کچھ شعر ہماری تغزل کی روایت کی بلند ترین سطح کے ہیں۔

نظر ہے سلسلہ خواب صد ہزار اوراق — کہاں کہاں سے گزرنا پڑا ہے کیا کہیے
اسی کی راہگذر پیچ پیچ آئی ہے — کہیں سے قصہ عمر گریز پا کہیے
نوائے شوق کو زنجیر در گلو کیجیے — سخن کو طائر مجروح کی صدا کہیے
یہ تیرے دور کا اک عہد خوش نوائی ہے — مگر سکوت ہے ایسا کہ مرحبا کہیے

اس آخری شعر کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ ١٩٥٨ء میں پہلا مارشل لا ملک میں نافذ ہوا۔ سول آمریت تو ملک غلام محمد قائم کر کے قوم کو زبوں انجامی کی راہ پر لگا گیا تھا۔ اب کھلی توپ بندوق کی حکومت تھی۔ ادیب مصاحبان دربار نے کہا حضور والا ادیبوں کا دل جیت لینا چاہیئے کہ یہ ہم ہو جائے تو حکومت دلوں پر حکومت کرنے لگے گی سو مرحوم قدرت اللہ شہاب نے جواں سال جمیل الدین عالی کو نائب بنا کر رائٹرز گلڈ قائم کر دیا۔ یہ آخری شعر اس فضا میں کہا گیا۔ یہ بات عرض کر دینا ضروری تھا کہ قاری اس شعر کی طنز جو "مرحبا" میں آئی ہے پوری طرح سے اس کا تاثر حاصل کر سکے۔ اس کے بعد آنے والی غزل میں بھی شاعر کے وجدان میں اس قصیدہ گو فضا کا اثر اضطرار انگیز ہے۔

خوبان تازہ کاری گفتار کچھ کہو — تم بھی ہوئے ہو کاشف اسرار کچھ کہو
جانے بھی دو تغیر عالم کی داستاں — کس حال میں ہے نرگس بیمار کچھ کہو
بادل اٹھے ہیں چشمک برق و شرار ہے — منہ دیکھتے ہو صورت دیوار کچھ کہو
مطرب کو تازہ بہت سکھاؤ ہوا ہے نرم — گزرے کسی طرح تو شب تار کچھ کہو
ٹھہرا ہوا ہے وادی غم میں رسیدہ وقت — مجھو بھی کچھ نزاکت بسیار کچھ کہو
زندہ دلان شوق نے رکھا بہار نام — اک موج خوں گئی سر گلزار کچھ کہو
الجھے گا آج ہی کہ ہوا پیچ پیچ ہے — بنتا نہیں کوئی رخ گفتار کچھ کہو

میرے خیال میں یہ بہت ارفع سطح کی احتجاجی ندا ہے۔ ١٩٥٨ء سے ١٩٦٣ء تک کا سارا اردو ادب اٹھا کر تحقیق کر لو۔ اس سطح کمال کا احتجاجی کلام کسی شاعر کے ہاں نہیں ملے گا۔ غزل کے پیرائے میں۔ ہاں فیض صاحب کی غزل ہے جو میاں افتخار الدین کی موت پر کہی گئی تھی۔

کرو کج جبیں پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو ۔۔۔ کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا ۔
مدنی کی غزل میں حسن ناصر کے عقوبت کدے میں سفاکانہ قتل کی بات بھی ہے ۔ ع اک موج خوں گئی سر گلزار کچھ کہو!

اب ایک اور غزل آئی ہے جو میں سمجھتا ہوں گزشتہ چھ عشروں کی تین چار عظیم غزلوں میں سے ایک ہے ۔

سب پیچ و تاب شوق کے طوفان تھم گئے وہ زلف کھل گئی تو ہواؤں کے خم گئے

یہاں مدنی کا کردار ہوا کس سج دھج سے آیا ہے ۔ یہ شعر کائناتی تناظر میں کہا گیا ۔ جب شوق تجسس کے پیچ و تاب آسودہ ہو جاتے ہیں ، جب نگار مطلق کی زلف کا پیچ کھل جاتا ہے تو ہوا کا اضطراب تغیر کی موج تند نرم رو ہو جاتی ہے ۔ تکنیکی سطح پر بھی یہ شعر ایک باکمال صناع کا شاہکار ہے ۔ زلف میں پیچ رہتے ہیں تو ہوا میں بھی خم بڑھتے چلے جاتے ہیں ۔ یہ خم کبھی بگولوں کی صورت میں آکر بستیوں کو کھنڈر بنا دیتے ہیں ۔ لیکن جب نگار مطلق مائل بہ تلطف ہے اور اپنی زلف کو کھول کر اس کا جمال اپنی خوشبو عام کر دے تو نوعی شوق و اضطرار تسکین پا جاتے ہیں اور ہوا نرم و سبک چلنے لگتی ہے ، ارتقا اور تبدیلی کا سفر آشتی کے ماحول میں جاری رہتا ہے ۔

ساری فضا تھی وادی مجنوں کی خوابناک جو روشناس مرگ محبت تھے ۔ کم گئے

ابھی مارشل لا کے عقوبت کدے میں جو لاہور کے شاہی قلعہ میں قائم تھا ایذا رسانی اور ہمت عشق میں مقابلہ جاری تھا جو ایک مرگ عظیم کے بعد دھیما پڑ گیا ۔ غالب نے کہا تھا ۔ مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے ۔ مدنی نے اسی بات کو آگے بڑھایا ہے ۔

اے جادہ خرام مہ و مہر دیکھنا تیری طرف بھی آج ہوا کے قدم گئے

روح تجسس کی ہوا عرش کی جانب تیز پا رواں ہے Cosmic Change بعید از امکاں نہیں رہا ۔ اور دیکھو " اے جادہ ، خرام مہ و مہر " ! اس سطح کی بات غالب کے بعد کسی نے نہیں کہی تھی ۔

وحشت سی ایک لالہ ، خونیں کفن میں تھی اب کے بہار آئی تو سمجھو کہ ہم گئے
میں اور تیرے بند قبا کی حدیث خاص نادیدہ خواب عشق کئی ہے رقم گئے
ایسی کوئی خبر تو نہیں ساکنان شہر دریا مجنوں کے جو بہتے تھے ، تھم گئے

اگر غالب اور پھر ذرا کم تر سطح پر حالی کے بعد غزل اسلوب اور فکر ہر دو سطح پر وجدان کی سطح عظمت کے قریب قریب پہنچی ہے تو وہ اس غزل میں لپنے جمال بیکراں کے ساتھ نظر آتی ہے اب میں کیا کروں ۔ ہر غزل میرا دامن تھامتی ہے کہ تم ہمارا جمال دیکھے اور اس کی بات کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ یہاں مدنی غزل میں شاعر فردا ہے ۔

ہوا آشفتہ تر رکھتی ہے ہم آشفتہ حالوں کو برتنا چاہتی ہے دشت مجنوں کے حوالوں کو

تغیر ۔ نوعی تعمیر ، [illegible] لگن اور وحشت چاہتا ہے ۔ کہ اس وحشت شوق کے بغیر

راہ کے مراحل طے نہیں کئے جاسکتے۔

نہ آیا کچھ مگر ہم کشتگان شوق کو آیا ہوا کی زد میں آخر ہے سپر رکھنا خیالوں کو
خدا رکھے تجھے اے نقش دیوار صنم خانہ کہیں گے لوگ دیوار ابد تیری مثالوں کو
اندھیری رات میں اک دشت وحشت زندگی نکلی چلا جاتا ہوں دامان نظر دیتا اجالوں کو
بجھا جاتا ہے دل سا ایک لعل شب چراغ آخر کہاں لے جاؤں اس کے ساتھ کے صاحب جمالوں کو

اور اب دیکھئے پھر کوئی کانٹوں کا تاج Crown of Thorns سر پر پہنے زندگی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کھڑا ہے کہ اس کی شہادت کے بعد زندگی سرخرو نغمہ بہ لب شوق بہ جاں آگے بڑھ سکے۔

کھڑی ہے تاج پہنے شہر میں خار مغیلاں کا جواب تازہ دینے زندگی کہنہ سوالوں کو

تہذیب کے سفر کے ہر موڑ پر اساسی سوالوں کو ایک نئی سطح پر جواب دینا لازم آتا ہے۔ ہماری روایت میں چار آسمانی صحیفے نازل ہوئے کہ چار تاریخی مراحل پر کہنہ سوالوں کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر قابل عمل اور قابل قبول جواب دیے جاسکیں۔ اب دور خرد ہے تو اب مسیح بے جبرئیل آئے گا جو زندگی کی علامت بن کر خار مغیلاں کا تاج پہنے گا۔ مصلوب ہوگا اور اپنے تازہ لہو سے زندگی کے عارض و لب کو نیا رنگ نئی تاب دے گا۔

خیاباں خندقوں میں کھو گئے وہ موج خوں گزری ہوا نے زخمہ ور نے ساز بجھا ہے جنالوں کو

ہر نئے دور تاریخ میں موج خوں اچھلتی ہے۔ چھ سو برس قبل مسیح بخت نصر نے حضرت سلیمان کے بنائے ہوئے ہیکل کو جلا دیا۔ ہزاروں تابعین شریعت موسوی مارے گئے۔ باقی غلام بنا کر بابل لے جائے گئے۔

پھر قوم موسیٰ نے مسیح کو مصلوب کروایا۔ (مسیحی عقیدے کے مطابق) تو تاریخ کا نیا موڑ آیا۔ ہزاروں مومن مسلسل شہید کیے جاتے رہے۔ مسیح کے سارے مومن ایک ایک کرکے صلیب پر لٹکائے گئے۔ ملوکیت کے پٹھوؤں کو جو یہودی تھے خود ان کے سرپرستوں نے یوں بے دریغ قتل کیا کہ اس کی مثال کم ہی تاریخ عالم میں ملتی ہے۔ یہودی دو ہزار برس کے لیے ملکوں ملکوں بکھر گئے۔ جان بچانے کے لیے۔ پھر ہلاکو نے بغداد میں قتل عام کیا اور آٹھ لاکھ بندگان رب تلوار اور تیر و پیکان سے نوک سناں سے دو دن میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ بہت مثالیں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں کیا ہوا۔ کروڑوں بیگناہ انسان آدمی کے اندر پنہاں ہوس کے شیطان کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب اشتراکیت کا خاتمہ ہوا اور دنیا میں ایک برتر قوت رہ گئی تو ایک نیا عالمی نظام امریکی ملوکیت نو لے کر سامنے آئی ہے۔ یہ امریکہ، یہود، مہاجن عالمی حاکمیت کا نظام ہے۔ سو دیکھو بوسنیا میں کیسا Genocide ہورہا ہے۔ اور امن کے اپدیشک امریکہ کے نو دولتے اور یورپ کہ گیارہویں صدی سے اسلام کا دشمن ازلی ہے چپ ہیں چاہتے ہیں کہ یورپ کی سرزمین میں اسپین کے بعد جو اسلام کے آثار باقی رہ گئے تھے وہ بھی مٹا دیئے جائیں۔ میں نے ہر موڑ پر مسیح

ہے جبرئیل کی ضرورت کی نشاندہی کی ہے جو نوع کے گھناؤنے جرائم کا کفارہ ادا کرے گا۔ یہی مدنی کی اس غزل کے پیچھے ایک آرزو ایک حسرت کی فضا ہے۔

نکلنے ہی نہ پائے حلقۂ دشت تمنا سے ۔۔۔ ملی تھی گردش پرکار ایسی کچھ غزالوں کو
سبو میں موجزن آب ضمیر میگساراں ہے ۔۔۔ طلوع صبح تک روشن رکھیں گے ہم پیالوں کو

یہاں بھی علامتیں پرانی ہیں مگر مدنی نے انہیں بالکل نئے اسلوب سے استعمال کیا ہے۔ نیا تلازمہ گردش پرکار کا شامل کر کے یہ باہم متناقض علامتوں کا خوشنما اتصال بڑی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ایسی تازہ کاری بیدل، صائب اور غالب کے ہاں ملتی ہے۔ بعد کے غزل گو شاعروں میں ناپید ہے۔

کبود و سرخ میں تھی نیک و بد میں داغ و درماں میں ۔۔۔ ہوا سیاح تھی دیکھ آئی قم کے سب شوالوں کو

شوالہ یہاں علامت ہے معبد کے لئے، وہ زمین وہ جگہ جو تقدس رکھتی ہو۔ ہوا ساری تاریخ کے مقدس اور زندہ حوالوں کو دیکھ آئی ہے۔ اور موج تغیر یہ سارا سرمایہ اعصار اپنے ساتھ لیے آگے بڑھے گی۔

تغیر کی زمین پر آدمی کا تیز رو پرتو ۔۔۔ گیا ہے صورت مشعل لیے آیندہ سالوں کو

سارا خواب تخلیق اپنے اختتام کو آخری شعر میں پہنچ گیا۔ دور آیندہ کا ایک واضح تصور مشعل ہے جسے اٹھائے آدمی انحطاط اور آسودگی کے دشت تیرہ سے آگے نکل رہا ہے۔

اس کے بعد کی غزل واردات شوق کی دنیا لیے ہوئے ہے۔ اور تغیر ان واردات دل کی اساس ہے۔

نم خوردہ بہت شعلہ، جاں ہے کہ نہیں ہے ۔۔۔ ہر موج نفس آج دھواں ہے کہ نہیں ہے
ویسے تو یہ فرد غم جاں جل نہ سکے گی ۔۔۔ شعلہ کوئی نوخیز و جواں ہے کہ نہیں ہے

یہاں نوخیز و جواں میں تناقص نہیں ہے۔ نوخیز و جواں دونوں شعلہ کی گلتابی اور تیزی کے لیے علامت ہیں۔

مجھ کو تو ہے ہے خواب ہواؤں کو پرکھنا ۔۔۔ آپ اپنی جگہ یہ غم جاں ہے کہ نہیں ہے
خواب در و دیوار لیے تیز ہوا میں ۔۔۔ جاتی ہوئی شب عمر رواں ہے کہ نہیں ہے
ٹوٹا ہوا دل جادہ دریافت پہ رکھنا ۔۔۔ بنیاد تغیر مری جاں ہے کہ نہیں ہے

یہ آخری شعر مدنی کے اصل اسلوب کا نمائندہ ہے۔ یہ شعر مدنی کے سوا اور کوئی ہم عصر شاعر نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس میں بیدل کی سی ایک عمیق بہر خیال اور احساس کی ہے۔

اور ایک خالص عاشقانہ شعر، جو عشق کی زیاں طلبی اور دنیا اور اہل دنیا کے کار شب و روز کے خسران کا مقابلہ کرتا ہے۔

ویسے تو محبت میں بہت جی کا زیاں ہے ۔۔۔ بے دور محبت بھی زیاں ہے کہ نہیں ہے

روحانی اقدار سے معذور یہ تہذیب حاضر ہمہ زیاں، ہمہ خسران ہے کہ نہیں؟

محراب چراغ رخ ایلم ہے دنیا   ماتم گہہ چشم نگراں ہے کہ نہیں ہے

محراب کو معابد اور ایوانوں کے در و بام سے ہٹا کر بطور علامت سب سے پہلے جدید اردو شاعری میں مدنی نے استعمال کیا۔ اور آج کے جدیدیوں نے اسے دو ہی برس میں کلیشے بنا دیا۔ لیکن مدنی کے ہاں یہ سمبل ہمیشہ تازہ و تابدار رہے گا۔

میں نے مدنی کی غزل کا مزاج، اس کی فضا، مدنی کی منفرد لفظیات غزل میں اس کا سب سے الگ اسلوب یہ سب کچھ خاصی تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اب صرف ایک اور غزل کی بات کر کے کہ وہ اس کی زندہ جاوداں غزلوں میں سے ہے "دشت امکاں" کا جائزہ ختم کر دوں گا۔

"نخل گماں" میں مدنی نہ غزل میں نہ نظم میں "دشت امکاں" سے آگے گیا ہے۔ صرف ایک تھکن کے آثار اس میں نظر آتے ہیں۔ نظم میں مصرعے بہت اچھے اچھے کہیں آتے ہیں مگر کوئی نظم معرکہ آرا نہیں۔ غزل میں لفظیات کا انداز بہت دشوار اور ثقیل سطح پر نظر آتا ہے۔ اسلوب میں بھی ایک ٹھاؤ اور غیر ضروری بوجھل الفاظ اور آہنگ کے سوا کچھ نہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ شعر اچھا آتا ہے۔ اس کی نشاندہی میں کر دوں گا اور پھر اس کی آخری طویل نظم "مرزا باقر علی۔ داستان گو" پر بات کر کے اس تحریر کو اختتام تک پہنچاؤں گا۔ "دشت امکاں" کی تجزیے کے لئے آخری غزل یہ ہے۔

نرمی ہوا کو موج طرب خیز ابھی سے ہے   اے ہم صفیر آتش گل تیز ابھی سے ہے

فردا کا نقیب فردا کی لو فضا میں آج ہی محسوس کر رہا ہے اور ہوا میں رجائیت کی جو موج ہے وہ اہل دل کے لئے وجہ طرب و نشاط ہے۔

اک تازہ تر سواد محبت میں لے چلی   وہ بوئے پیرہن کہ جنوں خیز ابھی سے ہے

اس بوئے پیرہن میں ایک لہر پیرہن یوسف کی ہے جس نے یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹا دی تھی اور پھر آل اسرائیل نے مصر میں جا کر بہت اعلیٰ خطہ میں نئی اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال آیا کہ بوئے پیرہن سونگھنے والا مدنی آج کا یعقوب ہے عام بشر کی شکل و صورت میں۔ یہ کل کے کنعان کا نقیب ہے۔ ساری نوع کے لئے۔

اک خواب طائران بہاراں ہے اس کی آنکھ   تعبیر ابرو باد سے لبریز ابھی سے ہے

کیسا تازہ کیسا مہکتا ہوا اسلوب غزل ہے۔ لفظ سب پرانے ہیں۔ پیرایہ بالکل نیا اچھوتا اور جاں فزا ہے۔

گزری ہے رو ابھی مرحلہ خوابناک کی   دل میں لہو کی موج بہت تیز ابھی سے ہے
آئینہ لے کے گھوم گئی عمر نو خرام   تازہ رتی کا موڑ بلا خیز ابھی سے ہے
مبہم سے ایک خواب کی تعبیر کا ہے شوق   نیندوں میں بادلوں کا سفر تیز ابھی سے ہے
شاید کہ محرمانہ بھی اٹھے تری نگاہ   ویسے تری نگاہ دلآویز ابھی سے ہے

کیسی گلپوش لہجے کی غزل ہے۔ بے مثال، سراپا جمال، باد نو بہار کی طرح نشاط انگیز

مدنی کی غزل کا تفصیلی جائزہ ختم ہوا ۔ میں نے ساری غزلوں کو دو تین کے سوا التزاماً موضوعِ بحث بنایا ہے ۔ تاکہ میں دیانت دار قاری کو دکھا سکوں کہ دیکھو صاحب بیس سے بھی زیادہ غزلیں اس کلام میں ایسی ہیں جو گزشتہ (۸۰) برس میں اور کوئی نہیں کہہ سکا ۔ کوئی اس سطح کے قریب قریب بھی نہیں آسکا ۔ مدنی کی فکر تازہ و شاداب ہے اور عمیق جوئے رواں ہے ۔ اس کی لفظیات میں نئے احساس و شعور اور نادر سطح کے وجدان کی وجہ سے ایک دل افزا تازگی اور حسن ہے ۔ اس میں حد سے سوا موسیقیت ہے اپنے خالص آہنگ کی ۔

مدنی اور ضیا کے اسلوب بہت مختلف ہیں مگر ایک بات دونوں میں مشترک ہے ۔ خیال کی تہ داری ۔ اور اس خیال کے لئے عمر بھر کی ریاضت سے نکھرا ہوا اپنی شخصیت اور اپنی منفرد وجدانی کیفیت کے مطابق گہر تاب اسلوب

"نخلِ گماں" مجھے مدنی نے چھپنے کے فوراً بعد آکر عنایت فرمائی تھی ۔ پھر میں اس کی تقریب اجراء میں بھی شامل ہوا ۔ میں نے اس کتاب کو کئی بار بڑی محبت سے ورق ورق پڑھا ۔ بس چند بند چند نظموں کے دامنگیر ہوئے ۔ پہلی نظم موجِ نفس میں کچھ مصرعے بہت اچھے ہیں ۔ جیسے ۔

ساعتوں کے چاک گرداں ہے قیام — ہے خطِ فاصل سوادِ صبح و شام
زندگی لیکن غنودہ سوگوار — بام و در پر موجِ دود کو کنار
دورِ کبریتی میں اجزائے جہاں — اک دھواں ، اک آگ فردائے جہاں

Nuclear Age کے لئے دورِ کبریتی کسی بانکی ترکیب ہے اور کیسی بلیغ

اور

پھر سوادِ شرق ہے تاریک بن — دودھ کے پیالوں پہ ہیں سانپوں کے پھن

یہ نو آزاد ملکوں میں آمریت کی طرف اشارہ ہے کہ ہر بونا آمر ایک ناگ کی طرح ہلاکت آفریں ہوتا ہے ۔

روغنوں کے چاہ پر ہے راہ تنگ — تیل کے چشموں پہ زرداری کی جنگ
ایک سیل ہے گراں قیمتی ہوا — اک گرہ خوردہ دھواں جلتا ہوا

اور

مایۂ اقلیم جاں رازِ سخن — اے مری موجِ نفس سازِ سخن
کوئی افسانہ سنا جمہور کا — تیرگی میں ساز اٹھالے نور کا

اور

حرفِ حق کی کوئی تابندہ دلیل — تازہ تر سقراط کے ہونٹوں کا نیل
بے سخن کیوں ہے لبِ خاموش جاگ ! — بیتِ نو آغاز و چشمِ ہوش جاگ !

"ماہی گیروں کی بستی میں" یہ نظم بھی "موجِ نفس" کی مثنوی کی ہیئت میں ہے ۔ اور چھوٹی بحر میں ہے ۔

دیکھئے پرانی چھوٹی چھوٹی کٹیاؤں کی بستی کا ایک منظر شب:

سب لالٹینیں ایسی دھوئیں میں — بلی کی آنکھیں اندھے کنوئیں میں
اور
پانی کے سیاح طوفان زادے — پر پیچ موجیں ان کے لبادے

آخر میں سمندر سے خطاب کر کے شاعر کہتا ہے۔

طوفاں یہ طوفاں شام اور سویرے — تو بھی ہے ان کا وہ بھی ہیں تیرے
گیت ان کے سارے تونے سنے ہیں — ان کے سروں نے طوفاں بنے ہیں
تیرے قدیکی ہم راز ہیں یہ
سب سے پرانی آواز ہیں یہ

ایک گھمبیرتا ایک Mellowness تو شاعر کے مزاج میں نظر آنے لگی ہے۔ جو ایک نیا عنصر ہے۔ "قریب مرگ" "ایک سانحے پر کہی ہوئی نظم ہے جو شاید ہسپتال میں طویل قیام کے دوران لکھی گئی۔ اس میں موت کو سامنے دیکھا۔ ایسا تجربہ اس شاعر کے لئے جو ایک غزال وحشی تھا بالکل نیا تھا۔ اس کا بھی مثنوی کی ہئیت میں بیان ہے۔ بیان اپنے اندر جو بھی اس کا منظر ہے۔

اس نظم کے کچھ اشعار جو ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد مدنی کی شخصیت اور اس کی باغی کیفیت کے ترجمان ہیں:

کیا افق سے جانے آج آئی ہوا — کچھ کفن کے تار و پو لائی ہوا
اک تصادم سے دبی یوں نبض ہوش — آگئی اک ساعت میت بدوش
ذہن میں سایہ سا اک پھرنے لگا — ہو بط کا پل ٹوٹ کر گرنے لگا
تھے خیالوں میں کبھی آباد شہر — ہو گئے ویران وہ آباد شہر
سامنے ہے اک غبار ماہ و سال — سانس لیتے ہیں شکستہ پر خیال
ہوش کی مشعل بجھانے آگئی — موت اک نشتر چلانے آگئی
کھل گیا کوئی جنوں خانے کا در — مار و شاہیں گھر گئے دیوار پر
وقت کو کیسا تپایا خون میں — موت نے لوہا بجھایا خون میں

برسوں بعد جوش کا لہجہ جو شاید لاشعور پر اب بھی محیط تھا اس جانگسل لمحے میں شعور پر محیط ہو گیا۔ یہ آخری شعر بالکل جوش کا آہنگ رکھتا ہے۔ لفظیات بھی جوش کی ہے۔ یہ نظم کسی ارفع سطح سے مدنی کے مرتبے کی نہیں دکھائی دیتی۔ جب موت نظر آرہی ہو سامنے تو آدمی کے اندر جو خیال ابھرتے ہیں وہ اس کو سمجھنے میں بہت مددگار ہوتے ہیں۔ میں نے دو دفعہ یہ عالم اپنے سامنے دیکھا ہے۔ میرا تجربہ مدنی کے تجربے سے بالکل مختلف تھا۔ میں تو اس مرد کلاں کار کو نوعی سطح پر دیکھ رہا تھا جو صاحب "سلطان" ہو گا۔

"شہیدان بیروت" بھی معمولی سطح کی نظم ہے۔ یہاں صرف ایک مصرعے نے مجھے ہیچ طرف متوجہ کیا کہ اس میں پھر ہجرت کا لفظ آیا۔ یہ نظم اب سے پندرہ سولہ برس پہلے لکھی گئی تھی

"ابھی ہے راکھ سی کچھ خیمہ گاہ ہجرت سے" ۔ یہاں بھی ہجرت کا لفظ مدنی لایا ۔ مگر یہ تو بات ہی مہاجروں کی بستی کی ہے تاہم ہجرت کے استعمال میں دوسرے مقامات پر پہل جدید تلازمے کے ساتھ مدنی نے کی تھی ۔ جسے نئی نسل کے شاعروں نے "کچاپچہ" بنادیا ۔ سب نظمیں دشت امکاں کی سطح سے کم تر ہیں ۔ غزلوں میں لہجہ مشکل اور لفظیات میں زور بڑے وزن کے لفظوں پر ہے ۔ شاعر کی جگہ ایک لغت نویس نے لے لی ہے ۔ ایک غزل غنیمت نظر آئی ۔

الگ الگ بھی بہت دلفریب نکلے گی ۔۔۔ کہیں گے لوگ ابھی تیری داستاں کیا کیا
نفس کی رو میں کوئی پیچ و تاب دیکھا تھا ۔۔۔ گیا ہے وادی جاں سے رواں دواں کیا کیا
وفا کی رات کوئی اتفاق تھی لیکن ۔۔۔ پکارتے ہیں مسافر کو سائباں کیا کیا
ہزار شمعیں جلائے ہوئے کھڑی ہے خرد ۔۔۔ مگر فضا میں اندھیرا ہے درمیاں کیا کیا

باقی غزلوں کے بہترین اشعار جو میں ڈھونڈ سکا ۔ درج ذیل ہیں

یہ تغیر ہے کسی قافلہ درد کی گرد ۔۔۔ پردہ دار غم منزل ہے وطن کیا کہیے
دیکھنے میں تو وہ جیسا بھی نظر آتا ہے ۔۔۔ لیکن اس شوخ کا اسلوب بدن کیا کہیے
ایک دو شب سے مرا خواب جنوں ایسا ہے ۔۔۔ ٹوٹ جاتی ہے کوئی دل میں کرن کیا کہیے

اور

فغاں کہ رسم و رہ عاشقی بھی عام ہوئی ۔۔۔ جبین شوق تری بندگی بھی عام ہوئی
حدیث لالہ و گل کا جب اختصار ہوا ۔۔۔ بہار تیرے تصور کا ایک نام ہوئی
فضا میں گزرے ہوئے کارواں کی یادیں ہیں ۔۔۔ مسافرو ! یہ کہاں آکے آج شام ہوئی

ہم نہ کہتے تھے محبت میں زیاں ہے اے دوست ۔۔۔ کوئی حاصل نہیں اس حاصل دشوار کے بعد
دل کو احسان وفا یاد دلانے کے لئے ۔۔۔ ایک دنیا ہے ترے سایہ دیوار کے بعد

ایک اور غزل کے دو حاصل غزل ابیات :

جو زندگی میں ادھوری سی رہ گئی وہ نیند ۔۔۔ جب آگئی تو سر نخل دار آتی ہے
اک آدمی سے محبت کے نام پر برسوں ۔۔۔ جو گفتگو تھی وہی بلا بار آتی ہے

ایک غزل میں صرف ایک شعر نے روکا ۔

ہوا کے غم سے سلگتا رہا ہے سینہ گل ۔۔۔ کوئی تو سینہ گل کے گداز تک پہنچے

ایک غزل میں صرف ایک شعر جدید شاعری کے سلسلے میں نظر گیر ہوا ۔

یہ رات طائر ہجرت زدہ غنیمت ہے ۔۔۔ طلوع صبح سواد کمیں میں ہوتی ہے

موسمی پرندے سائبریا کے برفستان سے زندگی بچانے کے لئے ہماری دنیا میں آتے ہیں ۔ اور یہاں پاکستان کے جاگیردار اور ستوؤں اور کھجوروں پر بیس تیس برس پہلے تک بسر اوقات کرنے والے نو دولتیے شیوخ جرہ و شاہین لئے تلور کا شکار کرنے آموجود ہوتے ہیں ۔ یہ خوبصورت پرندوں کی نوع ان بدچلن شیوخ کی اور ہماری حکومتوں کی طمع کے باعث ختم ہونے کو ہے ۔ کیسے قابل نفرت کیسے نجس لوگ ہیں یہ ۔ شہوات کے غلام ۔ اور اپنی فطرت میں سفاک ۔

میں نے نخلِ گماں کا مزاج، اس کی فضا، اس کی وجدانی سطح کی چند مثالیں پیش کر دی ہیں اب صرف ایک آدھ غزل کا ذکر باقی ہے جو کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ شاید ان مسودوں میں جو مدنی چھوڑ گئے ہیں اور بہت سا اچھا کلام ہو۔ اکادمی ادبیات کے سالانہ انتخاب برائے ۱۹۹۰ء میں مدنی کی غزل شامل ہے۔ اس میں ایک بے مثال شعر ہے۔ نئی Imagery ہے۔ اور تغزل Enrich ہوا ہے۔Image نامانوس سی لگی۔

خواب کے آئینہ، گرداں نے کی صورت گری — تیرے رخ کے زاویے کیا کیا نظر آتے رہے

زندہ جاوداں شعر ہے۔ اس غزل کے تین شعر اور اس جائزے میں شامل کئے جانے کا تقاضا کرتے نظر آتے ہیں۔

وقت کی تازہ رخی کی رو میں آخر روئے یار — تیرے افسانے بہ عنوانِ دگر آتے رہے
اپنی خاکستر سے تو قالب رہی دنیا تمام — اک نئی فرہنگ لے کر دیدہ ور آتے رہے
عالمِ فردا تری بینا رصدگاہوں کی خیر — جن کی رو پر آفتاب تازہ تر آتے رہے

یہ اشعار بیسویں صدی کے آخری عشروں کا شاعر ہی کہہ سکتا تھا۔ بڑی فکر اور بڑا وجدان رکھنے والا شاعر۔ ایک اور غزل ایک جریدے میں دیکھی تھی۔ اس کے مطلع میں ایک نئی علامت مدنی نے اردو ادب کو عطا کی۔ شہر میں استحصال، ظلم اور سفاکی کے لیے رقصِ بسمل کی ترکیب اور علامت تو فارسی اور اردو شاعری میں صدیوں سے موجود تھی لیکن کھیتوں اور جنگلوں کی زمین جس میں ہمارے کاشتکار رہتے ہیں ان کے استحصال اور ان پر مظالم کے لئے کوئی علامت نہ تھی۔ مدنی کے مطلع کا دوسرا مصرعہ ہے۔ دشت میں آہو گردانی سی، شہر میں رقصِ بسمل سا۔ صاحب لوگ شکاری کتوں کے ساتھ لومڑی کا یا ہرن کا شکار کھیلتے ہیں تو شکاری کتوں کے غول چھوڑ دیتے ہیں جو انہیں بھگا بھگا کر تھکا دیتے ہیں۔ وہ تھک جاتے ہیں تو تازہ دم شکاری کتے ان کو جا کر بے بس کر دیتے ہیں۔ تاکہ مالک آئے اور انہیں پکڑ لے۔ یہ نئی علامت مجھ پہ کئی دن طاری رہی اور میں مدنی کا دل میں سپاس گزار رہا۔

اور اب "مرزا باقر علی۔ داستان گو" پر میں اپنا تاثر رقم کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ مجھے یہ نظم پہلی شنید میں بہت بڑی نظم محسوس ہوئی۔ پھر یکایک مجھے اطلاع ملی کہ بھئی یہ سمبل تو مستعار ہے۔ اب سے چند عشرے ادھر ایک یورپی شاعر نے پرانے اور نئے دور کے تصادم کے لئے ایک بڑے عقاب اور ہوائی جہاز کو سمبل بنایا تھا۔ عقاب ہوا میں گرمِ پرواز تھا کہ اسے دور سے ہوائی جہاز آتا دکھائی دیا۔ عقاب نے ایک لمحہ میں فضاؤں اور ہواؤں پر اپنی قیادت اور حاکمیت کو ایک فوری خطرہ کی طرح Visualise کر لیا۔ عقاب ہوا کا حاکم تھا۔ ایک اقلیم میں دو بادشاہ بیک وقت نہیں رہ سکتے۔ سو عقاب نے اپنی توانائی پنجوں چونچ اور پروں میں سمیٹ لی۔ پروں کو پھڑپھڑا کر مستعد کیا اور ہوائی جہاز کا رخ کیا۔ ہوائی جہاز قریب آیا تو عقاب یوں اس پر حملہ آور ہوا جیسے سرخاب و کبوتر پر جھپٹتا تھا اگلے لمحے عقاب کے جسم کے

لاکھوں ٹکڑے اور لہو کے قطرے ہوا میں بکھر گئے ۔ نئے عہد کی مشینی توانائی نے پرانے عہد کی Muscle Power اور چونچ اور پنجوں کی تیزی اور قوت کو فنا کر دیا ۔ جو ماضی کا نیم فراموش قصہ بن کر رہ گئی ۔ میں چند لمحے بہت آزردگی کے عالم میں رہا ۔ پھر یکایک وہ آزردگی دور ہو گئی ۔ مجھے یاد آگیا کہ اپنے ایک تنقیدی جائزے میں ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ شاعر کے وجدانی ارتعاش و اشتعال کے تین محرک ہوتے ہیں ۔ شاعر زندگی کے ارژنگ کے کسی زاویے سے فوری اثر قبول کرتا ہے ۔ اور وہ ادب میں ایک فن پارہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ۔ یا شاعر اپنے اندر کے کسی فوری عمیق تجربے سے Inspire ہوتا ہے اور اس کے اندر تخلیقی Process کارفرما ہوتا ہے ۔ یا ادیب اور شاعر یا دوسرا تخلیق کار اور مصور، موسیقار کسی کتاب کسی شہکار سے Inspire ہوتا ہے ۔ یہ بات شیکسپیئر کے ڈراموں میں چاسر کی Canterbury Tales میں نظر آتی ہے جس کی سب کی سب کہانیاں پرانی ہیں ۔ ان کا فن چاسر کے بیان میں ہے ۔ ہیملٹ کی پرانی عام سی کہانی کو شیکسپیئر نے عظیم بنا دیا ۔ ہمارے ہاں رومی نے مثنوی میں پرانی لوک کہانیوں کو جو بچوں کو سنائی جاتی تھیں اساسی اہمیت کے روحانی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کو سطح عظمت سے بیان کرنے کے لئے استعمال کیا ہے ۔ سارا شعر حماسہ پرانی کہانیوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ سو اگر مدنی نے جواب سے کئی عشرے پہلے لکھی ہوئی نظم کے عقاب اور ہوائی جہاز کے تصادم سے Inspire ہو کر دو اور سمبل اختراع کیے اور ان میں اپنے تاریخی سیاسی اور معاشرتی Environment کے مطابق بیان کیا تو اس کی وجدانی ندرت اور Originality میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ۔ اور کوئی نقاد یہ کہے کہ مدنی نے یہ علامتیں بدل کر پرانی نظم سے مدد لی ہے تو یہ اعتراض بے جواز ہوگا ۔ نظم کو ویسے ہی جانچنا ہوگا جیسے ہم شیکسپیئر کے ڈراموں اور سوفوکلیز کے کلاسیک یونانی المیوں کو جانچتے اور پرکھتے ہیں ۔

مدنی کی نظم کی حکایت یہ ہے کہ نام کے مغل بادشاہ کا ایک ہاتھی تھا جو شاہی تقریبات اور قومی تہواروں کے دن سج بن کر شہر کی گلیوں میں اپنی عظمت اور اپنی بے پناہ قوت کا اپنی مستانہ چال سے نظارہ لوگوں کو دکھاتا تھا ۔ پھر انگریز صاحب بہادر کی حکومت آگئی ۔ اور ریلوے لائن بچھا دی گئی ۔ بہت دنوں کی تنہائی اور لوگوں کی بے توجہی سے اکتا کر یہ شاہی فیل باہر نکل آیا اور اسی شان اور طمطراق سے گھومنے لگا ۔ اب کیا ہوا اس نے دھواں چھوڑتا ایک کالا عفریت دہاڑتا چھک چھک کرتا اپنی طرف آتا دیکھا ۔ بس اس کے پنکھوں جیسے کان کھڑے ہو گئے اس کی سونڈ غصے اور جوش مبارزت سے تن گئی ۔ یہ فیل سونڈ اٹھائے اس کالے عفریت کے سامنے آکھڑا ہوا ۔ ادھر سے وہ عفریت بڑھا ادھر سے اس نے حملہ کیا پہلی ہی ٹکر میں ادھ موا ہو گیا ۔ رہی سہی سکت مجتمع کر کے اٹھنے ہی کو تھا کہ اس عفریت نے اسے ایک پارہ پارہ لاشہ بنا دیا ۔ سارا قصہ نیا ہے ۔ پلاٹ دو تہذیبوں کا تصادم ہے ۔ ایک پرانی تہذیب ہے جو صدیوں کی شان و شوکت ۔ امارت ۔

سطوت و جلال، علم و تحقیق اور فنون میں عظیم تخلیقات کی سرمایہ دار ہے۔ مگر پھر رو بہ زوال ہوئی تو نہ قوت و شوکت رہی نہ علم و تحقیق کی لو۔ سب کچھ چھن گیا، صرف ظاہری کچھ نشان رہ گئے دوسری طرف علم اور تحقیق قدرت کو مسخر کرنے کے لئے شبانہ روز اعلیٰ دماغوں کی محنت، جب ان کے دو ایک سی شباہت رکھنے والے سمبل ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے تو زوال کے گھن سے کھو کھلی تہذیب اور اس کے آثار Visible Remnants نئی جہاں کشا اور جہانگیر صاحب علم تہذیب کے سمبل کا کیا مقابلہ کریں گے۔ ناپید ہو جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں اس نظم میں مدنی نے اپنی عمر بھر کی علم و خرد کے نور کی جو برکات گنوائی تھیں، ان کا جمال جس طرح پیش کیا تھا یہ نظم اس کا Finale ہے۔ اس کا نقطہ اتمام، اس کا ماحصل ہے۔ جہاں اس نے دو علامتوں کے تصادم میں اپنی روایت کی کامل تخریب کا تماشا دکھا دیا ہے اور پھر کیسے کہا ہے کہ اگر تم اب بھی نئے علم و تحقیق کے نور کی طرف نہیں آتے تو تم اپنی ہیئت اجتماعی میں اس شاہی فیل جیسے انہام سے نہیں بچ سکو گے۔ شاعر نعرہ باز نہیں ہوتا۔ اشارے کنائے میں بات کرتا ہے۔ یہ نظم Freeverse میں ہے۔ مدنی نظم آزاد میں بھی پوری قدرت اور مہارت کا ثبوت اپنے تینوں چھپے ہوئے مجموعوں اور شکسپئیر کے ڈراموں کے منظوم ترجموں میں دے چکا ہے۔ یہ نظم بیشتر معرا ہے۔ قوافی بہت کم آئے ہیں۔

اس نظم میں کہیں کہیں سپاٹ حصے بھی آئے ہیں جہاں شاعر مدنی اپنے اسلوب اور اپنے فن میں اپنی اعلیٰ سطح پر نہیں۔ میں سمجھتا ہوں شاید وہ Flat اور سپاٹ حصے مدنی نے دانستہ رکھے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی کسی زمانے میں تابناک قومی روایت کو لفظوں میں مناسب طور سے پیش کر سکے سپاٹ حصے اور فروتر مصرے دو متقابل قوتوں کے مقام کا فرق صوت اور تشکیل نظم میں اسی طرح دکھایا جا سکتا تھا کہ کچھ حصے دمک والے ہوں۔ بہت چوکس اور کچھ بے جان بے رنگ ہوں کہ مغل ہند کی مجموعی روایت ۱۸۵۷ء میں تھی ہی سپاٹ، مردہ، آزردہ اور بے نور۔ اس اندھے کی آنکھ جیسی جس کی آنکھیں کھلی تو ہوتی ہیں مگر ان میں نور نہیں ہوتا ہے۔ پہلا بند یہ ہے۔

میر باقر علی داستاں گو کی مجلس تھی
دلی کے شرفا،
خواتین ذی جاہ
کشاد سماعت کی خاطر کئی صاحب ذوق آئے ہوئے تھے
ادھر بزم شمعوں کی جھل مل سے اک بقعہ نور تھی
اور ایسا اجالا تھا اس جا کہ خود اکتساب سحر آئینہ لے کے حاضر ہوا ہو
مجمروں میں ادھر عود و عنبر کے پیچاں دھوئیں نے
جاگتی آنکھ کے خواب کو بال و پر دے رکھے تھے

دو رویہ قناتیں تھیں اور چلمنوں کی سبک اوٹ سے جھانکتے تھے پری وش
وہ چہرے کہ خود جن کے پرتو کی منت سے آنکھیں
آپ اپنے ہی ہونے کی تازہ دلیلیں ہیں
ہر نظر ایک پاس نظر چاہتی تھی
ہر نگہ ایک سلک گہر چاہتی تھی

یہ حصہ سراسر بیانیہ ہے۔ ایک امرا اور اشراف کا مجمع ہے۔ اس مجلس کی آرائش اور روشنیوں کا منظر ہے۔ خواتین کا اجتماع بھی پس پردہ ہے۔ مگر نیم نہاں۔ نیم عیاں، ان کا حال بھی ایک طرح سے جنت نظارہ ہے۔ میں نے پرانی مثنویوں میں اس سے بہتر بیان مجلسوں کے دیکھے ہیں۔ سو اس بیان سے یہ نظم بڑی نہیں بنتی کہ نظم بڑی اپنی فکر اور اپنے خیال کی سطح سے بنتی ہے اور بیانیہ بھی یہاں فوٹو گرافی سے زیادہ مماثل ہے۔ اس میں شاعر کا باطن نہیں اس کی اسلوبی ریاضت کارفرما ہے۔

ذکر اب میر باقر علی دلی کے آخری بادشاہ کا کر رہے ہیں۔ جس میں اس بادشاہ کے جاہ و حشم کا ذکر محض زیب داستاں ہے کہ وہ بچارا اچھا شاعر تو تھا۔ مگر باقی زندگی میں محض وظیفہ خوار شاہ شطرنج تھا۔ اب اس نظم کا یہ حصہ چھوڑ کر آگے چلتا ہوں۔

اس کا یہ اک فیل مست
شہر میں فیل خانے سے نکلا
اس کے دانتوں پہ سونے کے پتر منڈھے تھے
جن پر لعل بدخشاں کے گل باف خط کو
شجرہ ہائے نسب کے امیں
خود چلاتے تھے اپنے لہو سے
اس کے ماتھے کا جھومر رقیبانہ چشمک سی
اوج ثریا سے کرتا تھا
جلوس اس کا دمامہ و دف کی آواز
شہنائی سرنا کے رس میں چلاتا تھا
جھومتی چال تھی رقص و رم کا سماں تھا

ایسی منظر کشی ہے جو محض خارج کی ہے اور کوئی موج خیال کوئی کرب دروں توجہ طلب نہیں۔ یہ منظر کشی مدنی کی برتر سطح کی نہیں ہے۔

اگلا بند نسبتاً بہتر ہے شعری سطح پر کہ مصرعے ترشے ہوئے ہیں۔ کہیں کوئی کھردرا کونہ نہیں ملتا ہے۔

جھومتی چال میں اک نشہ تھا
اور اٹھے ہوئے اس کے قدموں سے
بل زمانے کا نکلا تھا
پھول والوں کے میلے میں
جب بادشاہ کی سواری نکلتی
تین صدیوں کی ساری روایت کا یہ جشن
اس فیل کی موج خوں میں
ایک طوفان اٹھاتا تھا
وہ فاتح کے مانند
جس کے مقابل کہیں سنگ و آہن کی دیوار گرتی ہوئی ریت کا ڈھیر ہو
اپنے خوابوں میں خود ہی مگن
تیز چلتا
زرفشاں خاک ان رہگزاروں کی وہ
منہ پہ ملتا
جانور بے خبر بھی نہ تھا
کچھ سمجھتا بھی تھا شہر کے انتظامات نو کو
باغ در باغ
لال کرتی میں گورے نوجوانوں کی سب بینڈ باجوں کی ساری دھنیں
اس کے کانوں میں آتی تھیں
زہر سا کچھ پلاتی تھیں

اس کے بعد گوروں کی فوج نے جنگ آزادی میں دلی میں جو غدر مچایا، جو غارتگری کی، اس کا نقشہ ہے۔ جو زبان و بیان میں اور پرو دیے گئے مصرعوں سے بہتر نہیں۔ کہیں کمتر ضرور ہو گیا ہے۔

پھر کہا کہ جب بادشاہ تخت سے اتار دیا گیا اور جلا وطن ہوا تو وہ ہاتھی زنجیر توڑ کر فیل خانے سے نکل جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے بعد کے مصرعے فنی اور حسیاتی سطح پر کچے ہیں۔ پر جانور تو تھا ہی، پرانی یادیں اس کے اندر کھولنے لگیں۔ ہاتھی ذہین جانور ہے۔ حافظہ بھی بہت اچھا رکھتا ہے۔ اب وہ ہاتھی کیا کرتا ہے!

مگر ایک دن شہر کی یاد نے جب ستایا
تو چنگھاڑتا ان بنوں سے نکل کر چلا

روند تا خار و خس کو
درختوں کو مسمار کرتا
(یہاں بیان اور کچا ہو گیا۔ درخت مسمار نہیں ہوتے)
بلندی و پستی کو ہموار کرتا
شہر کی سمت آیا۔

نکل کر چلا۔ اور شہر کی سمت آیا مدنی کی سطح اسلوب کے مقابلے میں یہ بتدیانہ کلام دکھائی دیتا ہے۔ ہاتھی خشمگیں ہے۔ تو پھر نکل کر چلا اور سمت آیا۔ بہت کمزور بیان Lifeless Expression ہیں۔

آگے بھی مصرعہ کمزور ہے۔ مسافر کا ایک موڑ آیا۔ مجھے یقین ہے مرزا باقر علی جیسا نادر دوراں داستاں گو ایسی دبی دبی بے دمک بے چمک زبان کبھی استعمال نہ کرتا۔ اور ایسا مصرعہ کہ شکنجے و شمشیر و سناں بنے تھے۔ یہاں حرف علت کا استعمال ناگوار گزرا۔ آگے ریل کی پٹریوں کا ذکر ہے جو بے رنگ اور بے اثر ہے۔ اب اس معرکہ کا ہنگام آرہا ہے۔ فیل شہر میں آیا ریلوے لائین کے پاس سے گزرا تو دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ مدمقابل بھی اک آہنی فیل چنگھاڑتا آرہا ہے
وہ کہ تھا بادو باراں کا پالا ہوا
جس کے اجداد کے استخوانوں میں تھیں جذب
جنگلوں کی سیاہی میں آتی ہوئی آندھیاں
اور سورج کی وہ آتش سبز جس سے زمینوں کے قلب و جگر جل گئے
ان زمینوں میں پالی ہوئی ساری نسلوں کا وہ بھی تو وارث تھا
صدائے تفنگ آشنا کان تھے
رزم آراؤں کی تربیت تھی
وہ تیروں کی بوچھار میں بارہا جا چکا تھا
نشانات فتح و ظفر لے کر
اب!
آہنی فیل کو دیکھ کر اس کے غصے کے حد جلال آگئی
اور گرزد تبر کی طرح
سونڈ اٹھائے ہوئے وہ
مقابل میں آیا
صف آرا قدیم و جدید ایک پٹری پہ تھے

اک طرف ایسی طاقت تھی
جو پاس شجاعت کو جاری رگ و پے میں جانے ہوئے تھی
دوسری سمت
چالاک و سفاک
ایجاد کی اک علامت تھی
اک سیہ فام انجن
کف در دہاں
عہد نو کے تحکم کا اٹھتا دھواں
پہلی ٹکر سے وہ فیل شاہی لڑکھڑاتا ہوا نیم رخ سا ہوا
ٹوٹ کر گرنے والی چٹانوں کے مانند
لڑھکتا ہوا۔ کروٹیں سی بدلتا
دوسری کی سکت لے کر کے اٹھا ہی تھا
اک آن میں فیل شاہی
بیاباں کے داماں میں بے خام میت ہوا
اس کے مبہوت سارے تماشائی مداح
اپنی بے چارگی میں فراست کی ہر تازہ کاری سے
منہ موڑ کر خود کھڑے تھے
اب مرزا باقر علی داستان گو اپنی طرف آتے ہیں۔
صاحبو۔ بی بیو!
یہ افتاد کیا بس فنا و بقا کی یہ چوسر ہے
زمانہ ورق جب الٹتا ہے
بساط روایت پلٹتی ہے
ساز و ساماں نئے
حدیثیں نئی اور عنواں نئے
روکیے اشک خونین کو چاک جگر کو
صاحبان زمانہ نئے اور درباں نئے
آہی جاتے ہیں
صاحبو، بی بیو،
ہمارا اتبہار اخدا بادشاہ

داور لم یزل
وہ قہار و غفار و ستار ہے
وہ رزاق و جبار ہے
مری داستاں ختم ہونے کو آئی
چراغ اب بڑھاؤ
نئے داستاں گو
تازہ تر واردات زمانہ کہیں گے
میں نے تاریخ کے تار و پو کو
اپنی موج نفس میں پرو کر
داستاں جو بنی تھی وہ اب ختم ہے
وہ شب داستاں گو
جو اک جوئے حرف و سخن کی طرح
صبح تک آئی تھی تا بہ لب ختم ہے
گوش فردا کی خاطر
مری داستانوں کی شب ختم ہے

آخر کا حصہ پہلے حصے سے بہت زیادہ Wellknit مربوط اور بیانیہ سطح پر اثر انگریز ہے ۔ اس میں دو کرب ناک انجام ہیں ۔ ایک تو بر صغیر کی ملت اسلامیہ کے دور عظمت کی آخری نشانی وہ معزول بادشاہ کا فیل مشینی فیل سے بار ا ہی نہیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔ سو وہ ساری روایت وہ ساری تہذیب جو اندر سے بے تاب و تواں تھی کھو کھلی تھی ختم ہو گئی ۔ ایک فعال علم والی ملوکیت نے اب اس ملت کو اپنا طوق غلامی پہنا دیا ۔ اب اگر یہ ملت محکوم نئی توانائی نئے علوم سے حاصل شدہ فکر و عمل کی صلاحیت لے کر اٹھے تو اساس فتح لے کر اٹھے گی نہیں تو محکوم و زبوں حال رہے گی ۔ ۔بہر حال فی الوقت وہ دور ختم ہوا دوسرا انجام اس کا یہ ہے کہ ثقافتی روایت داستاں گوئی کی ، وہ بھی ختم ہوئی کہ میر باقر علی جو داستانیں جانتے تھے وہ تغیر حالات سے اب اپنا تاثر کھو چکی ہیں ۔ سو ایک اعلیٰ ثقافتی روایت بھی ختم ہوئی اور اس نے کہا ہمارے فن پر یہ آخری بار Curtain گرے گا ۔

نظم مدنی کی شاعری کا فکری سطح پر Finale ہے ۔ اس کی فکر کا خلاصہ اس میں آگیا ہے ۔ فنی سطح پر یہ نظم Grand Finale نہیں بن سکی ۔ اپنے Conception میں مدنی اپنی فنی سطح پر ہے لیکن اسے اسلوبی لباس پہنانے میں سطح عظمت پر نہیں ۔ ۔بہر حال یہ نظم زندہ رہے گی کہ مدنی کی فکر کا نچوڑ ہے ۔

میں نے اپنے قاری کو ساتھ لے کر مدنی کے فکر و فن کے جہاں کا ایک زائر کی طرح سفر کیا ہے ۔ ہر دیدنی مقام پر میں قاری کو لے کر ٹھہر گیا ۔ اور ایک Tourist guide کی طرح میں نے اس مقام کے سارے پہلو بیان کئے ۔ اور مقام بہ مقام، نظم بہ نظم، غزل بہ غزل میں اسے ساتھ لایا ۔ مدنی کے اسلوب اس کی لفظیات اس کی حسن جمال، اس کی ظاہری ہیئتی بے ترتیبی میں مضمر نازک رشتہ و ربط نمایاں کیا ۔ میں ادب کا ایک ادنی طالب علم ہوں ۔ میرا خیال تھا کہ میں نئے قاری کی کچھ مدد کر سکتا ہوں ۔ سو اپنی توفیق کی حد تک کوشش کی ہے ۔

اب آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں نے جس نظر سے مدنی کے کلام کو دیکھا وہ ایک نیاز کیش دوست اور مداح ہی کی نظر نہیں تھی ۔ نصف صدی سے کچھ کم کے تعلق خاطر کی پاسداری ہی مطلوب نہیں تھی ۔ جائزہ لکھنے والا دیانت دار طالب علم بھی ہے ۔ سو میں نے مدنی کے سارے کلام کو جو دستیاب ہے ناقدانہ نظر سے دیکھا جو کمزوریاں نظر آئیں وہ بھی ظاہر کر دیں ۔ جہاں اس کے آفاق خیال پر تارے چاند سورج جھلمل کرتے جہاں تاب ضیا پاشی کرتے دیکھے ان کو دکھانے کے لئے بھی قاری کو اپنا شریک تماشا بنالیا ۔ اس زائرانہ سفر کے اختتام پر صرف اتنا عرض کروں گا کہ مدنی اپنی غزل میں حالی کے بعد سب سے برتر شاعر ہے ۔ کوئی اس کے جمال صوت اس کی ندرت فکر اور وسعت خیال کے قریب تک نہیں ۔ نظم میں مدنی اپنی غزل کی سطح سے کم تر تھا ۔ مگر اس نے ایک بہت مشکل کام اپنے ذمہ لیا تھا ۔ نظم میں نئی اصطلاحات، نئی علامتوں، نئے کرداروں کو جو جدید علم میں روز سامنے آتے ہیں شعر میں یوں استعمال کرنا کہ وہ Poetic Sensibility کا اہم جزو بن جائیں، اس کام میں وہ سو فیصد کامیاب رہا ۔ وہ علامتیں علامتوں کے طور پر آئیں ۔ فہرست اشیا کے طور پر نہیں ۔ ادبی تاریخ میں مدنی کی اس اسلوبی ندرت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔

ادب کا اور ادیب کا مقام وقت معین کرتا ہے ۔ مدنی کا اردو شاعری کی تاریخ میں اصل مقام اکیسویں صدی کے ربع دوم میں معین ہوگا ۔ جب آج کے ادبی دھڑے اور یہ اخباروں کے ادبی کالموں کے تیر و نشتر ٹوٹ چکے ہوں گے اور گانے والے اور گانے والیوں کے فن کی موج پر اوپر آئے ہوئے شاعر موسیقی کا منظر بدلنے پر اپنی اصل سطح پر آجائیں گے ۔ اس وقت میں بھی نہیں ہوں گا ۔ کہ میں تو اب چراغ سحر ہوں ۔ مگر یہ مضمون شاید کسی کتاب کسی مجلے میں پڑا کسی لائبریری میں موجود رہے ۔ اگر فیصلہ وقت نے وہی دیا جو میں نے کہا ہے تو میری بات رہ جائے گی ۔ ورنہ باقی رہے نام اللہ کا ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

رقص کرنے والا بگولہ

صاحب صدر ۔ خواتین و حضرات

یہ آج کی بات نہیں نصف صدی سے بھی پہلے کا قصہ ہے ۔ شاعر شیوا بیان ناصر کاظمی مرحوم کے بقول اس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے ہوسٹل کے دو کمروں کی بڑی دھوم تھی ۔ دونوں کمرے سجاوٹ کے لحاظ سے دیکھنے دکھانے کے لائق تھے ۔ ایک خود ان کا کمرہ تھا ۔ دوسرا کمرہ اس بوڑھے آدمی کا تھا جو اس وقت ہمارے آپ کے درمیان چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا سب کو حیران حیران نظروں سے دیکھ رہا ہے ۔ چہرے کے تاثر سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہے ۔ غالباً یہ سوچ رہا ہے کہ میں کہاں آگیا ۔ اس مجمع عام میں کیسے پھنس گیا ۔ اس آدمی کو دنیا حمید نسیم کے نام سے جانتی ہے ۔

نصف صدی پہلے یہ صورت حال نہیں تھی ۔ بقول مرزا غالب "جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا" ۔ واقعی نسیم صاحب کا رنگ بھی چمپئی تھا ۔ گول ۔ شاداب ۔ ہنسنے مسکرانے والا چہرہ ۔ شریر آنکھیں ۔ گھنے بال ۔ متوسط قد ۔ نکھ سکھ سے درست ۔ ادھر کسی نے کہا "نسیم صاحب فلاں تقریب ہے ۔ آپ کو شرکت کرنا ہے" اور بس نسیم صاحب شریک ہیں ۔ اس شان سے کہ بانکے کی ٹوپی صوفیانہ رنگ کی چست شیروانی زیب تن ، بٹن اوپر تک بند ۔ چوڑی مہری کا پاجامہ دیکھنے سے یہ احساس کہ رنگ اور خوشبو کے جھونکے چلے آرہے ہیں ۔ محفل میں بیٹھے ہیں اور بلبل ہزار داستاں کی طرح چہک رہے ہیں ۔ ایسے ہوتے تھے نسیم صاحب ۔ جہاں بیٹھ گئے ساری تقریب کا رخ اسی طرف ہو گیا ۔

۱۹۴۸ ۔ میں جب میں ریڈیو سے وابستہ ہوا تو نسیم صاحب اس عہد کی درجہ بندی کے مطابق پروگرام ایگزیکٹو تھے ۔ ریڈیو اسٹیشن ان دنوں انٹے لی جنس اسکول میں سمندر کے کنارے تھا ۔ ایک لمبی سی بیرک تھی جس میں اسٹوڈیوز تھے ۔ عملے کے لیے خیمے لگے ہوئے ۔ سب لوگ انہیں میں بیٹھتے تھے اور شرفائے شہر میں ڈیرے دار کہلاتے تھے ۔ ایک خیمہ نسیم صاحب کا بھی تھا صبح سے شام تک بیٹھے کام کرتے رہتے ۔ کہنے والے کہتے یہ آدمی نہیں جن ہیں ۔ جس طرف جھک پڑے بس جھک پڑے ۔ دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر اسی کام کے ہو گئے ، مگر مجھے ذاتی طور پر اس کا کوئی تجربہ نہیں ہوا کیوں کہ میرا اصول یہ ہے کہ بڑوں سے دور رہنا چاہئے ۔ جہاں تک ممکن ہو سکے سامنے نہ پڑو ۔ اسی وجہ سے میں نسیم صاحب سے بھی دور دور ہی رہا ۔

کرنا خدا کا یہ کہ ایک دن ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کے مطب میں حسب معمول یاران طریقت جمع تھے۔ (ڈاکٹر یاور عباس کا مطب کیا تھا شاعروں کی بیٹھک تھا۔ راقم الحروف ان کا ایک خاکہ بھی لکھ چکا ہے)۔ یاور صاحب کے برادر خورد دلاور عباس نے ان دنوں سی۔ای۔ایم۔جوڈ کی ایک مقبول کتاب "تعارف فلسفہ" پڑھی تھی۔ اس وجہ سے انہیں فلسفے کے بارے میں آزادانہ گفتگو کا استحقاق حاصل ہو گیا تھا اور وہ اپنے اس استحقاق کو ہم لوگوں پر بڑی فراخ دلی سے آزماتے رہتے تھے۔ اتفاق یہ کہ ریڈیو کے سربراہ سید ذوالفقار علی بخاری بھی آپہنچے۔ نسیم صاحب بھی ساتھ تھے۔ دلاور عباس نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً بخاری صاحب کے سامنے ایک فلسفیانہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ بخاری صاحب ایسے موضوعات سے بالعموم گریز کرتے تھے۔ اس لیے وہ تو اٹھ کر یاور صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ نسیم صاحب رہ گئے۔ دلاور نے انہیں کو فلسفے کے رموز و نکات سے آگاہ کرانا شروع کر دیا۔ نسیم صاحب کچھ دیر چپ چاپ سنتے رہے پھر جو تقریر شروع کی تو دلاور صاحب کے چھکے چھوٹ گئے۔ بڑا وقت گزر گیا مگر نسیم صاحب کی گفتگو ناتمام رہی۔ چنانچہ اگلے دن ہم سب پھر جمع ہوئے۔ پھر گفتگو ہوئی اور اس سے اگلے دن بھی۔ نسیم صاحب کی گفتگو کا یہ عالم تھا جیسے دریا بہہ رہا ہو۔ ہم سب نے بھرپور استفادہ کیا۔ کسی حد تک مرعوب بھی ہوئے۔ سب سے زیادہ مرعوب دلاور ہوئے۔ بعد میں مجھ سے کہنے لگے یہ جوان تو قیامت ہے قیامت۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارا فلسفہ گھول کر پی گیا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ بہت سی الجھنیں دور ہو گئیں۔

اس واقعے کے بعد اپنی فطری جھجک کے باوجود میں گاہے گاہے نسیم صاحب کے خیمے میں جاتا رہا۔ تھوڑی دیر بیٹھتا۔ جان بوجھ کر کوئی علمی ادبی موضوع چھیڑتا اور ان کی گفتگو سنتا۔ یہ تو ذہانت اور علم کی بات تھی۔ جلد ہی مجھے نسیم صاحب کے حافظے کی قوت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ ایک دن شعبہ موسیقی میں ہم سب بیٹھے کام کر رہے تھے۔ وجد چغتائی نے موسیقی کا پندرہ روزہ چارٹ تیار کر لیا تھا۔ تفصیل بھری جا رہی تھی۔ چغتائی لکھتے لکھتے بولے۔ اساتذہ کی تین غزلوں کے مطلع بتاؤ۔ میں نے میر اور سودا کے مطلعے پڑھ کر کہا۔ تیسرا مطلع یقین کا "نہیں معلوم ایک سال میخانے پہ کیا گزرا۔" مرحوم ارم لکھنوی بھی اس وقت موجود تھے۔ بگڑ کر بولے۔ "یہ آپ کیا غپ شپ کرتے رہتے ہیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے۔ اشعار میں تحریف نہ کیا کیجئے۔ یہ مطلع غلط لکھ لیں گے اور اگر کوئی غپ شپ ہوئی تو ساری آئی گئی ہمارے سر ہو گی۔" ارم صاحب ایک خاص مزاج کے شاعر تھے میں ان کا یوں بھی لحاظ کرتا تھا کہ وہ لکھنؤ میں میرے نانا کے ہم محلہ اور ملنے والے تھے۔ چنانچہ بڑے ادب سے عرض کیا کہ ارم صاحب بات کیا ہے۔ مطلعے میں کیا غلطی ہو گئی۔ بولے قبیح غلطی ہے۔ گزری کو گزرا بنا کر سارا لطف غارت کر دیا۔ میرے اصرار اور چغتائی کی یقین دہانی کے باوجود وہ یہ بات ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوئے کہ یقین جیسا شاعر گزری کے بجائے گزرا بھی

کہہ سکتا ہے ۔ دیوان اس وقت موجود نہیں تھا ۔ ارم صاحب رفیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ بزرگ بھی تھے اس لیے وہ گفتگو میں اپنی بزرگی کا بھرپور فائدہ بھی اٹھا رہے تھے ۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ نسیم صاحب کو حکم بنا کر ان سے رائے لی جائے ۔ چنانچہ ارم صاحب، چغتائی اور راقم الحروف تینوں ان کے خیمے میں گئے ۔ نسیم صاحب نے بٹھایا پھر پوچھا ۔ یہ شعبہ موسیقی کا مثلث ادھر کیسے ۔ ارم صاحب نے کہا" وہ جو یقین کی غزل ہے نہیں معلوم ۔۔۔" ارم صاحب نے آدھا مصرعہ پڑھا تھا کہ نسیم صاحب نے پورا مصرعہ پڑھ دیا" نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گزرا" ۔ اور پھر پوری غزل پڑھ کر اس کے محاسن پر جھوم جھوم کر گفتگو شروع کر دی ۔ کیا خوبصورتی اور دل نوازی تھی گفتگو میں ۔ ارم صاحب نے اس وقت تو نسیم صاحب کی بات نہیں کاٹی ۔ بت بنے سنتے رہے مگر باہر نکل کر کہنے لگے ۔ سب غپ شپ ۔ سب غپ شپ ۔ نسیم صاحب کو غزل صحیح یاد نہیں ہے ۔ اگلے دن میں نے دیوان یقین لا کر ارم صاحب کو دکھا دیا مگر وہ مانے نہیں ۔ یہی کہتے رہے ۔ غلط بھی چھپ سکتا ہے ۔ وہ اپنی کہتے رہے مگر مجھے نسیم صاحب کی یادداشت پر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک مصرعے کے حوالے سے پوری غزل پڑھ دی ۔

اسی زمانے میں نجانے کیوں مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ نسیم صاحب دراصل ایک مضطرب روح ہیں ۔ انتہائی مضطرب ، بے قرار ، معلوم حقایق میں کسی انجانی حقیقت کے متلاشی ۔ ان کی جامہ زیبی ، مستعدی اور کاموں میں غیر معمولی انہماک کو دیکھتا اور یہ سوچتا کہ نسیم صاحب نے مصروفیت اور خوش بیانی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ذاتی اضطراب اور بے چینی کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپا لیا ہے ۔ ہر وقت دوستوں اور مداحوں کے حلقے میں گھرے رہتے ہیں مگر اندر سے بالکل تنہا اور ٹوٹے ہوئے ہیں ۔ دیکھنے والے ان کے ظاہر پر ریجھ جاتے ہیں ۔ باطن کے جائزے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور یہ خود دوسروں کی اس روش سے لطف لیتے رہتے ہیں ۔

ریڈیو میں نسیم صاحب واجد علی شاہ کی طرح رہے ۔ موسیقی میں یکتا ۔ کیسے کیسے فنکار ڈھونڈ نکالے ۔ شاعری میں یکتا ۔ چودہ اگست کے موقعے پر ایسا غنائیہ لکھ دیا جو نہ ان سے پہلے لکھا گیا نہ ان کے بعد کسی کو ایسا غنائیہ لکھنے میں کامیابی ہوئی ۔ ہم لوگوں نے اسے حیرت اور مسرت کے ساتھ سنا تھا ۔ میں نے اپنے طور پر اس سے متاثر ہو کر اس طرح کے کئی غنائیے لکھے مگر بات نہیں بنی ۔ یہ محسوس ہوا کہ غنائیہ نہیں لکھا بلکہ منہ چڑایا ہے ۔ انتظامی امور میں شفقت اور نرمی کاموں کو بگاڑ دیتی ہے مگر نسیم صاحب کی شفقت اور نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے کسی کو نہیں دیکھا ۔ وہ اپنے ماتحتوں کے لئے شجر سایہ دار اور بازوئے محافظ تھے ۔ اس حوالے سے مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے ۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملک میں سرکاری رویت ہلال کمیٹیاں نہیں بنی تھیں ۔ صبح کی نشریات کے آغاز میں چاند کی تاریخ اخبار کے حوالے یا محض معلومات سماعی کی بنیاد پر نشر ہوتی

تھی ۔ ایک دن تاریخ غلط نشر ہو گئی ۔ کچھ ایسا ہوا کہ ستائیس کے بجائے اٹھائیس یا اٹھائیس کے بجائے ستائیس کا اعلان ہو گیا۔ کسی سننے والے نے شکایت کا ایک کھرا ہیڈ کوارٹرس کو لکھ مارا کہ اسلامی مملکت میں بھی اسلامی تاریخ کا صحیح اعلان نہیں ہوتا ۔ غفلت اور لاپرواہی کی حد ہے ۔ ہیڈ کوارٹرس نے کھمبایوں نوچا کہ کراچی اسٹیشن کو ایک طول طویل مراسلہ لکھا کہ اس ڈیوٹی افسر کا Explanation بھیجا جائے جس نے ایسی قبیح غلطی کی اور اسے تنبیہ کی جائے کہ آیندہ اس قسم کی غلطی نہ کرے ۔ دفتر نے اس خط کی ایک نقل ڈیوٹی افسر کے حوالے کی اور Explanation مانگ لیا ۔ وہ بیچارہ حق حیران کہ یہ بیٹھے بٹھائے کی مصیبت آن پڑی ۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو ۔ مفت میں جواب دہی کرتے پھرو ۔ خاصی پریشانی ہوئی ۔ کسی نے سمجھایا ۔ میاں نسیم صاحب سے تو مشورہ کرو ۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں ۔ نسیم صاحب غالباً ان دنوں اسٹیشن ڈائرکٹر تھے ۔ ڈیوٹی افسر ڈرتا، جھجکتا ان کے پاس پہنچا ۔ دل میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ بھی ڈانٹیں گے تم لتنے لاپرواہ ہو ۔ سوچتے نہیں ۔ ٹھیک سے کام نہیں کرتے ۔ نسیم صاحب نے حسب معمول شفقت سے سلام کا جواب دیا ۔ چائے منگوائی پھر کہا ۔ ہاں بھئی خیر تو ہے ۔ اگلے نے کہا خیر بخیر ۔ صاحب یہاں جان پر بنی ہے ۔ نسیم صاحب نے پوچھا کیوں؟ پورا واقعہ سنا ۔ ہنسے ۔ پھر بولے اچھا اب تم جاؤ کچھ نہیں ہوگا ۔ Explanation مت لکھو ۔

اگلے دن نسیم صاحب نے ہیڈ کوارٹرس کو ایک خط لکھوایا کہ ہمارے یہاں چاند کی تاریخوں کے سلسلے میں استناد کا کوئی انتظام نہیں ہے اس وجہ سے غلط تاریخیں نشر ہونے کا اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے ۔ ہمیں سال بھر کا کیلنڈر بنا کر بھیج دیا جائے تا کہ ہم صحیح تاریخیں نشر کرتے رہیں ۔ اگر یہ انتظام جلد نہ ہوا تو کسی قسم کی غلطی کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی ۔ لیجئے صاحب نہ Explanation نہ تنبیہ ۔ مگر نسیم صاحب کا سادماغ تو ہو ۔ وہ اپنے سارے عملے کو اپنا کنبہ کہتے اور سمجھتے تھے ۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی کو ڈانٹا ڈپٹا ہو یا سختی برتی ہو ۔ ہر ایک سے ملتے تھے ۔ عادت کے مطابق خندہ پیشانی سے ملتے تھے ۔ سب کا دکھ سکھ سنتے تھے ۔ تابمقدور مدد بھی کرتے تھے مگر اس سب کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نسیم صاحب کے سخت خلاف تھے ۔

ایک دفعہ ریڈیو کے ایک بہت بڑے افسر نے جو بخاری صاحب کے باہر جانے کی وجہ سے قائم مقام ہو گئے تھے موقعے سے فائدہ اٹھا کر نسیم صاحب کا بہت دور تبادلہ کر دیا ۔ مجھے یاد ہے کہ ہم سب بڑے حیران ہوئے تھے ۔ یہ سوچتے تھے کہ قائم مقام کو اس قسم کی تبدیلی نہیں کرنا چاہیئے ۔ ہوا بھی یہی ۔ تبادلے کے حکم پر عمل نہیں ہوا اور ان بڑے افسر کو یہ حکم واپس لینا پڑا ۔ ناراض رہنے والے دوسرے صاحب کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے ۔ میں انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا کیوں کہ وہ رفیق کار رہ چکے تھے ۔ ان کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ آپ ان سے ملے تعارف ہوا ۔ باتیں ہوئیں ۔ اب جو گھر پہنچے تو ایک کاغذ پر آپ کا نام، پتہ، پیشہ، حلیہ لکھا ۔ گفتگو کا خلاصہ لکھا

اور یہ کاغذ ایک فایل کور میں لگا دیا۔ آپ کی فایل کھل گئی۔ جب بھی آپ سے ملاقات ہوئی یا آپ کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو انہیں فوراً فایل میں درج کر دیا۔ بے شمار فایلیں تھیں اس شخص کے پاس۔ ہر ملنے جلنے والے کی فایل کھلی ہوئی ہے۔ اتفاق سے نسیم صاحب اور یہ صاحب پشاور میں ساتھ تھے۔ نسیم صاحب نے کسی دفتری معاملے میں ان سے اختلاف کیا۔ انہیں اختلاف کی تاب کہاں۔ نسیم صاحب شام کو گھر جا رہے تھے۔ انہوں نے غنڈوں سے حملہ کرا دیا۔ نسیم صاحب زخمی ہو گئے۔ کچھ دانت بھی ٹوٹ گئے مگر انہوں نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ حد یہ ہے کہ کبھی اس شخص کا برائی سے نام بھی نہیں لیا۔ اس شخص کا انجام یہ ہوا کہ ادھیڑ عمر میں شادی کی۔ شادی کے فوراً بعد موٹر میں کہیں جا رہے تھے حادثہ پیش آیا۔ وہیں ختم ہو گئے۔ مجھ سے ریڈیو میں کسی صاحب نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ نسیم صاحب کی بے زبانی اور مظلومیت کا اثر ہے" مگر مجھے یقین ہے کہ نسیم صاحب نے کبھی اس شخص کا برا نہیں چاہا۔ ویسے بھی سزا، جزا کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ فیصلہ وہی کرتا ہے۔ ہم لوگ اپنی فہم ناقص کے مطابق سزا، جزا کی تاویل کرتے رہتے ہیں۔

بعض باتیں نسیم صاحب میں بڑی تعجب خیز تھیں۔ مثلاً یہ کہ جب وہ اسٹیشن ڈائرکٹر تھے تو مجبوراً گھڑی دو گھڑی کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ بیٹھتے کیا تھے صرف ٹک جاتے تھے باقی سارے وقت پروڈیوسروں والی لمبی بیرک میں ٹہلتے ہوئے ملتے۔ یا تو دفتر کے بڑے کمرے میں جو عملے سے بھرا رہتا تھا بیٹھے رہتے یا ادھر سے ادھر ٹہلتے رہتے۔ میری دانست میں یہ اس بے قرار روح کا اظہار تھا جس کا تذکرہ میں نے شروع میں کیا ہے۔ ماتحتوں کے کمرے میں نسیم صاحب اس بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے ملتے جیسے وہ انہیں کا ایک حصہ ہیں۔ بعد میں مجھے یہ احساس ہوا کہ اس جم کر نہ بیٹھنے میں بھی قدرت کی کرشمہ سازی شامل تھی۔ نسیم صاحب سربراہ کے کمرے میں شاہانہ کروفر کے ساتھ بیٹھنے کے عادی ہی نہیں ہوئے۔ ان کی جگہ سربراہ کے کمرے میں نہیں عملے کے دل میں تھی۔ آج بھی ہے۔ آج بھی وہ درویشانہ انکسار کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن کے ایک چھوٹے کمرے میں بیٹھتے ہیں یا ریڈیو کی عمارت میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے باتیں کرتے نظر آتے ہیں مگر جہاں بھی ہوتے ہیں لوگوں کے سر ان کے احترام میں جھکے ہوتے ہیں۔

ایک دور وہ تھا کہ سارے برصغیر میں نسیم صاحب کی دھوم تھی۔ جس انعامی مباحثے میں شریک ہوئے انعام ضرور حاصل کیا۔ جس سے بات کی اسے لاجواب کر دیا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ ساری طاقت لسانی اور جادو بیانی کے باوجود اب وہ مجمعے کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ میں نے پچاسوں مرتبہ منت کی کہ میرے طلبہ کو مسجد قرطبہ کے حوالے سے ایک لیکچر دے دیجئے مگر وہ صرف ٹال گئے۔ بظاہر انکار بھی نہیں کیا اور حامی بھی نہیں بھری۔ بس ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے رخصت کر دیتے۔ نجانے کیوں مجمعے کے سامنے جانے سے گھبرانے لگے ہیں۔ میرے خیال میں

یہ بھی بے قرار روح کی بے قراری کا اظہار ہے۔

ایک اور بات یہ تھی کہ کراچی ریڈیو اسٹیشن کی سربراہی کے دور میں نسیم صاحب اسٹیشن سے نشر ہونے والے ہر لفظ کو بغور پڑھتے تھے۔ اعلانات سے لے کر تقریروں تک کے مسودے تمام و کمال خود پڑھتے اور نشر ہونے والے ہر لفظ سے باخبر رہتے۔ بظاہر ہر چیز سے بے تعلق لیکن ہر چیز سے مکمل طور پر آگاہ۔ ذمہ داری کی یہ ادا بھی بڑی تعجب خیز تھی۔

پھر نسیم صاحب پی آئی اے کی آرٹس اکیڈمی میں چلے گئے۔ ریڈیو کی ساری کشتیاں جلا کر۔ مدت العمر کی شاہانہ اور کروفر کی ملازمت پر لات مار کر چلے گئے۔ سنا ہے آرٹس اکیڈمی میں انہوں نے بڑی محنت کی۔ غیر ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ وہ اکیڈمی میں راجہ اندر بن گئے تھے مگر میں نے خود یہ انداز نہیں دیکھا۔ سنا ہی سنا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نسیم صاحب جہاں بھی ہوتے ہیں اچھے لوگ ہی ان کے اردگرد نظر آتے ہیں۔ ان کی سربراہی میں اکیڈمی نے بڑا کام کیا اور بڑا نام بھی پایا۔ فنکاروں کے طائفے دنیا کے مختلف ملکوں میں گئے۔ ان کے پروگرام بہت پسند کیے گئے مگر یہ پروگرام زیادہ دن جاری نہ رہ سکے۔

مرزا غالب نے اپنے باپ مرزا عبداللہ بیگ کی ملازمتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرزا عبداللہ حیدرآباد جاکر نظام کے نوکر ہوئے۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ پی آئی اے آرٹس اکیڈمی میں نسیم صاحب کی ملازمت بھی ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ خانہ جنگیاں بھی متعدد اقسام کی ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ کشت و خون ہی کی نوبت آئے۔ اسلحہ استعمال کیے بغیر بھی خانہ جنگی ممکن ہے اور آسانی سے کام تمام کیا جا سکتا ہے۔ غالباً یہ نسیم صاحب کی سب سے بڑی دنیاوی آزمائش تھی۔ مجھے اس حوالے سے نسیم صاحب کے رد عمل اور رویے پر خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی سے منسوب ایک غزل کے دو شعر یاد آتے ہیں۔

ہر آنچہ آیدت از غیب نیک و بد منگر   ہمیں بس است کہ از سوئے دوست می آید

ازیں مصائب دوراں ملال و شاداں باش   کہ تیر دوست بہ پہلوئے دوست می آید

(غیب سے جو کچھ بھی ظہور میں آئے یہ مت دیکھو کہ وہ اچھا ہے یا برا۔ یہ بہت کافی ہے کہ جو کچھ بھی آیا ہے دوست کی طرف سے آیا ہے)

(زمانے کی ان تکلیفوں پر رنج نہ کرو۔ خوش رہو کیوں کہ دوست ہی کا تیر دوست کے پہلو کی جانب آتا ہے)

نسیم صاحب کا رد عمل یہی تھا۔ ریڈیو میں کشتیاں جلا چکے تھے مگر سمندر پایاب تھا۔ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ سر آنکھوں پر واپس آئے۔ دینی پروگراموں کی نگرانی کرنے لگے۔ ان کے انداز قد کے اعتبار سے معاہدے کی یہ عارضی ملازمت بہت معمولی تھی مگر انہوں نے خندہ پیشانی سے اسے قبول کر لیا

میں نے اس موقعے پر یہ محسوس کیا کہ نسیم صاحب واپس آئے تو عملے میں ان کا احترام کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ دنیا کا دستور ہے کہ واپس آنے والوں کو ہنسی خوشی گوارہ نہیں کیا جاتا۔ مگر نسیم صاحب کے حوالے سے یہ دستور درست ثابت نہیں ہوا۔ وہ پہلے بھی محترم تھے۔ واپس آکر اور محترم ہو گئے۔ غالب نے شاید یہ شعر انہیں کے لئے کہا تھا۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار بروصد ہزار بار بیا

مگر یہ بات بھی صحیح ہے کہ یہ بڑی سخت آزمائش تھی۔ سارے خواب بکھر گئے۔ شوق کی فراوانیوں کا یکسر خاتمہ ہو گیا۔ بڑی سرشار زندگی تھی۔ کہاں وہ شوراشوری اور کہاں یہ بے نمکی۔ ریڈیو کے عملے نے احترام ضرور کیا لیکن نسیم صاحب کی مضطرب روح کو کچوکے دینے والے بھی کچھ کم نہیں تھے۔ بہت سے ایسے لوگ جو ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے یک لخت آنکھیں پھیر گئے۔ معلوم نہیں اور کیا کیا ذہنی، روحانی اور مادی تکلیفیں اٹھانا پڑی ہوں گی مگر نسیم صاحب نے سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا۔ کم از کم میں نے ان کی زبان سے کوئی شکایت نہیں سنی۔ وہ اس انتہائی اذیت رساں تجربے کی آنچ سے بھی کندن ہی بن کر نکلے۔

کوئی اور ہوتا تو یہاں پہنچ کر روداد حیات پر تمت کی مہر لگ جاتی مگر یہاں مقابلے کا جذبہ کارفرما تھا۔ بے قرار روح کا ایک بالکل نیا سفر شروع ہوا۔ عرفان ذات کا سفر۔ اپنے آپ کو دریافت کرنے کا سفر۔ نسیم صاحب نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو دریافت کرنا شروع کیا۔ صحیح منصب اور مقام تک پہنچنے کا سفر۔ اب تک انہوں نے انتہائی لاابالی انداز میں خود کو موسیقی اور اس کے جملہ گفتنی اور ناگفتنی لوازمات میں محو کر رکھا تھا۔ اگرچہ موسیقی کی بھی ایک دنیا ہے۔ اس کا اپنا سحر اور روح میں اہتزاز پیدا کرنے کی اپنی تاثیر ہے تاہم نسیم صاحب کی زندگی میں اس کے تقاضے کچھ اور تھے۔ "لاجواب" لوگوں کی محفل سے اٹھ کر دینی پروگراموں کی نگرانی کرتے کرتے انہوں نے اپنے آپ کو حاصل کر لیا۔ پہلے خود کو بڑی بے دردی سے ضائع کیا تھا۔ اب اتنی ہی مستعدی سے جگر لخت لخت کو جمع کیا اور علم و عرفان کی دنیا میں تمام تر عجز و انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو نمایاں کر دیا۔ نسیم صاحب اگر ریڈیو سے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر وابستہ رہتے تو وہ کم از کم ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوتے۔ اسلام آباد یا کراچی کے کسی عمدہ علاقے میں قیام پذیر ہوتے۔ دوستوں کے حلقے میں مقبول ہوتے۔ آرام دہ زندگی ہوتی۔ ممکن ہے کہ سبک دوش ہونے کے بعد کسی اور منصب پر فائز ہو جاتے۔ یہ سب کچھ ممکن تھا مگر وہ حمید نسیم جو ان دنوں بیت المکرم کی پشت پر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں مقیم ہیں اور روزانہ صبح ریڈیو اسٹیشن جا کر مسودوں کی دیکھ بھال کا کام انجام دینے کے بعد ہمہ تن علم و ادب کی خدمت یا اپنی ذات کے عرفان اور اظہار میں سرگرم ہیں کہیں نظر نہ آتے۔ بے قرار روح کو شاید قرار کبھی نہ آتا۔

پی آئی اے سے گلو خلاصی کے بعد نسیم صاحب نے بڑی مشکل اور صبر آزما زندگی گزاری

لیکن حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا اور مسلسل غور و فکر میں محو رہے۔ دینی پروگراموں کی نگرانی کرتے کرتے دین میں ایسے ڈوبے کہ قرآن مجید کی تفسیر مرتب کر دی۔ میں کسی تفسیر کے بارے میں رائے دینے کا اہل نہیں۔ تاہم میں نے ارباب نظر سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال ضرور کیا ہے اور ثقہ علما سے اس کے بارے میں تعریفی کلمات بھی سنے ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ یہ نسیم صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کی صحیح شناخت اور مضطرب روح کا قرار و ثبات ہے۔ یہ دور نسیم صاحب کا تخلیقی دور ہے۔ شاعری کی طرف مایل ہوئے تو سب نے محسوس کیا کہ صبح کا بھولا شام ہونے سے پہلے گھر آگیا ہے۔ اسے بہت پہلے گھر آجانا چاہیے تھا۔ خود نوشت لکھی تو وہ بھی ایک بے قرار روح کی بے قراری کا والہانہ اظہار بن گئی۔ فکر اقبال پر کتاب لکھ دی۔ ہم عصر شعرا پر کتاب مرتب کر دی۔ ریڈیو یا پی آئی اے میں رہ کر نسیم صاحب یہ سب کچھ نہ کر پائے۔ فیضان محبت کسی اور ہی دنیا سے حاصل ہوتا ہے۔

نسیم صاحب ان دنوں خوب لکھ رہے ہیں۔ ماشاءاللہ قلم بزار و ان دواں ہے۔ مگر یہ سب کچھ ایک بڑے طویل ذہنی سفر کے بعد ہوا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ نسیم صاحب کے یہاں خط مستقیم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ پوری زندگی خطوط منحنی میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا سفر صرف خط منحنی میں ہے۔ ساری لکیریں ٹیڑھی ہیں۔

ذاتی اعتبار سے نسیم صاحب بڑے سیر چشم، حوصلہ مند اور قانع انسان ہیں۔ بڑے صابر و شاکر انسان ہیں۔ کچھ دن پہلے جوان جہان بیاہی تیاہی بال بچوں والی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ غالباً اسی دن یا اس سانحے کے دوسرے دن انہوں نے مجھے فون پر اطلاع دی۔ لہجے میں دکھ بھی بہت تھا اور صبر و ضبط بھی بلا کا تھا۔ شاید کوئی دوسرا باپ اس دکھ بھرے واقعے کو ایسے صبر و ضبط کے ساتھ نہ سناتا۔ یہ انہیں کا حوصلہ تھا کہ اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔

نسیم صاحب عفو و درگزر کے بھی قایل ہیں۔ اس ضمن میں مجھے ایک تازہ واقعہ یاد آتا ہے۔ انگریزی کے ایک تبصرہ نگار نسیم صاحب کے یہاں اکثر شام کو حاضری دیتے۔ کوئی علمی، ادبی مسئلہ چھیڑتے۔ گفتگو ہوتی۔ گفتگو ہوتی سے میرا مطلب یہ ہے کہ سارا بار گفتگو نسیم صاحب کے سر کیوں وہ بہترین گفتگو کرتے ہیں۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ وہ جب بولتے ہیں تو پھر کوئی دوسرا نہیں بولتا۔ اسی زمانے میں نسیم صاحب کا شعری مجموعہ شایع ہوا۔ ایک نسخہ تبصرہ نگار صاحب کو بھی ملا۔ انہوں نے اس پر ایک تبصرہ دھر گھسیٹا۔ اس تبصرے میں دو باتیں قابل ذکر تھیں۔ ایک تو یہ کہ تبصرہ نگار کے بقول نسیم صاحب شاعر نہیں متشاعر ہیں۔ ان کے یہاں آمد نہیں آورد ہے۔ وہ ایک Genuine شاعر نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے کلام میں عروضی سقم بہت ہیں۔ یہ دونوں باتیں بالکل لغو اور بے بنیاد ہیں۔ اگر نسیم صاحب Genuine شاعر نہیں ہیں تو پھر کوئی بھی Genuine شاعر نہیں ہے۔ یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ فلاں حقیقی شاعر نہیں

ہے ۔ جس کے بارے میں چاہے کہہ دیجئے ۔ کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے ۔ شاید اسی لیے ایک شاعر نقاد نے جل کر کہہ دیا تھا کہ شاعری پر تنقید لکھنے کا حق صرف شاعروں ہی کو ہے ۔ رہی عروضی سقم کی بات تو میرا خیال یہ ہے کہ نسیم صاحب نے عروض کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے اور سر سنگیت کے سچے عاشق ہونے کی وجہ سے بھی وہ شعر کے وزن کی پرکھ سے پوری طرح واقف ہیں ۔ موسیقی کی لے اور شعر کے وزن دونوں میں یکسانیت ہے ۔ اس کا ذاتی تجربہ مجھے یوں ہے کہ ایک زمانے میں استاد امراؤ بندو خاں مرحوم مجھ سے انگریزی پڑھتے تھے ۔ پڑھتے کیا تھے گپ مارنے کے لیے پڑھنے پڑھانے کی ایک تہمت تھی ۔ ایک دن میں نے داغ کی ایک غزل انہیں سنائی ۔ ایک شعر میں دانستہ میں نے پہلے مصرعے میں ایک وتد کم پڑھا ۔ امراؤ نے غور سے سنا پھر کہنے لگے "استاد یہ غزل دیوان میں پھر سے دیکھ لیجئے" ۔ میں نے پوچھا کیوں ؟ بولے "یہ مصرع ذرا اگڑ بڑ لگتا ہے ۔ صحیح معلوم نہیں ہوتا ۔ "میں نے ہنس کر کہا" یہ تمہاری آزمائش کے لیے پڑھا گیا تھا ۔ تم آزمائش میں پورے اترے" ۔ نجانے ان تبصرہ نگار کو یہ احساس کیسے ہو گیا کہ نسیم صاحب کے یہاں عروضی سقم ہیں ۔ بہرحال اس کالم کی اشاعت کے بعد نسیم صاحب نے ایک شام مجھے فون کیا لہجے میں کسی قدر تاسف تھا ۔ بولے "بھائی نہ ہم شاعر نہ عروض سے واقف ۔ ساری زندگی کا ریاض مٹی میں مل گیا ۔ " یہ کہہ کر چپ ہو گئے ۔ نہ ہاں نہ نا ۔ وہ تبصرہ نگار حسب معمول ان کے یہاں جاتے رہے ۔ نسیم صاحب نے ان سے جھوٹوں بھی نہ پوچھا کہ میاں تمہارے منہ میں کے دانت ہیں یہ صبر و ضبط کی بھی بات ہے اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ بھی ہے ۔

ریڈیو والے نسیم صاحب اب ایک بدلے ہوئے انسان ہیں ۔ پہلے مجلس آرا تھے اب گوشہ گیر ہیں ۔ پہلے ہر چیز پر چھا جاتے تھے اب انانیت کا کوئی مظاہرہ نہیں ۔ پہلے بحث و مباحثے میں فریق مخالف کی زبان بند کر دیتے تھے اب کسی سے بحث نہیں کرتے ۔ پہلے لباس میں دقت نظر تھی اب اس سے صرف نظر کر لیا ۔ محب وطن پہلے بھی تھے اب یہ لے بہت تیز ہو گئی ہے ۔ جس زمانے میں "روشنی" پروگرام میں تقریریں کرتے تھے سننے والے مسحور ہو جاتے تھے ۔ روپئے پیسے سے پہلے بھی چپ چپاتے لوگوں کی مدد کرتے تھے یہ روش اب بھی برقرار ہے ۔ ریڈیو کے نچلے درجے کے عملے میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے نسیم صاحب کی اس عادت سے فائدہ نہ اٹھایا ہو ۔

امداد کے سلسلے میں نسیم صاحب کے یہاں تحفظات نہیں تھے ۔ جو آگیا، جس نے کسی کام کے لیے کہا خوش دلی سے کر دیا ۔ کراچی اسٹیشن کے صدر نقل نویس ایک صاحب تھے ۔ مہذب، متین ۔ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آنے والے ۔ ان کا ایک بیٹا باہر جانا چاہتا تھا ۔ پاسپورٹ بنوانے کا مرحلہ تھا ۔ اس زمانے میں پاسپورٹ کے فارم پر کسی درجہ اول کے افسر کی تصدیق ضروری تھی ۔ اسٹیشن پر درجہ اول کے افسر محض ایک یعنی اسٹیشن ڈائرکٹر ۔ جو صاحب اس زمانے میں ڈائرکٹر تھے وہ بھی سب کے دوست اور یار باش ۔ نقل نویس فارم لے کے ان کے پاس

گئے مگر انہوں نے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی، صاف انکار کر دیا۔ نقل نویس اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔

اب کہاں جائیں۔ کسی نے کہا۔ میاں ہیڈ کوارٹر جا کر نسیم صاحب سے کہو۔ وہ ضرور دستخط کر دیں گے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ ہانپتے کانپتے ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ یہ بھی اتفاق کہ نسیم صاحب کے کمرے میں وہ اور ان کے اسٹیشن ڈائرکٹر دونوں ساتھ ہی داخل ہوئے۔ نسیم صاحب نے دونوں کو بٹھایا۔ پھر ان صاحب سے پوچھا کیسے آئے؟ اگلا اس شش و پنج میں کہ کہے تو کیا کہے۔ انکار کر دینے والے سر پر مسلط ہیں۔ آخر بڑی ہمت کر کے کہا۔ بیٹے کے پاسپورٹ کے فارم پر تصدیق کرانا تھی۔ نسیم صاحب کہنے لگے کہاں ہے فارم۔ انہوں نے فارم دیا۔ نسیم صاحب نے دستخط کیے۔ گھنٹی بجا کر پی اے کو بلایا اور کہا اس پر مہر لگالاؤ۔ اس کے بعد انہیں چائے پلائی پھر رخصت کیا۔ ڈائرکٹر صاحب بیٹھے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔ میں نے یہ واقعہ نقل نویس صاحب کی زبانی سنا تھا۔ پھر نسیم صاحب سے تصدیق چاہی۔ ہنسے۔ کہنے لگے، بھائی جو بھی آیا۔ میں نے بے چوں و چرا دستخط کر دیے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے پوری دفتری زندگی میں کوئی ڈھائی ہزار فارموں کی تصدیق کی ہوگی مگر آج تک ان میں سے کوئی غلط ثابت نہیں ہوا۔ نہ مجھ سے کبھی پوچھ گچھ ہوئی۔ بات یہ ہے کہ جو ڈرتے ہیں پوچھ گچھ بھی انہیں سے ہوتی ہے۔ جو دھڑلے سے دوسروں کی مدد کرتے ہیں ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔

شاعری کی حد تک نسیم صاحب کے مزاج کی سرشاری اب بھی برقرار ہے ورنہ وہ پوری طرح تائب ہو چکے ہیں۔ ایک دن بات ہو رہی تھی۔ بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگے "تم متقی ہو۔" اس عاجز کو وہ اکثر متقی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ مجھے اس لفظ سے ہمیشہ فسانہ مبتلا کے میر تقی اور مبتلا سے ان کی بحثیں یاد آتی ہیں اور وہ کمال کا منظر نظر میں ابھرتا ہے جب میر متقی حج سے واپس آکر رات کے وقت مبتلا کے یہاں پہنچے تھے۔ نسیم صاحب نے کہا تم متقی ہو۔ تم کیا جانو۔ تائب کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ تائب کبھی متقی کی سطح پر نہیں آسکتا۔ میں نے کہا یہ آپ کا خیال ہے اور ضروری نہیں کہ ہر خیال صحیح ہو۔ حضرت سلطان جی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی ایک مبارک مجلس میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ دو آدمیوں میں یہ بحث ہوئی کہ متقی کا مرتبہ زیادہ ہے یا تائب کا۔ گفتگو نے طول کھینچا۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ دونوں اپنے عہد کے پیغمبر کے پاس گئے۔ ان سے فیصلہ چاہا۔ انہوں نے کہا میں خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ وحی کا انتظار کرو۔ وحی بھی نازل ہوگئی۔ پیغمبر نے دونوں سے کہا۔ تم آج رات کسی ایک کے یہاں قیام کرو۔ صبح گھر سے نکلو۔ جو پہلا آدمی تمہیں ملے اس سے یہ مسئلہ پوچھ لو۔ دونوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو جو پہلا آدمی ملا اس سے پوچھا۔ تائب بہتر ہے یا متقی۔ اس نے کہا۔ میں بیچارہ ان پڑھ جولاہا۔ میں کیا جانوں تائب اچھا کہ متقی۔ میں تو یہ جانوں کہ کپڑا بننے میں تار بہت ٹوٹتے ہیں۔ ٹوٹنے والے تاروں کو اور تار جوڑ کر

مضبوط کر دیتا ہوں ۔ یہ جڑے ہوئے تار ان تاروں سے بہت زیادہ مضبوط ہوتے ہیں جو ٹوٹتے نہیں ہیں ۔ نسیم صاحب یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے ۔ بے قرار روح کے قرار کا ایک پہلو یہ بھی ہے ۔

نسیم صاحب کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے ۔ بالعموم بیمار رہتے ہیں ۔ بیماری بھی معمولی نہیں مگر قلم رواں دواں ہے ۔ ریڈیو بھی برابر جاتے ہیں ۔ سارا کام کرتے ہیں ۔ بچوں سے محبت ہے ۔ دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں ۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں ۔ میں نے ان سے زندگی کے آداب، سلیقہ اور علم حاصل کیا ہے ۔ مجھے ان سے محبت ہے مگر میں ان سے ڈرتا بھی ہوں ۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے سامنے پڑنے سے گریز کرتا ہوں ۔ بگولے کے رقص سے مجھے خوف آتا ہے ۔

یہاں تک لکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ساری تگ و دو اور مضمون آفرینی کے باوجود نسیم صاحب کا خاکہ لکھا ہی نہیں گیا ۔ میں ان کا خاکہ کیسے لکھوں ۔ انہیں جانتا ضرور ہوں لیکن ہزار کوشش کے باوجود انہیں سمجھ نہیں سکا اور جب سمجھ نہیں سکا تو خاکہ نگاری کا حق کیا ادا ہو ۔ بقول مرزا عبدالقادر بیدل ۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما
چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

آپ ہی کہئے رقص کرنے والے بگولے کا خاکہ کوئی لکھ سکتا ہے جو میں لکھ دوں ۔

(اس خاکے کا بیشتر حصہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۔ کراچی کی تقریب" حمید نسیم ۔ اعتراف خدمات ادب" میں پڑھا گیا تھا ۔ یہ تقریب ۱۱ نومبر ۹۳ء کو منعقد ہوئی تھی ۔)

..... اس آباد خرابے میں

گیارھواں باب

۴۴ء کی حیدر آباد کانفرنس کے بعد میں دلی یا نجیب آباد جانے کی جگہ بمبئی آگیا۔ میں پہلے کہیں یہ بات کہہ چکا ہوں کہ میرا کوئی کام سوچا سمجھا ہوا نہیں ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے ایک رو آتی ہے اور پھر جدھر اللہ لے جائے چل پڑتا ہوں۔ بمبئی جانے کی وجہ مدھو سودن تھے۔ یہ دلی میں بارہ دری شیر افگن خاں میں میرے ہمسائے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمسائیگی دوستی میں بدل گئی تھی جو ابھی تک اسی طرح قائم تھی۔ ان کے بڑے بھائی سری سریواستو فلم سے متعلق تھے۔ کیمرہ مین تھے۔ عکاسی کے شعبے سے متعلق۔ اس نسبت سے یہ پہلے لاہور گئے۔ اس کے بعد جب ان کے بھائی بمبئی آئے تو یہ بمبئی آگئے۔

مدھو سودن کو طالب علمی کے زمانے میں لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ افسانے لکھا کرتے تھے۔ "اجالے سے پہلے" ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ یا انتخاب بھی چھپا تھا۔ بمبئی آکر یہ فلموں کے لئے کہانیاں اور منظر نامے لکھنے لگے تھے۔ کئی فلمیں ڈائرکٹ بھی کیں۔ میں کچھ دن ان کے پاس رہا پھر پونا چلا گیا۔ پونا میں کرشن چندر تھے، جوش تھے، ساغر نظامی بھی تھے۔ تینوں ایک فلم کمپنی "شالیمار پکچرس" سے وابستہ تھے۔ میں گیا تو کرشن چندر کے پاس تھا مگر وہاں جاکر معلوم ہوا کہ ملک حبیب احمد بھی شالیمار میں مینجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ملک حبیب احمد کو میں دلی سے جانتا تھا اور ان کے گھر بھی بہت آنا جانا تھا۔ ملک صاحب کا منجھلا لڑکا ملک نسیم الظفر میرے ساتھ کالج میں تھا۔ وہ میرا ہم جماعت تو نہیں تھا مگر میرے قریبی دوستوں کے حلقے میں تھا۔ نسیم الظفر ہی کے ہم جماعت جمیل الدین عالی اور رضی الرحمن بھی تھے۔ ایک روز ملک صاحب کے ساتھ میں شالیمار گیا۔ کمپنی کے مالک اور ڈائرکٹر پروڈیوسر کا نام وحید الدین زیڈ احمد تھا۔ ملک صاحب مجھے باہر بٹھا کر خود زیڈ احمد سے ملنے چلے گئے۔ میں بیٹھا سوکھتا رہا۔ اب آتے ہیں کہ جب۔ شاید انہیں احمد صاحب سے میرے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ میں اٹھ کر جانے والا تھا کہ کرشن چندر آگئے۔

"ارے تم کب آئے؟" انہوں نے مجھے وہاں دیکھ کر پوچھا

"ایک روز قبل" میں نے بتایا۔
"تو باہر کیوں بیٹھے ہو۔ اندر آو"
میں کرشن چندر کے ساتھ اندر احمد کے دفتر میں گیا۔ احمد بڑے نستعلیق آدمی تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ ان دنوں میری پہلی کتاب "گرداب" چھپ چکی تھی۔ شاید ان کی نظر سے بھی گزری تھی۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے مجھے رسائل میں پڑھا تھا۔ جو لکھنے والے زیڈ احمد نے بلاکر رکھے ہوئے تھے جیسے کرشن چندر، ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی اور ایک ہندی کے شاعر تھے بھرت ویاس، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو فلمی صنعت میں داخل کرنا چاہتے تھے جو باقاعدہ ادیب اور شاعر ہوں۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد زیڈ احمد نے پوچھا میں اب کیا کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے بتادیا واپس علی گڑھ جاؤں گا۔ آگے کچھ پڑھوں لکھوں گا۔ انہوں نے بر سبیل گفتگو کہا فلم میں اچھے لکھنے والوں کی بڑی گنجائش ہے۔ میں فلموں میں لکھنے لکھانے کے لئے تو نہیں آیا تھا یہ درست مگر یہ بھی درست تھا کہ علی گڑھ میں جو زندگی میں جی رہا تھا۔ اس سے بہت خوش نہیں تھا۔ آگے بڑھنے کے لئے کوئی دروازہ ہی نہیں کھل رہا تھا۔ بالکل ایک غیر یقینی کی کیفیت تھی۔ احمد صاحب نے تو سرسری طور پر بات کہی ہوگی مگر میں دودلا ہو گیا اور فلم میں کام کرنے کی نیت ظاہر کی۔ احمد صاحب نے تنخواہ صرف ڈیڑھ سو روپئے کہی۔ مگر وعدہ کیا انہیں میرا کام پسند آیا تو اور بڑھادیں گے اور میں شالیمار پکچرس میں کام کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ان دنوں جب میں "شالیمار پکچرس" سے متعلق ہوا وہاں "من کی جیت" بن رہی تھی۔ بن کیا رہی تھی مکمل ہو گئی تھی۔ اس فلم کے مکالے کرشن چندر نے لکھے تھے اور گانے جوش اور بھرت ویاس نے۔ "من کی جیت" کے اہم اداکار شام چڈہ، نینا اور تیواری تھے۔ شام چڈہ ہیرو تھا نینا ہیروئن۔ ان کا اپنا نام شاہدہ تھا۔ شیخ عبداللہ جو علی گڑھ میں لڑکیوں کے کالج کے بانی تھے ان کے بڑے بیٹے محسن عبداللہ سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ اس فلم کے فوری بعد جو فلم شروع ہونے والی تھی اس کا نام "غلامی" تھا۔ یہ پروپگنڈا فلم تھی۔ رینو کا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ مسعود پرویز ہیرو تھے۔ رینو کا کا اپنا نام خورشید تھا۔ یہ شاہدہ یعنی نینا کی نند تھیں۔ شیخ عبداللہ کی بیٹی۔

احمد صاحب نے وہ فلم لکھنے کے لئے میرے حوالے کی۔ مکالموں کے علاوہ میں نے اس فلم کے دو گانے بھی لکھے۔ ایک ہیروئن کا گانا تھا۔ ع۔ "جاگیں، رگ رگ میں جاگی امنگیں" جو دراصل میری ایک نظم تھی۔ ایک کہانی اور ایک اوپیرا تھا جس میں آزادی کے لئے ہندوستانیوں کی جدوجہد دکھائی گئی تھی۔ اس نظم کو احمد صاحب نے شیڈو پلے کی شکل میں پیش کیا۔ تیرہ منٹ کا اوپیرا تھا۔ "غلامی" شروع کرنے کے فوراً بعد "من کی جیت" کی نمائش کے لئے بمبئی گئے۔ وہ سبھی لوگ تھے جنہوں نے "من کی جیت" میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ میں بھی گیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو لوگوں نے بہت پسند کی۔ تیواری کا رول خاص طور پر اور جوش اور بھرت ویاس کے گانے بھی۔ احمد

صاحب بہت خوش تھے اس کامیابی پر ۔ طے پایا کسی اچھی جگہ چل کر کھانا کھائیں ۔ شاہدہ کہنے لگیں تاج محل ہوٹل چلیں ۔ مگر ایک قباحت آن پڑی ۔ ان دنوں خاص طور پر کالے ڈنر سوٹ کی قید تھی ۔

"اختر الایمان کیا کریں گے ؟" اس لئے کہ میں اپنے روزمرہ کے کپڑوں میں تھا ۔ وہی سفید کرتا پاجامہ ۔ شیروانی تک نہیں تھی ۔ میں نے احمد صاحب کی مشکل حل کی اور کہا "احمد صاحب میں پاجامہ پہنے رہوں گا، کرتا اتار دوں گا ۔" سب ہنسنے لگے اور تاج کی جگہ کہیں اور کھانا کھایا ۔

بمبئی سے واپس آکر "غلامی" میں مصروف ہو گئے ۔ فلم کے دوران ایک دن رینو کا (خورشید) نے شوشہ چھوڑا "بھنگ نہیں کھائی ہم نے کبھی ۔ کیا خیال ہے ؟ کھائی جائے ؟"

مجھے بھنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا ۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں شوٹنگ میں موجود تھے ۔ شیریں نام کی بھی ایک لڑکی تھی ۔ غالباً پارسی ، اس نے کہا میں کھلاؤں گی ۔ اگلے روز وہ بھنگ کی بہت سی پکوڑیاں پکوا کر لے آئی ۔ ایک کمرہ لکھنے والوں کے لئے مخصوص تھا ۔ میں ، کرشن چندر ، بھرت ویاس وغیرہ اکثر وہیں بیٹھتے تھے ۔ شیریں نے وہ پکوڑیاں لا کر اس کمرے میں رکھ دیں اور مجھ سے اصرار کر کے کہا کسی کو نہ بتاؤں اس میں بھنگ ہے ۔ میں نے نہیں بتایا بلکہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ پکوڑیاں بہت اچھی ہیں ہر آنے والے کے ساتھ دو چار کھاتا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا مجھ پر وقفے وقفے سے ہنسی کے دورے پڑنے لگے ۔ اس روز کہانی پر احمد کے ساتھ نشست تھی ۔ تب تک راما نند ساگر بھی شالیمار سے متعلق ہو گئے تھے ۔ وہ وقتی طور پر کرشن چندر کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے ۔ اب ایک ایک سے کہہ رہے ہیں احمد صاحب ، لیکن وہ نشست نہیں ہو سکی ۔ کوئی ان کے پاس نہیں گیا ۔ ساگر گئے مگر بجائے کچھ کہنے کے بار بار احمد کا چشمہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیتے تھے اور احمد لے کر میز پر رکھ دیتے تھے یہ کہہ کر :

"یہ میرا چشمہ ہے ، بھائی"

ساگر واپس آگئے ۔ پھر سب نے مجھے بھیجا ۔ میں گیا مگر عجیب کیفیت تھی ۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ہنسی نکل پڑتی تھی ۔ زیڈ احمد کے پاس جوش بھی بیٹھے ہوئے تھے ۔ مجھے بار بار اس طرح ہنستا دیکھ کر بڑی دلچسپی ظاہر کی ۔

"خیریت ہے ، کیا زعفران کا کھیت دیکھ لیا ؟"

"بھنگ کھائی ہے" ۔ میرا جواب تھا ۔ جوش بہت محظوظ ہوئے اور کھود کھود کر پوچھنے لگے ۔ کہاں کھائی ، کیسے کھائی ، کس نے لا کر دی وغیرہ وغیرہ ۔ میں بہت دیر ہنسی نہیں روک سکا اور اٹھ کر باہر آگیا ۔ بھنگ کھانے کا سب ہی پر کچھ نہ کچھ اثر ہوا تھا ۔ جتنے لوگ اس وقت شالیمار میں تھے سب ایک برادری کی طرح تھے ۔ اپنے تہواروں کے موقع پر مسلمان خاص طور پر ایک دعوت کا اہتمام کرتے تھے اور شالیمار کے تمام کام کرنے والوں کو بلا استثنا مدعو کرتے تھے ۔ سب لڑکے ، لڑکیاں

ہیرو ہیروئن اہم کردار کرنے والے، سب میں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ تھا۔ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ رامانند ساگر، کرشن چندر کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا یہ عالم تھا دوسرے کمرے میں لے جاؤ تو چھوٹ کر کرشن چندر کے کمرے میں آجاتے تھے اور کرشن چندر انہیں دیکھ کر بڑے زور سے قہقہہ لگا کر باہر بھاگتے تھے اور بیچ سڑک پر بیٹھ کر ہنستے تھے۔ دونوں کو پھر الگ کرتے تھے اور پھر وہی ہوتا تھا۔

نواب بیگم بار بار چارپائی کی ادھوائن میں پاؤں ڈال کر چلاتی تھی "پھنس گئی پھنس گئی پھنس گئی" بار بار اس کا پاؤں نکالتے تھے اور بار بار وہ پھنسا لیتی تھی۔ مسعود پرویز کی شوٹنگ تھی مگر دن بھر اس کے منہ سے ایک جملہ بھی نہیں نکل سکا۔ بالکل گنگ ہو گئے تھے۔ میں کمرے پر جاکر سکنج بین پی کر سو گیا اور اگلے دن کی خبر لایا۔ غرضیکہ سب ہی کی حالت غیر تھی۔ لطیفہ یہ کہ جس نے بھنگ کی فرمائش کی تھی، یعنی رینو کا، اس نے پکوڑیاں چکھی بھی نہیں۔

اسی زمانے کی بات ہے۔ نشست کے لئے ایک روز جوش آئے اور کہنے لگے " ارے صاحب کیا زمانہ آیا ہے بچے بڑوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔"

"کیا ہوا جوش صاحب"

"آج صبح سویرے ہی ہمارا نواسا آیا اور پوچھنے لگا۔

، نانا بچے کہاں سے آتے ہیں، اب صاحب اسے بتانا تو ضروری تھا۔ میں نے ایک الٹی سیدھی کہانی سی بنا کر اسے بتایا فرشتے لے کر آتے ہیں۔"

"پھر؟"۔

وہ بیٹھا آرام سے سنتا رہا اور جب میں بتا چکا تو کہنے لگا

، اماں نانا کیوں چوتیا پن کی باتیں کرتے ہو، ؟"

ان دنوں پونا شہر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اسٹوڈیو شہر سے باہر شنکر سیٹھ روڈ پر تھا۔ جس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ آبادی بھی شہر کی بہت نہیں تھی۔ راتیں ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا۔ اورنگ زیب کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اس نے شہر کا نام بدل کر محی نگر رکھ دیا تھا مگر اس نام کو قبول عام حاصل نہیں ہوا۔

میں ابتداء میں کچھ روز ملک صاحب کا پاس رہا۔ چند دن بعد جب ملک صاحب دلی چلے گئے اور پلٹ کر نہیں آئے تو مجھے وہاں رہنے میں تردد ہونے لگا۔ ملک صاحب کے پاس ایک لڑکا انور بھی رہتا تھا۔ وہ میرے ساتھ اینگلو عربک کالج میں بھی تھا اور دلی میں ملک صاحب کے یہاں رہا کرتا تھا۔ ان سے اس کی کوئی رشتہ داری تھی یا وہ اس خاندان کو کیسے جانتا تھا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مگر مجھے یہ خیال پریشان کرنے لگا کہ ملک صاحب واپس نہ آئے تو میں اتنے بڑے مکان کا کرایہ کیسے دوں گا؟ شالیمار میں شام اور مسعود پرویز کے ساتھ بھارت بھوشن بھی تھے۔ ان سب

فلموں کے ساتھ ساتھ ایک فلم کرشن بھگوان بھی بن رہی تھی ۔ بھارت بھوشن اس میں کرشن کا کردار کر رہے تھے ۔ میں ان کی ایک فلم "بھگت کبیر" پہلے بھی دیکھ چکا تھا ۔ انہوں نے کبیر کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا ۔

شالیمار اسٹوڈیو کے سامنے دو تین کوٹھیاں تھیں ۔ ایک میں ایک یہودی خاندان تھا ۔ دوسری میں شہر کے مجسٹریٹ رہتے تھے ۔ جن کا بہت بڑا کنبہ تھا ۔ بیچ کی کوٹھی میں بھارت بھوشن رہتے تھے وہ صرف دو میاں بیوی تھے ۔ ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی ۔ بھارت بھوشن سے اسٹوڈیو میں ملاقات ہوتی رہتی تھی ۔ انہیں مکالمے کا بہت شوق تھا ۔ کبھی کبھی کہانی کے موضوع پر ان سے باتیں ہوتی تھیں ۔ ایک روز معلوم ہوا وہ اپنی کوٹھی کے دو کمرے کرایے پر دینا چاہتے ہیں میں نے پوچھا مجھے دیں گے اور وہ آمادہ ہو گئے ۔ میں ملک صاحب والا مکان چھوڑ کر اسٹوڈیو کے سامنے آ گیا ۔

ان دنوں کچھ باتیں ایک معمول سا بن گئی تھیں ۔ جیسے ایسٹ اسٹریٹ کا ایک ہوٹل جہاں ہم اکثر بیٹھتے تھے ۔ کرشن چندر ، میں ، کبھی کبھی جوش ، بھرت ویاس ، کچھ دلی ریڈیو کے آرٹسٹ آ گئے تھے جیسے پریم ، راجکمار اور محمد حسین ۔ وہاں بھنا ہوا گوشت بہت اچھا ملتا تھا اور ہوٹل کے مالک نے ہمیں وہاں پینے پلانے کی اجازت بھی دے دی تھی ۔

کبھی کبھی شام کے کمرے میں بیٹھک ہوتی تھی اور پینا پلانا ہوتا تھا ۔ کبھی میرے یہاں بیٹھ جاتے تھے ۔ اکثر محفلوں میں رامانند ساگر بھی ہوتے تھے ۔ محفلیں کبھی ان کے گھر پر بھی ہوتی تھیں ۔ ان دنوں میرے ساتھ ایک عجیب بات یہ تھی کہ تین پیگ تک پیوں تو سر در رہتا تھا ۔ اس کے بعد پیتا تھا تو اتر جاتی تھی ۔ رامانند ساگر کے گھر کی ایک محفل مجھے یاد ہے جس میں جوش بھی تھے ۔ میں نے تیرہ چودہ پیگ پیے تھے ۔ دو تین پینے والے تو الٹیاں کر رہے تھے ۔ میں نے دیکھا جوش آہستہ آہستہ پیچھے کو سرکتے جا رہے ہیں اور آخر میں جوتے ہاتھوں میں لے کر باہر آ گئے ۔

"کہاں جا رہے ہیں ؟" میں نے ان کے پیچھے پیچھے آ کر پوچھا ۔

"تم سے مطلب ؟"

"میں بھی چلوں گا"

انہوں نے ایک موٹی سی گالی دی ۔

"...... یہ لے جاؤ ۔" اور جوتے ہاتھوں میں تھامے تھامے اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہی چلے گئے ۔

جوش کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے ۔ بحیثیت مجموعی میں انہیں معصوم انسان تصور کرتا ہوں ۔ پینے کے بعد کبھی بالکل بنسوڑ ہو جاتے تھے ۔ کبھی ان کا خاندانی طنطنہ ابھر آتا تھا ۔ اپنے عہد کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہے مگر میں انہیں یہاں بطور ایک

شاعر کے پیش نہیں کر رہا۔ اپنے شالیمار میں کام کرنے والے ایک ساتھی کی حیثیت سے ان کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں جو متضاد بھی ہیں مگر ان کی ذاتی زندگی سے بھی اس وقت میرا کوئی سروکار نہیں۔ ہم ساتھ بیٹھے اٹھتے تھے۔ وہ ہمارے بزرگ تھے۔ ان کی نظمیں سنتے بھی تھے اپنی نظمیں سناتے بھی تھے۔ جب کچھ سنانے لگتے تھے "تو مردودو سنو" سے شروع کرتے تھے۔ زمانے بعد ایک بار بمبئی کی ایک ادبی نشست میں ملاقات ہوئی۔ کیفی، سردار، وشوامتر عادل اور تقریباً سب ہی کی بیویاں جو جوان تھیں اور دیکھنے میں اچھی بھی لگتی تھیں اس نشست میں شامل تھیں۔ میری بیوی سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ جوش محفل میں آئے تو سب لڑکیوں یا بیویوں کو دیکھ کر کہا۔

"مردودوں نے کیا کیا عورتیں رکھی ہیں۔"

سلطانہ گھر آکر بہت بگڑیں۔ کیا مطلب تھا جوش صاحب کا اس بات سے؟ کیا سمجھتے ہیں وہ عورتوں کو۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ہنس کر ٹال دیا اس لئے کہ جوش کا سنجیدگی سے کچھ بھی مطلب نہیں تھا۔

شالیمار پکچرس ایک ایسی جگہ تھی جہاں گھوڑوں کی ریس کے زمانے میں سب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میری مراد فلم کے لوگوں سے ہے۔ اکثر لوگ جب ریس میں آتے تھے تو شالیمار ضرور آتے تھے۔ وہاں میں جدن بائی سے ملا۔ شوکت حسین اور فضلی سے ملا۔ چندو لال شاہ جو ایک زمانے میں فلم کی بڑی شخصیت تھے ان سے ملا۔ منٹو بھی آتے تھے۔ مسعود پرویز سے ان کی عزیز داری تھی۔ ان سے ملنے بھی آتے رہتے تھے۔ دلی ریڈیو میں ان کے اور اپندر ناتھ کے درمیان اکثر چشمک رہتی تھی۔ ایک بار منٹو اردو کا ٹائپ رائٹر خرید لائے۔ دفتر میں اس پر کام کرنے لگے اور بلند آواز سے اپندر ناتھ کو چڑانے کے لئے کہنے لگے "ٹائپ رائٹر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ہاتھ سے لکھنے میں وہ مزا نہیں آتا۔" منٹو کی ضد میں اپندر ناتھ بھی ٹائپ رائٹر خرید لائے۔ منٹو نے ٹائپ رائٹر پر لکھنا چھوڑ دیا اور اعلان کیا "ہاتھ سے لکھنے میں جو لطف ہے، ٹائپ رائٹر پر لکھنے میں نہیں"

میں جب شالیمار پکچرس بند ہونے کے بعد بمبئی آگیا تو ایک روز شاہد لطیف ایک ٹائپ رائٹر لے کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے "یہ منٹو کا ٹائپ رائٹر ہے۔ وہ اسے تین سو روپے کے بدلے میرے پاس رکھ گئے تھے۔ تم رکھ لو مجھے تین سو روپئے کی ضرورت ہے۔ وہ ٹائپ رائٹر بہت دن تک میرے پاس رہا۔ اب معلوم نہیں کیا ہوا۔ شاید مکان بدلنے میں ادھر ادھر ہو گیا۔ جب میں نے پینڈا اسٹنیڈ والا گھر چھوڑا تھا بہت سی چیزیں خورد برد ہو گئی تھیں۔ میں عادتاً بھی پرانی چیزیں بہت دن تک نہیں رکھتا۔ بوسیدگی کی بو آنے لگتی ہے۔ انسانی رشتوں کی بات اور ہے۔

اسٹوڈیو کے سامنے والے مکان میں منتقل ہونے کے بعد اسٹوڈیو میں آنا جانا آسان ہو گیا

تھا۔ ان دنوں شوٹنگ کے اوقات مقرر نہیں تھے۔ کبھی کبھی دن رات بھی کام ہوتا تھا۔ "غلامی" کی شوٹنگ کے زمانے میں کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس فلم میں ایک چھوٹا سا کردار میں نے بھی ادا کیا تھا۔ یونین کا لیڈر بنا تھا۔ دن رات منہ پر میک اپ لیپے لیپے عاجز آگیا تھا۔ جیسے بادشاہوں کے عروج و زوال کی کہانیاں پڑھنے میں آتی ہیں ویسی ہی فلم کے لوگوں کی بھی ہیں۔ سیاست سے متعلق لوگوں کی بھی ایسی ہی ہیں۔ آزاد پیشوں میں ترازو کے پلڑے بہت جلدی جلدی اوپر نیچے ہوتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جب بمبئی آیا اور کام کی کھوج میں ٹرینوں میں سفر کرتا تھا، ان دنوں بہت سے چہرے جو ریلوے پلیٹ فارم پر ملتے تھے بعد میں بڑی بڑی گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں ملے مگر اس وقت مجھے اس سے سروکار نہیں۔ ان دوستوں اور بزرگوں کا ذکر کر رہا ہوں جو میرے ساتھ شالیمار پکچرس میں بھی تھے اور پھر اس زندگی کے سفر میں آگے بھی کہیں کہیں ملے۔ جیسے کرشن چندر اور جوش۔

کرشن چندر سے میں پہلی بار صادق الخیری کے مکان پر ملا تھا۔ اس کے بعد تو ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔ دلی میں بھی پونے میں بھی اور بمبئی میں بھی۔ میں ان کے جنازے میں بھی شریک تھا۔ میں ان کا شمار بھی اچھے لوگوں میں کرتا ہوں۔ دوستوں کے دوست، ہمدرد قسم کے انسان تھے۔ کسی کے لئے جو کر سکتے تھے کر دیتے تھے۔ ان کا اپنا ایک طریقہ کار تھا۔ اپنا ہر کام کر لیتے تھے ہر مشکل نپٹ لیتے تھے دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر۔ شالیمار پکچرس کے زمانے ہی کی بات ہے، بمبئی میں ایک کانفرنس ہوئی۔ وہ بھی شاید ترقی پسند حلقے ہی نے منعقد کی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے میں اور کرشن چندر دونوں ساتھ آئے۔ کانفرنس شاید قیصر باغ میں ہوئی تھی۔ جہاں جہاں بھی بمبئی کی سڑکوں اور بازاروں سے ہم گزرے ہر طرف دیواروں پر کانفرنس کے پوسٹر لگے دیکھے مگر ان میں سے کسی پر بھی نہ میرا نام تھا نہ کرشن چندر کا۔ چلتے چلتے وہ ہنس کر کہنے لگے "اختر الایمان نہ تم شاعر ہو نہ میں افسانہ نگار۔" مگر اس کانفرنس میں شرکت کے بعد دیکھتے دیکھتے کرشن چندر ایشیا کے بڑے افسانہ نگار مان لیے گئے۔

کرشن چندر نے پے در پے ایسے مضامین لکھے جن میں ترقی پسند تحریک میں کام کرنے والوں کو سراہا گیا تھا۔ ایک مضمون میں سجاد ظہیر کو پیار سے "چمڑے کا سوداگر" کہا گیا تھا۔

کرشن چندر پونے میں ۱۳ / تلک روڈ پر رہا کرتے تھے۔ اسٹوڈیو سے یہ جگہ بہت فاصلے پر نہیں تھی۔ کرشن چندر بہت ہمدرد قسم کے آدمی تھے۔ ریڈیو چھوڑ کر جب شالیمار پکچرس میں آئے وہاں کے کئی اداکاروں کو ساتھ لے آئے تھے یا بلوا لیا تھا۔ انہیں میں ایک ثمینہ خاتون بھی تھیں۔ زندگی میں جتنی بھی اچھی چیزیں ہیں، جیسے اچھے کھانے، اچھی شراب، اچھی زندگی کے سارے لوازمات، اچھے دوست مرد ہو یا عورت، انہیں سب بہت پسند تھے۔ دلی میں انہیں کچھ دن ایک خاتون کے ساتھ دیکھا جو ہندی کے ایک مشہور ادیب کی بیوی، جن کی تھیں اب طلاق ہو گئی تھی۔

اس کے بعد ایک اور لڑکی تھی جو ان کے ڈراموں میں کام کیا کرتی تھی ۔ پھر ثمینہ خاتون آگئی تھیں فلمی زندگی میں آئے تو وہ بھی آگئی یا بلالی گئی ۔ شالیمار چھوڑنے کے بہت دن بعد کی بات ہے ایک روز مجھے باندرہ کے بازار میں مل گئے ۔ وہ ان دنوں وہاں قریب ہی رہتے تھے ۔ باتیں کرتے کرتے ہم ان کے گھر چلے گئے ۔ ان دنوں انہیں گھٹیا ہو گئی تھی ۔ کہنے لگے "ڈاکٹر کہتا ہے یہ نہ کھاؤ وہ نہ کھاؤ ۔ کچھ نہ کھاؤ تو جیوں کیوں" ؟

ایک روز میں اسٹوڈیو میں بیٹھا کام کر رہا تھا نواب بیگم آگئی ۔ مجھے کام کرتا دیکھ کر خاموش بیٹھی رہی ۔ اچانک میری نظر پڑی ۔ اسے مایوس دیکھ کر میں نے پوچھا "کیا ہوا تمہیں" ؟ معلوم ہوا ایک بڑے قلمکار کے بارے میں جو اس کا تصور تھا وہ بہت مجروح ہوا ہے ۔ میں نے تفصیل پوچھی تو بتایا کہ اس نے ابھی راستے میں کرشن چندر کے ساتھ ثمینہ خاتون کو دیکھا ۔

"یہ کیا بات ہوئی ۔ تم بھی تو لڑکی ہو اور میرے پاس بیٹھی ہو"

"نہیں ۔ ایں ۔ ایں" اس نے نہیں کو کھینچا اور پھر بتایا کرشن چندر ثمینہ خاتون کا چپل ہاتھ میں لئے موچی کے پاس جا رہے تھے ۔ مجھے یہ کوئی عجیب بات نہیں لگی ۔ میں نے اسے کہا "اگر تم میرے ساتھ بازار جاؤ اور راستے میں تمہاری چپل ٹوٹ جائے تو میں کیا کروں گا" ؟

"کیا کریں گے" ؟

"تمہاری چپل اٹھا کر موچی کے پاس لے جاؤں گا ۔ یہ ایک عام رویہ ہے کسی بھی مرد کا ۔"

"ہٹایئے ۔ ہر بات کو مذاق میں ٹال دیتے ہیں آپ ۔" اس نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی ۔ کچھ دن بعد کرشن چندر شالیمار پکچرس چھوڑ کر بمبئی چلے گئے اور بمبے ٹاکیز سے متعلق ہو گئے ۔ ثمینہ خاتون بھی چلی گئیں ۔ وہاں انہوں نے ثمینہ کو ہیروئن لے کر ایک فلم بنائی ۔ کیا حشر ہوا نہیں معلوم ۔ کرشن چندر کے بعد میں ان کے مکان ۱۳ / تلک روڈ پر منتقل ہو گیا ۔

شالیمار پکچرس کے علاوہ پونے میں اور دو فلم کمپنیاں تھیں ۔ "پربھات" اور "نویگ چترپٹ لمیٹڈ ۔ "غلامی ختم ہوتے ہی زیڈ احمد نے اگلی تصویر "پرتھوی راج سنجوگتا" شروع کر دی ۔ اس میں سنجوگتا کا کردار نینا نے کیا اور پرتھوی راج کا پرتھوی راج کپور نے ۔ وہ اپنے زمانے کے بڑے مشہور اداکار تھے ۔ فلموں میں کام کرنے کے علاوہ "پرتھوی تھیٹر" کے نام سے ایک تھیٹر بھی قائم کر رکھا تھا جس کے ڈرامے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے ۔ پونے میں بھی انہی دنوں اپنا تھیٹر لے کر آئے اور ان کے ساتھ ان کے دوسرے اسٹیج کے اداکاروں سے ملاقات ہوئی ۔ ان کے بیٹے راجکپور اور ان کی ہیروئن دمینتی ساہنی سے بھی ۔ اس فلم کی ہدایت کے لئے نجم نقوی کو بلایا گیا ۔ نجم نقوی نے انہیں دنوں نویگ کے لئے ایک فلم بنائی تھی جو بہت کامیاب ہوئی تھی ۔ نجم نقوی سے ملاقات علی گڑھ یونیورسٹی میں ہوئی تھی ۔ بمبئے ٹاکیز میں کئی برس ایک جرمن فلم ڈائرکٹر کے ہاتھ تلے کام کیا تھا جسے ہمانشو رائے لے کر آئے تھے ۔ اس زمانے میں اور بہت سے پہچان کے لوگ

جو فلموں سے وابستہ تھے پونا آگئے تھے ۔ شاہد لطیف اور عصمت چغتائی "نویگ" کے لئے ایک فلم بنا رہے تھے جس میں ہیروئن کا کردار گیتا نظامی کر رہی تھی ۔ اس سے پہلے وہ "نویگ" کی فلم "پنا" کی ہیروئن رہ چکی تھی جس کے ڈائرکٹر نجم نقوی تھے ۔ گیتا نظامی ادھ کچری سی لڑکی تھی ۔ ناخواندہ ہونے کے برابر مگر ان ہی سب سے دوستی بھی تھی ۔ ایس وی دی پہلے مظہر خاں کی فلم "بڑے نواب صاحب" بنا چکے تھے جو اچھی خاصی چلی تھی ۔ آہستہ آہستہ ایسٹ اسٹریٹ کے حلقے والوں میں یہ سب نام بھی شامل ہوگئے تھے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ۔

میرا تلک روڈ والا گھر ایک طرح کا مہمان خانہ بن گیا ۔ جسے کہیں رہنے کی جگہ نہیں ملتی تھی میرے پاس آکر بستر لگا دیتا تھا ۔ کچھ دن کے لئے نور الحق بھی آگئے ۔ آج وہ بھی حیات نہیں ۔ جن دنوں میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تھا وہ بھی وہاں پڑھتے تھے ۔ حیدرآباد کے رہنے والے تھے ۔ اکبر یار جنگ کے پوتے یا نواسے ، تفصیل یاد نہیں رہی ۔ ان سے اور کچھ دوستوں سے جیسے مشتاق احمد یوسفی ، ذکی ، آغا اور بلوچستان کا ایک لڑکا تھا ، ایسا میل ہوگیا تھا کہ دوپہر کا کھانا سب ساتھ کھاتے تھے ۔ کوئی عثمانیہ ہوسٹل میں تھا کوئی ماریسن کورٹ میں اور کوئی ایس ایس ہال میں ۔ سب اپنا کھانا ایک جگہ منگالیتے تھے اور مل کر کھاتے تھے ۔ نور الحق کے بعد ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر آگیا تھا ۔ اب نام یاد نہیں رہا ۔ کچھ دن کے لئے شالیمار پکچرس میں ملازم ہوگیا تھا ۔ وہ گیا تو خورشید منیر اور سلمہ صدیقی آگئے ۔ ان دونوں کو میں خود لایا تھا ۔

علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں کئی بار میں نے خورشید منیر کو دیکھا تھا مگر واقفیت کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ چھیلا صفت لڑکا تھا اور ایسے کھیلوں میں حصہ لیتا تھا جس میں جسمانی نمائش زیادہ تھی ۔ میں جب شالیمار میں آیا تو ایک روز دیکھا وہ بھی وہاں ہے ۔ کب آیا کس کے توسط سے آیا مجھے کچھ معلوم نہیں تھا ۔ مجھے اتنا معلوم تھا ۔ جسٹس منیر کا بیٹا ہے ۔ پونے میں دو تین لڑکوں نے مل کر ایک کمرہ لے رکھا تھا ان کے ساتھ رہتا تھا ۔ پتہ نہیں وہ کیوں آگیا تھا ۔ مجھے اس کے اندر کبھی اداکاری کی صلاحیت محسوس نہیں ہوئی ۔ ایک بار چند روز کی چھٹی لے کر گیا اور آیا تو ساتھ بیوی تھی ۔ رشید احمد صدیقی کی بیٹی سلمہ ۔ میں رشید صاحب کا بہت احترام کرتا تھا اور سلمہ کے بارے میں بھی میری رائے تھی کہ پڑھی لکھی اور ذہین ہیں ۔ مگر یہ شادی ؟ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ۔ مگر یہ مجھے معلوم تھا کہ خورشید منیر کے پاس رہنے کا کوئی اچھا ٹھکانہ نہیں ۔ میں نے کچھ روز سوچا اور پھر ایک دن جاکر انہیں اپنے پاس لے آیا ۔

•

۱۳ / تلک روڈ کا مکان بنگلہ نما تھا ۔ اوپر ایک کمرشیل آرٹسٹ پٹوردھن رہتے تھے ۔ جب تک میں پونے میں رہا اسی مکان میں رہا ۔ گھر کے قریب بی ایس پی کالج تھا ۔ گھر کے سامنے جمخانہ تھا جس کے لان میں اکثر آر ایس ایس کے نوجوان مختلف قسم کی ورزشوں میں صبح اور شام کے وقت مصروف نظر آتے تھے ۔ نویگ ، پربھات اور شالیمار میں کام کرنے والے لوگوں کے ساتھ ایک

اور بھی نام ہے جس کا ذکر ضروری ہے۔ ان کا نام مسز مچل تھا۔ نیم انگریز نسل کی خاتون تھیں اور عرفِ عام میں ممی کہہ کر بلائی جاتی تھیں۔ بڑا مسکراتا ہوا نرم سا چہرہ جس پر اب جھریاں نظر آنے لگی تھیں۔ اپنی جوانی میں ضرور خوبصورت رہی ہوں گی۔ بڑی "حاجت روا" قسم کی خاتون تھیں۔ جسے جب جو چاہیے مل جاتا تھا۔ ٹھرے سے انگریزی شراب تک اور گھاٹن سے اینگلو انڈین اور انگریز لڑکی تک۔ شام چڈھا خاص طور پر ان کا گاہک تھا۔ وہ مجھ پر بھی بہت مہربان تھیں۔ میں اسٹوڈیو سے گھر یا گھر سے اسٹوڈیو جاتے وقت تھوڑی دیر ان کے ہاں ضرور بیٹھتا تھا۔ ان کی دسترس کہاں تک تھی یہ وہی جانتی تھیں۔ ویدی، رندھیر ایکٹر، شاہد لطیف، شام، کون تھا جو ان کا گرویدہ نہیں تھا۔

ان دنوں میں ڈائری لکھا کرتا تھا۔ آگے اس ڈائری کے کچھ حوالے دوں گا جو ممکن ہے بے ربط لگیں مگر میرے اس زمانے کی جھلک ان میں مل جائیگی اور میں ایک طول امل سے بچ جاؤں گا" پرتھوی راج سنجوگتا" ختم ہونے کے بعد "میرا بائی" شروع ہونے والی تھی۔ میں زیڈ احمد سے اجازت لے کر کچھ دن کے لئے گھر گیا۔ میرے گھر کی صورت حال ایسی تھی کہ اب اسے ٹھیک کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ میں نے اماں کو دلی بلایا اور خود نجیب آباد چلا گیا۔ سلمہ اور ظہور احمد کو بلایا، ایک وکیل کو بلایا اور وکیل کے سامنے سلمہ کو طلاق دے دی اور اس کا سارا سامان دے کر اسے ظہور احمد کے ساتھ رخصت کر دیا۔ بعد میں ان دونوں نے شادی کر لی۔ میرے گھر کے افراد، والد، والدہ، تایا، چچا کے لڑکے کسی کو میری یہ بات پسند نہیں آئی مگر میں نے جو طے کر لیا تھا وہ کیا اور دلی آگیا۔ سلطانہ کے بڑے بھائی مجاہد علی سے ملا اور ان کے سامنے تجویز رکھی کہ سلطانہ سے میرا نکاح اب کر دیں رخصتی اگلے سال ہو جائے گی ان کا بڑا خاندان تھا۔ تھوڑی دیر انہوں مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ نکاح بھی اگلے سال ہی ہو جائے مگر میں نے اپنے دلائل دیے اور اڑا رہا۔ آخر نکاح ہو گیا اور ۳/ مئی ۴۷ء کو ظہر اور عصر کے درمیان سلطانہ میری بیوی بن گئی رخصتی اگلے سال پر ملتوی کر دی گئی۔ کچھ روز دلی میں رہ کر میں واپس پونا آگیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فضا مکدر ہوتی جارہی تھی اور ملک پر تقسیم کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ جگہ جگہ انگریزوں کے خلاف مظاہرے اور بلوے ہو رہے تھے۔ فرقہ داری فساد زور پکڑنے لگے تھے۔ کرشن چندر تو بمبئی چلے ہی گئے تھے۔ نجم نقوی اور جوش بھی چلے گئے اور مسعود پرویز بھی۔ ایک روز کسی نے آکر اطلاع دی گیتا نظامی ایس ویدی کے ساتھ چلی گئی۔ نظامی کو چھوڑ دیا۔ نظامی لاہور چلے گئے۔ ویدی "نو ییگ" کی ایک فلم کرہ نمبر ۹ بنا رہے تھے۔ گیتا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ شالیمار پکچرس کی مالی حالت بھی بگڑنے لگی تھی۔ کئی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں میں سگریٹ پیتا تھا اور بہت پیتا تھا۔ سگریٹ سے سگریٹ جلا کر۔ ایک روز سگریٹ خریدنے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ میں خزانچی کے پاس گیا اور کچھ پیسے مانگے۔ اس نے آٹھ آنے دیئے۔ فلپس

موریس تو آٹھ آنے میں نہیں آتی تھی۔ مجھے بہت برا لگا اور میں نے اس روز سے سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔ ان دنوں پان بھی کھاتا تھا اور اس میں مراد آبادی تمباکو کھاتا تھا۔ سگریٹ پینا چھوڑا تو تمباکو کو کھانا بھی چھوڑ دیا اور پان بھی۔

اس انتشار کے زمانے کی بات ہے ایک روز پٹ وردھن میرے پاس آئے اور کہا
"رات کو یہاں نہ رہنا کہیں اور چلے جاؤ۔"
"کیوں"؟ میں نے پوچھا۔
"آر ایس ایس کے لڑکے شام گاڑیوں میں بیٹھ کر اس گھر کے چکر لگا رہے تھے۔ خطرہ ہے"
"اور تم"؟ میں نے پٹ وردھن سے پوچھا۔
"میں یہیں ہوں" اس نے جواب دیا۔
"جب تک تم میرے پڑوسی ہو میں بھی گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا"
کہنے کو یہ سب میں نے کہہ تو دیا مگر رات بھر نیند نہیں آئی۔ رات کا بیشتر حصہ برآمدے میں کھڑے کھڑے گزرا۔ مگر کوئی نہیں آیا۔ پٹ وردھن سے میرے بہت اچھے مراسم تھے۔ مسز پٹ وردھن اکثر میرے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ ان کے یہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ مراٹھی کے سوا کوئی دوسری زبان بھی نہیں جانتی تھیں مگر ہم "یس" اور "نو" سے کام چلا لیتے تھے۔ ایک روز میں کسی کام سے اوپر پٹ وردھن کے یہاں گیا۔ کمرہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ میں ذرا سا دھکا دیا تو کھل گیا۔ مسز پٹ وردھن کسی کے ساتھ بستر میں تھیں۔ میں واپس آگیا۔ اسٹوڈیو میں کچھ پڑھے لکھے مراٹھوں سے بات کی تو انہوں نے بتایا مہاراشٹرا میں "نیوگ" آج بھی رائج ہے۔ بچہ نہ ہوا ہو یا نہ ہوتا ہو تو شوہر کے سوا اور کسی سے بھی لے سکتے ہیں۔ میں نے کبھی اس بات کی تحقیق نہیں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

انہیں دنوں کی بات ہے گرمی بہت تھی۔ میں اسٹوڈیو سے جلدی آگیا۔ کھانا کھایا اور دھوتی بنیان پہن کر لیٹ گیا۔ اکیلا ہی تھا۔ میں نے بنیان بھی اتار دیا اور پھر لیٹنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ایسے ہی ننگے بدن اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک لڑکا کھڑا تھا۔ کتابیں ہاتھ میں تھیں۔ شاید یس پی کالج کا طالب علم تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا۔
"یہاں آپ رہتے ہیں"؟ اس نے کچھ ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔
"ہاں" میں نے جواب دیا۔
سنا ہے اس گھر میں بھوت ہے"۔
"کھڑا ہوں تمہارے سامنے" مجھے شرارت سوجھی۔ وہ ایسا سٹپٹایا کہ فوراً ہی بھاگ کھڑا ہوا اور جب تک میں اسے دیکھتا رہا وہ بھاگا ہی چلا جا رہا تھا۔ بعد میں کسی نے مجھے بتایا اس گھر کے بارے میں اکثر کہا جاتا تھا کہ وہاں بھوت ہے۔

میں ان دنوں ڈائری لکھا کرتا تھا مگر تسلسل کے ساتھ نہیں۔ کہیں کہیں سے نقل کرتا ہوں۔ مراد اپنی اس وقت کی زندگی کا مختصر ساخاکہ پیش کرنا ہے۔ جن واقعات کو میں یہاں نقل کر رہا ہوں وہ اسی طرح بیان ہوئے ہیں جس طرح مجھ سے صاحب واقعہ نے بیان کئے تھے۔ غلط ہیں یا درست اس کی تحقیق میں نے نہیں کی۔

۹ / مارچ ۴۶ء کی تاریخ میں لکھا ہے "آج سر آغا خاں کو ہیروں میں تولا گیا۔" ہندوستان میں قحط پڑنے والا ہے۔ انگریزوں کے خلاف ہر جگہ مظاہرے ہو رہے ہیں۔ جشن فتح کے موقعے پر لاہور کے اسکولوں اور بنکوں کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔"

۱۵ / مارچ ۴۶ء کی تاریخوں میں گاندھی جی کا بیان تھا "آزادی کی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے کو سمجھنے کی کوشش بھی کریں"۔

اس کے نیچے کی سطروں میں ہے: "بے بی کا نتیجہ نکل آیا وہ پاس ہو گئی۔ اس خوشی میں مٹھائی لے کر آئی تھی"

میرے پڑوس میں ایک مرانٹھا خاندان تھا۔ ان کے یہاں چھوٹی لڑکی کو بے بی کہہ کر بلاتے تھے۔ مجھ سے ان کا بہت خلا ملا تھا نیچے کی سطر میں لکھا تھا "ایک مدت بعد سنہہ پربھا پردھان سے ملاقات ہوئی۔ جب میں شالیمار سے متعلق ہوا تھا اس وقت تعارف ہوا تھا۔ شاہد لطیف کی فلم "شکایت" میں کام کر رہی ہے۔ آج "شکایت" کی مہورت میں مل گئی۔ پوچھ رہی تھی آپ نے گھر آنا کیوں چھوڑ دیا۔ دو بار پہلے بھی کھانے پر بلا چکی ہے۔ عام طور پر میں اس سے بچتا ہوں۔ طبعیت کی بہت چھوٹی ہے۔"

بعد کی سطروں میں لکھا ہے: "شالیمار پکچرس کی حالت دگر گوں ہے۔ زیڈ احمد روپے کے لیے پریشان نظر آتے ہیں۔ اسٹاف کی تنخواہیں بھی نہیں ملیں۔" نیچے کی سطروں میں جوش صاحب سے ملاقات کا ذکر ہے۔

"جوش صاحب سے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بغیر پیے بہت مزے دار باتیں کرتے ہیں۔ پی کر ان کی انا کبھی کبھی ابھر آتی ہے۔ حیدر آباد میں نظام کے ملازم رہ چکے ہیں۔ نظام دکن کی عادات و فضائل کا ذکر کر رہے تھے۔ انہیں انگریزوں سے نفرت ہے۔ ان کے قصے سناتے رہے۔ کمرے کی صفائی کرتے وقت خادم یا خاکروب کی جیب سے ایک روپیہ بھی زمین پر گر جائے تو اسے باہر نکال دیتے تھے اور روپیہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ کوئی درباری مرجائے تو پرسہ دینے سب سے پہلے پہنچ جاتے تھے اور اس کے بدن یا انگلی پر جو سونا یا ہیرا ہوتا تھا اتار لیتے تھے۔ نواب سالار جنگ نظام کے بعد دکن کے سب سے متمول شخص تھے۔ نظام نے ان سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کی خواہش ظاہر کیے۔ مگر وہ نظام کی نیت سے واقف تھے انہوں معذرت کر دی:

"حضور میں تو عورت کے قابل ہی نہیں ہوں"۔ اس ڈائری کی آخری سطریں ہیں "مجھے

اور نجم نقوی کو راماننند ساگر نے شام کے کھانے پر مدعو کیا۔ ان کے والد آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنا مقصود تھا۔"

۲۶ / مارچ ۴۶۔ "ہماری زندگیاں یونہی کوئی بڑا مقصد سامنے رکھے بغیر کٹ جاتی ہیں۔ اس پر بھی ہم درازی عمر کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ اس دوران نجم نقوی کے ساتھ موٹر سے بمبئی گیا اور آیا۔ بمبئی میں احمد عباس اور عصمت چغتائی سے ملاقات ہوئی۔ عصمت سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ شام کی چائے احمد عباس کے ساتھ پی۔ وہ نجم نقوی کے عزیزوں میں ہیں۔ بمبئی میں مدھوسودن کے پاس ٹھہرا۔"

"آج اسٹوڈیو سے واپس آتے وقت ثریا میرے ساتھ آگئی۔ یہ لڑکی تیواری کے ساتھ رہتی ہے۔ اچھی میٹھی سی لڑکی ہے۔ میں نے بچو سے کباب چائے بنائے۔ اس بیچ میری پڑوسن اندومتی بھی آگئیں۔ میں نے ثریا سے تعارف کرایا۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بے بی اور اندومتی کی ایک عزیز گلاب بھی آگئیں۔ سب نے مل کر چائے پی۔ بہت دیر تک ہنستے ہنساتے رہے۔"

۲۲ / مارچ ۴۶۔ "کل ہم دیر تک مصروف تھے۔ ہولی کا دن تھا۔ شام کے ہاں ہولی کھیلی وہاں ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ نام زیبا تھا۔ اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔ لڑکی کیا عورت ہے۔ فلموں میں کام ڈھونڈنے آئی ہے۔ ہولی کا اختتام نجم نقوی کے مکان پر ہوا۔ چلتے وقت شاہد لطیف نے کہا رات کو شام کے ہاں بیٹھیں گے۔ گپ کریں گے۔"

شام کو گیا۔ وہاں زیبا بھی تھی۔ اس نے ترنم سے کئی غزلیں پڑھیں۔ اچھا وقت گزرا۔

۲۳ / مارچ ۴۶۔ ۱۱ / بجے کے قریب صبح ادیب اپنی بیٹی اور سالی کے ساتھ آگئے۔ یہ بریلی کے رہنے والے ہیں اور یہاں گولہ بارود بنانے کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ انہی کے ساتھ دو تین لڑکے اور آئے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھتے اور باتیں کرتے ہیں۔ اچھے سلجھے ہوئے لڑکے ہیں۔ مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔ شام کو گھومنے کے لئے نکلا اور سفر امپیریل ہوٹل پر ختم ہوگیا۔ شاہد لطیف مل گئے وہ ہوٹل ہی میں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ابراہیم بھی تھا۔ وہ فتح پوری اسکول میں میرے ساتھ تھا۔ شام راولپنڈی گیا ہوا ہے۔ وہ اس کا وطن ہے۔ شاہد لطیف نے زیبا کا ذکر چھیڑ دیا۔ اتنے میں وہ آگئی اور غزلیں سنانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کا ترنم بھی اچھا تھا۔

۱۴ / اپریل ۴۶۔ آج اسٹوڈیو سے آتے وقت کچھ دیر کے لئے جوش صاحب کے یہاں بیٹھ گیا۔ اپنے خاندان کے حالات اور بزرگوں کے قصے سنانے میں انہیں فخر و مباحات ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنا سنہ پیدائش ۱۸۹۸ء بتایا تھا۔ ان کے دادا کے ایک سو بارہ لڑکے تھے۔ چار منکوحہ بیویاں تھیں۔ باقی کنیزیں۔ باندیاں اور ادھر ادھر کی عورتیں۔

جوش کا بیان ہے کہ ان کے دادا اپنی اولاد کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ وجہ؟ کثرت اولاد۔

تیس بتیس بیویوں میں سے کسی کا بچہ ان کے پاس آنے سے انکار کر دیتا تھا یا انہیں نہیں پہچان سکتا تھا تو اس زور سے طمانچہ مارتے تھے کہ بچے کا دم نکل جاتا تھا۔ کئی ایسے واقعات ہونے کے بعد ان کی داشتہ عورتیں اپنے بچے ان کے سامنے لاتے ہوئے گھبرانے لگی تھیں۔ اگر کبھی سامنا ہو جاتا اور وہ پوچھتے تھے "یہ بچہ کس کا ہے تو "میاں آپ کا ہے" کہہ کر بھاگ کھڑی ہوتی تھیں۔ اور بدحواسی میں بھاگتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں "میاں آپ کا ہے"، "میاں آپ کا ہے"، "میاں آپ کا ہے"۔ ایک مرتبہ ان کے چھوٹے لڑکے نے ان کے بارے میں کہہ دیا تھا "میاں تو لکھنو کے نوابوں کی چال چلتے ہیں"۔ کیونکہ وہ ذرا سست گام تھے اور تیز چلنے کو بدتمیزی میں شمار کرتے تھے جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ ان کے لڑکے نے ان کے بارے میں ایسی رائے کا اظہار کیا تو تلوار لے کر اس کے گھر پہنچ گئے اور راستے میں جو کتا بلی آیا اسے مارتے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لکھنو کے نوابوں کو نامرد تصور کرتے تھے۔ "جوش اپنے بارے میں کہہ رہے تھے کہ ایک مرتبہ وہ گاؤں کے کنویں پر کسی کو مار رہے تھے۔ دادا نے جب دیکھا تو گھر بلوا کر انہیں ہار پھول پہنائے اور مٹھائی بانٹی اور جوش کے والد سے کہا یہ لڑکا بہت دلیر ہوگا اس لئے کہ اس کے انداز میں پیٹتے وقت بزدلی شامل نہیں تھی۔"

اپنے کسی نوجوان عزیز کے متعلق بات کر رہے تھے کہ انہوں نے ناخن کٹواتے ہوئے ایک بار "سی ای ای" کی اس پر باپ نے اسے "نامرد" جیسے خوبصورت لفظ سے یاد کیا اور بیٹے نے اپنی بہادری کا ثبوت دینے کے لئے اپنے تمام ناخن پتھر سے کچلوا کر باپ کے پاس بھیج دیئے۔ "[1]
جوش پیدائشی شیعہ نہیں تھے۔ کچھ لکھنو کے ماحول اور اثر اور کچھ شیعہ لڑکیوں کی محبت میں شیعت اختیار کرلی۔ جب باپ کو معلوم ہوا تو انہوں نے عاق کر دیا۔ لیکن انہوں نے شیعت کو ترک نہیں کیا۔ آخر باپ نے محبت سے مجبور ہو کر بیٹے کو معاف کر دیا اور اپنی جائیداد کا حق دار قرار دیا۔ " ۱۵/ اپریل ۴۶۔

" ۱۵/ اپریل کے بعد ڈائری کو آج ہاتھ لگایا ہے۔ ہم ایسے لوگوں کی زندگی میں ایسا ہوتا بھی کیا ہے جسے باقاعدہ قلمبند کیا جائے؟۔

آج نجمین نام کی ایک لڑکی آئی تھی۔ سانولا رنگ ہے مگر دیکھنے میں اچھی لگتی ہے۔ فلم میں کام کرنے کا شوق ہے مگر زبان نہیں جانتی۔ کہتی تھی آپ زبان سکھا دیجئے۔ میں نے کہا۔ آیا کرو وقت ملے گا تو تمہاری مدد کر دوں گا۔ شلندر نام کی بھی ایک لڑکی آئی تھی۔ مہاراشٹرین ہے۔ اچھی شراب کا شوق ہے۔ شنکر روڈ پر ایک صاحب رہتے ہیں۔ کسی چھوٹی موٹی ریاست کے نواب ہیں۔ گجراتی میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ملی تھی۔ میری شاعری سننے آئی تھی۔ میں نے کہا بیٹھو۔ باتیں کرو شاعری رہنے دو۔ " ۱۰/ مئی ۴۶

" آج دوپہر کو زہرہ آ گئی تھی۔ بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ شام کے ساتھ رہتی ہے۔

بمبئی کے کسی فلم میں ہیروئن رہ چکی ہے۔ یہاں پونا میں ابھی اسے کوئی کام نہیں ملا۔ میں نے زیڈ احمد سے اس کی سفارش کی تھی۔ وہ پندرہ سو روپے مہینہ پر رکھنے کو تیار ہے مگر وہ آمادہ نہیں ہوئی۔ شاید پندرہ سو روپیہ اس کی نظر میں بہت کم تھا۔

نجم نقوی بمبئی چلے گئے۔ وہاں فلمستان کے لئے کوئی فلم بنا رہے ہیں۔ مجھ سے کہہ کر گئے تھے تمہیں بمبئی بلالوں گا مگر ابھی تک کچھ ہوا نہیں۔ کچھ کرنے کی جی نہیں چاہتا۔ "تاریک سیارہ" کا دیباچہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ بھی نہیں لکھا گیا۔ نظم کہنا چاہتا ہوں وہ بھی نہیں ہو رہی۔ معلوم ہوتا ہے سارے سوتے بند ہو گئے ہیں۔"

"اندومتی سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ہم سامنے مخانہ کے لان میں جاکر بیٹھ جاتے ہیں اور ایسے ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں۔ ۱۱/ مئی ۴۶ء

"آج خورشید اور سلمہ ایک مہینے کے لئے علی گڑھ چلے گئے۔ میں ان کے خالی کمرے میں گیا اور بہت دیر تک کھڑا ننگے کمرے کو دیکھتا رہا۔ آدمی جگہ چھوڑتا ہے تو اپنے پیچھے کتنا بڑا گھاؤ چھوڑ جاتا ہے جسے عرف عام میں خلا کہتے ہیں۔ حالانکہ خورشید اور سلمہ کی وجہ سے مجھے کافی پریشانی ہوئی۔ میری آزادی بڑی حد تک سلب ہو گئی تھی پھر بھی مجھے ان کے جانے سے زندگی میں کمی کا احساس ہوا۔ ۱۵/ جولائی ۴۶ء

میں کئی روز کی علالت کے بعد آج کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔ بہت دیر تک سامنے کے لان میں ٹہلتا رہا۔ میرے گھر کے سامنے والی پہاڑی پر ایک مندر ہے جسے یہاں والے پاربتی کا مندر کہتے ہیں۔ اسے مرہٹہ پیشواؤں نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں مندر میں بہت بیش قیمت جواہرات اب تک محفوظ ہیں۔ کل وہاں ایک میلہ تھا۔ مشہور ہے کہ میرے مکان سے لے کر مندر تک کسی زمانے میں ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ اس کی یادگار ایک بہت بڑا گڈھا اب بھی موجود ہے جسے مہاراشٹرا کلب والے بڑی تیزی سے پاٹ رہے ہیں۔ اب یہ جگہ ان کے پاس ہے۔

۱۴۔ نومبر سے ۱۲/ جنوری تک کچھ لکھنے کو جی نہیں چاہا۔ ذہن پراگندہ رہا۔ شالیمار کی مالی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ میراجی ابھی تک میرے پاس ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں کا مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ ناشر نہیں ملتا۔ نور الحق کے امتحان ختم ہو گئے وہ واپس حیدرآباد جا رہے ہیں۔ میراجی کا خیال ہے شاید حیدرآباد میں ناشر مل جائے۔ میں اور وہ دونوں نور الحق کے ساتھ حیدرآباد جا رہے ہیں۔ حیدرآباد میں ہم نور الحق کے یہاں ٹھہرے۔ ان کے والد سے مل کر جی خوش ہوا۔ بڑے زندہ دل اور خوش باش آدمی ہیں۔ حیدرآباد میں اچانک آفتاب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے ساتھ بیڑ لے گیا۔ بیڑ سے ہم اس کے ساتھ اجنتا گئے۔ تکلیف دہ سفر تھا۔ بیڑ سے احمد نگر تک کا سفر موٹر اور بس میں کیا۔ محنت کش طبقے کی عورتوں میں اکثر ایسی تھیں جنہیں خوش شکل کہا جا سکتا تھا میرے خیال میں یہی وہ عورتیں یا ان کی اولادیں ہیں جن کے نقوش اجنتا کے غاروں کی

تصویروں میں ملتے ہیں۔ اس سفر میں سب سے فضول آدمی حکیم ظہیرالدین ملے جن کے مکان پر ہم ایک رات اورنگ آباد میں ٹھہرے تھے۔ جس فن یا شعبے کی بات کرو وہ اس کے ماہر تھے۔ ۱۳ فروری ۴۶ء

یہ اکیس جنوری ۴۷ء کی رات ہے۔ آفتاب پیڑ سے آیا ہوا ہے۔ شاہد لطیف اور ان کا بھانجا اطہر بھی میرے پاس ہے۔ شاہد بمبئی گیا ہے اور اطہر سو گیا ہے۔ آفتاب سو گیا ہے اور میرے کمرے میں ہے۔ اب رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔

نورالحق پریشان ہو گا۔ وہ میراجی اور محمد حسین کے ساتھ دوسرے کمرے میں ہے۔ میراجی اور محمد حسین دونوں پیے جا رہے ہیں اور کبھی روتے ہیں کبھی ہنستے ہیں۔ میراجی ہر وقت ہاتھوں میں دو گولے رکھتے ہیں اور مالا جپنے رہتے ہیں۔ ۲۱ / جنوری ۴۷ء

"میں پچھلے دنوں بمبئی گیا تھا۔ نجم نقوی نے ڈیوڈ سے کہا مجھے بمبئی بلانا ہے۔ پروتما داس گپتا فلموں کی مشہور ہیروئن بھی ہے اور فلم پروڈیوسر بھی۔ وہ ایک فلم بنا رہی ہے۔ "جھرنا" فلم کا نام ہے۔ لکھنے کے لئے مجھے بلایا۔ بیگم پارہ اور پروتما دونوں ساتھ رہتی ہیں۔ میں ملا اور ان سے فلم لکھنے کا معاہدہ ہو گیا۔ ایک دو روز کے لئے پونا جاؤں گا۔ میراجی ابھی وہیں ہیں۔ اب میں شاید مستقل طور پر بمبئی آجاؤں۔

کرشن چندر سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ ثمینہ کو ہیروئن بنا کر کوئی فلم بنا رہا ہے۔ "راکھ" نام رکھا ہے۔

پچھلے دنوں سرن دلی سے آئے تھے۔ میں نے انہیں زیڈ احمد سے ملوایا اور احمد نے انہیں شالیمار میں آجانے کی دعوت دی۔ سرن پھر آنے کا وعدہ کر کے واپس چلے گئے۔

میں واپس بمبئی جانے کی تیاری میں تھا کہ ایک صاحبزادے سامان سمیت آگئے۔ میں انہیں ایک دو بار دیکھ چکا تھا۔ زیبا کے بھائی ہیں۔ میں نے ان سے کہا اپنے آنے کی خبر تو دیتے۔ میں تو بمبئی جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا ایک روز کے لئے آیا ہوں آپ سے کام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد کہنے لگے میں زیبا کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

"کیسا پیغام"؟ کہا "آپ ان سے شادی کر لیجئے۔"

زیبا اچھی عورت تھی مگر اس سے شادی کا خیال تو میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ میرے ڈھب کی عورت ہی نہیں تھی۔ اچھی دوست تھی مگر بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے علاوہ شادی تو میری طے ہو گئی تھی۔ سلطانہ کے ساتھ۔ میں نے ان سے کہا میں بمبئی آؤں گا تو زیبا سے ملوں گا۔ آپ آرام کیجئے میں ذرا اسٹوڈیو کا ایک چکر لگا آؤں۔ اگلے روز ان کو رخصت کر کے میں بمبئی چلا گیا۔ ۲۶ / مارچ ۴۷ء

آج کئی روز بعد بمبئی سے پلٹا ہوں۔ میراجی واپس بمبئی چلے گئے۔ وہ عام طور پر موہن

ہنگل اور ملک کے ساتھ ٹھہرتے ہیں۔ بمبئی میں ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ پروتما کی کہانی پر کام کرتا رہا۔ بالکل وقت نہیں ملا۔ دو چار روز بعد پھر جاؤں گا تو ان سے ملوں گا۔ میں مدھو سودن کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ موہن ہنگل کا مکان اس کے گھر کے نزدیک ہی ہے۔

پروتما کی کہانی پر کام کرتے کرتے دن نکل جاتا ہے۔ ایک روز پوچھنے لگی "تم پیتے ہو"؟ "کبھی کبھی" میں نے کہا۔ وہ ہنسنے لگی۔ "روز میں کیا حرج ہے؟" میں نے خیام کی رباعیوں کا حوالہ دیا جس کا مطلب تھا کبھی کبھی پیو، ہنس کے پیو اور خوبصورت لوگوں کے ساتھ پیو" اس نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔

"ہم خوبصورت تو ہیں"

"ہاں۔ اور ہنستی بھی رہتی ہو اس لئے ساتھ دے دوں گا۔"

وہ اندر سے بہت اچھی شراب لے کر آئی۔

اس کا باپ کسی ریاست کا دیوان تھا۔ انگریزی اور بنگالی شاعروں سے بڑی دلچسپی ہے۔ چل نکلتی ہے تو بہت مزے کی باتیں کرتی ہیں۔ اپنے شباب اور اپنے چاہنے والوں کا ذکر بہت ہنس ہنس کر کرتی ہے۔ ان میں سے ایک ابھی تک یاد آتا ہے۔ موسیقی میں قاضی نذر الاسلام کی شاگرد رہ چکی ہے۔ کچھ دن شانتی نکیتن بھی رہی ہے۔

"گرودیو کو خوبصورتی بہت پسند تھی۔" ایک روز کہہ رہی تھی۔

"ہر فنکار کو ہوتی ہے" میں نے کہا۔

اپنے شوہر کے بہت خلاف تھی۔ کہہ رہی تھی جسم کے سوا اس کی اور کوئی دلچسپی نہیں تھی تنگ آکر اس نے طلاق لے لی۔ ازدواجی زندگی مشکل سے چار پانچ برس نبھا پائی۔ گپ کرتے کرتے اور شغل کرتے کرتے کافی رات ہو گئی۔ میں نے کہا "میں ابھی بمبئی سے پوری طرح واقف نہیں۔ کوئی سواری ملے گی؟" اس نے اپنی گاڑی میں گھر پہنچایا اس کا گھر مدھو سودن کے گھر سے بہت دور نہیں۔ وہ ورلی پر رہتی ہے۔ سمندر کے کنارے!

پروتما اور بیگم پارہ سے اچھی خاصی نبھ رہی ہے۔ ہمارے درمیان اب تکلفات اور رسمی رویہ حائل نہیں رہا۔ ایک دوسرے سے بے تکلف دوستوں کی طرح ملتے ہیں۔ پارہ اور پروتما کے مزاجوں میں بڑا فرق ہے۔ پارہ بہت کھلنڈری اور زندگی سے بھرپور ہے۔ پروتما سنجیدہ اور پریشان حال۔

میں نے پچھلے دنوں آئیزاڈوراڈنکن کی سوانح پڑھی۔ میں نے پروتما کو مشورہ دیا وہ اپنی سوانح لکھے اچھی مزیدار ہو گی اور ڈنکن کی سوانح کی طرح اس کی سوانح کی بھی بہت اہمیت ہو گی۔ اس بات کو سامنے رکھ کر میں اکثر اس سے اس کے ماضی کے بارے میں استفسار کیا کرتا تھا۔

ایک شام ہم دونوں بیٹھے شغل کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں، امرد پرستی اور عورتوں

میں،ہم جنسی کا موضوع نکل آیا۔ پروتما کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے ہاں،ہم جنسی کا رجحان ہے۔ میں نے دبی زبان میں اس کی طرف اشارہ کیا اور وہ بے تکلفی کے ساتھ بات کرنے لگی۔ پروتما صاف گو بہت تھی۔ ہم دونوں کی دوستی کا بڑا سبب ہی یہ تھا کہ ہم بے جھجک بالغ انسانوں کی طرح بات کر سکتے تھے۔ اپنی شادی کے سلسلے میں بتانے لگی کہ اپنے شوہر سے وہ کلکتہ میں ملی تھی اس وقت بیگم پارہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہاں اس نے اسے پہلے منگنی کے بہانے مسلمان کیا مگر وہ منگنی نہیں تھی نکاح تھا جس کا پروتما کو بالکل علم نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ بمبئی آگئی۔ اس کا شوہر بھی آگیا اور اس نے پروتما کو بتایا وہ منگنی نہیں تھی نکاح تھا اور اس پر اپنے شوہر ہونے کا حق جتایا۔ مگر پروتما نے اس کو شادی تسلیم نہیں کیا اور دوسری شادی کرلی۔ ان دنوں وہ ایک فلم "کنوارا باپ" میں کام کر رہی تھی۔ ہیروئن تھی اس فلم کی۔

اپنی ہم جنسی کے بارے میں اس نے ایک واقعہ بیان کیا۔ وہ کسی کام سے غالباً فلم شوٹنگ کے سلسلے میں دلی جارہی تھی۔ راستے میں اس کی ہم سفر ایک ترک عورت ہوگئی۔ وہ عورت پہلے پروتما سے بے تکلف ہوئی۔ اس کے بعد اسے شراب پلائی پھر غسل کرایا پھر اس کے ساتھ ہم بستری کی۔ پروتما مفعول تھی اور وہ فاعل۔ میں نے کہا میری معلومات کے لئے بتانا لڑکیاں یہ سب کیسے کرتی ہیں۔ وہ ٹال گئی۔ کہا پھر کبھی بتاؤنگی۔ ۲/ جون ۷۴ء

بمبئی سے واپس آیا تو دیکھا گھر میں راجکمار بیدی اپنی والدہ اور والد، بہن وغیرہ کے ساتھ براجمان ہیں۔ کہنے لگے تھوڑے دن کے لئے ان لوگوں کو لے آیا۔ چلا جاؤں گا۔ میں خاموش ہوگیا میری زندگی کا تو ڈھرّہ ہی یہ تھا۔ جسے کہیں جگہ نہیں ملتی تھی میرے گھر آجاتا تھا۔ سلمہ صدیقی اور خورشید منیر رہے۔ ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر جسے شالیمار میں ملازمت مل گئی تھی اپنی بہن کے ساتھ رہتا رہا۔ نور الحق واڈیا۔ یہیں رہتے رہے میرے پاس حالانکہ متمول باپ کے بیٹے ہیں۔ میرا جی رہے ایک مرتبہ ایک صاحبزادے فرمانے لگے۔ "شام کو گھر دیر سے آیئے۔ میں اپنی دوست کو یہاں لے کر آنا چاہتا ہوں"!

پچو چلا گیا ہے۔ یعقوب اس کی جگہ آیا ہے۔ اس نے خط لاکر دیا۔ دلی سے آیا تھا سلطانہ کی بڑی بہن امجدی بیگم کا۔ اس میں دلی کی فضا اور حمیدہ عارف کا ذکر تھا۔ امجدی اور عارف ایک ہی سکول میں پڑھاتی تھیں۔ امجدی ڈرائنگ سکھاتی تھیں۔ عارف سلطانہ کی استانی بھی رہ چکی تھیں۔ امجدی نے ایک ضیافت کی تھی، شادی کی خوشی میں، اس میں عارف کو بلوایا تھا۔ عارف نے رخصت ہوتے وقت کہا سلطانہ بہت اچھی لڑکی ہے تمہیں خوش رکھے گی۔ امجدی نے لکھا تھا جب عارف کو شادی کی اطلاع ملی تو وہ بہت دیر تک خلا میں گھورتی رہی۔ یہ ان کا گمان بھی ہوسکتا ہے اور سچ بھی۔ جن دنوں میں کالج میں تھا لڑکے لڑکیاں جو قریب تھے اکثر میری اور عارف ہی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں عارف کے ساتھ وہ قربت نہیں محسوس کر سکا جو سلطانہ کے ساتھ ہوئی۔

دلی کی فضا کے بارے میں لکھا ہے۔ "رات بھر سو نہیں سکتے۔ ہر طرف سے اندھیرے میں، ہر ہر مہادیو، اور، اللہ اکبر، کے نعروں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔

جب سلطانہ سے میری ملاقات ہوئی تھی ان دنوں یہ لوگ چیلوں کے کوچے میں دریا گنج میں رہتے تھے۔ بعد میں مجاہد علی کے کوارٹر میں جو میونسپل میموریل روڈ پہاڑ گنج میں تھا، چلے گئے تھے۔" ۳/ جون ۴۷ء

کبھی کبھی سوچتا ہوں، ہم بھی نباتات، جمادات یا حیوانات کی طرح ہوتے تو کیا اچھا ہوتا۔ احساس نعمت بھی ہے اور عذاب بھی۔

ان دنوں پھر روپے کی طرف سے پریشان ہوں۔ شالیمار کی طرف گیارہ مہینے کی تنخواہ واجب الادا ہے اور اب وہاں دروازے پر تالا پڑا ہے۔ پرو تما کا کام بھی کر کے دے دیا اور باقی بھی ہو رہا ہے مگر پیسہ اس کے پاس بھی نہیں۔ جانے روپئے کو مجھ سے کیا بیر ہے۔ اپنا تو خیر کسی نہ کسی طرح کام چلتا ہی رہتا ہے مگر سلطانہ کی وجہ سے فکر مند ہوں۔ انہیں ان تنگیوں کی عادت نہیں ہوگی۔ کیوں ایسا کوئی کام نہ کر لیا کہ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا کچھ اثر ہی نہ ہوتا۔ ہر کام ضرورت کے وقت ہو جاتا میں مشین کے پرزے کی طرح اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔

سرن میرے ساتھ ایک فلم بنانے کو کہہ رہا تھا۔ وہ لندن جا کر بیٹھ گیا۔ پرو تما کے پاس پیسہ نہیں۔ نجم نقوی اپنے کام میں مصروف ہے اور میرے پاس دوسرے ذرائع نہیں۔ مگر میں جینے سے بد دل اس لئے نہیں ہوتا کہ حالات ہمیشہ بہتر سے بہتر ہی ہوتے چلے گئے ہیں۔ ایک زمانے میں پانچ روپئے کی ٹیوشن کر کے گزارہ کرتا تھا، ساغر نظامی کے یہاں پینتیس روپئے مہینے ملتے تھے، سپلائی کے محکمے میں پینسٹھ روپئے تنخواہ تھی۔ ریڈیو اسٹیشن پر پچھتر روپئے مہینے ملتے تھے۔ شالیمار میں ڈیڑھ سو مہینے پر ملازم ہوا تھا۔ اب بارہ سو مہینے ملتے ہیں۔ قدم تو پیچھے نہیں ہٹا۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟ ۲۷/ جون ۴۷ء

اب میں جن کا حوالہ دے رہا ہوں یہ اس ڈائری کے آخری صفحات ہیں۔ ان پر ۱۶/ جنوری ۴۹ء کی تاریخ پڑی ہے۔ اس دوران جو گزری اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ زیڈ احمد ہندوستان چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ گیتا نظامی، نظامی کو چھوڑ کر ویدی کے ساتھ چلی گئی اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ نظامی بھی لاہور چلا گیا۔ نو یگ میں ویدی ایک فلم کرہ ۹ بنا رہے تھے۔ گیتا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ میں اپنا مکان راجکمار بیدی کی نگرانی میں چھوڑ کر مدھو سودن کے پاس بمبئی آ گیا۔ کبیر ایک اخبار نویس تھے۔ اردو کا ایک روزنامہ "اقبال ڈیلی" کے نام سے نکالتے تھے۔ نجم نقوی ان کے لئے ایک فلم ڈائرکٹ کر رہے ہیں۔ میں وہ لکھ رہا ہوں۔ نجم نقوی ۲۲، ٹرنر روڈ باندرہ میں رہتے ہیں۔ ان کے برابر جو صاحب رہتے ہیں ان کا نام شیرازی ہے ایرانی ہیں۔ وہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جا رہے ہیں۔ میں ان کا مکان لینے کی کوشش کر رہا ہوں

وہ چار ہزار روپیہ مانگ رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد پتہ چلا سلطانہ کا گھر فسادیوں نے لوٹ لیا۔ وہ بمشکل تمام گھر سے بھاگے اور اپنی جان بچائی۔ سلطانہ آصف علی بیرسٹر کی بہن ہیں۔ وہ امریکہ میں سفیر کے عہدے پر ہیں۔ اتفاق سے وہ دلی آئے ہوئے تھے۔ کسی طرح ان لوگوں نے انہیں اطلاع دی اور فوج کی نگرانی میں یہ سب گھر کے لوگ پہلے پٹیل کے یہاں گئے اور پھر وہاں سے مولانا آزاد کے پاس چلے گئے۔ اس کے بعد آصف علی کے پرانے مکان میں جو چیلوں کے کوچے میں تھا وہاں جاکر ٹکے۔ مجھے پتہ چلا سب لوگ کراچی جارہے ہیں۔ امجدی بیگم سرن کی وجہ سے نہیں جانا چاہتی تھیں۔ میں نے انہیں لکھا سلطانہ کو بمبئی بھیج دو۔ میں اس لئے نہیں جاپایا کہ ملک میں بدامنی کے سبب سفر کرنا مشکل تھا۔ دوستوں نے جانے کا مشورہ نہیں دیا۔ ٹکٹ بھی نہیں مل رہے تھے۔ میں ابھی ماٹنگا والے مکان میں مدھوسودن کے ساتھ ہی تھا کہ سلطانہ آگئیں۔ سرن لے کر آئے تھے۔ وہ چھوٹا سا مکان تھا۔ دو کمرے، باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ۔ میں باورچی خانہ میں سوتا تھا۔ سلطانہ آئیں تو ان کے لئے بھی وہی کمرہ تھا۔ مگر کچھ دن بعد نجم نقوی کے برابر والا مکان مل گیا اور میں وہاں منتقل ہوگیا۔ چار ہزار روپئے شیرازی کو دیئے جس میں سے دو ہزار نجم سے مستعار لیے تھے اور مشق سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی شروع ہوگئی یعنی یہ کہ میں ازدواجی زندگی میں بندھ گیا۔

آپ کے مطالعے اور لائبریری کے لئے

اردو اکادمی، دہلی کی اہم مطبوعات

کتاب	مرتب / مصنف	قیمت
نیا اردو افسانہ تجزیہ و مباحث	مرتّب: پروفیسر گوپی چند نارنگ	۶۰/-
دلّی کے آثارِ قدیمہ	مصنّف: ڈاکٹر خلیق انجم	۴۰/-
مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین	مرتّب: ڈاکٹر اسلم پرویز	۳۰/-
کلّیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد اوّل)	مرتّب: سیّد مظفر حسین برنی	۱۲۵/-
کلّیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد دوم)	مرتّب: سیّد مظفر حسین برنی	۱۲۵/-
کلّیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد سوم)	مرتّب: سیّد مظفر حسین برنی	۲۰۰/-
واقعاتِ دارالحکومت دہلی (۳ جلدوں میں)	مرتّب: مولوی بشیر الدین احمد	۴۰۰/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ	مرتّب: پروفیسر قمر رئیس	۵۰/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم	مرتّب: ڈاکٹر عتیق اللہ	۵۰/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق	مرتّب: ڈاکٹر تنویر علوی	۳۰/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح	مرتّب: پروفیسر مظفر حنفی	۳۰/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	مرتّب: ڈاکٹر نصیر احمد خان	۴۵/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید	مرتّب: ڈاکٹر شارب ردولوی	۴۰/-
آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ	مرتّب: پروفیسر شمیم حنفی	۴۵/-
آثار الصنادید (تین جلدوں میں)	مصنّف: سر سیّد احمد خان مرتّب: ڈاکٹر خلیق انجم	۲۵۰/-
آدمی نامہ	مصنّف: پروفیسر مونس رضا	۴۰/-
اوراقِ معانی (غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ)	مترجم: ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۷۰/-
نمائندہ پنجابی افسانے	مرتّب: رتن سنگھ	۸۵/-

اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۲

فون: ۳۲۷۶۲۱۱

خطوط

آل احمد سرور کے نام

۱۔ رشید احمد صدیقی
۲۔ راجندر سنگھ بیدی
۳۔ عزیز احمد

ضمیر الدین احمد کے نام

۱۔ ممتاز شیریں
۲۔ مشفق خواجہ
۳۔ ثناء اللہ
۴۔ اے۔ ایچ۔ خان
۵۔ محمد عمر میمن
۶۔ بلراج مین را
۷۔ اسلم فرخی
۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی
۹۔ فراق گورکھپوری

اختر اورینوی

اور

ڈاکٹر شمیم افزا قمر کے نام

عزیز احمد

(پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے خطوط کی اشاعت پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ اصغر گونڈوی کو انھوں نے جو خط لکھے تھے وہ ان کے انتقال کے بعد اُن کے کاغذات میں سے نکال کر تلف کر دیے تھے۔ انتقال سے چند سال قبل انہوں نے اخبارات میں اس مضمون کا بیان بھی دیا تھا کہ ان کے خطوط شائع نہ کئے جائیں۔ رشید صاحب سے میرے بہت گہرے مراسم تھے اور ان سے ایک عرصۂ دراز تک خط و کتابت بھی رہی۔ میں نے ان کے خط محفوظ رکھے۔ مگر ان کی خواہش کے احترام میں انہیں شائع نہیں کیا۔ رشید صاحب کے انتقال کے بعد جب ان کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو گئے تو میں نے محسوس کیا کہ اب ان خطوں کو پردۂ خفا میں رکھنا غلط ہوگا۔ کیونکہ میرے نزدیک اگرچہ رشید صاحب کے ہر خط کی اہمیت ہے مگر ان خطوں کی اہمیت دوسرے خطوط کے مقابلے میں اس لئے زیادہ ہے کہ ان میں نہ صرف رشید صاحب کے اسلوبِ نگارش کے بہترین نمونے ملتے ہیں بلکہ حالات و واقعات اور معاصر شخصیتوں پر بے تکلف تبصرے بھی ہیں۔ رشید صاحب کا سب سے پہلا خط تلاشِ بسیار کے باوجود ابھی تک نہ مل سکا۔ یہ اُس وقت لکھا گیا تھا جب میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبا کی یونین کا نائب صدر منتخب ہوا تھا۔ رسم تنصیب کے دوسرے دن یہ خط آیا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا "اورنگ نشینی مبارک ہو"۔ بقدر دو گولوں کے میں بھی متمتع ہوا (اس زمانے میں تنصیب کے بعد گولے چھوڑے جاتے تھے) اس کے بعد ڈیوٹی سوسائٹی کے اس دفتر کا حوالہ دے کر جو یونین کی عمارت میں تھا دفتر کے لئے کچھ سہولت چاہی تھی۔ رشید صاحب نے خود لکھا ہے کہ "میں نے اپنے خطوط سے بہت کام نکالے ہیں" عموماً وہ چند فقرے اپنے مخصوص انداز میں مکتوب الیہ کو متوجہ اور مشتاق کرنے کے لئے لکھتے تھے۔ پھر انہیں کے الفاظ میں "خلاصۂ فریاد" ہوتا تھا۔ یہ خط ۱۹۳۴ء سے ۱۹۷۳ء تک کے ہیں اور ان کی تعداد ۲۱ ہے۔ خطوط کو یکجا کرنے، صاف کرنے اور ان پر حواشی لکھنے میں خاصا وقت صرف ہوا۔ بہرحال اب یہ سب خط رشید صاحب کی مکتوب نگاری کی خصوصیات کے ایک جائزے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہونے والے ہیں۔ "سوغات" میں یہ پانچ خط اس لئے شائع کئے جا رہے ہیں کہ قارئین کو رشید صاحب کے ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے۔ ان سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کیوں وہ اپنے ان خطوط کی اشاعت کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان میں بعض اشخاص اور واقعات پر جو بے ساختہ اور بے تکلف تبصرہ ہے وہ ان کے حقیقی خیالات و جذبات کا آئینہ دار ہے۔ ورنہ عام زندگی میں وہ خاصے محتاط تھے۔ یہ شانِ احتیاط "آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے" کے اندیشے اور "خوفِ فسادِ خلق" دونوں کی وجہ سے تھی۔ اپنے اسلوب کے لحاظ سے یہ خط اردو کے بہترین مکاتیب میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ سرور)

(۱)

نارلاج ۔ الموڑا ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

سرور صاحب! آج علی گڑھ کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ آپ کا تقرر ہو گیا۔ آپ کی قسمت تو ادھر کچھ عجیب "نصیب دشمناں" قسم کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب تو کسی دن بیٹھے بٹھائے یہ سن لینا ہے کہ آپ آئی سی ایس میں بھی آ گئے ہیں!!

خدا آپ کے والدین اور بیڈو میرس[۱] دونوں کو یہ خوشی مبارک کرے۔ جیب خرچ کتنا ملا۔ ایک پینشنر "والدین" کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ یہ رقم آپ کی ضروریات کے لئے کافی ہو گی یعنی آپ سال میں ایک بار پہاڑ پر آ جا سکیں گے۔ بدایوں کے پیڑے تقسیم کر سکیں گے۔ اور ... جیبوں کے خطوط کی ...[۲]۔ اب سوال صرف سہیل[۳] کا رہ جاتا ہے۔ آپ اور ہم ان باتوں کے علاوہ جواب تک کرتے آئے ہیں اور کیا کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری آپ کی منصوبہ آرائیاں" بہ اہتمام مقتدی خاں[۴]" کب جلوہ گر ہوں گی۔ اختر تلہری[۵] تو کہیئے کہ ان کے مضمون اور ڈاکٹر اشرف[۶] کے مضمون لیبن ازم کا منتظر ہوں۔

آپکا ۔ رشید صدیقی

(۲)

علی گڑھ ۔ ۱۸ جون ۱۹۳۸ء

سرور صاحب۔ آپ کا خط آیا۔ ان دنوں کسی معقول آدمی کے خط کا بڑا انتظار تھا۔ کیونکہ خط وکتابت بڑی کرنی پڑتی تھی اور جواب بھی بند ھے ہی ٹکے آتے تھے۔ گورکھپور[۱] سے لکھنؤ مرکز نقل کے ہٹنے سے بڑی خوشی ہوئی خربزے کے زمانے میں نہ جا سکے دسہری کا زمانہ کیوں گنوائیے۔

یہاں کا موسم بہت اچھا ہے یعنی بارش بالکل نہیں اور ہوائیں نہایت دل پذیر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیوی نہ ہو اور بیوی کے لطائف و ظرائف میسر۔

آپ کے علی گڑھ آنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے البتہ جی چاہتا ہے کہ آپ اتفاقیہ آ نکلتے تو گپ خوب رہتی۔ بشیر صاحب[۲] اور نیاز[۳] موجود ہیں۔ بشیر صاحب شاید کل چلے جائیں۔ نیاز کا ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر عبادالرحمن[۴] کو میں نے مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ذاکر صاحب المتخلص بہ وارڈھا[۵] کمیٹی دہرہ دون ہی میں تھے۔ میں نے جو خط لکھا تھا اس سے ان کو کوفت ہوئی اور سرخروئی بھی۔ اس سے آپ میرے بے ایمان اور ان کے بد مذاق ہونے کی داد دے سکتے ہیں۔ اقبال پر آپ نے تقریر پسند کی اس سے نفس موٹا ہوا۔ میں نے محنت سے لکھی تھی لیکن اس کے بارے میں معقول شخص کی رائے نہ سن پایا تھا۔ اب آپ نے معلوم کر لیا ہوگا

کہ میں نے خط کی ابتدا میں معقول سے کیا مراد رکھی تھی۔ اصغر[6] صاحب کی بھتیجی کے شوہر کا رام پور میں انتقال ہوگیا جسکے سبب سے وہ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ اختر[7] صاحب یہیں ہیں۔ خاں[8] صاحب بھی موجود ہیں۔ خلیل الرب[9] آئے ہوئے ہیں۔ پی۔ ٹی میں داخلہ چاہتے ہیں جو ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ غریب خلیل الرب! ریڈیو پر آپ کی تقریر کے لئے زور لگا رہا ہوں۔ مکان کا نام تجویز کیجئے۔

(۳)

یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۲۸ مئی سنہ ۵۱ء

سرور صاحب۔ آپ کا مفصل خط ملا۔ لفافہ دیکھتے ہی متحیر سا ہوگیا۔ اس لئے کہ ابھی آپ یہاں آئے تھے اور ہر مسئلے پر تھوڑی بہت گفتگو ہو چکی تھی۔ پڑھا تو صورت حال معلوم ہوئی۔ میں ۲۳ کو الٰہ آباد میں تھا ۲۴ کو واپس آ کر بے اختیار ذاکر صاحب کے یہاں پہنچا کہ لکھنؤ[1] کا حال سنوں۔ وہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور پہنچ کر دریافت حال کیا۔ ذاکر صاحب نے غیر معمولی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ انہیں جن کہے سب خبر تھی کیا کہیے۔ فرمایا کہ جو کچھ مطالبہ ہے وہ سب منظور ہے! ذاکر صاحب کے لہجے یا تیور میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اندازہ لگا سکتا کہ ان پر کسی طرح کا تغض یا مایوسی طاری ہے بلکہ اس کے برعکس معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس مہم سے لطف اٹھایا۔ اب آپ کے خط سے پوری تصویر سامنے آئی۔

تو سرور صاحب۔ آپ نے سمپور[2] نانند کی بد دماغی کا جو تذکرہ ذرا برہمی اور بیزاری سے کیا ہے اس سے مجھے تفریح ہوئی۔ آپ نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ آپ کو اتنا لحاظ تو کرنا چاہیے تھا کہ سمپور نانند یا اُن کے قبیلے کے لوگ کس سطح کے لوگ ہیں۔ RISING TO THE OCCASION بڑا مشکل کام ہے۔ کبھی یہ کرنے لگیں تو صدیوں کی ریاضت اور روایت جو افراد اور جماعت کی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے اور جو بڑی قوموں کا تہذیبی سرمایہ ہے اس کی کیا منزلت رہ جائے۔ قلب کی کشادگی اور نظر کی وسعت سمپورنانند میں کہاں سے آئے گی جو اتفاقات زمانہ کو اپنا سب سے بڑا سہارا اور سرمایہ سمجھتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ صوبہ کا وزیر ہونا ایسی منزلت ہے جو اُن کے ہر گھٹیا پن کی پردہ پوشی بانعم البدل ہے۔ اس غریب کو نہیں معلوم کہ قسمت کا کھیل آدمی کو بدلتا نہیں صرف بے نقاب کر دیتا ہے اور بے نقاب ہونے کی آزمائش معمولی آزمائش نہیں ہے۔ سمپورنانند کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی کہ انہوں نے ذاکر صاحب کی جو توہین کی وہ دراصل ایک انتقام تھا جو ذاکر صاحب کی بڑائی نے سمپورنانند کے گھٹیا پن سے لیا۔ بڑائی گھٹیا پن سے اسی طرح کا انتقام ازل سے لیتی آئی ہے۔ سمپورنانند کا رویہ آپ کو ناگوار

ہوا لیکن میں خوش ہوں کہ حسب معمول ذاکر صاحب نے پھر CORE کیا! سرور صاحب۔ آپ یقین مانیں کہ جس ہندو قوم میں مہاتما گاندھی اور جواہر لال رہے ہوں وہ قوم سمپورنانندوں سے جلد داغدار نہیں ہو سکتی۔ قوموں میں بعض اتنی بڑی ہستیاں گذری ہوتی ہیں کہ اس قوم کے سمپورنانند یا مولانا عبدالماجد[۳] جو تعداد او رمقدار میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اس قوم کی بڑائی کو معدوم نہیں کر سکتے۔

سرور صاحب۔ آپ مجھے سمپورنانندوں اور عبدالماجدوں میں نہ پھنسائیے۔ مجھے تو خدا کے سامنے گاندھی جی سے آنکھ ملانے کی تیاری میں مبتلا رہنے دیجیے۔ گاندھی جی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں حشر کے دن جب خدا مجھے بلا کر پوچھے گا کہ تیری قوم کے لئے گاندھی نے میرے نام پر جان دے دی تو نے میرے نام پر گاندھی کی قوم کے لئے کیا کیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اور تف ہے اس ہندوستانی مسلمان پر جس سے خدا یہ سوال کرے۔ تو سرور صاحب واقعہ تو یہ ہے لیکن میں ہوا، آپ ہوئے، پھر معمولی انسان ہیں۔ بے ہودگی دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ غضبناک ہوتے ہیں۔ صبر کیجیے اور ڈھارس پکڑئے۔ خود اپنوں میں سمپورنانندوں سے بھی زیادہ گھٹیا لوگ موجود ہیں۔ اپنوں سے نپٹ لیجئے دوسروں کو بعد میں دیکھیے گا۔ ان دنوں مولانا عبدالماجد علی گڑھ اور ذاکر صاحب کو جس طرح رسوا کر رہے ہیں اس نے مجھے اغیار کے ظلم وستم سے بے پروا کر دیا ہے۔ جب تک ذاکر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ جنگ میں اپنوں پر قابو پانا دوسروں پر قابو پانے سے بدرجہا دشوار تھا۔ دوسروں کے وار کا جواب وار سے دینا آسان ہے اور کھلا ہوا راستہ ہے۔ اپنوں کے وار کا جواب کاہے سے دوں! دشمن تو اکثر سامنے سے حملہ کرتا ہے اپنے تو بے خبری میں ریڑھ میں چھرا گھونپ دیتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی صحت کا استوار نہ ہونا اور میرا اپنی خانگی پریشانیوں سے بسا اوقات تقریباً بے جان ہو جانا ایسی باتیں ہیں جس (جن) سے کبھی کبھی طبیعت بڑی پریشان ہوتی ہے۔ کاش! ایسا نہ ہوتا پھر ذاکر صاحب کی قیادت میں یہ دکھانے کا مزا اٹھاتا کہ مسلمان مصائب میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو کس طرح کام میں لاتا ہے۔

مولانا ماجد سمجھتے ہیں کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ مسلمان کے دل میں ہندو کے خلاف اور ہندو کے دل میں مسلمان کے خلاف کینہ پیدا کرانا یا اس کی پرورش کرنا ادبی بدکرداری کے علاوہ وہ بڑی ادنیٰ درجہ کی خود پرستی ہے۔ اس زمانے میں علی گڑھ اور ذاکر صاحب کے خلاف ہر کارروائی

کو میں انتہا درجہ کا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ اس وقت ہندو ستانی مسلمانوں کی صحیح اور صالح قیادت صرف علی گڑھ کے محاذ سے ذاکر صاحب کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں ایسے شخص کو غدار سمجھتا ہوں جو اپنی بساط کے مطابق علی گڑھ کی مدد نہ کرے۔ اس کی مخالفت کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ سرور صاحب۔ آپ کو معلوم نہیں بظاہر جو ہمارے ساتھی معلوم ہوتے ہیں ان میں بھی غداروں کی کتنی بڑی تعداد ہے! آج سے پہلے مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ ہم میں واقعی جو بڑا آدمی ہوتا ہے اُسے کیسے کیسے مصائب جھیلنے پڑتے ہیں اور وہ کیسا وسیع النظر اور وسیع القلب ہوتا ہے کہ تلخ سے تلخ اور نجس سے نجس گھونٹ اتار لیتا ہے۔ ہندو مائتھالوجی میں نیل کنٹھ مہادیو کا قصہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ آج مرشد سے کہوں گا کہ میں کچھ دنوں کے لئے مرشد کا خطاب واپس لیتا ہوں اور نیل کنٹھ مہادیو کا پیش کرتا ہوں۔

آپ نے اردو کا انقلابی سیاست سے رشتہ جوڑنے کا جو سوال اٹھایا ہے اُس سے مجھے اختلاف کب ہے۔ آپ سے زیادہ اس بات کو اور کون جان سکتا ہے کہ یہ اردو کا رول رہا ہے۔ مجھے آپ سے جہاں اختلاف ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس کا قائل ہوں کہ اپنی ڈفلی پر اپنا ہی راگ موزوں ہوتا ہے یہ نہیں کہ ڈفلی اپنی راگ کسی دوسرے کا۔ رہا انقلابی سیاست سے رشتہ جوڑنے کا سوال میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔

بقول غالب ...... جو سر ہی پھوڑنا ٹھہرا۔ تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

سرور صاحب آپ کو تعجب ہوگا یہ خط پنسل سے کیوں لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ گرمی کے موسم میں قلم کی سیاہی بار بار خشک ہوتی ہے اور قلم کو بار بار سیاہی میں ڈبونا مجھے بہت کھلتا ہے۔ میرے لکھنے کا آسن کچھ ایسا ہوتا ہے کہ سیاہی کا ڈھلان آگے کے بجائے پیچھے کا ہوتا ہے اور اب تک کوئی ایسی چیز دریافت نہیں ہوئی جو کشش ارضی کے قانون کو بدل دے۔ قانون بدل نہ پایا تو میں نے قلم بدل دیا۔ پھر آپ جانتے ہیں پنسل کا ایک فائدہ یہ ہے کہ قلم سر نوشت کے سیدھے الٹے خط کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

کل ۲۷ کو کورٹ کی اسپیشل میٹنگ[۳۴] تھی جس میں یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کی تجاویز پیش ہوئیں جس کے خلاف مولانا ماجد صاحب نے تمام اردو اخبارات کو یونیورسٹی اور ذاکر صاحب پر لعن وطعن کی دعوت دے رکھی تھی۔ جلسہ دھواں دھار تقریروں سے شروع ہوا اور جیسا ذاکر صاحب کا طریقہ ہے انہوں نے دو ڈھائی گھنٹے تک کامل سکوت سے کام لیا اور جب دو تین بار دریافت کر لیا کہ کوئی اور صاحب کچھ فرمانا چاہتے ہیں یا نہیں اور مجمع میں کوئی صاحب آمادہ نہ ہوئے تو تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ۲۰ منٹ

کی تقریر کی ہو گی مجمع پر سناٹا طاری ہو گیا۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایسے دریدہ دہن اور آبرو باختہ جیسے کہ ڈاکٹر بیٹ[۵] ہیں جنہوں نے مجمع میں ٹرپونگ مچانے کی بار بار کوشش کی تھی اور بڑے ہی نا ملائم اور نجس الفاظ استعمال کئے تھے دم بخود ہو گئے اور دیر تک سر اٹھانے کی ہمت نہ کی اور جلد ہی اٹھ کر چل دیئے۔ میرا خیال ہے کہ علی گڑھ میں ذاکر صاحب نے اب تک ایسی معرکتہ الآرا تقریر نہ کی تھی۔ مشکل یہ ہے کہ میں پورے طور پر لطف اندوز بھی نہ ہو سکتا تھا اس لئے کہ جوں جوں تقریر کی گونج اور گرج یا TEMPO بڑھتا جاتا تھا میرا دل بیٹھتا جاتا تھا کہ خدا نہ کرے اس کا اثر ذاکر صاحب کے قلب پر پڑے اور لینے کے دینے پڑ جائیں اس لئے کہ آپ جانتے ہیں ڈاکٹروں نے تقریر کرنے کی سخت ممانعت کر رکھی ہے۔ تقریر کے دوران میں میری حالت وہی تھی جیسے میرا عزیز ترین دوست یا رشتہ دار ہوائی جہاز سے خطرناک ترین قلابازیاں ہزاروں فٹ بلندی پر دکھا رہا ہو اور میں تو دوست کی سلامتی کی دعا مانگ رہا تھا۔ اس کے کمالات سے کیوں کر لطف اندوز ہوتا۔ غرض یہ ایک یادگار جلسہ اور تقریر تھی۔ ایک لمحے کے لئے کہیں بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ فلاں لفظ یا فلاں فقرہ یا فلاں لہجہ زائد یا آرائشی تھا یا دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ کارآزمودہ، قابل اور ایماندار آدمی اپنے اوپر کتنا یقین رکھتا ہے اور اس کے یقین کا سیلاب کتنا بے پایاں و بے پناہ ہوتا ہے اس کا مظاہرہ ذاکر صاحب کی تقریر سے ہوا۔ ہر فقرہ اور جملہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا کہ اسی موقع اور اسی کام کے لئے وجود میں آیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ظہور کے لئے ذاکر صاحب کا منتظر تھا! پھر لطف یہ کہ بعد میں جو کچھ ترمیم یا اصلاح ہوئی اُسے سب نے ہنسی خوشی قبول کیا۔ نہ یہ کہ بیٹھے گھٹا کئے اور عابد صاحب کی طرح گھر جا کر استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا۔ آپ تو جانتے ہیں اس طرح کا استعفیٰ اس لئے ہوتا ہے کہ اپنے نفس کا احتساب نہیں کر سکتے دوسروں کی آبرو ریزی کا دل چاہتا ہے۔ اللہ کا نام لے کر شریفوں کو بدنام کرنا ہمارے ہاں ہمیشہ سے بڑی مقبول عادت رہی ہے۔

تو پھر جناب سرور صاحب۔ سمپورنانندوں اور عبدالماجدوں کا ماتم کرنا چھوڑیئے۔ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی۔ اپنی شرافت نفس اور اچھے اور بڑے کام کرنے کی اپنی صلاحیتوں اور حوصلوں پر بھروسہ کیجئے۔ اس کی خوشی دنیا کی تمام مکروہات پر غالب آئے گی۔ میری اس دراز نفسی کا بُرا نہ مانیے۔ اس کا شکرانہ ادا کیجئے کہ میں نے دراز دستی سے کام نہ لیا۔ دراز نفسی اور دراز دستی میں جو رعایت آپ کو ملے گی اُسے مولانا ماجد کا تعارف سمجھئے!! گو اسے بتانے کی ضرورت نہ تھی بالخصوص آپ کو۔ آپ کا۔ رشید صدیقی

(۴)

یونیورسٹی علی گڑھ ۔ ۹ اگست ۵۷ء

سرور صاحب ۔ کل آپ کا خط ملا ۔ جے پوری جوتا اچھا ہے اور اس سے اچھی بات یہ ہے کہ عنقا میں سے للعہ آپ بچا لائے اور سب سے اچھی بات آپ کے مشن(۱) کی کامیابی ہے ۔ آپ نے لکھا تھا کہ طبیعت کچھ یوں ہی سا ہے کیوں نہ ہوتی ۔ انفلوئنزا سے نجات پاتے ہی آپ نے کچھ اس طرح دوڑ دھوپ شروع کردی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا ۔ اپنے اور انفلوئنزا دونوں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں کبھی کبھی سوءِ ظن سے بھی کام لے لیا کیجیے ۔ خیر یہ تو ہوتا رہے گا۔(۲) آج کل ادھر آدھر یہ غلط خبر ذرا زیادہ پھیلنے لگ گئی ہے کہ آپ میرے شاگرد ہیں! اور لطف یہ ہے کہ جب آپ کو بُرا بنانا ہوتا ہے تو میری شاگردی کا واسطہ دیتے ہیں اور جب آپ کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بھول جاتے ہیں! آپ کی شرافت ہے کہ آپ اس غلط فہمی کی تردید نہیں کرتے ہیں ۔ اپنی بے غیرتی کو کیا کہوں کہ چپکا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے!

چپکے ہیں پر کو زہر بھی دے سکتے ہیں ۔ یاد رکھیے کبھی نہ کبھی کام آئے گا ۔ ڈرتا ہوں کہیں میرا وہ حال نہ ہو جو مولانا ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان کا ہوا یعنی جب معاملے نے طول کھینچا کہ فلاں مضامین اول الذکر کے نہیں ہیں بلکہ موخر الذکر کے ہیں جو الہلال میں اداریے کے طور پر شائع ہوتے ہیں تو مولانا نے کچھ اس طرح کی بات کہی: اچھا میرے بھائی ۔ میرا نہیں، انہیں کا سہی! ۔ تو پھر کچھ کیجیے ۔ مجھے واقعی تکلیف ہوتی ہے جب کوئی شخص یہ بات لکھتا ہے ۔

آپ کی رائے ہو تو میں قاضی عبدالودود(۳) صاحب سے کہوں کہ وہ تردید شائع کردیں ۔ "سوانحی حصے" تو انہیں کے سپرد ہیں ۔ آپ کے اور مسعود صاحب کے بارے میں گل پیٹرک(۴) کا جو ریمارک تھا وہ ذاکر صاحب نے مجھے لکھا اور میں نے آپ کو اسی خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میرے (ذاکر صاحب کے) پہلے مہمان مولانا ماجد ہوں گے ۔ پھر کہا کہ میرے (رشید صدیقی کے) حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی! اور ٹھیک لکھا ہے ۔ میرے حاشیۂ خیال کا اب یہی مصرف رہ گیا ہے! میں نے قمر رئیس(۵) کے لیے ڈین کو لکھ دیا ۔

پرسوں رات پڑوس کے ایک صاحب اپنے ریڈیو پر بآوازِ بلند سارے محلے کو پاکستان سے سوز خوانی سنوا رہے تھے ۔ فرماتے تھے سب کے داخلِ حسنات ہونے کے لیے یہ کیا تھا ۔ ان کو کیا کہوں کہ مجھ پر کیا گذر گئی ۔ بالکل نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ وہ اس طرح کی باتوں سے بہت اونچے ہو چکے ہیں ۔ اس کے آگے کچھ اور کہنا چاہتا

تھا کہ سیاست در بال سے ڈر گیا۔ مگر کیا بتاؤں اس شخص نے سوز خوانی وغیرہ کی رسم و روایت کے ساتھ کیسا سلوک کیا! اچھا خدا حافظ۔ یہاں پہنچ کر گریہ کے ساتھ اور کیا باتیں گلوگیر ہو گئیں گو کچھ ضروری باتیں کہنے سے رہ گئیں۔

آپ کا۔ رشید صدیقی

(۵)

۲۸ جنوری ۷۳ء

سرور صاحب مکرم تسلیم

میرے پرو(۱) چانسلر ہونے کا تو کوئی سوال نہیں۔ چاہتا ہوں کہ احباب مجھے معاف کر دیں۔ ان کا بدل شکر گذار ہوں گا۔

خیال یہ ہے کہ جامعہ اردو سے دو مقتدر غیر مسلم عہدیداروں کو (راج ناتھ کنزرو مرحوم چانسلر اور پنڈت آنند نرائن ملا پرو چانسلر کو) نظر انداز کرنا اور ان کے بجائے دو مسلمانوں کو لانا قرین مصلحت اور دور اندیشی نہ ہوگا۔ اس لئے بحیثیت پرو چانسلر کم سے کم ملا صاحب کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ براہِ کرم اس بارہ میں ڈاکٹر نذیر(۲) صاحب سے میرے حوالے سے فون پر گفتگو فرما لیجئے اور ہو سکے تو مبکش(۳) صاحب ڈاکٹر مسعود(۴) صاحب اور مالک(۵) رام صاحب سے بھی لیکن مشکل یہ ہے کہ موخر الذکر تینوں حضرات کے ہاں فون نہیں ہے۔ آپ نذیر صاحب سے گفتگو فرما کر مجھے (کمال(۶) کے ٹیلیفون نمبر 1554) پر مطلع فرما دیجئے تو میں متذکرہ صدر صاحبان کو CONTACT کرنے کی کوشش کروں لیکن صورت حال میں جو نزاکت پڑنے والی ہے اُسے آپ ہی اعتدال پر لا سکتے ہیں ورنہ مخالفوں کو جامعہ کو بدنام کرنے کا بڑا آسان اور موثر موقع ہاتھ آئے گا۔

یہ مسئلہ آپ صاحبان کی ضروری توجہ کا محتاج ہے۔ مخلص: رشید احمد صدیقی

حواشی

خط نمبر ۱۔ کا حاشیہ

(۱) ہیڈ و ہیرس۔ صدر شعبۂ انگریزی، علی گڑھ۔ میں نے جب ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا تو یہی صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے علی گڑھ چھوڑا اور ان کی جگہ پروفیسر فیلڈن کا تقرر ہوا۔

(۲) "حسینوں کے خطوط" کے بعد کچھ لفظ دیمک کی نذر ہو گئے۔

(۳) سہیل، سہ ماہی۔ رشید صاحب کی ادارت میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک نکلا تھا اور اس دور کا معیاری رسالہ تھا۔ پھر یہ بند ہو گیا۔ ۱۹۳۴ء میں رشید صاحب کو اس کے دوبارہ شائع کرنے کا خیال آیا۔ وہ ادارت میں مجھے بھی شریک کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے مضامین کی فراہمی میں سال بھر سے زیادہ لگ گیا اور بالآخر جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کوئی نمبر نہ نکل سکا۔

(۴) مقتدیٰ خان شروانی۔ منیجر مسلم یونیورسٹی پریس۔ سر سید کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ رعایت لفظی اور مقفیٰ عبارت کا شوق تھا۔ کئی کتابیں اور رسالے ان سے یادگار ہیں۔

(۵) اختر حسین رائے پوری۔ یہ کچھ عرصے رشید صاحب کے مہمان بھی رہے تھے۔ رشید صاحب اُن کی صلاحیتوں کے خاصے قائل بھی تھے۔

(۶) ڈاکٹر اشرف نے بالآخر سہیل کے لئے جو مضمون لکھا وہ لینن ازم پر نہیں بلکہ پریم چند کے رسالے ہنس اور ہندی سابتیہ پریشد پر تھا جس میں سنسکرت آمیز ہندی کے حامیوں کی خاصی خبر لی گئی تھی۔

خط نمبر ۲ کے حواشی

(۱) میری شادی ہوئی تو گورکھپور میں میرے خسر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ۱۹۲۸ء میں اُن کا تبادلہ لکھنؤ کا ہو گیا تھا۔

(۲) بشیر احمد صدیقی۔ پرنسپل شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔ رشید صاحب کی بیوی ان کی بہن تھیں۔

(۳) نیاز احمد صدیقی۔ رشید صاحب کے چھوٹے بھائی۔ رشید صاحب پر یہ جان چھڑکتے تھے اور رشید صاحب کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ محمد حسن انٹر کالج، جونپور میں انگریزی کے استاد تھے محمد حسن انٹر کالج میگزین کا ایک خاص شمارہ اقبال سہیل کی شاعری اور شخصیت پر نکلا تھا جس میں رشید صاحب کے اور میرے مضامین بھی شامل تھے۔ بعد میں ندوہ آ گئے۔

(۴) ڈاکٹر عبادالرحمٰن۔ یہ علی گڑھ میں جغرافیہ کے شعبہ کے صدر تھے۔ بعد میں انسپکٹر آف اسکولس ہو کر میرٹھ چلے گئے تھے۔ آخر میں ریاست کے ڈائرکٹر تعلیم ہو گئے تھے۔ رشید صاحب سے دوستی تھی۔ ڈڈلی اسٹیمپ کی جغرافیہ کی کتاب کا اردو ترجمہ جو اُن کے نام سے شائع ہوا رشید صاحب کا کیا ہوا تھا۔

(۵) گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کا خاکہ تیار کرنے کے لئے جو کمیٹی بنائی تھی اس کے صدر ذاکر صاحب تھے چونکہ اس کا پہلا اجلاس وارد ھا میں گاندھی جی کی قیادت میں ہوا تھا۔ اس لئے یہ وارد ھا کمیٹی کہلاتی تھی۔ اس سلسلے میں کمیٹی کی رپورٹ کے لئے مواد علی گڑھ میں جمع کیا گیا تھا۔ ذاکر صاحب کا قیام علی گڑھ میں

ہمیشہ رشید صاحب کے یہاں ہوتا تھا۔ ذاکر صاحب پر مضمون میں رشید صاحب نے اس کمیٹی کے سلسلے میں ذاکر صاحب کی مصروفیات کا بڑے پر لطف انداز سے ذکر کیا ہے۔

(۶) ڈاکٹر علی اصغر حیدر۔ شعبۂ باٹنی میں ریڈر۔ رشید صاحب کے گہرے دوست۔

(۷) اختر حسن صاحب۔ باٹنی میں لکچرر۔ اصغر صاحب کے یہاں برج کی پارٹیوں میں رشید صاحب اور اختر صاحب مستقل شریک رہتے تھے۔

(۸) خان صاحب۔ حمید الدین خان، ریڈر شعبۂ فارسی۔ علی گڑھ کی ایک اہم شخصیت۔ اکثر شام کو احباب ان کے یہاں جمع ہوتے تھے۔

(۹) خلیل الرب۔ اردو آنرس کے پہلے بیچ کے طالب علم۔ بعد میں شعبۂ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور اُن کے مضامین کئی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

خط نمبر ۳ کے حواشی

(۱) لکھنؤ کا حال۔ انجمن ترقی اردو ہند کا ایک وفد سمپورنانند وزیر تعلیم اتر پردیش سے ملا تھا۔ سمپورنانند نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے یہ سرکلر جاری کیا تھا کہ اتر پردیش میں سب کی مادری زبان ہندی ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، ریاست میں اردو کے چلن اور اردو کے استادوں کے تقرر کے سلسلہ میں دشواریاں عام ہو گئیں تھیں۔ وفد نے جو یادداشت وزیر تعلیم کو پیش کی تھی اس میں ان سب باتوں کی طرف اُن کی توجہ مبذول کرائی گئی تھی۔ وفد کی قیادت ڈاکٹر ذاکر حسین نے کی تھی۔ وہ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ملک کے ممتاز ماہر تعلیم اور بنیادی تعلیم کی کمیٹی کے صدر تھے۔ وفد میں ذاکر صاحب کے علاوہ اتر پردیش انجمن ترقی اردو کے صدر، پنڈت کشن پرشاد کول، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر عبد العلیم اور راقم الحروف بھی تھے۔ ہم لوگ وقت مقررہ پر پہنچے تو ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیئے گئے جہاں وزیر تعلیم ایک بکس میں سے ہندی کی نئی کتابیں نکال کر دیکھ رہے تھے۔ وزیر موصوف کچھ دیر کتابیں دیکھتے رہے اور ہم لوگوں کی طرف مطلق التفات نہ کیا۔ کمرے میں کرسیاں کم تھیں اس لئے ہم لوگ کچھ دیر کھڑے رہے بعد میں جب سب کے لئے کرسیاں لائی گئیں تو ہم لوگ بیٹھ سکے۔ کتابیں دیکھنے کے بعد وزیر موصوف ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ذاکر صاحب سے باکسی اور سے انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ صرف یہ

کہا کہ جو سرکلر محکمہ تعلیم نے جاری کیا ہے اور جس کی رو سے اتر پردیش میں سب کی مادری زبان ہندی تصور کی گئی ہے وہ واپس لے لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ آپ کے جو مطالبے ہیں اُن کے سلسلے میں مرکز سے رجوع کیجئے۔ ان کے ان چند جملوں کے بعد سب خاموش ہو گئے۔ بالآخر راقم الحروف نے ان مطالبات کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور ان پر دوبارہ غور کرنے کی درخواست کی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی اس کی تائید کی مگر وزیر موصوف نے کہا کہ ایک بات آپ کی مان لی گئی باقی باتوں کے لئے آپ مرکز سے رجوع کریں۔ اس کے بعد خاصے دل برداشتہ ہو کر ہم لوگ چلے آئے۔ مجھ پر اول تو وزیر موصوف کی بے رخی کا اثر تھا دوسرے اس بات کا کہ انہوں نے ذاکر صاحب جیسی محترم ہستی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس لئے گھر آکر رشید صاحب کو ایک لمبا خط لکھا۔ رشید صاحب سے خط و کتابت میں اکثر تازہ حالات و واقعات کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ رشید صاحب کا یہ خط میرے خط کے جواب میں ہے۔ یہ میرے نزدیک اُن کے خطوط میں ایک امتیازی اہمیت رکھتا ہے اور اُن کے حقیقی جذبات کی آئینہ داری کرتا ہے۔

(۲) سمپورنانند۔ ان کا ذکر پچھلے حاشیے میں آیا ہے۔ یہ اور پرشوتم داس ٹنڈن اردو کے خلاف شروع سے تھے۔ سمپورنانند پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ہندی کے ممتاز لیکھکوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اردو اچھی خاصی جانتے تھے اور کبھی کبھار اردو میں شعر بھی کہتے تھے۔ آنند تخلص تھا۔ مگر ہر اردو مخالف تحریک میں پیش پیش رہتے تھے۔ سی۔ بی گپتا کے بعد یہ اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ بھی ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ ذاتی خوبیاں بھی تھیں۔ دوسرے سیاست دانوں کی طرح ان کا دامن آلودہ نہ تھا۔ وقت کے پابند تھے۔ حکومت چلانے میں انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں کیا۔ اردو کے معاملے میں نہ جانے کیوں وہ بہت تنگ نظر تھے۔ ایک ملاقات میں میں نے انہیں بتایا کہ ۱۹۴۷ء تک اتر پردیش میں اردو کو اپنی زبان قرار دینے والے ہائی اسکول میں ایک تہائی تھے جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف پندرہ فی صد تھی۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ سب انگریزوں کا کیا دھرا ہے ورنہ سب کی زبان ہندی ہی تھی۔

(۳) مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق رشید صاحب کی جو واقعی رائے تھی وہ اس خط سے ظاہر ہو جاتی ہے ملاقاتوں میں اور عام خط و کتابت میں رشید صاحب اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا کا قیام بھی رشید صاحب کے یہاں ہوتا تھا۔ اپنے خطوط کی اشاعت کے رشید صاحب دراصل اسی لئے خلاف

تھے کہ انہوں نے بعض دوستوں سے مراسلت میں اپنے حقیقی جذبات کا اظہار بے تکلفی سے کیا تھا۔ یہ خوفِ فسادِ خلق یا سیاستِ درباں سے ڈر صرف رشید صاحب کے یہاں نہیں بہت سوں کے یہاں ملے گا۔ اس لئے اس پر تعجب یا اعتراض دونوں غیر ضروری ہیں۔

(۴) ۱۹۵۱ء کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ اس بات کی اجازت دیتا تھا کہ کورٹ میں مسلمان ممبروں کے علاوہ دوسرے مذہبی فرقوں کے افراد بھی ہوں۔ اس میں یہ بھی وضاحت تھی کہ مذہبی تعلیم جبری نہ ہو بلکہ مسلم اور غیر مسلم طلبا کو اختیار ہو کہ مسلم تھیالوجی کے بجائے اخلاقیات لے سکیں۔ اس میں کورٹ سے وہ اختیار لے لیا گیا تھا جس کی رو سے وہ وائس چانسلر کا انتخاب کرتا تھا۔ یہ تقرر ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے مطابق ایگزیکٹو کونسل کی سفارش پر وزیٹر یعنی صدر جمہوریہ کے دائرۂ اختیار میں لایا گیا تھا۔ اس پر مولانا عبدالماجد اور کچھ اور حضرات بہت خفا تھے۔ مگر دراصل اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی گئی تھی جس سے ادارے کا مخصوص کردار مجروح ہو۔ میں نے ذاکر صاحب سے خطاب کرتے ہوئے اس زمانے میں ایک نظم میں لکھا تھا ؎

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور	اس میں سوزِ عرب و حسنِ عجم یاد رہے
کارواں منزلِ نو کے لئے ہو گرمِ سفر	اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے
چمنِ علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور	میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے
محو ہوں عظمتِ شاہیں کے حسیں افسانے	گر رہے یاد تو جمہور کا غم یاد رہے
درِ مے خانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے	پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے

(۵) ڈاکٹر بٹ۔ پرنسپل طبیہ کالج۔ رشید صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کے مضمون "کارواں پیدا است" میں اُن کا ذکر جا بجا آیا ہے۔ "آبرو باختہ" "غصہ" میں لکھ گئے ہیں۔ ڈاکٹر بٹ ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے مخالف تھے اور اُن کی مخالفت میں خاصی شدت تھی۔ رشید صاحب کے اس جملے کو اسی سیاق و سباق میں دیکھنا چاہئے۔

خط نمبر ۴۴ کے حواشی

(۱) مشن۔ جے پور میں انجمن ترقی اردو ہند کی کل ہند کانفرنس تھی۔ میں انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے جے پور، اس کانفرنس کے سلسلہ میں گیا تھا۔ انجمن کے صدر تو پنڈت ہردے ناتھ کنزرو تھے۔ مگر آل انڈیا کانفرنسوں میں کسی اور کو صدر بنانے کا دستور تھا۔ چنانچہ اس کانفرنس کے صدر پنڈت آنند نرائن ملّا

ہتے جن کا یہ جملہ مشہور ہے "میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا" انہوں نے کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں یہ بات کہی تھی۔ مُلّا صاحب کا یہ شعر بھی زبان زد خلائق ہے ؎

لبِ مادر سے مُلّا وہ زباں جس نے سنائی تھیں　　وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھو

(۲) میں نے ۱۹۳۴ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ دو سال شعبۂ انگریزی میں لکچرر رہا۔ ۱۹۳۶ء میں ذاکر صاحب اور رشید صاحب کے کہنے سے ٹیچر کی حیثیت سے اردو میں بھی ایم۔ اے کیا۔ ایم۔ اے۔ اردو کی کلاس ۱۹۳۴ء سے شروع ہوئی مگر مجھے رشید صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل نہ ہوا۔ سب سے پہلے اُن سے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ملا۔ پھر ربط ضبط بڑھا اور اکثر ملاقات ہونے لگی۔ رشید صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کے اسلوب کے اثرات بھی شاید میری تحریروں میں مل جائیں گے۔ رشید صاحب کی شفقت اور محبت مجھے عرصۂ دراز تک میسر رہی۔ کچھ لوگوں نے ناواقفیت کی بنا پر جب مجھے رشید صاحب کا شاگرد قرار دیا تو میں نے اس کی تردید ضروری نہیں سمجھی۔ آخر رشید صاحب نے خود ہی اس خط میں واضح الفاظ میں یہ غلط فہمی دور کر دی۔

(۳) یہ دلچسپ فقرہ اس لئے کہ قاضی عبدالودود کی حق گوئی مشہور ہے۔ اور وہ ہر غلط بات کی جو مشہور ہو گئی ہو تردید کے لئے تیار رہتے تھے۔

(۴) گل پیٹرک۔ روک فیلر فاؤنڈیشن کے ایک نمائندے۔ یہ ہندوستان آ کر یہاں کے اسکالروں اور استادوں سے مل کر اُن میں سے ایک یا دو کے لئے راک فیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے امریکہ یا یورپ کے علمی سفر کے لئے وظیفے کی سفارش کرتے تھے۔

(۵) قمر رئیس اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ ان کے لئے مالی امداد کی سفارش کا سوال تھا۔

خط نمبر ۵ کے حواشی

(۱) جامعہ اردو کے آگرے سے علی گڑھ منتقل ہونے کے وقت سے رشید صاحب جامعہ اردو کی سرپرستی کرتے رہے۔ اس وقت سوال یہ تھا کہ پرو چانسلر کون ہو۔ میں نے اُن کو راضی کرنا چاہا مگر وہ تیار نہ ہوئے۔

(۲) ڈاکٹر نذیر احمد اس وقت نائب شیخ الجامعہ تھے۔ رشید صاحب شیخ الجامعہ۔

(۳) محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی۔ بزرگ شاعر، جامعہ کی مجلس عاملہ کے ممبر۔

(۴) ڈاکٹر مسعود حسین خان۔ جامعہ کی مجلس عاملہ کے ممبر۔ بعد میں شیخ الجامعہ ہوئے اور اب تک اس عہدے پر فائز ہیں

(۵) مالک رام صاحب ۔ مشہور اردو محقق اور ادیب ۔ جامعہ کے عہدہ دار ۔

(۶) کمال احمد صدیقی ۔ رشید صاحب کے بھانجے ۔ رشید صاحب اُن سے بہت محبت کرتے تھے ۔ اور انہوں نے بھی رشید صاحب کی بڑی خدمت کی ۔ رشید صاحب کے اکثر مضامین کمال کے صاف کئے ہوئے ہیں ۔ خطوط میں کمال کا تذکرہ جا بجا آیا ہے ۔

راجندر سنگھ بیدی

(راجندر سنگھ بیدی میرے گہرے دوستوں میں سے تھے ۔ جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "دانہ و دام" شائع ہوا تو میں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اس پر تبصرہ کیا اور اردو دنیا کو افسانے کے افق پر ایک نئے ستارے کے طلوع کی بشارت دی ۔ کچھ عرصے بعد بیدی مجھ سے ملنے علی گڑھ آئے اور میرے یہاں قیام کیا ۔ اس وقت سے نومبر ۱۹۸۴ء میں اُن کی وفات تک اُن سے ملاقاتیں اور خط و کتابت ہوتی رہی ۔ میں کئی دفعہ بمبئی میں ان کا مہمان رہا اور وہ علی گڑھ میں میرے ۔ اُن کے خطوط کا ایک مجموعہ عنقریب حواشی اور ان کی شخصیت کے جائزے کے ساتھ شائع ہوگا ۔ بانگی کے طور پر ایک دلچسپ خط "سوغات" کے قارئین کے لئے بھیج رہا ہوں ۔ یہ خط ۱۹۷۰ء کا ہے اور اس میں فلم "دستک" کے سلسلے میں اُن کی کاوشوں اور پریشانیوں کا تذکرہ ہے ۔ اس خط سے ان کے مزاج اور مزاج دونوں پر روشنی پڑتی ہے ۔ سرور)

---

۱۹ اگست ۱۹۷۰ء

پیارے سرور صاحب ۔ آداب

اب میں کیسے کہوں ، میں کیوں آپ کے متعدد کرمناموں کا جواب نہ دے سکا ۔ اس کی سبب وجہ میری تصویر "دستک" تھی جس کے بنانے میں چاروں طرف سے گھر گیا ۔ اس تصویر کے لیے حکومت نے مجھے دو لاکھ روپے قرض دیا ۔ لیکن چونکہ کوئی تصویر دو لاکھ میں بنتی نہیں ہے اس لئے اسے مکمل کرنے کے سلسلہ میں میں نے بے شمار پیسہ بازار سے اٹھایا اور وہ بھی ہُنڈیوں کی صورت میں ۔ ہر تیسرے چوتھے روز دس پندرہ ہزار کی کوئی ہُنڈی DUE ہو جاتی تھی اور مجھے اپنی ساکھ اور عزت بچانے کے لئے بہت تگ و دو کرنی پڑتی تھی ۔ اکثر تو ایک ہُنڈی سے نکلنے کے لئے دوسری ہُنڈی میں پھنسنا پڑتا تھا اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قرض اترنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ تین مہینے ادائیگی کا وقفہ تین دن میں ختم ہو گیا اور میری حیثیت

شور کی سی ہو گئی جو گندگی کے ہر ڈھیر میں اپنا منھ مارتا رہتا ہے۔

کوئی بھی کہے گا آخر تم نے کیوں یہ مصیبت مول لی؟ اکثر لوگ تو میرے جواب کو معقول نہیں سمجھیں گے لیکن آپ سے مربّی اور ہمدرد انسان سے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھی میں نے نہایت ہی نیک نیتی سے کیا ہے۔ شروع سے آخر تک کہیں بھی میرے دل میں یہ بات نہ تھی کہ میں ایک تصویر بنا کر بہت سا پیسہ کماؤں۔ اول تو گرد و پیش کا ماحول دیکھ کر مجھے بے حد کڑھن ہوتی تھی۔ فلمی کہانیوں میں بھی وہی لڑکا لڑکی نظر آتے تھے جو پیڑوں کے گرد گھوم پھر کر کسی خلجان کا شکار ہوتے اور آخر میں لڑکا لڑکی کو لے ڈوبتا۔ لیکن وہ چڑیا جسے زندگی کہتے ہیں کہیں چہکتی نظر نہ آتی تھی۔ ادب میں بھی جب ہم لوگ آئے تھے تو زمین ایسی ہی تھی۔ فیاض محمود، عاشق بٹالوی اور بے شمار بزرگ ایسے تھے جن کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا اور نہ اس کا سلیقہ میسر۔ لیکن جسٹس ہمایوں مرزا جسٹس — ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا کرتے تھے۔ پھر منٹو، کرشن، عصمت کا گروپ آیا اور انہوں نے ایک واضح کہانی پیش کی جو رگِ جاں سے قریب تھی۔ بعینہٖ میں نے فلم بنانے کا بیڑہ اٹھایا تاکہ اس میں کچھ معقولیت پیدا کر سکوں۔ مجھے شروع سے اندازہ تھا کہ اس "وادیٔ غربت" میں قدم رکھوں گا تو "یادِ وطن" دور تک سمجھانے آئیگی"۔ لیکن مرزا نے یہ بھی کہا ہے۔ ع پہ چل نکلتے جو مے پیے ہوتے۔

پھر اس کی کچھ نفسیاتی وجوہات بھی تھیں۔ اردو میں تصنیف و تالیف روزی روٹی کا سلسلہ نہیں ہے اور نہ اس کے بننے کی امید ہے۔ میں نے سوچا اگر فلم ہی سے روٹی کمانا ہے تو منکوحہ بن کر کماؤں گا طوائف ہو کر نہیں۔ ہماری اچھی سے اچھی چیز کچھ یوں مسخ کر دی جاتی ہے کہ آخر اپنے ہمدرد سے ہمدرد دوست تین حرف کی بجائے چار چھ ارسال کر دیتے ہیں۔ پھر گھر میں مجھے میاں کا، باپ کا امیج نبھانا تھا جس کا اشارہ میں نے اپنے ایک افسانے "صرف ایک سگریٹ" میں کیا ہے۔ اس عمر میں سب یہی کہنے لگتے ہیں کہ ایک طرف بیٹھ جاؤ اور آرام کی روٹی کھاؤ جو بالآخر حرام کی ہو جاتی ہے۔ آخر ہو ئیں پوتے کو گود میں دیکر دروازے پر بٹھا دیتی ہیں کہ کتے ہنکاؤ۔۔

آجکل باپ اور بیٹے کا جو تعلق ہے وہ اپنے زمانے کا نہیں ہے جس میں کوئی کہا کرتا تھا — اب مجھے کس بات کی فکر ہے۔ ماشاءاللہ میرا جگر گوشہ جوان ہو گیا ہے۔ پھر ہم پہلے بھی کچھ اس انداز سے ہیں کہ حمیت کسی پہ مدار رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ نوکری کوئی ایسی کی نہیں کہ پنشن پائیں اور ساری کی بجائے آدھی کھائیں مگر کھائیں۔۔۔

فلم ایک بہت ہی POSSESSIVE قسم کی محبوبہ ہے جو کہیں اور جھانکنے کی اجازت نہیں دیتی لیکن میں نے شروع ہی میں اس سے کہہ دیا تھا کہ میری پہلی شادی ہو چکی ہے اور اس سے میری اولادیں بھی ہیں۔ اگر میں

اُن سے ملنے نہیں جاؤں گا تو کم از کم خرچہ ضرور بھیجوں گا۔ میری لکھنے کی رفتار کبھی زیادہ نہیں رہی ہے۔ لیکن اسے میں خرچہ ضرور بھیجتا رہا ہوں۔ ابھی حال ہی میں میں نے "تعطّل" نام سے ایک افسانہ کشمیر کے بارے میں لکھا ہے جو "کتاب" والوں نے چھ مہینے سے پس انداز کر رکھا ہے کہ افسانہ نمبر میں چھاپیں گے اور شاید وہ اگلے شمارے میں آرہا ہے۔ ہو سکتا ہے فلم اتنا تقاضہ وقت کے سلسلہ میں مجھ سے نہ کرتی تو میں چند کتابیں اور لکھ لیتا لیکن شاید میرے حالات اس بات کی اجازت نہ دے رہے تھے۔ ہمیشہ روٹی کھائی لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ کل کے سلسلہ میں تھوڑا بے فکر ہوتا۔ INSECURITY کے ساتھ زندہ رہنے کا فن تو جانتا ہوں لیکن شاکی بھی ہوں کہ اس عقوبت کے واسطے کوئی حد بھی تو چاہیئے۔ اگر میں کہوں کہ میرا فلم بنانے کا عمل اس سلسلے میں — STOOPING TO CONQUOR — ہے تو شاید کوئی یقین نہ کرے۔ مجھے پتہ ہے کہ میں تخلیق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس چڑیل کی طرح سے جو اپنا منتر کسی کے کانوں میں پھونکے بغیر مر نہیں سکی۔ میں نے جو کام کیا ہے وہ مجھے اتنی فرصت دے جائے گا کہ میں کچھ کر سکوں۔

آپ خوش ہوں گے کہ میں نے چونکا دینے والی تصویر بنائی ہے جس میں خیال اور ٹکنیک دونوں کے اعتبار سے مغرب اور مشرق کے درمیان ایک پل باندھا ہے۔ میں اسے جرمنی کے ایک فلمی میلے میں بھیج رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے؟ رہی قرض کی بات تو وہ تصویر کے بکنے کے ساتھ اتر جائے گا اور کامیابی کی صورت میں کچھ پیسے بچ بھی جائیں گے۔ جن سے چاہ بنا، تالاب بنا والی بات تو نہ ہو سکے لیکن راہ گذر پہ گرمی کے موسم میں ایک آدھ پیاؤ ضرور لگ جائے گا۔ میرے پیاسوں کی جس سے تسکین ہوگی۔

ہم اپنے آپ کو کس قدر غیر محفوظ سمجھتے ہیں کہ چار صفحے تو اپنی بات کہنے میں صرف کرتے ہیں اور شاید ایک ڈیڑھ صفحہ محب کی بات پوچھنے میں۔ امریکہ کے بارے میں تو میں "ہماری زبان" میں پڑھتا رہا ہوں اور آخر میں پڑھا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔ جب سے مجھے زیادہ ہی فکر ہو گئی ــ تلافی کے ساتھ ساتھ آپ کی صحت کے بارے میں پوچھنے اور دعا کرنے کو بھی جی چاہا۔ اب آپ کیسے ہیں؟ خدا کرے یہ خط آپ کو صحت مند پائے۔

صدیق[1] کے بارے میں ایک بار نہیں بیسیوں بار شام لال اور جشونت سنگھ سے کہا۔ ایک دو بار تو باقر بھی میرے ساتھ تھے۔ لیکن یہی جواب ملا کہ ویکنسی کی صورت میں انہیں ہی بلوائیں گے۔ میں نے ایک جگہ اور بھی کوشش کی لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ سوچا تھا کہ کوئی معقول بندوبست کر کے آپ کو تار دوں گا۔ لیکن وہ سب ہوا ہی نہیں صدیق آج کل کیا کر رہے ہیں؟ میں جانتا ہوں اس جوان عمری میں بے کار رہنا دل و دماغ کے لئے اچھا نہیں لیکن

مجبوری ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صدیق میرے ہاں آجائیں اور دن میں لوگوں سے ملیں ملائیں۔ شاید کوئی بات پیدا ہو جائے۔ ہو سکتا ہے ہماری دوڑ مسجد تک رہ گئی ہو۔ اگر کچھ نہ ہو تو بمبئی کے ٹریپ کو سیر ہی سمجھ لیں۔ اور کچھ ہو جائے تو شکار۔

میرا ابھی ایک جرمنی والا ہے جو وہاں آفسیٹ اور فوٹو گرافک پرنٹنگ کی تعلیم مکمل کر چکا ہے۔ اس کے لئے آب کا ایک حصہ کسی جرمن لڑکی کی قسمیں کھا نا بھی ہو گیا۔ گھر بھر میں ہنگامہ مچا ہے۔ ایک میں ہوں جو بین الاقوامی شادی کی مشکلیں جانتا ہوا بھی اس پہ صاد کرتا ہے۔ اس میں میرے باپ کا کیا جاتا ہے کا انداز نہیں ہے۔ محبّت کو محبّت ہی نہیں سمجھتا ہوں اور جو سمجھتا ہوں وہ گفتن نمی آید۔

یہاں ادیب لوگ سب بکھر گئے ہیں۔ جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔ کرشن اور جعفری ـــ یا روا ب اللہ ہی اللہ ہے کے انداز میں اپنے اپنے کابوس میں گھسے بیٹھے ہیں جب بھی سازشوں سے باز نہیں آتے۔ حال ہی میں مجھے پتہ چلا ہے کہ سازش قسم کی چیز بیٹھنے سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے دوڑنے بھاگنے سے نہیں۔ ادھر فسادات کا خدشہ رہتا ہے جس کے لئے وقت نکالتے ہیں یعنی کروانے کے لئے نہیں رکوانے کے لئے۔ نامی آدمیوں کو آگے کرتے ہیں۔ خود پیچھے رہتے ہیں۔ ان کے جذبۂ نام و نمود کی تسلی ہو جاتی ہے اور اپنے جرم کے احساس میں کمی۔ کبھی کبھار یا قر سے ملاقات ہو جاتی ہے جو حقیقت کو کچھ یوں بے دریغ استعمال کرتے ہیں کہ وہ بطلان معلوم ہونے لگتی ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں انسان نے یہی کیا ہے ـــ یا وہ چھلانگ مار کر بہت آگے نکل گیا ہے اور یا پھر پیسنڈ ٹی ہو کر رہ گیا ہے۔ بیچ میں کیوں نہیں چلا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

بھابی کا تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا وہ بھی ساتھ گئی تھیں امریکا؟ ضرور گئی ہوں گی۔ کیسی رہیں وہاں؟ ـــ وہ زندگی جو یہاں کی زندگی سے یکسر علیحدہ ہے ـــ ضرور انھیں پتہ چلا ہو گا کہ وہاں جھوٹ کم بولا جاتا ہے لیکن وہ اپنے سچ سے کمتر ہے۔ بہت بہت محبّت اور بڑی معافیوں کے ساتھ۔ آپکا: بیدی

---

(۱) صدیق میرے بڑے لڑکے۔ جو انڈین ایکسپریس سے استعفا دینے کے بعد بیکار تھے۔ بیدی کو میں نے لکھا تھا کہ شام لال یا خشونت سنگھ سے ان کے سلسلے میں بات کریں۔

عزیز احمد

(۱)

۳۰ جولائی ۱۹۶۴ء

مکرمی و محبّی سرور صاحب

تسلیمات عرض ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے
برسوں سے پھر آپ سے خط و کتابت کا موقع نہیں ملا۔ میں ۱۹۶۲ء سے کناڈا میں ہوں۔ یہاں مستقل پروفیسری مل گئی ہے۔ نہ انگریزی کی نہ اردو کی بلکہ علومِ اسلامی کی۔ اس ایک زندگی میں کئی علمی کینچلیاں بدلیں۔ یہ شاید آخری کینچلی ہے کیونکہ اس میں جتنی عزت اور شہرت نصیب ہوئی ہے وہ کسی اور ڈگر میں نہیں ملی تھی ـــــ بہر حال!

آپ فرمائیں کہ آپ کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کئی جلدوں میں ایک تاریخ ادبیات اردو مکمل کر رہے ہیں۔ مجھے اس کا بڑا اشتیاق ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اپنی تاریخ ادبیات اردو کی ایک جلد مجھے بھیج سکیں اور یہ لکھ دیں کہ اس کی قیمت کس قدر ہے تاکہ میں فوراً یہاں سے روانہ کردوں یا کسی کتب فروش کو ہدایت کردیں کہ مجھے بھیج دے۔ قیمتاً۔ میں بہت ممنون ہوں گا اس کے علاوہ مطبوعات انجمن ترقی اردو یا دیگر اردو مطبوعات کی فہرستیں اگر بھجوا سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

اگر کبھی امریکہ آنا ہو تو مجھے ضرور لکھیں۔ شاید کہیں ملاقات ہو جائے۔ اور اگر Toronto آنا ہو تو آپ میرے پاس مہمان بن کر قیام فرمائیں۔ یوسف حسین خان صاحب اگر اب تک علی گڑھ میں ہوں تو انہیں میرا سلام پہنچا دیں اور خلیق احمد صاحب نظامی اور رشید احمد صدیقی صاحب کو بھی۔ (خدا کرے وہ اب تک زندہ ہوں اور مجھے بھول نہ گئے ہوں)

کمترین
عزیز احمد۔ اونٹیریو (کناڈا)

(۲)

۲۹ دسمبر ۱۹۶۹ء

مکرمی و محبّی سرور صاحب

السلام علیکم۔ محبت نامہ ملا اور یقین مانیے حد سے زیادہ خوشی ہوئی۔
آپ سے بہت کم ذاتی ملاقات کا موقع ملا مگر صحیح جانیے کہ آپ کا شمار میں اپنے اوّلین دوستوں میں سمجھتا ہوں۔ آپ کی واپسی سے پہلے آپ سے ملاقات ہونی چاہیئے۔ یہاں اردو کا پروگرام

تقریباً مفقود ہے ورنہ آپ کو لکچر دینے بلاتا۔ لیکن اگر ہو سکے تو ٹورنٹو اور مونٹریال کا ایک چکر ضرور لگائیے۔ تاکہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔ ٹورنٹو میں کاش میں آپ کو اپنے پاس ٹھہرا سکتا۔ لیکن خود ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ہوں اس لئے آپ یہاں ہوٹل میں ٹھہریں گے مگر میرے مہمان ہوں گے اور آپ کا ہوٹل کا خرچ میرے ذمے ہوگا۔ امید ہے کہ آپ یہ دعوت قبول فرمائیں گے۔

ادب کا ساتھ بڑی حد تک چھوٹ گیا۔ ادب غزل کی طرح جوانی کی چھیڑ چھاڑ ہے۔ اسکے بعد تاریخ میں زیادہ لطف آتا ہے اور اب تاریخ میرا موضوع ہے۔ خدا نے اس میں اتنی مقبولیت اور شہرت عطا کی جو ادب میں نصیب نہ ہو سکی تھی۔ کاش میں آپ کو غالب کے چھ[۲] شعر لکھ سکتا لیکن کئی سال سے غالب کو پڑھنے کی باری نہیں آئی۔ ذہنی زاویہ بالکل بدل گیا ہے۔

ٹورنٹو ضرور آئیے۔ یہاں اور بہت سے ادب دوست حضرات آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ فقط

کمترین
عزیز احمد۔ ٹورنٹو (کناڈا)

---

[۱] میں اکتوبر ۱۹۶۹ء سے مارچ ۱۹۷۰ء تک شکاگو یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تھا۔ واپسی پر مانٹریال اور ٹورنٹو جانے کا خیال تھا۔ عزیز احمد سے ملاقات کی غرض سے ٹورنٹو جانے کی ہمت کی تھی۔ اسی سلسلے میں اُن سے خط و کتابت ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ میں ہنگری اور پولینڈ کے کلچرل ایکسچینج پروگرام کے تحت سفر کا پروگرام بن جانے کی وجہ سے مانٹریال سے لندن آگیا اور ٹورنٹو نہ جا سکا۔

[۲] شاید غالب کے پسندیدہ سو اشعار کا جو سلسلہ ہماری زبان میں شروع کیا تھا اس کے لئے عزیز احمد سے بھی فرمائش کی تھی ——————— آل احمد سرور

ضمیر الدین احمد کے نام

ممتاز شیریں

(۱)

۲۹ / جولائی ۱۹۵۳ء

مکرمی ضمیر احمد صاحب

آداب

میرے نام آپکا خط، شاہین کے نام خط، افسانہ اور طنز سب کچھ مل گئے تھے جواب اور رسید

کی اطلاع میں تاخیر کے لیے معافی چاہتی ہوں ۔ شاہین نے کہا تھا کہ اب کے وہ آپ کو لکھیں گے ۔ لیکن وہ آپ کے بھائی کا انتظار کرتے رہے کہ ملنے پر آپ کو لکھیں ، لیکن اب تک ان کی آپ کے بھائی سے ملاقات نہیں ہوئی ۔ کہہ رہے تھے کہ یہ اطلاع آپ کو دیدوں ۔

کچھ دن ہوئے ہم نے سنا کہ آپ خود یہاں آرہے ہیں ۔۔ غالباً اگست کے پہلے ہفتے میں ۔ خط نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب تو ساری باتیں زبانی ہی ہوں گی ۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ آپ کو کم از کم افسانوں کی رسید کی اطلاع تو دینی چاہیئے تھی ۔

ساقی کا ضخیم افسانہ نمبر جس میں آپ کا افسانہ حکیم مجتبیٰ حسین شائع ہوا ہے بک پوسٹ سے ارسال تھا ۔ مل گیا ہوگا ۔

آپ کا افسانہ " رگ سنگ " بہت پسند آیا ۔ تکنیک کے لحاظ سے اور ایک خاص کیفیت طاری کرنے میں ، یہ افسانہ اتنا ہی کامیاب ہے جتنا " باد و باراں " بلکہ میرے خیال میں تو یہ باد و باراں سے زیادہ گہرا افسانہ ہے اور اس میں تہہ داری کے کئی پہلو نکلتے ہیں ۔ جب میں نے اس پر غور کیا کہ اس میں وہ کون خاص بات ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے کہ آپ نے اس افسانے میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ، تو یکے بعد دیگرے کئی باتیں نکل آئیں ۔

اختر میں عورت کے روپ کا ایک اور VARIATION ہے جو نفیس اور قیصر سے مختلف ہے ۔ اور اختر اور ظہیر کے تعلق کا بھی ایک اور VARIATION ہے جو نفیس اور قیصر اور نظیر کے تعلق سے مختلف ہے ۔ یہاں وہ صرف دوست ہیں ، سچے دوست ۔ اختر سے وہ سب کچھ کہہ سکتی ہے اور اختر کی دوستی نازک سے نازک موقعوں پر سہارا دے سکتی ہے ۔ لیکن شمی کی موت کا ذکر وہ اختر سے بھی نہیں کر سکتا ۔ شمی کی موت کا اسے اتنا زبردست صدمہ پہنچا ہے کہ وہ یہ بات زبان تک لا بھی نہیں سکتا ۔ شمی کی موت کی حقیقت ایسی ہے کہ خود اس کا ذہن اسے قبول نہیں کرتا ، قبول نہیں کرنا چاہتا ۔ جب وہ خود موت کا سامنا کرتا ہے اور موت سے گھبرا کر واپس لوٹ آتا ہے تو اس پر یہ حقیقت پوری طرح کھلتی ہے کہ شمی نے موت کا سامنا کیا اور وہ واقعی مر بھی گئی ۔ شمی کی موت کی حقیقت اس وقت ایک TANGIBLE شکل اختیار کر لیتی ہے ۔

وہ لمحہ سب سے اہم لمحہ ہے جب وہ خود کشی کرنا چاہتا ہے ۔ اس دوران میں اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ موت کا سامنا کرنے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں پاتا ۔ اس لمحہ وہ ایک معمولی آدمی بن جاتا ہے ۔ A PITIFUL ORDINARY HUMAN BEING
نیچے لوگوں کے ٹھٹھے مذاق اس کے اس انکشاف کو اور بھی واضح کر دیتے ہیں ۔ اور اب اس کے ضبط کا بند آپ ہی آپ ٹوٹتا ہے ۔ اور وہ اپنی بلندیوں پر سے اتر کر ایک عام آدمی کی طرح رو سکتا ہے ، ۔۔۔ کا سہارا لے کر ۔ اختر جو پہلے بھی اسے اچھی طرح سمجھتی تھی ۔ اب اسی

UNDERSTANDING کے ساتھ اس نئے ظہیر کو بھی قبول کر لیتی ہے۔

"بادو باراں" کا پہلا تاثر قائم رہتا ہے لیکن یہ افسانہ ایسا ہے کہ پڑھنے کے بعد جوں جوں وقت گزرتا جائے آپ پر GROW ہونے لگتا ہے۔

آپ یہاں کب آ رہے ہیں؟ پر کاش پنڈت صاحب سے مجھے اپنا مضمون ابھی تک واپس نہیں ملا ہے۔ اگر انہوں نے بھجوایا نہ ہو تو از راہ کرم آپ ان سے لیتے آئیں۔ ممنون ہوں گی۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے
نیاز کیش

ممتاز شیریں

....

(۲)

۱۸/ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مکرمی ضمیر احمد ۔۔۔ آداب

آپ کا خط مل گیا تھا۔ جواب دینے والی تھی کہ وہ خط ہی کہیں کھو گیا۔ اور ساتھ ہی آپ کا نیا پتہ بھی۔ یہ خط "فنکار" کی معرفت لکھ رہی ہوں۔ امید کہ آپ کو مل جائے گا۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فنکار کے تازہ شمارے میں آپ کا کوئی افسانہ آ رہا ہے "فنکار" میرے پاس آتا ہی نہیں، آپ پر کاش پنڈت صاحب سے کہیں کہ وہ مجھے پرچہ نکلنے پر بھیج دیں۔

میں نے "سیارہ" والوں سے دریافت کیا کہ آپ نے جو افسانہ انہیں بھیجا تھا اس کا کیا ہوا وہ تو صاف منکر ہیں کہ آپ کا کوئی افسانہ ان کے پاس آیا تھا۔

"سیارہ" کا کتابی سائز پر ایک خاص نمبر جلد ہی نکلنے والا ہے۔ اس میں میرا تازہ افسانہ "میگھ ملہار" شائع ہو رہا ہے۔ یہ دراصل پورا افسانہ نہیں ہے۔ یہ افسانہ مکمل "سویرا" کے آنے والے شمارے میں آئے گا۔ آپ یہ پورا افسانہ ضرور پڑھیئے گا اور اس کے بارے اپنی رائے لکھ بھیجئے گا۔ یہ اردو میں اپنے انداز کی ایک اور کافی SIGNIFICANT تخلیق ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں نے عرصے سے کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا اور اب یہ افسانہ بڑی شدید تخلیقی URGE کے تحت ہوا ہے۔ اردو میں ایک UNUSUAL اور RARE قسم کی چیز تخلیق کرنے کا اچانک جنون سا سوار تھا اور دوران تحریر یہ جنون چھایا رہا۔

اب یہ آپ لوگ ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ واقعی میں نے کوئی چیز تخلیق کی بھی ہے کہ نہیں۔ یہ افسانہ فل سکیپ سائز کے کوئی ۹۰ صفحات کا ہے اور جانے کن کن چیزوں کو اس میں ملایا ہے۔ ہندو دیو مالا GREEK MYTHOLOGY ہومر، ورجل، اور ملٹن کے کچس کے

ساتھ ، انجیلی عیسائی SYMBOLISM اسلام میں RITUAL کا کم یاب عنصر ، یعنی کئی ایک کلچر اور مذہبوں کے مشترکہ عناصر ۔ یہ سب یونہی پس منظر کے طور پر ہے ورنہ افسانے کی مرکزی تھیم تو موسیقی کا سحر ہے اور فنکار کا امر ہونا IMMORTALITY OF ART

میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ جس میں دیپک راگ اور میگھ ملہار دونوں شامل ہیں شاید جلد ہی شائع ہو جائے ۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے متعلق کوئی ایسے فنکار لکھیں جو واقعی فن کی سمجھ رکھتے ہیں اور ایسے تو معدودے چند ہی ہیں ۔ آپ کے ذوق پر مجھے بھروسہ ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ ان افسانوں کی SIGNIFICANCE کو سمجھ پائیں گے ۔ جب کتاب نکل آئے تو میں آپ کو بھیجوں گی ، کیا آپ وہاں کے پرچوں میں یا "سویرا" یا "نقوش" کے لئے اس پر تبصرہ کر دیں گے ۔

میری منٹو پر کتاب اور تنقیدی مضامین کے مجموعے کے سلسلے میں بھی بات چیت ہو رہی ہے ۔

شاہین ہالینڈ سے ابھی نہیں لوٹے ۔ ایک ڈیڑھ ماہ میں آئیں گے ۔ ان کی ڈوکٹریٹ PROMOTION کے لئے جن پروفیسروں کی موجودگی ضروری تھی ، وہ پروفیسر چھٹیوں میں ہالینڈ سے باہر جا چکے تھے اس لئے شاہین کو دو مہینے اور دیر ہو گئی ورنہ وہ اب تک واپس لوٹ آتے آپ کی بیگم صاحبہ کو میرا اسلام پہنچا دیجئے ۔

نیاز کیش

ممتاز شیریں

••••••••••••••••••••••

(۳)

مکرمی ضمیر احمد صاحب ۔ آداب

آپ کے دونوں خط مل گئے تھے "گلبیا" اور سارے افسانے بھی ۔ میں آپ کو جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ آپ کا یہ خط ملا ۔

دراصل میں نے "نقوش" اور "سویرا" والوں کو "گلبیا" کے بارے میں لکھا تھا اور ان کے جواب کا انتظار کر رہی تھی ۔ غالباً آپ کو "نقوش" والوں کا خط میرا خط انہیں ملنے کے بعد ہی ملا ہے ۔ بہر حال اب کے آپ نے دوسرے افسانے بھی بھیج دیئے ہیں ۔ "نقوش" والوں کو ان کی مرضی کے مطابق کوئی "شریفانہ" چیزی بھیجی جا سکتی ہے ۔

"گلبیا" اگر سویرا کے اس شمارے میں آجائے جس میں میرا طویل افسانہ "میگھ ملہار" آرہا ہے تو بہت اچھا ہو ۔ میں نے انہیں لکھ دیا ہے ۔ افسانے کی تعریف بھی کر دی ہے ۔ دیکھیں وہاں

سے کیا جواب آتا ہے۔ غالباً وہ یہ پرچہ صرف طویل نگارشات کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو شاید آپ کا افسانہ وہاں شائع ہو سکے۔

"نقوش" کے لئے بغیر عنوان والی نمبر ۲ بھجوا دیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کہتے ہیں یہ پرانی وضع کی ہے۔ مجھے تو یہ کہانی واقعی پسند آئی۔ بغیر عنوان والی نمبر (۱) اس میں SUBTLE UNDERTONES ہیں۔ ہموار سطح کے نیچے ایک دبی دبی زیریں ہلچل جو دبی دبی رہنے کی وجہ ہی سے خاصی شدت اختیار کر گئی ہے۔ بغیر عنوان (۱) تکنیکی لحاظ سے اور جذبات و محسوسات کے مد و جزر کے اعتبار سے میرے افسانے "گھنیری بدلیوں سے" بہت کچھ ملتا ہے۔ لیکن وہ ہلچل تو ایک محبت کرنے والی بیوی کے ذہن میں ایک معمولی سی بات پر ضرورت سے زیادہ ANXIETY سے پیدا ہوئی ہے اور یہاں آپ کے افسانے میں یہ مجرم ضمیر کی کشمکش ہے۔ یوں بات تو شروع ہی میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ افسانے کا اختتام صرف اس کا اضافہ کرتا ہے کہ وہ آیا تھی۔

"اچھی بیٹی" کی نفسیاتی SIGNIFICANCE کو نہیں معلوم، لوگ سمجھ بھی سکیں گے۔ "شوبھارانی" پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ بچوں کا جاگا ہوا جنسی شعور کیا رنگ لے آتا ہے۔

"گلبیا" تو خیر کچھ اور ہی چیز ہے۔ منٹو کا افسانہ معلوم ہوتا ہے اور کردار بھی منٹو کا ہے۔ منٹو کی پھڑکتی ہوئی عورت کرداروں کے علاوہ "گلبیا" میں میں نے ایک اور کردار سے بھی مشابہت پائی۔ یہ ایملی زولا کے ایک کردار LA COGNET سے مشابہ ہے جو EARTH کی ایک کردار ہے۔ ایملی زولا کا انگریزی میں ترجمہ ابھی ابھی چھپا ہے۔ اب تک یہ کتاب انگریزی میں شائع ہی نہیں ہوئی تھی کیونکہ انگریزی اس کی غضب کی عریاں حقیقت نگاری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جانے کیسے اس کا ترجمہ ہو گیا۔ اور ترجمہ کیا ہوا کہ تہلکہ مچ گیا۔ اگر آپ نے ابھی تک یہ کتاب نہ پڑھی ہو تو ضرور پڑھیئے گا۔ بلا کی شدت، غضب کے PASSIONS اور پھڑکتی ہوئی زرخیز دھرتی کی کوکھ سے پھوٹتی ہوئی زندگی۔ "زر" اور "زمین" اور "زن" کے لئے انسان کی حرص و طمع اور POSSESSIVE INSTINCT کی دیوانگی جو اسے حیوان سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔ البتہ کتاب کے بعض حصے اتنے GROTESQUELY FILTHY اور OBSCENE ہیں کہ FINER SENSITIVITIES والوں کی طبیعت پر نہایت گراں گزرتے ہیں۔ لیکن کتاب پڑھنے کی ہے بڑی IRRESISTIBLE اور اس میں "گلبیا" کا سا ایک کردار ہے LA COGNET

ہاں "گلبیا" کے بارے میں ایک چھوٹا سا SUGGESTION ہے اور وہ یہ کہ اس کا دوسرا جملہ سب سے پہلا ابتدائی جملہ ہونا چاہئے۔ اس سے فوراً آغاز ہی میں گرفت پیدا ہو جاتی ہے چھوٹتے ہی چھوٹتے کیوں نہ گلبیا کا یوں تعارف ہو جائے۔

"جرانچ کر رہنا بھیا۔ بڑی حرامجادی ہے سالی"

اور اس کے بعد رام دین کے بارے میں جملہ آسکتا ہے۔ کہیئے۔ آپ کو یہ مشورہ پسند آئے تو میں خود یہ تبدیلی کر لوں۔ اور افسانے کے آخر میں دو ایک جملے جن سے عریانی پیدا ہو گئی ہے کاٹے جاسکتے ہیں مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ یہ رسالے والے چھاپنے سے جو ڈرتے ہیں! یوں بھی بات اشاروں ہی اشاروں میں واضح ہو جاتی ہے۔ ایک آدھ کھلے جملوں کو نکالا جا سکتا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ مجھے نئے افسانہ نگاروں کے بارے میں مضمون لکھنا چاہیئے۔ بہت سے لکھنے والوں کو اس کا احساس ہے کہ جب سے میں نے افسانوں کا جائزہ لینا چھوڑ دیا ہے انہیں کوئی ٹھیک طور سے سمجھنے والا نہیں ہے اور سب نقادر سمی سی باتیں کر دیتے ہیں۔ انشاء اللہ کبھی کچھ اس موضوع پر لکھوں گی۔ بلکہ مجھے تو افسانے پر ایک کتاب ہی لکھنی چاہیئے۔ یوں میں تکنیک کے تنوع میں جو اضافے کر رہی ہوں اس میں آپ کا بھی ذکر ہو گا۔ تقسیم کے بعد میرے رائے میں دو ہی افسانہ نگار ایسے ابھرے ہیں جن کی کوئی ادبی SIGNIFICANCE ہے۔ ایک انتظار حسین، ایک آپ۔ ایک حد تک اشفاق احمد نے بھی اچھی چیزیں لکھی ہیں۔ اس موضوع پر میں فی الحال تو کچھ نہیں لکھ سکتی کیونکہ یونیورسٹی کے بکھیڑے ہیں اور میرا وقت اپنا نہیں ہے۔ کوئی چھ مہینے تک میں کچھ نہ لکھ سکوں گی۔

آپ کو اس کی شکایت ہے کہ وقار عظیم صاحب نے "ساقی" میں اپنے مضمون میں آپ کا یونہی ذکر کر دیا ہے۔ اب اسے کیا کہیے کہ عبادت بریلوی نے ساقی میں پچیس سالہ تنقید پر مضمون میں میرا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ حالانکہ بعض اونچے ادبی حلقوں میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں دو ہی وقیع نقاد ہیں۔ ایک عسکری صاحب ایک میں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی وجہ کا بھی اندازہ ہے کہ کیوں۔ میں اس لحاظ سے داد نہیں چاہتی کہ عورتوں میں میں ایک ہی نقاد ہوں۔ ادب میں عورت مرد کی تفریق کو کیوں لایا جائے۔ دونوں کی ادبی حیثیت ساتھ ساتھ متعین کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسے مضمون میں جس میں ان کا تک ذکر ہو جنہوں نے صرف ایک ایک دو دو تنقیدی مضمون لکھے ہیں، میرا نام تک نہ لیا جائے، یہ تعجب خیز ہے!

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ نے "ہندی مسلمان" کے بارے میں رپورتاژ لکھا ہے۔ ساقی نکلنے پر ضرور پڑھوں گی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ یہ ادبی بحران، یا "ادبی بخار" ہم دونوں کو ایک ساتھ ہوا ہے۔ میں نے بھی ان دنوں کافی چیزیں اور طویل چیزیں لکھ ڈالیں۔ امریکی انسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں سارے امریکی افسانے کا ایک طویل جائزہ بھی لیا ہے۔ "میگھ ملہار" کوئی اسی (۸۰) صفحات کا لکھ ڈالا۔ "نقوش" کے اصرار پر مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر" لکھا (یہ ان کے

بھی شائع کئے گئے افسانوں سے ضخیم انتخاب میں شامل ہے۔ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا) منٹو نمبر میں دو ایک مضامین لکھے۔ منٹو پر اپنی کتاب "نوری نہ ناری" تقریباً ختم کرلی۔ اور انگریزی میں، ہیمنگوے پر، منٹو پر مضامین لکھے۔ انگریزی ہی میں ناصر شمسی کے ڈراموں کا دیباچہ لکھا۔ غالباً اس کی وجہ بھی آپ کی سی ہو۔ بیوی کی شدید بیماری کی وجہ آپ کو تخلیق کی شدید تحریک ہوئی ہو تو شاید میری تخلیق کی اس شدید URGE کا باعث شاہین کی غیر حاضری کا احساس ہو۔

شاہین فروری میں آئیں گے۔ ان کی ڈاکٹریٹ کی تاریخ پھر ملتوی ہو گئی۔ یہ بھی عجیب مصیبت ہے۔ جانے ڈچ یونیورسٹیوں کے خداوؤں کو کیا سوجھی کہ ان کو ڈاکٹریٹ عطا کرنے کی تاریخ ملتوی کر کے ۲۱ جنوری کردی۔ کرسمس کی چھٹیوں کے بعد۔ حالانکہ ان کی تھیسس چھپ چکی ہے اور APPROVE بھی ہو چکی ہے۔۔ بہر حال جب اتنا انتظار کر لیا ہے تو دو ماہ اور سہی۔

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے

نیاز کیش

ممتاز شیریں

....

مشفق خواجہ

۲۵ / نومبر ۱۹۵۶ء

محترم تسلیم

ابھی ابھی گرامی نامہ ملا۔ شکر گذار ہوں۔

اب تک تو یہ عالم رہا کہ بہت سے لوگوں کی طرف سے پرچہ نہ ملنے کی شکایتیں آئیں مگر میرے خط سبھی لوگوں کو ملے۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ کو پرچہ تو مل گیا مگر خط نہ ملا۔ "تخلیق" کے ... میں اپنی رائے دیجئے۔ یقین کیجئے آپ کی رائے خواہ کیسی ہو، میرے لئے خوشی کا باعث ہوگی

آج کل یہاں کراچی میں آپ کے افسانے "گلبیا" کی بڑی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ہر طرف اسی کے تذکرے ہیں، اور اس کے چند جملے تو لوگوں نے زبانی یاد کر رکھے ہیں ۔۔۔ اور اس کہانی کے متعلق تو یہ بھی سنا ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی بڑی "مقبول" ہوئی۔ بہر حال بڑی خوبصورت اور "مزیدار" کہانی ہے!

مشفق خواجہ

ثناء اللہ
نیادور، کراچی

برادرم، تسلیم

کراچی میں یہ افواہ گرم ہے کہ نیادور پر مقدمہ چلنے والا ہے اس لئے کہ اس میں "گلبیا" ضمیر الدین احمد کا افسانہ بھی چھپا۔ دو ایک اخباروں میں خط بھی چھپے۔ ایک خط کا تراشہ بھجوا رہا ہوں۔

بہرحال ہم تو مقدمہ لڑنے کو تیار ہیں۔ اور وہ اس وجہ سے کہ ارباب اقتدار آخر اس بات کا ایک دفعہ فیصلہ تو کرلیں کہ کیا چیز فحش ہے اور کیا فحش نہیں ہے۔ ارادہ ہے کہ اس مقدمے کو سپریم کورٹ تک لڑا جائے۔ کیا خیال ہے؟

بھابی صاحبہ کی خدمت میں آداب، ماموں کو پیار

آپ کا
ثناء اللہ

....

رسالہ نیادور کا افسانہ

ایڈیٹر صاحب

آپ کی توجہ کچھ اردو افسانوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آج شریف گھروں میں سستے فلمی پرچے اس لئے نہیں پڑھے جاتے کہ ان میں مردانہ و زنانہ پوشیدہ بیماریوں اور ایسے ہی دوسرے امراض خبیثہ کی دواؤں کے اشتہارات کے علاوہ نہایت عریاں افسانے شائع ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں کے گھٹیا فلمی رسائل صرف [illegible] جاتے ہیں۔ مگر چند روز ہوئے میں نے اردو کا ایک بہت صاف [illegible] خوبصورت پرچہ "نیادور" خریدا۔ مجموعی طور پر اگرچہ یہ پرچہ بہت اچھا ہے لیکن اس میں ایک افسانہ "گلبیا" کے عنوان سے چھپا ہے جو اتنا عریاں ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کو نہیں پڑھ سکتا۔ یہ افسانہ جو مکالمات کی شکل میں ہے اپنے ہر مکالمے میں عریاں نویسی کے عروج کو چھوتا ہے۔ میرے گھر کے دوسرے افراد، ماؤں بہنوں نے بھی اس افسانے کو پڑھا اور میرے لئے ایک قیامت بپا ہوگئی جو کہ اسے گھر میں لانے کا ذمہ دار تھا۔ کیا "نیادور" کے ناشران مضامین اور افسانوں کے انتخاب میں دوبارہ احتیاط کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

اے۔ ایچ خان
نوشیرواں جی کمپاؤنڈ۔ صدر۔ کراچی

محمد عمر میمن
۲۰/ جون ۱۹۸۸ء

برادرم ضمیرالدین احمد صاحب

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔
خط اور کوائف بھیجنے کا شکریہ۔ ان دنوں بے حد مصروف رہا۔ دراصل کتاب کو ختم کرنے کی فکروں میں لگا ہوا ہوں۔ اگلے دس روز میں سارا کام نمٹا دینے کا ارادہ ہے۔ دیدہ باید!
عارف کی عنایت سے "شعور" کا پرچہ مل گیا تھا اور میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر آپ کے افسانے کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔ "سوکھے ساون" لاجواب ہے! طبیعت خوش ہو گئی۔ ہلکا سایہ غم بھی رہا کہ کہانی اتنی CULTURE SPECIFIC ہے کہ قرینے کا ترجمہ شاید مشکل ہی سے ہو۔ لیکن کوشش ضرور کروں گا۔ آہستہ آہستہ۔ کسی دن شاید ۰۰۰۰۰۰ ایک اور "دیدہ باید"!
"تشنہ۔ فریاد" بھی من کو بھائی ------ لیکن ظاہر ہے "سوکھے ساون" چیزے دیگری است! تیسری کہانی ۰۰۰۰ بعض اوقات قلم روک لینا بھی اتنی ہی شدید تخلیقی قوت کا طلبگار ہوتا ہے جتنا قلم کو بڑھنے دینا۔ یہ کہانی اچھی ہے، اپنے تھیم کے اعتبار سے۔ لیکن اسے ان دو کے ساتھ نہیں چھپنا چاہیئے تھا۔ بہرحال --- آپ کی ۳ کہانیاں یک مشت مل جائیں یہ کسی سوغات سے کم نہیں۔
محمد عمر میمن

••••••••••••••••••••••

بلراج مینرا
تیس مئی ۱۹۸۸ء

ضمیر بھائی،

دس مئی کو شام کو لاہور سے لوٹنے پر آپ کا تیرہ اپریل کا خط ملا تھا --- میں اکیس اپریل کو لاہور چلا گیا تھا۔ لاہور، فیصل آباد، راولپنڈی اور اسلام آباد میں اس قدر محبتیں ملیں کہ جی اداس ہو گیا --- میں اتنی محبت کے قابل کہاں ہوں؟
حالت یہ ہے کہ ہمت نہیں ہے، دوستوں کو خط لکھ سکوں --- اب بمشکل خود کو سمیٹ کر، میمن کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔
پاکستان میں، یہاں ہر جگہ اور ڈھاکہ میں بھی، آپ کی کہانیاں "تشنہ۔ فریاد" اور "سوکھے ساون" بہت بہت پسند کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے جو حد سے زیادہ مبارکباد دی گئی ہے۔ وہ آپ قبول کیجئے۔
"شعور: ساتویں کتاب" کی روپ ریکھا ترتیب دے رہا ہوں --- منٹو کی نو غیر مطبوعہ

کہانیوں کی شمولیت کے سبب "شعور" کی اہمیت اور میری ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ زبردست افسانہ / افسانے لکھے ہوں تو، میری پچھلی "حماقت" بھول کر، فوراً بھیج دیجئے۔ بیس اپریل کی شام کوئی بادس پہنچنے پر افسانوں کے تراشے مل گئے تھے۔

بھابی کو آداب

آپ کا

بلراج مین را

(۲)

۲۰ / جون ۱۹۸۷ء

ضمیر بھائی

اب کہاں سے بات شروع کروں؟

ندامت کا بوجھ ایک طرف تو دوسری طرف یہ خدشہ کہ جانے آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے، بس پریشان ہوتا رہا اور خط لکھنے کی ہمت پیدا نہ کر سکا۔ آپ کو پالینا بڑی بات تھی، آپ کو کھو دینا مجھے منظور نہیں، حالانکہ میری طویل بے معنی خاموشی مجھے خوف دلاتی رہی ہے۔

ہر سمے یہ سوچتے رہنے کے باوجود کہ آپ کو خط لکھنا ہے خط نہ لکھ سکا۔ اس سلسلے میں اگر میں نے مزید بات کی تو ممکن ہے اداسی مجھے گھیر لے اور یہ خط مکمل نہ ہو سکے --- تو پیارے بھائی، ہزار معافیاں --- خاص طور پر بھابی جان سے۔ جب میں نے "تشنہ فریاد" پڑھی تھی، میرے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے تھے اور میری اداسی بہت زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ مجھے اس کلچر کے گھناؤنے رخ سے کہیں زیادہ بے نام مرکزی کردار کے المیے نے متاثر کیا۔ المیہ جھنجھوڑتا ہے اور جب ہم سنبھلتے ہیں، تب گھناؤنا کلچر، ہم محسوس کرتے ہیں NARRATOR کی دبی دبی سی خواہش کے باوجود READER کے من میں تو اس عورت کے لئے عزت اور محبت ہی پیدا ہوتی ہے۔ درد مندی بڑے ادب کی ایک پہچان ہے --- ہزار معافیوں کے بعد اب ہزار مبارکیں۔

نیویارک کی شام واقعی "تشنہ فریاد" کو COMPLEMENT کرتی ہے --- اور SEQUENCE یوں بنتا ہے۔ (۱) تشنہ فریاد (۲) نیویارک کی ایک شام (۳) سوکھے ساون۔ اسی ترتیب سے تینوں کہانیاں شامل کر رہا ہوں --- اکتوبر میں پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ "پروائی" اب تک مجھ سے دور ہے۔

بھابی جان کی خدمت میں آداب

آپ کا

بلراج مین را

اسلم فرخی

۸/دسمبر ۱۹۸۸ء

برادرم۔ السلام علیکم

کل تمہارا ایک دستی خط موصول ہوا۔ اس سے قبل ایک خط اور بھی ملا تھا مگر میں دلی جارہا تھا اس لئے جواب نہ بھیج سکا۔ تمہارا دوسرا خط مجھے نہیں ملا۔ ڈاک میں بڑی گڑبڑ رہتی ہے۔ بیشتر خطوط ضائع ہوجاتے ہیں یا وقت پر نہیں پہنچتے۔

میں نے تمہاری تینوں کہانیاں بڑے انہماک سے پڑھیں۔ فتح گڑھ، تمہارا مکان، اپنا ماحول، عہد جوانی سب کچھ شدت سے یاد آتا رہا۔ بڑی خوبصورت، دلاویز کہانیاں ہیں اور میرے لئے پہلی دو کہانیوں میں غیر معمولی کشش ہے۔ تیسری کہانی بھی بڑے پائے کی ہے مگر پہلی کہانیوں میں جو جذباتی وابستگی محسوس ہوئی اس نے تیسری کا اثر میری حد تک قدرے کم کردیا۔

تمہارا مضمون مکمل ہوگیا۔ بہت اچھا ہوا۔ اس کا فوٹو اسٹیٹ مجھے فوری طور پر بھجواؤ۔ رسالے کی حد تک اشاعت کی بات تو یہ ہے کہ "اردو" میں بھی چھپ سکتا ہے بشرطیکہ تند و تیز نہ ہو کیونکہ "اردو" تند و تیز تحریروں کا تحمل نہیں ہوسکتا۔ کتابی صورت میں اشاعت منظور ہو تو اس کا انتظام بھی ہوسکتا ہے۔ میں اپنی نگرانی میں کتابت کرواکے شائع کردوں گا۔ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ مضمون کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ شائع کئے جا[illegible] [illegible] سے مضمون کی وحدت اور مجموعی تاثر ختم ہوجائیں گے۔ رسالے بھی اتنی دیر دیر سے [illegible] پڑھنے والے مضمون کے تسلسل کو برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ ویسے بہتر یہ ہوگا کہ سو صفحات کا مضمون کتابی صورت میں شائع ہو تاکہ اس کی ایک حیثیت قائم ہوسکے۔ تم جو فیصلہ بھی کرو اس کے مطابق آسانی سے عمل درآمد ہوسکتا ہے۔

آصف طب کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہارورڈ چلے گئے۔ غالباً اگلے سال واپس آئیں گے چونکہ ان سے اکثر علمی ادبی گفتگو رہتی تھی لہٰذا میرے لئے گھر میں بڑا سناٹا ہوگیا۔

امید کہ تم بخیر ہوگے۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں آداب

تمہارا

اسلم

....

شمس الرحمن فاروقی

۱۳/دسمبر ۱۹۸۸ء

"نیا دور" کراچی میں آپ کا افسانہ "پروائی" پڑھ کر عجب فرحت مسرت کا

احساس ہوا کہ آپ افسانہ نگاری کی طرف پھر مائل ہیں ۔ میں نے " پروائی " کی نقل بنوا کر " شب خون " میں اشاعت کے لئے دے دی اور آپ کے پتے کی فکر میں تھا ۔ میرا خیال تھا کہ آپ پاکستان میں ہی ہیں ، اس لئے وہاں لکھا ۔ پھر میمن نے بتایا کہ آپ لندن میں ہیں ، افسوس ہوا کہ یہ بات اس نہ معلوم تھی جب میں اس سال مارچ میں لندن میں تھا ۔ میمن سے آپ کا پتہ لے کر کاغذوں میں رکھ دیا کہ خط لکھوں گا ۔ لیکن میری مصروفیت اور کاہلی دونوں ہی غضب کی ہیں ۔ پرچہ چھپ بھی گیا (" شب خون " بوجوہ بہت دیر دیر سے نکلتا ہے) اور میں اسی خیال میں رہا کہ آپ کو خط لکھوں ۔

اب اگلا شمارہ بھی آگیا ، ادھر آپ کا محبت نامہ بھی " شب خون " کے ذریعہ ملا ۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ اب تک اس قدر تساہل برتا رہا ۔ انشاء اللہ اب ایسا نہ ہوگا ۔

آج ہوائی ڈاک سے " شب خون " (۱۵۰) اور (۱۵۱) کا پیکٹ روانہ کیا ہے ۔ یقین ہے کہ اس خط کے ساتھ ہی یا ایک دو دن آگے پیچھے ملے گا ۔ استدعا ہے کہ جواب میں ایک افسانہ بھی روانہ فرمائیں ۔ پاکستان میں چھپ چکا ہو یا چھپنے والا ہو تو کوئی قباحت نہیں ۔ یہاں " شعور " میں آپ کے دو افسانے دیکھے ۔ " سوکھے ساون " پڑھ کر تڑپ اٹھا ۔ خدا نے آپ کو متوسط طبقے کے مسلمان مرد عورت کی روح سے وہ آشنائی عطا کی ہے کہ بس ۔ اور آپ کا افسانہ اب پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ UNDERSTATED ہو گیا ہے ۔ دل سے بے اختیار آفریں نکلتی ہے ۔ آپ کے [illegible] کے افسانے ہمارے ادب پر مستقل نقش چھوڑ گئے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ [illegible] نقادوں کا حافظہ کمزور اور مطالعہ [illegible] ہوتا ہے لیکن سنجیدہ پڑھنے والوں کو آپ اچھی طرح یاد ہیں ۔ چند مہینے ہوئے شہریار سے آپ کا ذکر رہا ۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا

نیاز مند

شمس الرحمن فاروقی

....

فراق گورکھپوری

26-11-46

محبی ضمیر صاحب ۔ خط ملا ۔ تاباں صاحب کی نظموں کے مجموعہ کے لئے بجائے نغمہ ۔ بر ہم کے " ساز لرزاں " کیسا نام رہے گا ؟ مقدمہ کر سمس میں لکھنے کا ارادہ ہے " انگلیاں تیرگی چٹکاتی ہے ..... میں " انگلیاں " کی الف نہیں دبتی اور " تیرگی انگلیاں چٹکاتی ہے " میں دبتی ہے ، اس لئے انگلیاں پہلے رکھا ہے ۔ الف کا دبنا مجھے ناپسند ہے اور کوئی ناگواری بھی اس [illegible] نہیں پیدا ہوتی

نیاز صاحب اور دیگر لوگ جو مجھ سے کچھ برہم یا میری شاعری یا تنقید سے بدگمان ہیں وہ واقعی بے وجہ ہے۔ لیکن کس کس کی زبان پکڑی جائے۔ میں اپنا کام برے بھلے کئے جا رہا ہوں۔ زمانہ بہتر فیصلہ کرے گا۔ خیر اندیش: فراق

اختر اورینوی اور شمیم افزا قمر کے نام

(عزیز احمد کی ناول نگاری پر مقالہ لکھ کر محترمہ شمیم افزا قمر نے ڈی لٹ کی ڈگری لی ہے۔ ڈاکٹر شمیم افزا قمر نے اپنے مقالے کی تکمیل کے دوران عزیز احمد سے خط و کتابت کی تھی اور ان سے ان کی سوانح بھی منگوائی تھی۔ یہ خطوط اور یہ سوانح ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ شمیم افزا قمر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "کاغذی پیرہن" اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ ویسے شمیم افزا قمر ڈرامے بھی لکھتی ہیں اور ان دنوں شعبۂ اردو، بھاگلپور یونیورسٹی (بہار) میں لکچرار ہیں۔

ان خطوط میں دو خط اختر اورینوی کے نام ہیں جو افسانہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن انھوں نے ڈرامے اور ناول بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔ استاد کی حیثیت سے بھی بے حد مقبول رہے۔ عزیز احمد انہیں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

درج ذیل خطوط اور سوانح کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ان میں عزیز احمد کا ظاہر و باطن ایک نظر آتا ہے اردو ادب میں ان سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں رواج پا چکی ہیں۔ یہاں چند غلط فہمیوں کی تردید عزیز احمد نے خود کی ہے ——————— ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

ٹورنٹو۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء

محترمہ شمیم افزا صاحبہ! سلام علیکم

آپ کا اور اختر اورینوی صاحب کا گرامی نامہ ملا۔ یہ میری بڑی قدر افزائی ہے کہ آپ اختر اورینوی صاحب کی زیر نگرانی میرے ناولوں اور مختصر افسانوں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہی ہیں۔ اگرچہ کہ میں ہرگز اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ میں انشاء اللہ دو ہفتے کے اندر آپ کے سوالات کا تفصیلی جواب بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

اگر آپ چاہیں تو دو اور اصحاب سے میرے ناولوں اور مختصر افسانوں کے متعلق خط و کتابت کر سکتی ہیں۔ جنہوں نے ان پر کام کیا ہے۔

(۱) ریاض احمد چودھری۔ انکا پتہ یہ ہے:

ریاض احمد چودھری
بمعرفت قوسین لمیٹڈ
تھارنٹن روڈ ۔ لاہور

انھوں نے اپنا ایم ۔ اے کا مقالہ میرے ناولوں پر وقار عظیم صاحب کی زیرِ نگرانی لکھا تھا ۔

(۲) دوسرے :

عبدالسّلام صاحب
لکچرار شعبۂ اردو
کراچی یونیورسٹی ۔ کراچی

انھوں نے "اردو ناول بیسویں صدی میں" کے عنوان سے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کا مقالہ لکھا تھا جس میں ایک باب میرے متعلق ہے ۔

پشت پر ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کے نام خط ہے جو ان تک پہنچا دیجئے گا ۔ عنقریب آپ کو تفصیلی جواب دوں گا ۔

کمترین دعاگو : عزیز احمد

ٹورنٹو ۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۰ء

مکرمی و محبّی جناب اختر اورینوی صاحب ! سلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا ۔ یاد آوری کا بہت شکریہ ۔ آپ کی چند سطور پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی کیونکہ مجھے ہمیشہ سے آپ کی تحریروں کی وجہ سے آپ سے نیاز حاصل تھا ۔ میں آپ کی طالبہ شمیم افزا صاحبہ کے سوالات کا جواب انشاء اللہ دو ہفتے میں روانہ کر دوں گا ۔ والسلام

آپ کا خادم : عزیز احمد

ٹورنٹو ۔ یکم نومبر ۱۹۷۰ء

محترمہ شمیم افزا صاحبہ ! سلام علیکم

میں آپ سے بہت معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے سوالات کا جواب دینے میں تاخیر ہوئی ۔ جواب بہر حال اب ارسالِ خدمت ہے ۔

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنے THESIS کی ایک نقل مجھے بھیج سکیں ۔ عاریتاً ۔ صرف پڑھنے کے لئے ۔ پڑھ کر میں واپس کر دوں گا ۔

اختر اور رضوی صاحب کو سلام نیاز۔ کمترین دعاگو: عزیز احمد

(۱) سنہ پیدائش ۱۹۱۴ء۔ دادھیال کاکوری کا ہے اور ننھیال بانسہ شریف ضلع بارہ بنکی کا۔ خود حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا۔

(۲) والدین کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ میں چھ برس کا تھا جب والد کا انتقال ہوا اور نو سال کا تھا جب والدہ کا انتقال ہوا۔ ماموں نے پرورش کی۔ دو بہنیں تھیں۔ ایک شادی کے ایک سال بعد زچگی میں فوت ہو گئی (۱۹۳۶ء) دوسری زندہ ہے۔ ۱۹۴۰ء میں شادی ہوئی۔ تین بچے ہیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ تینوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔

(۳) ابتدائی تعلیم عثمانیہ ہائی اسکول عثمان آباد میں ہوئی۔ وہاں سے میٹرک درجہ اول میں کیا۔ پھر حیدرآباد آگیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے درجہ اول میں کیا اور ساری یونیورسٹی میں اول آیا۔ سرکاری اسکالرشپ سے لندن گیا۔ وہاں سے انگریزی ادب میں بی۔ اے آنرز ۱۹۳۸ء میں درجہ دوم میں کیا۔ بچپن سے کتب بینی کا شوق رہا اور اب تک ہے۔ مناظر فطرت سے ہمیشہ بہت دلچسپی رہی۔ طالب علمی کے زمانے میں تقریباً سارے یورپ کا سفر کیا۔ اس کے بعد جنوبی امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا کے علاوہ تقریباً ساری دنیا گھوم چکا ہوں۔

(۴) فنی اثرات: یورپ کے نشاۃ ثانیہ کی مصوری اور سنگتراشی پسند رہی۔ ناقدوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ یورپ کے تنقید نگاروں کا مجموعی طور پر بہت اثر رہا۔

(۵) ادبی ذوق طالب علمی کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ سب سے پہلی چیز جو شائع ہوئی وہ کپلنگ کے ایک افسانے کا ترجمہ تھا جو "نیرنگ خیال" لاہور میں شائع ہوا۔ مقامی شہرت کا آغاز "کالج کے دن" نامی ایک ڈرامے سے ہوا جو جامعہ عثمانیہ کے کالج ڈے میں ۱۹۳۱ء میں تمثیل کیا گیا۔ میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔

(۶) ہوس۔ ۱۹۳۱ء۔ تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ بہت ناقص اور میرے لئے باعث شرم ہے۔

مرمر اور خون۔ ۱۹۳۲ء۔ تھرڈ ایئر۔ بہت ناقص اور باعث شرم۔

گریز۔ ۱۹۴۰ء — آگ۔ ۱۹۴۶ء

ایسی بلندی ایسی پستی۔ ۱۹۴۷ء — شبنم۔ ۱۹۵۰ء

اس طرح تخلیق کے دو دور ہیں۔ ایک ۱۹۳۱-۳۲ء کا جو طالب علمانہ ہے اور ایک ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک جب مجھ پر ترقی پسندی کی تحریک کا بہت اثر تھا..... ۱۹۵۱ء میں شاہد احمد دہلوی اور رفیعہ سلطانہ وغیرہ نے بہت سے مضامین میرے خلاف لکھے۔ میں نے ناول نگاری چھوڑ دی۔

(۷) نظریۂ فن ۔ فطرت نگاری ہے ۔ واقعات جس طرح زندگی میں پیش آئے ہیں اسی طرح بے کم و کاست قلم بند کئے جائیں۔
اپنی شخصیت کا تجزیہ — یہ میرے لئے بہت مشکل ہے ۔

(۸) میں "آگ" کو اپنا سب سے اچھا ناول سمجھتا ہوں ۔ اس کے بعد "ایسی بلندی ایسی پستی" کو (ایسی بلندی ایسی پستی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر رالف رسل ، لندن یونیورسٹی نے کیا ہے اور عنقریب لندن سے کارج آلون اینڈ آن وِن اسے شائع کر رہے ہیں)

(۹) ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک عثمانیہ یونیورسٹی میں لکچرار رہا ۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک شاہزادی درشہوار کا پرائیویٹ سکریٹری رہا ۔ لیکن یونیورسٹی میں LIEN باقی رہا ۔ ۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کا ریڈر مقرر ہوا ۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلا گیا اور وہاں محکمۂ مطبوعات و فلم سازی میں پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ، پھر ڈپٹی ڈائرکٹر ہوا اور ۱۹۵۳ء میں ڈائرکٹر مقرر ہوا ۔ ۱۹۵۷ء میں لندن یونیورسٹی میں اردو کا OVER SEAS LECTURER مقرر ہوا اور (LIEN) وہاں ۱۹۶۲ء تک رہا ۔ ۱۹۶۲ء میں ٹورنٹو یونیورسٹی میں اسلامیات کا اسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہوا اور ۱۹۶۸ء میں اسلامیات کا پروفیسر مقرر ہوا ۔ اسی عہدے پر اب تک ہوں ۔

(۱۰) موجودہ مستند تاریخ : یورپ اور کنیڈا آنے کے بعد سے چار کتابیں اور علمی اور تحقیقی رسالوں میں بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی ہے ، جو اردو ناول نگار کی حیثیت سے شہرت سے کہیں زیادہ اور بدرجہا اہم ہے ۔ چاروں کتابوں کے عنوان حسب ذیل ہیں ۔

1. Studies in Islamic Culture in the Indian enlistment, clanedon Press, Oxford - 1964, 1966, 1970.
2. Islamic Modernism in India and Pakistan, Oxford University Press London 1967,1970.
3. An Intellectual History of Islam in India, Edinburgh University Press, Edinburgh 1969.
4. Muslim self- statement in India and Pakistan (in collaboration with professor Gustave Evon Gruneboun) Otto Harrassowitz Wiesbaden.

(۱۱) میں نے پچھلے دس سال میں دو اردو ناول پڑھے ہیں "اداس نسلیں" اور "آگ کا دریا"۔ دونوں مجھے بہت پسند آئے۔ چونکہ اب اردو ادب سے بہت غیر متعلق ہوگیا ہوں اس لئے جدید ناول کے متعلق کوئی خاص رائے نہیں رکھتا۔

(۱۲) میرے سب ناولوں کے پلاٹ حقائق زندگی پر منحصر ہیں۔

(۱۳) "تری دلبری کے بھرم" کے بعد کوئی ناول یا افسانہ قسم کی چیز نہیں لکھی۔

(۱۴) میرے مختصر افسانوں کے دو مجموعے "رقص ناتمام" اور "بیکار دن بیکار راتیں" شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد کچھ طویل افسانے "ماہ نو" اور "نیا دور" میں شائع ہوئے۔

ٹورنٹو۔ ۲۸ نومبر ۱۹۷۲ء

محترمہ شمیم افزا صاحبہ! سلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ میرے پاس بھی "شبنم" کی کوئی جلد نہیں۔ "حرف گریز" ہے۔ "مرمر اور خون" میرے طالب علمی کے زمانے کی تصنیف ہے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ "برے لوگ" میرا نہیں۔ "تری دلبری کا بھرم" ناول نہیں، افسانہ ہے اور "نیا دور" میں شائع ہوا تھا۔

آپ اور قمر صاحب مع اپنے بچوں کے اگر کینیڈا آنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ:

۱۔ پہلے آپ لوگ کینیڈا IMMIGRATION کو درخواست دیں۔ میرا نام بطور Refree کے ضرور استعمال فرمائیے

۲۔ ساتھ ہی ساتھ قمر صاحب کے لئے دو صورتیں ہیں:

پہلی یہ کہ وہ University of Toronto کے Dept. of English کو لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کے داخلے کا فارم منگوائیں اور یہ فارم پُر کر کے یونیورسٹی آف ٹورنٹو کے Dept. of English کو بھیج دیں اور گرانٹ کے لئے درخواست دیں جو غالباً انھیں مل جائے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ لوگ امیگریشن لے کر یہاں آجائیں اور قمر صاحب EDUCATION میں ایک ڈگری لے لیں۔ جس کے بعد انہیں اسکول میں انگریزی پڑھانے کی نوکری آسانی سے مل جائے گی۔ یہاں یونیورسٹیوں اور اسکولوں کی تنخواہوں میں زیادہ فرق نہیں۔

اب یہاں کینیڈا بھر میں اردو پڑھانے کی کوئی جگہ خالی نہیں۔ اس لئے اگر آپ نوکری کرنا چاہیں تو آپ کو لائبریری سائنس میں یہاں ڈگری لینا پڑے گی جس کے بعد لائبریری میں نوکری مل جائے گی۔

اختر اور ینوی کی بیماری کی خبر سن کر تکلیف ہوئی۔ خدا انہیں جلد شفا دے۔ جب وہ کینیڈا آئے تھے میں یورپ میں

تھا۔ اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔ جس کا بہت افسوس ہے۔

میری رائے تو یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ اپنا مقالہ ختم کر دیں۔ جو کتابیں نہ مل سکیں اس حد تک مجبوری ہے۔
آپ کے اور قمر صاحب کے ایک دوست اوٹاوا سے یہاں آئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آپ دونوں کا ذکر کر رہے تھے۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو ضرور تحریر فرمائیں۔ کمترین: عزیز احمد

ٹورنٹو۔ ۲۹ مارچ ۱۹۷۳ء

مشفقی و محبی پروفیسر اختر اورینوی صاحب! سلام علیکم

چند سال ہوئے آپ کا گرامی نامہ شمیم افزا صاحبہ کے خط کے ساتھ آیا تھا۔ جس سے معلوم ہوا تھا کہ شمیم افزا صاحبہ میرے ناولوں کے متعلق اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر فرما رہی ہیں۔
معلوم نہیں شمیم افزا صاحبہ نے اس موضوع پر اپنا مقالہ لکھا یا کسی اور موضوع پر۔ اگر اس موضوع پر لکھا ہو تو کیا اس کا کوئی امکان ہے کہ آپ یا وہ اپنا مقالہ مجھے عاریتاً بھیج دیں۔ میں پڑھ کر فوراً واپس کر دوں گا۔
شمیم افزا صاحبہ کا پتہ میرے پاس تھا لیکن گم ہو گیا۔ اگر آپ اُن کا پتہ لکھ بھیجیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ شمالی امریکہ میں اردو کے لئے جونیر ہوتی رہتی ہیں اور اکثر یونیورسٹیاں مجھ سے پوچھتی ہیں کہ اگر کوئی مناسب آدمی میری نظر میں ہو تو اس کا نام بتاؤں۔ اگر شمیم افزا صاحبہ کو شمالی امریکہ آنے اور یہاں پڑھانے سے دلچسپی ہو تو ان سے فرمائیے کہ وہ اپنے Qualification. کی فہرست مجھے بھیج دیں۔
آپ فرمائیں آپ کی صحت کیسی ہے۔ شاید میرا کبھی پٹنہ آنا ہو۔ کیونکہ خدابخش لائبریری میں بڑے قابلِ قدر مخطوطات ہیں جن سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو تحریر فرمائیں۔ کمترین: عزیز احمد

ٹورنٹو۔ ۵ فروری ۱۹۷۶ء

محترمہ شمیم افزا صاحبہ! سلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ آپ کو بحری ڈاک سے "گریز" روانہ کر رہا ہوں۔ مگر اس کے پہنچتے پہنچتے تین چار مہینے لگ جائیں گے۔
"برے لوگ" قطعاً میری تصنیف نہیں۔ کسی اور عزیز احمد کی ہوگی۔ "تری دلبری کا بھرم" البتہ میرا طویل مختصر افسانہ تھا اور "نیا دور" میں شائع ہوا تھا۔ دوسری تصانیف کی کاپیاں میرے پاس نہیں۔
قمر صاحب کب Post doctorate کے لئے امریکہ جائیں گے۔ آپ بھی ضرور ساتھ آئیں۔ ان کو اور اختر صاحب کو سلام۔ دعاگو: عزیز احمد

ٹورنٹو

عزیزہ بیٹی شمیم افزا اسلم! دعا

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کا مقالہ مکمل ہوگیا۔ خدا کرے میری زندگی ہی میں مجھے مل جائے۔ جس قدر جلد ممکن ہو سکے بھیج دیجئے۔ "گریز" اپنے پاس رہنے دیجئے۔ اس کی ایک کاپی میرے پاس ہے۔ آپ C.C. لا کے چیرمین پروفیسر ستیش چندر کو براہِ راست خط لکھئے اور بتائیے کہ جس عزیز احمد ناول نگار کے متعلق آپ نے مقالہ لکھا ہے وہ وہی عزیز احمد مورّخ ہے جس کی کتابیں وہ پڑھ کر قدر افزائی کر چکے ہیں اور جب دو دن کے لئے ٹورنٹو آئے تو دو مرتبہ وقت نکال کے بڑی محبّت سے مجھ سے ملنے آئے۔ انھیں لکھئے کہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے مجھ سے ذاتی پرخاش کی وجہ سے مخالفت کی ہے۔ اور مقالہ اردو کے کسی اور ممتاز پروفیسر یا ادیب کو رائے کے لئے بھیجیں مثلاً علی سردار جعفری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر خورشید الاسلام یا پروفیسر ظ. انصاری۔

اگر وہاں سے نہ ہو سکے تو علی سردار جعفری کو لکھئے کہ کیا وہ اُسے شائع کرنے میں مدد کریں گے۔ جمیلہ ہاشمی صاحبہ کو بھی لکھئے۔ وہ غالباً شائع کرنے کا انتظام کر سکیں۔ ان کا پتہ میرے پاس کھو گیا۔ آپ کے پاس ہو تو روانہ فرمائیں۔

قمر صاحب کو اور آپ کے بچّوں کو دعا۔ دعاگو: عزیز احمد

"یہ اشعار ۱۹۸۳ء میں کراچی میں ایک کرم فرمانے دئے تھے جن کا اصرار تھا کہ میں عزیز احمد پر کچھ لکھوں۔ حفیظ الکبیر قریشی کے عزیز احمد سے اچھے مراسم تھے اس لئے عزیز احمد کی بیاض سے انھوں نے نقل کرائے ہوں گے یا عزیز احمد نے انہیں دئے ہوں گے اور انہوں نے شاہد رزاقی سے نقل کرائے ہوں گے۔ یہ اشعار بڑی کیفیت رکھتے ہیں۔ محقق نقاد مورخ مترجم ناول نگار اور افسانہ نگار عزیز احمد ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ اُن کی پہلی نظم "سنبوریتا" "انتخاب جدید" میں انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی تھی۔ یہ انتخاب عزیز احمد کے اور میرے اشتراک کا نتیجہ تھا اور ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا یہ کل ایکسو بیس اشعار ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اردو کے کسی اور شاعر نے اس سے پہلے اس موضوع پر اس طرح کی شاعری نہیں کی ہے۔ ایک طرف اس کرب کا اندازہ ہوتا ہے جس سے عزیز احمد گذرے۔ دوسری طرف اُن کی قدرت کلام اور اُن کے میلانِ طبع کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ اشعار بہرحال یادگار رہیں گے۔

"سوغات انہیں اگر ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دے تو اچھا ہو۔"

آل احمد سرور

صیدِ تن و شکنجۂ خرچنگ دوستو!

تغزل بہ سلسلہ آغوش مرگ

۱۲۰

ایک سو بیس اشعار

عزیز احمد (مرحوم)

گھبرا کے ہم تو عرصۂ جاں سے نکل گئے

دو نظمیں

۱: سنوریتا

۲: فردوس بر روئے زمین

بشکریہ:

انتخاب جدید، نیا دور

عطیہ: حفیظ الکبیر قریشی

نقل بدستِ خاص: شاہد رزاقی

"عزیز احمد بڑے جامع حیثیات آدمی تھے۔ ایک محقق، مترجم، نقاد، مورخ، افسانہ نگار۔ ایک جامع مضمون میں اِن سب پہلوؤں کا جائزہ ہونا چاہیئے۔ "سب رس" پر ان کے مضامین جو رسالہ "اردو" (پاکستان) میں چھپے تھے اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انہوں نے "سب رس" کے ماخذ کی تلاش کا سلسلہ فرانس کے ازمنہ وسطیٰ کے رومانوں سے ملایا ہے۔ اُن کے تراجم میں "بوطیقا" (ارسطو) اور شیکسپیئر کے ڈرامے "رومیو اور جیولیٹ" کے علاوہ دانتے کی "طربیۂ خداوندی" اور ابسن کے "معمارِ اعظم" کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ سب ترجمے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے لیم کی چنگیز خان پر کتاب کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ آج کل اس کتاب کا "جامعہ" دہلی میں قسطوں میں ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ زبیر مسعود نے بجا طور پر لیم کے عزیز احمد پر اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تراجم پر عزیز احمد کے دیباچے بھی ان کی تنقیدی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔

وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے۔ مولوی عبدالحق نے ان کی بڑی ہمت افزائی کی۔ مولوی صاحب نے خود مجھ سے عزیز احمد کی صلاحیتوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ کچھ دن شاہزادی دُرِّ شاہوار کے اسٹاف میں بھی رہے اور اس کے ساتھ کشمیر گئے، جس کی یادگار اُن کا ناول "آگ" ہے۔ آزادی کے بعد وہ کراچی چلے گئے اور حکومتِ پاکستان کے شعبۂ اطلاعات سے وابستہ رہے۔ لیکن یہاں سے بددل ہو کر غالباً ۱۹۵۷ء میں لندن چلے گئے اور وہاں لندن اسکول آف اورینٹل اور افریقن اسٹڈیز سے وابستہ ہو گئے۔ ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۳ء میں اردو کانگریس، حیدرآباد میں ہوئی۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے اس لئے واقف تھے کہ مولوی عبدالحق نے مجھے غالباً ۱۹۴۲ء میں انتخابِ جدید کا ایک مسوّدہ بھیجا جو عزیز احمد نے مرتب کیا تھا۔ میں نے اُس میں کچھ اضافہ تجویز کیا تھا۔ اُس اضافے کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں میرے اور عزیز احمد کے نام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کی۔ عزیز احمد نے میری کتاب "نئے پرانے چراغ" پر "سوغات"★ بنگلور میں تبصرہ بھی شائع کیا۔

کراچی سے بھی وہ خط لکھتے رہتے تھے۔ ان سے دوسری اور آخری ملاقات ۱۹۷۰ء میں ماسکو میں ہوئی۔ میں یہاں انٹرنیشنل اورینٹلسٹس کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ساتھ گیا تھا۔ عزیز احمد لندن کے ایک وفد کے ساتھ آئے تھے جس کے سربراہ پروفیسر طیبی تھے اور جس میں آر۔ ایس۔ شرما اور متین زبیری

★ یہ تبصرہ "نیا دور" بنگلور میں شائع ہوا تھا۔ (م۔ ا۔)

بھی شامل تھے۔ یہیں انہوں نے بتایا تھا کہ اب اُن کا میلان تاریخ کی طرف ہو گیا ہے اور اب وہ ادب کی بجائے تاریخ پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی اشارہ کیا تھا کہ وہ کناڈا میں مستقل قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔ غالباً سال بھر بعد وہ وہاں چلے گئے۔ میں جب ۱۹۶۹ء میں شکاگو میں تھا تو واپسی پر کناڈا جانے اور عزیز احمد سے ملنے کا بھی خیال تھا۔ عزیز احمد نے اپنے یہاں قیام کی دعوت بھی دی تھی مگر مجھے مانٹریال سے جلد لندن پہونچنا تھا اس لئے ٹورنٹو کا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ عزیز احمد نے جدید ہندوستان میں، خصوصاً انیسویں صدی میں برِ صغیر میں اسلامی جدیدیت پر بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے۔ آخر میں وہ کینسر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس موذی مرض میں مریض کے سامنے ہر وقت اُس کا انجام رہتا ہے۔

یہ ایک سو بیس [۱۲۰] اشعار مجھے کراچی میں ایک کرم فرما سے ملے۔ اشعار حفیظ الکبیر قریشی کا عطیہ ہیں جنھیں شاہد رزاقی نے نقل کیا ہے۔ یہ کرم فرما جن کا نام اب یاد نہیں آتا ہے، چاہتے تھے کہ میں عزیز احمد پر کوئی مفصّل مضمون لکھوں۔ یہ اشعار پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ اردو میں اس موضوع پر ایسے اشعار کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ پھر یہ اشعار بڑی کیفیت رکھتے ہیں۔ ان میں ایک حزنیہ فضا کے علاوہ عزیز احمد کے درد و داغ و سوز و ساز کے بڑے بھرپور نقش بھی ملتے ہیں۔ عزیز احمد کی شاعری کا پہلا نمونہ جو میری نظر سے گذرا وہ "سینور ریتا" ہے جو "انتخابِ جدید" میں شامل ہے۔ ان کی کچھ غزلیں بھی شاید کچھ رسالوں میں نکلی تھیں مگر یہ ایک سو بیس [۱۲۰] اشعار شاید پہلی دفعہ منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔

عزیز احمد کے افسانوں اور ناولوں پر تو "سوغات" میں ایک گوشہ شائع ہو چکا ہے مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن کے ناولوں اور افسانوں پر ایک الگ کتاب ہو، تراجم پر ایک الگ کتاب، تنقید پر الگ کتاب اور تاریخی کتابوں پر الگ جائزہ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سب پہلوؤں پر ایک جامع کتاب لکھی جائے۔ اردو ادب کو عزیز احمد نے بہت کچھ دیا ہے۔ ان کی شخصیت پر کچھ لوگوں کی چینِ جبیں کی وجہ سے اُن کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ "بوطیقا" کا ترجمہ ہو یا "اقبال ایک نئی تشکیل" "رومیو جیولیٹ" کا ترجمہ ہو یا اُن کے افسانے اور ناول، اُن کے تاریخی مطالعے ہوں یا "تب رس" پر مضامین، اُن کا "طربیۂ خداوندی" کا ترجمہ ہو یا اُن کی شاعری، سب میں اُس یگانۂ روزگار اور ہمہ جہت شخصیت کا لازوال نقش مل جائے گا۔"

آل احمد سرور —— علی گڈھ

یہ محفل ختم ہے اب لو خدا کا نام اے یارو   یہ ہے پیرِ مغاں کا آخری پیغام اے یارو

نہ یہ شام و سحر ہوگی، نہ باقی روز و شب ہونگے   کہ پیچھے چھوڑ دیں گے گردشِ ایام اے یارو

اور شہروں میں سُنی محفلِ یاراں ہی کی بات   نہ حکایت کبھی ایسی نہ شکایت اتنی

تیرِ مژگاں بھی کبھی اُن کو پہونچنے نہ دیا   گو خودی سے رہی آنکھوں کو محبّت اتنی

نشتر ذرا چمک کہ رگِ جاں قریب ہے
مضمون اب آ گرہ سُرخیِ عنواں قریب ہے

کرتی نہیں ہے خاکِ بیاباں کسی میں فرق
نقشِ قدم سے افسرِ سلطاں قریب ہے

سب در کھلے ہوئے ہیں نہ مہماں نہ میزباں
دُزد اب نہیں قریب، نہ درباں قریب ہے

دیوار تو ہے در نہ سہی، یوسفِ حیات
کنعاں نہیں قریب، تو زنداں قریب ہے

جس اشک نے ستم سہے میرے بصد وقار
میری لحد سے بر سرِ مژگاں قریب ہے

اِس دشت میں نہ سانحہ مراد دے سکے گی تو
رخصت ہو عقل، جادۂ مژگاں قریب ہے

پہلے بھی ہم سے دور نہ تھا، نارسا تھے ہاتھ
ہاتھوں سے آج دامنِ یزداں قریب ہے

کھا کھا کے علم و عقل کی وادی میں ٹھوکریں
منزل نظر جو آئی تو گریاں* قریب ہے

---

* مسوّدے میں یہی لفظ ہے۔

جو موت آئے تو اُس سے ہمتِ مردانہ سے لڑیئے
شہامت سے، سخا سے، جراَتِ رندانہ سے لڑیئے

دیا ہے عمر بھر کا ساتھ جس کے قلب و بازو نے
نہ اب چینِ جبینِ برہمِ جانانہ سے لڑیئے

وہی ہو گی غروب آنکھوں میں جب حسنِ نظر بن کر
تو پھر کیوں جاتے جاتے نرگسِ مستانہ سے لڑیئے

تہی ساغر میں گر اک قطرۂ مے بھی نہیں باقی
تو ساقی سے نہ لڑیئے، گردشِ پیمانہ سے لڑیئے

متاعِ درد سے کشکولِ درویشاں کو بھر دیجے
فقیہِ شہر کے اِس فکرِ درویشانہ سے لڑیئے

جو سنگ و خشت ہیں کام آئیں گے گورِ غریباں میں
نہیں اتنے کہ اب ویرانیِ کاشانہ سے لڑیئے

حدیثِ آرزو پوری طرح لکھنے نہیں پائے
تو عنواں سے نہ لڑیئے، شوخیِ افسانہ سے لڑیئے

ماہِ تاباں نے چھپایا رُخِ انور اِس رات
جو ستارے تھے بنے ٹوٹ کے اخگر اِس رات

آسماں سے یہ کہو حشر کی تاریکی میں
پھر سے جلوائے چراغِ مَہ و اختر اِس رات

کتنے شہروں سے، دیاروں سے، گزرگاہوں سے
کتنی یادوں کے چلے آتے ہیں لشکر اِس رات

اتنی شدت سے چلی شہر و بیاباں میں سموم
بادشاہوں کے اڑے جاتے ہیں افسر اِس رات

قلب کے پاس سلگنے لگا اک شعلۂ سُرخ
ایک خنجر ہے رگِ جاں کے برابر اِس رات

جاں میں وہ آگ لگی ہے کہ عیاذاً باللہ
ملک الموت کے جل جائیں نہ شہپر اِس رات

دُور جانا ہے، شبِ تار ہے، تنہائی ہے
اِک نگاہِ کرم اے شافعِ محشر اِس رات

ہے تہی ساغرِ گل، لطف کی شبنم برسے!
جُرعۂ ناب ملے ساقیٔ کوثر اِس رات

جم تو باقی نہ رہا، جام ابھی باقی ہے
جام میں دُردِ مئے خام ابھی باقی ہے

اک گلِ تازہ معطّر ہے بآغوشِ خزاں
ایک طائر بکفِ دام ابھی باقی ہے

اب تو سنتے ہیں تری راہ گزر ہے خاموش
ایک تصویر لبِ بام ابھی باقی ہے

شہرِ خاموش سہی، شہرِ خموشاں تو نہیں
کیا کوئی شاہدِ بدنام ابھی باقی ہے

داستاں حُسنِ خوش آغاز کی باقی نہ رہی
تہمتِ عشقِ خوش انجام ابھی باقی ہے

ہے ابھی دیر ستاروں کے جلاؤ نہ چراغ
شب ابھی آئی نہیں، شام ابھی باقی ہے

ایک مدّت ہوئی شہ مات ملی موت کے ہاتھ
زندہ رہ جانے کا الزام ابھی باقی ہے

(فیض کا خط آنے پر)

ہم نے جو سمجھا بلا خوفِ ستم لکھتے رہے
ہم الف سے پڑھ نہ پائے تا حروفِ لام و میم
ہم صمد کی مدح کیا لکھتے کہ یہ ہمت نہ تھی
داستاں اپنی لکھی، روداد اپنوں کی لکھی
ہم پہ جو گزری سو گزری، در حدیثِ دیگراں
یہ نہیں معلوم کر پائے کہ کیا تم نے پڑھا
پاسداری کی، طرفداری کسی کی کر نہ پائے
دشت میں شیر و شغال و گرگ سے بچ بچ کے ہم
جانتے تھے اپنا ہر حرفِ غلط مٹ جائے گا

زندگی کے راز سارے بیش و کم لکھتے رہے
پھر بھی ساری عمر تفسیرِ الم لکھتے رہے
خامۂ ایماں سے ہم مدحِ صنم لکھتے رہے
مدح و ذم سے بچ کے شرحِ زیر و بم لکھتے رہے
داستانِ نوش و عیش و نیش و سم لکھتے رہے
ہم کو یہ معلوم ہے کیا تم کو ہم لکھتے رہے
اپنا غم، اپنوں کا غم، غیروں کا غم لکھتے رہے
آہوانِ شعر کا لفظوں پہ رم لکھتے رہے
ہو گی ہر فکرِ پریشاں کالعدم، لکھتے رہے

فیضؔ نے کی عمر بھر تفسیرِ آئینِ ستم
ہم تھے کم ہمت عزیزا اتنے کہ کم لکھتے رہے

گوہر جاں کہ بہ دامانِ شبستاں اُفتاد
چوں بیفتاد، نہ لرزاں و نہ ارزاں افتاد

اُو کہ ہر جاست بیک خانہ نخواہد گنجید
شُد ز اصنام تہی، کعبہ چہ ویراں افتاد

چوں غزالانِ حرم راہ بہ صحرا بُردند
قیس در شہر ز پہلوئے بیاباں افتاد

باز آتشکدہ بر خاکِ عجم می افروخت
شررے ز آتشِ رومی بہ نیستاں افتاد

آں ہمہ زلزلگاں کوہ و دمن برہم ریخت
شکنی بود کہ در گیسوئے جاناں افتاد

گشت سیلابِ بلا، سرحدِ ساحل بشکست
شعلہ ای در جگرِ رودِ خراماں افتاد

•

آخرِ عمرِ روان و من و خرچنگ عزیز
محشری ہست کہ در رزم گہِ جاں افتاد

شمع کے شعلوں میں پروانوں کے داغِ آرزو
صبح کی خنکی میں بن بن کر دھواں مٹ جائیں گے

شاہرہ کی نبضِ خستہ رات کو رُک جائے گی
ان بیابانوں میں کاہل کارواں مٹ جائیں گے

یاد اُن کی بن کے رہ جائے گی دردِ کائنات
یہ زمیں مِٹ جائے گی، یہ آسماں مٹ جائیں گے

اِک ستارہ جھلملائے گا نقابِ ابر میں
اِس شبستاں کے یہ ماہ و کہکشاں مٹ جائیں گے

خاک ہو جائیں گے ساحل، خشک ہو جائیں گے بحر
سب شکستہ کشتیوں کے بادباں مِٹ جائیں گے

محملِ لیلیٰ سمومِ دشت سے گِر جائے گی
دشت ہو گا مُنتشِر خاک اور ساربان مٹ جائیں گے

ہو طلوعِ شمس یا تاریکیٔ ابرِ سیاہ
بار کہ تارے بساطِ آسماں مِٹ جائیں گے

یاد کی شمعیں جلیں گی اِس مزارِ دہر پر
پھر مزارِ دہر کے نقش و نشاں مٹ جائیں گے

شعلۂ جام الگ، شعلۂ طور الگ یعنی ہوتا ہے ہر اک عشق کا دستور الگ

جبرِ جاں اور ہے اور ہجرِ بدن ہے کچھ اور دلِ مجبور الگ ہے، دلِ مہجور الگ

تن کا پہنے کوئی ملبوس تو کوئی من کا شمعِ عریاں ہے الگ، شعلۂ مستور الگ

اے مسافر نہیں شہراہِ وفا کوئی یہاں کہ ہوا کرتا ہے ہر شہر کا دستور الگ

ہے وہی تابشِ مئے فرق ہے پیمانوں کا چشمِ مخمور الگ، دیدۂ مہجور الگ

نہیں اس کاخ کی ترمیم و مرمّت ممکن اس عمارت سے ہوا جاتا ہے مزدور الگ

عقل ہو، نقل ہو، مطلوب وہی ہے پھر کیوں حاصلِ کار الگ، نار الگ، نور الگ

کٹ گئی عمرِ عزیز اب بھی نہ سمجھا لیکن
کہ وہ بدنام الگ ہے تو ہے مشہور الگ

ہم جو سو جائیں گے سارے بحر و بر سو جائیں گے
آگ میں جنات، بستی میں بشر سو جائیں گے

ٹھوکریں کھا کے چلتا ہی رہے گا کارواں
رات کے تارے ہیں جتنے ہم سفر سو جائیں گے

رات بھر گرِ ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوا ایسی چلی
ایک اک کر کے چراغِ رہ گزر سو جائیں گے

آتے آتے کوئے جاناں سے طیورِ نامہ بر
نامۂ دلدار رکھے زیرِ پر سو جائیں گے

اپنی مسند سے اُتر کر آخرِ شب کج کلاہ
تاج کانٹوں کا دھرے بالائے سر سو جائیں گے

جلتے جلتے ایک شب آتشکدہ بُجھ جائے گا
ہیں جو خاکستر میں آزردہ شرر سو جائیں گے

اک دریچہ بن کے چشمِ وا، کھُلا رہ جائے گا
اس مکاں کے فرش و سقف و بام و در سو جائیں گے

شب کو پڑ جائے گی روئے مہرِ تاباں پر نقاب
سارے تارے جاگ اٹھیں گے بحر و بر سو جائینگے

موت کے تشنے کو دیکھیں گے جبینِ ماہ پر
چادرِ ابرِ رواں سب اوڑھ کر سو جائیں گے

جھونکا چلا قضا کا تو چُپکے سے سو گئے　　آیا جو کاروانِ اجل ساتھ ہو گئے

جس قافلے کے ساتھ ساتھ چلتا رہیگا وہ*　　منزل جب اپنی آئی الگ ہو کے کھو گئے

اس بحر میں تلاطم و طغیاں کا زور تھا　　ساحل نظر نہ آیا تو کشتی ڈبو گئے

ہم نے وفا میں کوئی کمی کی نہیں مگر　　ہم کیا کریں کہ یار بھی اغیار ہو گئے

جو حال تھا حیات میں وہ بے ممات میں　　کچھ دوست آکے ہنس گئے کچھ آکے رو گئے

○

آغوشِ مرگ ہم پہ ہوئی تنگ دوستو

صیدِ تن و شکنجۂ خرچنگ دوستو

سنگِ سحر سے شیشۂ شب پاش پاش ہے

نکلا جو آفتاب تو بے رنگ دوستو

منزل کا ہیں پتہ کہ نشاں رہ گزر کے ہیں

لوحِ مزار و کتبۂ فرسنگ دوستو

اب اپنی شکل بھی نظر آتی نہیں ہمیں

آئینۂ جہاں کو لگا زنگ ــــ دوستو

ہے یہ دُعا کہ تم کو ابد تک رہیں نصیب

علم و ادب کے افسر و اورنگ دوستو

---

* یہ مصرعہ غلط نقل ہوا ہے غالباً یہ ہو گا۔ "جس قافلے کے ساتھ چلے تھے ہم ایک عمر" (س)

اس کارزارِ زیست میں تنگ آگئے ہیں ہم
لے کر اجل کی تیغ و خدنگ آگئے ہیں ہم

یاروں سے کی وفا، تو جفا کیا، ملا فریب
سکرات میں بہ عرصۂ جنگ آگئے ہیں ہم

جو آئینہ غبار و کدورت سے پاک تھا
اس پر بھی اب جو لگ گیا زنگ آگئے ہیں ہم

نقشِ بر آب تھے تو ترا خوف تھا اجل
اب آ کر بن کے کتبۂ سنگ آگئے ہیں ہم

آمد حریف کی ہو کہ آمد اجل کی ہو
لے کر رباب و بربط و چنگ آگئے ہیں ہم

خونِ دلِ شکستہ کے گہرے کفن پہ داغ
پہنے ہوئے لباسِ دو رنگ آگئے ہیں ہم

پھیلا کے دامِ دوست نے ہم کو طلب کیا
بے وقفہ و دریغ و درنگ آگئے ہیں ہم

حُسن کے جلوے نقوشِ بے بدل ہو جائیں گے
خاک داں میں گُل، تو پانی میں کنول ہو جائیں گے

جس کشش کے راز آنکھوں سے زباں پر آنہ پائے
پھر کسی ابرو کا خم، کاکل کا بَل ہو جائیں گے

جس کے کہنے سے یہ دردِ دل بنا حرفِ غزل
اس کو جب یاد آئیں گے، بیت الغزل ہو جائینگے

اس سفر میں زندگی کا بوجھ کچھ ہلکا نہ تھا
دست و پا یوں چلتے چلتے اور شل ہو جائیں گے

دشت کو گلزار سمجھا اور چلتے ہی رہے
اک نہ اک دن لُقمۂ گرگِ اجل ہو جائیں گے

عمر ساری یار اور اغیار سب ہی کے لئے
عُقدۂ مشکل رہے آخر کو حل ہو جائیں گے

جل رہے ہیں دل میں جتنے نرم شعلے گرم داغ
آسماں پر ماہ و مرّیخ و زحل ہو جائیں گے

کتنے لمحوں کی نوازش سے بنے تھے کل سے آج
آج سے آگے بڑھیں گے ہم تو کل ہو جائیں گے

ابتدا سے منزلِ مقصود تھی شامِ ابد
شام آئے گی تو ہم صبحِ ازل ہو جائیں گے

چھلکی جو مئے تو بن کے شرر گونجتی رہی
مینا سے تا بہ ساغرِ زر گونجتی رہی

بادل کی سی گرج تھی یہ دُنیا کہیں جسے
جو درمیانِ شمس و قمر گونجتی رہی

تھی جو دُعا وہ ابر کے دامن میں چھپ گئی
جو بددُعا تھی بن کے اثر گونجتی رہی

آئی خزاں طیور تو جتنے تھے اُڑ گئے
نغموں سے پھر بھی شاخِ شجر گونجتی رہی

آغوشِ شب میں پھول تو مُرجھا کے گر گئے
صحنِ چمن میں بادِ سحر گونجتی رہی

تھا کوئی اجنبی کہ جو آیا، چلا گیا
صدیوں تلک اُسی کی خبر گونجتی رہی

فریادِ دل کسی کے دبائے نہ دب سکی
جب کٹ گئی زباں تو نظر گونجتی رہی

سمجھے تھے ہم خموش تھی اپنے قدم کی چاپ
کیا جانے کیوں یہ راہ گزر گونجتی رہی

کھیتیاں دل کی کتنی ہی بنجر سہی، آبِ جو چشمِ ویراں سے جاری کرو
صُبح سورج کی اُٹھ کر پرستش کرو، رات آئے تو اختر شماری کرو

سنگ ریزے جو راہوں میں ہیں جا بجا، کیا پتہ کس کے ہیں پائمالِ دل
اُن کو ٹھوکر لگا کر نہ آگے بڑھو، پاسِ رسم و رہِ شہ سواری کرو

اے گُلو اور کچھ دن مہک لو ذرا، بُلبُلو اور کچھ دن چہک لو ذرا
ختم ہونے کو ہے یہ بہاروں کی رُت، گُلعذاری کرو، دل فگاری کرو

تُم حرم سے جو نکلے تو پھر اے بُتو، اتنے شہروں میں رُوپوش کیوں ہو گئے
جلوہ گر اک نئی بناؤ پھر کہیں، پھر سے زُہاد پر وجد طاری کرو*

ق

پھر سے برہم کرو یہ صفِ عارفاں، پھر سے روشن کرو مشعلِ عاشقاں
کشورِ حسن عرصے سے بے تاج ہے، کج کلاہی کرو، تاج داری کرو

آب بہہ جائے گا، آگ بجھ جائے گی، باد اُڑ جائے گا، خاک مٹ جائیگی
چھوڑ کر اِن کو جانا ہے اِک دِن تو پھر اِن عناصر سے اتنی نہ یاری کرو

---

*۔ نقل کرنے میں سہو ہوا ہے۔ یہ مصرعہ یوں ہوگا "جلوہ گر اک بناؤ نئی پھر کہیں، پھر سے زُہاد پر وجد طاری کرو"
(س)

گھبرا کے ہم تو عرصۂ جاں سے نکل گئے

بزمِ جہاں، طلسمِ جناں سے نکل گئے

کب سے تھے ہم اسیرِ شب و روز و ماہ و سال

قیدِ زماں و بندِ مکاں سے نکل گئے

تھا جنبشِ زبان و قلم کا یہ ماحصل

ناگفتہ حرف تھے کہ زباں سے نکل گئے

یاروں کو بزمِ لالہ رخاں ہی میں چھوڑ کر

ہم خاک بن کے کوئے بتاں سے نکل گئے

عزیز احمد عزیز

سِنوریتا

(سان ریمو۔ اطالوی ریویرا۔ گرمیوں کے موسم میں سرِشام سمندر کے کنارے)

سنوریتا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا"
رُک گیا میں تو کہا "پھر خاموش؟
ایک دو جام میں اتنے مدہوش"
ان کی آنکھوں کو جو دیکھا تو شرارت کی جھلک
اور ہونٹوں پہ وہی برقِ تبسم کی چمک
جسم میں تازگی و عطر و نفاست کی مہک
ہاتھ کو چوم کے میں نے یہ کہا
"ہے یہ الزام ذرا بے جا سا
مئے گلفام کو کیوں کرتی ہیں ناحق بدنام
ہیں خطا کار تو ہیں آپ کی آنکھوں کے جام

آپ کے حُسن سے سرشار ہوں مَیں
کیجیے انصاف خطا وار ہوں مَیں ؟ "
سنوریتا نے کہا " سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا ؟
ایسے جملوں کی تو شاید تمہیں عادت سی ہے
ہاں تمہیں ہر کس و ناکس سے محبّت سی ہے
ہے سبھی مردوں کی عادت جو یہی
کاش اک تھوڑی سی جدّت ہوتی "
پھیلتی جاتی تھی تاریکیِ شام
دستِ نازک کو لیا مَیں نے تھام
مُڑ کے دیکھا تو کوئی اور نہ تھا
اُس کے رخساروں کو جھک کر چوما
پھر کہا " مجھ کو ترے حسنِ فروزاں کی قسم
تیری آنکھوں کی ، ترے کاکلِ پیچاں کی قسم
اس خموشی میں سمندر کے ترنّم کی قسم
تیرے ہونٹوں پہ ملامت کے تبسّم کی قسم ..... "
میں ابھی اور بھی قسمیں کھاتا
اُس تبسّم نے مگر روک لیا
سنوریتا نے کہا " سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا "

عزیز احمد

فردوس بر روئے زمین

(ایک بیانیہ نظم)

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دار و گیر
(اقبالؔ)

(۱)

مارِ غلیظ[1] و خوب رو، پیچ بہ پیچ و خم بہ خم
شہر میں کب سے ہے رواں، موج بہ موج حسن و سم
اس کی روانیاں کثیف، اس کی روش بڑی عجیب
لطف کرے تو لطف ہے۔ اور ستم، غضب ستم
اس سے کثیف تر ہے شہر، شہر سے وہ کثیف تر
شہر کی اس میں گندگی، اس کی نمی سے شہر نم
گود میں کتنے بام و در، نوح و امیر و بیشہ ور
سطحِ عدم پہ ہے حیات، اور حیات میں عدم
موج سے اس کی ہم کنار، پارچہ ہائے زرنگار
چوب پہ نقش کی بہار، رنگ سے جام، جامِ جم

---

[1] سری نگر میں دریائے جہلم۔

سرو و سفیدۂ و چنار، اہلِ سبزکی تشنہ لبی
تو کہ رواں ہے رات دن، اِن سے کہاں گریگی رم

(۲)

ایک بدیسی نے کہا:-

صبح در باغِ نسیم و شام در باغِ نگیں
بوسۂ لب ہائے خنداں، بوئے زلفِ عنبریں
رقص میں آغوش در آغوشِ جسمِ نازنیں
دلربا و دل نواز و دل فریب و دلنشیں

اشتراکی نے کہا:-

دیکھ سطحِ آب پر وہ کچھ شکارے ہیں رواں
جن میں آغوشوں میں لپٹے ماہ پارے ہیں رواں
اہلِ ثروت موٹروں میں اُس کنارے ہیں رواں
ایک ٹوٹی ناؤ میں غربت کے مارے ہیں رواں

اک مورّخ نے کہا:-

چار سو وہ جلوہ پیرا شانِ نسلِ اکبری
وہ جہانگیری چمن سازی کا حسنِ دلبری
عظمتِ شاہِ جہانی، دلبری با قاہری
حکمتِ دارا شکوہی، دلبری بے قاہری

عصرِ حاضر نے کہا:-

دیکھ بے شامِ نشاط اور شامِ شالامار دیکھ
آخرِ جنّات تجری تحتہا الانہار دیکھ
عظمتِ پارینہ کے مٹتے ہوئے آثار دیکھ

اور پھر سڑتی ہوئی لاشوں کا یہ انبار دیکھ

(۳)

برف کی زلف خم بہ خم ہاتھ میں اک پیالہ ہے[1]

ہاں یہ پہاڑ ساقیِ سلسلۂ ہمالہ ہے

سرد ہیں گرمیاں یہاں پھول ہیں دلستاں یہاں

دامنِ کوہ پر پڑا سبز سا اک دوشالہ ہے

آگئی ٹٹّوؤں کی فصل آگئی بابوؤں کی فصل

آج نِوالہ لو نگل ، کل وہی برف وژالہ ہے

(۴)

دیوں میں گھری ہے سبز پری[2]

اس سبز پری کے بال ہرے اور اس کی رسیلی آنکھ ہری

کولو ہوئی اور زوجی لا

اور دیو بہت سے ان کے سوا

سر پر برفانی تاج دھرا ، شوکت میں بھی اک آشفتہ سری

دیوؤں کو جو غصّہ آتا ہے

سردی کا عالم چھاتا ہے

ہر بادل برف گراتا ہے ، سورج نہیں کرتا دردِ سری

تب زردی موت کی چھاتی ہے

اور برف کفن پہناتی ہے

سبزے کو نیند آجاتی ہے ، طاری ہے فضا پر بے خبری

آخر پھر سورج یہ چھتا تا

ٹیلوں کے جوبن گرماتا

---

[1] گلمرگ

[2] سونامرگ

پھیلا کر کرنوں کے پنجے
برفانی دامن سہلاتا ، کرتا ہے آ کر داد گری
لو برف کی سل سینے سے ہٹی
وہ جسم پہ سبزی پھر سے جمی
چشموں کی نبضیں ہیں جاری ، سیماب صفت پانی سے بھری
لو نرم ہوا ، پھر چلنے لگی
سبزے کی موج مچلنے لگی ، وہ ناچ رہی ہے سبز پری
ہے سبز پری کی چال ہری
ہیں سبز پری کے بال ہرے ، چشموں سے سر کی مانگ بھری
ڈالے ہیں بابو نے ڈیرے
قدرت کے تماشے دیکھے گا
کشمیری لایا ہے ٹٹّو
انعام اُسے مِل جاوے گا
اور سونا مرگ کی سبز پری ، دونوں کی کرے گی چارہ گری

(۵)

پہاڑوں کے اوپر وہ بارش مُسلسل
سڑک کی یہ حالت کہ چلنا بھی مشکل
وہ ارض و سما کے دھڑکتے ہوئے دِل
مگر آ ہی پہنچے ، وُلر کے مقابل

"خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے"

وُلر کی وہ جھیل ، اُس کے اطراف دلدل
مقابل شفق کی دہکتی سی مشعل
وہ ذخّار پانی میں طوفاں کی ہَل چَل

وہ دلدل کا نیکن جمودِ مکمل

"خضر سوچتا ہے ڈلر کے کنارے"

ڈلر کی یہ شوکت، یہ پانی کی وسعت
پہاڑوں کے آغوش سنگیں کی رفعت
وہ دلدل کی انسان سی پست حالت
وہ حسن اور وہ عظمت، جمود اور ہیبت

"خضر سوچتا ہے ڈلر کے کنارے"

ہے مشکل بہت سوچنا اور سنانا
پہاڑوں کے پیچھے ذرا ہو تو آنا
سنو جا کے لولابیوں کا ترانہ
وہیں بچھ رہا ہوگا اقبال دانا

"خضر سوچتا ہے ڈلر کے کنارے"

(۶)

ہم سنتے آئے تھے عرصے سے ہوتی ہے تجارت حسن کی یاں
یا تو خود لا کے بھڑاتے ہیں، یاں بیوی، بیٹی، بہنیں، ماں
یاں آکر ہم نے یہ دیکھا، گو حسن یہاں بھی بکتا ہے
یہ کوئی انوکھی بات نہیں، ہر ملک میں یوں ہی بکتا ہے
پر ہندوستاں سے بہت زیادہ، یاں سچی شرم و حیا بھی ہے
دیکھا ہم نے کشمیرن کو، پابندِ رسم وفا بھی ہے
یاں شرم و حیا ہے آنکھوں میں، یاں غربت میں خودداری ہے
یاں دل میں جلوۂ عصمت ہے، یاں زخمِ محبت کاری ہے
اکثر دیکھا ہے، کشمیرن کم کم ہی آنکھ لڑاتی ہے
غربت ہی کا شاید ہے یہ اثر، دل شوہر ہی سے لگاتی ہے

سچی عصمت کہتے ہیں جسے وہ عورت کی خودداری ہے
جس قوم میں یہ موجود رہے لازم اُس کی بیداری ہے
اے گوری چِٹی کشمیرن، بدبو سے لپٹی کشمیرن
اچھا ہے نہا کر کپڑے بدل، لیکن نہ بدلنا اپنا چلن

(۷)

"ہاں ہاں جمالدار
پھر کیا جمالدار؟"

"اقبال ہے جناب کا، ہم کیا بتائے گا
یہ گھانس نشانس چھیل کے ہم گھر کو جائے گا"
اور زرد زرد دانت
نکلے کر مسکرا بھی رہے تھے جمالدار

بوڑھے جمالدار
اچھے جمالدار
سیدھے جمالدار
سن اُن کا ساٹھ سال کا داڑھی ذرا سی تھی
کپڑے بہت کثیف تھے، ٹوپی مگر نئی
"غربت ادھر بہت ہے" یہ کہتے جمالدار
تھے پاس ہی کے گاؤں میں رہنے جمالدار
کچھ بکریاں تھیں جن کے لئے گھاس چھیلنے
آتے جمالدار

"ہاں ہاں جمالدار

یہ تو بتاؤ کیسی ہے جانی جمالدار؟"

"اقبال ہے جناب کا اچھی ہے وہ جناب"

جانی جمالدار کی بیوی کا نام تھا

سن میں وہ اُن سے کم تھی مگر زرد زرد دانت

باقی نہ تھا کوئی

لڑکا جو تھا بڑا اُسے مرگی کا مرض تھا

"اچھا جمالدار

کب تم کرو گے لڑکے کی شادی جمالدار؟"

ہنستے جمالدار

کہتے جمالدار:

"بیٹی یہاں اسے کوئی دیتا نہیں جناب"

القصّہ دوست ہو گئے میرے جمالدار

اپنی کبھی سناتے حکایت جمالدار

کرتے گرانیوں کی شکایت جمالدار

"روٹی کنک کی بچتی نہیں کیا کرے جناب

شالی گراں ہے ملتی نہیں کیا کرے جناب"

اللہ کا غضب ہے کہ جنّت میں قحط ہے

لکڑی کہیں نہیں

جنگل بہت سے ہیں

جانی کو کوئی کاش بس اتنا بتا سکے
لکڑی کہاں سے لائے کہ روٹی پکا سکے

فصلیں بھی ٹھیک تھیں
جنگل بہت سے ہیں
چاول بھی تھا بہت
لیکن کہاں گیا؟
لکڑی بھی ہے بہت
ملتی نہیں مگر
مہنگی ہے اِس قدر

"پھر کیا جمالدار؟
پھر کیا کرو گے تم؟"

"ہم کانگڑی جلائے کرے گا دُعا جناب
قانون یہ خراب ہے، قانون توڑ دے
باہر سے یہ جو آیا ہے، کشمیر چھوڑ دے"

بشکریہ "نیا دور"

شان الحق حقی

غزل

قضا کے تو بہو طرزِ ستمرانی پہ مر مٹیے
مگر ہم زندہ ہیں اپنی گراں جانی پہ مر مٹیے

فروغِ حسنِ خوباں دیر تک مہلت نہیں دیتا
اسی دم آہ اُس کی جلوہ سامانی پہ مر مٹیے

بتانِ دیر کی تو کفر سامانی سے بچ نکلے
اب اربابِ حرم کی نامسلمانی پہ مر مٹیے

وفاداری کو بھی اس نے خطاکاری ہی ٹھہرایا
تو اب کیا کیجے، اُس کی چینِ پیشانی پہ مر مٹیے

توجہ ہے خطاؤں پر مری ہی اُن کی ہر لحظہ
مجھی پر ہیں نگاہیں اس نگہبانی پہ مر مٹیے

نکلتے ہیں گلِ دشنام منہ سے کیا تراشیدہ
عبث مت کھا نیے گل اِس گل افشانی پہ مر مٹیے

مزا کچھ تلخ ہے اِس خوابِ بیداری کا سو رہیے
نہ راس آئے گا تکیہ عالمِ فانی پہ، مر مٹیے

ہوائے دل نے رکھو دی تلخ کر کے زندگی حقی
نہ مٹ جائے تو خود اِس دشمنِ جانی پہ مر مٹیے

وزیر آغا

غزل

سحر نے آ کر مجھے سُلایا تو میں نے جانا
پھر ایک سپنا مجھے دکھایا تو میں نے جانا

بجز ہوا اب رُکے گا کوئی نہ پاس میرے
اندھیری شب میں دیا بُجھایا تو میں نے جانا

گیا یہ کہہ کر کہ ایک شب کی ہے بات ساری
مگر نہ جب لَوٹ کر وہ آیا تو میں نے جانا

میں ایک تنکا رُکا کھڑا تھا ندی کنارے
ندی نے بہنا مجھے سکھایا تو میں نے جانا

سیاہ بادل میں برق کوندی تو سب نے دیکھا
تری ہنسی نے مجھے رُلایا تو میں نے جانا

میں اوڑھ کر خود کو سو گیا تھا کہ بے خطر تھا
کوئی پرندہ جو پھڑپھڑایا تو میں نے جانا

ہے میرے سینے میں سخت پتھر سی چیز کوئی
یہ آج تو نے مجھے بتایا تو میں نے جانا

میں تیری نظروں میں گر چکا تھا مگر جو تو نے
مری نظر سے مجھے گرایا تو میں نے جانا

ہوا میں شامل تھی تشنگی اُس کے تن بدن کی
ہوا نے میرا بدن جلایا تو میں نے جانا

مغنی تبسم

غزل

پچھتائے بہت سفر گنوا کر
ہم آئے تھے کشتیاں جلا کر

آنکھوں سے نکل گیا ہے کوئی
آنکھوں میں چراغ سا جلا کر

یہ بزمِ خیال بھی اُلٹ دیں
کیا فائدہ محفلیں سجا کر

شاید کہ سُراغ اپنا پا لے
آئینے کے گھر میں دیکھ جا کر

آنکھوں میں نہ کوئی خواب آئے
سو جائیں چراغِ جاں بجھا کر

مغنی تبسم

غزل

پورا چاند اور آدھی رات ۔ آدھی رات ، اور تیرا ساتھ
میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ جاگتے خوابوں کی سوغات
پلکیں جھپکاتے تارے جلتے بجھتے سے لمحات
آنکھ کھلے تو اپنا دن آنکھ مندے تو اپنی رات
مٹتے اور ابھرتے چہرے آنکھوں میں یادوں کی برات
تو سچ مچ ہی لوٹ آئے یادیں اور یہ امکانات
دل کی باتیں کون سنے کون سنائے دل کی بات
کل نہ رہیں گی یہ باتیں آج نہیں ہے کل کی بات

دل پہ گھٹائیں چھائی ہیں
اب ہونے کو ہے برسات

عرفان صدّیقی

غزل

خوابِ آسودگیِ بال و پر آنے کا نہیں
شام آنکھوں سے یہ کہتی ہے گھر آنے کا نہیں

دل کے آئینے سے رخصت ہوا زنگارِ ملال
اس میں اب کوئی بھی چہرہ نظر آنے کا نہیں

فیصلہ کر، کم و بیشِ تہِ دریا کی نہ سوچ
مسئلہ ڈوبنے کا ہے اُبھر آنے کا نہیں

اور کیا چاہیے، پیروں سے گریزاں ہے زمیں
آسمانوں سے تو اذنِ سفر آنے کا نہیں

جس کو ہونا ہے وہ فریاد میں شامل ہو جائے
بے نوا شہر میں بارِ دگر آنے کا نہیں

کوئے قاتل کی روایت ہی بدل دی میں نے
ورنہ دستور یہاں لوٹ کر آنے کا نہیں

غزل

فقیر ہوں، دلِ تکیہ نشیں ملا ہے مجھے
میاں کا صدقۂ تاج و نگیں ملا ہے مجھے

زباں کو خوش نہیں آتا کسی کا آب و نمک
عجب تبرّکِ نانِ جویں ملا ہے مجھے

چراغِ گنبد و محراب بجھ گئے ہیں تمام
تو اک ستارۂ داغِ جبیں ملا ہے مجھے

میں بوریا بھی اسی خاک پر بچھاتا تھا
سو اک خریطۂ زر بھی یہیں ملا ہے مجھے

یہ سر کہاں، وہ کلاہِ چہار ترک کہاں
ابھی اجازۂ بیعت نہیں ملا ہے مجھے

عرفان صدّیقی

غزل

ہر طرف ڈوبتے سورج کا سماں دیکھئے گا
اک ذرا منظرِ غرقابیٔ جاں دیکھئے گا

سیرِ غرناطہ و بغداد سے فرصت پا کر
اِس خرابے میں بھی خوابوں کے نشاں دیکھئے گا

یہ در و بام، یہ چہرے، یہ قبائیں، یہ چراغ
دیکھئے، بارِ دگر اِن کو کہاں دیکھئے گا

راہ میں اور بھی قاتل ہیں، اجازت لیجے
جیتے رہیے گا تو پھر کوئے بُتاں دیکھئے گا

شاخ پر جھومتے رہنے کا تماشا کیا ہے
کبھی ہر ہر میں، ہمیں رقص کناں دیکھئے گا

ہے یہی گردشِ ایّام تو اس دھار کو آپ
ایک دن گردنِ خنجر پہ رواں دیکھئے گا

دل طرفدارِ حرم، جسم گرفتارِ فرنگ
ہم نے کیا وضع نکالی ہے میاں دیکھئے گا

ارشد عبدالحمید

غزل

خاموشی تک تو ایک صدا لے گئی مجھے
پھر اس سے آگے طبعِ رسا لے گئی مجھے

کیا آنکھ تھی کہ موجِ بقا کی طرح ملی
کیا موج تھی کہ مثلِ فنا لے گئی مجھے

دشتِ جنوں سے آئی تھی بستی میں بادِ شوق
لوٹی تو اپنے ساتھ بہا لے گئی مجھے

مٹی کو چوم لینے کی حسرت ہی رہ گئی
ٹوٹا جو شاخ سے تو ہوا لے گئی مجھے

اے ساعتِ فرار ترا شکریہ کہ تو
رشتوں کے پیچ و خم سے بچا لے گئی مجھے

عشرت ظفر

غزل

عجب کھلاتی ہیں گل بے کرانیاں اس کی
طلوع ہوتی ہیں مجھ میں نشانیاں اس کی

مرے لئے سفر آساں ہے شب کے جنگل کا
ہیں مشعلوں کی طرح نکتہ دانیاں اس کی

بناتی ہیں مری مٹی کے ذرّے ذرّے پر
ہزاروں نقشِ قدم لامکانیاں اس کی

میں اک تراوشِ نادیدہ کی گرفت میں ہوں
نچوڑ رہی ہیں مجھے مہربانیاں اس کی

نفس سے اس کے معطّر بساطِ جاں میری
لہو سے میرے منوّر کہانیاں اس کی

میں ایک شب کو ہی مہمان اس کا تھا عشرتؔ
بھلا سکا نہ مگر میزبانیاں اس کی

عشرت ظفر

غزل

قرب کی ساعتِ تہہ دار مرے سامنے ہے
ایک پیچیدہ سی دیوار مرے سامنے ہے

توڑ دوں حرف و بیاں تیرے طلسمات مگر
میرا پیرایۂ اظہار مرے سامنے ہے

بستیاں اندھے چراغوں کی عقب میں ہیں مرے
بے کراں دشتِ پُر اسرار مرے سامنے ہے

سبز، گنجان دریچوں میں نہ گل ہیں نہ ثمر
کیا عجب منظرِ اشجار مرے سامنے ہے

ایک ٹھوکر میں ہوا اس کا نشاں تک غائب
میں یہ سمجھا تھا کہ کہسار مرے سامنے ہے

میں کہ اک عمر سے مفروض تھا جس کا عشرتؔ
بے نیام آج وہ تلوار مرے سامنے ہے

عشرت ظفر

غزل

افق کوئی نہ ملے گا کسی کہانی میں
فضول محو ہیں آئینے چہرہ خوانی میں

کہیں وجود میں میرے نہ جذب ہو جائیں
سمندروں کو نہ دے میری پاسبانی میں

سکوتِ شام میں اِستادہ اک مکاں وہ مَیں
وہ غرق ہوتا ہوا اک جزیرہ پانی میں

سنائی دے گی مِرے شہپروں کی گونج کہاں
فلک تو قید ہے خود میری بے کرانی میں

کنارِ آب تھا میں سنگِ پا بہ گِل کی طرح
ندی مجھے بھی بہا لے گئی روانی میں

اتر رہے ہیں جو عشرتؔ سرابِ جاں میں سحاب
کسی کی آنکھ ہے مصروف مہربانی میں

عشرت ظفر

غزل

برق کی طرح نگاہوں میں کڑک کر میں نے — آخرش راکھ کیا اس کو چمک کر میں نے

ریزۂ خاک بنی آنکھ میں یکسائیٔ عکس — کر دیا دفن ہر آئینے کو تھک کر میں نے

ہاتھ آئی نہ کسی نقشِ قدم کی خوشبو — ریت کو دیکھ لیا چھان بھٹک کر میں نے

کس کے قدموں کی صدا دشتِ طلب میں گونجی — کس کے آنے کی خبر دی ہے چہک کر میں نے

یک قلم ساکت و خاموش ہے گہوارۂ خاک — کون ہے کس کو سلایا ہے تھپک کر میں نے

معتکف کون مرے حجرۂ تخلیق میں تھا — کس لیے وا کیا دروازہ جھجک کر میں نے

آئینہ جب بھی مرے سامنے آیا عشرتؔ

خیر مقدم کیا خود اپنا لپک کر میں نے

مغنی تبسّم

ویرانی میں مُردہ چیخیں

کشمکش راتوں کی جنگل سے گزرتے گزرتے سو گئی
ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ہم خود کو بہت سوچتے ہیں
تو بھول جاتے ہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں ان آنکھوں کو جو بیدار نہیں ہیں
پھر آندھی سے دیواریں ٹکراتی ہیں
ندیوں سے پانی بہہ جاتا ہے
نزدیک بہت، دور ہو جاتا ہے
دور سے آوازیں آتی ہیں
کیسے رہتے وہ لوگ جو ویرانی میں اترے تھے
سر کے بل، ہاتھوں سے چلتے
کیوں کہ اُن کے پیروں میں زنجیریں تھیں
مُردہ چیخوں کا یہ انبار ہٹے تو ہم اپنے آنسو بوئیں
اپنے سفر کی چادر دھولیں۔

"کم امریکہ"

(۱)

"سان فرانسیسکو"

اُونچی اُونچی پہاڑیوں پر
بسا ہوا اک شہر
نیچے سمندر گہرا
دو پیروں پر کھڑا ہوا ہے
اُس پر برج سنہرا
اُوپر جائے
نیچے آئے
جگمگ جگمگ رستے
دوڑتی کاریں
بھاگتی ٹرامیں
پاگل کرتی شامیں
نشہ عجب ہوائیں!

(۲)

"شکاگو"

آدھی رات کو
ایک سو تیسری منزل سے
شہر کو دیکھو تو لگتا ہے
دور دور تک
روشنیوں کا جال بچھا ہے!
اُونچی نیچی عمارتیں
دوڑتی کاریں
لمبی راہیں
جال کے اندر پھنسی ہوئی ہیں!
سناٹا ایسا ہے جیسے
سارے شہر میں
گونگی روحیں بسی ہوئی ہیں!!

(۳)

"نیویارک"

کنارے دریا کے یوں کھڑا ہے
کہ جیسے ہاتھوں میں چاند لے گا
چلا تو دریا کو پھاند لے گا

(۴)

"بوسٹن"

یوں لگتا ہے جیسے ہم
بمبئی میں گھوم رہے ہیں
وہی بلڈنگیں
وہی بیچ ہے
وہی سمندر گہرا
وقت یہاں بھی آکر سالا
تھوڑی دیر نہ ٹھہرا

(۵)

"ڈزنی لینڈ"

بچے اپنے خوابوں کو
کھلی آنکھ سے
دیکھ رہے تھے

(۶)

"یونیورسل اسٹوڈیو"

ہنیچ بیک اور فرنکسٹائن
بچوں کو باہوں میں لے کر
تصویریں کھنچواتے ہیں
بس میں بیٹھ کے جاتے ہیں تو
جگہ جگہ
ہولناک منظر آتے ہیں
اِک اندھیارے غار میں
بس کے شیشوں سے لگ کر
کِنگ کونگ چلّاتا ہے
کہیں آگ لگ جاتی ہے تو
کہیں زلزلہ آتا ہے
بس اِک پُل پر جاتی ہے تو
وہ پُل ٹوٹ کے رہ جاتا ہے
پھر ایسا سیلاب آتا ہے
سب کا سب بہہ جاتا ہے

(۷)

"یہ لندن ہے"

بارشوں سے نہلایا ہوا
بادلوں میں کفنایا ہوا
آدھا دفنایا ہوا
یہ لندن ہے!

محمد صلاح الدّین پرویز

آں سیہ چردہ کہ شیرینیٔ عالم با دست

تیرے محبوب کے پاس تیری انگوٹھی ہے
وہ اس انگوٹھی میں بازار، نظّارہ کرتا ہے
تیرا محبوب شکر کا تاجر ہے
شیرینیِ عالم کو پہنچا کے آمین کہتا ہے
تیرا محبوب حاکم سرابوں کا
ہجرت کے ماروں کو آرام دیتا ہے
تیرا محبوب امّی زبانوں کا
بے کار لفظوں کو سونا بناتا ہے
تیرا محبوب ساقی ہے پیاسوں کا
فرقت کا نوحہ دعاؤں کی بینا میں تبدیل کرتا ہے
میرے خدا

تیرے محبوب کے گال کا خالِ مشکیں
کہاں ہیں وہ دل
جن سے اس کو بنایا گیا ہے

خدا

تیرے محبوب کی انگلیاں چاندنی سے بھی ہیں
کہاں ہیں وہ جانیں
جنھیں گوندھ کر ان میں افسوس زخموں کا مرہم چھپایا گیا ہے

خدا

بادشاہِ زمانہ، فسانہ ہے محبوب تیرا
کہ میں اس کے رستے میں، صحرا کی صرصر میں
سونے دیئے کی طرح لو بہ لو بجھ رہا ہوں۔

محمّد صلاح الدّین پرویز

ماہِ اندلس

خیال آگیا تھا یونہی
نقابوں سے گھرے منوّر شہر میں
ماہِ اندلس کا

وہ میرے ساتھ کسی طیارے سے اترے
سلگتے ہوئے ہونٹوں میں
ٹھنڈی ٹھنڈی آیتوں کے جگنو لئے
چہرہ چمکتا ہوا اُس کا مصحف کی طرح،
سیاہ بادلوں کے حریر جزدان میں

جب وہ عبادت گذار صحن کی
دھوپ مخمل پہ چلتی ہوئی، ذہبی جالیوں کے سامنے رک کر،
دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ انہیں سلام کہے، مجھے بھول جائے
ایک نہیں، بلکہ کئی صدیوں کے بعد
وہ سلام سے فارغ ہو، میرا خیال آئے،
مجھے وہاں نہیں پائے، تھوڑا سا گھبرا جائے
یکبارگی ان سے میری واپسی کی دعا مانگے، شرما جائے
میں اس کی شرماہٹ کی آہٹ سن کر ٹھٹھک جاؤں،

خود بھی اس کی شرماہٹ کا حصّہ بن جاؤں

اس وقت، میرے دل میں

اس سے ایک عہد کرنے کا خیال آئے

ماہِ اندلس

ہم جہاں کھڑے ہیں

انہی کی وجہ سے تو ہم پر یہ محبّت کے باب

افتتاح ہوئے ہیں

میں عہد کرتا ہوں:

میں الحمرا نہیں بناؤں گا

سرخ اینٹوں والا

جہاں حبشی غلاموں کو، آنکھوں میں سلائیاں پھیر کے،

رباب بجانے پر مامور کیا جاتا تھا

ان کے نغموں سے تالاب کا رنگ نیلے سے لال ہوجاتا تھا

میں عہد کرتا ہوں:

میں بناؤں گا تیرے لئے ایک گھر

جس کے آنگن میں سیڑھیاں ہوں گی

میں بعد نمازِ مغرب، سیڑھیاں چڑھ کے چھت پہ آؤں گا

دیکھنے کے لئے تجھے آسمان پر — پکاروں گا زور زور سے

ماہِ اندلس! ماہِ اندلس!

آہ میری آنکھوں کو تو تو نظر نہیں آئے گی

لیکن ہواؤں میں اڑتے ہوئے ایک پیس اکورڈ کے چند ٹکڑے

میرے ہاتھوں میں ضرور آجائیں گے۔

محمد صلاح الدین پرویز

اب گھر چلو بھائی

وفا کے ساحلوں پہ دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں ہم
سفینہ دور سے آتا ہوا اک دیکھتے ہیں ہم
سفینے کے کسی کیبن میں، اپنی دونوں آنکھوں میں
وہ میرے خواب لے کے سو رہی ہے، سوچتے ہیں ہم
نہ جانے کون سا پل ہو محبت کے مقدر کا
بہت جاگے ہیں اس پل کے لئے، اب سو رہے ہیں ہم
اگا ئی موسمِ گل میں یہ کس نے فصل رنجش کی
بہت زیادہ کسی کے دل میں شاید چبھ گئے ہیں ہم
وہ رسوائی اٹھائی ہے تری پوجا میں اے پتھر
کہ تجھ کو خدا سے بھی نہیں اب مانگتے ہیں ہم

ارے یہ کیا ابھی تک سب عیاں تھے میری آنکھوں میں
بہت سی لڑکیاں، لڑکے، پرندے، شام اور سورج
سمندر اور میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی اس کی
ہزاروں نیلماں حیراں پریشاں اور سرگرداں
وہ لہریں جن میں تھا کچھ زمزمہ وصلِ محبت کا
وہ لہریں جن میں تھا کچھ مرثیہ برہا کی دولت کا
وہ لہریں بھی اندھیری ہو گئیں اب گھر چلو بھائی
وہ برہا بھی پرائی ہو گئی اب گھر چلو بھائی
چلو اچھا ہوا جو کچھ ہوا سب خیر ہو سائیں
سفینہ بھی لو واپس ہو گیا سب خیر ہو سائیں

شفیق فاطمہ شعریٰ

خراجِ صوت وصدا

(ایک غزل پڑھنے کے بعد)

یہ اک غزل کہ ہے گم جس کا مطلع و مقطع
نہ کوئی دوش نہ فردا، جہان درد دوام
نہاں ہے جس کا سِرا دشنۂ رگ جاں میں
چلا کہاں سے وہ قصّہ سمجھ میں آ نہ سکا

فراموشی کے کہر سے نکل کے جیسے کچھ اور
جمیل تر حرم قرطبہ کے نقش و نگار
فراموشی کا کہر اوڑھے جیسے خواب میں گم
سکھی وہ نیند کی ماتی عروس فصل بہار

یقین اور گماں کا یہ دھوپ چھاؤں درخت
اسی کے رمتہ میں رم جانے کی الابیں الاپ
قتیلِ درد پرانے نئے نوا پیرا
ابھی نہ تھام مرا ہاتھ صرصرِ صحرا
ابھی ہے دور بہت کارواں ستاروں کا
ابھی تو رنگ شفق بھی نہیں ہوا گہرا

شفیق فاطمہ شعریٰ

گیت سندیسہ

یہ رات، اک بھول بھلیاں تان، سکھی،
اس ڈور کو تھام کے چل
رستے میں ساس کے بول ملے
اور سندر کی بات ہیں
دھار کٹاری کی
دکھ گاگر بھرتے بھرتے
میں تو جیسے ہار گئی
کب دور دیس سے
رُت پتیاں کی آئے گی

اے کاگا، اے کویل

چلتی رہی سوت ہوا
پوروں کی اوٹ میں دیپ کی لو
بھرتی ہی رہی
پوروں کے کناروں میں
اپنی لرزش کا رنگ
اب اپنے بندھے ہاتھوں میں بند
مری سیما
کیسے تھامے

اٹنا بادل ـــــ آنچل

رستے میں ہوش و خرد نے
دامن تھاما
قسمیں دیں
آگے جانے کا نام نہ لے
آگے وہ کانچ کی بیلا
مان گمان کا پل
پھر کانا پاتی کرتا ہوا
من مانی فنا کا سایہ سا
پھر رنجش کا دھڑکا
ہے گونج پہ جس کی تھما ہوا
افلاک کا شیش محل

رستے میں تاروں کے جرگے
دوری کی دھند،
دم سحر کی آب میں،
موتی موتی گلبر گے
کاغذ پتر کی قلم کی نگری
سرجن ہار پیاؤ نواؤں کا
کر دیتا ہے کیسے پاگل
اب سنکوچ نہ کر من میرے
منت کرنے
لکھ دے گا کوئی نہ کوئی
قلم کا سوامی
تیرا سندیسہ رُت پتیاں کے نام
وہ نیند کی ماتی رُت سنگھوار
جس نے حال ہمارا پوچھا
آج نہ کل

شفیق فاطمہ شعریٰ

بوسنیا

سامنے جو کیمپ ہیں
پہلے کبھی وہ
ایسے اک باڑے کے رقبے میں گھرے تھے
ہانک کر لائے گئے جن میں کئی قوموں کے گلّے
پھر نہ کوئی جان پایا
ان پہ کیا بیتی
مگر

بے دلی بے حاصلی نے
بار بار اس گھُپ اندھیرے میں یہ سوچا
کیا یہ عالم بے خدا ہے ؟
کیا تسلسل میں زمانے کے نہیں باقی
کوئی روزِ حساب ؟

سامنے جو کیمپ ہیں
ان کے مقابل
نازیوں کے گیس محبس
بھولا بِسرا ایک خواب

یہ جرائم کی نئی تنظیم
نخلِ زار شاہی کی وہ شاخ

کید و مکر و فن نے
جور و جبر و انواعِ فتن نے
بن کے دایہ اس کو پالا
اور پلایا اپنا زہر
"آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب"

سامنے جو کیمپ ہیں
باہر سے ہنگامی دکھائی دے رہے ہیں
ان کے پچھواڑے مگر
حکمتِ افرنگ — صد ہا سال کی وحشی جنونی —
حسرتوں کے ساتھ عریاں بے نقاب

اک غنیمِ فتنہ ساماں
اور اس کے اتنے رُخ!
اک ابوجہل، اک امیّہ بن خلف
اک مُکھوٹا دانشِ حاضر کا، اُجلا،
اک ڈراکیولا جو سرتاپا سیاہ
جس نے گلبانگِ ترقی میں چھپا رکھا ہے چہرہ
اس کو آدم زاد کی نظروں سے بچنا ہے ابھی
کچھ اور دن
ورنہ آدم زادگی کی روح
وہ پس ماندگی اور سرکشی
ڈر ہے
کچھ پڑھ کر نہ اس پر پھونک دے

لو بساط اُلٹی

کہ فرزندانِ یورپ ہی کی آنکھوں میں
سمایا جا رہا ہے
آج گر ذریاتِ بلالؓ
مریمانِ غرب ہوں
یا نازنینانِ حرم
آرزو سب کے لئے
وہ اسوۂ پاکِ سُمیّہؓ
مطلعِ صبحِ شہادت بن کے جو روشن ہوا
پردہ فرما ہوتے ہوتے اس جہاں سے
اک کھلے میدان میں، زیرِ سماء
ان کی صدا،
نعرۂ سرشار میں ڈھلتی ہوئی،
اک نئی حُرّیت کی مُنادی،
اک نئی حُرّیت ـــ
اُبھرو نے جس میں وہ مفہوم پایا،
جس سے دنیا،
آج بھی نا آشنا
اک نئی حُرّیت ـــ
جس کے دامن میں مہک،
ایسے شرف کی،
جو حقیقت میں شرف

ایک تصویر

ایک بچی سینۂ بابا سے لگ کر
اشک افشانی میں گم
بے قرار آنکھوں میں اس انسان کی

بار کر جبرِ مقدر سے بھی جو ہارا نہیں
دردِ شفقت ہے کہ آنکھ میں پگھلا ہوا طوفان ہے
اب بھی سینے سے لگی دیکھیا نہ لڑکی
اس کی نورِ چشم اس کی جان ہے
روشنی حیران، پریشانی بھی، غم بھی!
زندگی کیسی بیداری ہے

الفت،

دردِ بے پایاں میں گم یہ کیسا خوابستان ہے؟
کیسی نامسعود سی فیروزمندی
کیسا نامعروف سا
آہ، عالمِ فیضان ... ہے؟

بیٹھنا چاہا آئنے سے جا شروع کے وا ہمہ دوں نے ۔۔
پرتوِ رحمت تھا، عکسِ عدل اخلاق، کیسے مٹ پاتا یہ رشتہ،
بے خطا دختر کا اور اس کے غدار پدر کے درمیاں۔

بازیابی کے انھی اداروں سے وابستہ ہے
عالمی بردہ فروشی کے ادارے
جن کی نگرانی میں قائم شعبۂ تطہیرِ نسل
غارِ دل آزارِ جاں جن کے لئے ایسی آلاپ
جس میں، بنیادِ مکارم ۔۔۔ روحِ آزادی کا کیفِ بے کراں
چاہتے تھے کاروبارِ بے ضمیری کے اجارے دار
کاش!
دماغ بن جاتا یہ لمحہ
اشک روشن ہونے کے

ان معصوم آنکھوں میں
جو تابندہ ہُوا

کانچ کا پیکر۔ تھی، پاکیزگی تھی، چشمۂ شفاف سی آئینہ رو
عکس انگن جس میں نیلے آسماں
اب بھی چہروں پر اُسی کی آب، آنکھوں میں اُسی کی تاب ہے
پاکیزگی!
اے حسن ورعنائی کے رنگ جاوداں
وہ سراپا صبح صادق، رو کش حوران خلد
دختران ارض یوروپ، باحضورِ قلب اور باچشم نم
گم مناجات و دعا میں ______
لطمۂ سیل بلا سے،
ابتلا سے،
سابقہ کتنا پڑا ناگوہر شہوار کا ______
سیل سا بہتا رہا تاریخ کے ادوار کا ______

برف، پانی، دھوپ میں،
جمتے، پگھلتے اور جلتے موسموں کے درمیاں
گو بظاہر ہم بدلتے ہی رہے
پھر بھی بدل پائے کہاں
جیت کی ساعت ہو یا پل ہار کا
گونجتا ہے آج بھی
اور اد میں وہ ورد ہر سو
جس پہ دَم آخر ہوا تھا
مادرِ عمار رضؑ کا

خصوصی مطالعہ

فہمیدہ ریاض

محمد خالد اختر

بہت زمانے کی بات ہے۔ جب میں حیدرآباد (سندھ) کے ایک کالج میں پڑھتی تھی، میں نے نئی نظمیں لکھنی شروع کی تھیں اور وہ باقاعدہ لاہور سے احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی رسالے "فنون" میں شائع ہو رہی تھیں۔ کہ "فنون" میں ایک ایسے شخص کی تحریروں نے مجھے بے حد لبھا لیا جس کا نام کم از کم میرے لئے آشنا نہ تھا۔ یہ محمد خالد اختر تھے۔

محمد خالد اختر کے کچھ بے ڈھب سے نام کی طرح تحریریں بھی کچھ عجیب و غریب قسم کی تھیں۔ انھیں کسی صنفِ تحریر کے احاطے میں لانا تقریباً ناممکن تھا۔ کبھی ان کا لکھا ہوا کوئی سفر نامہ نظر آتا، کبھی یہ مشاہیر کو خطوط تحریر کرتے، کبھی کتابوں پر تبصرے لکھ ڈالتے، کبھی کبھار، مہینوں میں، ان کی کوئی باضابطہ کہانی بھی نظر آجاتی۔

ان سب تحریروں میں عجیب بات یہ تھی کہ ان کا سفر نامہ کوئی کہانی معلوم ہوتا، کتابوں پر تبصرہ بے حد دلچسپ انشائیے جیسا لگتا، جبکہ ان کی لکھی ہوئی کہانی کوئی سفر نامہ معلوم ہوتی۔ محمد خالد اختر جو کچھ بھی لکھتے وہ بالکل ایسا نہیں ہوتا تھا جیسا کہ عموماً لکھا جاتا ہے۔ یعنی تبصرہ تبصرے جیسا، کہانی کہانی جیسی اور سفر نامہ سفر نامے جیسا۔

اس کے علاوہ ان تمام تحریروں میں ایک ناقابلِ بیان لطیف سی روشنی اور مسکراہٹ سی پھیلی ہوئی نظر آتی۔ ان تحریروں کی زبان بھی بالکل اپنی ہی طرح کی تھی! ایسی زبان جیسی کوئی بھی دوسرا نہیں لکھتا۔ بعض اوقات ان کے جملوں کی ساخت انگریزی جیسی ہوتی۔ دل چاہتا تو غالب کی اردوئے معلیٰ لکھنے لگتے۔ یہ بے حد انوکھی تحریریں تھیں۔ انھیں پڑھ کر ایسا لگتا تھا — اور یہ سب سے زیادہ گہرا تاثر ہوتا — جیسے انھیں لکھنے والا کسی اپنی ہی دنیا میں رہتا ہے۔ ادھر ادھر چلنے والی ادبی تحریکیں رسوم و رواج، قدغنیں اور ادبی اصول جنھیں ہم غیر شعوری طور پر اپنا لیتے ہیں (یا اُن کے خلاف دھوم دھام سے اعلانِ جہاد کرتے ہیں جیسے ہیں) اس شخص پر اپنا اثر ڈالنے سے معذور رہیں۔ یہ کسی حسین ہنس کی طرح اپنے پُرسکون پانیوں میں تیرتے ہیں اور اٹھنے والی لہروں کے پانی کے قطرے ان کے سفید پروں سے آناً فاناً ڈھلک جاتے ہیں۔ یہ ایک بالکل انوکھے ادیب ہیں اردو کے ادبی معاشرے کے ایک ہپّی۔ ایک فلاور چائلڈ۔

لیکن شاید ایسا نہیں ہے۔ شاید محمد خالد اختر کئی دہائیوں پر محیط اس ادبی دور کے سب سے زیادہ باشعور، زیرک اور خلاق ادیب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی معجزے سے انھیں ہمارے درمیان پیدا کیا۔ یہ ہم سب کے بیچ میں رہتے

ہوئے بھی سب سے علیحدہ رہے۔ انھیں کسی ایسی مٹی سے بنایا جس نے اس ادراک کی تشکیل کی جو نا قابلِ مسخ INCO- RRUPTIBLE نکلا۔ انھیں منفرد اور یکتا نگاہ دی جو خوش قسمتی سے ایک مبہم لطیف روشنی اور مسکراہٹ سے مملو ہے گویا یہ ان تحریروں سے جھلکی پڑتی ہوں۔

محمد خالد اختر کو بعض اوقات مزاح نگار سمجھا جاتا ہے۔ (وہ کیا ہیں یہ حتمی طور پر کہنا مشکل ہے۔) بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا مزاح بہت لطیف ہے۔ ان کے ہم عصر (اور گہرے، زندگی بھر کے دوست) شفیق الرحمٰن جیسی مقبولیتِ عام انھیں نہیں ملی۔ اسی لئے اُن کے پسند کرنے والوں کا ایک حلقہ ہے۔

اس باب میں بھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہمارے پاس ایسے اعداد و شمار تو ہیں نہیں جن سے خالد کی مقبولیتِ عامہ کا اندازہ لگایا جا سکے۔ ہاں ان کے پسند کرنے والوں کا حلقہ، یا حلقے ضرور موجود ہیں جو خالد کی تحریروں پر تبسم زیرِ لب کی بجائے بے ساختہ قہقہے لگا لگا کر ہنستے ہیں۔ (شاید یہ لوگ صرف لطیف مزاح پر اس طرح ہنس سکتے ہوں۔) ادب کے بہترین دماغ اور اعلیٰ ترین صاحبِ نظر قاری ان کے شیدائی ہیں۔ اور ہم فخر سے یہ ذکر کیوں نہ کریں کہ فیض احمد فیض بھی ان میں شامل تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر کیوں ؟

یہ سطور لکھنے سے پہلے میں خالد کے ایک اپنے ہی جیسے شیدائی سے کہہ رہی تھی (ہمارے باقاعدہ کلب ہیں) کہ خالد کی تحریریں ایک چھلاوا ہیں۔ ان پر انگلی رکھ کر نشاندہی کرنا ناممکن ہے کہ ہمیں اس کی کس خصوصیت نے مسحور کیا ہے، اور کہاں کہاں ہمارے شعور کی کون کون سی رگ کو ان تحریروں نے چھوا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہم سب انہیں مختلف وجوہات کی بنا پر پسند کرتے ہوں۔

آدمی زیادہ سے زیادہ صرف اپنی ہی کیفیت بیان کر سکتا ہے۔ مثلاً میں کیوں خالد کی تحریروں پر عاشق ہوں؟ سوچنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس لئے کیونکہ خالد کی تحریر کی پہلی سطر پڑھتے ہی ایک جھٹکے سے میں ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتی ہوں۔ دراصل یہ دنیا وہی ہے جس میں میں رہتی ہوں۔ مگر خالد جیسے میری آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ مجھے تمام مدھم اور شوخ رنگ واضح نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً یہ وہی کراچی ہے، لیکن میں نے اسے پہلے ایسا کب دیکھا تھا؟ اب میں اسے پوری حسیات کے ساتھ محسوس کر سکتی ہوں۔ ایک قہقہہ آور شہر جہاں لیاری کی نہایت گنجان بستی میں، مکرانیوں کے جاندار یا دموکے شور میں، مچھلی فروشوں کی بو باس کے درمیان ایک دوکان پر ایک بلا خیز عشق نمو پذیر ہے۔ اور آلۂ مقیاس المحبت ایجاد ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ اتنا حقیقی ہے کہ میں اسے دیکھ اور چھو سکتی ہوں۔ اس دوکان کا لکڑی کا تختہ اور ٹوٹا ہوا اسٹول یہ سڑک، آرپار کی دوکانیں، جھینکوں میں جائے کے گلاس لے کر آنے والا نیم برہنہ لڑکا، یہ سب زندہ ہو گئے ہیں۔ میں عمارتوں کی ساخت اور ان کے اندرونی گوشے دیکھ سکتی ہوں۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ کسی پرانی عمارت میں کسی گمنام سی

کمپنی کے دفتر کے ایک کمرے میں، جو استعمال نہ ہونے کے باعث مدّت سے بند پڑا تھا، تاریکی میں ایک بلی نے بچے دیئے ہیں۔ مجھے بے انتہا تجسس اور ہمدردی ہے کہ ان بچوں اور اس بلی کا اب کیا ہوگا۔ بلی بعد از زچگی کے ایام سے گذر رہی ہے۔ اب میں یہ سب کچھ اس لئے دیکھ رہی ہوں کیوں کہ یہ سب کچھ اس مصنف نے مجھے دکھایا ہے۔ یہ چچا عبدالباقی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ آفس کیٹ نوشی کا اس کہانی کی ابتدا، وسط یا انجام سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر یہ اس میں موجود ہے۔ چچا عبدالباقی گدھوں کو امریکا برآمد کرنے کا کاروبار کرنا چاہ رہے ہیں۔ اب یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہنسی کی ہے۔ اسے ان موضوعات میں شمار کیا جا سکتا ہے جن پر باضابطہ ہنسا جائے۔ لیکن کیا یہ واقعی اس قدر ہنسنے کے قابل بات تھی؟ کہانی کے آخر میں پتہ چلتا ہے کہ نہیں۔ گدھے تو واقعی امریکا برآمد ہوئے۔ گو چچا عبدالباقی کے سیدھے پن اور کاہلی اور کاروباری مزاج نہ ہونے کے باعث کانٹریکٹ کوئی اور لے اڑا۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر جب چچا عبدالباقی اور بھتیجے بختیار خلجی نے برآمد کرنے کی غرض سے گدھے کو پہلی بار غور سے دیکھا، اس کا مشاہدہ کیا اور سنجیدگی سے سوچا کہ گدھے اچھے خاصے خوبصورت جیوان ہیں۔ دیگر یہ کہ ان کی آواز بھی اتنی بری نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے، تو آپ ہنستے ہوئے خود کو اُن سے متفق پاتے ہیں۔ حیوانوں کو — اور انسانوں کو بھی — اتنے غور سے کہاں دیکھا گیا ہے؟

یہ ہیں محمد خالد اختر۔ سب سے انوکھے، سب سے الگ، ایک نرالے ادیب۔ جو بہت سنجیدہ رہتے ہیں۔ کبھی کبھی معمولی سا ہنس کر چپ ہو جاتے ہیں۔

خالد ۱۹۱۹ء میں پنجاب اور سندھ کے بیچ پڑنے والی بڑی بھری ریاست بہاولپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے بہاولپور ہی میں حاصل کی۔ یہیں ان کی دوستی نامور مزاح نگار شفیق الرحمٰن سے ہوئی جو ان کے ہم جماعت تھے۔ لڑکوں کا یہ گروہ کتابوں کا عاشق تھا اور لمبی لمبی سیروں پر جایا جاتا تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں انھوں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کو دریافت کیا۔ اور یہ دریافت ان کا زندگی بھر کا عشق بن گئی۔ دارالاشاعت پنجاب کے شائع کئے ہوئے ترجمے پڑھے۔ رڈیارڈ کپلنگ کی جنگل بک (جس کا ترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی نے "زلیخا" کے نام سے کیا تھا) اور واشنگٹن ارونگ کی "الحمرا کی کہانیاں"۔ ان کتابوں کا ذکر آنے پر اب بھی خالد کی آنکھیں وارفتگی اور شوق سے چمک اٹھتی ہیں۔ کالج میں ان کی دوستی احمد ندیم قاسمی سے ہوئی (اردو ادب کی دنیا کی اس ازلی اور ابدی بزرگ و محترم شخصیت کو طالب علم کے روپ میں تصور کرنا کس قدر حیرت خیز ہے!) بعد میں شفیق الرحمٰن بہاول نگر چلے گئے۔ محمد خالد اختر نے بہاولپور سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد انہیں بالجبر لاہور کے پنجاب کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی میں داخل کر دیا گیا۔ خالد قطعی انجینئرنگ پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں دنوں ان کے لڑکپن کے ساتھی شفیق الرحمٰن لاہور

کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ پرانا ساتھ دوبارہ تازہ ہوا۔ دونوں اپنی محبوب کتابیں لے کر لمبی لمبی سیروں پر نکل جاتے تھے۔ چیکوسلواکیہ کے ادیب یاروسلدو ہاشک کا لکھا ہوا، دنیا کے مزاحیہ ادیب کا کلاسیک "گڈ سولجر شوائیک" (GOOD SOLDIER SCHWIEK) ایسی ہی سیروں کے دوران مل جُل کر پڑھا گیا۔

خالد کو سفر کرنے کا ہمیشہ اشتیاق رہا۔ ان کے اندرونِ ملک سفر کی یادیں سوات، کاغان اور سندھ کے صحرائے تھر کے سفرناموں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انھوں نے کچھ وقت انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی گذارا۔ سفر کا یہ پُرجوش اشتیاق آج بھی باقی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں انھوں نے اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ شاہراہِ قراقرم کے راستے چین کا سفر کیا۔ اور ۱۹۹۱ء میں اپنے نسبتاً نئے دوستوں کے ساتھ ایران، ترکی اور یونان کی بذریعہ ریل اور بس سیاحت کر کے آئے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی انھوں نے خوب سیر سپاٹے کئے جنھیں وہ اپنی نسل کے دوسرے پنجابیوں کی طرح "ہندوستان کا سفر" کہتے ہیں۔ اس زمانے میں وہ بنارس، الٰہ آباد، اجودھیا اور پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ تک گھوم آئے۔

خالد نے جوں توں انجینئرنگ کے دو سال تو پاس کر لیے مگر تیسرے سال فیل ہو گئے۔ اس پر وہ گھر سے بھاگ گئے۔ بہر حال انہیں کسی نہ کسی طرح واپس لایا گیا ۔ یا خود آ گئے ۔ اور انھیں تیسرا اور چوتھا سال بھی پاس کرنا پڑا۔ جس کے بعد انھیں مزید تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ واپسی پر انہوں نے کراچی کی انگلش الیکٹرک کمپنی میں ملازمت کی اور دو سال اس شہر میں گذارے۔ بعد میں انھیں سرکاری ملازمت مل گئی جو وہ ریٹائرمنٹ تک مارے باندھے کرتے رہے۔ ان کی شادی بھی کر دی گئی۔ ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔

محمد خالد اختر کی تحریر سب سے پہلے ۱۹۴۵ء میں "ادبِ لطیف" میں شائع ہوئی تھی جو اُس زمانے میں احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ یہ ان کی پہلی تحریر اور پہلا سفرنامہ "ڈیبلو سے نوکوٹ تک" تھا۔ کچھ برسوں تک خالد باقاعدگی سے "ادبِ لطیف" اور کراچی سے شائع ہونے والے ادبی رسالے "انکار" میں لکھتے رہے۔ "ایم مسلم خود اپنی نظر میں" کے نام سے ایم اسلم کی پیروڈی، "بور ڈم" اور "تنقید نگاری سے توبہ" اسی زمانے میں لکھی گئیں اور شائع ہوئیں۔

خالد ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک بسلسلہ ملازمت کراچی میں مقیم رہے۔ یہ اس دور میں ان کا سب سے زیادہ باثمر زمانہ تھا۔ چچا عبدالباقی کی کہانیوں نے یہیں جنم لیا۔ کراچی کی قدیم بستی لیاری نے اسی زمانے میں خالد کے دل کو لبھایا۔ "مقیاس المحبت" لیاری (چاکی واڑی) کے بارے میں پہلی کہانی تھی جو "سویرا" میں چھپی۔

خالد کا معرکۃ الآرا ناول "بیس سو گیارہ" انھیں دنوں کراچی میں لکھا گیا۔ پڑھنے والا آج بھی حیرت میں رہ جاتا

ہے کہ ۱۹۵۰ء میں یہ مصنف پاکستان میں آنے والے فوجی انقلابوں اور حکمرانوں کی پیش گوئی کیوں کر کرسکا۔ محمد خالد اختر کا کہنا ہے کہ انھوں نے ولیم فاکنر کے تخلیق دلیس یوکنا پوٹاوا پا کی از سر نو تخلیق کی۔ لیکن پڑھنے والے کو یہ آنے والے دنوں کا پاکستان لگتا ہے۔ جہاں محلاتی سازشوں کے ذریعے تابڑ توڑ فوجی انقلاب آرہے تھے۔ جہاں "کھلی ہوا کے عاشق" ہجوم کی صورت فٹ پاتھوں پر رہ رہے تھے۔ فوجی حکمران پالکی میں سفر کرتا ہے۔ تقریر سے پہلے فٹ پاتھ کے ایک پنساری سے خریدا سرمۂ محبت آنکھوں میں لگاتا ہے جس کو لگاکر دیکھنے سے عوام اس سے محبت کرنے لگیں گے (بعد میں جنرل ضیاء الحق نے یہ سرمہ لگایا۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ان کی آنکھیں ہمیشہ سرمگیں معلوم ہوتی تھیں) مگر پنساری بے ایمان نکلا۔ سرمہ لگانے سے جنرل کی آنکھوں میں بے تحاشا جلن ہوئی اور پانی بہنے لگا مگر عوام نے ان سے محبت کرکے نہ دی۔

"بیس سو گیارہ" کے حکمراں جنرل کو سُرخوں سے اس قدر شدید نفرت ہے کہ ریس کورس میں سُرخ گھوڑے کو جیتتا دیکھ کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور بے اختیار چلّانے لگتا ہے: "سرخ گھوڑے کو روکو"۔

پچاس کی دہائی میں پاکستان میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ محمد خالد اختر پر اس کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا دوسرا ناول "چاکی واڑہ میں وصال" تحریر کیا۔ جو ان کی لیاری سیریز کا نقطۂ کمال تھا۔ یہ کتاب ۱۹۶۴ء میں شائع ہوسکی۔ ان کی تحریروں کا مجموعہ "کھویا ہوا افق" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ ان دنوں پاکستان میں آدم جی ادبی ایوارڈ کے نام سے ایک واحد ادبی انعام دینے کا رواج تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اس ایوارڈ کی کمیٹی پر فیض احمد فیض بھی تھے۔ دوسرے ممبران روایتی قسم کے تھے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے ایوارڈ کے لئے اس تقریباً گمنام ادیب کا نام تجویز کیا۔ فیض صاحب نے "کھویا ہوا افق" کو آدم جی ایوارڈ دلایا۔ بعد میں انھوں نے محمد خالد اختر سے کہا کہ "یہ انعام پوسٹ ہیومس (POST HUMOUS) ہے۔ کیوں کہ یہ دراصل تمہاری پچھلی کتاب "چاکی واڑہ میں وصال" پر دیا گیا ہے"۔ اس طرح اردو کے سب سے عظیم ترقی پسند شاعر نے چاکی واڑہ کی ظالم حکمرانی حسینہ اور اس کے نامراد عاشق کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

محمد خالد اختر نے ۵۲-۱۹۵۱ء کے بعد اچانک لکھنا ترک کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میری نسل کے قارئین اور لکھنے والوں کے لئے ان کا نام گم ہوگیا۔ جب ہم نے ادبی رسالے پڑھنے شروع کئے تو خالد کی تحریریں ان سے غائب ہوچکی تھیں۔ انھیں دوبارہ ادب میں کھینچ لانے کا سہرا یقیناً احمد ندیم قاسمی کے سر ہے۔ جنھوں نے ۱۹۶۳ء میں فنون جاری کرکے نئے اور پرانے لکھنے والوں کو ایک ایسا روشن خیال اور تر و تازہ ادبی پلیٹ فارم دیا جس کی اس وقت بہت ضرورت تھی۔

محمد خالد اختر کی تحریریں اپنی ساری تازگی، تبسم روشنی اور ترنم سمیت "فنون" کے اوراق کو منور کرنے لگیں ان کے تبصرے قہقہہ آور تھے۔ وہ کسی سکہ بند تنقیدی اصول کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھوں نے وہ تنقیدی اصول وغیرہ پڑھے بھی نہیں۔ ان کے بغیر ہی وہ کتاب کی روح میں اتر کر اس کے نہاں راز کھول دیتے تھے۔ ان کا باشعور قلم ادب کی ازسرِ نو تفہیم کر رہا تھا۔ پاکستان میں سن پچاس سے سن ساٹھ تک آتے آتے اردو ادب، اس قدر گھٹیا اور قبضۂ نوکرشاہی کا شکار ہو چکا تھا کہ اس کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔ ادب پر ایک سے بڑھ کر ایک تنگ نظر خبیث فطرت بیوروکریٹوں اور ان کے خوشہ چینوں کا قبضہ تھا۔ ہوش و خرد اور انسانی اقدار کو اردو ادب سے مار مار کر نکالا جا رہا تھا۔ ایک عجیب و غریب غیر انسانی اور سرکاری تعریفِ حبّ الوطنی ادب کا گلا گھونٹ رہی تھی اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ زندگی کے کسی بھی پہلو پر سرکاری طور پر تسلیم شدہ تصور کے علاوہ کسی اور نقطۂ نظر کا اظہار کر سکے۔

محمد خالد اختر نے بنا کسی سیاسی نقطۂ نظر سے وابستگی کے اس نوکرشاہی تسلّط کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ بالکل یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی جوگی پہاڑ سے اتر کر آیا ہے اور شہر کی گلیوں میں گھومتے ہوئے اس شہر کے راز فاش کرتا چلا جا رہا ہے۔ اسے نہ کوئی خوف ہے نہ کوئی طمع، نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

یہی صورت ان خطوں کی تھی جو وہ مشاہیرِ عالم (زیادہ تر مشاہیرِ پاکستان) کو لکھ رہے تھے اور "نقوش" "افکار" اور "فنون" میں شائع ہو رہے تھے۔ اگر محمد خالد اختر سے کوئی کہے کہ انھوں نے ان خطوں کے ذریعہ ذہنوں کا زنگ کھرچ پھینکا اور ان آہنی زنجیروں کو توڑ ڈالا جو ادب کے شعور کو بری طرح جکڑے ہوئے تھیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ شرمندہ اور سخت پریشان ہو کر ہنسنے لگیں گے۔ ان کے دل میں کوئی کارنامہ انجام دینے کی ذرا بھی خواہش نہیں۔ کندھوں پر اٹھائے جانے اور ہار پہنائے جانے کا امکان ہو تو خالد جی جان کا زور لگا کر اور رسّیاں تڑا کر ایسے فرار ہوں گے کہ شاید اس بار "کالی کٹ" سے بھی دور نکل جائیں۔

وہ تو ایک سیلانی ادیب ہیں، کتابوں کے رسیا، سیر سپاٹے کے شوقین، گرد و پیش پر گہری نگاہ ڈالتے، اپنی طرح کے ایک، ناقابلِ تقلید محمد خالد اختر۔

محمد کاظم

محمد خالد اختر
(ایک تعارف)

اِن دنوں، اگر آپ کراچی کی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے کمرشیل ایونیو میں واقع ایک جدید طرز کے خوبصورت مکان پر جا کر گھنٹی بجائیں تو غالب امکان یہی ہے کہ اندر سے ایک صاحب گہرے رنگ کی ململی شلوار قمیص پہنے، پاؤں میں باٹا کا سلیپر گھسیٹتے ہوئے برآمد ہوں گے، جن کا حلیہ اور سراپا آپ کے لئے جاذبِ توجہ ہوگا۔ اونچا نکلتا ہوا قد، سانولی رنگت، تیکھا ناک نقشہ اور سینک سلائی ایسے جیسے کسی نے ہڈیوں کے ڈھانچے پر چمڑا مڑھ دیا ہو۔ آنکھیں چھوٹی مگر بلا کی ذہین، آلڈس ہکسلے کی سی ستواں ناک، پیچھے ہٹتی ہوئی اونچی پیشانی اور سر پر چھدرے اور پریشان سے کھچڑی بال! آپ اپنے آنے کا مدّعا بیان کریں گے تو وہ جواب میں اپنا مریل سا استخوانی ہاتھ آپ کی طرف مصافحے کے لئے بڑھائیں گے اور ایک گمبھیر آواز میں اپنا نام بتائیں گے۔"جی! میں ہی محمد خالد اختر ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی قدرے تکلّف سے بھاری آواز میں کھنکاریں گے کہ اس طرح شاید اگلا جملہ سوجھ جائے۔ محمد خالد اختر کے ساتھ آپ کی ابتدائی گفتگو ایک عذاب سے کم نہ ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اپنی فطری کم گوئی اور شرمیلے پن کی وجہ سے آپ کے ساتھ شروع میں بہت کھِنچے کھِنچے رہیں گے۔ یہ تاثر دیتے ہوئے کہ آپ نے اُن سے ملنے کا بے کار کشٹ اٹھایا۔ لیکن آپ کا اشتیاق دیکھتے ہوئے اگر وہ آپ کو ایک دفعہ اوپر کی منزل پر واقع اپنے کمرے میں لے گئے اور وہاں باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور اجنبیت کی برف پگھلنی شروع ہوگئی تو پھر آپ ایک بالکل ہی مختلف محمد خالد اختر کو اپنے سامنے پائیں گے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کھلتے چلے جائیں گے اور آپ کے ساتھ ایسی پُرلطف اور ذہانت اور تجربے کی باتیں کرنے لگیں گے، اور انگریزی اور اردو ادب کی کتابوں اور شخصیتوں کے بارے میں ایسی مفید اور نادر معلومات آپ کو مہیا کریں گے کہ ان کی باتوں میں گُم ہو کر آپ کو گزرتے ہوئے وقت کا احساس نہیں رہے گا۔ اور آپ جب اٹھیں گے تو پوری طرح آسودہ ہو کر اٹھیں گے۔

چند سال پہلے میرا یہ دوست بہاولپور میں اپنے قدیم آبائی مکان کے دو اڑھائی کمروں میں اکیلا رہتا تھا۔ میں اس سے ملنے وہاں کئی بار گیا۔ اس کے سونے کے کمرے میں ایک پرانی ہیئت کا پلنگ بچھا ہوتا جس میں ہمیشہ جھول پڑا رہتا اور اس پر عموماً ایک میلی سی چادر اور میلا سرہانہ دیکھنے میں آتے جنہیں دُھلائی کا منہ دیکھے ایک عرصہ ہو چکا ہوتا۔

بستر کے قریب ہی ایک چھوٹی سی لکھنے پڑھنے کی میز ہوتی جس پر ایک طرف کچھ کتابیں اور رسالے دھرے رہتے۔ اور میز پر کام کرنے کی جگہ کا تھوڑا سا ٹکڑا چھوڑ کر باقی میز اور کتابوں اور ڈائریوں پر گرد کی ایک تہہ جمی ہوتی۔ کمرے میں اور کچھ ہو نہ ہو چند لوازمات ضرور دکھائی دیتے۔ چائے کا ساز و سامان، اور سگریٹ ماچس اور ایش ٹرے، ایک طرف کتابوں سے ٹھسا ٹھس بھرا شیلف اور سامنے کونے میں ایک چھوٹا سا ٹی۔ وی! سونے کے کمرے سے ملحق کھانے کا کمرہ تھا، جس کے وسط میں پرانے وقتوں کی، میز پوش سے عاری، ایک ڈائننگ ٹیبل تھی جس کے ایک سرے پر بیٹھ کر خالد اپنا سادہ سا قوت لایموت تناول کرتا۔ کھانا اتنا نہ ہوتا کہ کسی ناگہاں آنے والے کو اس میں شامل ہونے کے لئے کہا جا سکے! — ان دنوں خالد کا رہن سہن بس ایسا ہی تھا جیسے کوئی درویش علائق دنیا سے دور اپنے حجرے میں رہتا ہو۔ زیادہ تر اس کے چند ایک یار دوست اس سے ملنے آتے، وہ خود کم ہی باہر جاتا تھا۔ لیکن پھر کچھ ایسے حالات پیش آ گئے کہ اسے بہاولپور کی اس زندگی کو خیر باد کہہ کر کراچی منتقل ہونا پڑا۔

پچھلے دنوں میں کراچی میں اس کے گھر گیا، اور لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اس کے کمرے میں جا کر بیٹھا تو یہ ایک اور ہی طرح کا ماحول تھا۔ صاف ستھرا اور کشادہ کمرہ، پلنگ اور اس کے ارد گرد خوبصورت صوفے اور کرسیاں، کتابوں کا شیلف اور لکھنے پڑھنے کی میز اور دوسرا سامان ایک سلیقہ سے ترتیب دیا ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس بھرے پُرے پانچ بیڈ روم والے گھر میں کوئی ہے جو اس کی اور اس کے کمرے کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اور اس سے مجھے بڑا اطمینان حاصل ہوا۔

محمد خالد اختر اب نہتر برس کا ہو چکا ہے۔ اس کی صحت قابلِ رشک تو کبھی نہ تھی۔ آج سے چالیس برس پہلے جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی وہ اسی طرح دبلا، سوکھا اور معدے کے السر کا مریض تھا جیسے آج ہے۔ اس لئے اس کی صحت آج بظاہر اتنی ہی اچھی یا اتنی ہی بُری ہے جتنی پہلے تھی۔ البتہ اب اسے کچھ دوسرے جسمانی عوارض مثلاً سانس کی نالی کا ورم اور پیشاب میں رکاوٹ وغیرہ کبھی کبھی لاحق ہو جاتے ہیں تو وہ مایوسی اور موت کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اپنے دوستوں کو لکھتا ہے: "I Think I should pack up now." ایک دفعہ میں ملک سے باہر جاتے ہوئے کراچی سے گزرا تو وہ مجھے اپنے خطوں میں جو کچھ لکھتا رہا تھا اس سے میں نے یہ تصور باندھا کہ میں ایک بیمار اور مضمحل خالد کو دیکھوں گا۔ لیکن جب وہ مجھے ایر پورٹ پر لینے آیا تو بھلا چنگا اور ہشاش بشاش تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلتا تھا۔ اسی طرح وہ کہیں ایک خط میں لکھے گا "اب میرے کنوئیں کا پانی ختم ہو گیا ہے اور اب میں کوئی چیز بھی نہیں لکھ سکوں گا۔" اور دوسرے ہی مہینے کراچی کے ادبی رسالے "آج" میں اس کی ایک بھرپور "عبدالباقی کہانی" چھپی ہوئی ہوگی۔ اور اس میں محمد خالد اختر اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ موجود ہوگا۔ چنانچہ اب ہم نے اس کی باتوں کا زیادہ اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا یہ دور موروثی حیاتیاتی جرثوموں (Genes)

کی دریافت کا ہے اور انسانی زندگی پر اُن کے اثرات کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جارہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خالد کو جو Genes ورثے میں ملے ہیں ان میں بڑی توانائی اور قوّتِ حیات ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اپنی اس خراب صحت کے باوجود وہ ابھی لمبا عرصہ جیئے گا اور ہمیں اس کی اور بہت سی چیزیں پڑھنے کو ملیں گی۔

عجیب بات ہے کہ خالد پر یہ تعارفی مضمون لکھتے ہوئے میں جب اس کی زندگی کے حالات رقم کرنے پر آیا تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ چالیس برس کی اس طویل رفاقت کے باوجود میں اس کی زندگی کے پہلے دَور کے متعلق بہت کم جانتا ہوں (شاید دوستوں کے درمیان ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں) چنانچہ اس بارے میں کچھ کہنے کے لئے مجھے خالد سے متعلق پرانے کاغذات اور مضامین اور مسوّدات (Archives) کی کافی ورق گردانی کرنی پڑی۔

محمد خالد اختر کے اجداد پنجاب کے ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ اس صدی کے اوائل میں پہلے اس کے دادا اور بعدازاں اس کے والد نے ریاست بہاولپور میں آکر محکمۂ مال میں ملازمت کی۔ اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ خالد کا بچپن ریاست کے ایک سرحدی شہر بہاول نگر میں گزرا۔ وہ ابھی دوسری جماعت میں تھا کہ اس کے گھر میں دارالاشاعت پنجاب کا بچوں کا رسالہ "پھول" آنے لگا جسے وہ شوق سے پڑھتا اور اس سے آگے پڑھنے کا ایسا چسکا پڑا کہ اس نے اس ادارے سے شائع ہونے والی بچّوں کی بہت سی دوسری کتابیں بھی ایک ایک کر کے پڑھ ڈالیں۔ جب وہ بڑا ہوا تو اُس وقت کا اہم ادبی رسالہ "نیرنگ خیال" اس کے مطالعے میں آیا، جس میں منٹو، عظیم بیگ چغتائی اور دوسرے اکابرِ ادب لکھتے تھے۔ ان لوگوں کی تحریروں نے اس کے اندر ادب کا شعور اور ذوق پیدا کیا اور پھر انہی دنوں میں ایک اور اتفاق یہ ہوا، جو میں سمجھتا ہوں اس کی زندگی کا بہت اہم اتفاق تھا، کہ انگریزی کے نامور اور صاحبِ طرز ادیب رابرٹ لوئی سٹیونسن سے متعارف ہوا۔ اُس نے اس مصنّف کو پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ وہ پوری طرح اس کے جادو تلے آگیا۔ سٹیونسن اپنے سحرانگیز فن اور شخصیت کے ساتھ اُس کے حواس پر اس طرح چھا گیا کہ اُس زمانے میں وہ اپنے آپ کو سٹیونسن کا چیلا کہا کرتا اور اس کی تصویر ہمیشہ اپنے کوٹ کی اوپر کی جیب میں دل کے قریب رکھتا۔ خالد کے مطالعے کا رُخ جب انگریزی ادب کی طرف ہوا تو وہاں نوجوانوں کی دلچسپی کا بڑا سامان موجود تھا۔ وہاں رائیڈر ہیگرڈ، کیپٹن مریات اور فینی مور کوپر جیسے مصنف تھے جو معرکہ آرائی، مہم جوئی اور بحری قزّاقوں کی کہانیاں لکھتے تھے۔ ان سب کی تحریروں نے خالد کے تخیّل کو جلا دی اور اس کے احساسِ حیرت کو بھڑکایا۔ وہ نہ صرف ان کہانیوں اور ان کے دل آویز طرزِ بیان کا گرویدہ ہوا بلکہ اس کے سر میں خود بھی بحری قزّاق بننے، دور دراز جزیروں میں مہمات کرنے اور پھر ان کے بارے میں سٹیونسن کی طرح کہانیاں لکھنے کا سودا سمایا۔ اُس وقت وہ جوان، پُرجوش اور حوصلہ مند تھا۔ اور اُس کی امنگیں بھی جوان اور منہ زور تھیں۔ ان کے بارے میں وہ اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

"اپنے آغازِ شباب میں میری امنگیں مجھے کسی کل آرام سے نہ بیٹھنے دیتیں کتنی ہی چیزیں میں کرنا چاہتا تھا۔ اونچے، برف سے ڈھکے پہاڑوں کی کوہ پیمائی، ایک چھوٹی سی کشتی میں ایمیزن جیسے دریا میں ایک ہزار میل لمبا سفر، جھیل مانسرور کے کنارے کیلاش کی لاماسری میں لاما بننا اور گیان و عرفان حاصل کرنے میں بہت ہی خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا، اور رابرٹ لوئی سٹیونسن کی طرح ڈھیروں زرخیز و نڈر ناول کتابیں لکھنا......"

اپنی ان ناآسودہ آرزوؤں کو لئے ہوئے وہ اسکول سے نکل کر کالج آ گیا۔ بہاولپور کے صادق ایجرٹن کالج میں اس کی ملاقات احمد ندیم قاسمی سے ہوئی اور ان کے درمیان دوستی کا ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہوا۔ ندیم کالج میں اس سے دو سال آگے تھا لیکن چونکہ ان کا ٹیوٹوریل گروپ ایک ہی تھا اس لئے یہ اس کے جلسوں میں اکثر اکٹھا ہوتے اور اپنی لکھی ہوئی چیزیں پڑھ کر سناتے۔ خالد نے اس زمانے میں بحری قزاقوں کی کچھ کہانیاں انگریزی میں لکھ کر ان جلسوں میں سنائیں، جو پسند کی گئیں۔ لیکن بات کچھ زیادہ آگے نہ بڑھی۔ ندیم ان دنوں صرف شاعری کرتا تھا اور ان جلسوں میں اپنی خوبصورت نظمیں سناتا تھا۔ خالد نے اُسے ترغیب دی کہ وہ کہانیاں بھی لکھا کرے۔ اس طرح ندیم نے افسانے لکھنے شروع کئے۔ اور اس صنف میں اتنی ترقی کی کہ آگے چل کر بطور افسانہ نگار کے بڑا نام پیدا کیا۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ ندیم بھی خالد پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہوا۔ اور اُس کے دل میں اردو میں لکھنے کا خیال پیدا کیا۔ اُس وقت ادب میں ترقی پسندی کی جو فضا بن رہی تھی اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ انسان ایک اجنبی زبان میں لکھنے بجائے اردو میں لکھے۔

بہاولپور کالج سے فارغ ہونے کے بعد خالد نے لاہور کے لا کالج میں ایک ناکام سال گزارا اور اس کے بعد اس کے والد نے اُسے انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے لاہور کے میکلیگن کالج میں داخل کرا دیا۔ انگریزی ادب نے اب اس کے قلب و ذہن پر اتنا تسلط جما لیا تھا کہ انجینئرنگ کی کتابوں کی طرف وہ پوری توجہ نہ دے سکا اور یہ تعلیم مکمل کرنے میں اُسے دو سال زیادہ لگ گئے۔

مبہم جوئی اور دنیا کے غرابت آمیز (EXOTIC) خطوں کی طرف نکل جانے کی امنگ ابھی تک خالد کے دل میں ہمکتی تھی۔ جبھی اس زمانے میں اُس نے کئی مرتبہ کالج اور گھر کی پابند اور گھٹی ہوئی فضا سے رسّی تڑا کر ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جا کر بس رہنے کا ارادہ کیا۔ ایک دفعہ بمبئی کی طرف جا نکلا اور باندرہ، چوپاٹی اور مالابار ہل کے علاقوں میں گھومتا پھرا۔ دوسری بار اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ اورنگ آباد کا قصد کیا۔ وہاں اُس نے دولت آباد کا قلعہ دیکھا، مغل بادشاہ عالمگیر اور اس کے مرشد شیخ برہان الدین کے مزاروں پر حاضری دی۔ وہاں سے نکل کر چھ میل پر واقع ایلورا کے غار جا کر دیکھے اور سنگ تراشوں کی محنت اور مہارت کو دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ جب اس طرح کے سفروں کا ارادہ کرتا تو بغیر کسی کو بتائے اچانک گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔ اور دو دن بعد ہر طرف اس کی ڈھونڈیا پڑنے لگتی۔ ایسے ہی

ایک موقع کا ذکر کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"چند روز کے بعد مجھے سورت سے اُس کا خط ملا کہ میں یہاں جنوبی ہند کی اس ساحلی آبادی میں چلا آیا ہوں اور مچھیروں کی ایک بستی میں قیام پذیر ہوں۔ پھر اُس نے مچھیروں کی آزاد اور رنگا رنگ زندگی اور نیلے سمندروں سے ان کی دوستی کا طویل تذکرہ رومانی انداز میں کیا اور اس حسرت کا اظہار کیا کہ کاش وہ ایک سیدھا سادا مچھیرا ہوتا....."

خالد ابھی انجینئرنگ کالج میں ہی تھا کہ ایک دفعہ پھر اسی طرح کی یاترا پر نکل کھڑا ہوا اور اب کے وہ گیان اور شانتی کی تلاش میں ہردوار جا پہنچا۔ مندروں اور بندروں کے اس شہر میں اس نے کئی دن گزارے اور یہاں کی ایک سرائے میں بندو لانام سے ٹھہرا رہا۔ اور اسی سرائے کے ایک کمرے میں اس نے ۱۹۴۴ء میں اپنی پہلی کہانی "کھویا ہوا افق" لکھی جو ایک طرح سے اس کے اسی سفر کی رُوداد ہے۔ اس کہانی میں وہ ایک جگہ کہتا ہے: "ایک پہاڑی پر چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے دل میں کہا: یہ ہے وہ رومان جس کو ڈھونڈنے تم اتنی دور آئے ہو۔" لیکن اس رومان سے وہ اپنی روح کو زیادہ دن تک شاد نہ کر سکا۔ اس لیے کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے پیچھے ایک فرستادہ آنکلا اور اسے سمجھا بجھا کر گھر واپس لے گیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے "کھویا ہوا افق" کے متعلق ایک دو باتیں خاص طور پر ذکر کرنے کی ہیں۔ اوّلاً یہ کہ یہ اردو زبان میں خالد کی پہلی باقاعدہ اور مکمل ادبی کوشش (composition) تھی۔ دوسرے یہ کہ نو دس سال بعد جب "ادبِ لطیف" میں اس کے چھپنے کی نوبت آئی تو سعادت حسن منٹو نے اسے بغور پڑھا اور اس میں اتنی کانٹ چھانٹ کی کہ یہ اپنی طوالت میں آدھی رہ گئی۔ "کھویا ہوا افق" کا ایک ابتدائی مسودہ میرے پاس خالد کے کاغذات میں موجود ہے۔ میں نے ایک دفعہ اس مخطوطے کو مطبوعہ کہانی سے ملا کر دیکھا تو منٹو کی محنت پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے نہ صرف اس کے پورے کے پورے پیراگراف کاٹ کر بیانیے کو چست اور سُبک بنا دیا تھا، بلکہ یہاں وہاں زبان اور محاورے کی اصلاح بھی کی تھی اور خالد کے بعض جملوں کی ناگوار انگریزیت دور کر دی تھی۔ خالد کی اس پہلی کوشش میں وہ کیا بات تھی کہ اس نے منٹو جیسے نابغۂ روزگار کی توجہ حاصل کی اور اس نے اپنے استادانہ "ٹچ" کے ساتھ اسے "ادبِ لطیف" میں شائع کرا دیا۔ اس کہانی میں دراصل منٹو کو ایک ایسا اُبھرتا ہوا جوہر (Talent) دکھائی دیا تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں۔

۱۹۴۵ء میں انجینئرنگ کی تعلیم سے فارغ ہو کر خالد نے سندھ کے جنوب مشرق میں واقع ریگستانی علاقے "تھر" کا سفر کیا اور وہاں کئی روز قیام کیا۔ تھر کے اس سفر کے ایک حصے کا احوال اس نے "ڈیپلو سے نون لوٹ" کے عنوان سے لکھا جو رسالہ "سویرا" میں شائع ہوا۔ یہ بھی ایک سفری سرگزشت تھی اور ایک عجیب اتفاق یہ کہ اسے ایک دوسرے بڑے ادیب احمد ندیم قاسمی نے اشاعت سے پہلے نوک پلک سے سنوارا اور یہی نہیں بلکہ یہ کہانی اس رسالے

ہیں ان دو نو ں کے منتشر کردہ مواد سے پیمپر ۔

اگلے سال خالد پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کے لئے انگلستان چلا گیا اور ڈیڑھ برس سے کچھ زیادہ عرصہ گذار کر جب وہ لوٹا تو پاکستان بن چکا تھا اور کراچی اس نوزائیدہ مملکت کا پایۂ تخت تھا۔ واپس آکر خالد نے زندگی کے تین چار سال بعض کمپنیوں کی ملازمت کے سلسلہ میں کراچی میں گذارے، اور اس بڑھتے پھیلتے ہوئے کاروباری شہر کے ایک غریبانہ علاقے کھارادر میں سکونت اختیار کی۔ کراچی کے اس قیام نے خالد کو بہت کچھ دیا۔ اس کی تخلیقی قوتوں کے لئے جو آب نمو پاکر اپنا اظہار چاہتی تھیں یہاں کی پرہجوم زندگی اور اس میں چلنے پھرنے والے انسانی نمونوں کی صورت میں ایک بہر حاصل مواد موجود تھا چنانچہ اسی زمانے میں اس نے اپنا پہلا ناول "بیس سوگیارہ" لکھا جو اس وقت کے سیاسی اور سماجی طور طریقوں پر ایک تمثیلی لیکن پُرمزاح طنز تھی۔ اس نے جارج آرویل کے تتبع میں اس ناول کو ایک فینٹسی بتایا، لیکن دراصل یہ ان معنوں میں کوئی فینٹسی نہیں تھا بلکہ طنز و مزاح کا ایک تیز و تند مرکب تھا، جس کی زبان کچھ ضرورت سے زیادہ انگریزیت زدہ تھی۔ اس وقت کے مشہور طنز نگار کنہیا لال کپور نے اسے اردو کا پہلا معاشرتی اور سیاسی طنزیہ ناول قرار دیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش وہ اس کا مصنّف ہوتا۔ کھارادر اور چاکی واڑہ کے تنگ بازاروں اور گلی کوچوں کی زندگی نے بوہیمین خالد کو ایک اور کہانی کا مواد بھی مہیا کیا اور اس نے اپنا دوسرا ناول "چاکی واڑہ میں وصال" لکھا۔ اس میں اس نے بقول خود چاکی واڑہ کی فضا کو سٹیونسن کے رنگ میں منعکس کرنے کی کوشش کی۔ اس کتاب کے انتساب میں خالد کہتا ہے "اس ناول کا اصلی اور حقیقی کردار چاکی واڑہ ہے، باقی انسانی کردار محض ضمنی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کے نزدیک جیتے جاگتے کردار نہ ہوں، لیکن ان میں ایک wole houzan قسم کی جلت پھرت اور زندگی ضرور ہے۔" اس ناول کے بارے میں پڑھنے والوں کی آرا ملی جلی اور کچھ متضاد قسم کی تھیں۔ منٹو کو اس میں حقیقت سے قریب انسانی کردار نظر نہ آئے تو وہ جھنجھلا اٹھا۔ لیکن شاعر فیض احمد فیض کو یہ ناول اتنا پسند آیا کہ ایک زمانے میں وہ اس پر ایک فلم بنانے کا سوچتے رہے۔ انھیں اس میں چارلز ڈکنز کے ناولوں کے مزاحیہ کرداروں کی چلت پھرت نظر آئی — ان ساری باتوں کے علاوہ کراچی کی اس زندگی نے خالد کو "چچا عبدالباقی" اور "بھتیجے بختیار خلجی" کی صورت میں دو ایسے کردار سجھائے جنھوں نے اس کے خالص انگریزی طرز کے مزاح اور طنز کے لئے امکانات کی ایک دنیا کھول دی۔ اور اس نے ان کرداروں کے گرد وقتاً فوقتاً ایک درجن سے زائد عبدالباقی کہانیوں کا تانا بانا بنا اور اردو ادب کو طنز و مزاح کے ایک نئے اور اچھوتے ذائقے سے آشنا کیا۔ ان کہانیوں کے یہ چچا اور بھتیجا جو کاروباری معاملات کی الف بے نہیں جانتے، راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھتے ہیں اور اس کے لئے انھیں بہت دور کی سوجھتی ہے۔ اپنے تئیں ہوشیار سمجھنے والا چچا ہر دفعہ ایک بڑا کاروباری منصوبہ اپنے سادہ لوح بھتیجے کے پیسوں سے شروع کرتا ہے اور

ہر دفعہ کچھ مضحکہ خیز حالات سے گزر کر ذلت آمیز ناکامی سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن چچا کے پاس ہمیشہ اس ناکامی کی ایک مطمئن کرنے والی دلیل موجود ہوتی ہے اور سادہ لوح بھتیجا ایک دفعہ پھر اس کے دام میں آکر ایک نئے منصوبے کے لئے پیسہ مہیا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ـــ چچا عبدالباقی اور بھتیجا بختیار اتنے دلچسپ، حقیقت سے قریب اور ہمدردی کے مستحق کردار ہیں کہ مجھے یقین ہے اردو ادب میں یہ بہت دیر تک زندہ رہیں گے۔

پھر جس طرح سب اچھی چیزیں ایک دن اپنے انجام کو پہنچتی ہیں، اسی طرح خالد کا قیام کراچی بھی ایک دن ختم ہوا اور وہ اس دارالحکومت کو خیر باد کہہ کے بہاولپور آ گیا۔ یہاں آکر وہ بجلی کے سرکاری محکمے میں ملازم ہوا اور اس کی وہ آزادی اور بے فکری کی زندگی اب ملازمت کے قواعد و ضوابط کی پابند ہو کر رہ گئی۔ وہ ایس۔ ڈی۔ او کے عہدے پر پہلے احمد پور شرقیہ میں اور اس کے بعد چشتیاں اور خانپور کے شہروں میں تعینات رہا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے پر ترقی پا کر لاہور آ گیا۔ یہاں ایک دن اس کی زندگی کا ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا، کہ اس کے دیرینہ دوست احمد ندیم قاسمی اس کے دفتر میں اس سے ملنے آئے اور اُسے یہ اطلاع دی کہ "فنون" کے نام سے وہ ایک ادبی رسالہ نکالنے لگے ہیں جس کے لئے خالد کو باقاعدگی سے لکھنا ہوگا۔ خالد کے لئے جس نے پچھلے کئی برسوں میں بہت کم لکھا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کا لکھنے کا کیریئر اب تمام ہوا، یہ ایک نئی زندگی کی نوید تھی۔ خالد نے "فنون" میں اس کے پہلے شمارے سے ہی اپنی چیزیں دینی شروع کر دیں۔ اور رفتہ رفتہ "فنون" کے صفحات اس کی گوناگوں ادبی صلاحیتوں کی جولانگاہ بن گئے۔ آنے والے برسوں میں ملک کے اس سب سے موقر ادبی رسالے میں اس کے افسانے، طنزیہ و مزاحیہ خاکے، مضامین کتابوں پر مفصل تبصرے، عبدالباقی کہانیاں اور پیروڈیاں شائع ہونے لگیں۔ جس سے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے فن کے دلدادگان کا ایک وسیع حلقہ پیدا ہو گیا۔

ہمارے ایک شاعر دوست ہیں جو موسم بہار کو اپنی خاص ڈکشن میں "وقفۂ گل" کہتے ہیں۔ ایک شاعر اور ادیب کی نسبت سے وقفۂ گل وہ ہوا جب اس کی تخلیقی قوتیں اپنے اوج پر ہوں اور وہ آمد کے دور میں ہو۔ میں جب خالد کی اب تک کی تخلیقی زندگی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے یوں نظر آتا ہے کہ اس میں یہ وقفۂ گل تین مختلف موقعوں پر آیا اور خالد کے قلم کو گہر بار کر گیا۔

- ایک اس وقت جب وہ کراچی کے اندرونی محلوں کھارادر اور چاکی واڑہ میں بود و باش رکھتا تھا اور اپنے کام کے سلسلے میں فریئر روڈ، لورپریڈی اسٹریٹ اور انفنٹری کے علاقوں میں آتا جاتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے انسانی نمونے۔ جن سے اُسے روزانہ سابقہ پیش آتا، اُس کے تخیل کو زرخیز کرتے تھے۔
- دوسرے اس وقت جب وہ پہلی بار تبدیل ہو کر لاہور آیا اور یہاں اس کے کالج کے زمانے کے دوست احمد ندیم قاسمی نے اسے "فنون" میں باقاعدہ لکھنے کے لئے کہا۔ اور اس کی بوقلموں تخلیقی صلاحیتوں کے لئے

ایک جہانِ امکانات اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

● اور تیسرے اس وقت — اور یہ بہت بعد کے زمانے کی بات ہے — جب خالد نے اسد اللہ خان غالبؔ کو اس کے خطوط میں "دریافت" کیا۔

میں نہیں جانتا وہ کیسا اتفاق تھا کہ غالب کے خطوط اس کے ہاتھ لگے۔ لیکن ایک دفعہ جب وہ اس کے ہاتھوں میں آگئے اور اُس نے انھیں پڑھنا شروع کیا تو اُسی طرح ان کے سحر تلے آتا چلا گیا جس طرح ایک دفعہ وہ اپنے لڑکپن میں آر۔ ایل۔ سٹیونسن کے اسلوبِ تحریر کا متوالا ہوا تھا۔ غالبؔ کو اس نے خوب پڑھا اور بار بار پڑھا اور اپنی کاپیوں میں اور کاغذوں کے پُرزوں پر اس کے فقرے کے فقرے نقل کر کے اس کا طرزِ خطاب اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے محسوس کیا کہ اس شاعر کی روح اس میں سما گئی ہے۔ اور اب وہ جب چاہے اور جیسے چاہے اپنی بات غالب کے خطوط کے انداز میں کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا نام محمد خالد خان خضرؔ رکھا اور "مکاتیبِ خضرؔ" کے عنوان سے اپنے بے تکلف دوستوں آشناؤں، وقت کی اہم ادبی شخصیتوں، رسالوں کے مدیروں، سیاستدانوں اور مذہبی رہنماؤں، اداکاروں، شاعروں اور تاریخ کی بعض پُر رنگ شخصیتوں کے نام غالبؔ کے طرز میں خطوط لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ پہلے کچھ عرصہ کراچی کے ماہنامہ "افکار" میں چلا۔ اور پھر ایک وقفے کے بعد "فنون" میں آنے لگا۔ اس طرز کی مکتوب نگاری میں خالد کی پیداوار اتنی فراواں (۲۰۰ مکاتیب) تھی کہ اس نے دو تین دوسرے رسالوں کو بھی اپنی اس طرفہ نگارش سے خرسند کیا۔ اپنے عہد کی ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیتوں میں جہاں جہاں خالد کو جھوٹ، بناوٹ اور ریا کاری کے مظاہر نظر آئے اس نے اپنے ان مکاتیب میں انہیں ایک بے رحم طنز و مزاح کا نشانہ بنایا اور اپنی تحریر کے آئینے میں انہیں ان کا اصل چہرہ دکھایا۔ میں اَوروں کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ ادب کی دنیا کے وہ لوگ جو ان خطوں میں خالد کی بے لاگ طنز کا نشانہ بنے، اُن کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ اُس کے خون کے پیاسے ہوئے اور انہوں نے اسے کبھی معاف نہ کیا۔ محمد خالد خان خضرؔ کے ان خطوں کی کاٹ کتنی تیز تھی اس کا اندازہ سید سبطِ حسن کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے۔ سبطِ حسن اُن دنوں کراچی سے ایک رسالہ "پاکستانی ادب" نکالتے تھے۔ اور اس میں انھوں نے خالد کا ایک مکتوب شائع کیا تھا جو کراچی کے نامور صحافی اور روحانی شخصیت رئیسؔ امروہوی کے نام تھا۔ اس مکتوب کے ردِّ عمل کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"محرّم تو آج شروع ہوا ہے، لیکن ساداتِ امروہہ بالخصوص جناب رئیسؔ امروہوی کے بنگلے پر تو پندرہ روز سے صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ کبھی ماتم ہوتا ہے اور کبھی آپ کے ساتھ "پاکستانی ادب" پر تبرّا بھیجا جاتا ہے۔ گیہوں

ے ساتھ گھٹن تو پیسا ہی تھا۔ واہ حضرت، واہ! آپ نے مثبت شگنی کا جو انداز نکالا ہے اگر محمود غزنوی زندہ ہوتا تو اس ایجاد پر خودکشی کر لیتا۔ یہاں ہر جگہ آپ کے خط کی دھوم ہے اور جو ملتا ہے "پاکستانی ادب" کو آپ کے کارنامے پر مبارکباد دیتا ہے۔ یقین مانئے بہت دنوں کے بعد ایسا مضمون پڑھنے کو ملا جس کا ذکر دوسروں سے کر کے خوشی ہوتی ہے۔"

محمد خالد اختر کس وضع کا اور کس مرتبے کا ادیب ہے اور اردو ادب میں اس کی کنٹری بیوشن کیا ہے؟ اس بارے میں اگر آپ اردو کے نقادوں سے رجوع کریں گے تو وہاں سوائے خاموشی کے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ خالد کو بالکل نظر انداز کرنے میں انہوں نے شروع سے اب تک بڑی استقامت دکھائی ہے۔ اس پر اب تک جن دو چار لوگوں نے قلم اٹھایا وہ یا تو ادبی برادری میں سے اس کے کچھ دوست ہیں یا اردو اور انگریزی سی انت کی دنیا میں اس کے قدر دان! ایک اور ایک بات جو آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی یہ ہے کہ پاکستان میں اردو کے چار پانچ جتنے بھی معروف مزاح نگار ہیں وہ یوں تو سب کے سب خالد کے مدّاح ہیں، لیکن جب وہ کتابوں کے فلیپوں پر یا اشتہاری بروشروں میں ایک دوسرے کی تحسین کرنے پر آتے ہیں تو خالد کا کہیں نام نہیں لیتے اور اسے اپنے حلقے سے یوں خارج کر دیتے ہیں جیسے وہ ان کے قبیلے کا فرد ہی نہ ہو!

محمد خالد اختر میری رائے میں ایک مختلف اور غیر روایتی قسم کا ادیب ہے، اور اس کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن میں وہ دوسرے سب قلم کاروں سے الگ اور یگانہ دکھائی دیتا ہے۔ خالد کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لئے ان کی خصوصیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہوگا۔

اوّلاً وہ ایک ایسا ادیب ہے جس نے اردو کے روایتی، گھسے پٹے اور کلیشوں کے مارے ہوئے طرزِ اظہار کی جگہ ایک ایسے اسلوب کو رواج دیا ہے جس میں انگریزی کے اسالیبِ بیان کے رچاؤ کی وجہ سے بڑی تازگی، توانائی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ یہ وہ فن کار ہے جو انگریزی ادب کا سمندر اپنے اندر اتار کر اردو کی طرف آیا اور اس میں اپنے مخصوص طرزِ اظہار سے اردو ادب کو ایک بالکل نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ شروع میں اس کی اردو تحریر پر انگریزی کا اثر بہت نمایاں اور بعض جگہ نازک طبائع پر گراں گذرنے والا ہوتا تھا۔ لیکن پھر جوں جوں خالد نے اردو میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا تو اس کی عبارتوں میں انگریزیت کے اثرات کم سے کم تر ہوتے چلے گئے، لیکن اس کی سوچ کا انداز اور اس کے فقرے کی ساخت انگریزی ہی رہی اور آج تک انگریزی ہے۔ البتہ یہ خصوصیات اس کی تحریر میں ایسی رچ بس گئی ہیں کہ ان کی وجہ سے اس میں ایک انفرادیت پیدا ہو گئی ہے، اور شاید اسی کو دیکھتے ہوئے محمد حسن عسکری نے ایک دفعہ کہا کہ جو فقرہ محمد خالد اختر لکھتا ہے وہ کوئی دوسرا ادیب نہیں لکھ سکتا۔ اردو میں صاحبِ طرز نثر نگار بہت کم ہوئے ہیں۔ خالد کا شمار بجا طور پر ان صاحبِ طرز نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ اور ایک نیا پن اور تازگی لئے ہوئے اسلوب کی صورت میں

اس نے اردو نثر کو جو کچھ دیا ہے وہ اس کی بہت بڑی دین ہے۔

دوسرے یہ کہ محمد خالد اختر جس طرح کا ٹیلنٹ لے کر آیا ہے اس میں وہ مجھے اس برِّصغیر کے سب ادیبوں اور قلم کاروں سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک ہشت پہلو ادیب ہے جس نے اردو ادب کی کم و بیش دس اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اور ان میں ایسے پائے کی تخلیقات پیش کی ہیں کہ ان میں سے بعض خاص اصناف میں کوئی اس کے قریب بھی نہیں پہنچتا۔ سفری روداد یا سفرنامہ، ناول، افسانہ، طنزیہ و مزاحیہ کہانی یا مضمون، شخصی خاکہ، پیروڈی، محاکات (Imitation) مفصّل تبصرہ، سنجیدہ مقالہ اور انگریزی سے ترجمہ! یہ اردو ادب کے وہ میدان ہیں جن میں اس کے اشہبِ قلم نے خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔ اور فن کے نادر اور بے مثال نمونے پیش کئے ہیں۔

تیسرے یہ کہ وہ ایک ایسا ادیب ہے جس نے شہرت اور نام و نمود کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے کئی موقعوں پر کہا ہے کہ "میں اپنی تسلی اور اپنے سکون کے لئے لکھتا ہوں۔ میری خوشی صرف اس میں ہے کہ میں کوئی اچھا تخلیقی کام کر لوں"۔ اور اس کی یہ بات سو فیصد صحیح ہے۔ اگر اسے شہرت اور ناموری کی خواہش ہوتی اور وہ اپنی تخلیقات کو جائز اہمیت بھی دیتا تو وہ ناشروں کے ساتھ میل جول بڑھاتا کہ اس کی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوں اور جب وہ چھپ کر منظرِ عام پر آتیں تو وہ نقادوں اور تبصرہ نگاروں کے ساتھ تعلقات استوار کر کے ان پر اخباروں اور رسالوں میں ریویو کراتا۔ لیکن اس نے یہ سب کچھ نہیں کیا اور ایسی کوئی بات کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکا (اور اس میں اس کی طبعی کاہلی اور بے سلیقگی کا کچھ کم دخل نہیں) کہ اپنی تحریروں کو کسی طرح اپنے پاس محفوظ ہی کرتا جاتا۔ اگر وہ یہ سب کچھ کر لیتا تو آج اس کی کم از کم پندرہ کتابیں چھپ کر بازار میں آ چکی ہوتیں۔ اب تک اس کی سات یا آٹھ جتنی بھی کتابیں شائع ہو کر دن کی روشنی دیکھ پائی ہیں ان میں سے بیشتر کی جمع و ترتیب میں اس کے دوستوں اور بہی خواہوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

چوتھے یہ کہ خالد کے وجود کو اردو ادب کے نقّادوں اور پروفیسروں نے بھلے تسلیم نہ کیا ہو، اس کا ٹیلنٹ اتنا سچّا اور توانا تھا کہ اس نے ایک دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کیا اور اس کے مدّاحوں میں بڑے بڑے نام دیکھنے اور سننے میں آئے۔ کنہیا لال کپور، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، شفیق الرحمان، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، سید سبط حسن، فہمیدہ ریاض اور صلاح الدین محمود۔ اس کے فن کے قدر دانوں میں سے صرف چند نام ہیں، ورنہ یہ فہرست بہت طویل ہے۔ اس کی عزلت پسندی اور بے حد کمزور تعلّقاتِ عامّہ کے باوجود اس کے ایک مجموعے "کھویا ہوا افق" پر اسے آدم جی ادبی انعام دیا گیا۔ اور ادھر چند برس پہلے محمد خالد اختر کا نام لاہور کے اورینٹل کالج میں ایم۔ اے اردو کے تھیسس کے پرچے کے لئے منظور کیا گیا۔ اور ادب کے ایک محنتی اور لگن رکھنے والے طالب علم نے اس پر ایک جامع اور بھرپور مقالہ لکھ کر ایم۔ اے کی

ڈگری حاصل کی۔ خالد اب اپنی گوشہ نشینی اور تنہائی پسندی کے باوجود ادب کی ایسی معتبر شخصیتوں میں سمجھا جاتا ہے کہ رسالوں اور اخباروں سے تعلق رکھنے والے لکھاری نوجوان اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے اس کا انٹرویو لینے کے لئے اس کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس مسلّم ادبی مرتبے کے باوجود خالد کی کتابیں بازار میں نہیں بکتیں۔ بیسٹ سیلر ہونا تو دور کی بات ہے، اس کی کتاب "کھویا ہوا افق" جو انعام یافتہ بھی تھی، اس کا پہلا ایڈیشن بارہ تیرہ برس میں کہیں جا کے ختم ہوا اور تب اس کا نیا ایڈیشن چھپنے کی نوبت آئی۔ اس کی پہلی دو کتابیں "بیس سو گیارہ" اور "چاکی واڑہ میں وصال" اب ایک عرصے سے کہیں نظر نہیں آتیں اور ان کا دوسرا ایڈیشن طبع کرنے کا اب تک کسی ناشر نے نہیں سوچا — ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ خالد ایک ایسا ادیب ہے جس کی اپیل کم پڑھے لکھے قاری کے لئے نہیں ہے۔ وہ دراصل لکھنے والوں کا مصنّف (writer,s writer) ہے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے نہ صرف اچھا تعلیم یافتہ ہونا بلکہ انگریزی ادب کا کچھ ذوق رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ انگریزی مزاج کی وجہ سے اس کا بات کرنے کا انداز اتنا لطیف اور sophisticated ہوتا ہے کہ بسا اوقات ایک اوسط درجے کے قاری کے سر پر سے گذر جاتا ہے۔

خالد کی اب تک آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے کوائف کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ "بیس سو گیارہ" (طنزیہ ناول) ستمبر ۱۹۵۰ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

۲۔ "چاکی واڑہ میں وصال" (مزاحیہ ناول) یہ کراچی میں غالباً ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۵۲ء کے زمانے میں لکھا گیا۔ لیکن ۱۹۶۴ء میں جا کے شائع ہوا۔

۳۔ "کھویا ہوا افق" (کہانیوں، خاکوں اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۶۸ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

۴۔ "دو سفر" (سواتی مہم اور کاغانی مہم) یہ دو مختصر سفرنامے پہلے "فنون" میں چھپے اور پھر کتابی صورت میں لاہور سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئے۔

۵۔ "عبدالباقی کہانیاں" (مجموعہ) لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

۶۔ "ایلیس جہانِ حیرت میں" اور "آئینے کے پار" (لیوس کیرل کی بچوں کے لئے لکھی گئی دو مشہور کہانیوں کا انگریزی سے ترجمہ) اس کتاب کی اشاعت میرے لئے آج تک معمّہ ہے۔ حکومت کے ایک ادارے "بک فاؤنڈیشن" نے اس ترجمے کو شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور سنا ہے کہ پریس میں دینے سے قبل ان لوگوں نے خالد کے ترجمے میں کافی ردوبدل کیا اور اسے کچھ مقامی رنگ

دینے کی کوشش کی۔ یہ کتاب چھپ کر کہاں گئی؟ اس کا آج تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ خالد نے اس ترجمے میں جو خون پسینہ بہایا تھا، افسوس کہ وہ سب رائیگاں گیا۔ خالد کے ترجمے کا اصل مسودہ البتہ میرے پاس محفوظ ہے۔

۷۔ "مکاتیبِ خضر" (غالب کے طرز میں طنزیہ و مزاحیہ خطوط کا مجموعہ) ۱۹۸۹ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

۸۔ "یاترا" (سندھ کے علاقے "تھر" سے متعلق ایک تازہ سفرنامہ) ۱۹۹۰ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

ان کے علاوہ خالد نے بہت عرصہ پہلے لندن کے گبز میموریل سے شائع ہونے والی ایک کتاب Travels of Ibn-e-Jubayr ۔ کو اپنی تلخیص اور ترجمے کے ساتھ اردو میں منتقل کیا تھا۔ ابنِ جُبیر اندلس کا باشندہ تھا جس نے بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں حج بیت اللہ کے سلسلے میں بلادِ مشرقیہ کی سیاحت کی تھی اور ایک سادہ سچا بے تکلفانہ سفرنامہ لکھا تھا۔ خالد کی تلخیص و ترجمہ "ابنِ جُبیر کا سفر" لاہور کے ایک ادبی رسالے "نصرت" میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا منصوبہ باندھا گیا لیکن اس کا کتابت شدہ مسودہ کئی برس تک ایک کاتب کے ہاں نگاہوں سے اوجھل پڑا رہا۔ اب یہ مل گیا ہے تو امید ہے کتاب سال چھ ماہ میں چھپ کر آجائے گی۔

اور پھر ان تصانیف کے علاوہ خالد کے طنزیہ و مزاحیہ خاکوں، اس کی سنجیدہ کہانیوں، اس کی پیروڈیوں اور کتابوں پر مفصل تبصروں پر مشتمل کم از کم چھ مجموعے اور تیار ہو سکتے ہیں۔ اور یہ سب اگر چھپ جائیں تو خالد کا مکمل کام قارئین کے سامنے آسکتا ہے۔

اور اب یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں پھر اپنے دوست کی شخصیت کی طرف آتا ہوں اور ایک ادیب کی حیثیت سے خالد کا اس کی زندگی کے بارے میں اور لکھنے پڑھنے کے اس سارے کاروبار کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے وہ سامنے لاتا ہوں۔ یہ ہم اس کی اپنی زبان سے سُنیں گے۔ اب سے کئی سال پہلے ایک انٹرویو کرنے والے نے محمد خالد اختر سے پوچھا۔ "اگر آپ کو قانوناً لکھنے سے روک دیا جائے تو آپ کیا کریں گے؟" اس کے جواب میں خالد نے جو کچھ کہا، اور یہ گفتگو ریڈیو کی لہروں پر نشر ہو رہی تھی، وہ اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

"اس سے میری زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ میں یقیناً ایسا واہیات قانون بنانے والے کی کوتاہ اندیشی اور ضعیف الدماغی پر افسوس کروں گا اور شاید مجھے ایک دل لگی کے چھن جانے پر تھوڑی بہت جھنجلاہٹ بھی ہو۔ اس سے زیادہ یہ بندش میرے معمولات پر اثر نہیں ڈالے گی ... مجھے قانوناً لکھنے سے روک دیا جائے گا اور میں لکھ نہیں سکوں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا اندھیر ہو جائے گی اور میں اُداس بے آس ہو کر خودکشی کا سوچنے لگوں گا۔ مجھے یقین ہے سورج تب بھی چمکے گا۔ جنگل پرندوں کے نغموں سے پھر بھی گونجیں گے اور میرے شہر کا دریا اپنے ریتیلے کناروں کے

بیچ اسی طرح پرسکون اور خوبصورت بہتا رہے گا۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا بے حد حسین ہے۔ زندگی میٹھی ہے۔ اس سے کس کا دل بھر سکتا ہے؟ لکھنے کا مشغلہ چھوٹ جانا کوئی اتنی بڑی محرومی نہیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ گائے ہوئے نغمے سہانے ہوتے ہیں، لیکن وہ ان کہے نغمے جو ہونٹوں پر نہیں آپاتے اور بھی سہانے ہوتے ہیں... میں لکھ نہیں سکوں گا، مگر کتنی ہی اور چیزیں ہیں جو میں اپنے وقت کو مسرت اور منفعت سے گذارنے کے لئے کر سکتا ہوں۔ میں ایک اچھی سی کتاب جیب میں ڈالے ایک چھوٹی کشتی میں اپنے دریا کے آبناؤں اور ٹاپوؤں کی سیاحی کروں گا۔ اپنے لڑکپن کے چہیتے مصنّفوں کو نئے سرے سے پڑھوں گا۔ ریت کے ٹیلوں پر دُور نکل جایا کروں گا اور جھاڑیوں کے سائے میں بیٹھ کر نوجوان چرواہوں کی رفاقت میں پانی کے گھونٹ سے روکھی سوکھی روٹی کھاؤں گا... اور رات کو اپنے ایک دلی دوست کے ساتھ شطرنج کے کھیل میں اپنی مایوسیوں اور محرومیوں کا تریاق ڈھونڈوں گا۔"

بے شک محمد خالد اختر! تم یہ سب کچھ کروگے اور مگن رہوگے۔ تمہیں زندگی سے اتنا پیار ہے کہ اگر لکھنے کا مشغلہ تم سے کبھی چھوٹ بھی جائے (خدا کرے ایسا کبھی نہ ہو) تو تمہارے لئے زندگی میں مکافات کے اور بہت سے پہلو باقی رہیں گے اور تم ہنسی خوشی جیئے چلے جاؤگے۔ لیکن تمہارے دوستوں اور قدردانوں کو اس سے کتنا بڑا نقصان ہوگا، اور وہ اس زندگی کی مسرتوں میں سے کتنی بڑی مسرت سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کا شاید تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے!

ضیاء بہاء الحق

محمد خالد اختر
(فن اور شخصیت)

ایڈمنڈ گھوز نے رابرٹ لوئی سٹیونسن کے متعلق کہا تھا "قلم ہاتھ میں لئے میں حیران و ششدر ہوں کہ الفاظ میں اس نہایت ہی پیارے اور باہمت انسان کی کیوں کر تصویر کھینچ سکتا ہوں"۔ کچھ یہی کیفیت اس کے چیلے کے بارے میں لکھتے وقت میری ہے۔ کسی فن کار کی شخصیت اور فن میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جتنی بھرپور اور توانا اس کی زندگی ہو گی اتنی ہی اس کی تخلیقات عظیم اور آفاقی ہوں گی۔

محمد خالد اختر، اللہ آباد جہاں اس کے والد تحصیل دار تھے ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوا۔ یہ شہر دو سو سال پیشتر امیر صادق محمد خان عباسی اول، فرماں روائے بہاول پور نے بسایا تھا۔ خالد کا آبائی مسکن کھوڑی، تحصیل کھاریاں ضلع گجرات ہے۔ اس کے مورثِ اعلیٰ رائے پتھورا نے ۱۱۹۱ء میں شہاب الدین محمد غوری کو ناکوں چنے چبوائے تھے لیکن عرصہ بعد بہادر چوہانوں کا ایک خاندان مشرف بہ اسلام ہوا۔ بھائی بندوں نے ان پہ عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور ان کا سیلاب بلا کش کھاریاں ہی کی پہاڑیوں میں آ تھما۔ کھوڑی ہی کے دامن میں ایک گاؤں ہے۔

گوہر خان چوہان خالد اختر کا جدِ امجد ایک متمول زمیندار تھا۔ اور مار دھاڑ اس کا محبوب مشغلہ۔ کچھ فاصلہ پہ "بھملے" بستے تھے۔ یہ راجپوت نانہ کے راجہ بھمد کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے کئی گاؤں تھے۔ لیکن حافظ ہست کی درس گاہ کے باعث ملوانہ کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ حافظ ہست ایک انسان دوست اور عالم متبحر تھا۔ دور دراز سے تشنگانِ علم ملوانہ آ کر قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے۔ ان کے نان نفقہ کا وہی کفیل تھا جسے وہ اپنی زمینداری سے پورا کرتا۔ اس کی خوبصورت گھوڑیاں بھی تھیں جن پہ گوہر خان کی نظر تھی۔ ایک رات اس نے گھوڑیاں نکالیں اور دریائے جہلم کے پار کسی رسہ گیر کو دینے کا قصد تھا کہ ہی کی پہاڑیوں میں راستہ کھو بیٹھا اور شب بھر بھٹکتا رہا۔ صبح دم گھوڑیاں اپنے تھان پہ لوٹ ہنہنانے لگیں۔ تو اس مردِ درویش کو آگاہی ہوئی۔ کوئی آدھ پہر دن چڑھے گوہر خان بھی نادم و پشیمان آن موجود ہوا۔ نہ جانے ان میں کیا باتیں ہوئیں کہ اگلی صبح اس کا اکلوتا لڑکا محمد عالم ملوانہ کی دانش گاہ سے وابستہ ہوا۔ اور برسوں رہ کر فاضل اجل ہو کر کھوڑی واپس ہوا۔ گوہر خان اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ میاں محمد عالم

نے اپنی درس گاہ شروع کی اور کھوڑی "کھوڑی شریف" کہلایا۔ امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان سرکارِ برطانیہ کی دعوت پر جب عازمِ لاہور ہوا تو کھوڑی سے گذرا۔ وہ اس عالم بزرگ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ کابل آنے کی دعوت دی لیکن میاں صاحب عدیم الفرصتی کے باعث نہ جا سکے۔

میاں محمد عالم کے چھ بیٹے تھے سبھی عالم و فاضل۔ چھوٹے حافظ عبد الوارث تو جنمی نابینا تھے۔ تین گاؤں میں ہی "زمیندارہ" کرتے رہے۔ لیکن دو قدرے مہم جو واقع ہوئے۔ غلام جیلانی ریاست ٹونک میں ناظمِ ضلع ہوئے۔ اور مولوی عبد المالک خالد کے دادا کئی کتابوں کے مؤلف ریاستِ بہاولپور میں پہلے مشیرِ انہار اور پھر ۱۹۲۴ء تک مشیرِ مال کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ جامع مسجد بہاولپور کے پہلو میں مسجدِ اقصٰی ان کی یادگار ہے۔ ان کے بڑے لڑکے عبد اللہ خان لندن سے بیرسٹری کے بعد ملتان میں لیگل پریکٹس کرتے رہے۔ لیکن چھوٹے مولوی اختر علی بہاولپور میں تحصیلدار نائب منتظم آبادی، ڈپٹی کمشنر اور کمشنر بحالیات ہوئے۔ ریاست بہاولپور کے لق و دق صحراؤں میں یہ لہلہاتے کھیت و باغات اور ہندوستان سے لُٹے پٹے مہاجروں کی آباد کاری انھیں کی تگ و دو کا ثمرہ ہے۔ بڑے ابا جی تو پنشن پر جو گھر گئے تو کھوڑی کے ہو کر رہ گئے ۱۹۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ پرانی انڈین سول سروس کے سر ہمفری ٹریویلین نے اپنی انگریزی کتاب میں جہاں مولوی اختر علی کی مستعدی اور دیانت داری کی تعریف کی ہے وہاں انکے والد کی پرسکون موت کا بڑے دلکش پیرائے میں ذکر کیا ہے۔

۱۹۴۸ء میں جب بہاولپور میں "مولوی اختر علی ہاؤس" کھڑا ہوا تو خالد کے ابا نے اُسے رین بسیرا بنایا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سیاست میں آئے تو قومی اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ فیلڈ مارشل کی انتخابی مہم میں نکلے ہوئے تھے کہ ۲۶ دسمبر ۱۹۶۴ء کی صبح کینال ریسٹ ہاؤس چک عبد اللہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ کیا باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ کتنی دلربا شخصیت اور انسانیت سے سچی محبت! حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

محمد خالد اختر اُن معدودے چند خوش بخت ادیبوں میں سے ہے جسے علم و ادب اور فارغ البالی ایک ساتھ ورثہ میں نصیب ہوئی لیکن نہ تو اسے مایہ ناز ادیب ہونے کا گھمنڈ ہے اور نہ ہی خاندانی وجاہت پہ فخر۔ ایسا منکسر المزاج انسان تو شاذ ہی کوئی ہوگا۔ وہ ایک نامور کہانی کار اور طنز و مزاح کا لکھاری ہے۔ اس کی تحریروں میں مسحور کن شگفتگی اور تازگی ہے کیوں کہ وہ اچھے ادب کا رسیا اور قاری ہے۔ انگریزی ادب ہو، اردو، فرانسیسی، المانی یا روسی سب میں اس کے لئے سامانِ دلکشی ہے۔ ادب سے اس کی یہ گہری وابستگی نصف صدی پر محیط ہے جب اس نے اپنے باپ کی لائبریری سے اس سفر کا آغاز کیا تھا۔ اسٹیونسن اس کا گرویدہ اور انگریزی ادب

اس کا اوڑھنا بچھونا۔ پنجابی اس کی مادری زبان ہے اور سرائیکی سے بک گونہ محبت۔ افسانہ، پیروڈی، طنزومزاح مکتوبات، خاکے اور سفرنامے اس نے کیا کچھ اردو ادب کو دیا۔ سوچتا ہمیشہ وہ انگریزی میں رہا اور لکھتا قومی زبان میں یہی اس کا منفرد مقام ہے۔ اور انگریزی ادب کی گہری چھاپ نے اس کی تحریروں کو ایک جادوئی چاشنی دی ہے۔ اس نے ان گنت دیوپیکروں کے شہ پارے پڑھے اور وہ ادب پہ ایک ناقدانہ نظر رکھتا ہے۔ اِکّے دُکّے ادیب کا چربہ اتارنا تو سہل ہے لیکن ادب کا قاری ہونا بڑا کٹھن اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور ایک منجھا ہوا قاری ہی ادب پر عمیق نگاہ رکھتا ہے۔ "کارِ جہاں دراز ہے" میں قرۃ العین حیدر نے شکایت کی ہے کہ "اداس نسلیں" کے متعلق انٹرویو میں اس کے مصنّف نے اسے قابلِ التفات ناول نگار نہ جانا۔ حالانکہ اس بھلے آدمی نے اپنے اسی ناول کے کئی ابواب میں ادب کی اس ساحرہ کے ناولوں اور ایک افسانہ کا چربہ اتارا تھا اور قرۃ العین کو ناچار کہنا پڑا "خفیف سے ردوبدل کے ساتھ پورے جملے اور پیراگراف تک وہی ہیں۔ لیکن آج تک سوائے پاکستانی طنز نگار محمد خالد اختر کے کسی ایک پاکستانی و ہندوستانی نقاد کی اس طرف نظر نہیں گئی۔"

خالد کو پہلی بار میں نے پروفیسر مولوی حاجی احمد کے مکان بہاولپور میں دیکھا۔ مولوی اختر علی ان دنوں بہاول نگر میں تھے۔ اور انھوں نے اپنے لاڈلے کو اپنے چچیرے بھائی کے ہاں چھوڑ رکھا تھا۔ اس نے خاکی نیکر پہن رکھی تھی اور گھٹنوں پر تختی جمائے خوش خطی کی مشق کر رہا تھا۔ پھر وہ جلد ہی بہاول نگر بھائی بہنوں میں لوٹ گیا۔ بی بی جی دل کھول کر خرچی دیتیں اور وہ تحصیل بازار میں گوران دتہ پنساری سے لال شربت پیتا۔ بادۂ احمریں کی بھی کیا لت ہے۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

وہ ایک شوخ و شنگ کھلنڈرا سا لڑکا تھا لیکن ماسٹر ولایت شاہ درآئے۔ وہ کبھی اس کے باپ کے استاد تھے۔ اور اب ضعیف العمری میں اپنے شاگرد کے بچے بچیوں کے ٹیوٹر۔ باہر ڈیرے میں رہتے۔ خالد بھی وہیں ایک کمرہ میں سوتا۔ وہ کجردم جھنجھوڑ کر اٹھاتے۔ میاں آموختہ یاد کرو۔ اس کے سنہرے سپنے ٹوٹ جاتے۔ آج بھی جب اس کرب کو یاد کرتا ہوگا تو تن میں جھرجھری سی آجاتی ہوگی۔

ایک روز قاضی جی کتب فروش مولوی صاحب کو ملنے آئے۔ خالد بھی پاس کھڑا تھا۔ جھٹ ایک روپہلی سکّہ اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ وہ سیدھا سادہ لڑکا اگلے روز ہی اس اچھے آدمی کی دوکان پر جا نکلا کہ شاید بھلا آدمی پھر روپیہ دے لیکن قاضی نے ڈانٹ پلائی کہ کھڑا کیا کرتا ہے۔ ہم قاضی صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمیں

خالد اختر سا طنز و مزاح نگار دیا!

مولوی صاحب نائب منتظم آبادی ہو کر بہاولپور آئے اور خالد کو بہاول نگر کی کھلی فضاؤں کو خیرباد کہنا پڑا۔ پہلے مشن اسکول اور پھر صادق ڈین ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ انہیں دنوں شفیق الرحمٰن بھی یہیں۔ ڈی ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ وہ اکیلا منہ اٹھائے پھرتا تھا کوئی راولی ہی شناسا۔ دونوں قریب آئے اور ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے۔ ریاض الدین احمد کے والد بہاولپور کمشنر پولیس ہوئے تو وہ بھی ان کا ہم درس اور دوست بنا۔ شفیق کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "کرنیں" ریاض کے نام اور دوسرا "شگوفے" خالد کو منسوب ہوا۔

میٹرک کے بعد خالد گورنمنٹ کالج لاہور آیا۔ پروفیسر بخاری انگریزی کلاس لیتے تھے۔ درسی کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ان کی چٹپٹے دار باتیں ہی علم و حکمت کا مخزن تھیں۔ وہ اب بھی اُن کی پُرکشش شخصیت سے مسحور ہے لیکن خوشگوار لمحات ہمیشہ مختصر ہوتے ہیں۔ انہی دنوں پانچویں پشت میں حافظ ہست کا ایک نابکار فرزند اسلامیہ کالج میں گل کھلا چکا تھا۔ خالد کے دادا نے اس کے باپ کو سرزنش کی کہ جلد لڑکے کو بہاولپور بلائے، سو سر منڈاتے ہی اولے پڑے اور گرما کی تعطیلات ختم ہوتے ہی وہ ویگا بانڈ ایس۔ ای کالج میں پہنچ گیا۔ صادق ایجرٹن نے جہاں احمد ندیم قاسمی، ریاض الدین احمد اور محمد کاظم سے مایہ ناز طالب علم پیدا کیے وہاں خالد نے بھی کالج رول آف آنر پر کر کے ۱۹۳۶ء میں بی۔ اے کیا۔ کہاں سکیسر کی پہاڑیوں میں اٹکہ اور کہاں بہاول پور کے ریگزار لیکن ندیم صاحب کے چچا بہاولپور مشیرِ مال ہو کر آ رہے تھے اور اپنے مرحوم بھائی کی نشانی کو اپنے ساتھ رکھنے کو ناگہانی موت نے آلیا۔ ندیم پہلے ہی تھرڈ ایئر میں داخلہ لے چکے تھے۔ اب ناچار ملول اور اداس ہوسٹل میں رہنے لگے۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ ایک سابق مشیرِ مال کا پوتا فرسٹ ایئر میں ان کا منتظر تھا۔ کچھ دن بعد ریاض الدین احمد بھی خالد سے آملا۔

عبدالرشید پیرزادہ انگریزی ادب کے استاد علی گڑھ یونیورسٹی تیاگ کر ایس۔ ای کالج سے وابستہ ہو چکے تھے۔ وہ پیرزادہ احمد شاہ ندیم پہ خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ پاکستان نے دو ہی تو احمد شاہ پیدا کیے ہیں۔ احمد شاہ بخاری اور ندیم۔ ان کی شعر و شاعری کی دھاک تھی۔ "نخلستان" کالج میگزین میں ان کی "صبوحی" کو وہی مقام حاصل تھا جو اختر شیرانی کی "سلمیٰ" کو۔ انگریزی میں خالد کی کہانیاں بھی چھپتی تھیں۔ جیسا کہ وہ "جلال و جمال" میں کہتے ہیں۔ خالد ہی نے انھیں انگریزی ادب پڑھنے اور افسانہ لکھنے کی ترغیب دلائی اور وہ ایک بڑے افسانہ نگار بن کر ابھرے۔ منشی پریم چند کی صنف میں ان کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ "چوپال" خالد ہی کے نام معنون تھا۔ غالباً اظہارِ تشکر کے طور پر!

ریاض الدین احمد گورنمنٹ کالج لاہور سدھارے اور ندیم بی۔ اے کر کے چل دیے۔ خالد کے اور بھی دوست تھے۔ رانے زادہ اندر بھان تو اب کانپور میں ہیں۔ اور شمس گورگانی نے انکم ٹیکس کے بہی کھاتوں سے فراغت پا کر لمبی

داڑھی چھوڑ رکھی ہے اور رحیم یار خان اپنی زمینوں پہ شکار کھیلتا ہے۔ عمر کے ہر دور کے ساتھ جہاں ہمارا روزمرّہ اور معمولِ حیات بدلتا ہے وہاں نت نئے ساتھی ملتے ہیں۔ وہ جگہیں جہاں ہمارا بچپن مسکرایا، لڑکپن کھیلا اور وہ لاتعداد ہجولی اور ساتھی کہاں گئے۔ گذرے ہوئے دنوں کی محض ایک صدائے بازگشت رہ جاتی ہے اور زندگی کے تلخ حقائق ہمیں اتنی بھی مہلت نہیں دیتے کہ ہم ان جگہوں میں لوٹ سکیں یا ان ساتھیوں سے مل سکیں جن سے ہم نے عہد و پیمان باندھے تھے۔ بس کچھ بھولی بسری یادیں رہ جاتی ہیں۔ اور وہ بھی بہت کم خوش نصیب ہیں جو ماضی کے دھندلکوں میں جھانک سکیں۔

خالد ایک چاق و چوبند چوڑے چکلے سینے اور کھلے ہوئے بازوؤں کا جوانِ رعنا تھا۔ لمبی سیر، ورزش اور کشتی رانی کا اسے شوق تھا۔ ہم اکثر ستلج کی نیلی شاموں میں کشتی کھیتے۔ اور جب میں چپو سنبھالتا تو وہ پتوار پکڑ کر کوئی انگریزی رومان پڑھتا رہتا اور کسی وقت ہوبہو سٹیونسن کا کوئی کردار دکھائی دیتا۔ یہاں تک کہ بی۔ اے کا امتحان آپہنچا۔ اپریل ختم ہوا اور امتحان بھی۔ میں اپنے گاؤں ایر جہلم کے کنارے پبی کے دامن ڈھاک کے جنگلوں میں لوٹ گیا اور وہ بہاولپور لوٹ گیا۔

کوئی ڈیڑھ ماہ بعد میں اپنے دوست مانی سے ملنے آیا تو خالد بھی ملا۔ وہ تنہا بوریت کا شکار تھا۔ واپسی پر میرے ساتھ ہو لیا۔ تین چار روز تو تنہائی میں گزرے۔ پھر ہم پیدل ہوتے دریائے جہلم کے کنارے کھوہار پہنچے جہاں زمانہ قبل مسیح میں سکندر یونانی اور پورس کی لڑائی ہوئی تھی۔ ہم دریا پر گھوم رہے تھے کہ ملک ربانی، ہمارے میزبان نے شمالی سمت ایک بلند چوٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "وہ رہا ٹلہ جوگیاں۔ گورکھ ناتھ کا ٹلہ جہاں رانجھا نے بالا ناتھ سے کان چھدوا کر جوگ دھارن کیا تھا۔ اگلے روز ہم سرائے عالم گیر و دینہ ہوتے شیر شاہ سوری کے قلعہ رہتاس میں پہنچے۔ شب تو رہتاس میں بسر کی۔ سورج طلوع ہوتے ہی ہم دشوار پہاڑی راستوں پہ ہو لئے اور جون کی کڑکتی دوپہر محکمہ جنگلات کے ڈاک بنگلہ موگلی پہنچے۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے اور جو مزہ چوکیدار کی تنوری روٹیوں اور پیاز نے دیا زندگی بھر ایسا کھانا نصیب نہیں ہوا۔ چھ میل کی بلندی پر ٹلہ تھا۔ ہم نے اوپر رینگنا شروع کیا اور شام کے جھٹ پٹے میں ہم نے سادھوؤں کے اس آشرم کو جا لیا۔ بڑا پروہت چوکی پہ براجمان تھا اور کئی بٹے کٹے سادھو، چھوکرے بالے اس کی سیوا میں کھڑے تھے۔ ہم نے پرنام کیا اور آشیر واد لی۔ سوامی پربھوانند کا بھی امریکہ میں ایسا ہی آشرم ہو گا جہاں کرسٹوفر ایشروڈ ٹھہرا تھا۔ خالد کی یہ پہلی یاترا تھی۔

اخیر جون میں بی۔ اے کا نتیجہ نکلا اور ۷ ستمبر میں ہم نے لا کالج لاہور کے مانٹ مورنسی ہال میں رہنا شروع کیا۔ ان دنوں شفیق کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں تھا۔ خالد اور وہ اکثر انگریزی فلمیں دیکھتے۔ الجیریہ میں چارلس بائر کی منفنا طیسی آنکھوں نے انہی دنوں مسحور کر رکھا۔ ندیم صاحب بھی محکمۂ آبکاری کو خیرباد کہہ کر دار الاشاعت سے رابطہ قائم کر چکے تھے۔

مسجد میں امام آکے ہوا آج وہاں سے — کل تک تو یہی شخص خرابات نشیں تھا (میر تقی میر)

کرشن چندر کا "طلسمِ خیال" آچکا تھا اور اس کا افسانہ "آنگی" ہم کئی بار پڑھ چکے تھے۔ اردو افسانہ کا چیخوف بیدی کا بھی کہیں قریب ہی پوسٹل کلرکی کرتا تھا۔ گراہم گرین، ڈکنز، ہارڈی اور پریسٹلے تو خالد پڑھتا ہی تھا لیکن انارکلی کے نکڑ والے اسٹال سے "شیرازہ" لینا نہ بھولتا۔ چراغ حسن حسرت کے ہلکے پھلکے شذرات اس کی توجہ کا خاص مرکز تھے۔ اسی سال کرسمس میں بھٹناگر نے ایک سیاحتی ٹرین کا اہتمام کیا جو لاہور سے دہلی، آگرہ، الٰہ آباد اور کلکتہ ہو کر لوٹتی۔ دس بارہ روز کا ٹرپ تھا۔ خالد نے بکنگ کرالی۔ احمد خان عباسی بھی ہم سفر تھے۔ الٰہ آباد سے احتی بس میں بیٹھے تھے کہ خالد نے میونسپل نل پر ایک توندیلے مہاجن کو نہاتے دیکھا۔ اس کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور عباسی کو کہا "وہ دیکھو پنت یو پی کا وزیر اعلیٰ"۔ احمد خان بس سے اتر کر اس کی طرف لپکا ہی تھا کہ ڈرائیور نے ہارن دیا اور وہ مایوس لوٹ آیا۔ ہاں البتہ وہ کانگریسی لیڈروں کی سادگی کی ایک جھلک دیکھ پایا تھا۔ آنند بھون میں وہ جواہر لعل سے ملے۔ پنڈت جی نے اسی روایتی مسکراہٹ کے بجائے سنجیدہ چہرے سے ان کا سواگت کیا۔ سر نہوڑائے کھڑے کھڑے چند باتوں میں انہیں ٹرخا دیا۔

لا کے سال اول میں ہم چاروں شانے چت۔ خالد کا باپ اسے انجینئر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی مراد بر آئی اور اسے میکلیگن انجینئرنگ کالج میں دھکیل دیا اور میں غمِ روزگار میں الجھ کر رہ گیا۔ وہاں ڈاکٹر بشرو بریگیڈیر شامی شہید اس کے دوست بنے اور رانا اللہ داد روم میٹ۔ اس سے پہلے موسمِ برشگال میں وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ وادی کشمیر کی سیاحت کر چکا تھا۔ پہلگام، گلمرگ سے واپسی پر ڈال لیک کے ایک ہاؤس بوٹ میں قیام تھا کہ ایک شام سیر کے لئے نکلا۔ قریب ہی پہاڑی پہ ایک خانقاہ دکھائی دی۔ ابھی تلہٹی ہی میں تھا کہ آوارہ کتے نے پیچھے سے ٹانگ آن دبوچی۔ دنوں مشن ہسپتال سری نگر میں پیٹ میں ٹیکے لگتے رہے۔ اگلے سال کہیں اخبار میں پڑھا کہ کوئی سوامی جی امرناتھ تیرتھ کی یاترا پر جا رہے ہیں۔ خالد پیدائشی مہم جو ہے۔ ان سے خط و کتابت کی لیکن برف باری کے باعث وہ روانہ نہ ہو پائے۔ البتہ کرسمس کی تعطیلات میں بمبئی جا نکلا۔ باندرہ، چوپاٹی اور مالابار ہل پر گھوما پھرا۔ مالابار پہ "ماؤنٹ پلیزنٹ" محمد علی جناح کی اقامت گاہ تھی۔ اسی پہاڑی پہ ممتاز صنعت کار باولا کو مہاراجہ ہلکر نے جوشِ رقابت میں قتل کرایا تھا اور اسے گدی سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

مئی ۱۹۴۲ء میں ہم اورنگ آباد گئے۔ بابائے اردو تو نقلِ مکانی فرما چکے تھے۔ فلک پیما میں نواب علی اصغر بلگرامی صوبیدار اورنگ آباد سے ملے۔ پانچ میل شمال دولت آباد کا قلعہ دیکھا اور اتنی ہی مسافت پہ خلد آباد غازی عالمگیر کے مزارِ غریب پر حاضری دی۔ ساتھ ہی سڑک کے پار غرب میں شیخ برہان الدینؒ ان کے مرشد کا مرقدِ پُرانوار تھا۔ کوئی چھ میل آگے ایلورہ کے غار تھے۔ برہمن، جین اور بدھ ادوار کی تاریخ پتھر کے مجسموں میں ہمارے سامنے تھی۔ ہم محوِ حیرت تھے

کہ وہ سنگ تراش کتنے قوی ہیکل ہوں گے جنھوں نے سنگلاخ چٹانوں کو توڑ کر دیو پیکر مجسمے بنائے اور فنِ سنگتراشی پر اپنے اَن مِٹ نقوش چھوڑے!

اخیر دسمبر ۱۹۴۲ء میں مجھے ڈیرہ دون جانا تھا۔ انجنیرنگ کالج بند تھا اور خالد بھی ساتھ ہو لیا۔ وہ تو پچھلی رات ہری دوار اُتر گیا اور میں ڈیرہ دون ایکسپریس سے آگے نکل گیا۔ ہری دوار مندروں اور بندروں کا شہر ہے جہاں پوتر گنگا بہتی ہے۔ اور ہر کی پوڑی کے نیچے جہاں کبھی ہر اُترے تھے یاتری اشنان کر کے اپنے پاپ دھوتے ہیں اور اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کے پھول گنگا مائی کی نذر کرتے ہیں۔ وہ گھوما پھرا۔ قرب و جوار جوالا پور اور بہادر پور کی سیر کی۔ ایک سرائے میں ہندوانہ نام سے کئی دن پڑا رہا۔ اس کے محبوب مصنّف ہمیشہ کی طرح اس کے ہمراہی تھے۔ اسی سرائے کے کمرے میں اس نے لافانی کہانی "کھویا ہوا افق" لکھی جسے منٹو نے ازحد سراہا اور "سویرا" میں چھپی۔ مئی ۱۹۴۵ء میں بی۔ ایس۔ سی (انجنیرنگ) سے فراغت نصیب ہوئی تو صحرائے تھر کا سفر کیا۔ اور اس کا پہلا سفرنامہ ادبِ لطیف کی زینت بنا۔

سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

آخر وہ ساعتِ سعید بھی آگئی۔ فروری ۱۹۴۷ء میں وہ پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کے لئے انگلینڈ روانہ ہوا۔ سٹیونسن کے بحری قزاق کا دخانی جہاز سے یہ پہلا سفر تھا۔ ڈیڑھ سال سے کچھ زائد وہ انگلستان میں رہا۔ انگلش الیکٹریکل کمپنی اسٹیفورڈ میں وہ اپرنٹس تھا۔ شیکسپیر کے مولد کی زیارت کی اور ورڈس ورتھ کے لیک ڈسٹرکٹ کا تو اس نے پیدل سفر کیا۔ اس کی تکمیل کے بعد فرانس اور سوئیزرلینڈ کی سیر کی۔ برن میں عالمی اسپرنٹو کانفرنس میں شرکت کی۔ انہی دنوں بٹوارہ ہوا اور جب دیس لوٹا تو ایک نوزائیدہ آزاد مملکت منصۂ شہود پر آچکی تھی۔ لیکن آہ! کشت و خون۔ خالد کو آج بھی اس کا گہرا ملال ہے۔ اور اس کا استاد پروفیسر کرم چند تو بیوی بچّوں سمیت بہاول نگر جنّا پہ جل مرا تھا۔

وہ شاید ملازمت نہ کرتا لیکن باسط میانوالی میں سب ڈویژنل آفیسر انہار تھا۔ سب سے چھوٹا بھائی جیلانگ آسٹریلیا سے ٹیکسٹائل انجنیرنگ میں ڈگری لینے والا تھا۔ خاندانی ریت کے مطابق اس نے انگلش الیکٹریکل کمپنی کی کراچی برانچ میں بطور الیکٹریکل انجنیر ملازمت اختیار کی اور میری ویدر ٹاور کے قریب ایک فلیٹ میں رہنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور سن گرین میں میجر ہینتھ کی جنرل منیجری میں سیلز منیجری قبول کی۔ یہ زمانہ اس کی ذہنی زرخیزی کا تھا۔ جارج آرول کی ۱۹۸۴ء کے اسلوب میں اردو ادب کو ایک ناقابلِ فراموش فینٹسی "۲۰۱۱" دی۔ شہرہ آفاق طنز نگار کنہیا لعل کپور نے کہا "کاش میں اس کتاب کا مصنف ہوتا" ۱۹۸۶ء میں نئی دہلی سے انگریزی کتاب "پاکستان لٹریچر اینڈ سوسائٹی" میں فہمیدہ ریاض نے اس فینٹسی کا خوب چرچا کیا ہے۔ پھر چاکیواڑہ میں وہ ان پیارے کرداروں سے ملے جو ہمارے

معاشرے کی روح رواں ہیں۔ اور "چاکی واڑہ میں وصال" کے بارے میں فیض نے کہا کہ اردو میں ایک ہی ناول ہے جسے ڈکنز کے انگریزی ناولوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسی ہی رائے قدرت اللہ شہاب کی بھی تھی۔ خالد کا لافانی کردار "چچا عبدالباقی" بھی یہیں کی تخلیق ہے۔ پی۔ جی۔ اوڈ ہاؤس کے "انکل جیوز" سے کہیں زیادہ توانا اور پیارا چچا عبدالباقی!

تین سال بعد وہ کراچی چھوڑ کر بہاولپور آیا اور آخر کار جنوری ۱۹۵۵ء میں سرکاری ملازم بن کر احمد پور شرقیہ سب ڈویژنل آفیسر ہوا۔ اور پاور ہاؤس کھڑا کیا۔ اسٹالن کے جانشین میلنکوف کو پریذیڈیم سے ہٹا کر کسی دور افتادہ مقام پہ بجلی گھر تعمیر کرنے پہ لگا یا گیا تھا اور خرو چیف بھی بعد فراغت ایسے ہی کام پہ مامور ہوا۔ راؤ ریاض قریب ہی کوٹلہ موسیٰ خان ایس۔ ڈی۔ او محکمۂ انہار تھا۔ اور احمد حسن چغتائی سول انجینئرنگ کی ڈگری لے کر ابھی ملازمت کے بکھیڑوں میں نہ پڑا تھا۔ تینوں دوست اکٹھے ہوتے اور خوش گپیوں میں وقت گزارتے۔ پھر ظہور نظر بھی کراچی سے بہاولپور آ گیا۔ چاروں اکثر بہاولپور میں ملتے۔ اور ان کی ایک بوہیمین کلب تھی جس سے کوئی دانا بینا بچ کر نہ جا سکتا تھا۔ ملک سعید اللہ ایس۔ پی کی تو خوب بھد اُڑاتے لیکن وہ پیارا آدمی ان پہ جان نثار کرتا تھا۔ علی امام بھی پبلک اسکول بہاولپور میں آرٹ ٹیچر تھے۔ ان کی شامیں ایک ساتھ گزرتیں۔ کتنا سہانا سماں تھا۔ انہی دنوں ریاض اور خالد سوات گئے اور اگلے گرما میں خالد نے کاغان کی سیر کی اور جھیل سیف الملوک کے دل فریب مناظر سے لطف اندوز ہوا۔ اس کے سفرنامے۔ سواتی مہم اور کاغانی مہم فنون میں چھپے اور اب "دو سفر" کتابی شکل میں موجود ہے۔

پھر خالد کا تبادلہ چشتیاں ہوا۔ وہاں بھی اس نے بجلی گھر بنایا۔ کاظم عربی کا اسکالر اور صاحب طرز نثار بہاول نگر سب ڈویژنل آفیسر تھا۔ یوں دونوں ہم پیشہ ادیب ایک دوسرے کے قریب آئے۔ یگانگت بڑھی اور دائمی رفاقت میں بدل گئی۔ اس کے سب مطبوعہ شاہکار کاظم کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ادبِ لطیف، سویرا، نقوش، نیا دور، افکار، لیل و نہار، شعور، تخلیق، داستان گو اور فنون میں اس کے افسانے، طنز و مزاح، پیروڈی، ریویو اور سفرنامے چھپتے رہے۔ لکھنے اور پڑھنے کا یہ لامتناہی سلسلہ جاری رہا۔ اس کا معلوماتی قاعدہ اور مکاتیبِ خضر تو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ افکار میں اس کی صحرائے تھر کی یاترا کئی اقساط پر مشتمل ہے۔ خالد خان پور میں تھا کہ ۱۹۵۹ء میں ایکس سی۔ این ہو کر لاہور گیا۔ ایوبی دور میں جب رائٹرز گلڈ معرض وجود میں آیا تو اس سے منسلک ہونے سے احتراز برتا۔ البتہ سونار بنگلہ دیکھنے کی دعوت سے مستفید ہوا۔ سلہٹ، سندربن، ڈھاکہ کی سیر کی۔ اب اکیڈمی آف لیٹرز سے بھی ویسی ہی بے نیازی ہے۔ بار بار دعوت نامے آئے لیکن فقط ایک بار گیا اور وہ بھی اس لئے کہ چلو شفیق الرحمٰن سے ملاقات ہو جائے گی۔

کچھ اور ہو گیا ہے ، وہ شاعر نہیں رہا   وابستہ ہو گیا جو کسی تاجدار سے

کھلی ہواؤں کا یہ شیدائی گھر گرہستی کے چکّر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا ۔ لیکن سنجوگ کو کون ٹال سکتا ہے ۔ ۱۹۵۶ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے معزز گھرانے میں شادی ہوئی ۔ بیگم پڑھی لکھی ایک سلیقہ شعار خاتون ہیں ۔ بڑا بیٹا منصور کبھی ایچیسن کالج لاہور میں تھا ۔ پھر مڑی ۔ جے کالج کراچی سے گریجویشن کی ۔ ڈیڑھ سال پیشتر بالی ڈے اِن میں عقد ہوا ۔ اور اب اللہ نے اُسے چاند سا بیٹا دیا ہے ۔ منصور اپنی آبائی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔ بیٹی سارہ نے انٹر کیا ہے ۔ اور چھوٹا ہارون خالد بلا کا ذہین ہے ۔ ڈی ۔ جے سائنس کالج سے پری انجنیرنگ گروپ میں انٹر کر رہا ہے ۔ میٹرک میں فیڈرل بورڈ سے دونوں نے وظیفے لئے تھے خالد نے جہاں اپنے پڑھنے والوں کو بہت کچھ دیا ہے وہاں اپنے بچوں کے لئے کیرول کی "ایلس ان ونڈر لینڈ" کا اردو ترجمہ کیا ہے ۔ کشور ناہید نے طبع کرایا ۔

"کھویا ہوا افق" اس کی کہانیوں اور مضامین کے مجموعہ کو ۱۹۶۸ء میں آدم جی ایوارڈ ملا ۔ ملازمت زیادہ لاہور میں گزری ۔ کچھ عرصہ نیرون (حیدر آباد) اور تین سال ملتان میں رہا ۔ شہزادہ شہید محمد کے اس علم و ادب کے گہوارہ میں اسے چودھری اکرام اللہ سا پیارا اور حسین دوست ملا ۔ مسعود اشعر سے بھی یہیں دوستانہ ہوا ۔ اور اس کا ہم پیشہ اقبال خان ٹونک ضلع ڈیرہ غازی خان کا وہ مردِ دہقاں یہیں اس کے دامِ الفت میں گرفتار ہوا ۔ ۱۹۷۲ء میں وہ سپرنٹنڈنگ انجنیر ہو کر پھر سے لاہور گیا ۔ کاظم کو جرمنی سے لوٹے کئی سال ہو گئے تھے ۔ دفترِ فنون ، انار کلی میں ہر جمعہ کو نشست جمتی ۔ علّامہ علی عبّاس جلال پوری ، مسعود حمیدی صاحب ، الف المیراث ، قتیل شفائی اور ندیم صاحب کے جاں نثار نوجوان ادیب ، شاعر اور صحافی عطاء الحق قاسمی امجد اسلام امجد ، خالد احمد بھی موجود ہوتے ۔ چائے کے دَور چلتے ۔ ادبی چٹکلے ہوتے ، بوڑھے الف المیراث اور جواں سال خالد احمد میں دلچسپ نوک جھونک ہوتی ۔ خالد اور کاظم بھی باقاعدگی سے جاتے اور لاہور آتے جاتے مجھے بھی اس ادبی محفل میں جھانکنے کا موقع ملتا ۔ ساتھ ہی انار کلی کے ایک خستہ حال چوبارہ میں ایک شاعرِ مزدور بھی رہتا تھا ۔

۱۹۸۰ء میں خالد ڈائرکٹر وایڈا تھا کہ ملازمت کا یہ طویل اور کٹھن سفر ختم ہوا اور وہ پنشن پاکر بہاولپور آیا ۔ پھر سے مولوی اختر علی ہاؤس آباد ہوا ۔ اور بھولے بھٹکے لوگ اس سے آملے ۔ وہی ہماہمی اور گہما گہمی ۔ مولوی صاحب کے زمانہ کی ہلکی سی جھلک چغتائی اپنی مارک ٹو اور ریاض شیراڈ میں آتا ۔ ظہور نظر بھی جب ریڈیو ڈرامہ کی اسکرپٹ نویسی سے فرصت ملتی قریب ہی اپنے مکان سے پیدل آملتا ۔ عمر کے ساتھ انسان زندگی کے سفر سے تھک جاتا ہے اور بیتے ہوئے دنوں کی یادیں ہی اس کا سرمایۂ حیات ہوتی ہیں ۔ ابھی یہ دوست ان حسین یادوں کو دُہرا بھی نہ پائے تھے کہ ظہور نے ہتھیار پھینک دیئے ۔ اہالیانِ بہاولپور نے شاعرِ بہاولپور کی یاد منائی ۔ ندیم صاحب اور منّو بھائی لاہور سے آئے ۔ خالد ، ریاض اور چغتائی نے بھی اپنے بچھڑے ہوئے

یار کی یاد میں آنسو بہائے۔

نیشنل سینٹر بہاولپور والے مُصر تھے کہ خالد کے ساتھ شام منائی جائے۔ ہر چند کہ وہ پبلسٹی سے بدکتا ہے لیکن کچھ ان کی مجبوری تھی کہ ملک کا ایک بڑا طنز و مزاح نگار اور عظیم انسان بہاولپور میں رہتا ہے۔ اور پھر انہیں اپنی کارکردگی بھی دکھانی تھی۔ خالد نے آخر حامی بھرلی۔ بانو قدسیہ، غوث علی شاہ ثانی، اشفاق اور منیر شیخ کشاں کشاں بہاولپور آئے۔ سینٹر میں تقریب ہوئی جلوانہ ہاؤس میں ڈنر اور اگلی شام دس میل دور خانقاہ شریف مخدوم محکم الدین سیلانیؒ کی سجادہ نشین عائشہ بی بی کے وسیع و عریض باغ کی پہنائیوں میں بیگم جمیلہ ہاشمی نے چائے پارٹی دی۔ کاش کسی کے ساتھ صبح منانے کی بھی ریت چل نکلے۔ شامِ زندگی میں تو لوگ دن بھر کے تھکے ہارے ہوتے ہیں۔ اب تو جمیلہ ہاشمی بھی نہیں رہیں۔ سیاست سے اُسے کوئی سروکار نہیں سٹیونسن نے کہا تھا "دنیا میں سیاست ہی ایک ایسا پیشہ ہے جس کے لئے تیاری کی ضرورت نہیں"۔ اور پھر وطنِ عزیز کی سیاست۔ فارغ البالی ہو اور چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کا گُر معلوم ہو عوام دوستی خود کر آتی ہے۔ اخبار بینی کا اس کا شوق نصر اللہ خان اور منو بھائی کے کالموں تک محدود ہے۔ ٹی۔ وی پر خبر بھی ہو تو آواز مدھم کر دے گا۔ ہاں البتہ عابدہ پروین کی جھلک دکھائی دے تو وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کتابیں دائیں بائیں اس کے بستر پہ بکھری رہتی ہیں اور وہ کہتا ہے: کچھ لکھنے کی سکت نہیں۔ ذہن ماؤف ہے۔ اخیر اپریل ۸۶ء میں جب درّہ کے کھلنے میں ہفتہ باقی تھا وہ خنجراب کی بلندیوں کو چھو آیا۔ جب مشاہدۂ فطرت کا یہ عالم ہو تو اس کی میز پر کوئی خالی ڈائری اور بال پوائنٹ رکھ دو وہ خود بخود ہی لکھتا چلا جائے گا اور ایسا لکھاری کبھی اپنے آپ کو ہراتا نہیں۔

خالد کی چھ مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ساتویں بھی عنقریب "سنگ میل" لاہور سے آرہی ہے۔ "کھویا ہوا افق" اور "چاکی واڑہ میں وصال" کے جدید دیدہ زیب ایڈیشن انھوں نے نکالے ہیں۔ "دو سفر" اور "چچا عبدالباقی کی کہانیاں" بھی خوبصورت کتابیں ہیں۔ "حضر کی یاترا" نہ جانے کب کتابی شکل اختیار کرے گی۔ اور "۲۰۱۱" تو قریب قریب ناپید ہے۔ لیکن ان لاتعداد ادبی شاہ پاروں کا کیا بنے گا جو اس نے اردو ادب کو دیئے اور جو اس کے پینتالیس سالہ ادبی دور میں کئی مجلّوں کی دبیز تہوں میں دبے پڑے ہیں۔ اس کے مرید دلبند کا ایم۔ اے انگریزی کا آخری سال ہے۔ اور کاظم بھی اپنی ملازمت کی معراج کو پا چکا ہے۔ وہ اس کی لائبریری میں جا بیٹھے اور کاظم کی رہنمائی میں ان گم گشتہ ادبی جواہر پاروں کی کھوج لگائے۔ مگر وقت کی رفتار تیز ہے اور ہم اس حیاتِ مستعار میں کچھ بھی تو نہیں کر پاتے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

محمد خالد اختر

ڈیپلو سے نوں کوٹ تک

ایک سفر نامہ

"ڈیپلو سے نوں کوٹ تک" صوبہ سندھ کے ضلع تھرپارکر (تھر) میں ایک گاؤں ڈیپلو اور ایک ریلوے اسٹیشن نوں کوٹ کے درمیان ایک سفر کی روداد ہے۔ یہ سفر ستمبر ۱۹۴۵ء میں کیا گیا تھا۔ لکھنے والے جذباتی ہم آہنگی کے مدنظر صیغہ واحد استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔"

جب میں ڈاکٹر کو الوداع کہنے کے بعد لوٹا تو دونوں ساربان اونٹوں کی مہاریں تھامے دروازے کے باہر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ سورج ابھی ریت کے ٹیلوں سے نیزہ بھر اونچا تھا مگر "ویرجی" کا مشورہ تھا کہ مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہیئے۔ سو ایک ساربان کو اونٹ پر "پاکھڑا" ڈالنے کے لیے کہا گیا۔ ویرجی نے (جو ایک پیدائشی شترسوار ہیں) میری کتابیں ایک چادر میں دو برابر گٹھڑیوں میں اس طرح باندھ رکھی تھیں کہ متوازن صورت میں اونٹ پر بآسانی دھری جاسکیں۔ انہوں نے شام کا کھانا جو روٹیوں اور گھی میں تلے ہوئے انڈوں پر مشتمل تھا، پہلے سے اخباروں میں لپیٹ رکھا تھا اور اس پر بندھے ہوئے رنگین فیتے نے تو اسے اچھا خاصا نفیس بنڈل بنا دیا تھا۔ اس بنڈل کو نہایت محنت اور چابکدستی اور انگوٹھوں کے دباؤ سے حجامت کے تھیلے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی اور جب یہ کوشش ناکام ہوتی نظر آئی تو اسے نہایت بھونڈے طریق پر ٹھونس دیا گیا (انسان کے دماغ میں نفاست اور خباثت پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اس لیے نفیس بنڈل کو حجامت کے تھیلے میں ڈالنے کے بجائے ٹھونسنے پر مجھے مطعون نہیں کیا جاسکتا) یہ حجامت کا تھیلا سچ مچ عمر عیار کی زنبیل ہے۔ اس میں اتنی چیزیں سما سکتی ہیں کہ آپ ان کا تصور تک نہیں کر سکیں گے اور جب یہ بالکل بھر جائے اور ہمارے کُرّے کی سی صورت اختیار کر لے تب بھی اس میں کئی ایک چیزوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس تھیلے کو ہم نے پاکھڑے کی گھنڈی سے لٹکا دیا۔ ساربان اندر سے میرا ہولڈال اٹھا لایا۔ ویرجی اور ساربان نے مل کر اسے پاکھڑے پر کچھ اس طرح بچھا دیا کہ میرے اور ساربان کے لیے دو نہایت ملائم اور آرام دہ نشستیں بن گئیں۔ یہ اطمینان

کر کے کہ کوئی چیز تو رہ نہیں گئی، میں ویرجی کو آخری ہدایات دے کر اپنی نشست پر آبیٹھا۔ ویرجی کے لیے میرا رواں رواں شکر گزار تھا۔ اچھا آدمی۔ وہ میرے لیے انتہائی مددگار ثابت ہوا تھا جتنا مسٹر و سز کے لیے مسٹر جیوز۔ میرے قیام کے دوران میں سوائے اللہ دین کے چراغ کے وہ میرے لیے سب کچھ مہیا کرتا رہا تھا۔ اور فی الواقع ڈیپلو میں وہ میرے لیے لازمی اور ناگزیر اور جانے کیا کیا ہو گیا تھا۔

ساربان اپنی نشست پر آیا تو اونٹ حسب معمول چند بے تکے زاویے بنا کر اٹھا۔ میں اب بہت بلند ہو چکا تھا، دیہاتی مکانوں کی منڈیروں کے برابر۔ میں نے فلیٹ چھوڑ کر ویرجی کو اور ایک مبہم طریق پر ڈیپلو کو الوداع کہا اور تھوڑی ہی دیر میں ڈیپلو اور اس کے اچھے لوگ ہمارے عقب میں تھے اور ہمارے سامنے حواس باختہ سورج کی زردی اور لالی کا عجیب سا امتزاج ---- جیسے آگ بھڑک رہی ہے --- جیسے آگ بجھ رہی ہے۔!

وہی مینگنیوں اور گوبر سے پٹی ہوئی ریتلی چراگاہ، میلوں پر جگالی کرتی ہوئی بکریاں کنوئیں میں سے پانی کھینچتی ہوئی تین عورتیں جو دور سے چڑیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ ہیڈ منشی (ہمارے ہاں اسے نائب تحصیل دار کہتے ہیں) ننگے سر اور ننگے پاؤں، ہاتھ میں رسی لیے اپنی گائے کے پیچھے دوڑتا ہوا اور اپنی "ہیڈ منشی شپ" کے آداب اور مصلحتوں کی پروانہ کرتا ہوا، دور اسکول کے لڑکے فٹ بال کھیلتے ہوئے (فٹ بال کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر ہوا فولادی پمپ کے بجائے انسانی پھیپھڑوں کی مرہون منت ہے) مسٹر ویروانی ہیڈ ماسٹر، وہی ٹھنگنا گھبرایا ہوا بد حواس آدمی --- اپنے الگ تھلگ مکان کے سامنے والی گلی میں کھڑا مجھے ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتا ہوا، یا شاید مجھے یاد دلاتا ہوا کہ میں پلٹتے ہوئے اس کے لیے نارنگیاں لانا نہ بھول جاؤں ---- یہ تھے ڈیپلو کے آخری نقوش۔

اس کے بعد میں تھا اور میرا ساربان ----اور وہ جنگل کی بوٹیوں اور خودرو جھاڑیوں میں سے لہراتا ہوا ریتلا راستہ جو سامنے ریت کی ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ گیا تھا ---- ڈاکٹر اور میں اس پہاڑی کی چوٹی تک کئی مرتبہ آئے تھے۔ اسی پہاڑی پر سے میں نے پہلی بار ڈیپلو کو نیچے نشیب میں ایک کھوئے ہوئے رومان کے شہر کی صورت میں دیکھا تھا۔ اب بھی ڈیپلو سنہری شام کے شامیانے تلے بالکل مطمئن اور بے پرواہ انداز میں پڑا تھا۔ ڈیپلو کو میری جدائی کا چنداں احساس نہ تھا۔ پھر اونٹ ٹیلے کی دوسری طرف اتر گیا اور ڈیپلو میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

منظر انتہائی دلکش تھا اور ایک انوکھے صحرائی حسن کا حامل۔ جنگل کی خودرو جھاڑیوں سے ڈھنپی ہوئی ریتلی وادیاں اور پہاڑیاں جو بالکل اصلی وادیوں اور پہاڑیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں عجیب سے ٹیڑھے میڑھے اکیلے اکیلے درخت بھی تھے --- کاش میں آپ کو سب بوٹیوں اور درختوں کے نام بتا سکتا مگر میں علم الطبعیات کا ماہر نہیں ہوں۔

کبھی کبھی ہمیں موروں کی جھنکار سنائی دے جاتی ۔ ایک مرتبہ تو سار بان نے اشارے سے مجھے مور دکھائے بھی جو قدرت کے اس جنگلی باغ میں غرور سے اپنے رنگین پروں کی بھڑک دکھا رہے تھے ، اور مورنیاں ان کے سامنے کھڑی تھیں ۔ مسحور اور اداس اور شاید منتظر بھی ۔ (کیونکہ ناچتے ہوئے مور کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکتا ہے جسے مورنی "چگ" لیتی ہے اور یہی آنسو مورنی کے پیٹ میں انڈے کی تعمیر کی بنیاد ثابت ہوتا ہے ۔ آنسو اور نسل کشی! عجیب سی بات ہے مگر کھلنڈری قدرت جو انسانی ڈھانچے کی خاکستر سے پھول اگا سکتی ہے اگر آنسو میں سے انڈا پیدا کرلے تو حیرت بیکار ہے) پھر فاختہ کی آواز آئی ، جو اس گلابی جھٹپٹے میں نیم خوابیدہ پہاڑیوں اور درختوں اور جھاڑیوں کو اپنا ایک ہی ابدی پیغام سنائے جارہی تھی ۔۔۔ کو کو کو ۔ مترنم آوازوں کی لہریں تھیں جو فضا میں آن کی آن میں لپک جاتی تھیں ۔ گھنگھناتی ہوئی صداؤں کے چھینٹے تھے جو اندھیرے اجالے کی حدوں کو بھگوئے دے رہے تھے ۔ کو کو کو ۔ پنجاب میں جہاں ہم فاختہ کو گھگھی کہتے ہیں ، ایک عجیب سی لیکن بڑی خوبصورت کہانی مشہور ہے ۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ گھگھی کہتی ہے "یوسف کھوہ ۔ یوسف کھوہ ۔ " جب حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تو یہی گھگھی تھی جو ان کے بوڑھے والد حضرت یعقوب کے پاس یہ پیغام لے کر آئی تھی ۔۔۔ " یوسف کھوہ ، یوسف کھوہ " ۔۔۔ یوسف کنوئیں میں ہے ، یوسف کنوئیں میں ہے ! ۔۔۔ خدا جنت نصیب کرے ہمارے صدیوں کے پرانے افسانہ نگار کو جس کی متخیلہ نے گھگھی کو کاشف الاسرار بنادیا!

اونٹ کی چال ریاضی کے "سائن کرو، SIGN CURVE کے نچلے حصے سے کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی ہے ، پہلے آپ نیچے جاتے ہیں اور پھر اچانک نہیں بلکہ ایک متوازن گھماؤ کے ساتھ اوپر اٹھ جاتے ہیں اور اوپر اٹھتے ہی پھر نیچے چلے آتے ہیں ۔۔۔ جیسے سمندر کی لہروں پر ۔۔۔۔ لیکن میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اتنا خوش نہیں تھا ۔ ایک تو نشست تنگ تھی دوسرے وہ کتابوں کی گٹھڑیاں جنہیں ویرجی نے میرے آگے پاکھڑے پر رکھا تھا بار بار میرے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں ۔ شروع میں تو یہ کتابیں میرے گھٹنوں کو سہلاتی رہیں ، پھر چٹکیاں لینے لگیں ۔ اور اب لوہے کی سلاخ کیطرح انہیں چھیدے جارہی تھیں ۔

ڈیپلو سے نوں کوٹ تک کا راستہ انہی ریتلی پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ ہے ۔ چڑھاوا اور اتار ۔ اتار اور چڑھاؤ ، بالکل اونٹ کی چال کی طرح ۔۔۔ بالکل سمندر کی لہروں کی طرح ۔ عین میں سلسلہ ۔ خیالات کی طرح ۔۔ ان پہاڑوں کے درمیان ترائیوں میں کہیں کہیں باجرے کے کھیت عرف "بنیاں "ہیں جن میں "چھائیاں " بافراط ہوتی ہیں ۔ تھر میں ہندوانہ یا تربوز کو چھائی کہتے ہیں ۔ چھائی تھری بہشت کا اکلوتا پھل ہے اس لیے اسے نہایت شوق اور قدر سے تعظیم اور احترام سے کھایا جاتا ہے ، چھائیوں اور ایک دو اور سبزیوں کی پیدائش کا یہی موسم ہے ۔۔۔ چھائیوں کے

موسم سے چند مہینے پہلے لوگ ایک دوسرے سے ان حسین اور خوش آئند گھڑیوں کی باتیں کرتے ہیں، جب پھکی چھائیوں کی کثرت ہوگی۔ یہ احترام اور انتظار ایسے ملک میں فطری ہے جہاں سارے سال اور کوئی پھل یا سبزی نہ اگتی ہو۔

اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ڈیپلو سے نوں کوٹ تک اونٹ پر سوار ہوکر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سورج غروب ہوتے ہی اس سفر میں ابدیت رچنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کہیں ختم نہیں ہوگا۔ ریت کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں اور مسافر یوں محسوس کرتا ہے جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کوئی مفر نہیں۔ یہ سفر ایک پرانے مریض کی زندگانی سے بھی زیادہ طولانی ہے۔

رفتہ رفتہ مغربی افق بچے کھچے گلاب کی تلچھٹ پی گیا اور درختوں اور جھاڑیوں پر رات کی سیاہی یعنی ابدیت کی کہر چھانے لگی۔ فاختہ چپ ہوگئی۔ اس کے نغموں کی جگہ جھینگروں اور "حشرات شبی" کی مسلسل، تیز اور زیر و بم سے بے نیاز پکاروں نے لے لی۔ البتہ کبھی کبھی کسی شب زندہ بیدار پرندے کی اداس "تو ہو" سنائی دے جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ ایک چاندنی رات تھی، تیرھویں کا بڑا اور برف جیسا سفید چاند صاف آسمان پر پوری شان سے چمک رہا تھا۔ ہر جھاڑی اور بوٹی دمکنے اور ٹمٹمانے لگی تھی اور گرد کی پہاڑیاں چاندنی میں سحرزدہ کھڑی تھیں، ہمارا راستہ جھاڑیوں میں سے سفید جھلکی مارتا ہوا رینگ رہا تھا۔ جنگل کی رات کی مخصوص آوازوں کے علاوہ ہمیں کبھی کبھی نیچے کسی کوٹ میں مویشیوں کی گھنٹیوں کی سنسناہٹ سنائی دے جاتی جو ہمیں بتاتی کہ ہم انسانی آبادی سے دور نہیں۔ بعض اوقات تو ہم لوگوں کے ہنسنے بولنے اور بھاگنے کی آوازیں بھی سن لیتے تھے۔

یہ طلسم جو چاندنی جنگل اور درختوں پر پھونکتی ہے، صرف ایک بہت بڑے ساحر کا کام ہے، درخت عجیب خیالی صورتوں میں بدل جاتے ہیں، بعض دفعہ وہ عظیم آسمان کو چھوتے ہوئے دیو بن جاتے ہیں اور کئی مرتبہ دبک کر ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں، میں نے ایک درخت دیکھا جو اس وقت ایک بہت بڑا بادبانی جہاز بنا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے تمام بادبان پھیلائے کسی جزیرے میں مدفون خزانے کی دھن میں روانہ ہونے کو تیار کھڑا ہو۔۔۔ ایک درخت جو ہوائی چکی کا روپ دھارے تھا، میرے غور سے دیکھنے سے فوراً اپنی اصلی شکل میں آگیا۔۔۔ اور وہ ایک بڑا اور مہیب ٹینک جو میرے نزدیک آنے پر کیکر میں بدل گیا۔

کئی دفعہ یہ جھاڑیاں اور لہراتے ہوئے یہ ریتلے راستے مدھم روشنی اور سائے اور سکوت، سب مل کر ایک مبہم سا کھویا کھویا مگر بہت بڑا افسانوی شہر بن جاتے ہیں۔ مناروں، گنبدوں اور محرابوں والا شہر۔۔۔ میں نے راستے میں ایسے ہی دو تین شہر دیکھے۔ اور اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ

میرے ذہنی فریب تھے جو جنگل اور چاندنی اور سکوت کی باہم سازش کا نتیجہ تھے مگر میں اب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اصلی شہر نہیں تھے۔

ایک مرتبہ میں نے جنگل میں ایک تیز سیٹی کی آواز سنی ــــ ریل کی سیٹی کی آواز۔ میں جانتا تھا کہ ریل یہاں سے تیس پینتیس میل دور ہے اور اگر یہ آواز ایک مرتبہ بلند ہو کر رک جاتی تو میں یہی کہہ کر اپنے اوسانوں کو بہلا لیتا کہ میرے کان گونجتے ہیں یا رات کے کسی پرندے نے چہل کی ہے۔ مگر میں نے سیٹی کے بعد گاڑی کی مدھم چھکا چھکا چھک چھک بھی سنی اور پہیوں کی ہلکی گڑگڑاہٹ بھی، جیسے کوئی گاڑی اچانک حرکت میں آگئی ہو۔ یقیناً یہ کوئی نظر نہ آنے والی آسیبی گاڑی تھی جو ان جنگلوں میں سے گزر کر بھوتوں کے کسی شہر کو جا رہی تھی۔ ذرا اس ریل گاڑی کا تصور کیجئے جس کے ڈرائیور سے لے کر گارڈ اور مسافروں تک سب بھتنے ہوں ــ بھتنے اور بھتنیاں ــــ جگنوؤں کے ذریعے اور خشک تربوزوں کے اٹیچی کیس اور کیلے کے پتوں کے بستر اور ــــ ہائے یہ چاندنی کا جادو اور یہ انسان کی قوت خیال جو الف لیلہ کی تصنیف کا باعث بنی!

رات کے ساتھ چاند کی کرنوں کا سحر بھی بڑھتا گیا، چاند کے کھلنڈرے ساتھی ستارے بھی جیسے ہچکچاتے اور شرماتے ہوئے اپنی سلیٹی پناہ گاہوں سے باہر آگئے۔ شروع شب میں ایک گھڑ سوار اور ایک شتر سوار راستہ میں ملے تھے مگر اب تین چار گھنٹوں کے طویل وقفے اور طویل تر مسافت کے دوران میں، ہمیں راہ میں کوئی ذی روح نہ ملا۔ اگرچہ مویشیوں کی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں ہمیں اپنے ہم جنسوں کی قربت کا احساس دلاتی رہیں۔ میں ساربان کی زبان، اور ساربان میری زبان سے ناآشنا تھا اس لیے گفتگو کی کوشش بار آور ثابت نہ ہوتی تھی اور ایک آدھ سندھی فقرے (مثلاً فلاں مانو سٹھو ہے) سے شروع ہو کر ختم ہو جاتی تھی۔ ساربان پوچھتا "صوبہ دار سٹھو مانو" ہے ــــ یعنی کیا صوبہ دار اچھا آدمی ہے؟ اور میں جواب دیتا "صوبہ دار سٹھو مانو ہے۔" ساربان کے لہجے سے میں اس کا مافی الضمیر کسی حد تک سمجھ لیتا مگر یہ قوت تبادلہ خیالات میں ممد ثابت نہ ہو سکی گفتگو کی تمام کوششوں کو بے بسی کے کگرے سے نیچے اجنبیت کی کھاڑیوں میں گرتے دیکھ کر ساربان شاید بالکل ناامید ہو گیا اور عجیب چیختی ہوئی پھٹی پھٹی غیر قدرتی آواز میں گانا شروع کر دیا، اور اپنی ناک کو انگوٹھے اور انگشت شہادت میں لے کر اس سے وہی کام لینے لگا جو گویئے طنبورے سے لیتے ہیں اور سچ مچ اس کی ناک کی "تنغ تنغ" کسے ہوئے تاروں والے ساز کی طرح مہین اور تیز تھی۔

یہ کافی بے سرا گیت تھا۔ سفر سے اکتاہٹ اور آسیبی سکوت کے شدید احساس کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ اس گیت کو جاری رکھا جائے، میں سوچتا رہا کہ آخر اس گیت کا مطلب کیا ہو سکتا ہے، کیا یہ کسی نوجوان دیہاتی کے عشق کا گیت ہے، کیا یہ کوئی رزمیہ نغمہ ہے اور "مٹھو گھوڑا" کون ہے اور بار بار اس سے کیا درخواست کی جا رہی ہے ــــ کاش اس وقت ویری جی ہوتے

۔۔۔ وہ امرت دھارا قسم کے انسان جو شکسپیر کا سن پیدائش اور شلغم کے کیمیاوی اجزا ایک سانس میں بتا سکتے تھے ۔

شاید "منھو گھوڑا" بہت اڑیل ثابت ہوا ، اور ان تمام شاعرانہ درخواستوں کو پی گیا جو ساربان نے اس کے حضور گزرانی تھیں ۔ منھو گھوڑے کی بے اعتنائی سے تنگ آکر ساربان نے ایک اور گیت شروع کیا جو اگرچہ اسی تیز و تند "تنغ تنغ" کی دھن پر اور اسی مین کے کنستر کی سی آواز میں گایا گیا میرے خیال میں منھو گھوڑے کے گیت سے زیادہ معقول اور بامعنی تھا ۔

جلد ہی وہ گیت سے بھی تھک گیا اور پھر ایک وقفہ آیا جو بقا کی طرح لمبا اور کائنات کی طرح وسیع تھا اور جو چاندنی اور جنگل کی سائیں سائیں سے لبریز تھا ۔ ہم چپ چاپ سفر کرتے رہے ۔ ہم ایک مہتاب زدہ ٹیلے پر چڑھتے اور نیچے ایک ترائی کے انجام پر ایک اور مہتاب زدہ ٹیلا ہمارا منتظر ہوتا ۔ کتابوں کی گٹھڑیوں نے میرے گھٹنوں کا اپریشن کر ڈالا تھا ۔ ایک بار ساربان نے مجھ سے پوچھا "آرام سے بیٹھے ہو سائیں" ؟ ۔ میں نے اس سے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں کتابوں کی مسلسل نوازشوں کی شکایت کی ، جسے وہ شاید سمجھ نہ سکا یا میری شکایت کو اس نے اہمیت ہی نہ دی وہ یہ کیسے محسوس کر سکتا تھا بے چارا کہ کتابوں ایسی بے ضرر چیزیں بھی کبھی کبھی انسان کا جینا اجیرن کر سکتی ہیں ۔

ہم ایک جوہڑ کے پاس سے گزرے جو پانی میں مدھم شیشے کی تکون معلوم ہو رہا تھا ۔ ساربان نے جوہڑ کی طرف عجیب آرزو مندانہ نگاہوں سے دیکھا ۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ اس کے کنارے بیٹھ کر کھانا اور کچھ دیر آرام کرنا نہایت موزوں رہے گا ۔ اونٹ کی رفتار بھی مدھم ہو گئی مگر مجھے ابھی کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی ۔ کتابوں کی گٹھڑیوں کی مسلسل چاند ماری اور ٹانگوں کے اینٹھ جانے کے باوجود میں چاہتا تھا کہ منزل مقصود پر پہنچ کر آرام کیا جائے ۔ ساربان نے اپنی سست رفتاری کا جواب میری خاموشی میں پایا اور مہار تھام کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا ۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد ، ہم ایک بڑے گوٹ (گاؤں) کے قریب سے گذرے ، ہمیں بہت سی گھنٹیوں ، باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں ۔ مجھے گمان سا ہوا کہ سامنے ایک گوٹ موجود ہے مگر وہ گوٹ جو میں نے دیکھا سراب آسا تھا ۔ چاندنی اور ریت کا ایک فریب جن کا ذکر پہلے کر آیا ہوں ۔ یہاں ایک اونچے رتیلے ٹیلے پر جہاں دو راہی آسمان کی طرف رخ کیے مردوں کی طرح بے ہوش پڑے سو رہے تھے ۔ میرے ساربان نے "شو شو" کر کے اونٹ کو بٹھا دیا ۔ اب کے اس نے میری رضامندی ضروری نہیں سمجھی ، میں مجبوراً اونٹ سے نیچے اتر آیا کیونکہ بیٹھے ہوئے اونٹ پر بیٹھے رہنا عجب بھدا سا معلوم ہوتا ہے ۔ کچھ دیر میں ریت پر چہل قدمی کرتا رہا اور جب خون کی گردش اپنا معمول اختیار کر چکی تو ان خوابیدہ مسافروں کے پاس رتیلے فرش پر بیٹھ گیا ساربان نے اونٹ کو دو چار مانڈے پیش کیے اور حجامت کے تھیلے میں سے کھانے کا بنڈل نکال کر

میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے ویرجی یاد آ گئے۔ انہوں نے کاغذوں اور فیتوں کی مدد سے اس پیکٹ کو ایک پیشہ ور مٹھائی فروش کی سی چابک دستی سے باندھا تھا۔ گھی میں تلی ہوئی روٹیاں اور انڈے میں نے چھ روٹیاں اور نصف سالن سار بان کے حوالے کر دیا اور اب میں اور میرا اونٹ والا دو پرانے ہمجولیوں کی طرح اکٹھے بیٹھے کھانا کھانے لگے۔ اونٹ جواب مجھے بڑا نظر آ رہا تھا راستے کے آر پار بیٹھا جگالی کر رہا تھا اپنے دو انسان دوستوں کو مکمل بے اعتنائی سے دیکھ رہا تھا۔ ہم گھوڑوں کی طرح کھاتے رہے۔ کسی انسان کو کھانا اتنا لذیذ نہیں معلوم ہوا ہو گا جتنا یہ دنیا کے بدترین بارچی کا تیار کردہ سالن اور موٹی موٹی روٹیاں۔ مگر یہ کھانا ہم نے ڈائننگ روم کے تکلفات میں گھر کر نہ کھایا تھا۔ خدا کے کھلے گھر کے کھلے آنگن میں ازلی ریت کی چاندنی پر بیٹھ کر اور دور گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹوں کو سنتے ہوئے، ہم نے یہ دعوت اڑائی تھی۔

میں نے سار بان کو دو اور روٹیاں دیں اور تھوڑی دیر کے بعد جب اسے کچھ اور دینے کی کوشش کی تو اس نے انکار کیا۔ اب تین روٹیاں بچ رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کا کیا کیا جائے۔ آخر میں انہیں سار بان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اٹ" اور اونٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میری تجویز یہ تھی کہ اس دعوت میں اونٹ کو بھی حصہ دار بنانا چاہیے۔ سار بان نے جواب میں "بس" کہا۔ مجھ سے روٹیاں لے لیں اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس نے ان کا ایک گولہ سا بنایا اور انہیں خود ہی کھانے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں تین روٹیاں اس کے مبارک پیٹ میں تھیں۔

اب سوال پیدا ہوا پانی کا۔ میں بہت پیاسا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی سندھی میں میں نے کہا "پانی وٹھے" یعنی پانی چاہیئے۔ اس نے جواب دیا۔ "نہ۔ پانی نہ وٹھے، چھائیوں وٹھے" اور مبہم طریقے پر نیچے اشارہ کیا۔ اس نے ایک لمبی تقریر کی، جس میں بنیوں اور چھائیوں کے الفاظ بار بار آتے تھے، میرا سار بان ایک خوبصورت گھبرالو لڑکا تھا۔ اس کی آواز رسیلی اور راگوں سے لبریز تھی اور میں سوچنے لگا کہ وہ اپنی اصلی آواز میں گانے کی بجائے اس باریک غیر قدرتی آواز میں گانا کیوں پسند کرتا ہے۔ حسن کی طرح موسیقی کے بھی کتنے بے شمار معیار ہیں۔

اس نے کہا "بلو سائیں" کھانے کے بعد وہ زیادہ مؤدب اور ممنون نظر آ رہا تھا۔ ہم اونٹ پر سوار ہوئے اور نیچے ترائی میں اتر گئے۔ ہمارے بائیں طرف ایک بنی تھی، سار بان اونٹ کو آہستہ آہستہ چلاتا، ایک طرف جھک کر، پھیلی ہوئی بیلوں اور باجرے میں کسی چھائی کی تلاش میں تھا۔ ایک جگہ اس نے اونٹ کو روک لیا۔ ہم دونوں نیچے اترے۔ وہ بنی میں گھس گیا اور بازوؤں اور کہنیوں تلے پانچ چھ بنیاں دبائے کچھ دیر بعد واپس آ گیا۔ ہم دونوں وٹ (راستے کے کنارے) پر بیٹھ گئے۔ اسی طرح، گاؤں کے دو رفیقوں کی طرح۔ چھائیاں ہمارے سامنے تھیں، وہ ان کو توڑ کر زمین پر رکھتا اور میری طرف مسکرا مسکرا دیکھتا۔ ہم نے انہیں کھا کر اور ان کا

میٹھا اور ٹھنڈا رس چوس اور پی کر اپنی پیاس بجھائی۔

تھوڑی دور جا کر ہم نے تیس پینتیس اونٹوں کے ایک قافلے کو جالیا۔ مجھے اونٹوں کی وہ قطار کچھ عجیب سحر آمیز طریق پر علی بابا کی کہانی کے چالیس چوروں کی طرح معلوم ہوئی۔ اونٹ چمڑے کے بڑے بڑے مشکوں سے لدے ہوئے جا رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان میں گھی ہے۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ان میں گھی ایسی عام اور غیر رومانی پلپلی چیز نہیں ہو سکتی، گھی سے تو زیتون کا تیل زیادہ رومانی ہے، میرے نزدیک تو ان مشکوں میں خود چالیس چور ہی چھپے بیٹھے تھے اور ان کا سردار تیل کے ایک سوداگر کے بھیس میں ان کو علی بابا کے گھر انتقام لینے کی خاطر مشکوں میں چھپا کر لیے جا رہا تھا۔ ڈاکو۔۔۔۔ یا نظر بظاہر ساربان بڑے خوش باش قسم کے بے فکرے معلوم ہوتے تھے، وہ اچھلتے ناچتے اور گاتے جا رہے تھے۔ میرا ساربان ان میں سے کئی ایک کو جانتا تھا۔ خاص کر ایک بکرے کی ڈاڑھی والا پھرتیلا آدمی جو ایک چھلاوے کی طرح فریب دہ تھا، میرے ساربان کا کوئی گہرا لنگوٹیا نکلا۔ ساربان نے اس سے کئی باتیں کیں۔ پھر ہم قافلے سے آگے نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کسی کو اپنے سامنے ایک خرگوش کی طرح بھاگتے ایک بنی میں گھستے دیکھا۔ یہ وہی بکر ڈاڑھی چھلاوہ تھا، وہ اب بنی میں جھکا چھائیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ میرے ساربان نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پھر ہماری پیاس بھی تو ابھی پوری طرح نہیں بجھی تھی۔ وہ بہت سی چھاں اکٹھی کر لایا، اور پھر سے دعوت اڑائی گئی۔ اسی اثنا میں چالیس چور ہم سے آگے نکل گئے۔ فارغ ہو کر ہم نے پھر قافلے کو جالیا۔ اب کے ساربان نے شاید گپیں ہانکنے کے شوق میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی، اور مجھے چالیس چوروں کی قطار میں شامل کر کے ساربانوں سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے سختی سے حکم دیا کہ وہ آگے نکل جائے۔ قافلے کو تو وہ میرے کہنے پر پیچھے چھوڑ آیا مگر اب اس کے انداز میں وہ چستی غائب تھی، صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف قافلے سے آگے نکلا ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد ہم نے اس عجیب سی ڈاڑھی والے شخص کو (جس کا نام عمر تھا) صرف ایک لنگوٹا کسے زمین پر چت، مردے کی مانند پڑا ہوا پایا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بھوت کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور عجیب چہلیں کرتا ہمارے آگے آگے بھاگنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ عمر ایک نہایت کامیاب درباری مسخرا یا سنیما کامیڈین ہو سکتا ہے۔ آخر میرے "جلدی۔ جلدی" کی رٹ لگانے پر میرے ساربان نے بڑی بے دلی سے اپنے دوست عمر سے مفارقت گوارا کی، اور ہم قافلے سے بہت آگے نکل آئے مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساربان نے اونٹ کو تیز چلانے اور نونکوٹ پہنچنے کے ارادہ کو فی الحال ملتوی کر رکھا ہے اور دوسرے معاملات کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ ممنونیت جو کھانا کھا لینے کے کچھ دیر بعد تک اس کے بشرے اور اس کی حرکات میں نمایاں رہی، غائب ہو چکی تھی۔ وہ مجھے بالکل غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ ایک گستاخانہ اطمینان سے (کم از کم مجھے یہ ایک گستاخی ہی نظر آئی) وہ اونٹ کے ایک طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا بنیوں کو بغور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بدمعاش! کیا اب تک چھائیاں اس کے خیالوں میں بس رہی ہیں؟ کم از کم مجھے تو اب چھائیوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، میں فوراً نوں کوٹ پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ اونٹ کو باجرے کے ایک کھیت میں لے گیا۔ کھیت کے عین وسط میں اسے بٹھا کر کہیں سے درانتی نکالی اور کندھے پر پڑی چادر کو ہاتھ میں لیتا کھیت کے گنجان حصے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد مانڈوں کا ایک بہت بڑا گٹھا باندھ لایا، اور اونٹ کے سامنے ڈال دیا۔ اونٹ نے اس انبار میں سے ایک "مانڈہ" منتخب کر کے اسے کاغذ کے فیتے کھانے والے مداری کی طرح نگلنا شروع کیا۔ ساربان ایک مرتبہ پھر کھیت میں گھسا اور پہلے سے بھی بڑا گٹھا باندھ لایا۔ میرے دل میں ساربان کے خلاف ایک خاموش غصے کی آگ سلگ رہی تھی۔۔ دیر کر رہا ہے کمبخت، مگر ساتھ ہی میرے دل میں اس شخص کے لیے تحسین کے جذبات بھی تھے، قطع نظر اس بات کے کہ باجرے کا کھیت اس کا نہیں تھا اور مانڈوں کے یہ دو گٹھے قانون کے دو جنازے تھے، یہ شخص اپنے کام اور پیشے میں مجھ سے زیادہ مستعد تھا اور پھر اس کو اپنے جانور کا کتنا خیال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی کبھی وہ اونٹ کو گالی بھی دیتا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ چڑھائی پر جاتے جاتے اچانک رک کر اپنے لٹکے ہوئے ہونٹوں کو پھڑپھڑاتا یا وٹ سے ہٹ کر بنیوں میں جانے کی کوشش کرتا۔ اس کی گالی کی لغت لفظ "دلا" تک محدود تھی، اگر اس لفظ کا سندھی میں وہی مطلب ہے جو ہماری پنجابی میں ہے، تو اونٹ کے لیے یہ عجیب سی گالی ہے لیکن اگر گالی میں مہذب ہونے کی گنجائش ہے تو یہ گالی پنجابی کی دوسری گالیوں کے مقابلے میں واقعی نرم اور مہذب تھی۔ اس گالی کے باوجود ساربان اپنے اونٹ کو اپنے بیٹے یا بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ عرب کی محبت اپنے گھوڑے سے، ایک بتری یا بلوچ کی محبت اپنے اونٹ سے۔ یہ میری سمجھ میں آسکتی ہے، ہم میں سے شاید کسی نے وہ مشہور انگریزی نظم۔ " AN ARAB.S FAREWELL TO HIS HORSE " نہیں پڑھی اور اس سے متاثر نہیں ہوا۔ میں نے خود ایک آدمی کو (مگر صرف پردہ، سیمیں پر) کمال سنجیدگی سے اس بات کا اقرار کرتے سنا ہے کہ "گھوڑا میرا بہترین دوست ہے۔"

مجھے اعتراف ہے کہ میں حیوانات سے رفاقت اور قرابت کا اتنا بلند بانگ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ حیوانوں نے مجھ سے ہمیشہ بے اعتنائی کی ہے۔ اور تین حیوانوں نے (جن میں ایک بلا تھا اور دو گھوڑے) جن کی طرف میں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا، میرے جذبات کی کوئی قدر نہ کی۔ انہوں نے کئی بار اپنے قول و فعل سے مجھ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان کو میری دوستی کا نہ کوئی پاس ہے نہ لحاظ اور نہ ضرورت۔ کئی گھوڑوں نے تو فی الواقع میرے چمکارنے اور تھپکانے کے باوجود مجھے زمین پر پٹخ ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے۔

حیوانات سے محبت، ایک راز ہے جو میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ میرا مطلب محبت سے

ہے ، جو بعض لوگ اپنے کتے یا پالتو بن مانسوں یا لنگوروں سے کرتے ہیں ۔ ہم سب نے خوبصورت کالروں میں ، ملبوس ، مغرور کتوں اور بالوں بھرے کتوں کو موٹر کاروں کی پچھلی سیٹوں پر نہایت شان سے بیٹھے دیکھا ہے اور شاید ہم میں سے اکثر کو ان پر رشک بھی آیا ہو گا ۔ ہم سب نے وہ عجیب بوڑھی میمیں بھی دیکھی ہیں جو اپنے کتوں کی خوراک ، صفائی اور آرام کا اتنا ہی خیال رکھتی ہیں جتنا اپنی کوکھ کے بچوں کا ۔ شاید ان سے بھی زیادہ ۔ ۔ ۔ یہی محبت میری سمجھ سے آج تک بالاتر ہے ، میں اقرار کرتا ہوں کہ کم از کم میں اس نوع کی محبت کا نااہل ہوں ۔ میرے خیال میں حیوانات سے اتنی شدید محبت کرنے والے بالکل کلبی اور نک چڑھے ہوتے ہیں اور وہ اپنے ہم جنسوں سے اس درجہ بیزار ہوتے ہیں کہ انسان کی سوسائٹی پر کتوں کی سوسائٹی کو ترجیح دینے لگتے ہیں ۔ حیات کی حقیقتوں سے فرار کی یہ ایک نئی صورت ہے جس کی طرف ابھی تک ہمارے رومان دشمن شعراء متوجہ نہیں ہوئے ۔

حیوانات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہیں اور میں حیوانات کو پالنے اور ان پر ٹوٹے ہوئے صدیوں کے مظالم کی بیخ کنی کرنے والی مجالس کے اکثر اصولوں سے متفق ہوں لیکن مجھ سے یہ کبھی نہیں ہو گا کہ کسی کتے یا لنگور کو اپنے ساتھ لنچ یا ڈنر پر مدعو کروں یا اسے اپنے بستر میں سلاؤں ۔ انہی ناز برداریوں نے حیوانات کے دماغ بگاڑ رکھے ہیں ۔ مجھے اب بھی پورا یقین نہیں کہ ایک الٹرا ماڈرن میم صاحبہ کی اپنے کتے سے محبت انسان اور حیوان کے درمیان ایک UNDERSTANDING پر مبنی ہے ، یا صرف رواج ، فیشن اور خود نمائی کے جذبے پر!

اب کئی لوگ ہیں ۔ اور ان میں شاید بوڑھا شیکسپیئر بھی ہے جو آپ کو بتائیں گے کہ گھوڑا ایک شریف الطبع اور وفادار جانور ہے ۔ گھوڑے کی عظمت کا یہ جہانگیر ہمہمہ دراصل انہی ادیب لوگوں کی عبارت آرائیوں کا نتیجہ ہے جو خود کبھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے ۔ مجھے واللہ گھوڑے کی ذات سے کوئی پرخاش نہیں ، مگر میں نے ان آنکھوں سے کئی گھوڑے دیکھے ہیں جن میں حلم اور وفا کا نام تک نہیں ہوتا ۔ گھوڑوں کی تعریف کرنے والوں میں سے ایک شیکسپیئر ہی کو لیجئے ۔ اس بیچارے کو تو کبھی گھوڑے پر سوار ہونے کا اتفاق ہی نہیں ہوا ۔ اس کی قسمت میں تو فقط گلوب تھیٹر کے باہر امراء کے گھوڑوں کی لگامیں تھامنا ہی لکھا تھا ۔ ایسے شخص کو بھلا اس حیوان کی نفسیات اور خصائل کا کیا علم ہو سکتا ہے ۔ مسٹر ولیم شیکسپیئر کے بعد ہمارے دوست مسٹر جان گلپن سے پوچھئے ، جو ایک مغرور اور کاروباری شخص تھا ، اور جسے ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک پک نک پر جانا پڑا تھا ۔

یہ مذاق نہیں میں کمال سنجیدگی سے یہ سطور لکھ رہا ہوں ۔ یہ غلط خیال ہے کہ ایک کتا یا ایک گھوڑا یا ایک بندر انسان کا انسان سے بہتر مونس و غمخوار ہو سکتا ہے ۔ جو لوگ مویشیوں کی بریڈنگ اور سیوا کرتے ہیں یا وہ لوگ جو مرغیوں کی فارمنگ کا سلسلہ شروع کرتے ہیں کچھ عرصہ

بعد صرف مویشیوں اور مرغیوں ہی کی سوسائٹی کے لائق رہ جاتے ہیں۔ خود ڈیپلو میں دو تین آدمی ایسے ہیں جن سے مجھے اور ڈاکٹر کو ایک مستقل شکایت ہے۔ ایک تو وہ ہیڈ منشی جن کا ذکر آچکا ہے اور دوسرا پوسٹ ماسٹر، دونوں مویشیوں کے سرگرم "پالنہار" ہیں۔ ڈاکٹر انہیں ہمیشہ مذاقاً اور طنزاً CATTLE BREEDERS کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ دونوں معقول انسانوں کی صحبت پر حیوانوں کی صحبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور جب وہ اپنی گائے بھینس یا بکری کی صحبت میں ہوتے ہیں تو زیادہ خوش اور AT HOME محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ برہنہ سر برہنہ پا اپنی محبوبوں کے پیچھے "لکھی لکھی" "سادی سادی" پکارتے ہوئے بھاگتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی روشنی آجاتی ہے۔ یہی وہ لمحے ہیں جب وہ صحیح زندگی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

پھر بھی، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں بلوچ کی اپنے اونٹ سے محبت کو سمجھ سکتا ہوں اور اتنی محبت کر بھی سکتا ہوں۔ صحراؤں میں بھی مسافتیں، بے کنار تنہائیاں، جن سے ساربانوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے، انسان اور حیوان میں ایک جذبہ رفاقت ایک COMRADERIE پیدا کر دیتی ہیں۔ ساتھ ہی اونٹ غالباً اس بلوچ کی عزیز ترین متاع ہے وہ اپنے مالک کے لیے کماتا ہے۔ اس قسم کی محبت ایک قلندر کو اپنے بندر اور ایک چھندر کو اپنے ریچھ سے ہو جاتی ہے اور شاید بعض حیوانوں کی روحیں انسانوں سے زیادہ پچی اور بے داغ ہوتی ہیں کیونکہ اگر ایک حیوان شکر گزار نہیں ہوتا تو ہم کسی صورت میں اسے ناشکرا بھی نہیں کہہ سکتے ۔۔۔ اور انسانوں کی اکثریت ناشکروں پر مشتمل ہے۔ ناشکر گذاری جو بوڑھے شیکسپیئر کے الفاظ میں انسان کو سرما کی برفانی سانسوں کی طرح کاٹتی ہے اور اسے انسانوں کو چھوڑ کر حیوانوں کی محبت تلاش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہ معترضہ جملہ ڈیپلو سے نوں کوٹ تک مسافت اتنا طویل ہو گیا ہے۔ ساربان نے گٹھوں کو اپنی نشست پر جمایا اور پھر ان پر چڑھ بیٹھا اور ہم نے اپنا سفر جاری کیا۔ گھنٹیوں اور انسانوں کی آواز نے ہمیں بتایا کہ اونٹوں کا قافلہ پھر ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ مگر اب ساربان اس قافلے کو جا لینے اور اپنے لنگوٹیے عمر سے گپیں ہانکنے کا خیال چھوڑ چکا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اب ہمیں وٹ پر پڑاؤ ڈال دینا چاہیئے تاکہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ اس دوران میں اس کا اونٹ باجرہ چر لے گا اور پھر ہم صبح ہونے سے پیشتر چل پڑیں گے۔

لیکن وٹ پر کون سوئے! میں نے تو ڈیپلو ہی میں تہیہ کر لیا تھا کہ میں وٹ پر قطعی نہیں سوؤں گا۔ میں سانپوں سے ڈرتا ہوں، ہر صحیح الخیال انسان کو سانپوں سے ڈرنا چاہیئے۔ مگر میری صحیح الخیالی ذرا شدید قسم کی ہے اور ڈاکٹر نے بوقت روانگی مجھے خاص ہدایت کی تھی کہ تھر کا یہ صحرا صحیح معنوں میں سانپوں کی نگری ہے۔ ان سانپوں میں سب سے زیادہ دہشت ناک "ساہ پیوں"

(سانس پی جانے والا) ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ رات کو سونے والے کی چار پائی پر چڑھ جاتا ہے اور اس کی چھاتی پر رینگنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اپنا منہ اس کے ہونٹوں پر اس طرح رکھ دیتا ہے جیسے کوئی اپنے محبوب کا بوسہ لے، اس بوسے میں موت ہے، سانپ سونے والے کے منہ میں زہر ٹپکا دیتا ہے جس سے اس کے حلق کی رگیں کھچ جاتی ہیں اور اس کی سانس گھٹنے لگتی ہے اس کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ہاتھ پیر شل ہو جاتے ہیں اور زندگی گل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ سانپ دراصل فرضی اور خیالی ہے۔۔۔ اس کا وجود افسانوی ہو یا حقیقی، اس کے طفیل تھر کے لوگ ایک مستقل دہشت اور خوف کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اگر چار پانچ آدمیوں کے مجمع میں ایک مرتبہ "ساہ پیوں" کا ذکر چھڑ جائے تو بہت دیر تک گفتگو کا موضوع یہی سانپ رہے گا اور اس کے متعلق کئی عجیب و غریب طوفانی اور الکل پچو کہانیاں سنائی جائیں گی۔

ڈاکٹر سے ملاقات سے قبل میں سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ سانپوں سے ڈرنے والا انسان روئے زمین پر کوئی نہ ہوگا۔ میرے خوابوں کے بدترین کابوس وہ ہوتے تھے جن میں سانپ۔ کوڑیالے، دھبوں والے، بھورے اور نیلے سانپ۔ میری طرف رینگتے ہوئے آتے تھے۔۔۔ صرف رینگتے ہوئے (مجھے اب تک کوئی ایسا خواب یاد نہیں جس میں سانپ نے مجھے کاٹا ہو) میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ان بزدل آدمیوں میں سے ہوں جن کو خدا نے یہ کیڑا مارنے کی توفیق ودیعت نہیں فرمائی۔ ڈاکٹر سے مل کر مجھے گونہ تسلی اور تسکین ہوئی کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ سانپوں سے دہشت زدہ تھا۔ وہ کبھی رات کے وقت (خواہ وہ چاندنی رات ہی کیوں نہ ہو) ٹارچ کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔ اس نے مجھے اپنے پیشرو ڈاکٹر کے متعلق بتایا کہ اگر رات کو اسے کہیں باہر جانا ہوتا تو شام سے صبح تک اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا اور پانی پینے یا کسی اور ضرورت سے بھی نیچے اترنے سے ہچکچاتا بلکہ اونٹ کو بھی سانپوں کے ڈر کے مارے بیٹھنے تک نہ دیتا۔

ساربان اونٹ کو وٹ کے ایک طرف لے گیا۔ جہاں جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی ریتلی جگہ تھی۔ اونٹ کو بٹھا دیا گیا۔ ساربان نے میرے لیے اونٹ کی گلیم نیچے بچھا دی مگر میں کچھ دیر سانپوں کے متعلق سوچتا ہوا کھڑا رہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں لیٹ تو رہوں گا مگر سوؤں گا نہیں۔ اور اس جھاڑی کی طرف رخ کر کے لیٹوں گا جو گلیم کے بالکل قریب ہے۔ نیند کے مارے میرا برا حال تھا۔ پر بستر بچھا کر میں پتلون اور بوٹوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تو کہنی پر سر رکھے میں چاندنی میں سسکتی ہوئی جھاڑی کو دیکھتا رہا پھر ننھے ننھے مچھروں نے میری توجہ کلیتہً اپنی طرف مبذول کر لی۔ باجرے کے کھیت سے ہم اپنے ساتھ مچھروں کی ایک بڑی فوج لے آئے تھے جو اب میرے سر کے گرد بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح منڈلا رہی تھی۔ یہ مچھر شنشناتے ہوئے میرے چہرے پر LAND کرنے کی کوشش کرتے۔ انہوں نے مجھے کاٹا بھی مگر ان کی کاٹ ننھی

اور غیر محسوس تھی پھر بھی ان میں تنگ کرنے اور ستانے کی خداداد صلاحیت تھی۔ جذبہ ۔ انتقام سے مجبور ہو کر میں نے چادر اوڑھ لی۔ چھوٹے مچھر یقیناً جھنجھلائے ہوں گے۔ کچھ مایوس بھی ہوئے ہوں گے کہ ان کے شکار نے مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے یوں ستیہ گرہ کی ٹھان لی۔ کچھ دیر میں اپنے اوپر ان کی غصیلی شنشناہٹ سنتا رہا اور پھر وہ مجھے چھوڑ کر اپنے دوسرے ساتھیوں میں جا ملے جو اونٹ اور شتربان پر بلا روک ٹوک، بغیر کسی نوع کی مزاحمت کے، نہایت اچھا وقت گذار رہے تھے۔

میں نے سنا ہے کہ اونٹ ان ننھے صحرائی مچھروں کا بہشت ہے۔ شاید اونٹ کے جسم کی مخصوص بو انہیں بھاتی ہے یا وہ اس کی بے بسی اور بیچارگی کو پہچان چکے ہیں۔ ادھر وہ اونٹ کو دیکھتے ہیں ادھر ان کا ٹڈی دل حملہ آور ہوتا ہے اور اتنے بڑے "رتاور" کو بیحال کر دیتا ہے۔ میں نے کئی بار ڈیپلو میں گاؤں کے باہر چراگاہ میں ساربانوں کو دیکھا ہے، جو اپنے اونٹوں کو "دھواں" دیتے ہیں۔

دھواں تو شاملات کے میدان پر شام کے وقت ایک کہر کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اول اول دھواں دینے کا عمل مجھے مضحکہ خیز معلوم ہوا تھا۔ میرے وہمی دماغ نے تصور کیا کہ یہ دھواں اونٹوں کے لیے شاید انتہائی سکون بخش ہے، جیسے تمباکو انسان کے اعصاب کے لیے مگر بعد میں ڈاکٹر سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ مچھروں کو بھگانے کا حربہ ہے اور نہایت کامیاب حربہ ہے "باوجود اس کے اگر آپ پہلی مرتبہ اونٹ کو "دھواں دیا جاتا ہوا دیکھیں تو اس رسم کا انوکھا پن آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لائے بغیر نہیں رہے گا۔

مجھے یاد نہیں کہ کس وقت سویا۔ نیند ایک چور کی طرح آئی اور میں اس ٹھنڈی سپید چاندنی اور دور سے آتی ہوئی مدھم ٹنٹناہٹوں کی دنیا سے چپ چاپ ایک خوابوں کی دنیا میں چلا گیا۔ مگر اس دنیا میں چاندنی کی لو اور گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنائی دیتی رہی البتہ وہاں سانپ نہیں تھے۔۔۔
ایک مرتبہ میری آنکھ کھلی۔ شتربان اپنے اونٹ کو باجرے کے ٹانڈے کھلا رہا تھا۔۔۔ اونٹ کا منہ چارہ کاٹنے والی مشین کے مشابہ تھا جس میں لمبے لمبے ٹانڈے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد میرے ذہن پر سانپ رینگنے لگے۔ میں بستر میں دبک کر لسکتی ہوئی جھاڑی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب میں اٹھا تو پو پھٹ رہی تھی، چاند کی سفید ٹکیہ اسی طرح چمک رہی تھی۔ ستارے بھی اسی طرح چمکیلے تھے۔ البتہ کبھی کبھی ان کی لو میں پھیکے پن کا گمان سا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے طبعاً محسوس کیا کہ میں نے آخر کار رات کو صبح کے ڈر سے دبے پاؤں بھاگتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔ عناصر کی تمام کروٹوں میں سے یہی ایک کروٹ مجھے سب سے زیادہ دلآویز اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لمحے کی شیرینی صرف وہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو گھروں کی چار دیواریوں کے

باہر کھلی فضاؤں میں راتیں بسر کرنے کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ کیا کنجوس کروڑ پتی کا سارا سونا اس ایک پل کا بدل ہو سکتا ہے۔ جب اشجار اور جھاڑیاں ایک نئی سانس لیتی ہیں، اور کائنات ایک انگڑائی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لمحے کی تاثر آفرینی کو صرف شاعروں اور مصوروں، عاشقوں اور سیاحوں نے محسوس کیا اور ہمارے ہندوستان میں جوش نے محسوس کیا ہے ؎

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

میں نے دور کسی گاؤں سے مرغے کی بانگ سنی۔ پھر مویشیوں کی گھنٹیوں کی آوازیں، پھر مدھم، بہت مدھم، کسی دہقان موذن کی اذان میرے کانوں میں آئی۔ جیسے کوئی آواز دے رہا ہو اس کائنات کے رکھوالے کو اور کہہ رہا ہو کہ اس لمحے کو ابدی بنا دے، اس طلسم کو قائم رکھ، اے خدا،۔۔۔۔اے خدا۔

مگر یہ طلسم ٹوٹ گیا، دھند پر اجالا غالب ہونے لگا! خدا کب سنے گا انسان کی فریادیں، مستجاب الدعوات کے دربار میں یہ ننھی منی معصوم دعائیں کب بار پا سکیں گی؟

رات بھر کا تھکا ہارا ساربان لٹھ کی طرح سو رہا تھا اور اس کا اونٹ ابوالہول کی طرح ماورائے فہم و ادراک۔۔۔ایک عجیب مخفی اور ڈھکے چھپے انداز میں بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔

اگر کوئی حیوان مشین سے کسی طرح مناسبت رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اونٹ ہے۔ اس سے زیادہ مطمئن، بے اعتنا اور آسودہ خاطر اور کوئی جانور نہیں، اسے غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنی خوراک میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا تاہم یہ ایک ناقابل تصور مقدار نگل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر دیر تک بیٹھے رہنا اس کے جذبات پر (اگر اس کے کوئی جذبات ہوتے ہیں) ظاہری طور پر انتہائی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا سارا دن مسلسل چلتے رہنا۔ میرے خیال میں کسی اور حیوان میں اتنی قوت برداشت اور لاابالیانہ پن نہیں جتنا اونٹ میں، اور اگر اسے بزرگوں نے صحرا کے جہاز کا لقب دیا ہے تو وہ بالکل راستی پر تھے۔ بزرگ بھی کبھی کبھی سچی باتیں کہہ جاتے تھے میرے دوستو!

میں اب بہت جلد روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے ساربان کو کچھ دیر سونے دیا۔ جب سورج کی خون آلود آنکھ جھاڑیوں کے اوپر مشرقی افق پر سے جھانکنے لگی تو میں نے اسے جگایا۔ اٹھتے ہی اس نے فوراً اونٹ پر پاکھڑ ار کھا اور چند ہی منٹ میں تیار ہو کر ہم روانہ ہو پڑے۔ ہماری رفتار خاصی تھی، میں ساربان کی طرح ایک طرف ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ میرے خیال میں اونٹ پر بیٹھنے کا یہ سب سے آرام دہ طریقہ ہے۔

اب ہم خدا کی جاگی ہوئی گلابی دنیا سے گزر رہے تھے۔ پرندے ہوا میں کلکاریاں مارتے اور چہچہاتے، ہمارے سر دھکتے ہوئے درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں سے چھو جاتے۔ ایک درخت

کے نیچے سے گزرتے وقت ایک شریر شاخ نے میری سبز فلٹ کو میرے سر پر سے اچک لیا۔ شاید پتوں میں چھپا ہوا اور انسانی آنکھوں سے پوشیدہ کوئی ایریل ARIEL یا پک PUCK مسافروں کو ستانے کے لیے بیٹھا تھا اور یہ اسی کی کارستانی تھی۔ میری سبز فلٹ کانٹے دار شاخ میں الجھی ہوئی تھی۔ ساربان اونٹ کو واپس درخت تلے لایا اور میں نے بڑی مشکل سے اسے پک کی انگلیوں سے چھڑایا۔ اب میں نے ننگے سر بیٹھنا ہی بہتر سمجھا کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ درخت شرارتوں اور چھیڑوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ کچھ دیر تک اسی طرح جاری رہا مگر تقریباً دو گھنٹوں کے بعد پہاڑیاں پست اور کم ڈھلائی ہونے لگیں، اب ہم ان تھری پہاڑیوں کی دم پر پہنچ گئے تھے۔ یہ بالکل مختلف اور نئی زمین تھی۔ یہاں سے وہاں تک W کی شکل کی تھوہر کی جھاڑیوں سے ڈھنپی ہوئی۔ تھوہر کی اکا دکا جھاڑیاں ہم نے راستے میں بھی دیکھی تھیں مگر اس جگہ ان کی راجدھانی تھی۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ تھوہر کی جھاڑی کوئی خوبصورت چیز نہیں مگر یہاں اس انبوہ میں تھوہر حسین اور پرشکوہ معلوم ہونے لگی تھی۔

اب ہم پہاڑیوں سے باہر ایک میدان میں نکل آئے، یہ پہاڑیاں اب ایک سرخ خواب کی طرح ہمارے بائیں کو ڈھلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ تھوہروں کی مملکت ختم ہو چکی تھی۔ ہم کپاس کے ایک کھیت کے پاس سے گذرے، جس کے حاشیے پر شاندار درخت ایک زمردیں قطار کی طرح صف باندھے کھڑے تھے، ڈوڈوں میں کپاس کے پھول سفید ہیروں کی طرح دمک رہے تھے مجھے اس سے پہلے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ کپاس کا کھیت بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے مگر کپاس کا یہ کھیت تقریباً پہلا منظر تھا جس نے پہاڑیوں کے منظر کی یکسانیت اور یک رنگی کو توڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے اچانک باغ ارم کی طرح مہک اٹھا۔ اس کے تصور سے اب بھی میرا دل اچھلنے لگتا ہے۔

ہم ایک چھوٹی نہر کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی پر سے گزرے جہاں صحرائی سروتوں کی ایک رجمنٹ کی رجمنٹ ہماری سلامی کے لیے قطار باندھے کھڑی تھی۔ لمبے صحرائی سروٹ جن کی نرم ریشمیں جھالریں ہوا کی تھپکیوں سے جھکی پڑتی تھیں، کتنے خوبصورت لگ رہے تھے وہ سروٹ ۔۔۔ اور وہ پیلے پھولوں والا اکیلا کیکر، نازنین سروتوں کے درمیان ۔۔۔ ایستادہ پتوں میں صبح کا سونا لیے ۔۔۔ کیا آپ نے کبھی اس سے حسین چیز دیکھی ہے؟

مجھے ہر چیز حسین اور انوکھی معلوم ہو رہی تھی، شاید اس لیے کہ میں ایک تھکا دینے والے تسلسل کے بعد ایک خوش گوار تغیر سے دوچار ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ صبح گلابی اور سنہری تھی اور پرندے ہوا میں ناچ اور گا رہے تھے۔ یا شاید اس لیے کہ میں اب اس ابدی سفر کے خاتمے پر تھا۔

وہاں سے ہم ایک "ماہالغ نہر" کے کنارے کنارے ہو لیے۔ میں نے یہاں سے پہلی بار نوں کوٹ کے قصبہ اور اس سے پرے ریلوے اسٹیشن کا نظارہ دیکھا۔ اسٹیشن تنہا اور خاموش قصبے سے دور پڑا تھا۔ ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح۔ یہی ننھا سا اسٹیشن میرا ایلڈوریڈو ELDORADO تھا۔ وہ منزل جس تک پہنچنے کے لیے لوگ کئی برسوں کے جان جوکھم سفر کرتے ہیں۔ یہ میرا جادو کا قالین تھا اور میں ابھی سے اس سبز انجن والی چھوٹی ریل گاڑی کے متعلق سوچنے لگا جو دو گھنٹے کے بعد چنچناتی ہوئی مجھے اٹھا لے جانے کے لیے اس اسٹیشن پر ٹھہرے گی۔

نوں کوٹ تک پہنچنے میں ہمیں کافی وقت لگا۔ نہر کا پل دور تھا اور اس کو عبور کرنے کے بعد ہمیں الٹے پاؤں پلٹنا پڑا۔ نوں کوٹ کا قصبہ بالکل ایک مربعے کی صورت میں تھا اور بیسویں صدی کے ایک جدید شہر کا ایک ایسا حصہ معلوم ہوتا تھا جو کسی ناقابل فہم عمل سے اصل شہر سے علیحدہ ہو گیا اور علیحدگی کے اس سلسلے میں پرانا، شکستہ اور بوسیدہ ہو گیا ہو۔ یہ ان بدنصیب قصبوں میں سے ہے جسے اسٹیشن سے دور رہنے والے لوگ شہر سمجھتے ہیں۔ مگر جنھیں اپنی کم مائیگی کا پورا علم اور احساس ہوتا ہے اور جو اپنا سر شرم کے مارے ہمیشہ جھکائے رکھتے ہیں۔ نوں کوٹ کے پاس تھکے ماندے مسافر کے لیے کوئی مسکراہٹ نہیں۔ کوئی تبسم نہیں۔ محض ایک جذبات سے عاری نظر ہے۔ اینٹھتی ہوئی اور پھیکی پھیکی۔۔۔ گھر تھوڑے، بدصورت اور بے لطف ہیں، اور وہ خانہ بدوش بھی (میں خانہ بدوشوں سے محبت کرتا ہوں) جو اپنے خیموں اور عجیب وضع کی بیل گاڑیوں اور اپنے پیشے کے زنگ آلود اوزاروں کے ساتھ شہر کے کنارے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں، گدھوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں، جو شہر کی گلتی سڑتی لاش کے پنجر پر دعوت اڑانے کے لیے جمع ہو گئے ہوں۔

ہم دو تین ہوٹلوں کے پاس سے گذرے جن میں سے ایک پنجابی ہو آ رہی تھی۔ وہ ان غلیظ شوریدہ اور کھلے ہوٹلوں میں سے تھے جن میں کھانے کے علاوہ مسافروں کو چارپائیاں بھی مہیا کی جاتی ہیں اور جن کے تمام مشروبات و ماکولات کا ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے اور جن میں بڑے بڑے ترموں والے گراموفون دن رات گلا پھاڑ کر رینگتے رہتے ہیں۔ سننے اور سنانے والوں کے لیے یہ امر کسی طرح قابل لحاظ نہیں ہوتا کہ کونسا ریکارڈ بجایا جا رہا ہے۔ خواہ پنکج ملک گائے یا کالو قوال (مع پارٹی) سننے والے کے لیے ایک ہی بات ہے۔ وہ صرف پاگل کر دینے والا شور سنے گا۔ پنجابیوں کو ایسے خوفناک ہوٹل کھولنے کا خاص سلیقہ ہے جس ہوٹل کا گراموفون یا لاؤڈ سپیکر جتنا ہی زیادہ اونچا اور شوریدہ ہو گا اتنے ہی زیادہ گاہک ادھر کھچے چلے آئیں گے۔

ہم ہوٹلوں کے پاس سے گزرے، خانہ بدوشوں کے خیموں کے پاس سے گذرے جو نوں کوٹ اتنے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ حکومت کے مسافر خانے کے پاس سے گذرے، ریلوے اسٹیشن کے سامنے جا کر اترے، اسٹیشن کے مسافر خانے میں صرف ایک شخص کھڑا تھا اور وہ شخص

ٹکٹ کلکٹر کے پھاٹک پر سے مجھے کچھ مشتبہ اور محتاط اور متجسس آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی موچھیں لمبی اور بالکل سیدھی اور نکیلی تھیں، اور ایک دوسرے سے ۱۸۰ کا زاویہ بنا رہی تھیں ---خط مستقیم کہیئے لیکن "خط" سے موچھوں کے پھیلاؤ پر حرف آتا ہے۔

اب جب سے میں نے ہر دوار میں "لہری سوار" یا اسی قسم کی کسی فلم میں (جسے فضل بک ڈپو کے کسی جاسوسی سنسنی خیز ناول کا فلم ورشن VERSION کہا جاسکتا ہے) ایک سیدھی اور نکیلی موچھوں والے "ویلن" کو دیکھا ہے۔ مجھے سیدھی اور نوکدار موچھوں والوں کے متعلق ایک بد گمانی سی ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل بے ضرر اور شریف آدمی ہوں اور اتنے سادے جتنی ان کی موچھیں مگر مجھے تو وہ چور اور جیب کترے اور ٹھگ اور خونی معلوم ہوتے ہیں۔ میں ایک سیدھی اور نوکدار موچھوں والے آدمی کے ساتھ کسی اندھیری رات کو اپنے گھر سے دس قدم سے زیادہ دور جانے سے ہچکچاؤں گا اور پھر نہ جانے کیا بات ہے کہ اس قسم کی موچھوں والوں کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ وہی لال آنکھیں اور موٹی ناک اور ہونٹوں کے گوشوں میں چمٹی ہوئی گالیاں ---۔ مسافر خانے کا تن تنہا" باشندہ "مجھے عین مین لہری سوار کا شاندار اور پر اسرار ولین لگ رہا تھا۔

ساربان نے میرا بستر اور کتابوں کی گٹھریاں اٹھا کر مسافر خانے میں پہنچا دیں۔ وہ نیچے فرش پر رکھنے لگا تھا مگر لہری سوار کے ولین نے ایک میزبانہ خوش خلقی سے سامان کو پتھر کے بنچ پر رکھنے کے لیے کہا۔ ایک پر اسرار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی۔

میں نے ساربان کو کرایہ دیکر رخصت کیا۔ گٹھری کھول کر کتابیں نکال لیں اور ان کو بستر میں باندھ دیا۔ وہ شخص مجھ میں اور میرے سامان میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا۔ شاید میں اس کے لئے ایک معمہ تھا۔ آخر جب بستر باندھ کر میں نے اس سے وقت پوچھا تو وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف بھاگا "ٹھہریئے میں دیکھ کر آتا ہوں"۔ واپس آکر بولا "ابھی گاڑی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آئے گی۔ آپ شہر میں جا کر کچھ کھاپی آئیے۔ میں آپ کے سامان کا خیال رکھونگا"

مگر میں بچہ نہیں تھا۔ اور لہری سوار فلم میں اس کی چالبازیاں اور کرتوت دیکھ چکا تھا۔ میں ایک برتری کے انداز میں مسکرایا۔ جس طرح ایسے موقعوں پر مسٹر شرلاک ہومز مسکراتا ہوگا

شہر جانے کے ارادے کو فی الحال ملتوی کر کے میں پتھر کے بنچ پر بیٹھ کر "کیٹس" کی "سوانح حیات" پڑھنے لگا۔

OUR ADONAIS HAS DRUNK POISON. OH!

محمد خالد اختر

سعادت حسن منٹو

آزاد مشرب، مضطرب منٹو۔ ایک اور واحد منٹو کی موت سے اردو ادب کی دنیا پر ایک ایسی گھٹاٹوپ افسردگی کا بادل چھا گیا ہے جس کی مثال ہماری پوری یادوں میں مشکل سے ملے گی۔ ادب پیدا کرنے والے پہلے بھی گزرتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ کسی کی موت سے بھی ہم نے اپنے کو اس درجہ غریب اور کم مایہ محسوس نہیں کیا جس قدر اس بوہیمین مصنف کی موت سے۔ نثر کا عظیم زرکار ہم میں سے اٹھ گیا ہے اور اس کے بغیر فن اور انسانیت کی محفل سونی اور ویران ہوگئی ہے — ویسے تو یہ نقصان ساری انسانیت اور ساری ادبی دنیا کا نقصان ہے مگر ہم میں سے کتنوں کے لئے، جو اُسے محض اس کے افسانوں کے ذریعے جانتے تھے، یہ ایک نہایت شدید ذاتی نقصان ہے۔ اتنا ذاتی جتنا ایک بے حد پیارے اور عزیز دوست کا گزر جانا۔ اب بوہیمیا کے پُر تصویر کوچوں میں روشنیاں ماند پڑ گئی ہیں، اور دنیا کو کھونے والے اور اس کے رواجوں کی جکڑبندیوں سے آزاد بوہیمیا کے باسی اپنے استاد، اپنے بادشاہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ تاہم یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ سوگ صرف بوہیمیا والوں کا سوگ نہیں۔ انسان سے محبّت کرنے والے، جھوٹ اور ریاکاری سے نفرت کرنے والے، اردو نثر کے عاشق، سب آج اس بچھڑنے والے مصنّف کے لئے روتے ہیں۔ اُس کے حرف گیر، اُس کی ادبی عظمت کے مُنکر، اُس کی ذات پر اوچھے وار کرنے والے، اُس کی زندگی میں بڑے مصروف رہے۔ انھوں نے اس کے فن کو بڑھئی کی کاریگری سے تشبیہ دے کر اُس کا مذاق اُڑایا۔ وہ بے چارے اِس سے آگاہ نہ تھے کہ اس طرح دراصل وہ اُس کے فن کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے۔ اگر اُس کا فن واقعی کاریگری تھا۔ اگر واقعی یہ اتنا ہی آسان تھا تو وہ خود کوششِ بسیار کے باوجود اس جیسی ایک بھی کہانی کیوں نہ لکھ سکے۔ انھوں نے اُسے فحش نگار کہا اور ایک بہادر مگر درماندۂ روزگار مصنف کی عجیب وارفتہ مزاج زندگی کو دنیاوی عزّت داری کی عینک سے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی ہے۔ وہ خود چاہے نیکی کے پُتلے ہوں مگر انھیں اس انسان کی عظمت کا کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ اُس کی زندگی میں مصروف رہے۔ چُپکے سے، سرگوشیوں میں انھوں نے "گلیورز ٹریولز" کے جانشینوں کی طرح دیو کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھود کر اُسے گرانے کی کوشش کی کہ زندگی میں

وہ اس سے ڈرتے تھے ۔ اب وہ بھی اس کی موت کے سانحے سے سُن ہو گئے ہیں ۔ شاید انھوں نے اس مرے ہوئے "آوارہ مزاج" کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو اب معاف کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے گریبانوں میں جھانک کر اس برائی ، اس کمینگی کی جھلک دیکھ لی ہے جو اُن کے دلوں میں چھپی بیٹھی ہے ۔ ان میں شاید اب ایسا کوئی نہیں جسے اس کی موت سے تھوڑا بہت صدمہ نہ پہنچا ہو گا ۔ انہیں بھی غالباً احساس ہوا ہے کہ یہ موت کوئی معمولی موت نہ تھی اور یہ کہ اس موت سے ہمارے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے جو آسانی سے پُر نہیں ہو سکے گا ۔

ہمارے پاس یقیناً اب بھی الفاظ کی رنگین مصوّری کرنے والے ، رومانیت اور شعریت کے دیئے جلانے والے مصنّف موجود ہیں لیکن مختصر افسانہ نگاری کا استاد ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے ۔ وہ اب پھر نہیں آئے گا ۔ اردو ادب — بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دنیا کا ادب اس کے جانے سے صحیح معنوں میں مفلس ہو گیا ہے ۔ وہ موپاساں اور چیخوف کی صف میں تھا ۔ وہ ان کا ہمسر تھا ۔ شاید بلحاظِ فن ان سے بھی قدآور تھا ۔ وہ اپنی مختصر زندگی میں ہمارے ادبی منظر پر ایک دیو کی طرح چھایا ہوا تھا ۔ سچّے موتیوں کی سی پاک نثر میں وہ اپنے افسانوں سے ہمارے سوئے ہوئے ضمیروں کو کچوکے دیتا تھا ۔ ہماری خود طمانیت اور مصلحت کوشی میں احساس کی سوئیاں چبھوتا تھا اور بار بار ہمیں ایک ایسا مکمل صاف شفاف آئینہ دکھاتا تھا جس میں ہم اپنے اصل روپ کا عکس دیکھنے سے نہ بچ سکتے تھے ۔ وہ ہمیں سوچنے اور ایک بہتر انسان بننے پر مجبور کرتا تھا ۔ اور جب میں ایک بہتر انسان کہتا ہوں تو میری مراد آپ کے سلجھے ہوئے ، کفایت شعار ، مصلحت اندیش انسان سے نہیں ہے جو عموماً اپنی خود غرضی کو اپنی سوجھ بوجھ کا نام دیتا ہے ۔ اور جس کے سامنے اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور ترقی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا ۔ ہمارے ادب میں متشرع نیکی اور مصلحت اندیشی کی تعلیم اور ہدایت ایک سے زیادہ مصنفوں نے دینے کی کوشش کی ہے ۔ اس آشرم کا بڑا پروہت ہمارے ہاں ڈپٹی نذیر احمد ہے جس کے ناول ہمیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم نذیر احمد جیسے بن جائیں ۔ دنیاوی لحاظ سے عزّت دار ، صوم وصلوٰۃ کے پابند ، کفایت شعار اور گانٹھ کے پورے ۔ منٹو کے "بہتر انسان" میں ان اوصاف میں سے کوئی بھی چیز نہیں ، مگر انسانیت کی اصل روح اُس میں موجود ہے ۔ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کا غالباً منہ دیکھنا بھی آج کے ڈپٹی نذیر احمد گوارہ نہ کریں گے ۔ اور اپنے بچوں کو اس کے پاس بٹھانا گناہ سمجھیں گے ۔ منٹو کا "بہتر انسان" اشراف میں سے نہیں ۔ آپ اسے نہ مسجد میں پائیں گے اور نہ ہی غالباً کلب ہاؤس میں ۔ آپ اسے زندگی کی سڑک پر رواں دواں پائیں گے ، اپنے ہم جنسوں سے محبت کرتا ہوا ۔ اپنی زندگی کے خزانے کو ایک کنجوس کی طرح سینے سے لگائے رکھنے کی بجائے ایک سخی کی طرح لٹاتا ہوا ___ سعادت حسن منٹو کسی "ازم" کا مبلغ نہ تھا ۔ اس نے اپنے بے مثل فن کو کسی پرانے زمانے کے

ضابطۂ اخلاق کے تابع کر کے اسے بے جان اور جھوٹا نہیں بنایا تھا اور اگر اس کا کوئی "ازم" تھا، کوئی ضابطہ اور کوئی مسلکِ حیات تھا، جسے وہ شدت سے اپنائے ہوئے تھا، تو یہ مسلک تھا انسانیت سے محبت کا مسلک، اور اس سے بڑا مسلک اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ ایسے آدمی کی موت کتنا بڑا نقصان ہے، خاص طور پر اس لئے کہ وہ ایک بڑا فن کار بھی تھا۔ ہمارا نقصان اس لئے بھی ناقابلِ تلافی ہے کہ منٹو ابھی اپنے فن کی معراج تک نہیں پہنچا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے اور عظیم تر شاہکاروں کو ابھی اس کے قلم سے نکلنا تھا۔ اس کا ذہن شکسپیئر کے ذہن کی طرح زرخیز تھا۔ لاتعداد کرداروں کی جنویں اس میں زندگی سے روشناس ہونے کے لئے تڑپ رہی تھیں اور یہ مکمل اور حساس فن کار ہمیشہ اور ہر لمحے اپنے فن میں تکمیل کے لئے کوشاں تھا۔

جو کچھ اس نے ہمارے ادب کو دیا ہے وہ عظیم اور انمٹ ہے۔ ان لازوال چیزوں میں سے جو ایک بار عالمِ وجود میں آجانے کے بعد زندہ رہتی ہیں۔ اس کے لئے شاہکار لکھنا ایک ایسا ہی معمول تھا جیسا اس کے کئی ہم عصر افسانہ نگاروں کے لئے بے جان اور بیس پھسپھسے افسانے قلم بند کرنا۔ اس کی چیزیں زندہ رہیں گی۔ لیکن جسے اب ہم جیتے جی یاد کرتے رہیں گے، جس کا اب ہم سدا سوگ منائیں گے، وہ انسان سعادت ہے۔ کیسا خوبصورت انسان تھا وہ؟ وہ ساری انسانیت سے بھائیوں کی طرح محبت کرتا تھا۔ دوسروں کے لئے جان دے سکتا تھا۔ خود وہ ایک لحظے کے لئے بھی الجھنوں اور دکھوں سے آزاد نہ ہو سکا۔ ... ہم سب جانتے ہیں اُسے کس چیز نے مارا، مگر نہیں اُس کی قاتل شراب نہ تھی "کوئی تنگی سی تنگی ہے۔ کوئی ترشی سی ترشی ہے۔" اس نے ایک دفعہ چچا سام کے نام ایک خط میں شکایت کی اور وہ تنگی اور ترشی اس کی زندگی میں ایک زندہ ہولناک حقیقت تھی۔ ہم سب جانتے ہیں اُسے بچایا جا سکتا تھا لیکن جب وہ مر رہا تھا، خودکشی کر رہا تھا تو ہم اس کے افسانے پڑھنے اور ان پر تنقیدیں کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس کو بچانے کے لئے ہم نے ایک انگلی تک نہ ہلائی۔ ڈپٹی نذیر احمد ہمارے رگ و ریشے سے ابھی گیا نہ تھا۔ ہمارے دل منٹو کے دل کی طرح بڑے اور فراخ نہ تھے کہ ساری دنیا کو محبت کے بازوؤں میں سمیٹ لیتے۔ وہ شخص سب انسانوں سے پیار کرتا تھا اُس سے کسی کو اس "دو اور دو چار" کی دنیا میں پیار نہ تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے وہ "تنگی اور ترشی" کی نذر ہو گیا۔ تنگی اور ترشی جو اس کے بھائیوں اور ہم جنسوں کی کمینگی اور چھوٹے پن کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ ہم میں سے کتنے ہی اب جب منٹو کے بارے میں سوچتے ہیں، اپنے کو مجرم محسوس کرتے ہیں۔ منٹو کو خود منٹو نے ایک تدریجی خودکشی کے عمل سے مارا۔ تاہم ہم اس کی موت کی ذمہ داری سے خود کو مطمئن ضمیر کے ساتھ بری نہیں کر سکتے۔

"انسان سعادت" جیسا میں اُسے جانتا تھا

جون ۱۹۵۱ء کے گرما میں چند دنوں کے لئے لاہور میں اپنے ایک ناشر دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دنوں منٹو لاہور

میں نیا نیا آیا تھا۔ اور میرا ناشر دوست اس کی چند ایک کتابیں چھاپ رہا تھا۔ منٹو نے اس کے ادارے سے شائع ہونے والے ایک نئے ادبی مجلّے کی ترتیب کے لئے بھی رضامندی ظاہر کی تھی (یہ مجلّہ بڑی آب و تاب سے نکلا مگر دو شماروں کے بعد ہی تجارتی وجوہ کی بنا پر ایک خاموش موت مر گیا) میرا ناشر دوست منٹو سے بڑا متاثر تھا۔ "بڑا پیارا آدمی" "ایشیا کا سب سے عظیم انسان" یہ ان توصیفی القاب میں سے چند تھے جن سے وہ ایک پجاری کی مذہبی وارفتگی سے اپنے ادبی بُت کے سنگھاسن پر چڑھاوے چڑھاتا تھا۔ ایسے القاب کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں اس عمر سے قدرے آگے گذر آیا تھا جب ہر مصنف کا نام اپنے گرد شان اور عظمت کا ہالہ لئے ہوتا ہے۔ میں برتری کے انداز میں اپنے شرمیلے اور جھینپو دوست کی قصیدہ گوئی پر مسکراتا اور اس کے ساتھ چل کر منٹو سے ملنے کے وعدوں کو کل پر ٹالتا جاتا۔

پھر ایک صبح مجھے بتایا گیا کہ "ایشیا کا سب سے بڑا انسان" مجھ سے ملنا چاہتا ہے —— وہ مجھے میرے ایک افسانے کے سلسلے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ہر دوار میں اپنے سفر پر ایک لمبا افسانہ لکھا تھا۔ ہر ایک پچیس سالہ نوجوان لکھنے والے کی طرح مجھے یقین تھا کہ میں نے ایک شاہکار لکھا ہے۔ مگر اُن مدیروں کی رائے جنھیں میں نے اُسے چھاپنے کے لئے بھیجا، میری رائے سے مختلف تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ افسانہ بڑے عرصے تک اشاعت پذیر نہ ہو سکا تھا۔ پھر میں نے اُسے اپنے ناشر دوست کو بھجوایا۔ اس نے اُسے منٹو کو پڑھنے کے لئے دیا۔ منٹو نے اسے پسند کیا مگر وحشیانہ کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت سے اُسے آدھا کر ڈالا۔ کئی ایسے پیروں کے پیروں پر لکیر پھیر دی جو میرے نزدیک بڑے خوبصورت اور سحر انگیز تھے لیکن جو افسانے کی وحدت تاثر میں یقیناً کسی طرح مددگار نہ تھے۔ یہ افسانہ "اردو ادب" (جو میرے دوست کے مجلّے کا نام تھا) میں چھپنے کے لئے چُن لیا گیا۔ لیکن جب میرے دوست نے مجھے لکھا کہ اس کی تھوڑی سی قطع برید کی گئی ہے تو میں نے اپنے افسانے کو ایک نئے روپ میں، مجھے دکھائے بغیر شائع کرنے سے روک دیا۔ افسانے کا مسودہ مجھے بھیجا گیا۔ مجھے فی الواقع بڑا غصہ آیا۔ میرے افسانے کی اس سفاکی سے کانٹ چھانٹ کرنے والا منٹو کون تھا! میں اپنی حماقت میں یہ نہ سوچ سکا کہ یہ کتر بیونت فن کے ایک استاد نے کی تھی اور اس طرح ایک ژولیدہ اور پریشان رپورتاژ سے ایک نادر لطافت اور تاثر کا مختصر افسانہ بن گیا تھا۔ یہ افسانہ بعد میں "کھویا ہوا افق" کے عنوان سے "سویرا" میں چھپا۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ میں شاید اس سے بہتر کہانی کبھی نہ لکھ سکوں گا۔ صرف منٹو کی کانٹ چھانٹ نے اسے ایک کامیاب کہانی بنا دیا۔ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ یہ میری نہیں بلکہ منٹو کی اچھی کہانیوں میں شمار ہو سکتی ہے کیونکہ بات کہنے کی نسبت اسے ان کہا چھوڑنا کہیں بڑا فن ہے۔ سچ ہے کہ چھوٹی سی چیز سے فن میں عظمت آجاتی ہے۔ مگر عظمت کوئی چھوٹی چیز نہیں۔ اور ہمارے بہت سے افسانہ نگار بات کو بہت زیادہ کہہ کر اپنی تخلیقات پیدا نہیں کرتے بلکہ

اُنھیں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیتے ہیں ـــ مگر اُس وقت میں یہ سب کچھ نہ سمجھتا تھا اور مجھے منٹو سے اس کی بے رحم تصنیع کی وجہ سے کافی کدسی تھی اب جب وہ مجھ سے ملنے کا خواہشمند تھا تو مجھے چار و ناچار اپنے دوست کے ہمراہ اس کے ہاں جانا پڑا۔ وہ بال روڈ پر بنگلہ نما مکانوں کے بلاک میں سے ایک تھا۔ وہ اس کی نچلی منزل میں رہتا تھا۔ یہ چھوٹے خوشنما مکان نیم دائرے میں ایک سبز گول باغیچے کو احاطہ کئے ہوئے تھے۔ جگہ یقیناً ایسی تھی جسے انگریزی میں "پاش" کہا جا سکتا تھا۔ اردو کے ایک مصنف کے لئے بہت زیادہ "پاش" جس کی گذر محض اس کی تحریروں پر تھی۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ منٹو غلیظ بالکنیوں والے ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہتا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ برآمدے کے باہر سبز جھلملیوں کی جعفری بھی موجود تھی

میرے دوست کے دستک دینے پر ایک آدمی نے آکر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی جس کا سر بڑا اور گنبد نما تھا اور جس کی آنکھیں اس کے فراخ ماتھے کے نیچے جیسے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ یہ ایک انسان کی آنکھیں نہ تھیں۔ میں نے ایسی عجیب آنکھیں پہلے کسی انسانی چہرے میں نہ دیکھی تھیں۔ یہ آدمی ایک بے عیب، سپید پاجامے اور کرتے میں ملبوس تھا۔ اور اپنے ایک ہاتھ میں ایک کھلا فاؤنٹین پین لئے ہوئے تھا۔ خوشی اور اخلاص کی روشنی چمکی اور اس نے اتنی گرم محبت سے تمتماتا ہوا ہاتھ ملایا کہ اسی وقت میری ساری سرد مہری کا، سارا اجنبیوپن دور ہو گیا۔ تاریک اجنبی دیوار جو دو انسانوں کے درمیان ہوتی ہے پانی کی طرح بیٹھ گئی۔ میں اُسے جانتا تھا، وہ میرا برسوں کا دوست تھا ـــ منٹو لمبے کوچ پر بیٹھ گیا۔ اس پر ایک کاپی بک کھلی رکھی تھی۔ ہمارے آنے سے پیشتر وہ ایک افسانہ لکھنے میں مصروف تھا۔ یہ افسانہ اس کی کہانیوں کے مجموعے "چغد" میں شامل ہے۔ ان دنوں وہ ہر روز ایک افسانہ مکمل کر کے اپنے ناشر کے حوالے کر رہا تھا۔ ایک افسانے کا معاوضہ اسے تیس یا بیس روپے مل جاتے تھے۔ یہ روپے آشفتہ مزاج بوہیمین کے لئے بڑے کام کی شے تھی، ان سے وہ "کافر" حاصل کی جا سکتی تھی جو اس کے منہ سے لگی ہوئی تھی اور جو اس کی "تنگی و ترشی" کے درد کو تسکین دیتی تھی۔ ان سے اس کی بیوی اور پیارے بچے آرام اور فراغت کی گھڑیوں سے ہم کنار ہو سکتے تھے ـــ کمرے میں ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ کاؤچ کے پاس تپائی پر ایک گلدان تھا۔ (اس میں اصلی چمکیلے پھول تھے!) اور ایک ایش ٹرے بھی تھی! ـــ یہ آدمی نازک مزاج اور نفاست پسند ہے میں نے سوچا۔ وہ اپنی زندگی میں بھی اسی نظم اور قرینے کا شیدائی ہے جسے وہ اپنی تخلیقات میں بروئے کار لاتا ہے۔ ہر ایک لفظ تراش سے درست اور اپنی جگہ پر قرینے سے بیٹھا ہوا۔ یہ ایک بڑے مصنف کا کمرہ نہ تھا۔ یہ ایک شہر کے اچھے کھاتے پیتے وکیل یا انسپکٹر نٹنڈنٹ کا کمرہ ہو سکتا تھا۔ ایک مصنف کے کمرے میں آدمی ایک پُر تصویر افراتفری کی توقع کرتا ہے۔ ہر چیز نیچے اوپر، میز پر کاغذوں اور کتابوں کے گڑبڑ انبار، باسی قہوے کے پیالے، فرش پر پیئے ہوئے سگرٹوں کے ٹکڑے۔ بعض عظیم ترین مصنفوں نے ایسے کمروں میں اپنی بڑی کتابیں تخلیق کی ہیں۔ بالزاک ایسے ہی ماحول میں کام کرتا تھا اور اپنے گرد کی بے نظمی میں خوش تھا۔

اسی طرح مجھے یقین ہے دوستوسکی لکھتا تھا جس کا لکھنے کا کمرہ (جب وہ جیل کا حجرہ نہ ہوتا تھا) ایک باقاعدہ پسارخانہ ہوتا تھا.....

اسی طرح بدنظمی اور افراتفری کا حامل ان کا عظیم فن ہے۔ ان کے بڑے ناول الجھے ہوئے، طوفانی اور ناتراشیدہ ہیں۔ اچھی چیزوں سے بھرے ہوئے لیکن بہت کچھ کچرے اور ردّی سے بھی اٹے ہوئے۔ ان میں نظم اور ٹکنیک کا شائبہ نہ تھا۔ ان کے ناولوں کو پڑھنا گویا ایک وسیع کباڑ خانے میں داخل ہونا ہے، جہاں پہلے پہل تو انسان پریشان ہو جاتا ہے، پھر کباڑ کے ڈھیروں میں سے اس کی آنکھ نوادر پر پڑتی ہے۔ اور کیسے عجیب نوادر! پریشانی اور الجھن کے درمیان پڑھنے والے کے دماغ میں لو جل اٹھتی ہے اور اُسے اپنی محنت اور کاوش کا خوبصورت صلہ مل جاتا ہے۔ منٹو اپنے فن میں پھیلاؤ اور بے ترتیبی سے نفرت کرتا تھا یہی نفاست پسندی، نظم اور سلیقے سے محبت وہ اپنے اردگرد کی چیزوں میں پسند کرتا تھا۔ ہر چیز اپنی ٹھیک جگہ پر ہونی چاہئیے۔ ہر شے صاف ستھری ہونی چاہئیے۔ اس کے صفائی اور قرینے کے وہم کے بارے میں میرے ناشر دوست نے مجھے دو ایک دلچسپ باتیں بتا رکھی تھیں۔ اب میں نے خود تجربہ کیا۔ میرے سامنے کوچ پر اپنی سپید لمبی مخروطی انگلیوں میں ایک جلتا ہوا سگریٹ پکڑے اور گائے جیسی بڑی آنکھوں سے دیکھتا ہوا جو بوٹے سے قد کا شخص بیٹھا تھا، وہ اپنی ذات میں بھی ستھرے پن کا قائل تھا۔ اس کے کپڑے سپید اور اجلے تھے، اس کے ایک غیر قدرتی رنگت والے چہرے میں سب سے زیادہ اظہار کرنے والی اور مستحکم اس کی بڑی اُڑتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہ فی الواقع غیر انسانی اور خوفناک تھیں، جنھیں گویا دیوتاؤں نے خصوصیت سے انسانوں کی روحوں میں جھانکنے، ان کی اچھائی اور کمینگی کی عکاسی کرنے کے لئے بنایا تھا۔ میں نے انھیں خوف ناک کہا ہے۔ یہ پوری سچائی نہیں۔ چونکہ یہ "رِپ وین وِنکل" کے گاؤں کی پہاڑیوں کی طرح ہمیشہ ایک ہی رنگ اور یکساں کیفیت کی نہ رہتی تھیں۔ وہ خوشی اور محبت سے بھی لبریز ہو سکتی تھیں۔ اور پھر ان سے خوبصورت اور کوئی آنکھیں نہ ہوتی تھیں، وہ چلبلی ہنستی ہوئی آنکھیں بھی بن جاتی تھیں اور اتنی معصوم بھی جتنی ایک دودھ پیتے بچّے کی آنکھیں..... اور وہ پتھر کی آنکھیں بھی تھیں۔ تلخ اور سرد مہر! میں نے بعد میں اُن کی یہ سب مختلف کیفیات دیکھیں اس کی آنکھ کے بدلنے سے وہ انسان بھی بدل جاتا تھا۔ بعض وقت اتنا مختلف کہ آپ اس کو پہچانتے نہ تھے اور ڈر جاتے تھے۔ مگر اس روز اپنے اس کمرے میں منٹو سے زیادہ پیارا اور میٹھا دوست اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

ہمارے معذرت کرنے پر کہ ہم اس کے کام میں مخل ہوئے ہیں، اس نے خندہ پیشانی سے کہا۔ نہیں بالکل نہیں، اس کے لکھنے میں اس سے کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ افسانے کو اُسی سرے سے پھر شروع کر دے گا جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔ اس نے مسودہ اٹھا کر ہمیں دکھایا، آخری فقرہ ابھی نامکمل تھا۔ وہ موڈ اور الہامی لمحے کا قائل نہ تھا ــــ اس نے کہا کہ رات کو سوتے وقت وہ دوسرے روز کے افسانے کی کہانی کے موضوع کے لئے بڑے ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر

کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ صبح تک اسے کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا اور کیسا افسانہ لکھے گا۔ پھر حجامت بناتے ہوئے یا غسل کرتے ہوئے اُسے کوئی خیال سوجھتا ہے۔ پلاٹ ذہن میں آتا ہے پھر چند کردار اُبھرتے ہیں اور وہ افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہے — پھر لامحالہ کردار خود افسانے کا بیڑا اُٹھا لیتے ہیں۔ منٹو ان کو تخلیق نہیں کرتا۔ وہ اس کی تخلیق کرتے ہیں، وہ اپنے کرداروں کے سامنے بے بس ہوتا ہے — منٹو ہمیشہ یہ بات اپنے دوستوں میں دہراتا تھا مگر اپنے آپ پر "نقوش" میں ایک چھوٹے سے خاکے میں اس نے اقبال کیا کہ یہ محض بکواس ہے — میری رائے میں صداقت ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ منٹو پلاٹ اور کرداروں کو سوچتا تھا مگر ایک دفعہ جان پڑنے کے بعد کردار مصنف کو اپنے ساتھ ساتھ چلاتے تھے اور افسانہ اپنے کو خود لکھتا جاتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوہری کی صناعانہ نگاہ ہار میں پروئے جانے والے ایک ایک ہیرے کو پرکھنے سے بے گانہ ہو جاتی تھی۔ فن کار ہمیشہ چوکس اور ہوشیار رہتا تھا۔ چونکہ وہ جاندار کردار پیدا کر سکتا تھا۔ اور الفاظ کی مصوری کا ماہر تھا۔ یہ کام اس کے لئے نسبتاً سہل تھا۔ لیکن اس کے نقادوں کا اس کے اپنے الفاظ کو پکڑ کر یہ سمجھ لینا کہ اس کا فن سہل تھا بڑا حیرت ناک ہے۔

"اوئے محمد خالد اختر یار" اس نے اٹھ کر میری طرف سگرٹ کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "توں سُنیا اے میرے کولوں خواہ مخواہ بگڑ یا ہویا ایں۔ بھائی مینوں تیری چیز پسند آئی سی۔ میں اس وچ تبدیلی تے کوئی نہیں کیتی۔ صرف کٹ چھٹ کیتی اے۔"

اس کی اس معذرت سے میں شرمسار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مجھے محبت سے کچھ "طنزی" سے دیکھ رہی تھیں —

"نہیں منٹو صاحب! میں ناراض تو نہیں ہوا۔"

"ہن ایہہ چیز زندہ رہے گی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں اسے اچھی طرح نہ جانتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی اس تعریف کا قدرے بُرا مانا۔ یہ آدمی اپنے کو کیا سمجھتا ہے؟

"اچھا ہن ٹھہریں گا نا کچھ دیر۔ میں کل آواں گا۔ تو مینوں بڑا پیارا لگنا ایں —" منٹو نے ہمیں الوداع کرتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے کچے اُدبیر یہ مکمل فتح پالی تھی — یہ منٹو کا ایک چہرہ تھا لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس کے کئی چہرے تھے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں لاہور میں اپنے مختصر قیام کے دوران اس سے کئی بار ملا۔ اُسے میرے لکھنے کی کوشش سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں اس کی بڑی بڑی وحشت ناک آنکھیں میرے اندر نہ جھانک رہی ہوں اور کہیں وہ سچائی کو نہ بھانپ لیں۔ شاید وہ مجھے اپنے کسی افسانے کا کردار بنانا چاہتا ہے۔ میں اس خیال سے کانپتا تھا۔ میں خوش قسمت ہوتا اگر وہ مجھے اپنی کسی کہانی کے کرداروں میں سے ایک بنا لیتا۔ یوں میں جاوداں ہو جاتا۔ وہ انسانی فطرت کا طالب علم تھا۔ اور اس روکھی ریاکار دنیا میں سچے اخلاص کا جویا۔ اس کی مجھ میں دلچسپی بھی زیادہ تر اس لئے تھی۔ پچیس سال کی جوانی خود غرض ہوتی ہے۔ وہ کھلے بازوؤں سے آگے بڑھا۔

میں نذیر احمد اور اس کے مقلدوں کے چند نایاب پند و نصائح پر عمل کرتے ہوئے پیچھے اپنے خول میں سکڑ گیا۔ ان پند و نصائح کے بغیر دنیا رہنے کے لئے سنہری جگہ بن سکتی ہے۔

پہلی ملاقات کے دوسرے روز ہی وہ میرے ناشر دوست کے ہاں مجھ سے ملنے آیا۔ میں اس دن بخار میں اکیلا پڑا تڑپ رہا تھا۔ منٹو نے تقریباً سارا دن میرے پاس گزارا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے میری بیماری کا مذاق اڑایا اور اپنے کرتے کی جیب میں سے برانڈی کی ایک چھوٹی سی بوتل سے مجھے پانچ چھ گھونٹ چڑھا جانے پر مجبور کیا۔ مجھے مجبور کرنے کی خاص ضرورت نہ تھی اور میں نے اچھے لمبے گھونٹ لئے۔ منٹو نے مجھے یقین دلایا کہ اب میں ٹھیک ٹھاک ہو جاؤں گا۔ اسے برانڈی کی چنگا کر دینے والی تاثیر پر مکمل ایمان تھا۔ اسے وہ زکام سے لے کر گنوریا تک سب امراض کے لئے اکسیر سمجھتا تھا۔ اس کی باتیں اب مجھے یاد نہیں رہیں ہاں وہ مجھے بہلانے کے لئے متواتر بولتا رہا۔ اس نے کسی سے ملاقات کا ایک طویل اور قدرے بے سر و پا قصہ شروع کیا جس نے اس وقت مجھے شدت سے بور کیا..... منٹو کی زبان بہکی اور لڑکھڑاتی تھی۔ مگر اس کے دماغ کی صفائی دھندلائی نہ تھی اور اس کی پچھلی گفتگوؤں کی تفصیلات کی یاد کبھی غلطی نہیں کرتی تھی۔ اتنے گھنٹوں تک اس کی باتوں نے مجھے کچھ تھکا دیا۔

دوسرے دن میرے ناشر دوست کے پاس شاید اپنے ایک افسانے کے پیسے مانگنے کے لئے آیا تھا۔ اس دن وہ ایک بدلا ہوا منٹو تھا۔ اس کی آنکھیں پتھر اور برف کی تھیں۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا اور اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ ایک گھنٹے میں اس نے ایک لفظ نہ کہا اور مجھے اس طرح دیکھا جیسے ہم مکمل اجنبی ہوں۔ یہ میرے لئے ایک عجیب اور غیر مرئی تجربہ تھا۔ میں نے سوچا کوئی تاریک قوت اس پر مسلط ہے۔ پیسے لے کر وہ ایک لفظ کہے بغیر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

اسی شام وہ پھر آیا تو بڑے اچھے موڈ میں تھا اور بڑا زندہ دل دوست ثابت ہوا۔ اس سے اگلے دن ہی وہ مجھے اپنے ہمراہ لاہور کی فلمی دنیا کی سیر کرانے لے گیا۔ یہاں اسے ہر کوئی جانتا تھا۔ کئی ڈائرکٹروں اور ایکٹروں کی شادیوں میں اس کا ہاتھ تھا۔ ایک بار میں نے اس کی آنکھوں کو بھڑکتے ہوئے اور اس کے چہرے پر تمتماہٹ کو اچھلتے ہوئے دیکھا۔ ایک فلم اسٹوڈیو میں منٹو سے تعارف کرائے جانے پر ایک ایکٹر نے اس مشہور نام سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ منٹو ہمیں ایک ایسے اسٹوڈیو میں بھی لے گیا جہاں اس کی ایک کہانی فلمائی جا رہی تھی۔ باہر آنے پر میں نے اسے سخت غصّہ کی حالت میں دیکھا۔ اس کا مختصر جسم پتّے کی طرح ہلتا تھا۔ ڈائرکٹر نے اپنے قبیلے کے طور کے مطابق منٹو کی کہانی کو زیادہ "پاپولر" بنا دیا تھا۔ منٹو جلے ہوئے دل سے اسے بے نقط سناتا رہا۔ "اختراع جگر کو اس اے"۔

ایک صبح میرا ناشر دوست مجھے اور منٹو کو اپنے ایک کام کے لئے ہمراہ لے گیا۔ اس نے ہومیو پیتھک کالج کا آغاز کرنے

کی ٹھانی تھی۔ اور وہ نئے وزیرِ صحت و تعلیم سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت کرے۔ وزیر کی کوٹھی پر جاکر منٹو نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا "جاؤ بھئی تسیں وزیراں نوں ملن۔ اسیں ایتھے بیٹھے آں"۔ جب ہم وزیر صاحب سے مل کر باہر آئے تو منٹو ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے اسے ایک فقیرنی کی کٹیا میں سے ہمیں پکارتے ہوئے سنا۔ جہاں وہ بڑے مزے سے اکڑوں بیٹھا انسانی فطرت کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے یہی اس کی عظمت تھی انسانوں میں شدید طور سے دلچسپی کی وجہ سے اس کے تجربے اور تاثرات "فرسٹ ہینڈ" تھے۔ وہ اپنے اُن ہم عصروں کی طرح نہ تھا جو انسانی فطرت کا علم کتابوں سے حاصل کرتے ہیں یا جو اونچے گھوڑوں پر سوار زرق برق راستوں پر سے گزرتے ہیں

انہی دنوں منٹو کے دو خوجے دوست چنیوٹ سے لاہور آئے تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ منٹو نے انہیں کیسے دریافت کر لیا اور وہ اس کے دوست کیوں کر تھے۔ منٹو ان کے متعلق بے حد پُرجوش تھا۔ "اختر" اس نے مجھے کہا "چل تینوں اناں نال ملاواں۔ بڑے مزے دار آدمی نیں"۔ اس نے بتایا کہ دو نو خوجے فلیٹی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ چاندی کا ایک ہاون دستہ لائے تھے اُسے وہ بھنگ گھوٹنے کے لئے استعمال میں لاتے تھے۔ منٹو کے لئے وہ ایسے تھے جیسے ایک بچے کے لئے سونے کا خزانہ۔ وہ انھیں انسانیت کے دو دلچسپ نمونے سمجھتا تھا مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا ذرہ بھر شوق نہ تھا۔ میں منٹو کے ساتھ فلیٹی میں نہ گیا۔ لیکن ایک روز مال روڈ پر بنیاری کی ایک دکان میں ان دونوں کی زیارت نصیب ہو ہی گئی۔ ان میں سے ایک گیروے رنگ کا لاچا اور ایک لمبا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ منٹو ان کی مصاحبت میں تھا اور ان کی صحبت میں بڑا خوش اور مغرور لگتا تھا ــــ وہ فی الواقع زندگی کے کوچوں کا کھلنڈرہ شوخ لڑکا تھا۔ اسی اسکول میں اس نے ہر قسم اور ہر قماش کے لوگوں سے آسانی اور بے تکلفی سے دوست بنا لینے کا فن سیکھا۔ منٹو چنیوٹ کے ان خوجوں پر ایک افسانہ لکھنا چاہتا تھا۔ وہ افسانہ نہ لکھا جا سکا اور خوجے بد قسمتی سے ابدیت کا تمغہ پانے سے بال بال بچ نکلے۔ منٹو کی ایک ہولناک دہلا دینے والی تصویر میرے لوحِ ذہن پر نقش ہے (ان سطروں کو لکھتے وقت بھی وہ تصویر، وہ منظر اصلی زندگی کی طرح میرے سامنے ابھر رہا ہے)

ایک چلچلاتی دوپہر کو میں اور میرے چند دوست تانگے سے مال روڈ کے 'چینیز' کے ریستوران کے سامنے اترے پاس ایک برف بیچنے والے کی دوکان کے سامنے سر پر تولیہ لئے اور لال پتھریلی نگاہوں سے خلا میں دیکھتا ہوا سعادت حسن منٹو کھڑا تھا ــــ آشفتگی اور انسانی تنہائی کی مکمل تصویر۔ اسے اس طرح دیکھ کر ایک چاقو میرے کلیجے میں سے گزر گیا۔ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر میں اس کے پاس گیا ــــ اس نے مجھے کوری انجانی نظروں سے گھورا۔ "میں برف لیناں بیاں" ــــ اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ برف بیچنے والا اپنے شرابی گاہک کو عجیب طرح سے تک رہا تھا (اس بیچارے

کو کیا پتہ تھا کہ اس سے بڑا اور عظیم تر آدمی اس کی دکان پر کبھی نہ آئے گا) منٹو نے برف کی بڑی سل کی سل خریدی - اسے تولیے میں
لپیٹا۔ "جاؤ تسیں، اپنے دوستاں نال چینیز جاؤ - جاؤ تساں۔" اس نے اپنا پتلا لمبا ہاتھ بڑھایا اور تولئے میں لپٹی ہوئی برف
کی سل کو بغل میں دابے وہ تھکے ہوئے بے مقصد قدموں سے "زمزمے" کی طرف چل پڑا - میرا دل چاہا میں اس کے ساتھ جاؤں۔
مگر "چینیز" میں میرے دوست میرا انتظار کر رہے تھے۔

منٹو کی زندگی موپاساں کی ایک کہانی "بیرا، ایک جرعہ اور" کے ہیرو کی طرح خالی اور سونی تھی - وہ ایک ایسے جہاز
کی مانند تھا جس کا لنگر ٹوٹ چکا ہو - اس کے لئے اس پُر آلام دنیا کے سمندر میں کوئی امن کا جزیرہ نہ تھا اور وہ اس خلا کو
سستی تند شراب کے متواتر گھونٹوں سے پُر کرتا تھا — یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ "تنگی و ترشی" تھی یا اس کے ہم جنسوں کی
کمینگی اور خود غرضی جس نے اسے الکحل کے دروازے پر بے بس ڈال دیا - شاید اس کی اپنی (آرٹسٹ کی) تنہائی اس کے
پینے کا سبب تھی۔ الفاظ کی مصوری ایک تھکا دینے والا، خون پی لینے والا کام ہے - اور اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو ہر لمحے ایک
آرٹسٹ تھا - صحیح لفظ کے لئے اس کی کاوش پیہم اور مسلسل تھی - بڑی آنکھیں ہمیشہ دوسرے انسانوں کے دلوں میں غوطے
لگاتی تھیں اور اس کا ذہن بے رحمی سے چھوٹی سے چھوٹی تفصیل محفوظ کرتا جاتا تھا - اس کی یہ عادت بعض دفعہ اس کی
صحبت کو بوجھل بنا دیتی تھی - اس کی صحبت ایک نارمل تجربہ نہ تھا۔

مجھے ۱۹۵۱ء کا وہ عجیب دہشت ناک دن اب تک یاد ہے جس کے خیال سے اب بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو
جاتے ہیں - ایسا دن میری زندگی میں اچھوتا ہے - اس چمکیلے سورج کی دنیا کی بجائے کسی تاریک اور دیوانی دنیا سے اس
کا تعلق معلوم ہوتا ہے - اسی سال کے کرسمس میں ہم کار میں لاہور آئے اور میکلوڈ روڈ پر لاہور ہوٹل میں اترے - ہم تین
دوست تھے - ایک کو میں ایپی کیورس کہوں گا چونکہ وہ اپنے کو بھی ایپی کیورس کہتا تھا اور فلسفیانہ مزاج رکھتا تھا -
دوسرے کا نام پیٹر ہوگا - پیٹر ایک شاعر تھا اور ایک کامریڈ بھی - ہم ایپی کیورس کی کار میں لاہور گلچھڑے اڑانے کے واحد
اور بلند مقصد سے آئے تھے — میں ایک پُرسکون، ٹھنڈے خون کا شخص ہوں۔ گلچھڑے اڑانے کے لئے طبعاً اور جسمانی
لحاظ سے ناموزوں - مگر شوریدہ ایپی کیورس اور پیٹر مجھے زبردستی اپنے ہمراہ گھسیٹ لائے تھے - لاہور، میری طالب
علمی کا لاہور مجھے ہمیشہ ایک پرکشش شہر لگا ہے - یہاں پہونچنے کے بعد دوسرے دن لوہاری دروازہ کے باہر اپنے ناشر
دوست کی دکان پر مجھے بتایا گیا کہ منٹو صاحب میرا اور ایپی کیورس کا انتظار کر کے ابھی ابھی گئے ہیں - میرے ناشر دوست
نے منٹو کو ہماری آمد کی تاریخ سے مطلع کر رکھا تھا۔

ہم وہاں ابھی کھڑے ہی تھے کہ منٹو اور راہی تانگے میں وہاں آ پہنچے - منٹو اترتے ہی ہماری طرف لپکا۔ "اوئے اختر

میں تے بڑے دن دا تیرا انتظار کر ریاں آں ۔ رشید نوں پچھ کتنے چکر لائے نیں۔"

ایچ کیورس اور پیٹر نے اس بلائے ناگہانی کو پسند نہ کیا۔ ان کے دوسرے پروگرام تھے اور اب ظاہر تھا کہ منٹو ان کو نہ چھوڑیگا۔ منٹو نے کہا۔ "آؤ چلئے۔ فیر گھر چلئے۔ پرادھے تے افریقہ اتریا ہویا اے۔" افریقہ! اس کے چند قرابت دار تھے جن کا نیروبی میں کاروبار تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے سے شراب چھلکی پڑ رہی تھی اور اس کی زبان معمول سے زیادہ لڑکھڑاتی تھی۔ منٹو کار میں بیٹھ گیا اور ہم نے لاہور ہوٹل میں جانے کا فیصلہ کیا ۔ "پر یار راہی۔ ساڈا دارو تے ختم ہوگیا۔ او تھے چل کر کراں گے کی۔ چلو لے لیاں گا۔ پر پیسے۔ چلو پیساں دی بھی فکر نہ کر۔" اس نے پیچھے ہماری طرف دیکھا۔ "اپنا خالد جو اے۔ ریاض اے۔ پندرہ روپے تے اناں کولوں نکل آں گے ......"

پندرہ روپے سے ہاتھ دھونے کے خیال نے ہمیں زیادہ خوش نہ کیا۔ "منٹو صاحب" میں نے کہا۔ "آپ کے لئے لاہور ہوٹل میں بلیک اینڈ وہائٹ پڑی ہے۔" پیٹر اپنے ساتھ وہسکی کی ایک بوتل لے کر آیا تھا۔

لاہور ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر منٹو بڑے مزے سے نیچے فرش کی دری پر بیٹھ گیا ۔ "لیا بھئی فیر" ۔۔۔ پیٹر نے بلیک اینڈ وہائٹ کی بوتل کھولی اور اس میں سے شراب ایک گلاس میں انڈیلی ..... منٹو اسے ایک گھونٹ میں چڑھا گیا اسے پیتا دیکھ کر آدمی کو ڈر لگتا تھا۔ جتنا وہ پیتا تھا، اتنا ہی وہ زیادہ پیاسا ہو جاتا تھا۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد پیٹر اس کے لئے گلاس میں وہسکی ڈالتا اور وہ اُسے اپنے اندر ڈال لیتا ۔ اس کی گفتگو لکنت زدہ اور بے ربط تھی ۔ اس کی بڑی بوڑھے ہرن کی سی آنکھیں جو اپنے افق سے بھٹکی ہوئی اور کسی کھوئی چیز کی متلاشی تھیں ۔ اب اپنے اندر ایک چنچل بچے کی مسکراہٹ لئے ہوئے تھیں ۔ کچھ دیر تک وہ میرے ایک ناول کے مسودے کے بارے میں مجھ سے چھیڑ کرتا رہا ۔ "اوے اختر میں تیرا ناول پڑھیا اے ۔ نرا بکواس ۔ بکواس ۔۔۔ وہ ساری گل جس واسطے توں دو سو صفے لخے نیں، چھ صفیاں وچ کہی جا سکدی سی ۔ اوئے تو لکھیا کر پر تھوڑا ۔ تھوڑا ۔۔۔

میں نے اپنے شاہکار کو بکواس کا نام پانے کا ذرا بھی برا نہ منایا ۔ یہ بکواس سہی مگر منٹو نے اسے پڑھا تھا! ہم مسحور اور کچھ سہمے ہوئے اس عجیب آدمی کی بہکتی اور سیانی باتیں سنتے رہے ۔ آنکھیں جلتے انگارے بن گئیں ۔ اس کا ہاتھ رعشہ زدہ ہوگیا ۔ پھر بھی اس نے اپنے ذہن کی صفائی ایک لمحے کے لئے نہ کھوئی ۔ ہمارے لئے یہ ایک وحشت ناک خواب میں سانس لینا تھا۔

وہ کئی ایک بار اٹھا ۔ "چل راہی چلئے ۔ اِناں کرے جانا ہووے گا ۔" وہ ہماری طرف طنزمانہ آنکھوں سے دیکھتا پھر بیٹھ جاتا ۔ "او اُتھے جا کے کی کراں گے ۔ اُتھے افریقہ اترا ہویا اے ۔"

چار گھنٹے کی بادہ نوشی کے بعد اُسے نیند سی آگئی ۔ اور وہ پلنگ پر ایک بچے کی طرح اکٹھا ہو کر اور اپنی بانہہ

کو اپنی آنکھوں پر رکھ کر سو گیا۔ اس پریشان بے قرار نیند سے وہ آدھ آدھ گھنٹے کے بعد بیدار ہوتا اور بستر پر اٹھ بیٹھتا۔ "ٹریژر آئی لینڈ" کے بحری قزاق بلّی جونز کی طرح وہ ہم پر لال آنکھیں گاڑتا اور ہلاکت کی دوا کے ایک اور گلاس کا حکم دیتا۔ ڈر کے مارے ہمیں انکار کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

ایک دفعہ اس نے مجھے اور راہی کیورس کو آواز دی۔ "ایتھے آکے بیٹھ نا یار ــــ" ہم اس کے پاس جا کر بیٹھے کچھ گھبرائے سے کچھ سحر زدہ ..... "اوئے اختر توں بکواس لکھیا اے۔ لکھیا کر لیکن مختصر۔ مختصر۔"

ہم نے اس کی کہانیوں کا کسی طرح ذکر کر دیا۔ وہ غصے میں بھڑک اٹھا۔ ناتواں جسم کپکپانے لگا۔ "بیراذکر چھوڑ دیو" اس نے کہا "میری بات نہ کرو۔" اس نے اپنی ایک انگلی کا قلم بنا کر دوسرے ہاتھ پر لکھنے کا اشارہ کیا۔ "میری بات چھوڑو۔ میں ایک سطر لکھ دوں وہ آرٹ ہے" وہ اپنی انانیت کے موڈ میں تھا۔ ہم سہم کر دبک گئے۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہ کوری شیخی نہ تھی۔ اس کا دعویٰ سو فیصدی درست تھا۔ جو کچھ وہ لکھ دیتا تھا، آرٹ تھا۔

اس کا غصہ فوراً اتر گیا اور اس نے ایک التجا کے لہجے سے کہا۔ "اختر ایس بک بک توں میں نکلنا چاہنا۔ مینوں اپنے نال پہاڑاں تے لے چلو ــــ دور۔ مینوں کڈ لو ایتھوں ....."

میں نے کہا کہ ہم اسے اپنے ساتھ کاغان کی وادی میں لے چلیں گے۔

"مینوں اس بلاتوں دور رکھنا" اس نے وسکی کی بوتل کی سمت اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں آزادی اور کوہستانی ہواؤں کے تخیل سے خواب آلود ہو گئیں۔ اچانک اس کا چہرہ اداس اور سنجیدہ ہو گیا۔ میرے بیوی بچے انہاں واں کی ہوئے گا۔ انہاں واانتظام کرنا پئے گا۔" ایک دفعہ اس نے یہ بھی کہا۔ "میں مرجاؤں گا۔ منٹو مر جائے گا تو اختر تو دی روئیں گا۔ تساں سارے روؤگے۔"

باہر گہری شام پڑنے پر وہ آخر گھر جانے کے لئے اٹھا۔ "چلئے بھئی افریقہ نوں ملیے۔"

میں اسے اور راہی کو نیچے سڑک پر چھوڑنے آیا ..... میکلوڈ روڈ پر نیلے اندھیرے میں تانگوں اور موٹروں کی روشنیاں اچھل رہی تھیں اور زندگی کا "پُر رنگ" اور دلچسپ اور احمقانہ میلہ لگا تھا۔ راہی نے ایک تانگے کو آواز دی۔ منٹو نے مجھ سے اپنا ہاتھ ملایا "اواچھا بھئی اختر ــــ" پھر اچانک اجنبیت اور کھنچاؤ کی رسّی میرے اندر ٹوٹ گئی اور میں نے اس پیارے اکیلے آدمی کو گلے لگا لیا۔

جب میں اسے تانگے میں سوار کرا کے لوٹا تو میری آنکھوں میں انسان کی تنہائی کے المیہ کا خیال کر کے آنسو آگئے۔ میں نے منٹو کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ جب اس کی کہانی "موذیل" چھپی تو میں نے منٹو کو ایک بے حد عقیدت مندانہ اور تعریفی خط لکھا۔ اس قسم کا خط جو ایک چیلا اپنے گرو کو لکھتا ہے۔ میں نے لکھا کہ وہ ایشیا کا یقیناً سب سے بڑا آدمی ہے۔ اس خط

سے اسے خوشی ہوئی اور اس نے مجھے اپنے واحد خط میں جواب دیا کہ میں منٹو کے غبارے میں اتنی ہوا نہ بھروں کہ وہ پھول کر آسمان کی پہنائیوں میں اوجھل ہو جائے۔ اس نے اسی رات کی بات کو دہرایا کہ اس نے اپنے کرداروں کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کے ہر نئے کردار کے بعد ایک نیا منٹو جنم لیتا ہے۔

یہ خط مجھ سے کھو گیا ہے۔ اب اسے حاصل کرنے کے لئے میں کیا کچھ دینے کو تیار نہیں ہوں۔ اس آخری ملاقات کے بعد میں دو تین بار لاہور گیا منٹو سے نہ ملا۔ اس کے لئے میں عمر بھر اپنے کو کوستا رہوں گا۔ اس کی خبریں مجھے ملتی رہتیں، اس کی بیماریاں، اس کے شراب چھوڑنے کی خاطر دماغی ہسپتال میں داخلے۔ اس کی اپنے بیوی اور بچوں کو آرام سے رکھنے کی تند کش مکش۔ مگر پچھلے چار پانچ مہینے سے مجھے اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔

پھر سرما کی ایک سرخ اداس شام — پتے سڑک پر بکھرتے ہوئے اور ایک آندھی چلتی ہوئی۔ اور پیٹر ایک غم زدہ چہرے سے تانگے میں سے چلاتا ہوا اترا۔ "منٹو مر گیا۔"

میں اس وقت گاڑی پکڑنے کے لئے اسٹیشن جا رہا تھا۔ پیٹر مذاق کر رہا ہوگا۔ جس طرح اس کی عادت تھی! مگر اس کے چہرے نے مجھے بتایا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔ میرا دل ڈوبا۔ دنیا گویا اور پریچھی ہو گئی۔ ہم میں سے کتنوں کے لئے زندگی کی لو اس دن بجھ گئی۔

یہ ایک عہد کا اختتام تھا — "عہد سعادت حسن منٹو"۔

"آرٹسٹ منٹو"

"آرٹسٹ منٹو" "انسان سعادت حسن" سے الگ نہ تھا۔ ایک دوسرے کا پرتو اور عکس تھا۔ یہ چیز شاید ہر بڑے فن کار کے بارے میں کافی صداقت سے کہی جا سکتی ہے۔ لیکن منٹو کے بارے میں یہ بات ایک سے زیادہ لحاظ سے سچ تھی۔ اس کے آخری ایک دو سال میں آرٹسٹ اور انسان اس طرح غیر منقسم طور پر گتھ گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے الگ بتانا مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض وقت (جیسا کہ اس کے ایک نقاد دوست نے ایک دفعہ کہا) اس کی صحبت شریف رواجی فطرتوں کے لئے بوجھل ہونے لگتی تھی۔ وہ ہر وقت آرٹسٹ تھا۔ صحیح لفظ کی تلاش اور اپنے فن کی کارفرمائیوں سے اس درجہ بھنکتا ہوا کہ وہ لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا اور وہ اس سے بچ کر اپنی چین بھری سمجھ دار دنیا میں جانے کی خواہش کرنے لگتے۔ شریف دنیادارانہ معیار سے اس کا رویہ، اس کا طریقِ حیات یقیناً "کریکٹش" اور نامناسب تھا اور اس کی صحبت میں سورج اور کھلی ہوا کی کمی تھی۔ ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے وہ زندگی کا ایک ایک لمحہ بھرپور طریق سے جیتا تھا اور جب وہ کسی سے ملتا تو وہ محض رسمی واقفیت پر قانع نہ ہوتا بلکہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ شخص کیا ہے اور یہ چیز بھلے مانسوں کے لئے بڑی پریشان کن ہوتی۔ وہ اپنے اور اپنی کتاب (کل انسانیت اس کی کتاب تھی) کے

درمیان کوئی تکلف اور "اچھے" اخلاق کی دیوار برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے اندر کا آرٹسٹ ہمیشہ ہر ملنے والے کی روح میں جھانکتا رہتا تھا اور یہ پتہ لگاتا رہتا تھا کہ اس میں سونا کتنا ہے اور زنگ آلود لوہا کتنا۔ منٹو ہر لکھے اپنے افسانے خود جیتا تھا اور اس ایک کہانی کے مقابلے میں جسے وہ حقیقتاً لفظوں میں لاتا تھا بیسیوں اس کے ذہن میں ہوتی تھیں۔ میرا خیال ہے اس نے ڈیڑھ سو یا دو سو کے قریب مختصر افسانے لکھے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کئی ہزار افسانے پلاٹ اور کردار دوں سے متعلق اس کے اندر ہی رہے تھے جنہیں وہ نہ لکھ سکا۔ وہ بعض دفعہ بڑا کھرا اور بظاہرا بد اخلاق ہوتا جس کا بے سمجھ ظاہر بیں بُرا مانتے۔ یہ اس کا لوگوں کو کھولنے کا طریقہ تھا۔ ہم سب بند کتابیں ہیں اور دیکھا جائے تو ہمارے بہترین دوست بھی ہمارے متعلق تاریکی میں ہوتے ہیں۔ ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمارا اصل تاریکی میں رہے اور ہماری کمینگی اور غلاظت ان پر آشکارا نہ ہو۔ آرٹسٹ منٹو فوراً آدمی کو بھانپ جاتا تھا اور اس کی فطرت کو لاشعور کے آئینے میں منعکس کر لیتا تھا بوڑھے ہرن کی سی آنکھیں سب کچھ دیکھ لیتی تھیں۔ موپساں میں بھی یہ خداداد خوفناک صفت تھی مگر جہاں عظیم فرانسیسی کو اس کے علم نے فطرت انسانی کے متعلق حد درجہ تلخ اور کسی بنا دیا تھا، منٹو نے آدمی کی کمینگی اور جھوٹ کے باوجود اس سے رشتۂ محبت استوار رکھا۔ سارے انسانوں کا درد اور حزن اس اکیلے بادہ گسار میں تھا اور سب آدمی اس کے اپنے بھائی تھے یہ محبت اور یہ درد اس کے ہر ترشے اور چھانٹے ہوئے افسانے میں نوا سنج ہے۔ اور اس واحد چیز کی بدولت اسے فرانسیسی دیو سے ایک لحاظ سے بڑا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

میں نے لکھا ہے کہ آرٹسٹ اور انسان ایک تھے۔ وہ ایک ضرور تھے لیکن ایک اہم فرق کے ساتھ۔ جہاں انسان سعادت اپنی دنیاوی زندگی میں بے حد جذباتی ہو جاتا تھا۔ احساسات کی انگلیوں کے نیچے ایک طرب آمیز ساز — وہاں آرٹسٹ منٹو سرد اور سخت اور بے رحم تھا۔ آرٹسٹ منٹو برف تھا اور اپنی تخلیقات سے جذبات کے خود رو گنجلک پودوں کو اس سفاکی سے چھانٹتا تھا جیسے ایک محتاط باغبان اپنی کیاریوں پر سے زہریلی بیلوں کو۔ یہ وہ شعوری طور پر ارادتاً نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یہ اس کے لیے قدرتی تھا۔ ایسے کئی مصنف ہیں۔ غالباً بہت زیادہ، جو کسی مقصد میں خلوص کے ساتھ یقین رکھنے کی وجہ سے یا ادبی فیشن کی خاطر جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں آبدار نثری ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اور خوبصورت منظر نگاری کے صفحوں کے صفحے۔ لیکن ان پر مقصدی جذباتیت ایک چیغے کی طرح پڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کو اپنے ہاتھوں ایسے مکمل اور کامیاب طریق سے دفن کرتے ہیں کہ ہزار مسیحا بھی انھیں جِلا نہیں سکتے۔ اور ان کی لکھی ہوئی چیزیں (گو وہ وقتی طور پر بھڑکدار چمکیلا تاثر پیدا کرتی ہیں) پیدائش ہی میں جان دے دیتی ہیں۔ آرٹسٹ منٹو جانتا تھا کہ ایک فن پارے کے لئے مقصدیت اور جذباتیت زہر قاتل ہے۔ ایک تخلیق بہت زیادہ کہی ہوئی باتوں سے مرتی ہے نہ کہ ان کہی باتوں سے۔

اسی لئے وہ بے باکی سے ، بے رحمی سے اختصار کرتا تھا۔ کہانی میں جو فقرہ ہو ، ضروری کا ہو۔ وہ کردار میں دم پھونکے یا کہانی کی سالمیت میں معاونت کرے۔ اگر وہ فقرہ ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں کرتا تو خواہ اس کا خیال کیسا تازہ اور انوکھا ہو، کہانی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کہانی اس کے بغیر بہتر ہو گی۔ منٹو ایک بڑا آرٹسٹ تھا کیونکہ وہ ہم عصروں سے زیادہ قربانی کر سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ "کھول دو" کو اپنی عظیم ترین کہانی سمجھتا ہے کیونکہ اس میں ایک بھی فقرہ زائد نہیں۔ اب "کھول دو" بے حد مختصر، مختصر افسانہ ہے اور شاید مختصر ترین جو منٹو نے لکھا ہے۔ اس کے افسانے کبھی کتابی دس بارہ صفحوں سے لمبے نہیں ہوتے۔

وہ سومرسٹ ماہام کی طرح اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایک مختصر افسانے کا ایک 'شروع' ہونا چاہیئے، ایک 'وسط' اور ایک 'انجام'۔ اس کا واضح طور متعین پلاٹ ہونا چاہئے۔ اگر اس لکھی ہوئی چیز کا 'شروع' اور 'وسط' تو ہے مگر آخیر میں کہانی کسی انجام کو نہیں پہنچتی اور راہ میں لٹکی رہ جاتی ہے تو یہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے۔ 'مختصر افسانہ' نہیں ہو سکتی۔ منٹو اپنی کہانیوں کو صنّاعی سے ایک چونکا دینے والا انجام دیتا تھا۔ اس کی کہانیوں کے انجام یقیناً عظیم ہیں اور ان کا سارا ڈھانچہ ان کے آخری فقروں میں ایستادہ ہے۔ "کھول دو"، "موذیل" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے خاتمے عظیم ہیں اور وہ دنیا کی عظیم ترین کہانیوں میں سے ہیں۔ اس کے حرف گیروں نے اس کی کہانیوں کے ان انجاموں کو محض مداری کے ہاتھوں کی صفائی کہہ کر تمسخر اڑایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا فن زندگی کے مطابق نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے مختصر افسانہ نگاروں کی مانند منٹو اس سچائی کو جانتا تھا کہ فن کبھی زندگی کے مطابق نہیں ہوتا۔ فن زندگی کی عکاسی نہیں ہے جو الجھی ہوتی ہے۔ جس کا کوئی سر پیر نہیں اور جس میں مسلسل تخیل کی گزشتہ تصویر دن، دوستوں کے ساتھ بے رنگ گفتگوؤں اور ایک لامحدود بے منطقی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایک فن پارہ اس کے برعکس ایک مکمل، واضح اور موثر چیز ہے۔ نٹولنس اپنے ایک مضمون میں فن پارے کو اقلیدس کے دائرے کی مانند بتاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ منٹو پہلے اور آخر ایک مختصر افسانہ نگار تھا۔ اس کی کہانیاں اتنی مختصر یعنی کٹی چھنٹی ہیں کہ ایک طرح وہ جسم کے بغیر ہیں اس کی نثر چھوٹے نپے تلے فقروں پر مشتمل ہے اور حیران کن حد تک رنگینی سے دور ہے۔ اس کی لغت بھی ہم عصروں کی نسبت محدود ہے۔ منٹو کا جینئس میری رائے میں ناول لکھنے کے لئے موزوں نہ تھا۔ منٹو کا خیال تھا کہ ناول اس بات کو کئی سو صفحے میں پھیلا کر کہنے کا فن ہے جو پانچ صفحوں میں سمیٹی جا سکتی ہو۔ مسلسل اور لگاتار محنت جو ایک ناول لکھنے کے لئے درکار ہے، منٹو کے مضطرب ذہن کو راس نہ آتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ کوئی ناول شروع کرتا تو چند دن بعد اس سے تنگ آ کر اسے بیچ میں چھوڑ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ بہت کم ایسے ناول ہیں جو زندہ رہ سکتے ہیں۔

اس کے فن کے بارے میں ایک اور نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس نے لامحالہ اپنے کرداروں کو روندے ہوئے

طبقے سے چنا۔ یہ بڑا انسانیت پرست، طوائفوں، ممدو بھائیوں، موذیلوں سے محبت کرتا تھا اور ان کے متعلق لکھتا تھا۔ اب کچھ تو یہ اس وجہ سے تھا کہ اپنی ساری زندگی اس نے سوسائٹی سے دھتکارے ہوئے لوگوں کے ساتھ گذاری۔ وہ اس زندگی کو اپنی ہتھیلی کی مانند جانتا تھا، وہ ان لوگوں سے ملا تھا اور ان سے باتیں کی تھیں۔ لیکن اصل وجہ اور تھی۔ مجھے یقین ہے اسے بڑے آدمیوں اور زندگی کے زرق برق راستوں سے کبید گی تھی۔ اس کے نزدیک وہ بے روح، کھوکھلے اور شیخی خورے تھے۔ وہ دلچسپ نہ تھے اس لئے اس نے اُن کو شاذ و نادر ہی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان عزت دار اشراف کی بجائے اس نے طوائفوں اور غنڈوں اور تانگے والوں کے متعلق لکھا۔ اس نے ان کے اندر کے سونے کو نکالا اور انسانی روح کی عظمت اور خوبصورتی کی ایسی تصویر کھینچی کہ اس کے افسانوں کو پڑھنے والے یقیناً بہتر انسان بن گئے۔ ان کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ آوارہ موذیل تمہاری باعفت، سگھڑ، دیندار خواتین سے کہیں عظیم اور خوبصورت عورت تھی۔ وہ اتنی اچھی اور نیک تھی کہ وہ خود بھی اس کی گرد کو نہ پا سکتے تھے۔ منٹو نے ہمیں انسانوں میں اصلی عظمت سے روشناس کیا۔ اس نے ادب میں دلیری اور بے باکی سے وہ کچھ کیا جو پہلے کسی نے کرنے کی جرأت نہ کی تھی۔ مجھے ان لوگوں کے ہوش و حواس کی سلامتی پر شک ہوتا ہے جو اصرار کرتے ہیں کہ وہ فحش نگار ہے۔ میرا دعوٰی ہے کہ منٹو نے کبھی کوئی فحش کہانی نہیں لکھی۔ کیا "کھول دو" ایک فحش کہانی ہے؟ کیا اس بے مثال تند و تلخ شاہکار کو پڑھنے کے بعد ہم یہ خواہش کرنے لگتے ہیں کہ کاش ہم اس بازیافتہ عورت کو ٹرک میں لانے والے بہادروں کے ساتھ ہوتے؟ اگر ہم یہ خواہش کرنے لگتے ہیں تو فحاشی ہمارے اندر ہے، منٹو میں نہیں۔ منٹو نے تو فحاشی پر اس زمانے میں سب سے دلیرانہ سب سے تیکھا وار کیا ہے۔ "میں ایک سطر لکھدوں، وہ آرٹ ہے۔" ایک فانی ناتواں آدمی کے لئے یقیناً ایک اونچا دعوٰی! مگر حیرانی کی بات ہے کہ یہ کس قدر سچ ہے۔ ایک سطر بھی جو اس نے لکھی آرٹ ہے۔

ایک خط

سو یہ تھا آرٹسٹ منٹو اور انسان سعادت۔ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ دہلی میں ایک شام اس نے منٹو کو ایک بدرو کے کنارے پڑا پایا۔ منٹو نے اسے سرد پتھریلی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے وہاں ہونے کو گویا سمجھانے کی خاطر کہا کہ وہ بدرو میں اچھائیاں ڈھونڈ رہا ہے۔ "اچھائیاں؟" میرے دوست نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں اچھائیاں۔" منٹو نے جواب دیا۔ "لیکن میں بدرو میں غلاظت اور گندگی کے سوا کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں۔ میری زندگی بھی ایک ایسی ہی بدرو ہے اور میرا عارف بیٹا تو ایک ستھری اور آلودگی سے پاک شے تھا۔ اور وہ سات دن پہلے مر چکا ہے۔" جب منٹو نے یہ الفاظ کہے تو اس کا چہرہ روایتی غم و الم سے جامد اور خوفناک ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ زندگی

کی بدروں میں اچھائیاں ڈھونڈتا رہا تھا۔ کوئلوں کے انباروں میں لعل۔ یہ پیہم تلاش اکثر بے سود ہوتی تھی۔ اس جستجو میں اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں۔ وہ کسی گنوائی ہوئی چیز کو ڈھونڈتا معلوم ہوتا تھا۔

وہ یہ کہنے کا مشتاق تھا کہ اگر ایک شخص لکھنا چاہتا ہے تو اسے پڑھنا بالکل نہیں چاہئے۔ کہ اس سے مصنف کی "اوریجنلیٹی" ختم ہو جاتی ہے۔ اسے زندگی کو ایک پرجوش ولولے سے جینا اور زندگی کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہی اس کا اپنا طریقہ تھا اور اس نے عرصے سے پڑھنا ترک کر رکھا تھا۔ وہ گورکی کو بہت بڑا فن کار تصور کرتا تھا۔ کیونکہ گورکی نے اپنا انسانی فطرت کا علم اور اپنا فن لمبی سڑک پر سے حاصل کیا تھا۔ منٹو جانتا تھا کہ کتابیں اصل زندگی کا بالکل بے خون بدل ہیں۔ لائبریریوں میں بیٹھ کر زندگی کا مطالعہ کرنے والے کبھی عظیم فن پیدا نہیں کرتے ..... میری رائے میں سارے اردو ادب میں غالب کی مثال کو چھوڑ کر کوئی اور اس کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ فطرت انسانی کے نباض ہونے کی حیثیت سے وہ شیکسپیر کے پاس جگہ پانے کے لئے نااہل نہیں ہے۔ ممکن ہے کتنوں کو میری یہ مدح سرائی مبالغہ آمیز اور انصاف سے کوسوں دور لگے مگر وقت یہ ثابت کر دے گا کہ منٹو کا فن باقی رہنے والا ہے۔

یہ مثال دینے کے لئے اس کی موت نے سلجھے ہوئے اور حساس ذہنوں پر کیا اثر کیا اور کتنے جذبوں کو ان کے دلوں میں ابھارا، نیچے میں اپنے ایک دوست کا اقتباس تقریباً اسی کے الفاظ میں دیتا ہوں جو اس نے مجھے منٹو کی وفات کے چند دن بعد لکھا۔

"منٹو پر قلم اٹھانا کوئی آسان بات نہیں۔ خاص کر اس کے لئے جو اس بڑے انسان کے متعلق اس قدر کم جانتا ہو۔ اور جو کچھ تھوڑا بہت مجھے اس کے بارے میں علم ہے تمہارے تعارف کی بدولت ہے۔ اس کی موت نے ادبی حلقوں میں غم اور محرومی کی چادر ڈال دی ہے۔ خصوصیت سے ان ناشروں پر جنہوں نے اس کی کتابوں سے ہاتھ رنگے، ان بےچاروں کا ٹکسال بند ہو گیا ہے اور سنہری انڈے دینے والی مرغی اب نہیں رہی۔ بہت سے چوٹی کے اخباروں نے اس خبر پر جلی سیاہ حاشیے چڑھائے، بہت سی سوگواری کی محفلیں جمیں، ریڈیو پر تقریریں کی گئیں، مقالے پڑھے گئے اور پڑھے جائیں گے۔ منٹو یوم منائے جائیں گے، منٹو نمبر نکلیں گے۔ وہی لوگ جن کے نزدیک وہ راندۂ درگاہ اور قابلِ دار تھا اب اچانک اس پر مہربان ہو گئے ہیں۔ اس سب ادبی شور اور ہمدردی کی ظاہرداری کے باوجود بہت تھوڑے ایسے تھے جنہوں نے اس انسان کی پاک روح کو پہچانا۔ یہ سب اونچی اور بلند بانگ باتیں بڑی اور خوش آئند ہیں لیکن اس درد سے بھرے ہوئے انسان کا درد کسے ہے جو اپنے توانا قلم سے فن تخلیق کر دیتا تھا۔ لوگ حالات سے فائدہ اٹھانے میں بے حد طاق تو ہیں۔ لیکن قدرتوں کی طنز دیکھو۔ بالشتیے، ایک دیو کو اپنے حقیر پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ جب میں ان کی باتیں سنتا ہوں تو معاف کرو، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک گھریلو بلونگڑا زرعی اصلاحات پر بولنے لگ جائے۔ کم آدمیوں کو

اس ادبی شمع کے گل ہونے کا افسوس اور درد ہے۔ اور بیشتر جن کے دیئے اس کے سامنے نہ جل سکتے تھے اب اطمینان کا سانس لیں گے۔ دیوا اب نہیں ہے، اس لئے بالشتئے اب اپنی ہستی کا احساس کرا سکتے ہیں۔ تم اس خلا کو محسوس کر سکتے ہو یا وہ عام چھوٹے لوگ جن کا غم گسار اور سچا دوست وہ آشفتہ مزاج انسان تھا۔ ایسی درخشاں، ایسی بے باک زندگی خاتمے کو پہنچ گئی ہے۔ ایسا دلیر، ایسا خوبصورت انسان اپنے بنانے والے کے پاس جا چکا ہے۔ گلیوں کا آوارہ آدمی، عام کچلا ہوا آدمی، دکھ کی خزاں سے ستا ہوا آدمی۔ اب اپنے سب سے بڑے اور پیارے دوست سے محروم ہو چکا ہے۔"

اور اس آخری فقرے کو مرے ہوئے عظیم آدمی پر ہمارا الوداعی سلام بن جانے دو۔ اس سے زیادہ اُسے کوئی اور تعریف خوش نہیں کر سکتی۔ اس سے زیادہ اور کوئی کتبہ اس کے مناسب حال نہیں ہے!

محمد خالد اختر

آپ کا کافی ہاؤس

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ "انڈیا کافی ہاؤس" کے بند ہونے کے کوئی دو ہفتے بعد سونا در میں عبد الغفور لانڈری ورکس کی بغل میں ایک نیا کافی ہاؤس معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اس کافی ہاؤس کی زندگی چراغِ سحری کی طرح بہت مختصر تھی اور یہ ایک کمزور دیے کی مانند چند ہی روز ٹمٹما کر ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔ اس سارے افسوسناک واقعہ میں ایک اہم کردار تھا، شاید آپ اس کافی ہاؤس کی پس پردہ، اصل کہانی سننا چاہیں گے ؟

جب میں ایک روز شام کو چچا عبدالباقی سے گپ شپ کی خاطر اس کے گھر پر گیا تو میں نے اسے ہمیشہ کی طرح اپنے چیک کے سوٹ میں ملبوس صوفے پر دراز "ایوننگ سٹیل" کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔ اس کے چاند جیسے گول بدھ سے چہرے پر ایک قسم کا عرفانی نور پیدا ہو رہا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ اس کا موجب "ایوننگ سٹیل" ہے۔

"بھتیجے" اس نے سامنے کرسی پر اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا بیٹھو! میں تم سے ایک ضروری معاملے میں مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے سنجیدہ انداز اور اس کی آنکھوں کی عجیب روشنی سے میں فوراً جان گیا کہ یہ ضروری معاملہ اس کی روپیہ کمانے کی کسی اور مجنونانہ اسکیم سے متعلق ہوگا، اخبار کے کسی خبر کے مضمون نے اس کے تخیل کو بھڑکا دیا ہوگا اور دولت پیدا کرنے کا کوئی اور طوفانی طریقہ اس کے پُر جدت اور حیران کن دماغ میں آ بسا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس کی ایسی سب اسکیموں کے لئے ایک سرمایہ لگانے والے حصہ دار کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور پچھلے دو تین سال سے وہ سرمایہ دار لامحالہ میں ہوتا رہا ہوں اس لئے چچا کی اس ضروری معاملے میں مجھ سے مشورہ کرنے کی خواہش کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ دنیا میں واحد شخص ہے جو مجھ سے کاروباری معاملے میں یا کسی بھی معاملے پر مشورہ لیتا ہے۔ اور قدرتاً اس سے میرے جذبۂ خود اہمیت کی تسکین ہوتی ہے۔

چچا عبدالباقی نے مجھے اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا "بھئی بختیار! تم نے "ایوننگ سٹیل" میں یہ خبر دیکھی ہے کہ انڈیا کافی ہاؤس بند ہوگیا ہے۔ مینجمنٹ نے اُسے خود بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

میں نے اس خبر کو "ایوننگ سٹیل" میں نہیں پڑھا تھا۔ میں ٹی۔ ایل گلبری کے اخبار کو کم ہی پڑھتا ہوں لیکن بلاشبہ میں کافی ہاؤس کے بند ہونے کے سانحے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس سے مجھے ذاتی دھچکا لگا تھا۔ اور فی الحقیقت میں انڈیا کافی ہاؤس

میں روزانہ جانے والے اور وہاں گھنٹوں بیٹھے رہنے والے "انٹلیکچوئلز" میں سے تھا جو اس کے بند ہو جانے سے اپنے آپ کو ایسے جہازوں کی طرح محسوس کر رہے تھے جن کا لنگر نہ رہا ہو اور جن کو اس سانحے سے جانکاہ صدمہ پہنچا تھا۔ ان سے ان کی امان گاہ اور ان کے ملنے کا اڈہ چھین لیا گیا تھا۔

"ہاں چچا۔" میں نے دلی کرب سے جواب دیا "آج ان کا آخری دن تھا میں ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر ہی آ رہا ہوں۔"

"تم نے یہ بھی پڑھا ہے" چچا نے "ایوننگ سنٹینل" کے پرچے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ٹی۔ ایل گلہری نے اپنے غیب کے کالم میں لکھا ہے کہ حکومت نے کافی ہاؤس کو خود اپنی کارروائی سے بند کیا ہے۔ کیونکہ لمبے بالوں والے سوڈو انٹلیکچوئل اور کمیونسٹ لوگ یہاں کافی کے سستا ہونے کی وجہ سے سارا سارا دن بیٹھے حکومت کے خلاف سازشیں پکاتے رہتے تھے اور لوگوں میں ہراس اور بے اطمینانی پھیلاتے تھے۔ گلہری نے کافی ہاؤس والوں پر یہ الزام بھی تھوپا ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کو کافی کے ساتھ کیشونٹ مہیا نہیں کرتے تھے کیونکہ ہندوستان سے کیشونٹ آنے بند ہو گئے تھے۔ اس کی رائے میں یہ کافی ہاؤس والے ففتھ کالمسٹ تھے۔"

"گلہری کا یہ لکھنا اس کا حد درجہ اوچھا پن ہے" میں نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ "اب جب وہ مجھے کبھی بازار میں جا تا مل گیا تو میں اس پر عملی طور پر واضح کروں گا کہ میری اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ میں . . . . ."

"سو، تمہارا خیال ہے کہ گلہری نے جو کچھ لکھا ہے جھوٹ ہے۔"

"جھوٹ ہے۔ سراسر کمینگی۔ لمبے بالوں والے انٹلیکچوئل! مجھے یقین ہے یہ میرے دوست جمیل پر حملہ ہے جو لمبے بال رکھتا ہے اور جو ہمیشہ کافی ہاؤس میں ملتا تھا۔ یہ گلہری کا ایک اوچھا وار ہے۔ حد درجہ کمینہ وار۔"

"خیر اس کو چھوڑو۔" چچا عبدالباقی نے اخبار کو کرسی پر رکھتے ہوئے اور اپنی چھوٹی ٹانگوں کو سامنے میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں تم سے ایک ضروری بات پر مشورہ کرنا چاہتا ہوں، ابھی ابھی ایوننگ سنٹینل پڑھتے پڑھتے مجھے یہ خیال سوجھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالباً تمہیں روپیہ کمانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے؟" اپنی انوکھی بے مثال روپیہ کمانے والی ترکیبیں پیش کرنے سے پہلے چچا عبدالباقی ہمیشہ مجھ سے یہ سوال کرتا ہے۔ میں جان گیا کہ اب کیا آنے والا ہے۔ ایک دیوانہ پن کی اسکیم، مجھے حصہ دار بننے کی پیشکش۔ ماہنامہ اُلو کے اجرا اور یوگنڈا سے وکٹوریاؤں اور زنانگوں کے لئے زیبروں کی درآمد کی اسکیموں کی حسرتناک ناکامیابی نے مجھے چچا کی اسکیموں کے متعلق محتاط بنا دیا تھا۔ میں نے اب فیصلہ کر لیا کہ اگر چچا کو صرف مشورے کی ضرورت ہے، میں اس کو بخوشی اپنا مشورہ دوں گا لیکن اگر اسے مشورے کے ساتھ سرمایہ لگانے والے حصہ دار کی بھی ضرورت ہے تو آپ کے وہ سرمایہ لگانے والا حصے دار محمد بختیار خلجی نہیں ہوگا۔

چچا عبدالباقی نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ملاتے ہوئے مجھے کچھ بزرگانہ نصیحت دی۔ "ادھر دیکھو بختیار

بھتیجے! تم ابھی بچے ہو، تم ابھی نہیں سمجھ سکتے کہ روپیہ کمانا کس وقت ضروری ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ تم پر اس بات کا ایک بوجھ سا رہتا ہے کہ تم اپنے والد کے روپے پر جی رہے ہو۔ میاں! نوجوان آدمی ہو۔ ہمت کرو۔ کچھ کماؤ۔ روپیہ پیدا کرو۔ روپیہ! جب میرا جیسا شخص تمہیں لاکھ روپے کے مشورے دینے کے لئے موجود ہے تو حیرت کی بات ہے کہ تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے...!"

میں نے روپیہ کمانے کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

"ماہنامہ الّو اور زیبروں کی اسکیم کی ناکامیابی سے مجھے جج نہ کرو" عبدالباقی نے اپنی صفائی کرتے ہوئے کہا۔

"اس میں ہماری بدقسمتی سے ہمیں دوسرے لوگوں نے دھوکا دیا اور تم بھی جلد دل چھوڑ گئے، ورنہ ہماری کامیابی یقینی تھی۔ اس نئی بزنس میں ہم بالکل اپنے آپ پر بھروسہ کریں گے۔ اپنی لائنز پر اسکو چلائیں گے۔ اچھا! پچاس فیصدی منافع میں حصّہ تمہیں غالباً منظور ہوگا، نہیں تو تم پچپن بلکہ ساٹھ فیصدی حصّہ لے سکتے ہو۔ صرف تمہارے کہنے کی دیر ہے۔" عبدالباقی اپنے سرمایہ لگانے والے حصّہ داروں کو ہمیشہ شرائط دینے میں فیاضی دکھاتا ہے۔

"اسکیم کیا ہے۔ سن تو لوں!"

"ویسے پچاس پچاس کی شرکت بالکل منصفانہ ہے اگر تم ساٹھ فیصدی منافع لو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تم زیادہ روپیہ کماؤ گے، مگر تمہارا دل خوش نہ ہوگا، تمہارے ضمیر میں ایک خلش سی رہے گی کہ تم اپنے حصّہ دار سے منصفانہ سلوک نہیں کر رہے ہو۔ مان لیا کہ سرمایہ تمہارا ہوگا لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ مینجمنٹ کی ذمہ داری کلیۃً میری ہوگی اور اس سرمایہ کو دوگنا کرنے کے پیچھے میرا دماغ کام کر رہا ہوگا۔ پچاس پچاس کی شرکت میرے خیال میں بالکل واجب ہے... میں مینجنگ ڈائرکٹر ہوں گا اور تم جنرل منیجر، تمہارے فرائض ہوں گے، جگہ کو ٹپ ٹاپ رکھنا، بیروں کو مختلف میزیں نامزد کرنا، یہ بیرہ ان میزوں پر کام کرے گا اور یہ ان پر، کافی اور کھانڈ کے اسٹاک کو محفوظ رکھنا....."

"کافی اور کھانڈ۔ تمہارا مطلب ہے کہ....."

"ہاں! انڈیا کافی ہاؤس کے بند ہونے کی خبر پڑھ کر مجھے سوجھا ہے کہ یہاں اب ایک نیا کافی ہاؤس خوب کامیاب ہو سکتا ہے۔ وہ سب انٹلیکچوئل اور دوسرے لوگ جو انڈیا کافی ہاؤس میں جایا کرتے تھے ہمارے کافی ہاؤس کو نوازیں گے.... اور ہم ان کو کافی کے ساتھ کیشو نٹ بھی مہیا کریں گے۔ لیکن بھتیجے ہمیں جلدی کرنی ہوگی بیشتر اس کے کہ کوئی اور اس معاملے میں پہل کر ڈالے یا کافی کو زندگی کا لازمہ سمجھنے والے انٹلیکچوئل اس کے بغیر ہی جینے کے عادی ہو جائیں۔"

بہ واقعی ایک معقول اور مضطرب کن تجویز تھی لوگوں کو ان کا کافی ہاؤس واپس ملنا چاہیئے! اچھا عبدالباقی سے اپنی پہلی شرکتوں کی تاریخ کو بھول کر میں سوچنے لگا کہ یہ کافی ہاؤس عجیب چیز ہوگا، ایک شخص کافی ہاؤس میں ساری عمر

خوش خوش گذار سکتا ہے ، یہ چیز بالکل میرے مزاج کے مطابق ہو گی ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ قدرت نے میرے لئے اصل کیریر ہی ایک مقرر کر رکھا تھا ۔ کافی ہاؤس کا بزنس منیجر ، میں اپنی نئی پوزیشن میں اپنے کو متصور کر کے گلابی خواب دیکھنے لگا ۔

میں نے کہا "چچا ! ہندوستان سے کافی درآمد کرنے میں ہمیں دقت ہو گی ۔"

"دقت کیا ہے ؟" چچا عبدالباقی کے لئے ہر چیز سہل ہوتی ہے ۔ "وزیر صنعت بھی میری طرح علیگڑھ کا اولڈ بوائے ہے کل ایوننگ سنٹس میں اس کی زندگی کے مختصر حالات سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی ۔ آخر ایک پرانے علیگرین کا اتنا بھی لحاظ نہ کرے گا کہ کافی کی درآمد کا پرمٹ دینے سے انکار کر دے ، تم اس بات کی فکر نہ کرو ، یہ سب تردّدات عبدالباقی پر چھوڑ دو ۔ اگر بفرضِ محال ہم ہندوستان سے کافی درآمد نہ بھی کر سکیں تو گاہکوں کو ٹین کی کافی مہیا کر کے پلائی جا سکتی ہے ۔ اور اس عرصہ میں یہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم خود سندھ میں تمہارے باپ کے مربعوں میں کافی کی کاشت شروع کر دیں گے ....."

"چچا ! کافی تو صرف پہاڑی ڈھلانوں پر اور مرطوب آب و ہوا میں پیدا ہوتی ہے ۔ سندھ میں ....."

"تت نت !" عبدالباقی نے ایک پرندے کی سی عجیب آواز نکالی "جس زمین میں گندم اور کپاس اُگ سکتی ہے اس میں کیا کچھ نہیں اگایا جا سکتا ۔ ابھی تک کسی نے ادھر کافی کی کاشت کی کوشش ہی نہیں کی ، میرے جو مربعے سندھ میں ہیں اُن میں دو تین ٹیلے بھی ہیں اُن کی ڈھلان پر تجربہ کیا جا سکتا ہے ۔ خیر یہ تو بعد کا سوال ہے پہلے تو ہمیں کافی ہاؤس کے لئے مناسب نام تجویز کرنا ہے ۔"

"نام" میں نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا "کیوں نا چچا تمہارے نام پر اس کا نام باقی کافی ہاؤس رکھ دیا جائے ، باقی اور کافی ہم قافیہ بھی ہیں ۔"

چچا عبدالباقی اس سے بظاہر خوش معلوم ہوتا تھا مگر پھر اس نے کسر نفسی کا اظہار کیا ۔ "نام تو موزوں ہے اور میرے دل میں تمہاری اس عقیدت کی قدر ہے ، مگر میں ابھی اتنا بڑا آدمی نہیں کہ اس عزت کا اہل ہوں ..... اور پھر نام میں جدت ہونی چاہیئے ۔ جدت بزنس میں کامیابی کا پہلا راز ہے ۔ کوئی دوسرا نام ۔"

میں نے اسے کئی دوسرے نام تجویز کئے ۔ پاک کافی ہاؤس ، قائد کافی ہاؤس ، روح افزا کافی ہاؤس ۔ اس نے انہیں پسند نہ کیا ۔

"بسم اللہ کافی ہاؤس ؟"

"یہ کوئی برا نام نہیں ، مگر بزنس کے نظریہ سے اچھا نہیں رہے گا ۔ مولوی طبقہ کافی پینے کا زیادہ عادی نہیں ۔ جیسا کہ تم جانتے ہی ہو ۔"

"آپ کا کافی ہاؤس" میں نے ویسے ہی کہا۔

"بالکل یہی نام ہے" چچا عبدالباقی نے صاد کرتے ہوئے کہا۔" اس نام میں جدت ہے۔ بس اب اللہ کا نام لے کر جنرل مینجر کی حیثیت سے "آپ کا کافی ہاؤس" کے سائن بورڈ کے لئے آرڈر دیدو....."

"مگر چچا جگہ کہاں ہے ؟ اور پھر روپیہ کا سوال ہے۔ میری مالی حالت آج کل بے حد خستہ ہے۔ کل ہی مجھے اپنے ٹیلر کا نوٹس ملا ہے۔"

"روپیہ!" عبدالباقی نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا" اپنے والد کو کہو کہ تمہیں دو ہزار روپے اُدھار دیدے۔ چمڑے کے نرخ ان دنوں تیز رہے ہیں اور اس نے خوب ہاتھ مارے ہوں گے۔ یہ انتظام تم کرو اور باقی رہا جگہ کا سوال، سو جگہ میں دیتا ہوں۔ میرے ایک دوست محمد باقر کی "سونا در" میں آہنی بچوں اور قبضوں وغیرہ کی دوکان ہے جو غالباً گھاٹے میں چل رہی ہے۔ محمد باقر بھی تمہاری ہی طرح میرا بھتیجا ہے۔ چند دنوں سے وہ دوکان کو میرے چارج میں چھوڑ کر منٹگمری اپنے ماموں کی فاتحہ خوانی کے لئے گیا ہوا ہے۔ اس دوکان کے سامان کو فی الحال اٹھوا کر تمہارے فلیٹ میں رکھا جا سکتا ہے اور تم چاہو تو سائڈ لائن کے طور پر ان قبضوں اور پچوں کی فروخت بھی کر سکتے ہو۔ ہم محمد باقر کی فروخت پر دس فیصدی کمیشن چارج کریں گے آخر کمیشن تو ہمارا حق ہے۔ بزنس، بزنس ہے۔"

"اور جب محمد باقر واپسی پر اپنے اسٹور کو کافی ہاؤس میں بدلا ہوا دیکھے گا تو....."

"میں نے اس کی بابت سوچ لیا ہے" چچا عبدالباقی نے اطمینان سے کہا" میں اس کو راہ پر لے آؤں گا۔ آخر اس کی قبضوں کی دوکان منافع پر تو چل نہیں رہی ہے۔ اسے کافی ہاؤس میں دس فیصدی کا شریک بنالیں گے۔ معقول بھلا مانس ہے۔"

ہم نے اس معاملے پر کچھ دیر اور بحث کی اور جب میں اس کے گھر سے باہر نکلا تو میں چچا عبدالباقی کا سرمایہ لگانے والا حصہ دار بننے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مگر قبلہ گاہی سے روپیہ حاصل کرنے کا سوال مجھے فکر مند کر رہا تھا۔

(۲)

میرا باپ ایک شفیق اور بامروّت باپ ہے۔ پھر بھی بوڑھے آدمی سے دو ہزار روپے اگلوانے کا معاملہ ٹیڑھی کھیر تھا اس کے لئے نہایت لطیف اور نازک پیرایۂ اظہار کی ضرورت تھی اور اس کی مشکلات کا اندازہ کچھ وہی نوجوان کر سکتے ہیں جنھیں اپنے والد سے روپے حاصل کرنے پڑتے ہیں، اپنے پہلے بزنس کی کوششوں میں افسوسناک ناکامیابیوں کے بعد میں بوڑھے آدمی کی نگاہوں میں اپنا بھرم کھو بیٹھا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ مجھے روپیہ حوالہ کرنا اسے پدر رو میں بہا دینا برابر ہے۔ مجھے اب کے بڑا پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا اور کئی ایک ڈوریں کھینچنی پڑیں۔

میں نے بوڑھے آدمی کو اپنی نئی بزنس کے بارے میں ذرا بھی اشارہ نہ دیا کہ وہ کس نوعیت کی ہے۔ میں نے اس سے

اس امر کو مخفی رکھا کہ اس کا کافی سے کسی قسم کا تعلق ہے یا یہ کہ چچا عبدالباقی اس میں پچاس پچاس کا شریک ہے (یعنی منافع میں) بوڑھے آدمی کی چچا باقی کی کاروبارانہ صلاحیتوں کے متعلق جو رائے ہے اسے اگر یہاں اس کے اپنے الفاظ میں لکھ دیا جائے تو شاید خوش مذاق پڑھنے والوں کی طبع پر گراں گزرے۔ بہرحال میرے باپ کے عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ جس کاروبار میں چچا عبدالباقی کا ہاتھ ہوگا اس کی سو فیصدی ناکامیابی یقینی امر ہے۔

میں نے اور میری والدہ نے بوڑھے آدمی کو یقین دلایا کہ اس دفعہ میری کامیابی بالکل مسلّم ہے اور کامیابی میں شک کا ذرّہ برابر بھی احتمال نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے آپ کے سب سوچ سمجھ لیا ہے وہ آنکھیں بند کر کے دو ہزار روپے مجھے دیدے۔ صرف دو ہزار روپے، اس سے ایک پائی زیادہ نہیں۔ میں انشاءاللہ تین چار مہینے میں اس روپے کو نگنا بنا لوں گا۔ اور اسے خاطر جمع رکھنا چاہیے کہ یہ دو ہزار روپے اپنے مع سود کے لوٹا دیئے جائیں گے۔ میں نے اس پر واضح کیا کہ یہ دو ہزار میں اس سے بطور قرض حسنہ لوں گا اور دس روپے کے اسٹامپ لگے ہوئے کاغذ پر اقرار نامہ لکھ کر دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دو ہزار روپے مجھے دیدے اور پھر میرے متعلق سب کچھ بھول جائے اور اگر اس کے بعد بھی کسی شخص نے اس سے روپیوں کے لئے کہا تو وہ شخص محمد بختیار خلجی نہ ہوگا....۔

بوڑھے آدمی کا دل پسیجا (وہ فطرتاً نرم دل واقع ہوا ہے) خدا جانے وہ میرے نئے دلائل سے مرعوب ہوا یا نہیں۔ بہرحال اس نے مجھے دو ہزار کا چیک اپنے بنک کے نام سے بھجوا دیا۔ میں نے اسی روز اسے کیش کرایا اور نئے اور روح افزا کاغذ کے کھنکتی ہوئی جیبوں کے ساتھ اور اپنے کو پہلے سے دوگنا محسوس کرتا ہوا میں چچا عبدالباقی کے مکان پر پہنچا تاکہ اسے یہ اچھی خبر سنا دوں۔

دوسرے دن صبح چچا عبدالباقی اور میں سونا دریں محمد باقر کی دوکان پر پہنچے۔ محمد باقر ابھی تک منٹگمری سے نہیں لوٹا تھا، دوکان مقفّل تھی۔ چچا نے اپنی جیب سے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکالا اور بہت سی چابیاں آزمانے کے بعد اسے کھولنے میں کامیاب ہوگیا یہ ایک چھوٹی سی تاریک دوکان تھی جس میں لوہے کے حلقے، قبضے، قفل اور اسی قسم کی زنگ آلود چیزیں بھری پڑی تھیں، آدمی اندر بمشکل داخل ہوسکتا تھا۔ اس دوکان کے دائیں طرف ایک پنساری کی دوکان تھی، بائیں طرف عبدالغفور لانڈری ورکس تھی۔ میرا چہرہ ڈھل گیا اور میرے سارے جوش اور ولولوں پر گویا اوس سی پڑ گئی۔

"تم اس دوکان کو کافی ہاؤس بنانا چاہتے ہو" میں نے چچا عبدالباقی سے کہا۔

"دیکھو نا!" چچا بولا۔ "ذرا ان قبضوں وغیرہ کو باہر اٹھوا لینے دو۔ پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ یہ جگہ کتنی کھلی ہے۔ ایک کیا یہاں تو پورے دو کافی ہاؤس بنائے جا سکتے ہیں۔ یہی ایک کمرہ تو نہیں، اس کے اوپر محمد باقر کا اپنا رہائشی کمرہ بھی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اس کمرے کو بطور کافی روم کے استعمال کیا جائے ۔ یہ تمہارا اسٹینڈرڈ کافی ہاؤس بھی تو دوسری منزل پر تھا؟"

میں اثبات میں کرایا۔

اوپر کا کمرہ بھی تقریباً دوکان جتنا بڑا تھا ۔ لالٹینوں، گٹھریوں اور زنگ آلود لوہے سے ٹھنسا ہوا، اس میں چوہوں کی بو کے ساتھ ایک اور تیز بو رچی ہوئی تھی ۔ سڑے ہوئے پیاز کی بو، عبدالباقی کے دوست کی کھاٹ کے نیچے پیاز کے دو بڑے بڑے گٹھے رکھے تھے اور ایک گھی کا ٹین بھی۔ ایک طاق پر معصالحوں کی پڑیاں اور ڈبے رکھے ہوئے تھے اور دو کتابیں لذت النکاح حصہ اول اور مشہور عالم جنتری اردو ادب کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ ایک کیل سے کھینچنے والے کسرتی اسپرنگ لٹک رہے تھے جنھیں سینہ کش کہا جاتا ہے، کمرے کے ایک کونے میں مگدروں کی جوڑی بھی رکھی تھی۔ اس سب متاع کو دیکھ کر میں محمد باقر کی ذہنی اور جسمانی ہیئت کا تقریباً اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوگا، میرے اندازے نے میرے دل پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا اور کچھ غشی کا سا احساس مجھ پر طاری ہونے لگا، مگدروں کو دیکھ کر میری طبیعت بیٹھنے سی لگتی ہے۔

"تو یہ کنٹونمنٹ فراہم کرنے کے لئے تمہارے پاس خالص گھی کا ٹین بھی موجود ہے" چچا عبدالباقی نے خوشی سے اپنی باچھیں چیرتے ہوئے چارپائی کے نیچے پڑے ہوئے گھی کے ٹین کی طرف اشارہ کیا۔ "فی الحال اس کو استعمال کرو باقر آیا تو اس کو اس کا حساب وغیرہ دے دیں گے۔ میرے خیال میں تو اسے کافی ہاؤس میں تمہارے کا حصہ دار بھی بنانا پڑے گا۔ اس سے کم پر شاید وہ راضی نہ ہو۔"

میں نے چچا کے اس ریمارک کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

۳

فوراً ہی چچا عبدالباقی کی ہدایات کے ماتحت "باقر قیصہ اسٹور" کو کافی ہاؤس میں تبدیل کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ دو اونٹ گاڑیاں کرایہ پر لی گئیں اور دوکان کا کل سامان ۔ قیمتے، قفل، مگدر اور معصالحہ جات کے ڈبے اور کوئی آدھ درجن لحاف ۔ ان میں لد وا کر میرے فلیٹ پر بھجوا دیا گیا، دو تین مزدور دیواروں کو سفیدی کرنے اور جگہ کو صاف کرنے پر لگا دیئے گئے، مجھے خوب بھاگ دوڑ کرنا پڑی اور یہ میری زندگی کا ایک نہایت مصروف دن تھا۔

"عبدالغفور لانڈری ورکس" پر ایک لمبے ناک والا شخص ایک ٹین کی کرسی پر بیٹھا اس ساری کارروائی کو قدرے مشکوک انداز سے تک رہا تھا۔ میں نے قیاس لگایا کہ غالباً خود پروپرائٹر عبدالغفور ہے، اس کا انداز یقیناً دوستانہ نہ تھا اور جب میں اس کی طرف دیکھتا تھا تو میرے دل میں ایک ڈوبنے کا احساس ہونے لگتا۔ وہ غالباً ہمیں چور یا بارگلر وغیرہ سمجھ رہا تھا۔ مگر ہماری دیدہ دلیری نے اسے کچھ کچھ شک میں ڈال دیا تھا۔

دوپہر کے بعد جب میں "باقر قیصہ اسٹور" کا بورڈ اتروا کر "آپ کا کافی ہاؤس" کا نیا بورڈ (جو اسی وقت پینٹر کے یہاں سے آیا تھا) اس کی جگہ لگوا رہا تھا تو میرے کندھے پر ایک ہاتھ پڑا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، میرا رنگ قدرے فق ہوگیا، یہ وہی لمبی ناک

والا عبدالغفور لانڈری ورکس کا پروپرائٹر تھا، اس نے قمیص کی آستینیں چڑھا رکھی تھی۔

"معاف کیجئے" وہ بولا "آپ کون لوگ ہیں؟"

چچا عبدالباقی جو دوکان کے اندر دوسرے کاموں کی نگرانی کر رہا تھا باہر آ گیا۔

"فرمائیے کیا پوچھتے ہیں آپ" چچا عبدالباقی نے اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھ کر عبدالغفور کو نہایت مرعوب کن انداز میں دیکھا۔

"اس دوکان پر آپ نے کس طرح قبضہ کیا ہے؟"

"قبضہ!" عبدالباقی ہنسا۔ "دوکان ہماری اپنی ہے، محمد باقر میرا بھتیجا ہے، ہم اپنے لوہے اور قبضوں کے سامان کو ایک اور دوکان میں منتقل کر رہے ہیں۔ اور اس دوکان کو کافی ہاؤس بنا رہے ہیں ....."

"بھائی باقر جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا تھا کہ میری دوکان پر نگاہ رکھنا، اس لئے میں نے پوچھا تھا۔"

"اور ہم کو وہ دوکان کی چابی دے کر گیا تھا" چچا عبدالباقی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا "اب آپ کی تسلی ہو گئی، آپ اس عبدالغفور لانڈری ورکس کے پروپرائٹر ہیں نا، گرم سوٹ کی دھلائی کیا لیتے ہیں آپ؟؟"

لانڈری ورکس والا چچا عبدالباقی کو دھلائی کے نرخ بتا کر پھر فوراً اپنی دوکان پر چڑھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب کرسی کی پیٹھ ہماری طرف تھی اور اس نے قمیص کی آستینوں کو اتار دیا تھا۔

۴

چچا عبدالباقی غیر ضروری اخراجات سے حتی الامکان احتراز کرتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ بزنس کی کامیابی کا یہ دوسرا راز ہے۔

اس غیر ضروری اخراجات سے بچنے کے لئے چچا کے مشورہ کے مطابق اپنے فلیٹ سے اپنا بیشتر فرنیچر دو دریاں ایک غالیچہ لد واکر "آپ کا کافی ہاؤس" میں لے آیا، میرا فلیٹ اب خالی اور غیر آرام دہ نظر آنے لگا تھا۔ دو کمروں اور چھوٹے سے صحن میں تو "باقر قبضہ اسٹور" کا سامان پھیلا ہوا تھا اور زنگ آلود لوہے کی بو فضا پر طاری و ساری تھی، اس فلیٹ میں رہ کر اب کوئی بھی شخص اپنا دل کا چین قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔

جب میرا اپنا غالیچہ اوپری دوکان کے بالائی کمرے میں بچھا دیا گیا تو چچا عبدالباقی نے ہاتھ ملتے ہوئے اور اپنے آپ کو اپنی حسنِ کارکردگی پر تحسین کرنے کے انداز میں کہا "یہ پہلا کافی ہاؤس ہوگا جس کے کافی روم کے فرش پر غالیچہ ہوگا۔"

نچلی دوکان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، داخلے پر ایک چھوٹا سا کاؤنٹر بنا دیا گیا (چچا ایک سیکنڈ ہینڈ فرنیچر کے ڈیلر سے ایک اسٹول اور ایک اونچا ڈرائنگ ڈسک خرید لایا تھا) ایک پردہ دوکان کے وسط میں لٹکا دیا گیا، اس کے پیچھے باورچی خانے کے لئے چولھے وغیرہ بنوا دئے گئے ..... دس کافی سیٹ جوڑیا بازار سے ایک تھوک فروش سے پہلے ہی روز خرید کئے جا چکے

تھے۔ میں بھی اپنا چائے کا سیٹ فلیٹ سے یہیں لے آیا اور چچا عبدالباقی نے کمال فیاضی سے ایک بے ڈھنگم بینڈ ہینڈل ٹکنے کی چائے دانی اور دودھ کا ایک قدرے شکستہ جگ کافی ہاؤس کو تحفتاً مرحمت فرمائے۔ تازہ کافی مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہم نے بازار سے ایک درجن اسنیس کافی کے ڈبے خرید کر لئے اور کافی بنانے کے لئے میرے اپنے نوکر قادر بخش کو مقرر کر دیا گیا۔ چچا عبدالباقی نے ایک دو گھنٹے قادر بخش کو کافی پر جنرل لیکچر دینے اور اسے یہ سمجھانے پر صرف کئے کہ کافی کے تیار کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور یہ کہ کافی کے بیجوں کو اچھی طرح پیسنا کیوں اس قدر ضروری ہے۔

"مگر چچا" میں نے ٹوکا۔ "ہمارے پاس تو تازہ کافی کے بیج نہیں۔ اس ڈبوں کی کافی کو تو پیسنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بنانے کی ترکیب تو ایسی پیچیدہ نہیں۔"

"میں قادر بخش کو فی الحال کافی پر ایک جنرل لیکچر دے رہا تھا۔ یہ لیکچر اُس وقت اِس کے کام آئے گا جب ہماری اپنی زمین پر تازہ کافی اگنے لگے گی اور ہم یہ ڈبوں کی کافی استعمال نہیں کریں گے۔ اس اسنیس کافی کے بنانے کی ترکیب میں ابھی اس کو سمجھانے ہی والا تھا۔ ذرا مجھے اسنیس کافی کا ایک ڈبہ لا دو۔"

میں نے اسے ایک ڈبہ لا کر دیا اور اس پر لکھی ہوئی ہدایات کو ترجمہ کر کے قادر بخش کو ترکیب سمجھانے لگا۔

ابھی ہمارے گاہک آنے شروع نہیں ہوئے تھے — آپ کا کافی ہاؤس، سفیدی کے باوجود ابھی تک ایک حد درجہ اداس اور منحوس سی جگہ تھی، فینائل کے فیاضانہ استعمال کے باوجود مرے ہوئے چوہوں اور سڑی ہوئی پیاز کی بو ابھی پوری طرح گئی نہ تھی۔ اس جگہ کو کافی ہاؤس میں تبدیل کرنے میں پانچ چھ سو روپے ابھی تک خرچ آچکے تھے اور اب میرے لئے پیچھے ہٹنا ابھی ممکن نہ تھا۔ اس بیل کے منڈھے چڑھنے کے آثار زیادہ روشن نہ تھے۔ مگر چچا عبدالباقی گرم جوش اور اعتماد سے پُر تھا۔

۵

میرا دلی چین اب رخصت ہو گیا۔ شام کو جب میں اپنے فلیٹ پر واپس لوٹتا تو میرے دل پر پرچھائیاں سی چلنے لگتیں۔ یہ رہنے کی ایک شریفانہ جگہ کی بجائے اب ایک زنگ آلود لوہے کے کباڑیئے کا اسٹور بن گیا تھا۔

چچا عبدالباقی کے مشورے سے باقر کی دوکان کا سائن بورڈ اب میرے فلیٹ کے دروازے پر لگا دیا گیا تھا۔ "باقر قبضہ اسٹور"۔ میرا خیال ہے "آپ کا کافی ہاؤس" کو وجود میں آئے ہوئے تیسرا ہی روز تھا کہ میں صبح دس بجے اپنے فلیٹ میں کافی ہاؤس جانے کی تیاری کر رہا تھا کسی نے دروازے پر دستک دی، میں نے جا کر دروازہ کھولا، دستک دینے والا ایک چھوٹا سا بھولا ہوا مینڈک نما شخص تھا، وہ ایک چھوٹا سا سیاہ کوٹ اور ایک گول ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور جس پھرتی سے پان کی جگالی کر رہا تھا وہ واقع تعجب انگیز تھی۔

"تم اس قبضہ اسٹور کا مالک ہے؟" اس نے ساتھ کی دیوار پر دلفریب پچکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں"

"اپنا مال کدھر ہے۔ گوڈان کون بازو میں ہے"

"یہیں اندر ہے" میں نے اشارہ کیا۔

"ہم کو کچھ قبضہ وغیرہ چاہیئے۔ مال نیا ہے یا جونا"

"اندر آ کر دیکھ لیجئے"۔

جس انداز سے وہ شخص اندر داخل ہوا اور جس بے تکلفی سے اس نے میرے غریب خانے کے فرش اور دیوار پر پیک کے بیل بوٹے بنائے۔ اس سے آپ یہ سمجھئے کہ یہ مکان ہی اس کا اپنا ہے۔ اس نے آ کر قبضوں پر نگاہ ڈالی اور کچھ سوچ کر بولا "اپنے کو بیچنا ہے نا"۔

"ارادہ تو یہی ہے" میں نے عبدالباقی کی ہدایات کو یاد کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مال جونا ہے" اس نے دو تین قبضوں کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد سر ہلا کر کہا۔

اس ایک قبضہ اٹھایا "یہ کتنا گراس ہے"۔

اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ دروازوں کے قبضوں کی فروخت سے میرا ابھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ابھی تک مجھے قبضہ خریدنے کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مجھے اس کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ کس نرخ پر فروخت ہوتے ہیں۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس شخص کو پھر شام کو آنے کے لئے کہوں گا۔ اور اب جا کر چچا عبدالباقی سے مشورہ کروں گا کہ ان کو کس بھاؤ پر بیچا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر غالباً یہ خیال کر کے کہ ایک کاروباری آدمی کو سمجھ بوجھ کا ثبوت دینا چاہئے اور میں نے ویسے ہی کہہ دیا — "پانچ آنے"

"پانچ آنہ گراس" اس آدمی نے کہا۔

"پانچ آنہ گراس" میں نے جواب دیا۔

میں نے اسے اپنی طرف سے ایک قبضے کے دام بتائے تھے۔۔۔ اور اب میں اسے گراس کے لئے اپنی زبان دے چکا تھا۔ سکول میں حساب میں خاص طور سے کمزور رہنے کی وجہ سے گراس کے متعلق میرا اندازہ کچھ دھندلا تھا۔ درجن کے متعلق تو مجھے یقین تھا کہ اس میں بارہ ہوتے ہیں۔ مگر گراس؟ — غالباً تین چار۔

اس نے مجھ سے پھر پیچوں، کیلوں اور کنڈوں وغیرہ کے نرخ پوچھے اور میں نے اسے اسی طرح ویسے ہی نرخ بتا دیئے، ان چیزوں کے دام بتاتے وقت میں نے نرخ کچھ اونچے رکھے، کچھ دقفے کے بعد اس شخص نے کہا کہ وہ ابھی ایک منٹ میں آتا ہے۔ دو تین منٹ کے بعد وہ واپس لوٹا، اس دفعہ اس کے ساتھ ایک دوہری ٹھوڑی اور چوبی چہرے والا شخص تھا، ان کے پیچھے پانچ چھ مزدور ٹوکریاں اور تھیلے لئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے نظر انداز کر کے گن گن کر پیچوں اور

قبضوں کو بوریوں میں بھرنے لگے اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ گراس میں بارہ درجن ہوتے ہیں۔ زمین میرے پاؤں سے نکل گئی۔

میں نے بڑبڑانے کی کوشش کی "میں نے ایک درجن کے نرخ بتائے تھے" مگر میرے الفاظ غالباً ناقابلِ سماعت تھے۔

میں خود بھی ان کو اچھی طرح نہیں سن پایا۔

مزدور بوریاں بھر کے نیچے لے گئے اور جلد ہی خالی بوریاں لے کر اوپر آ گئے۔ مختصراً یہ کہ محمد باقر کا تین چوتھائی اسٹور ان دو میمنوں نے پینتالیس روپے کچھ آنے کے عوض خرید لیا، جاتے وقت ایک میمن نے دوسرے کو کہنی ماری اور پہلا میرے صحن کے فرش پر ملمع کاری کرتے ہوئے بولا "ہمارا دوکان اُدھر سامنے ہی میمن مسجد کے بازو میں ہے حاجی حسین بھائی قاسم بھائی۔ تمہارا نیا اسٹاک آئے تو ہم کو بولو۔" اس نے مجھے فیاضی سے ایک بیڑی پیش کی۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے حساب لگایا، پینتالیس روپے میں ہمارا فروخت کا کمیشن دس فیصدی کے حساب سے تقریباً ساڑھے چار روپیہ تھا اس ساڑھے چار روپے میں میں اور چچا پچاس پچاس کے حصہ دار تھے۔

کافی ہاؤس جانے پر جب میں نے چچا عبدالباقی سے باقر کے مال کی فروخت کے متعلق بتایا اور اسے وہ نرخ بتائے جس پہ میں نے مال کو بیچا تھا تو اس نے زیادہ ناخوشی کا اظہار نہ کیا۔ دراصل اسے لوہے کے قبضوں وغیرہ کے بھاؤ کا بھی مطلق اندازہ نہ تھا، مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ اسے بھی یہ معلوم نہ تھا کہ گراس کتنے کا ہوتا ہے، شام کو ایک آہن فروش سے پوچھ گچھ کرنے پر مجھے پتہ چلا کہ میمنوں نے مجھے خوب بے وقوف بنایا تھا اور ڈھائی تین ہزار کا مال ساڑھے پینتالیس روپے میں مارے گئے تھے۔

(۶)

باقر قبضہ اسٹور کو کافی ہاؤس میں تبدیل ہوئے غالباً چوتھا روز تھا، میں کاؤنٹر کے اسٹول پر بیٹھا صبح سے گاہکوں کا انتظار کرتا کرتا تھک گیا تھا۔ میرے لمبے بالوں والے، دبلے، انٹلیکچوئل قسم کے شخص کو جو سامنے سے گذرتا میں پرامید نظروں سے دیکھتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں انھیں اندر آنے کی دعوت دیتا یہ سب لوگ ہمارے بورڈ پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر منھ پرے کی طرف پھیر لیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انٹلیکچوئل حضرات کے لئے اب کافی کا لفظ کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔

تین پیرے جنھیں ہم نے دو روپیہ روز، گاہکوں کے ٹپ میں پچاس پچاس کی شرکت اور کافی کے لامحدود پیالوں پر ملازم رکھا ہوا تھا، بیٹھے اونگھ رہے تھے یا مجھے کچھ تمسخرانہ انداز سے دیکھ رہے تھے اور ان کے اس گستاخانہ انداز نے مجھے اپنے اسٹول پر بے چین کر دیا تھا (یہ ایک اونچا سخت غیر آرام دہ اسٹول تھا۔ اس قسم کا اسٹول جو عموماً ہسپتالوں میں نظر آتا ہے) چچا عبدالباقی ہر پانچویں منٹ اوپر کافی روم سے (جہاں اس نے باقر کے غسل خانے کو اپنا آفس بنا رکھا تھا) اپنے ہاتھ ملتا ہوا اور

چہرے پر ایک نا لطف آمیز پروپرائٹرانہ مسکراہٹ لئے نیچے کاؤنٹر پر آتا اور مجھ سے دریافت کرتا کہ بزنس کیسی ہو رہی ہے، پانچ بجے شام تک چچا اور میں کافی کے پانچ پانچ پیالے پی چکے تھے، ان کے دام ہمارے حساب میں درج کر دیئے گئے کیونکہ انتظامیہ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں یہ طے کیا جا چکا تھا کہ ہم کافی مفت نہیں پئیں گے بلکہ اس کے دام ادا کریں گے، بیروں کو دو دو کافی کے پیالے ان کی خوش طبعی اور آسودہ دلی کو برقرار رکھنے کے لئے ہمارے حساب میں پلائے گئے تھے۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب ایک باریک مونچھوں والا، بلغمی مزاج شخص ایک ہاتھ میں ایک تھیلا اور دوسرے میں ایک ٹوکری اٹھائے اندر آیا۔

میں نے پُرامید میزبانہ خوش خلقی سے کہا "اوپر تشریف لے چلئے، کافی روم اوپر ہے"۔

بیرے تیزی سے اپنی بیزاری کو جھاڑتے ہوئے اٹھے۔

"معاف کیجئے" اس شخص نے تھیلے اور ٹوکری کو اوپر کاؤنٹر پر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں" تھیلے میں لہسن، تھوم، مولیاں اور گاجریں وغیرہ تھیں اور ٹوکری میں سے ایک مرغی اپنی بٹنوں سی گول آنکھوں میں سے باہر جھانک رہی۔

"فرمایئے" میں نے کہا۔ مرغی پھڑ پھڑاتی اور کٹ کٹاتی ہوئی ٹوکری میں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اور مجھے بات کرتے وقت اپنی ایک آنکھ اس طرف رکھنا پڑی۔

"یہ اس دوکان پر آپ نے قبضہ کیسے کیا۔ یہ دوکان تو میرے خالو مولوی محمد باقر کی ہے"۔

"دوکان تو انہی کی ہے" میں نے جواب دیا "صرف اسے قبضہ اسٹور سے کافی ہاؤس بنا دیا گیا ہے، محمد باقر صاحب بھی اس میں ہمارے ساتھ شریک ہیں"۔

"عجیب قصّہ ہے، وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ کل ہی ان کا مجھے منٹگمری سے خط ملا ہے کہ میری دوکان کا خیال رکھنا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے"۔

مرغی ٹوکری کی جالی میں سے آدھی باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ محمد باقر کے بھانجے نے اسے دوبارہ نیچے دبا دیا۔ اتنے میں چچا عبدالباقی اپنے ہاتھ ملتا ہوا مجھ سے بزنس کا حال پوچھنے اور کافی کا ایک پیالہ پینے کے لئے نیچے آیا۔ میری جان میں جان آئی میں نے محمد باقر کے بھانجے کو اس کے حوالے کر دیا۔

"یہ صاحب محمد باقر صاحب کے بھانجے ہیں" میں نے بلغمی مزاج شخص کو چچا سے متعارف کرتے ہوئے کہا۔

"آیئے۔ آیئے۔ آپ باقر صاحب کے بھانجے ہیں" چچا نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیتے کہا۔ آیئے نا! اوپر آفس میں

تشریف لے چلئے۔ بھئی بختیار! دو کافی اوپر بھجواؤ اور دو پلیٹ کیشو نٹ بھی .....''

نو وارد اور چچا اوپر سیڑھیوں پر چڑھنے لگے ۔۔ نو وارد آگے آگے اور مڑ مڑ کر اپنے سبزی کے تھیلے اور مرغی کی طرف نگاہ ڈالتا ہوا اور چچا اس کے پیچھے اس کو اپنے ہاتھ سے سہارا دیتا اور ڈھکیلتا ہوا ۔ میں نے ایک بیرے کو فوراً کافی اور کیشو نٹ اوپر لے جانے کے لئے کہا، باقر کا بھانجا کوئی بیس منٹ اوپر رہا اور میں اس عرصہ میں اس کی مرغی کی حفاظت کرتا رہا جو ٹوکری سے باہر آنے کی بار بار کوشش کر رہی تھی ۔

بیس منٹ بعد بھانجا نیچے آیا، وہ سراپا مسکراہٹ تھا۔ اس کے ہونٹ چکنے تھے اور کیشو نٹ کے دو ذرّے اس کی مونچھوں میں چپکے ہوئے تھے، چچا عبدالباقی سے وہ بار بار ہاتھ ملا رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ وہ اُسے دوکان سے باہر پہنچانے کی زحمت نہ کرے، وہ اس قدر بشّاش اور مطمئن معلوم ہوتا تھا کہ جب وہ میرے سامنے سے گذرا تو اس کی چال ایک خاص قسم کی انگریزی رقص "والترا" سے مشابہ تھی، وہ پہلی بار ناچتا ہوا دوکان کے نیچے اتر گیا اور اپنے تھیلے اور ٹوکری کو میرے کاؤنٹر پر بھول گیا، اسے ان کے لئے واپس آنا پڑا ۔

جب وہ چلا گیا تو چچا عبدالباقی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا "میاں کاروباری آدمی ہو، آدمیوں سے نبٹنا سیکھو، اب دیکھو اس کو منٹوں میں سیدھا کیا ہے، کیسے اطمینان سے گیا ہے، میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ باقر اور ہم نے مل کر یہ کافی ہاؤس کھولا ہے اور یہ کہ اس کے قبضوں کے سامان کی دوکان کو کھار ادر میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ باقر میرا اپنا بھتیجا ہے۔"

چچا عبدالباقی کی پُروقار بزرگانہ شخصیت ہر شخص کو مرعوب اور گرویدہ کر لیتی ہے اور اس کا گول معصوم دوستانہ چہرہ ہر کس و ناکس کا دل جیت لیتا ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

"ذرا اوپر آفس میں آؤ" چچا عبدالباقی نے مجھے ہدایت دی "اب ذرا ہائی لیول پر حصّہ داروں کی میٹنگ ہوگی" جب ہم اوپر چچا کے آفس میں بیٹھ گئے ۔۔ چچا اپنی کرسی میں اور میں سامنے میز کے اوپر ۔۔ تو چچا نے بحیثیت منیجنگ ڈائرکٹر مجھ سے استفسار کیا "آج بزنس پوزیشن کیسی تھی" جیسا کہ وہ خود نہ جانتا ہو ۔

"بارہ کافی کے پیالے بکے ہیں" میں نے جواب دیا "پانچ تم نے پیے ہیں، پانچ میں نے اور دو تم نے بعد میں اوپر باقر کے بھانجے کی تواضع کرنے کے لئے منگوائے تھے، اور ہاں ایک پلیٹ کیشو نٹ بھی ....."

"بزنس کچھ مدّھم ہو رہی ہے" چچا نے اپنی تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا اور اس انداز سے جیسے کہ بزنس کبھی تیز بھی رہی ہو "اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ۔ تمہارے اس قدر دوست، فن کار، ادیب اور آرٹسٹ وغیرہ ہیں ان کو کہا کرو نا کہ یہاں آیا کریں اور دن کا بیشتر حصّہ یہاں گزارا کریں ان کے یہاں آنے سے یہاں کی فضا انٹلیکچوئل ہو جائیگی اور پھر خود بخود لوگ یہاں ٹوٹ پڑیں گے۔"

"میں کوشش کروں گا" میں نے بے دلی سے کہا۔

"اور پھر ہم نے پبلسٹی بھی تو نہیں کی، لوگوں کو پتہ نہیں کہ نیا کافی ہاؤس کہاں ہے، ذرا سوچو محض اس وجہ سے کہ لوگوں کو اس جگہ کا پتہ نہیں آج کتنے آرٹسٹ اور انٹیلکچوئل صدر اور الفنسٹن اسٹریٹ میں بھٹکے بھٹکے اور اداس پھرتے رہے ہوں گے پبلسٹی بڑی ضروری چیز ہے، یہ کاغذ اور قلم لو "ایوننگ سٹینڈرڈ" کے لئے ایک اشتہار لکھو"۔

میں نے کاغذ لے کر چچا کی ڈکٹیشن کے مطابق لکھنا شروع کیا۔

"انڈیا کافی ہاؤس بند ہو گیا، تو آپ مایوس کیوں ہیں، آپ کیوں اداس سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں، آپ کیوں ایسی پناہ کے لئے آہیں بھرتے ہیں جہاں آپ کافی کے ایک مفرّح پیالے میں اپنے آلام اور اپنے غم ڈبو سکیں، جس پناہ گاہ کے آپ متلاشی ہیں وہ آپ کے قریب ہی تو ہے — سونا در میں عبدالغفور لانڈری ورکس کے بالکل بازو میں، یہاں آپ کو شہر میں بہترین کافی ملے گی، یہاں آپ کو خالص گھی میں تلے ہوئے کیٹلیٹ بھی ملیں گے، ہاں کیشونٹ اینیجنگ ڈائرکٹر اور جنرل منیجر دونوں آپ سے خوش خلقی سے پیش آئیں گے۔ دستخط : مینجنگ ڈائرکٹر ایچ۔اے۔باقی

"اس اشتہار کو ابھی ایوننگ سٹینڈرڈ کے دفتر میں بھجوا دو" چچا نے کہا "چوتھائی کالم کے غالباً پچاس پچپن روپے لگیں گے"۔

"پچپن!" میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرا۔ میرے باپ کا قیمتی پسینے سے کمایا ہوا روپیہ بدرَو میں بہایا جا رہا تھا چچا نے مجھے روکا۔

"ہاں ٹھہرو، بھئی بختیار میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ کل آپ کا کافی ہاؤس "کا یوم افتتاحیہ منایا جائے، اس سے خوب پبلسٹی ہو گی — یہ یوم افتتاحیہ کا تو ہمیں خیال ہی نہ آیا تھا، میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی چیز ہم بھول گئے ہیں، اشتہار میں اس کا اعلان بھی کر دیا جائے ..... ہاں یہ بتاؤ افتتاح کس سے کرایا جائے"۔

"کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیئے" میں نے کہا "اگر کوئی منسٹر ہو تو بہت اچھا ہے، وزیر صنعت و حرفت بڑا ناعلیگرین ہے"۔

"وزیر صنعت غالباً آج دورے پر ہے" عبدالباقی بولا "سکھر میں بسکٹ فیکٹری والوں نے ہڑتال کر دی ہے"۔

"اس صورت میں اس کے پارلیمنٹری سکریٹری سے کام چل جائے گا"

"وہ اس کے ساتھ گیا ہو گا"

مجھے خیال سوجھا "افتتاح کے لئے کیوں نہ ہمارے موقر روزناموں کے مدیروں میں سے ایک کو مدعو کر لیا جائے — مثلاً انعام کا مولانا قلندر بخش، ایوننگ سٹینڈرڈ کا ٹی۔ ایل۔ گلہری، تکبیر کا حاجی ....."

"بس ٹی۔ ایل۔ گلہری ٹھیک رہے گا، اشتہار بھی ہم اسی کے اخبار میں دے رہے ہیں، حکومت میں اس کا اچھا رسوخ ہے۔ اور اسے ہاتھ میں رکھنا مفید ہو گا، اچھا اشتہار میں یہ فقرہ بڑھا دو کہ ایوننگ سٹینڈرڈ کے ایڈیٹر مسٹر ٹی۔ ایل۔ گلہری

کل شام کو چھ بجے" آپ کا کافی ہاؤس" کا افتتاح فرمائیں گے، سب کو محبت سے مدعو کیا جاتا ہے۔

"لیکن پہلے ہمیں گلہری سے تو پوچھ لینا چاہیئے" میں نے کہا "فرض کرو وہ انکار کر دے"۔

"یہ مجھ پر چھوڑ دو" چچا عبدالباقی نے اٹھتے ہوئے کہا "یہ اشتہار کا مضمون بھی مجھے دو، میں ابھی سیدھا گلہری کے پاس جاتا ہوں اور اس سے فیصلہ کئے آتا ہوں، کوئی وجہ ہے کہ نہ آئے، آخر ہم اس کی عزت افزائی کر رہے ہیں — اور مجھے اشتہار کے لئے ساٹھ روپے بھی چاہئیں"۔

عبدالباقی اسی وقت ٹیکسی میں "ایوننگ سٹیل مین" کے دفتر کو چلا گیا۔ چچا کی خود اعتمادی اور بشاشت مجھے بھی لگ گئی تھی اور میں اس وقت گانے کے موڈ میں تھا۔ لیکن جس گیت کے بول ابھی میرے ہونٹوں پر تھے عبدالغفور لانڈری ورکس کی طرف نظر دوڑانے سے فوراً ختم ہو گئے، وہی باقر کا بھانجا جو آدھ گھنٹہ پہلے سراپا بشاشت کی تصویر بنا ہوا ہمارے کافی ہاؤس کی سیڑھیوں سے ناچتا ہوا اترا تھا وہاں موجود تھا، وہ اور لمبی ناک والا عبدالغفور جس نے پھر آستین چڑھالی تھی میری طرف قاتلانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چچا عبدالباقی کا کیا ہوا جادو اُتر چکا تھا اور ان کے اصل شبہات پھر عود کر آئے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ باقر کے بھانجے کے فل بوٹوں کے تلووں میں موٹے کیل ٹھکے ہوئے ہیں اور غالباً کسی تحت الشعوری جذبہ کے ماتحت میں اپنا سر کھجانے لگ گیا۔

۷

افتتاحیہ ڈے کے لئے ہمیں کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ چچا عبدالباقی مکان سے اس کے وہ تاریخی صوفے منگوائے گئے جن کے اسپرنگ اب ٹھوس ہو چکے تھے اور جن پر بیٹھنے سے ایک ناخوشگوار تعجب ہوتا تھا۔ ایک وائرلیس کمپنی سے لاؤڈ سپیکر کا انتظام کیا گیا تاکہ بازار میں لوگ افتتاحیہ کارروائی اور مسٹر گلہری کی افتتاحیہ تقریر سننے سے محروم نہ رہ جائیں۔ چچا عبدالباقی کی معزز، پُر وقار شخصیت سے متاثر ہو کر گلہری نے بمعہ اپنی بیوی کے آپ کا کافی ہاؤس میں آنے اور اس کا باقاعدہ افتتاح کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میں چار پانچ گھنٹے اپنے انٹیلیکچوئل دوستوں کے گھروں میں اُن کا کھوج لگاتا پھرا، ہم چاہتے تھے کہ افتتاح پر اچھا خاصا مجمع ہو جائے۔ میرے دوستوں میں سے بیشتر نے عذر داری کی کہ وہ شام کو مصروف ہیں اور افتتاح میں شمولیت نہیں کر سکتے۔ لیکن میرے یقین دلانے پر کہ کافی بالکل مفت ہو گی، انھوں نے میری دوستی کی خاطر اپنی مختلف مصروفیات کو کسی اور دن کے لئے اٹھا رکھا اور آنے کا وعدہ کیا، یہ اچھا ہوا یہ لوگ آگئے ورنہ غالباً مسٹر گلہری کو اپنی افتتاحیہ تقریر صرف منتظمین اور بیروں کے سامنے کرنی پڑتی۔

افتتاح کے وقت سے ذرا پہلے چچا عبدالباقی کو خیال آیا کہ گلہری کے لئے ایک بینڈ بھی ہونا چاہیئے، اتفاق سے پاس ہی کوئی شادی

تھی وہاں سے دو بینڈ والوں کو بڑی منّت سے پندرہ منٹ کے لئے بہلا پھسلا کر لایا گیا، ایک طوطی والا تھا دوسرا چھن چھن بجنے والی تھالیوں والا، انھوں نے آتے ہی دھوم دھام سے اپنا کام شروع کر دیا، ہم گلہری کا ایک باقاعدہ شاہانہ سواگت کرنا چاہتے تھے۔

چھ بج کر پانچ منٹ پر مسٹر گلہری اور مسز گلہری اپنے سر کھڑکی میں سے باہر نکالے آہستہ آہستہ ٹیکسی میں وہاں سے گذرے وہ افتتاحیہ جگہ کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے آگے جا رہے تھے کہ چچا عبدالباقی نے بازو ہلا کر اور ایک نعرہ سا لگا کر ان کو ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ جب گلہری اور مسز گلہری ٹیکسی میں سے اترے ہمارے بینڈ والے "تیرا بند گلو بندی ہے جالو" کا گیت بجا رہے تھے اور چچا اور میں اور میرے آدھ درجن دوست ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے گلہریوں کے استقبال کے لئے تیار تھے۔

افتتاحیہ شام کی کارروائی کی روئداد ہماری منیجمنٹ فائلز میں مکمل طور سے درج ہے۔ یہاں اتنا ہی لکھوں گا کہ ٹی۔ ایل گلہری اپنے استقبال کی وجہ سے بے حد خوش نظر آتا تھا۔ مجھے ایوننگ سنٹینل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اسے دیکھنے کا پہلا اور آخری موقع تھا کیونکہ اس کے بعد جلد ہی "ایوننگ سنٹینل" بند ہو گیا اور گلہری کو کسی جنوبی امریکہ کی ریاست میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔ ٹی۔ ایل گلہری جسمانی طور پر اپنے نام کی توقعات پورا کر رہا تھا اور حیرت ناک طور پر گلہری سے مشابہ تھا، مسز گلہری ایک بھاری جُثّے کی مغلوب کن انگیز عورت تھی، گلہری سے آٹھ دس سال بڑی، اس کا چہرہ دایرزادیوں پر مشتمل تھا۔ صحافتی حلقوں میں مشہور یہ تھا کہ مسٹر گلہری نے اس عورت سے اس لئے شادی کی تھی تاکہ وہ گلہری کے اداریوں کی انگریزی کو صاف اور درست کر سکے "ایوننگ سنٹینل" کے اداریئے عموماً مسز گلہری ہی لکھا کرتی تھی۔

گلہری نے کافی نوش کے بعد اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ اسے اس کافی ہاؤس کا افتتاح کرتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے اور وہ امید کرتا ہے کہ یہ کافی ہاؤس پاکستان کی ثقافتی اور تمدنی ترقی میں ایک قابلِ قدر حصّہ لے گا۔ اس نے چچا عبدالباقی کی انتظامی قابلیت کے متعلق بھی چند الفاظ کہے۔

گلہری نے دوسرے دن اپنے گپ شپ کے کالم میں "آپ کا کافی ہاؤس" کا ذکر کر کے ہمارا حق کافی ادا کر دیا۔ اس نے اپنے اخبار کے پڑھنے والوں سے سفارش کی کہ وہ اس کافی ہاؤس کو پیٹرنائز کریں اور پروپرائٹر کو کافی کے ساتھ کینٹونمنٹ مہیّا کرنے پر سراہا۔ اسی کالم میں وزیرِ خوراک کی توجہ اس کافی ہاؤس کی طرف مبذول کراتے ہوئے اس نے اسے (وزیرِ خوراک) مشورہ دیا کہ ہمیں کافی اور کھانڈ مہیّا کرنے میں پوری دریا دلی سے کام لیا جائے۔ کیونکہ کافی ہاؤس ملک کے تمدن کو ابھارنے میں حکومتوں سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ اس نے اس میں منیجنگ ڈائرکٹر عبدالباقی کے جذبۂ حب الوطنی کی تعریف کی اور تسلیم کیا کہ عبدالباقی صاحب نے ان نامساعد حالات میں ملک کی کلچری بہتری کے لئے ایک نہایت مفید قدم اٹھایا ہے۔ اس کالم کو چار پانچ مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی مجھے اپنا نام کہیں نظر نہ آیا۔

مگر افتتاحیہ ڈے کے باوجود اور مسٹر گلہری کی گپ شپ کے کالم میں پبلک اور حکومت سے سفارش کے باوجود پھر بھی کاروبار مدّہم ہی رہا (سوائے ان پیالوں کے جو چچا باقی اور میں پیتے تھے) مجھے زیادہ کافی پینے سے شب بیداری کی شکایت ہوگئی اور چچا عبدالباقی جو کافی کا عادی نہ تھا اپنے سر اور معدے میں کچھ مبہم آوازیں سننے لگا ہمارا چینی کا اسٹاک بھی تقریباً ختم ہو چلا تھا۔ اب تک ہم اپنے ذاتی راشن کی چینی سے کام چلا رہے تھے، کافی ہاؤس کے لئے چینی کے پرمٹ کی جو ہم نے درخواست دی تھی اس کا کچھ نہیں بنا تھا۔

چچا عبدالباقی کی خوش اعتمادی میں ذرّہ بھر کمی نہ آئی تھی۔

جب میں اپنے دوستوں کو آپ کا کافی ہاؤس میں آکر کافی پینے پہ نہ اکسا سکا تو "ایوننگ سٹیل" میں ایک اشتہار دیا گیا کہ ہم کو چند لمبے بالوں والے انٹیلکچوئل لوگوں کی ضرورت ہے جن کا کام سارا دن کافی ہاؤس میں بیٹھنا ہوگا۔ ان کو مفت کافی اور آٹھ آنہ یومیہ دیا جائے گا۔ چچا کا خیال تھا کہ یہ لوگ ایک طرح تحریص کے دانہ کا کام دیں گے جس سے دوسرے انٹیلکچوئل یہاں رفتہ رفتہ آنے لگیں گے۔ جب سے ٹی۔ ایل گلہری نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں اس کی انتظامیہ قابلیت کی تعریف کی تھی، چچا عبدالباقی کی اپنی کاروباری صلاحیتوں کے لئے رائے پہلے سے دوچند ہوگئی تھی۔

"ایوننگ سٹیل" میں اشتہار کا اثر یہ ہوا کہ اس کے دوسرے روز جب میں کافی ہاؤس پہنچا تو اس کے باہر وحشی آنکھوں اور پھیلے ہوئے متوحش بالوں والے نوجوانوں کا ایک ہجوم تھا، چچا عبدالباقی سارا دن ان سے ایک ایک کرکے اپنے آفس میں انٹرویو کرتا رہا اور بالآخر چار انٹیلکچوئل جن کے بال کمر تک آتے تھے اور جو کالرج کی نظم "کبلاخان" کے شاعر کی طرح شہد آگیں شبنم اور بہشت کے دودھ پر پلے ہوئے معلوم ہوتے تھے منتخب کرلئے گئے۔

ان کے آنے سے یہ ہوا کہ کافی ہاؤس کی رونق بڑھ گئی مگر کافی کی مقدار جو وہ پی سکنے کے اہل تھے واقعی حیران کن تھی، ان میں سے ہر ایک پندرہ بیس پیالے پی جانے کو مذاق سمجھتا تھا (ان میں سے ایک کا تو پہلے روز ہی گھر جاکر انتقال ہوگیا مرحوم نے دو درجن پیالے پی ڈالے تھے)

مجھے یاد ہے جب ہمارے پہلے گاہک آئے، انھوں نے اپنے سائیکل چوکیدار کے پاس چھوڑے (یہ چوکیدار چچا کی دریافتوں میں سے ایک تھا) جب وہ کافی پی کر نیچے اترے تو چوکیدار غائب ہو چکا تھا۔ ان کی سائیکلوں سمیت۔ انھوں نے بڑا ہلڑ مچایا۔ چچا عبدالباقی اور مجھ کو الزام دیا کہ ہم نے خود چوری کروائی ہے... تھوڑی دیر کے بعد کچھ پولیس مین ہاتھوں میں نوٹ بکیں لئے ہوئے آئے اور میرے اور چچا کے پتے اور پچھلی سوانح عمریاں نوٹ کرنے لگے۔

میرے دو ہزار روپے میں سے بارہ سو روپیہ بدرَو میں جا چکا تھا (چار سو تو افتتاحیہ ڈے ہی کی نذر ہوگیا تھا)

چچا عبدالباقی کی بشاشت بدستور قائم تھی۔ مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ "آپ کا کافی ہاؤس" کے معاملات ایک بحران میں پہنچ رہے ہیں اور میں آخری خاتمہ کا انتظار کر رہا تھا۔

۹

آپ کا کافی ہاؤس کو وجود میں آئے بارھواں دن تھا۔ شام کے کوئی چھ بجے ہوں گے اور میں کاؤنٹر کے اسٹول پر بیٹھا بوڑھے آدمی کو خط لکھ رہا تھا کہ میرا بزنس خوب کامیاب ہو رہا ہے مگر اس کو بالکل مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے فقط ایک ہزار روپیہ اور درکار ہوگا۔ چچا عبدالباقی اوپر اپنے آفس میں تھا۔ گاہک کوئی نہ تھا۔ ہاں ہمارے تین ملازم انٹیلیکچوئل نوجوان اوپر کافی روم میں بیٹھے فرائڈ جیمز جوائس وغیرہ پر بحث کر رہے تھے۔ دو بیرے اوپر کافی روم میں تھے، تیسرا غالباً نیچے باورچی خانے میں سو رہا تھا۔

مجھے بازار سے دو آدمی کافی ہاؤس کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے پہلے سمجھا کہ آخر کچھ گاہک آئے لیکن ان کے بشرے اور حلیے کافی پینے والوں سے مختلف تھے ـــ اوہ ان میں سے ایک تو وہی باریک مونچھوں اور کیل دار فل بوٹوں والا باقر کا بھانجا تھا، اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں کے روبرو اندھیرا سا چھانے لگا۔ دوسرا ایک خشخشی داڑھی والا خشم گیں قسم کا آدمی تھا جو اپنے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا کینوس کا بیگ پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے میں ایک لوٹا۔ وہ بظاہر سیدھا ریلوے اسٹیشن سے آ رہا تھا ان کے پیچھے ایک موٹی برقعہ پوش خاتون بھی تھی جو ایک سات سالہ ناخوشگوار لڑکے کا بازو پکڑے ہوئے تھی جیسے اسے روک رہی ہو، مجھے یہ قیاس لگانے میں دیر نہ لگی کہ خشخشی داڑھی والا شخص باقر قبضہ اسٹور کا پروپرائٹر محمد باقر ہے اور برقعہ پوش خاتون اس کی زوجۂ حیات۔ ناخوشگوار منہ والا بچہ یقیناً اس مبارک جوڑے کا لاڈلا بیٹا تھا۔ محمد باقر اور اس کے اہل و عیال نے اسٹیشن سے اترتے ہی ادھر کا رخ کیا تھا۔

خطرے کو پا کر میں سوچ ہی رہا تھا کہ اوپر بھاگ کر چچا عبدالباقی کے آفس میں پناہ کا طالب ہوں کہ وہ سب (عبدالغفور لانڈری ورکس کا پروپرائٹر بھی اب آستین چڑھائے ان کے ساتھ شامل ہو چکا تھا) ڈبل فائل میں طوفانی حملے کی نیت سے دوکان کی طرف بڑھنے لگے، ہراول میں محمد باقر اس کا بھانجا اور عبدالغفور تھے۔ ان کے پیچھے برقعہ پوش خاتون اور وہ کمینہ فطرت لونڈا تھا۔ وہ ایک جرمن ٹینکی دستے کی طرح بڑھ رہے تھے۔ اور ان کا ارادہ دوکان کو ایک برق آسا پہلے حملے میں فتح کرنے کا تھا۔

بھاگنے کا وقت نہ تھا، میں نے جلدی سے ایک بیرے کے ہاتھ اوپر آفس میں چچا عبدالباقی کو ایس۔ او۔ ایس بھیجا۔ میں ابھی ایس۔ او۔ ایس بھیج کر فارغ ہی ہوا تھا کہ مجھے اپنا گلا کچھ کچھ گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے اشیاء کچھ دھندلی

ہو رہی تھیں۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسا میری آنکھوں کا فوکس خراب ہو گیا ہو۔ ان کو فوکس کرنے کے بعد میں نے اپنے سامنے باقر کے بھانجے کو کھڑا دیکھا ... اس کا ہاتھ میری نکٹائی پر تھا اور وہ اسے غصّے میں کھینچ رہا تھا "نابے نواب زادے" وہ کہہ رہا تھا۔ "باہر نکل یہاں سے۔ کہاں ہے وہ تیرا گولا سا منیجنگ ڈائرکٹر ۔ چار سو بیس"۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر گلے کے گھٹنے کی وجہ سے میری آواز غرغراہٹ بن کر رہ گئی ..... میرے ارد گرد ایک محشر کا سا ہنگامہ بپا تھا۔ لانڈری ورکس والا عبدالغفور بیروں کو دھکے مار کر باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا، باقر اپنے لوٹے کو دھمکانے کے انداز میں اپنے اوپر گھما رہا تھا۔ برقعہ پوش خاتون چمچے سے مسلح اِدھر اُدھر ایک غصیلے شیر ببر کی طرح دندنا رہی تھی، باقر کا لونڈا باورچی خانہ میں گھسا ہوا اپنی جیبیں بسکٹوں اور کیشو نٹوں سے ٹھونس رہا تھا۔ ان واقعات کی پوری تفصیل دینا ممکن نہیں، دو تین کرسیاں ہوا میں اڑتی ہوئی میرے پاس سے سفر کرتی ہوئی بازار میں جا گریں۔ ظاہراً مجھ پر نشانہ کیا گیا تھا۔

پھر چچا عبدالباقی کی آواز آئی۔ وہ اوپر سے اتر آیا تھا، وقار اور سرد حوصلے کی پوری تصویر۔

"یہ کیا حرکت ہے" اس نے حاکمانہ لہجے میں پوچھا "بختیار! پولیس کو فون کرو"

میں اس حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ اوّل تو فون ہی نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو اپنی اس موجودہ حالت میں جبکہ باقر کے بھانجے نے ابھی میری نکٹائی کو نہ چھوڑا تھا یہ قطعی ناممکن تھا۔

چچا عبدالباقی نے اب باقر کو پہچانا۔

"بھئی باقر بات تو سنو، مجھے سمجھا تو لینے دو، یوں دوکان کے مال کا نقصان نہ کرو"

برقعہ پوش خاتون چچا عبدالباقی کو بے ایمان، اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے لگی۔ اس نے اپنے چمچے کو ایک غضبناک انداز میں چچا کے سر پر لہرایا، باقر نے چچا کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا جیسے کہ اسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ باقر کا بھانجا آخر میری ٹائی کو چھوڑ کر چچا کی طرف لپکا۔

محمد باقر نے کہا "عبدالباقی تم تو سخت بے ایمان آدمی ہو۔ اچھا میں تمہیں دوکان سونپ گیا، کہاں ہیں میرے تھیلے اور کیل، ڈھائی تین ہزار کا مال"

چچا عبدالباقی نے اسے سمجھانے اور اس کے غصّے کو دھیما کرنے کی کوشش کی، اس نے اسے یہ بھی خوشخبری دی کہ اس کا کافی ہاؤس میں ایک تہائی کا حصّہ ہے۔ جس پر محمد باقر نے کہا "کافی ہاؤس کی ایسی کی تیسی"۔ اس نے کافی ہاؤس اور ہمارے متعلق اور بھی ایسے کلمات کہے جنھیں چھاپا نہیں جا سکتا۔

"اچھا میرا ڈھائی تین ہزار کا مال کہاں ہے" محمد باقر نے پوچھا۔

چچا عبدالباقی نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے اور اپنے چشموں میں سے خوش طبعی کو منتشر کرتے ہوئے کہا۔ "فروخت ہوگیا۔"

"فروخت ہوگیا، سارا مال؟" محمد باقر گرجا۔

چچا نے میری طرف اشارہ کیا۔ "میاں بختیار نے تمہارا مال چند ہی دن ہوئے فروخت کر دیا۔ اس کی ہمّت ہے۔ تمہاری دوکان میں تو یہ ایک سال سے پڑا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ فروخت پر دس فیصدی کمیشن چارج کریں گے۔ اگر تمہاری مرضی نہ ہوئی تو نہ کریں گے۔ بھئی بختیار! محمد باقر کے مال کے سینتالیس روپے آٹھ آنے ان کے حوالے کر دو۔

"سینتالیس روپے آٹھ آنے"۔ باقر چلاّیا۔ "میرا ڈھائی ہزار کا مال"

اس نے میری طرف دیکھا۔ "بچّہ! میں تمہارے فرشتوں سے بھی تین ہزار وصول کر لوں گا۔ بھانجے ذرا اس سینتالیس روپے میں میرا مال بیچنے والے کو ٹائی سے کھینچ کر باہر نکال، ذرا اس کی شکل تو اچھی طرح دیکھیں۔

چچا عبدالباقی اور میری باقر کے بھانجے اور عبدالغفور کے ہاتھوں جو درگت بنی اور جو غیر شائستہ سلوک ہمارے ساتھ کیا گیا اس کا ذکر یہاں کرنا میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ چچا کی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹا، میرے اپنے دو دانت شہید ہوئے، ہم دونوں کو اوپر آفس میں چار گھنٹے محبوس رکھا گیا..... بڑی مشکل سے ایک اقرار نامے پر دستخط کرنے کے بعد کہ ہم محمد باقر کو اس کی دوکان پر ناجائز قبضہ کرنے کے عوض ہرجانہ کے طور پر ڈیڑھ ہزار روپیہ دیں گے اور یہاں سے اپنی کوئی چیز (از قسم فرنیچر وغیرہ) نہیں لے جائیں گے، ہماری جان چھوٹی، ہم نے کافی ہاؤس کو خیرباد کہا۔

باقر نے اپنی اس رقم کی پائی پائی وصول کی، اور میرا والد جس کو یہ رقم ادا کرنی پڑی اس کے بعد عرصے تک مجھ سے ناراض رہا۔

اگلے روز جب میں چچا عبدالباقی سے ملنے گیا تو اس کی عینک میں نیا شیشہ تھا۔ "بیٹھو بختیار! میں تم سے ایک ضروری معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس دفعہ تو ہمارا کاروبار چل پڑا تھا۔ گلہری نے بھی حکومت سے ہماری سفارش کر دی تھی، گاہک بھی ایک دو دن میں آنے لگتے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم صحیح لائنز پر کام کر رہے تھے، محمد باقر نے اپنے نامعقول رویہ سے ہمیں سخت نقصان پہنچایا خیر اس کو چھوڑو۔ میں تم سے پھر ایک ضروری معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں....."

محمد خالد اختر

مچھلیاں اور عبد الباقی

"دراصل بھتیجے ۔۔۔ مجھے جو دقت رہی ہے وہ یہ کہ مجھے ایسے حصہ دار نہیں ملتے رہے جن میں سرمایہ لگانے کا حوصلہ ہو ۔۔۔۔۔۔ ورنہ بزنس میگنیٹ بننا کونسی مشکل چیز ہے ۔ ایک سگریٹ تو پلاؤ" ۔

چچا عبد الباقی اور میں ایک سنہری شام وکٹوریہ روڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے ۔ چچا اپنے حصہ داروں کی خساست پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا ۔ ہم کو اپنے پچھلے مشترکہ کاروبار میں ۔۔۔ (جس کا تعلق غالباً پرانے ٹکٹوں کی فروخت سے تھا اور جس میں چچا عبد الباقی، اس کا دس سالہ بیٹا عبد الرحمن اور میں برابر کے حصہ دار تھے) بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا ۔ اس کے بعد سے ہمارے تعلقات قدرے کشیدہ ہو گئے تھے ۔ چچا عبد الباقی کا اپنے حصہ داروں کی خساست کا ذکر مجھے ایک نرم گوشے میں چبھونے کی خاطر تھا ۔

اس نے مجھے اپنی صفائی کرنے کی مہلت نہ دیتے ہوئے اپنی تقریر کو جاری رکھا ۔

"ورنہ" اس نے سگریٹ پر لمبے پر اطمینان کش لیے ۔ "ورنہ بھئی بختیار میں بڑے کام کا آدمی ہوں ۔ آج تک اپنے سے اچھا آرگنائزر دیکھنے کی حسرت رہی ہے ۔ کیا میں نے تم سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ پچھلے ہفتے جب میں سیکرٹری تربیت حیوانات سے ملا تو ایک گھنٹے کی ہی گفتگو میں وہ میرا اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ کہنے لگا عبد الباقی صاحب ۔ میں متعجب ہوں ۔ میری سمجھ سے بالا ہے کہ اس قدر خوبیاں ایک واحد شخص میں کیسے اکٹھی ہو گئیں ۔ آپ سچ سچ بتایئے ۔ بھلا اتنے عرصہ کہاں چھپے رہے ۔ آپ کو تو کسی ملک میں سفیر ہونا چاہیئے تھا ۔"

ایک فرمانبردار بھتیجے کی طرح میں نے سیکرٹری محکمہ تربیت حیوانات کی چچا کی قابلیت کے متعلق رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ چچا جیسے شخص کے لئے واحد موزوں جگہ سنٹر میں وزارت ہے ۔

مسرت کی سلوٹیں اس کے گول دودھ پیتے بچے کے سے چہرے پر نمودار ہوئیں ۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے فربہ ہاتھ میں لے کر متشکرانہ اور رازداری کے اظہار کے طور پر دبایا ۔

"بھئی بختیار ۔۔۔ تم ان معدودے چند آدمیوں میں سے ہو جو مجھے سمجھ پاتے ہیں ۔ لیکن عبد الباقی کو منسٹر کون بناتا ہے ۔ یہاں تو بھتیجے ۔ قابل آدمی کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیا جاتا ۔۔۔"

ہم پیراڈائز سینما کے سامنے کوئی بیسویں دفعہ رکے ۔ ٹکٹ گھر کے سامنے کیو لگنا شروع ہو چکا تھا ۔ ہم کچھ دیر کھڑے داخلے کے اوپر لگے ہوئے فلم کے رنگین اشتہار کو للچائی ہوئی نظروں

سے دیکھتے رہے ۔ ہم دونوں اس انتظار میں تھے کہ ہم میں سے کون (دوسرے کو) فلم دکھانے کی دعوت دیتا ہے ۔ میری جیب میں لے دے کے صرف ساڑھے بارہ آنے کے پیسے تھے ۰۰۰۰ اور چچا عبد الباقی اپنی جیب میں نقد ڈال کر گھر سے باہر آنے کے حق میں کبھی نہیں رہے ۔

"پکچر کونسی ہے" "سمسن اینڈ ڈیلالہ "چچا عبد الباقی نے ظاہراً اتفاقیہ لہجے میں کہا " اچھی معلوم ہوتی ہے ۔ سنا ہے ببلیکل کہانی ہے ۔"

"کیا خیال ہے چچا ۔ اسے دیکھا نہ جائے" ۔ میں نے پرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ ممکن تھا کہ شاید وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا اصول بھول گیا ہو ۔

"جیسے تمہاری مرضی بھتیجے "چچا عبد الباقی نے کہا" اگر تمہاری پکچر دیکھنے کی صلاح ہے ، تو ابھی سے کیو میں جاکر کھڑے ہو جاؤ" ۔

مجھے اقرار کرنا پڑا کہ میری جیب میں کل بارہ آنے ہیں ۔

" اوہو ۔ بھئی بختیار ، تم نے مجھے گھر کیوں نہ بتایا کہ تمہارا پکچر دیکھنے کا ارادہ ہے ۔ میں پیسے جیب میں رکھ لیتا ۔ ویسے بھتیجے ، میرا تمہیں یہ مشورہ ہے ، برا ماننے کی ضرورت نہیں کہ جب تک جیب میں پیسے نہ ہوں ، تمہیں لوگوں کو سنیما دیکھنے کی دعوت دینے سے احتراز کرنا چاہیئے ۔ یہ ایٹی کیٹ نہیں" ۔

اس کے انداز میں قدرے رنجش کا اشارہ تھا ۔ پھر اس نے کہا ۔

" تم مجھ سے اگلے روز گروی کی دوکان کے بارے میں پوچھ رہے تھے ۔ یہاں پاس ہی کھارادر میں ایک گروی کی دوکان ہے ۔ یہاں گھڑیاں اور فونٹین پین وغیرہ گروی رکھے جاسکتے ہیں ۔"

اس نے امید کی نظروں سے کوٹ کی اوپر والی جیب میں لگے ہوئے پارکر فونٹین پین کو دیکھا جسے میں نے اپنے دوست محمد منیر تنویر سے چند دنوں کے لئے مستعار لیا تھا ۔

"اس وقت گھڑی میرے پاس نہیں ہے ۔ پھر کسی وقت سہی" میں نے جواب دیا ۔

"فونٹین پین بھی وہاں گروی رکھے جاسکتے ہیں "چچا عبد الباقی نے کہا ۔

" پروپرائیٹر میرا دوست ہے ۔ چلو گروی نہ رکھنا ۔ میرے ساتھ آؤ ۔ دوکان کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ۔"

"چچا ۔ تم مجھے دوکان دکھانے پر اتنے مصر ہو جیسے تم خود اسے چلا رہے ہو" ۔

اس بات سے اسے کچھ تکلیف پہنچی اور ہم ایک دوسرے سے روٹھے اور کھچے ہوئے پیراڈائز سے واپس ہو کر پٹڑی پر درمیان میں فاصلہ رکھ کر چلنے لگے یکلخت میں نے دیکھا کہ چچا عبد الباقی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا ۔۔۔ جاسوسی ناول نگاروں کے الفاظ میں نعش کی طرح زرد ۔ اس نے اچانک ایک غوطہ لگایا اور پاس کی دوکانوں میں سے ایک لمحہ کے اندر پھرتی سے غائب

ہو گیا۔

میں کھڑا ہو کر چچا کی اس عجیب حرکت پر تعجب کر رہا تھا۔ ایک طرہ دار پگڑی پہنے خوفناک شکل کا انسان، جس کے چہرے سے ہن، منوں کے حساب سے برس رہا تھا میرے رو برو آکر ٹھہر گیا۔

"یہ آدمی جو ابھی آپ کے ساتھ آرہا تھا، کہاں چلا گیا ہے"۔ اس نے اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے کہا۔

"کونسا آدمی۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"وہ آدمی جو آپ کے ہمراہ تھا۔ اس کا نام عبد الباقی ہے"۔

"عبد الباقی"۔ میں نے تعجب سے کہا۔

"عبد الباقی۔ ابھی ابھی آپ کے ساتھ آرہا تھا" طرے والا آدمی اب اپنے کو کچھ بیوقوف محسوس کر رہا تھا۔ "ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ موٹا تازہ آدمی ہے۔ معصوم بچوں کا سا چہرہ ہے۔ چوکور شیشوں کی عینک پہنتا ہے۔ کراچی میں اس وقت غالباً سب سے مشہور چار سو بیس ہے۔"

"میں اسے نہیں جانتا۔" میں نے کہا" ویسے شکریہ۔ میں اس سے بچ کر رہوں گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے ہمراہ تھا۔"

"ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے! آپ اس سے، عبد الباقی سے، ملنے کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں!"

"اس کو میرا چار ہزار روپیہ دینا ہے۔ اس کے گھر جاؤ تو اندر سے کہلوا بھیجتا ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے"۔

"یہ تو آج کل کئی لوگ کرتے ہیں۔ میں خود اسی طرح کرتا ہوں۔"

طرے دار پگڑی والا شخص مجھے قاتلانہ نگاہوں سے گھورتا ہوا آگے چلا گیا۔ اس کے جانے بعد میں نے ارد گرد چچا عبد الباقی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ بالکل غائب ہو چکا تھا۔ اور مجھے کہیں نظر نہ آتا تھا۔ پھر میں نے ایک آواز سنی۔

"بھتیجے آل کلیر ہو گیا ہے"؟

آواز کے سمت دیکھتے ہوئے میں نے چچا عبد الباقی کی چوکور عینکوں کو ہیر کٹنگ سیلون کے سوئنگ دروازے کے اوپر دمکتے ہوئے پایا۔

"آل کلیر ہے آجاؤ" میں نے کہا۔

"اچھی طرح اطمینان کر لو کہ وہ آدمی واقعی چلا گیا ہے"۔

میرے اطمینان دلانے پر وہ سوئنگ ڈور سے باہر نکلا۔ اس نے مجھ سے آٹھ آنے ادھار لیے اور ہیر کٹنگ سیلون میں حجامت کرانے کے لیے لوٹ گیا۔ اس نے کہا حجام استرا لیے اس کا

انتظار کر رہا ہے اور اس وقت حجامت کرائے بغیر چل دینا شرافت سے بعید امر ہے ۔ جس وقت شیو کرا کے باہر نکلا تو میں نے اس سے اس طرح بھاگنے کی وجہ دریافت کی ۔

"یہ طرے والا شخص کون تھا" میں نے پوچھا" مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم سے چار ہزار روپیہ لینا ہے" ۔

"اس شخص کا نام ایم اے خان ہے "چچا عبد الباقی نے مجھے اطلاع دی" یہ نہایت کم ظرف اور ذلیل انسان ہے ۔ یہ موٹر سپیر (SPARE) پرزوں کے کاروبار میں میرا برابر کا حصہ دار تھا ۔ اس کی خساست کی وجہ سے فرم کو سات ہزار روپئے کا خسارہ ہوا ۔ اس کا خیال ہے کہ میں چار ہزار روپئے کا مال خورد برد کر گیا ہوں ۔ دراصل بھتیجے! تم میں ایک مکمل حصہ دار بننے کی صلاحیت ہے ۔ تم اور میں اگر مل کوئی کام شروع کریں تو ••••"

چچا عبد الباقی میرا مکمل حصہ دار بننے کے سلسلے میں درست ہی کہہ رہا تھا ۔ ہماری دوستی اتنی تباہ کن کاروباری شرکتوں کے بعد بھی فاتحانہ طور پر زندہ رہ گئی تھی ۔۔۔ لیکن پچھلے تجربات کی بناء پر میں نے اس موڑ کو جو گفتگو اب لینے لگی تھی پسند نہ کیا اور میں محتاط ہو گیا••••

"مجھے ابھی ہیر کٹنگ سیلون میں ایک خیال سوجھا ہے "عبد الباقی نے اپنے بازو کو میرے بازو میں منسلک کرتے ہوئے کہا" مجھے ہمیشہ اپنی بہترین اسکیمیں شیو کراتے ہوئے سوجھتی ہیں ۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اس پر غور کرو" ۔

"میں اسے سننا چاہتا ہوں" میں کراہا ۔

بھئی وہی ڈپٹی سیکرٹری تربیت حیوانات، جس سے میں نے پچھلے دنوں ملاقات کی تھی اور جو میرا اس قدر مداح ہے، میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ میں گورنمنٹ فشریز کی مچھلیوں کی خرید کا ٹھیکہ لے لوں ۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے یہ ٹھیکہ دلوانے میں پوری مدد دے گا ۔ وہ اپنے لیے منافع میں دس فیصدی سے زیادہ کی بھی خواہش نہیں رکھتا ۔۔۔ میں تم سے اس معاملے میں بہت پہلے گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر تم مجھے ملے ہی اتنے دن بعد ہو" ۔

"کیا وہ تمہیں سفارت دلوانے میں مدد نہیں دیگا" ۔ میں نے پوچھا ۔

چچا عبد الباقی نے میرے اوچھے وار کو نظر انداز کرتے ہوئے گورنمنٹ فشریز کی مچھلیوں کے ٹھیکے کے فوائد مجھ پر واضح کیے ۔

"بھئی بختیار ۔ یہ ایک ایسی بزنس ہے جس میں نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ تو گھر بیٹھے بٹھائے نوٹ بنانے والی بات ہے ۔ گورنمنٹ فشریز ڈیپارٹمنٹ کے ٹرالر مچھلیوں کے کچ ہفتے میں دو روز لاتے ہیں ۔ ہمارا کام محض اتنا ہو گا کہ ڈاکس پر جا کر اس مال کو مچھلی کے تھوک بیوپاریوں کے ہاتھ نیلام کر دیں اور رقم جیب میں ڈال کر مزے سے گھر آ جائیں ۔ میں نے ابھی شیو کراتے ہوئے سارا حساب کر کے دیکھا ہے کہ ایک کچ پر کم از کم پانچ ہزار روپیہ ہمیں بچتا ہے یعنی

سب خرچہ وغیرہ نکالنے کے بعد"۔

"تو چچا۔ یہ ٹھیکہ تم لیتے کیوں نہیں" میں نے اپنے آپ کو اس سکیم سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور مزے کی بات یہ ہے "چچا عبد الباقی نے کہا" کہ اس کے لیے زیادہ سرمایہ کی بھی ضرورت نہیں۔ چار ہزار روپئے سے کام شروع کیا جاسکتا ہے۔۔۔ یہ تو ڈپٹی سیکرٹری مجھ پر ذاتی طور پر احسان کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ اس ٹھیکے کے لئے تو بڑی تگ و دو اور سفارش کی ضرورت ہے دراصل یہ ڈپٹی سیکرٹری میرا گرویدہ ہو گیا ہے۔"

"لیکن چچا چار ہزار روپیہ کی رقم تم کہاں سے لوگے"۔

"بھئی بختیار۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تم کو اس میں حصہ دار نہیں بناؤں گا۔ تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ اتنے تعلقات کے بعد میں اس قدر کمینگی کا مظاہرہ کروں گا۔۔۔۔ اس پر غور کرو بھتیجے! یہ سونے کی کان ہے۔ روپیہ کماؤ۔ بزنس میگنیٹ بنو۔۔۔"

ایک غرارہ پوش لڑکی ہمارے پاس سے گزری اور چچا نے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر سیٹی بجائی۔ دراصل وہ اس وقت اپنے کو اپنی عمر سے بیس سال چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی چال میں بھی ایک طفلانہ لپک آگئی تھی۔ مچھلیوں نے مستقبل کو خوش آئند اور گلابی بنا دیا تھا۔

ہم چلتے چلتے وکٹوریہ روڈ کے آخر میں ایک موٹر شو روم کے سامنے رک گئے۔ بڑے شیشے کے دروازوں کے پیچھے بجلی کی تیز سفید روشنی میں نئی چمکیلی موٹر کاریں ایک دوسرے سے ناک بھڑائے کھڑی تھیں۔ چچا عبد الباقی نے ان کو گہری دلچسپی سے دیکھا۔

"بھتیجے "چچا عبد الباقی نے کہا" ذرا سوچو۔ مہینے کے آخر میں ہم دونوں کے پاس فسٹ کلاس موٹر کاریں ہوں گی۔ میں نے تو کیڈلاک خرید کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈپٹی سیکرٹری تربیت حیوانات کے پاس بھی کیڈلاک ہے۔ ایک مہینے کے بعد ہم کراچی کے فش کنگ ہوں گے

عبد الباقی شو روم میں جاکر کاروں کی قیمتیں دریافت کرنے کا آرزو مند تھا لیکن میرے یہ بتانے پر کہ یہ کیڈلاک کاریں نہیں بلکہ گھٹیا میک کی کاریں ہیں اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا

"یہ محض تضیع اوقات ہوگا"۔

آگے چلتے ہوئے اس نے اپنے حصہ دار کو ایک اور فیاضانہ پیشکش کی۔

"اور بھتیجے "اس نے کہا" اس دفعہ میں تم کو سرمایہ لگانے کے لیے بھی نہیں کہوں گا۔ اس کے باوجود تمہارا پچاس پچاس کا حصہ ہوگا۔ سرمایہ کی ایک ایک پائی تک میری ہوگی۔ تمہیں صرف پہلے مجھے چار ہزار روپیہ بطور قرض حسنہ کے دینا ہوگا۔ ایک مہینے کے اندر تمہارا یہ چار ہزار تمہیں واپس مل جائیگا۔ ایک ایک پائی۔۔۔۔۔"

ہم پیچھے مڑ کر چلنے لگے۔

"کیا تمہارا سارے کراچی میں ایک بھی ایسا دوست نہیں جو تمہیں پانچ ہزار کی رقم صرف ایک مہینے کے لئے دے سکے۔ صرف ایک مہینے کے لئے۔" اس نے پر امید لہجے میں کہا۔ "اگلے

دن تم مجھ سے اپنے دوست محمد منیر کا ذکر کر رہے تھے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس کے پاس جاؤ تو وہ انکار نہیں کرے گا ۔ دوست آخر اسی لیے ہوتے ہیں کہ بوقت ضرورت قرض دے سکیں ۔۔۔۔ کیا خوبصورت لڑکی ہے " اور اپنے ہونٹ سیکڑ کر چچا عبد الباقی نے پھر سیٹی بجائی ۔

" کیا خوبصورت لڑکی ہے " کا ریمارک ایک سلونی ، اٹھے ہوئے ناک والی حسین سی چیز کے بارے میں کیا گیا تھا ، جو ہاتھ میں لیڈیز ہنیڈ بیگ لٹکائے اونچی ایڑیوں کی گر گابیوں پر ٹپ ٹپ کرتی ہمارے پاس سے گزری تھی ۔ میں نے چچا عبد الباقی کو کبھی اس قدر رومانٹک اور بشاش نہیں دیکھا ، جتنا اس شام کو ۔ وہ الٹے پاؤں پھر لڑکی کے پیچھے جانے کا خواہشمند تھا ۔ مگر میں نے اس کو پھر یاد دلایا کہ اس طرف میرے ٹیلر کی دوکان ہے ۔

ہم فریر ہال کی طرف چلتے گئے ۔۔ مچھلیوں کے گلابی روپہلی خواب دیکھتے اور شرکت کی شرائط پر بحث کرتے رہے ۔۔ ہم نے مچھلیوں سے متعلقہ سب امور کو خوش اسلوبی سے طے کر لیا ہے اگرچہ ہمیں زندگی میں مچھلیوں کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی کبھار ہمارے دسترخوان کی نعمت بنتی تھیں ۔ پھر جس معاملہ فہمی اور کاروباری انداز سے ہم نے اس رات مچھلیوں کے متعلق باتیں کیں اس نے ہمیں خود حیران کر دیا ۔

(۲)

دوسرے دن صبح نو بجے میں اور چچا عبد الباقی وکٹوریہ میں کلفٹن پر ڈپٹی سیکرٹری محکمہ تربیت حیوانات کے دفتر میں گئے ۔ میں وکٹوریہ میں بیٹھا رہا ، اور عبد الباقی ڈپٹی سیکرٹری سے ملنے اندر چلا گیا ۔ جب وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو بشاشت کی تصویر تھا ۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جسے اس نے بڑے فخر سے میرے سامنے لہرایا ۔ ڈپٹی سیکرٹری نے اسے اپنے دوست کے نام چٹھی دی تھی جو ایک ایسے شخص کو جانتا تھا جس کی ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر کے ہیڈ کلرک سے گاڑھی چھنتی تھی ۔ حیوانات کے دفتر سے ہم چھ میل کا فاصلہ طے کر کے جمشید روڈ پر اس دوست کی کوٹھی پر پہنچے جس کے نام کی چٹھی تھی ۔ کوٹھی کے پچھواڑے ایک گٹھا ہوا شخص جانگیا اور بنیان پہنے اور لوہار کی دھونکنی کی طرح ہانپتا ہوا ، ایک ہینڈ پمپ کے دستے کو اس تندی اور آہنی عزم سے چلا رہا تھا جیسے دنیا کے مستقبل کا اس پر دارومدار ہو ۔ ہینڈ پمپ کے منہ سے ایک ربڑ کا پائپ کوٹھی کی دوسری منزل پر جاتا تھا ۔

" معاف کرنا بھائی " چچا عبد الباقی نے اس سے پوچھا " کیا محمد احسن اشرفی صاحب اسی کوٹھی میں اقامت پذیر ہیں " ۔

" بالکل " اس آدمی نے ہنیڈ پمپ پر اپنی مشقت کو روکتے اور اپنے ماتھے پر سے پسینے کو پونچھتے ہوئے جواب دیا " قطعاً بلکہ محمد احسن اشرفی یہ ناچیز ہے " ۔۔۔ پھر اس نے اپنی ہئیت کذائی کی معذرت کرتے ہوئے کہا ۔ " بدبخت نوکر پھر آج بھاگ گیا ہے ۔ میں اوپر کی منزل پر رہتا ہوں مجھے ہر صبح اوپر پانی پہنچانے کے لئے اس بدبخت پمپ سے دو گھنٹے دھینگا مشتی کرنا پڑتی ہے ۔۔۔۔ میرے سات بچے ہیں اور وہ سب نہانے کے عادی ہیں ۔ میں خود مہینہ میں ایک دو دفعہ نہاتا ہوں ۔۔۔ فرمایئے کیسے تشریف لائے ہیں " ۔

" کریم الدین صاحب نے آپ کے نام ایک خط دیا ہے " ۔ عبد الباقی نے اسے بتایا ۔

"حاجی کریم الدین صاحب نے دیا ہو گا۔ مہربانی کر کے ان سے کہہ دیں کہ میں یہ مکان ہرگز خالی نہیں کر سکتا۔ میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ میرے سات بچے ہیں۔"

"نہیں یہ مسٹر کریم الدین صاحب ڈپٹی سیکرٹری حیوانات کی چٹھی ہے" چچا نے اسے تسلی دی۔

"مچھلیوں کے کنٹریکٹ کے متعلق تو نہیں۔" اس نے اعتماد سے پوچھا۔

"ہاں اسی کے متعلق ہے۔ غالباً کریم الدین صاحب نے آپ سے اس سلسلے میں میرا ذکر ضرور کیا ہو گا۔ میرا نام ایچ اے باقی ہے"۔

"نہیں آپ کا ذکر خیر تو نہیں آیا"۔ محمد احسن اشرفی نے کہا "مجھے تو پچھلے دو ماہ سے کریم الدین صاحب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ ہاں اس عرصے میں وہ مجھے ساتھ آٹھ سفارشی خط بھجوا چکے ہیں کہ خط لانے والے حضرات کو گورنمنٹ فشریز کی مچھلیوں کا ٹھیکہ دلوانے میں ان کی امداد کروں"۔

ہم اس جواب سے اتنے بھونچکا رہ گئے کہ کچھ عرصے تک کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر چچا عبد الباقی نے پوچھا "تو گویا ان لوگوں کو ابھی کنٹریکٹ نہیں مل سکے"۔

"کنٹریکٹ! ان میں سے ہر ایک کو کنٹریکٹ مل چکا ہے۔ وہ کچھ عرصے کے بعد چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو اس وقت جیل میں ہیں•••"

"جیل میں"؟ چچا عبد الباقی نے ہڑبڑا کر احتجاج کیا۔

"بالکل! مطلقاً! ان بدبختوں نے وقت پر گورنمنٹ کو ٹھیکے کی رقم ادا نہ کی تھی ۔۔۔ اور پھر صاحب۔ انھوں نے میری مسز اور مجھ پر دن دہاڑے الفنسٹن سٹریٹ میں گندے انڈے پھینکے ۔۔۔ آپ حضرات تو اچھے خاصے معزز معلوم ہوتے ہیں!"

"دیکھو مسٹر بختیار سیٹھ" چچا عبد الباقی نے اپنی آنکھ میں ٹمٹماہٹ لیے میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ہم لوگوں کی اخلاقی حالت کس قدر پست ہو چکی ہے۔ بر سر بازار لیڈیز پر گندے انڈے پھینکنا اور پھر بیچارے اشرفی صاحب نے انہیں ٹھیکہ لے کر دیا تھا"۔

"ہاں ایچ ساقی صاحب۔ دو دن میں نے ان کو کنٹریکٹ دلوانے میں ضائع کیے۔"

"میرا نام ایچ اے باقی ہے" چچا عبد الباقی نے پروقار انداز میں اسے درست کیا۔ "حاجی عبد الباقی۔ میں علیگ ہوں"۔

اوہ معاف کیجئے۔ آپ صاحبان تھوڑی دیر تک تشریف رکھیے ۔۔۔ برآمدے میں دو اسٹول رکھے ہیں۔ میں ذرا اس کام سے فارغ ہو لوں"۔

وہ آدھ گھنٹے تک فارغ ہو کر آیا۔ اب وہ ایک میلی سفید پتلون اور ایک خوفناک امریکن بوشرٹ پہنے ہوئے تھا جس کے انچ انچ پر اخباروں کی قتل، طلاق اور جارحانہ عشق کی سنسنی خیز

کٹنگز چھپی ہوئی تھیں۔ محمد احسن اشرفی ان شخصوں میں سے تھا جو خبروں کو پڑھنے کی بجائے اوڑھنے میں یقین رکھتے ہیں۔

چچا عبد الباقی نے اسے ڈپٹی سیکرٹری کا خط دیا۔ اشرفی نے اسے سرسری انداز سے اور بے دلی سے پڑھا۔

"آپ کا ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں رسوخ ہے،" چچا نے پوچھا۔

"رسوخ"! اشرفی بولا "میرا ایک دوست ایک شخص کو جانتا ہے جو فشریز کے ہیڈ کلرک کو جانتا ہے۔ بلکہ وہ شخص اس ہیڈ کلرک کا سگا ماموں ہے۔ میں آپ کو اس دوست کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ اسے گیارہ بجے سے پہلے مل لیجئے۔ اس وقت تک وہ گھر پر ہوتا ہے اس کے بعد وہ مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا ہے"۔

"مچھلیاں پکڑنے" چچا نے چین بجبیں ہو کر کہا۔

"ہاں۔ یہ اس کی ہابی ہے۔ ہابی۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی ہابی ٹکٹیں جمع کرنا تھی۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۳۰ء کے بنے ہوئے مرتبان جمع کرنے کا شوق کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ اسکول میں میرا ہم جماعت تھا، اس کی ہابی ایک صندوق میں مینڈک پکڑ پکڑ کر بند کرنا تھا... آپ جانتے ہیں، بعض لوگ ہابی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے... آپ لوگ اب جانے کی کریں ورنہ وہ گھر پر نہیں ملے گا۔"

چچا عبد الباقی نے اسے بتایا کہ اس نے اس کے نام ایک خط دینے کا وعدہ کیا تھا۔

"خط ضروری نہیں ہو گا۔" اس نے کہا "آپ اس سے کہہ دیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی سے باہر آ کر وکٹوریہ میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ چچا کو یاد آگیا کہ اشرفی نے ہمیں دوست کا نام اور پتا تو بتایا ہی نہیں۔ ہم پھر واپس اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ اگر ہم تھوڑی دیر انتظار کر سکیں تو وہ خود ہمارے ساتھ چلے گا۔

ہم نے اس کرم فرمائی پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے مزید شرمندہ نہ کریں اور یہ کہ ہماری امداد کرنا اس کا فرض ہے۔

اس کے بعد جب وہ نیچے آیا تو اس کے ساتھ پانچ چھوٹے اشرفی اور تھے۔ اگر دنیا میں ان سے زیادہ بد تمیز اور ناخوش گوار بچے اور کہیں ہیں تو میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ اپنے باپ کے بچپن کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتے تھے۔ اور اشرفی چھاپ واضح طور پر ان کی پیشانیوں پر ثبت تھی۔

"معاف کیجئے۔ سیٹھ عبد الفانی صاحب۔ مجھے قدرے دیر ہو گئی۔" اس نے معذرت چاہی۔

"میرا نام عبد الباقی ہے "پچانے وقار سے کہا۔

"اوہ عبد الباقی ۔۔۔ ہاں تو صاحب بات یہ ہوئی کہ بچے ابھی سکول کے لئے تیار نہ ہوئے تھے ۔ آپ حضرات اگر برا نہ مانیں تو بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد عبد الحنان کے ہاں چلیں گے ۔ آپ ٹیکسی میں آئے ہیں نا"۔

"وکٹوریہ میں "! میں نے جواب دیا۔

چلو وکٹوریہ بھی ٹھیک ہی ہے ۔ اگر چہ بچوں کو دیر تو ہو جائے گی ۔ میں اپنی کار لے چلتا، لیکن اس کا سٹیرنگ ٹوٹ گیا ہے"۔

اشرفی کے بچوں کو ان کے سکولوں میں چھوڑنے میں ہمیں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ لگا ۔ وہ دو مختلف سکولوں میں پڑھتے تھے جن میں ایک ابی سینیاں لائنز کی طرف تھا اور دوسرا میری ویدر کلاک ٹاور کے پاس ۔ ویسے ان میں سے کوئی بھی اسکول جانے کا شائق نہ تھا ۔ وہ سب کلفٹن جانا چاہتے تھے اور بےحد بگڑے ہوئے بچے تھے اور اپنے باپ سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف تھے۔

بچوں کو سکولوں میں پہنچانے کے بعد محمد احسن کو یاد آگیا کہ اس کو بیوی کے لیے ایک سویٹر اور بچوں کے لئے جرابیں صابن ، ہیر آئل وغیرہ خریدنا ہیں ۔

"اگر آپ حضرات برا نہ مانیں "اس نے بولٹن مارکیٹ کے پاس وکٹوریہ ٹھیراتے ہوئے کہا" تو میں یہاں سے کچھ ضروریات کی چیزیں خرید کر لوں ۔ بدبخت بچے صابون اور تیل دو روز میں ختم کر دیتے ہیں ۔۔۔ میں ابھی ایک منٹ میں آیا"۔

وہ پورے ایک گھنٹے کے بعد آیا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مارکیٹ کے ارد گرد کی سب دوکانوں کو چھان مارا ہے ۔ اس نے کئی سویٹر، کئی جرابوں کے جوڑے اور صابون اور ہیر آئل کی بوتلیں دوکانوں پر دیکھیں لیکن وہ وہ سویٹر وہ جرابیں صابون اور ہیر آئل نہ تھا جو وہ خریدنا چاہتا تھا ۔ اس لیے وہ صرف ایک ربڑ کا چھوٹا گیند خرید کر کے لایا اور اس کے متعلق بھی اسے شکایت تھی کہ دوکاندار نے اسے لوٹ لیا ہے ۔

"بدبخت دوکانداروں نے ہر چیز کے بھاؤ چڑھا رکھے ہیں ۔ "اس نے کہا" اگر آپ حضرات برا نہ مانیں تو میں ایک منٹ کے لئے جونا بازار بھی ہو آؤں "۔

مختصراً یہ کہ جونا بازار میں ڈیڑھ گھنٹہ لگانے کے بعد جہاں سے اس نے ایک لوہے کا کفگیر خریدا ، اس نے ہمیں اطلاع دی کہ اب اس کے دوست کے ہاں جانا فضول ہے ، کیونکہ اب وہ یقیناً مچھلیاں پکڑنے جا چکا ہو گا ۔ " اگر آپ حضرات برا نہ مانیں " اس نے کہا " تو مجھے کوٹھی پر چھوڑ دیں ۔۔۔ معاف کیجئے ۔ آپ حضرات کو بے حد تکلیف ہوئی ۔ کل نو بجے آپ پھر میری کوٹھی پر تشریف لے آئیں تو بہتر ہو گا ۔ بدبخت وکٹوریہ بہت وقت لیتی ہے ۔"

ہم نے اسے اس کی کوٹھی پر چھوڑا۔

چچا عبد الباقی نے اس سے پوچھا "آپ ہمیں اپنے دوست کا پتا تو بتادیجئے ۔ ہم ان سے خود ملنے کی کوشش کریں گے"۔

"نہیں صاحب ۔ یہ بھی کوئی بات ہے ۔ میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا ۔" اس نے کہا ۔

"عبد الحنان ذرا ٹیڑھی کھیر ہے"۔

"ان کا نام عبد الحنان ہے ؟" چچا نے پوچھا

"بالکل ۔ مطلقاً" محمد احسن اشرفی نے کہا ۔

"غالباً وہی تو نہیں جو سویٹ میٹ مرچنٹ ہیں ؟"

"نہیں یہ اور ہیں ۔ یہ مولوی عبد الحنان ہیں"۔

"کہاں رہتے ہیں ؟"

اس نے ذرا تامل کے بعد ہمیں میریٹ روڈ پر ایک پتا بتایا ۔ مگر ساتھ ہی اس نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ ہم اس کو ہمراہ لیے بغیر عبد الحنان سے ملنے کی ہرگز کوشش نہ کریں ۔

"نہیں صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟" چچا نے اسے یقین دلایا ۔

وکٹوریہ میں لوٹتے وقت چچا عبد الباقی نے جو اس شخص کے خلاف بھرا بیٹھا تھا ۔ جی بھر کر اپنا غبار نکالا ۔۔۔ "اس اشرفی کے بچے کو دیکھو ، یہ کوئی انسانیت ہے ۔ یہ خرید کرنا ہے وہ خرید کرنا ہے ۔ یہاں چلو ، وہاں چلو ۔ جیسے وکٹوریہ اس کے باپ کی ہے ، بختیار بھئی ۔۔۔ کل اس شخص کے یہاں آنے کے بجائے سیدھے مولوی عبد الحنان کے پاس چلیں گے ۔ تم نے دیکھا میں نے اس سے عبد الحنان کا پتا کیسی حکمت عملی سے اگلوالیا ۔ وہ اسے نہیں بتانا چاہتا تھا"۔

جب ہم نے وکٹوریہ کو چچا کے مکان پر رخصت کیا تو وکٹوریہ والا سات روپئے سے کم لینے پر رضامند نہ ہوا ۔ میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے کرایہ ادا کیا ۔ چچا عبد الباقی پاس کھڑا بے تعلقانہ انداز میں دیکھتا رہا ۔

(۳)

مولوی عبد الحنان میریٹ روڈ پر ایک تنگ و تاریک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا اور ہم نے اس کا پتا بڑی مشکل سے ڈھونڈا ۔ وہ خود بھی ایک انتہائی تنگ و تاریک قسم کا آدمی نکلا ۔ بانس کی طرح لمبا اور سارے کا سارا ہڈیوں کا ڈھانچہ ۔ وہ ایک مشینی آدمی معلوم ہوتا تھا ۔ اس کے اعضاء ناگہانی دھچکوں کے ساتھ حرکت میں آتے تھے ۔ اس کی ٹھوڑی سے ایک چھوٹی سی کارڈینل ریچلیو (CARDINAL RICHILIEW) ٹائپ ڈاڑھی معلق تھی ۔ ایک نہایت ہی بوسیدہ

کیپ پہنے اور ہاتھ میں مچھلی کا کانٹا پکڑے سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ ہم نے اسے عین موقع پر پکڑا تھا۔ ورنہ وہ گھر پر ہمیں یقیناً نہ مل سکتا۔

ہم نے اسے بتایا کہ ہم کو محمد احسن اشرفی صاحب نے اس کے پاس بھیجا ہے اور اس نے فوراً ہم سے پوچھا کہ آیا ہماری تشریف آوری گورنمنٹ مچھلیوں کی ٹھیکے سے متعلق ہے۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ یہی ہمارے حاضر ہونے کا مقصد ہے۔ چچا عبد الباقی نے اس کی قیافہ شناسی کی مناسب الفاظ میں داد دی۔

اس نے کہا وہ ہمیں ضرور یہ ٹھیکہ دلوانے میں حتی الامکان تگ و دو کرے گا اور چونکہ ہمیں اشرفی صاحب نے بھیجا ہے اس لئے وہ ہم سے بالکل معمولی کمیشن چارج کریگا۔

کمیشن کے ذکر نے ہمیں حیران کر دیا۔ چچا عبد الباقی نے اسے بتایا کہ ہم دراصل ڈپٹی سیکرٹری کریم الدین صاحب کے اپنے آدمی ہیں اور یہ کہ ہمارا خیال نہ تھا کہ کمیشن دینے کا کوئی سوال بھی پیدا ہوگا۔

ایک انتہائی تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں" اس نے کہا" کہ ڈائریکٹر فشریز کے عملے کو دیئے دلائے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اپنے لیے تو مجھے ایک پائی تک کی خواہش نہیں۔ ویسے آپ کو خود خیال کرنا چاہیے کہ یہ ٹھیکہ لینا سخت مشکل کام ہے۔ آیئے اوپر چل کر دفتر میں بیٹھیں"۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اس کے دفتر میں داخل ہوئے۔ اس کا دفتر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کونے میں ایک نل اور ایک بالٹی ظاہر کرتے تھے کہ غسل خانہ بھی یہی ہے۔ ایک میز کے آر پار دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کی نشست ادھڑ جانے کی وجہ سے غائب تھی۔۔۔ نل کے اوپر ایک رنگین تصویر ایک کیل سے لٹک رہی تھی، جس میں قائد اعظم اور لیاقت علی خان چاند ستاروں والی ٹوپیاں اور ۱۸۶۰ء کی ترکی فوج کی وردیاں پہنے اور مجاہدانہ شمشیروں سے لیس، تلطفانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

اس نے جلدی سے اپنے آپ کو دفتر کی واحد قابل استعمال کرسی پر ممکن کرتے ہوئے بغیر نشست والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تشریف رکھیے۔ معاف کیجئے۔ کرسی یہاں ایک ہی ہے۔ آپ میں سے ایک صاحب میز پر بیٹھ سکتے ہیں"۔

چچا عبد الباقی نے میز پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ میں بے نشست کرسی کے بیرونی چوبی فریم کے سرے پر اٹک کر بیٹھ گیا۔

"آپ اطمینان سے ہو بیٹھئے" ۔ اس نے میرے ساتھ خوش اخلاقی برتی۔ اس نے اپنی پلس فور کی جیب میں سے ایک پرانا پائپ اور کاغذ میں لپٹی ہوئی تمباکو کی پڑیا نکالی اور تمباکو کو اپنی

ہتھیلیوں میں مسلتے ہوئے اس نے اپنی ماتی آنکھوں سے ہمارا جائزہ لیا۔

"مجھے سگریٹ پینے کی عادت نہیں" اس نے کہا" اس لیے میں آپ کو سگریٹ پیش کرنے سے معذور ہوں۔ اگر آپ کی جیب میں پائپ ہو تو یہ تمباکو حاضر ہے" اس نے پائپ کو منہ میں لگاتے اور سلگاتے ہوئے کاروباری باتوں کا آغاز کیا۔

"ہاں تو صاحبان" اس نے کہا" کچھ دیئے دلائے بغیر ٹھیکے کامل جانا ناممکن ہے۔"

اس نے متعدد کمیشنوں اور نذرانوں کی فہرست گنائی جن کا دیا جانا ضروری تھا۔ ایک تو اس کلرک کا کمیشن تھا جو ہم سے ٹنڈر لے گا۔ ورنہ وہ اسے گم کر سکتا ہے۔ پھر اس شخص کا کمیشن ہو گا جو دوسرے ٹنڈر دینے والوں کے سربمہر ٹنڈروں کو کھول کر ہمیں ان کا آفر بتائے گا تاکہ ہم اپنے ٹنڈر میں سب سے زیادہ آفر سے ایک دو پیسے زائد کا آفر کریں۔ پھر ہیڈ کلرک تھا۔

اس نے اصرار کیا کہ ہم چائے پئیں۔ بدقسمتی سے اس کی بیوی کہیں باہر تھی اور چائے گھر پر تیار نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ ہمیں نیچے "دی اسٹیٹ پہلوان ہوٹل" میں لے گیا۔ چچا عبد الباقی اور میں نے چائے کی ایک ایک پیالی پی کیونکہ ہم ناشتہ کر کے آئے تھے۔ مولوی عبد الحنان نے چائے کی پیالی کے ساتھ چار ٹوسٹ اور دو آملیٹ بھی ختم کیے۔ اٹھتے ہوئے اس نے چچا عبد الباقی کو کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کے لئے کہا۔ چچا نے مجھ سے چار روپئے ادھار لے کر بل ادا کیا۔

مولوی عبد الحنان چاہتا تھا کہ کمیشنوں کی رقم جو اس کے حساب کے مطابق ساڑھے تین سو بنتی تھی، فوراً اس کو دے دی جائے۔ پھر جس جس سے نمٹنا ہو گا وہ خود نمٹ لے گا اور ہمارے لیے دردسری نہ رہے گی۔ چچا عبد الباقی نے کاروباری ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ ہم ضروری کمیشن وغیرہ خود دیں گے۔ اس سے مولوی عبد الحنان کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے کہا کہ اس کے دل کو دکھ پہنچا ہے کہ ہم اس پر اعتماد نہیں کر رہے ہیں۔ اس نے ہمیں کئی ایسی پارٹیوں کے نام گنوائے جنھوں نے اسے پچاس پچاس ہزار تک کی رقم بغیر رسید کے سونپ دی تھی۔

ہوٹل سے ہم ٹیکسی لے کر ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں گئے۔ مولوی عبد الحنان ہمیں باہر بنچ پر بٹھا کر خود ایک کمرے میں چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ باہر آیا، اور اس نے ہمیں اندر آجانے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم ایک بڑے کمرے میں سے جس میں کئی زرد رو بیڑیاں پیتے ہوئے کلرک میزوں پر ٹانگیں رکھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے، ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک بڑی میز کے پرلی طرف فائلوں کے پہاڑوں کے پیچھے ایک بھینگی آنکھوں والے قدرے ترش رو شخص نے اٹھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو حیرت سے دیکھا۔ وہ سامنے ہماری طرف دیکھنے کی بجائے اطراف کی دیواروں کو دیکھتی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ ہیڈ کلرک تھا جس کے ہاتھ میں ہماری قسمت تھی۔

"اچھا تو آپ گورنمنٹ فشریز کے ٹھیکے کے ٹنڈر دینا چاہتے ہیں۔" اس نے دونوں

دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہا "اس ٹھیکے کے لیے بڑا زبردست کمپٹیشن ہے۔ پچھلے دو دن میں ہمیں بڑی بڑی معتبر پارٹیوں سے پچاس کے لگ بھگ ٹنڈر موصول ہو چکے ہیں۔ آپ چونکہ بھائی عبد الحنان صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ اس لیے آپ کی ہر طرح امداد کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ یہ دیکھیے یہ سب ٹنڈر ہیں۔" اس نے ریک پر لدی ہوئی ایک مبہم ڈھیری کی سمت اشارہ کیا۔۔۔ اس نے اپنی آواز دھیمی کر دی "سب سے زیادہ آفر کھنڈ اوالا کمپنی نے اپنے ٹنڈر میں دیا ہے۔ یعنی آٹھ من کے پیچ کا چار ہزار روپئے۔ آپ چار ہزار ایک روپئے کا ٹنڈر دے دیں۔"

اس نے ایک ٹنڈر فارم ہماری طرف بڑھا دیا۔ چچا عبد الباقی نے مولوی عبد الحنان کی ہدایت کے مطابق اس کو پُر کیا ہیڈ کلرک نے ہمیں ایک ہزار روپئے بطور ضمانت کے اُسی روز یا اُس سے اگلے روز گورنمنٹ ٹریزری میں داخل کر دینے کی ہدایت کی۔

ٹریزری رسید آپ یا تو بھائی عبد الحنان کو دے دیں یا براہ راست مجھے پہنچا دیں۔ میں خود اسے آپ کے ٹنڈر کے ساتھ نتھی کرنے کے بعد ٹنڈر کو مہر لگا دوں گا۔ لیجیے پان سے شوق کیجیے۔

اس کے بعد مولوی عبد الحنان چچا عبد الباقی کو ایک طرف لے گیا۔ ان کے درمیان کچھ دیر کھسر پسر ہوتی رہی پھر چچا عبد الباقی مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ٹنڈر قبول کرانے کے لیے دو سو روپئے پر فیصلہ ہوا ہے۔

"تمہارے پاس دو سو روپئے ہیں؟" اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

مجھے اس روز ایک بزرگ کی معرفت بوڑھے آدمی نے تین سو روپئے بھجوائے تھے جو اس وقت میری جیب میں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ صاف انکار کر دوں کہ میرے پاس روپئے نہیں ہیں۔ مگر چچا نے مجھے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرتے دیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی چچا کے اندر دوسرے لوگوں کی جیبوں میں پڑے ہوئے نوٹوں کو سونگھ لینے کی حس حیرتناک طور پر تیز ہے۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے دو سو روپئے کے نوٹ چچا عبد الباقی کے ہاتھ میں دے دیئے۔ چچا عبد الحنان کو ایک طرف لے گیا اور نوٹوں کو اس کی جیب میں ڈال دیا۔ عبد الحنان نے ہیڈ کلرک کے پیچھے چپکے سے جا کر نوٹوں کے کچھ حصہ کو ہیڈ کلرک کی جیب میں منتقل کر دیا۔

اس رسم کے بعد ہیڈ کلرک پہلے سے زیادہ ترش اور گھبرایا ہوا ہمیں وداع کرنے کے لیے اٹھا۔ "آپ حضرات سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور کوئی خدمت ہو تو بندہ ہر طرح سے حاضر ہے"۔

دفتر کے باہر پہنچ کر چچا عبد الباقی نے مجھے سرزنش کی۔ "دیکھو بختیار! تمہیں وہاں ہیڈ کلرک کے سامنے روپئے نکالنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تمہیں ایسے کاموں کا تجربہ نہیں اور پھر تم یہ سمجھو کہ یہ دو سو روپئے تم نے نہیں دیئے بلکہ میں نے دیئے ہیں۔۔۔۔ میں نے گویا یہ

دو سو روپئے اس چار ہزار روپئے کی رقم میں سے دیئے ہیں جو تم مجھے بطور قرض دینے والے ہو"۔

کھارادر کے پاس سے گزرتے ہوئے مولوی عبد الحنان نے مجھ سے پندرہ روپئے ادھار لیے۔ اس نے ایک پھیری والے سے کریم پاوڈر سستی لپ سٹک اور ایک دیسی عطر کی شیشی خرید کی۔ ہم نے اسے میریٹ روڈ پر اس کے فلیٹ پر چھوڑا۔ اس نے ہم سے کہا کہ اگلے روز ہم ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر جاتے ہوئے اسے ضرور ساتھ لے لیں۔ چچا عبد الباقی نے اس سے وعدہ کر لیا۔

"یہ مولوی عبد الحنان بڑے کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے"۔ راستے میں چچا عبد الباقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا" اس کی ڈائرکٹر آف فشریز کے دفتر میں بڑی جان پہچان ہے اور ہیڈ کلرک تو اس کا مرید ہے۔ اس کنٹریکٹ کو حاصل کرنا بڑا مشکل ہے۔ ذرا سوچو، دو روز میں پچاس ٹنڈر اور بڑی بڑی کمپنیوں کے۔ کیوں نہ ہو بھتیجے ایک کچ پر پانچ ہزار کا منافع تو وہ پڑا ہے یہ تو بے چارہ کریم الدین علیگ نکلا۔ ادھر سے مولوی عبد الحنان نے بھاگ دوڑ کی کہ ہمارا چانس اس قدر روشن ہو گیا، ورنہ رسوخ کے بغیر کون پوچھتا ہے۔۔۔ اچھا! آج ہی چار ہزار روپئے کا انتظام کر کے مجھے فوراً دے دو۔ محمد منیر تنویر سے لینے کی کوشش کرو۔۔۔ ہاں یہ آج کا ملیشن اور ٹیکسی وغیرہ کا خرچہ اگر تم چاہو تو اس چار ہزار میں سے وضع کر سکتے ہو۔۔۔۔"

" محمد منیر تنویر کے بارے میں مجھے یقین نہیں کہ وہ چار ہزار روپئے دے دے گا"۔ میں نے کہا

" وہ تمہارے باپ کی ہڈیوں کا اکسپورٹ ایجنٹ ہے۔"چچا عبد الباقی نے مجھے ڈھارس دی" وہ بوڑھے آدمی کے حساب میں سے ہی تمہیں یہ رقم دے سکتا ہے۔ بوڑھے آدمی کو اس کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ ایک مہینے کے اندر ہی تم یہ رقم محمد منیر کو لوٹا سکتے ہو"۔

دوسری صبح میں محمد منیر تنویر سے میکلوڈ روڈ پر اس کے دفتر میں ملنے کے لیے گیا۔ محمد منیر تنویر دوسرے تیسرے مہینے اپنے سٹاف کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ میں نے مس سینڈو کی بجائے ایک نئی لیڈی ریسپشنیسٹ کو ڈسک کے پیچھے بیٹھے ہوئے پایا جو میرے اور محمد منیر تنویر کے بے تکلفانہ تعلقات کو نہیں جانتی تھی۔ وہ ایک کافی حسین اور پیاری چیز تھی اور اگرچہ ہم خلیجی طبعاً طبقۂ اناث سے دور رہنے کے قائل ہیں تاہم ہم شروع سے نسوانی حسن کے قدر داں رہے ہیں۔

محمد منیر تنویر کے پاس اس وقت کوئی ملاقاتی تھا اور لیڈی ریسپشنیسٹ نے مجھے کچھ دیر انتظار کرایا۔ ملاقاتی کے جانے بعد ریسپشنیسٹ نے میرا چٹ اندر بھجوایا اور تنویر نے فوراً مجھے اندر بلوالیا۔

محمد منیر تنویر مجھ سے اٹھ کر ملا۔ اس نے ایک گرم جوش اور پر اعتماد مصافحہ کیا۔

آؤ بھئی چاچے۔ اتنا عرصہ تم ملے ہی نہیں"تنویر نے ملی جلی اردو اور پنجابی میں کہا" کہاں

رہتے ہو"۔

اس نے بجلی سے کام کرنے والی گھنٹی بجائی اور چپڑاسی کو چائے لانے کے لیے کہا۔ اس نے میز کی دراز میں چھپائے ہوئے پانچ سو پچپن کا سگرٹوں کا ٹین نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"چاچا۔ ہماری نئی ریپشنسٹ دیکھی ہے؟" اس نے گھومنے والی گدے دار کرسی پر تقریباً لیٹے ہوئے اور سگریٹ کا ایک پف چھت کی طرف پھونکتے ہوئے کہا" ہے نا فسٹ کلاس! داد دے پھر ہمارے چانس کی! واقفیت کرادوں تمہاری اس سے۔ آج چلو میٹرپول، یہ بھی آرہی ہے۔ ڈنر سوٹ ہے نا تمہارے پاس"؟

"میرے پاس کہاں ہے ڈنر سوٹ"؟

"پھر تو مشکل ہے۔ چاچا! تم نے ڈنر سوٹ بھی نہیں بنوایا۔۔۔ اچھا پھر اور سنا کیا بنتا ہے۔۔۔ او میاں پیسے کما۔ عیش کر۔۔۔۔ دیکھ میں چند سال پہلے کیا تھا۔ اب میری شان دیکھ لارڈ ہوگی ہوگی کل مجھے ہنگری کے "مغل" موٹر سائیکلوں کی سول ایجنسی دے گیا ہے۔ میں ایک امریکن فرم کے اشتراک میں ملیر میں ایک بولٹ نٹ بنانے کی فیکٹری بھی بنوا رہا ہوں۔ یہ ہو گیا تو بس پھر تو میں واقعی بزنس میگنیٹ ہو جاؤں گا۔ محمد منیر تنویر دی بولٹ کنگ آف پاکستان۔ عیش کرا کے دکھادوں گا تمہیں میاں بحر بنو۔۔۔۔ لے چائے پی"۔

میز پر فون کی گھنٹی بجی اور محمد منیر تنویر اپنی گھومنے والی کرسی پر اس قدر صفائی اور مستعدی سے ریسیور اٹھانے کے لئے گھوما کہ میں ششدر رہ گیا۔

"جی ہاں ایک مہینے کے اندر اندر مال آجائے گا۔ شپ ہو چکا ہے ایک تہائی پیشگی ادا کرنا ہوگا"۔

"پھنس گیا۔" محمد منیر تنویر نے ریسیور رکھتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔ "چاچا۔ میری کتاب دیکھی ہے تم نے۔۔۔ "ترانہ تنویر"۔۔۔ اور اس نے گھنٹی بجائی اپنے دفتر کے ایک کلرک کو بلوایا اس نے اسے حکم دیا کہ مجھے "ترانہ تنویر" کی ایک جلد پیش کرے۔

محمد منیر تنویر اسکول کے ایام میں غزلیں اور نظمیں کہا کرتا تھا اور کسی قدر ادیب مشہور تھا۔ "ترانہ تنویر" بھی انہی دنوں کی غزلیات کا مجموعہ تھا (ویسے اس میں سے بعض غزلیں قاضی شیر حسن انگر جلد ساز کی جودت طبع کا نتیجہ تھیں، جو اسکول کے طالب علموں اور دوسرے گاہکوں سے مکمل غزل موزوں کر دینے کے چار آنے چارج کیا کرتے تھے)۔

کلرک نے کتاب کی ایک کاپی مجھے لاکر دی۔ محمد منیر تنویر نے "ترانہ تنویر" کو بےحد خوبصورت انداز میں طبع کرایا تھا۔ جلد نیلے مراکو چمڑے کی تھی، اور اس پر سنہری الفاظ میں کتاب اور مصنف کا نام کندہ تھا۔ اندر کا کاغذ چمکیلا بہترین آرٹ پیپر تھا، اور کتاب اس اہتمام سے چھاپی گئی تھی جیسے تاج اور پیکو کے عکسی قرآن شریف۔ قیمت پانچ روپے تھی۔

"دیکھ پھرچاچا، کتاب چھپوائی ہے نا پھر۔ پورے تین ہزار روپئے اس پر لاگت آئی ہے میرے خیال میں سارے پاکستان میں میں واحد بزنس میگنیٹ ہوں جس کو شعروادب میں کافی دسترس ہے۔ میں نے "ترانہ تنویر" کی جلدیں گورنر جنرل اور سب منسٹرز کو بھجوائی ہیں"۔

اس نے کلرک کو گھنٹی بجاکر بلایا۔

بھئی وہ "ترانہ تنویر" کی ایک جلد تم نے مولوی تمیزالدین خان صاحب کو بھجوادی ہے نا"

"ابھی نہیں جناب عالی۔" کلرک نے جواب دیا۔

"یہ آج ہی بھجوادیجئے۔" محمد منیر تنویر اپنے اسٹاف سے خوش اخلاقی برتتا ہے۔"اور ایک کاپی ڈپٹی کنٹرولر امپورٹ اکسپورٹ کو بھی بھجوانی ہے۔"

"لاچاچا" اس نے کہا"تیری جلد کو آٹو گراف کردیں۔" اور اس نے کتاب کے سرورق پر "بختیار خلجی کی نذر۔ محمد منیر تنویر" لکھ دیا۔

"ارے مولانا۔ میں نے عرصہ ہوا شعروشاعری چھوڑرکھی ہے، ورنہ اگر لکھتا رہتا تو اس وقت تمہارے جوش، فراق وغیرہ جتنا مشہور ہوتا۔ اصل میں ادیب بننے کا بھی ایک وقتی شوق ہوتا ہے۔ اچھاچاچا! کل میں نے لارڈ بوگی بوگی کی آنر میں ڈنر دیا ہے۔ تم بھی آؤ گے! ڈنر سوٹ ہے نا تمہارے پاس؟"

میں نے اس سے کہاکہ تھوڑی دیر پہلے بھی میں اسے بتاچکاہوں کہ میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے۔

"ایک ڈنر سوٹ تو بنوا چھوڑ چاچا۔" اس نے مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا" تو بھی اسی طرح حاجی بغلول کا حاجی بغلول رہا•••"

"محمد منیر تنویر" میں نے آخر کہا"ہم اسکول میں اکٹھے تھے"۔

"ہاں چاچا تھے۔ بالکل تھے!"

"ہم لنگوٹیے دوست تھے۔" میں نے کہا

"چاچا۔ بات کر"

"کیاتم مجھے آج چار ہزار روپے فی الفور ادھار دے سکتے ہو۔ صرف ایک مہینے کے لئے"۔

محمد منیر تنویر کی پراعتماد خوش مزاجی اس کے چہرے سے ایک چھلکے کی طرح اتر گئی۔ وہ غمگین ہو گیا۔

"سچ"

"بالکل سچ بات ہے!" اور میں نے مچھلیوں کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے بارے میں اپنی کوششوں کا اس سے ذکر کیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس نے سکیم کے بارے میں کیا رائے قائم کی

مگر اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا "کل تم میرے پاس آتے تو میں تمہیں چھ ہزار روپے تک دے سکتا تھا۔ آج ۔۔۔۔"

"یہ تمہیں کرنا پڑیگا۔ محمد منیر تنویر" میں نے کہا "ہم کلاس فیلو تھے۔ میں نے تمہارے میٹرک کے امتحان کی فیس داخلہ دی تھی"۔

"اچھا ٹھیریئے۔" وہ اب برفانی طور پر پر تکلف ہو گیا۔ جیسے ہم اجنبی ہوں۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ کلرک کے آنے پر تنویر نے اسے چار ہزار روپے کا چیک لکھ دیا کہ اسے فوراً کیش کرالائے۔ اس نے ایک اسٹامپ لگے کاغذ پر مجھ سے چار ہزار روپے کی رسید لے لی۔

جب کلرک کیش لے کر آیا، تو میں نوٹوں کو اندر کی جیب میں ٹھونس کر اٹھ کھڑا ہوا ۔۔۔۔ محمد منیر تنویر نے مجھ سے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ لیکن وہ پہلے کی سی گرم جوشی بالکل مفقود تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے جانے کے بعد ہی اس نے اسٹینو کو بلوا کر بوڑھے آدمی کے نام خط ڈکٹیٹ کرایا ہو گا کہ میں بوڑھے آدمی کے حساب میں سے چار ہزار روپئے اس سے لے گیا ہوں!

(۵)

اگلے دن کوئی نو بجے مولوی عبد الحنان کو ہمراہ لے کر ہم بولٹن مارکیٹ کے سامنے ٹریزری میں ایک ہزار جمع کرانے کے لیے گئے۔ کھڑکی کے آگے روپیہ جمع کرانے والوں کا ایک بے حد لمبا کیو تھا۔ چچا اور میں اس میں کھڑے ہو گئے۔ کیو آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا اور جب ہم خدا خدا کر کے کھڑکی کے پاس پہنچے تو اس پر "ٹریزری کلوزڈ" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا ٹریزری گیارہ بجے بند ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز ہم علی الصبح کوئی پانچ بجے ہی ٹریزری کے باہر آکر کھڑے ہو گئے۔ آٹھ بجے ہمیں پتا چلا کہ ہم کیو میں سب سے پہلے اور آخری تھے۔ آج ٹریزری میں چھٹی تھی تیسرے دن ہم روپیہ وصول کرنے والے کلرک کے پاس پہنچ گئے لیکن اس نے روپیہ جمع کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے سب ٹریزری میں جاکر فارم داخل کرایئے کہ ہم اتنی رقم اس مد میں جمع کرا رہے ہیں۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ سب ٹریزری کہاں ہے۔ آخر ایک شخص نے بتایا کہ وہ میونسپل کارپوریشن کے بازو میں ہے۔ ہم فوراً بھاگم بھاگ سب ٹریزری میں پہنچے۔ آدھ گھنٹے کے بعد فارموں والی کھڑکی کے پاس پہنچنے پر پتا چلا کہ چھپے ہوئے فارم ختم ہو چکے ہیں۔ ایک پان چباتے ہوئے کلرک نے سڑک کے پار ایک ٹائپ کرنے والے کی دوکان کی طرف اشارہ کیا اور کہا "وہاں سے آپ کو ٹائپ شدہ فارم، آٹھ آنہ فی فارم کے حساب سے دستیاب ہو جائیں گے"۔

ٹائپ والے کی دوکان کا نام "دی رائل سولجر ٹائپنگ اسکول" تھا۔ پروپرائیٹر (جو ایک سفید پتلون پر پرانی خاکی پیٹی کا فوجی کوٹ پہنے ہوئے تھا) نہایت خوش اخلاق شخص ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا۔ ہمیں دو فارم دیئے اور کہا کہ ہم انہیں بھر سکتے ہیں۔ اس نے ہم

سے ایک روپیہ فی فارم چارج کیا۔ فارموں کو بھر کر ہم پھر فارم لینے والے کلرک کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت چائے پی رہا تھا۔ چائے پی کر اس نے اطمینان سے بیڑی سلگائی۔ بیڑی ختم کرنے کے بعد اس نے ہم سے فارم لے لیے اور چالان بنا کر ہمارے حوالے کیا کہ اسے روپیہ جمع کراتے ہوئے ٹریزری میں دے دیں۔ چالان لے کر ہم واپس ٹریزری کو بھاگے۔ وہ بند ہو چکی تھی۔ اس سے اگلے روز ہم صبح چار بجے ٹریزری کے باہر جا کھڑے ہوئے۔ اس دفعہ ہم کیو میں سب سے پیش تھے۔ آٹھ بجے کلرک کے آنے پر ہمارا روپیہ واقعی جمع ہو گیا اور ہم نے ٹریزری رسید لے کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

ٹریزری رسید ہم نے مولوی عبد الحنان کو جا کر دی کہ اسے ہیڈ کلرک کو پہنچا دے۔ مولوی عبد الحنان سے اب ہماری کافی گاڑھی چھننے لگی تھی •••• اس حد تک کہ ایک دو دفعہ اس نے مجھے اپنا قدیمی پائپ بھی پینے کے لیے دیا۔ چچا عبد الباقی نے اس کو زیادہ دوست بنانے کی خاطر گھر کے دو پرانے مرتبان جو ۱۹۱۰ء سے بھی بہت پہلے کے خرید شدہ تھے، اس کو تحفتاً نذر کیے (پرانے مرتبان جمع کرنا مولوی عبد الحنان کی ہابیوں میں سے ایک تھی)

مجھ پر عبد الحنان خاص طور پر مہربان ہو گیا۔ ہماری اس سے ملاقات کو چار روز ہی ہوئے تھے کہ اس نے مجھے اپنے دفتر میں ایک طرف لے جا کر پوچھا کہ آیا میں اس کی لڑکی سے شادی کرنا چاہوں گا جس نے اسی سال میٹرک پاس کیا تھا اور ابھی ابھی شادی کے قابل ہوئی تھی۔ میں نے شائستہ انداز میں ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ میرے انکار سے اسے صدمہ پہنچا۔

یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس کی لڑکی، کم از کم چالیس برس کی تھی اور قطعی طور پر بہری ہونے کی وجہ سے اب تک کنواری تھی ••••

(۶)

کوئی سات روز کے بعد مولوی عبد الحنان سے ملنے پر اس نے ہمیں یہ خوش خبری دی کہ ہمارا ٹنڈر منظور ہو گیا ہے۔ چچا عبد الباقی نے عبد الحنان کی پیٹھ ٹھونکی کہ سب اس کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ عبد الحنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے کمیشن کا مطالبہ کیا۔

ہم نے یہ ظاہر کیا کہ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھے۔ اسے ساتھ لے کر ہم فوراً ڈائریکٹر آف فشریز کے دفتر میں پہنچے۔ ہیڈ کلرک نے ہم سے شرائط کے فارموں پر دستخط کرائے اور ہمیں ہدایت کی کہ ہم سردست دو ہزار روپے کی رقم ٹریزری میں ڈائریکٹر فشریز کے نام کریڈٹ کرا دیں۔ اس نے ہمیں یہ بھی اطلاع دی کہ ہمارا پہلا فشنگ ٹرالر جمعہ یا سنیچر کی شام کو کیماڑی گودی میں لگ جائے گا۔ اور یہ کہ ہم ڈائریکٹر کا سرٹیفکیٹ ٹرالر کے فورمین کو دکھا کر مال کی ڈلیوری لینے کے لئے تیار ہیں، ورنہ نقصان کی صورت میں فشریز ڈیپارٹمنٹ پر کوئی ذمہ داری

عائد نہ ہوگی۔ "میری رائے میں عبد الباقی خان" مولوی عبد الحنان چچا کو ہمیشہ عبد الباقی خان کہہ کر پکارتا تھا۔ "آپ ٹرالر کو ان لوڈ (UN LOAD) کرانے کے بجائے ڈاکس (DOCKS) پر ہی مال کو نیلام کر دایں۔ اس سے آپ ان کو مارکیٹ میں فروخت کرنے کی بک بک سے بچ جائیں گے۔"

ہمیں یہ مشورہ بڑا اچھا لگا۔ اسی روز کراچی کے "توپ وتفنگ" میں ایک اشتہار دیدیا گیا کہ مچھلیوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جمعہ یا سینچر کو بولی دینے کے لیے کیماڑی ڈاکس پر جہاں چار من مچھلی کا نیلام ہوگا تشریف لے آئیں۔

"جمعہ کی شام کو "چچا عبد الباقی نے کہا" پانچ ہزار روپیہ ہماری جیب میں ہوگا بھتیجے بختیار! میں ابھی سے جیب میں اسے چھنکتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں"۔

جمعہ کے روز ہم دوپہر کے دو بجے ہی کیماڑی ڈاکس پر جا پہنچے۔ ہمارا فشنگ ٹرالر ابھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ مولوی عبد الحنان نے جو ہمارے ہمراہ تھا، کہیں سے پتا کر کے ہمیں بتایا کہ ٹرالر غالباً شام کے پانچ بجے چھ نمبر گودی پر برتھ ہوگا۔ ہم نے ایک دو گھنٹے حاجیوں کے ایک جہاز کو دیکھنے میں صرف کیے۔ چار بجے کے قریب تین چار کاروباری قسم کے لوگ نمبر ۶ گودی پر منڈلاتے ہوئے ہمیں نظر پڑے۔ مولوی عبد الحنان انہیں پہچانتا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ بولی دینے والی پارٹیاں ہیں۔ بقول اس کے ان میں سے ایک کراچی فشنگ مارکیٹ کی سب سے زبردست پارٹی تھی۔ کم از کم پانچ چھ لاکھ کی مالیت کی۔

چچا عبد الباقی اپنے بہترین پر وقار انداز میں مسکراتا ہوا ان کی طرف گیا۔

"آپ صاحبان تھوڑی دیر انتظار کیجئے" اس نے کہا "فشنگ ٹرالر ایک آدھ گھنٹے تک گودی پر لگ جائے گی۔ اسی وقت ہم نیلام کا آغاز کر دیں گے"۔

"کچھ کتنا ہے اندازاً" ایک لال ڈاڑھی والے شخص نے پوچھا۔

"چار ٹن کے قریب" چچا نے اسے بتایا۔

"بولی دینا ہے تو ابھی دو۔" ایک میلے کوٹ اور گول ٹوپی والے میمن نے کہا "ہم کو اور بھی کام ہے نا، سالا۔ ادھر مچھلی کا دھندا ہی تو نہیں ہے"۔

مولوی عبد الحنان نے چچا عبد الباقی اور مجھ کو ایک طرف لاکر سمجھایا کہ پارٹیاں بہت بڑی بڑی ہیں اور ان کو اس طرح جانے دینا غلطی ہوگی۔ اس نے کہا کہ نیلام کے لیے ضروری نہیں کہ ٹرالر کے آنے پر ہی کی جائے۔ اس کا آغاز ابھی سے کیا جا سکتا ہے۔

چچا کی خواہش تھی کہ میں نیلام کروں، لیکن میں نے اس کام میں بالکل تجربہ نہ ہونے کی بنا پر صاف انکار کر دیا۔ آخر چار و ناچار چچا نے اپنے آپ کو گودی پر پڑے ہوئے ایک لکڑی کے کریٹ پر کھڑا کر لیا۔ چار پانچ بولی دینے والے حضرات، ڈاکس کے کچھ مزدور اور سات آٹھ بچے اس

کے گرد جمع ہو گئے۔

"خاموش صاحبان "چچا عبد الباقی نے ایک بہترین پیشہ ور نیلام کرنے والے کے لہجے میں کہا" گورنمنٹ فشریز کی چار من مچھلی جو ٹرالر ابھی لارہا ہے، نیلام کی جاتی ہے۔ بولیے صاحبان۔ چار من فسٹ کلاس کوالٹی اور ہر قسم کی تازہ مچھلی کے لیے۔ پاملیٹ۔ جھینگا اور رنگا رنگ کی مچھلی کے لیے، بولیے صاحبان۔۔"

"پانچ روپے" کالے کوٹ اور گول ٹوپی والے میمن نے بولی دی۔ دو تین آدمی ہنسے۔

"کیا پانچ ہزار کے لئے پانچ روپے" عبد الباقی نے کہا۔

"پانچ روپے بارہ آنے" ایک سبز ڈاڑھی والے شخص نے جس کا چہرہ مجھے بے حد آشنا سا لگا آواز دی۔

"چھ روپے" کالے کوٹ والے نے کہا۔

"آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں۔ "چچا عبد الباقی نے انہیں سرزنش کی۔ "اگر آپ اسی طرح بولی دیں گے تو ہمیں مجبوراً نیلام کو بند کرنا پڑیگا۔"

"دو سو روپے" مولوی عبد الحنان نے جو بولی دینے والوں میں جاشامل ہوا تھا۔ آواز دی

دو سو روپے صاحب! دو سو روپے۔ کم از کم پانچ ہزار کے مال کا دو سو روپے"۔ چچا نے مجمع کی حوصلہ افزائی کی۔

"دو سو روپے بارہ آنے" کالے کوٹ والا بولا۔

"دو سو ایک" سبز ڈاڑھی بلی۔۔۔

"چار سو روپے" مولوی عبد الحنان نے پھر بولی کو اوپر چڑھایا۔ ہمارے چہروں پر پھر سے رنگ آگیا۔

"چار سو روپے، آیئے چار سو روپے صاحبان۔ چار من فسٹ کوالٹی۔ تازہ بہترین فش کے لیے۔۔۔ یہ سمندر کی مچھلی ہے۔ دریائے لیاری میں پکڑی ہوئی مچھلی نہیں"۔ چچا عبد الباقی کا لہجہ پر امید اور پر اعتماد تھا۔

"چار سو ایک" پھر کالے کوٹ والے نے کہا۔

"چار سو بیس" سبز داڑھی والے نے اچھلتے ہوئے چچا عبد الباقی کی سمت بازو سے اشارہ کیا

"چار سو بیس روپے صاحبان۔ چار سو بیس، بحیرہ عرب کی خوبصورت، ستھری چار من مچھلی کے لیے صرف چار سو روپے۔ آیئے صاحبان۔ وھیل مچھلی جتنی بڑی بڑی مچھلی"۔ چچا اب سراپا نیلام کرنے والا تھا۔

"ایک ہزار روپئے" مولوی عبد الحنان بولا۔
یہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا۔ آخر بولی گیارہ سو روپئے تک آکر رک گئی اور چچا عبد الباقی کی ساری منتوں کے باوجود کوئی بھی عبد الحنان کی آخری بولی کو بڑھانے پر تیار نہ ہوا۔ ہماری چڑھتی ہوئی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ہمیں یعنی چچا عبد الباقی کو پورا یقین تھا کہ بولی چار ہزار روپئے سے اوپر جائے گی۔
"آپ حضرات، تشریف لے جایئے" ۔چچا نے خشمگیں ہو کر کہا "آپ نے ہمارا وقت ضائع کیا ہے۔"
کاروباری آدمی آپس میں مشورہ کرنے لگے ۔۔۔ آخر سبز ڈاڑھی والا آدمی چچا کے پاس آیا "دیکھو بارہ سو روپئے میں بات پکی کرو۔ مارکیٹ میں تم کو اس سے آدھی رقم بھی نہیں ملے گی۔ مچھلی بہت آنے کی وجہ سے نرخ بڑے گرے ہوئے ہیں۔ یہ میرا آخری بڈ ہے"۔
"جہنم میں جاؤ" ۔چچا عبد الباقی نے اس سے کہا۔ وہ چڑ گیا تھا۔
"حاجی صاحب۔ گرم مت ہو۔" سبز ڈاڑھی نے تحمل سے کہا "میں نے تمہارے فائدے کی بات کی ہے"۔ میں سوچنے لگا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟
"جایئے صاحب" چچا نے کہا۔ "میں نے کہہ دیا ہے کہ میں مچھلی فروخت نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک مچھلی بھی فروخت نہیں کروں گا"۔
مجمع سے دور ہٹ کر ایک بھوری مونچھوں والا چھوٹا سا آدمی مولوی عبد الحنان سے کہہ رہا تھا۔ "اس فشنگ ٹرالر کا ڈوب جانا۔ بڑی ٹریجڈی ہے۔ ہاربر ماسٹر کہتا ہے کہ اس کے پیندے میں سوراخ تھا"۔
میں بدحواس ہو کر چچا عبد الباقی کی طرف بھاگا اور اسے ٹرالر کے ڈوبنے کی خبر سے مطلع کیا۔ اس نے بڑی دلیری سے اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں مولوی عبد الحنان اپنی پلس فور میں ایک ماتمی چال چلتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ ٹرالر کے ڈوب جانے سے اسے بے حد افسوس ہے۔
"یہ کوئی اور ٹرالر ہوگا بھتیجے" چچا نے مردانگی سے کہا "یہ ٹرالر ہمارا نہیں ہو سکتا"۔ مولوی عبد الحنان کو یقین تھا کہ یہ وہی ٹرالر تھا۔
چچا عبد الباقی نے کسٹم ہاؤس کے دفتر سے ہاربر ماسٹر کو رنگ کر کے دریافت کیا کہ آیا کسی فشنگ ٹرالر کے ڈوبنے کی اطلاع آئی ہے۔ ہاربر ماسٹر نے جواب دیا کہ اسے کوئی علم نہیں لیکن اگر یہ فشریز ڈیپارٹمنٹ کے ٹرالروں میں سے ایک ہے تو اسے اس کے ڈوبنے کی بے حد خوشی ہوگی کیونکہ ان ٹرالروں نے ہاربر کو خواہ مخواہ بلاک کر رکھا ہے۔
ہم نے آٹھ بجے رات تک ٹرالر کا انتظار کیا۔ جب یہ نہ آیا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ ضرور

ڈوب گیا ہو گا۔

"اس کا مطلب یہ ہے "میں نے کہا" اب ہمیں اگلے ہفتے تک دوسرے ٹرالر کیچ کا انتظار کرنا پڑیگا"۔

عبد الحنان نے ہمیں بتایا "گورنمنٹ نے اس ٹرالر کی پچھلی آپ کو شرائط کے مطابق فروخت کر دی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ ٹرالر ڈوب گیا ہے تو نقصان آپ کو برداشت کرنا پڑیگا۔ اگلے کیچ کے لئے آپ کو مزید رقم جمع کرانا ہو گی۔"

جب ہم ڈاکس سے واپس ہوئے تو پچا اور میں دنیا کے دو غمگین ترین آدمی تھے۔

(۷)

رات کو ۹ بجے مولوی عبد الحنان میرے فلیٹ پر مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ اس کے ہمراہ ایک چوڑے منہ اور چپٹی ناک والی ایک چالیس سالہ عورت تھی۔ اس نے اونچی ایڑیوں والی گرگابیاں اور فراک پہن رکھا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ جراب کے بغیر تھی۔

میرے دروازہ کھولنے پر عبد الحنان نے کہا "میں اپنی بیٹی سے تمہارا تعارف کرانے آیا ہوں۔ تم اسے نہایت کم سخن اور مخلص پاؤ گے"۔۔

میں نے محض اخلاقاً اس خاتون کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس نے مجھے کوری احمقانہ نظروں سے دیکھا۔

"اس سے کچھ کہنا فضول ہے"۔ عبد الحنان بولا "وہ بالکل بہری ہے"۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔" میں نے ہمدردی جتائی۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔ عبد الحنان نے مجھے ایک طرف لے جاکر سرگوشی میں کہا

"مولوی عبد الحنان! تمہارا اس سے کیا مطلب ہو سکتا ہے"؟ میں نے معصومیت سے پوچھا

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں" عبد الحنان نے پہلو بدل کر کہا" اچھا مسٹر بختیار، مجھے کل شام کے لیے ڈنر سوٹ درکار ہے۔ محمد احسن صاحب اشرفی نے مجھے اور چند اور دوستوں کو رات ڈنر پر بیچ لکشری میں مدعو کیا ہے۔۔۔۔ مدعو تو انھوں نے دراصل میری بیٹی شریفین کو کیا ہے، لیکن چونکہ اس کو ایسکورٹ کرنے کے لیے ضرور کوئی ہمراہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے میرا جانا ضروری ہے ۔۔۔چاہو تو تم بھی اس کے ساتھ جاسکتے ہو"۔

"میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے"۔ میں نے کہا

"عبد الباقی خان کے پاس ہے" - اس نے پوچھا "پچھلے سال اس کے پاس غالباً ڈنر سوٹ تھا۔ وہ آج کل اس کے ڈرائنگ روم میں ٹیبل کلاتھ کا کام دے رہا ہے" -

"تمہارے کسی اور دوست کے پاس ہے؟ مسٹر بختیار۔ مجھے ڈنر سوٹ کہیں نہ کہیں سے ضرور لے دو" -

میں نے اسے جلد ٹالنے کے لئے محمد منیر تنویر کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنا ڈنر سوٹ ایک رات کے لئے مولوی عبد الحنان کو دے دے - "مولوی عبد الحنان" میں نے لکھا "بڑے شریف اور مرنجاں مرنج بزرگ ہیں اور ان کی لڑکی شرلیلین کا ایک عیب انکا بہرہ پن ہے - ورنہ وہ بڑی پر کشش اور سلیقہ شعار خاتون ہیں" -

عبد الحنان اور اس کی بیٹی تھوڑی دیر اور ٹھیرے - عبد الحنان ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا - جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پانچ روپئے مانگے جو میں نے اسے دے دیے -

(۸)

اگلے دن ہم فشریز کے دفتر میں گئے - وہاں ٹرالر کے ڈوبنے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی - ہیڈ کلرک نے کہا ڈیپارٹمنٹ کے پاس لے دے کے یہی ایک کام کا ٹرالر تھا - باقی پانچ ٹرالر پیندوں میں سوراخوں کی وجہ سے ایک مدت سے بے کار پڑے تھے - فشریز ڈپارٹمنٹ نے انگلستان سے چار ہزار روپئے ماہوار پر ایک ٹیکنیکل اکسپرٹ کی خدمات حاصل کی تھیں - جو ڈیپارٹمنٹ کو سوراخوں کے بند کرنے کے متعلق مشورہ دے گا -

ہیڈ کلرک سے ملنے کے بعد مولوی عبد الحنان اور ہم مزید تفتیش کی خاطر کیماڑی ڈاکس پر جا نکلے نمبر ۲ گودی پر ایک زنگ آلود میڑھی (FUNNEL) فنل والی چیز کھڑی دھواں چھوڑ رہی تھی - اس سے مچھلی کی تیز بو آرہی تھی - یہ ہمارا ٹرالر تھا - اس کے ڈوبنے کی خبر کسی نے یونہی اڑادی تھی -

ہم نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ مچھلی کو نیلام کرنے کی بجائے ہم اسے خود مارکیٹ کر کے فروخت کریں گے - تین ہزار روپیہ تو ہم کو ٹھیکے کی شرائط کے مطابق حکومت کو ادا کرنا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ جب تک ہم اس کو کم از کم چار ہزار میں فروخت نہ کریں گے یہ ہمارے لیے گھاٹے کا سودا تھا - نیلام میں بولی بارہ سو سے اوپر نہ گئی تھی اس قیمت کو قبول کر لینے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا -

ہم نے ٹرالر کے فورمین کو مل کر محکمہ فشریز کا خط دکھایا اور اس نے کہا کہ ہم مچھلی کی ڈیلوری لے سکتے ہیں - ہم نے فوراً مچھلیوں کو گودی پر ان لوڈ کرانا شروع کر دیا - چچا عبد الباقی نے مجھے شہر میں ایک سو خالی بوریاں لانے کے لئے بھیجا - جب میں بڑی مشکل سے خالی بوریاں لے کر

آیاتو مچھلیوں کو ان میں بھرنے کا کام شروع ہوا جو کہیں شام کے پانچ بجے جاکر ختم ہوا۔

مچھلیوں کو چھ اونٹ گاڑیوں میں لدواکر ہم روانہ ہوئے۔ کل والے بولی دینے والوں میں سے ایک دو آج بھی موجود تھے۔ ان میں سبز ڈاڑھی والا شخص بھی تھا۔ اب وہ چچا عبد الباقی کے پاس آیا۔

"بارہ سو روپئے میں دے دو۔۔۔ باقی خرچہ میں ادا کروں گا۔ تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں"۔ اس نے پھر پیش کش کی۔

"میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں۔ "چچا عبد الباقی نے چڑکر اسے بتلایا" کہ میں یہ مچھلی تمہیں فروخت نہیں کروں گا۔"

"فروخت آپ کیسے نہیں کریں گے۔ آخر اتنی چار من مچھلی کا آپ کیا کریں گے"۔

"یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم اس سے جو بھی کریں۔ تم کو کیا؟۔۔۔ بتاؤں تمھیں ہم کیا کریں گے۔ ہم ان کو غربا میں تقسیم کریں گے۔۔۔ ہم ان کو کھالیں گے۔۔۔ ہم ان کو واپس سمندر میں پھینک دیں گے لیکن تمھیں ہرگز نہ بیچیں گے۔ "چچا عبد الباقی نے غصے میں تھا۔

"آپ کو اسے سمندر ہی میں غالباً واپس پھینکنا پڑے گا۔ مارکیٹ میں اسے کوئی دیکھے گا بھی نہیں۔

"جہنم میں جاؤ" چچا گرجا۔

"میں تمہارے فائدے کی بات کررہا ہوں۔" سبز ڈاڑھی نے کہا" تم پچھتاؤ گے"۔

"میرا پیچھا چھوڑو۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ مچھلی فروخت نہ ہوگی۔ کیا میں پولیس کو بلاؤں بختیار پولیس کو بلاؤ"۔

"جہنم میں جاؤ" سبز ڈاڑھی نے بھی جاتے ہوئے وار کیا۔

"میں تمھیں پہلے وہاں پہنچاکر رہوں گا۔ "چچا نے اسے اطمینان دلایا۔

چناکریک (Chinna Creek) والی کسٹم کی چوکی پر کسٹم والوں نے ہمارا بڑا وقت ضائع کیا۔ ایک ریلوے گارڈ کی سی ٹوپی والے شخص نے ہم سے دو درجن بوریاں کھلواکر اندر سے جھانکا۔ غالباً اس کے نزدیک اس امر کا قوی امکان تھا کہ ہم مچھلیوں میں سونا چھپاکر لے جارہے ہیں۔ پورے تین گھنٹے ان لوگوں نے ہمیں خراب کیا اور آخر میں انھوں نے ایک درجن بوریاں اٹھواکر اپنے یہاں رکھ لیں، جن کی وہ فرصت کے وقت اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس میں مجھے سبز ڈاڑھی والے کا ہاتھ معلوم ہوا۔ اس نے شاید کسٹم والوں کو ہمارے خلاف کردیا تھا۔ میں نے اسے کئی دفعہ کسٹم کے ایک انسپکٹر کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے انہیں ضرور بتایا ہوگا کہ ہم سمگلر ہیں اور فی الواقع چچا عبد الباقی گودی پر کام کروانے کے بعد اپنی چڑھی ہوئی آستینوں کے ساتھ کویت یا بحرین کی

طرف کا کوئی مشکوک قزاق یا سمگلر ہونے کا تاثر دیتا تھا۔

کسٹم سے گزرنے کے بعد میں نے سبز ڈاڑھی والے کو نگاہ میں رکھا وہ اب بھی ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ یک لخت اس نے ایک حرکت کی جو مجھے بڑی عجیب لگی۔ اس کی ڈاڑھی ایک طرف سے اتر گئی تھی اور وہ اسے ہاتھ سے جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس کو چپکانے کے لئے صحیح قسم کی گوند استعمال نہیں کی تھی۔۔۔ فوراً مجھے پتا لگ گیا کہ اس کا چہرہ کیوں اتنا زیادہ آشنا تھا۔ یہ شخص محمد احسن اشرفی تھا۔۔۔ مصنوعی ڈاڑھی کے ساتھ۔

میں نے چچا عبد الباقی کو جاکر بتایا کہ میری رائے میں سبز ڈاڑھی والا شخص محمد احسن اشرفی تھا۔

"بختیار، تم میں چہروں کے یاد رکھنے کا ملکہ مطلق نہیں ہے۔" اس نے کہا" محمد احسن شرفی کی ڈاڑھی نہیں تھی"۔

جب میں نے اسے ڈاڑھی کو جمانے کا واقعہ سنایا تو اس نے اس پر غور کیا۔

"ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ اسے میں نے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے نقوش محمد احسن اشرفی سے بہت ملتے جلتے ہیں۔۔۔ اچھا ذرا ٹھیرو"۔

چچا عبد الباقی سبز ڈاڑھی والے شخص کی طرف گیا۔

"ہاں تو بارہ سو آپ نے کہے تھے؟" اس نے کہا

"اور وہ لوڈنگ وغیرہ کا خرچہ بھی دوں گا" سبز ڈاڑھی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بارہ سو روپے" چچا عبد الباقی نے سوچا" ذرا قبلہ معاف کیجئے۔ آپ کی ڈاڑھی میں دو تنکے الجھے ہوئے ہیں"۔ ایک پھرتیلی حرکت سے چچا نے سبز ڈاڑھی کو ہاتھ سے جھٹک دیا۔ ڈاڑھی بالکل صاف ایک گال اور ٹھوڑی سے اتر آئی اور محمد احسن اشرفی کے آشنا نقوش نمایاں ہو گئے۔ اشرفی نے ڈاڑھی کو پھر جلدی سے جمانے کی کوشش کی۔

"تم محمد احسن اشرفی ہو" چچا عبد الباقی نے فاتحانہ للکار سے اسے چیلنج کیا۔

"تم نے میری ڈاڑھی پر کیوں ہاتھ ڈالا" اشرفی بولا" بر سر بازار تم نے میری ہتک کی ہے۔ بہت سے لوگ دیکھ رہے تھے"۔

"تمہاری ڈاڑھی جعلی ہے اور تم یقیناً اشرفی ہو"۔

"ڈاڑھی میری اپنی ہے۔ کھال میں چند حیاتیات کی کمی کی وجہ سے یہ کبھی کبھی جھڑنے لگتی ہے"۔ اشرفی نے کہا" تمھیں اسے جعلی کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا"۔

"کیا تم محمد احسن اشرفی نہیں ہو؟"

"محمد احسن جائے جہنم میں۔ میرا نام حاجی چراغ دین ہے"۔

"اب رہنے بھی دو۔ مسٹر اشرفی" چچا نے مسکراتے ہوئے کہا" ہم نے تمھیں پہچان لیا۔

ویسے یہ بتاؤ کہ اس طرح کرنے سے تمہارا آئیڈیا کیا ہے"۔

"محمد احسن کی ایسی تیسی۔ میں حاجی چراغ دین، صدر انجمن مچھلی فروشاں کراچی ہوں"۔

اشرفی نے اصرار کیا"بولو، تم بارہ سو روپئے میں مچھلی فروخت کرتے ہو یا نہیں"۔

"تم ایک کمینے رزیل شخص ہو۔"چچا نے کہا۔

(۹)

فشریز کا ہیڈ کلرک ہمیں آگے پل پر رکشا میں آتا ہوا ملا۔ اس نے دیر سے پہنچنے کی معذرت کی اور چچا عبد الباقی کو ایک طرف لے جاکر کہا"تین من مچھلی ابی سینیالائنز میں کوارٹر اٹھارہ میں پہنچادیں۔ میری لڑکی کی کل شادی ہے۔ عبد الحنان آپ کو جگہ دکھادے گا۔"

ہیڈ کلرک رکشا میں واپس چلا گیا۔

فش مارکیٹ میں مایوسی ہماری منتظر تھی۔ جیسا کہ محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین نے پیش گوئی کی تھی وہاں کوئی بھی ہماری مچھلی کو خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ بیشتر مارکیٹ والوں کا سلوک ہمارے ساتھ تمسخرانہ اور ترحم آمیز تھا اور انھوں نے فوراً بھانپ لیا تھا کہ ہم مچھلی کے بیوپار کی ابجد سے بھی نابلد ہیں۔ وہ لوگ دو یا تین بار کھلم کھلا ہنسے اور عبد الباقی اور میرے بارے میں ایسی باتیں کہنے لگے جو لکھی نہیں جاسکتیں۔ آخر ایک بوڑھے دوکاندار نے ہمیں سمجھایا "میاں یہاں کا سارا مچھلی کا بزنس جرے بڑے ٹھیکے داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جنھوں نے آپس میں ایکا کر رکھا ہے۔ اگر تم اس مچھلی کو یہاں مفت بھی دو تو کوئی نہیں لے گا"۔

محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین چچا کے پاس آیا"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مچھلی ایسے نہیں بک سکتی۔ بارہ سو روپئے میں اب بھی سارا لاٹ لینے کے لئے تیار ہوں۔ خرچہ"۔

"اشرفی تم ایک دھوکہ باز ہو"۔چچا عبد الباقی نے کہا"تم لوگوں نے ہمیں ناکام بنانے کے لیے یہ سازش کی ہے۔ میرا نام عبد الباقی نہیں ہوگا اگر میں نے تمھیں ایک بھی مچھلی فروخت کی۔"

"اشرفی! کیا کہتے ہو۔ میں حاجی چراغ دین ہوں"۔

آٹھ بجے جب ہم مچھلی کو مارکیٹ کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو عبد الباقی نے فیصلہ کیا کہ اسے فی الحال چچا کے مکان واقع جیل روڈ کے احاطہ میں سٹیک کرادیا جائے۔ چچا کو اس امر کا یقین تھا کہ ایک دو روز میں مچھلی کے تھوک فروش اسے چار ہزار تک دینے پر رضامند ہوجائیں گے۔

ہم نے ابھی ساری امید نہیں کھوئی تھی مگر حالات ناموافقت اختیار کررہے تھے۔ پچھلے تجربوں کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا کہ چچا کی ایک اور سکیم سرمایہ لگانے والے حصہ دار بختیار خلجی کو چار ہزار کے زیاں میں مبتلا کرکے اپنے ناگزیر اور حسرت ناک خاتمہ پر پہنچ چکی ہے۔

(۱۰)

ہم نے مچھلی کے بوروں کو چچا کے مکان کے پچھلے احاطے میں ڈھیر کر دیا۔ یہ احاطہ پہلے بھی کئی بار مختلف اور عجیب و غریب اشیاء کے اسٹور کا کام دے چکا تھا۔ پاس کے کئی ہمسائے دیوار پر سے ہمیں بوروں کو ڈھیر لگاتے دیکھنے لگے اور جو اجرت ہمیں اونٹ گاڑی والوں کو دینا پڑی اس ڈر سے یہاں نہیں لکھی جاتی کہ کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔

دو تین دن مارکیٹ میں سرتوڑ کوششوں کے باوجود ہمیں مچھلیوں کا کوئی خریدار نہ ملا۔ چچا عبد الباقی نے آخر تجویز پیش کی کہ ہم مچھلیوں کو تھوک فروخت کرنے بجائے پرچون میں بیچیں ایک بورڈ " باقی فش سپلائی کمپنی "چچا عبد الباقی کے مکان کے پھاٹک پر لگا دیا گیا۔ اس کے نیچے گاہکوں کے لیے مختلف قسم کی مچھلیوں کی قیمت مقرر کرنے پر صرف کیا۔ پہلے دن کوئی بھی گاہک مچھلی خرید کرنے نہ آیا۔۔۔ چچا عبد الباقی لوگوں کی مچھلیوں سے اس قدر بے اعتنائی سے متحیر اور خفا تھا۔

مولوی عبد الحنان شام کو البتہ اپنی بوسیدہ پلس فور میں آیا۔ ہم نے اس دن سے جب سے ہم مرالر سے مچھلیاں لائے تھے، اس کی شکل نہیں دیکھی تھی اور چچا عبد الباقی کو یقین تھا کہ وہ بھی محمد احسن اشرفی اور دوسرے لوگوں کی طرح ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہے۔ آتے ہی اس نے مجھے اپنا پائپ پینے کے لیے پیش کیا۔ جسے میں نے خودداری کے جذبہ کے تحت قبول نہ کیا۔ اس نے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ پھر اس نے ہمیں اطلاع دی کہ ٹھادر کے راحت جان، ہوٹل کے منیجر حاجی حسین بخش نے اس کا داماد بننا منظور کر لیا ہے۔ شرائط پر دستخط وغیرہ ہو چکے ہیں اور ڈھائی سو روپئے پر فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے ایک نادر موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

عبد الحنان نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے وہ برائے نام کمیشن پر باقی فش کمپنی کے سیلز مین کی حیثیت سے کام کرے گا۔ اور ایک دو روز تک اپنے ہونے والے داماد حاجی حسین بخش سے کم از کم پندرہ سیر مچھلی کا آرڈر لے آئیگا۔ ہم نے شکر رنجی کی بناء پر اور اس کے دو غلے پن کو جانتے ہوئے اس سے زیادہ کھل کر باتیں نہ کیں۔ جاتے ہوئے مولوی عبد الحنان اپنی واسکٹ اور پلس فور کی جیبوں میں پانچ چھ مختلف قسم کی مچھلیاں ڈال کر لے گیا۔ انہیں وہ باقی فش سپلائی کمپنی کی مچھلیوں کے نمونوں کے طور اپنے داماد کو دکھانے کا آرزومند تھا۔

" یہ مولوی عبد الحنان کام کا آدمی ہے " ۔ چچا عبد الباقی نے کہا " ممکن ہے یہ محمد احسن اشرفی وغیرہ سے نہ ملا ہوا ہو۔ اب ہوٹلوں کے آرڈر شروع ہو جائیں گے۔ ہم بازار سے کہیں کم قیمت پر سپلائی کر رہے ہیں۔ تم ایک کام کرو۔ کل اپنی جیب میں ایک نوٹ بک لے کر کراچی کے بڑے

بڑے ہوٹلوں مثلاً میٹروپول، پیلس وغیرہ کے منیجروں سے ملاقات کرو، اور ان سے مچھلی کے آرڈر بک کر لو۔ اس سے تمھیں سیلز مین کے کام کا بھی تجربہ ہو جائے گا۔

(۱۱)

چار دن کے بعد مچھلی سڑنے اور بو چھوڑنے لگی۔ یہ اس قدر تیز اور بے پناہ تھی کہ آدمی اسے دو فرلانگ دور سے سونگھ سکتا تھا۔ مسز عبد الباقی نے چچا کو الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ مچھلی فوراً یہاں سے اٹھوانہ دی گئی تو وہ اپنے میکے چلی جائے گی۔ چچا عبد الباقی نے مجھ سے عورتوں کی خود غرضی اور تنگ دلی کی شکایت کی۔

اسی دن ساتھ کی کوٹھیوں اور مکانوں کے ہمسائے ایک وفد کی صورت میں چچا کے پاس آئے۔ انھوں نے شکایت کی کہ مچھلی کی سڑاند کی وجہ سے ان کی زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے، اور اسے فوراً یہاں سے اٹھوا دیا جائے۔

چچا نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔

"یہ میرا مکان ہے یہاں میں چاہوں تو گھوڑے باندھ سکتا ہوں۔ بکرے ذبح کرا سکتا ہوں۔ آلو کاشت کرا سکتا ہوں۔ بحیثیت مالک مکان یہ حقوق مجھے حکومت کی طرف سے حاصل ہیں آپ لوگوں کو مچھلی کی بو ناپسند ہے تو آپ کہیں اور جا کر رہ سکتے ہیں۔ مجھے تو یہ بو نہایت خوش گوار لگتی ہے۔"

وفد سخت غصے میں رخصت ہوا۔ اس کے ممبروں نے چچا کو دھمکی دی کہ وہ ہیلتھ افسر کو رپورٹ کریں گے۔

مولوی عبد الحنان اس عرصے میں تین دفعہ آیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ آرڈر بک کرنے کے لئے پوری جان مار رہا ہے۔ آخری دفعہ وہ چار بورے وہاں سے اٹھوا کر اپنے داماد کے لیے لے گیا۔

"میرے داماد کی مالی حالت آجکل اتنی اچھی نہیں۔" اس نے کہا "اسے مہینے کے آخر میں بل بھجوا دو۔ اس وقت وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہو گا"۔

دوسری دفعہ ایک اور پیشکش لایا جس سے پوری سازش کا حال جو ہمیں تباہ کرنے کے لیے کی گئی تھی ہم پر کھل گیا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ ہماری بربادی ایک منظم منصوبہ بازی کے تحت پلین کی گئی ہے اور یہ کہ غنڈوں کا ایک پورا سنڈیکیٹ ہمارے خلاف کام کرتا رہا ہے۔

مولوی عبد الحنان کراچی کے ایک فش کنگ کی پیش کش لایا۔

"عبد الباقی خان۔ وہ سارے لاٹ کے لئے چار سو روپئے دینے کو تیار ہے۔ میرے خیال میں اب تم اسے بیچ دو۔ مال سڑ رہا ہے"۔

"چار سو" چچا نے کہا" اس فش کنگ کا نام کیا ہے؟"

"حاجی چراغ دین۔ جس نے اس دن ڈاک پر بولی بھی دی تھی"۔

"تمہارا مطلب محمد احسن اشرفی سے ہے؟"

مولوی عبد الحنان کا منہ کھلا رہ گیا۔

"نکل جاؤ" چچا عبد الباقی گرجا" تم سب لوگ ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہو۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ براہ مہربانی میرے وہ مرتبان جو میں نے تمھیں دیئے تھے واپس کر دو"۔

عبد الحنان کو ان الفاظ نے صدمہ پہنچایا۔

"عبد الباقی خان! میں نے آپ کی خاطر اتنی دوڑ دھوپ کی۔ دن رات ایک کیا۔ ایک ہفتے سے میں فشنگ کے لئے نہیں جا سکا۔ اس سے میری صحت پر اثر پڑا ہے"

"مولوی عبد الحنان" چچا عبد الباقی نے پوچھا" اب سچ سچ بتاؤ تم لوگوں نے کتنے منڈر دینے والوں کو اس طرح خراب کیا ہے"۔

"عبد الباقی خان۔ مجھے فی الواقعی تمہاری اس بد ظنی سے دلی صدمہ پہنچا ہے"۔

"اچھا۔ اب دور ہو جاؤ۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا"۔

دور ہو جانے سے پہلے عبد الحنان نے مجھے ایک طرف لے جا کر یقین دلایا کہ اگر میں نے اس کی بیٹی شریفین کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی ہو تو وہ مجھے اپنی دامادی میں لینے کے لیے تیار ہے کیونکہ شریفین کو راحت جان ہوٹل کا منیجر پسند نہیں آیا۔ "چار جز" اس نے کہا" صرف ڈیڑھ سو روپے ہوں گے"۔

عبد الحنان کے چلے جانے کے بعد چچا عبد الباقی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔" بھتیجے بختیار! ان سب لوگوں نے مچھلیوں کے ٹھیکے داروں کو تباہ کرنے کی منظم سازش کی ہے۔ میں اب اس سنڈیکیٹ کے طریقہ کار کو سمجھ گیا ہوں۔ پہلے نئے شکاروں سے منڈر دلوایا جاتا ہے اور ان کو خوب لوٹا جاتا ہے۔ پھر منڈر کو ایک مجوزہ پلین کے مطابق قبول کر لیا جاتا ہے۔ مرالر کے کچ کی نیلام پر ایک ہزار سے زیادہ بولی نہیں دی جاتی اور بے چارہ ٹھیکدار یہ جانتے ہوئے کہ وہ مارکیٹ میں مال کو کھپا نہیں سکتا، آخر مال کو اس قیمت پر ہی فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔ اس طرح ٹھیکیدار بیچارے کا بالکل پلستر ہو جاتا ہے اور یہ لوگ سارا فائدہ اٹھاتے ہیں۔۔۔ یہ محمد احسن اشرفی، مولوی عبد الحنان اور فشریز کا ہیڈ کلرک سب اس انجمن کے ممبر ہیں۔ حقیقتاً یہ لوگ اس ریکٹ کو ایک باقاعدہ بزنس فرم کی لائنز پر چلا رہے ہیں۔۔ تم اخباروں کے دو تین ایڈیٹروں کو جانتے ہو۔ اس ریکٹ کے خلاف ان میں لکھو۔ ان کو ایکسپوز کرو"۔

"مگر ڈپٹی سیکرٹری تعلیم و تربیت حیوانات۔"

"وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہے۔ وہ شکار پھانستا ہے۔ دیکھو بختیار کتنا بڑا ریکٹ

ہے"۔

چچا عبد الباقی اور میں بیٹھے اس سنڈیکیٹ کے ممبروں کی کمینگی اور رذالت پر گرم بحث کر رہے تھے کہ نیچے سے کچھ شور سا سنائی دیا۔ تھوڑی دیر بعد چچا کے لڑکے عبد الرحمن نے آکر ہمیں بتایا کہ دو پولیس مین اور بہت سے آدمی نیچے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

"ان سے کہو میں گھر پر نہیں ہوں۔" عبد الباقی نے غسل خانے کا رخ کرتے ہوئے کہا

"میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ گھر پر ہیں"۔

"کتنی دفعہ عبد الرحمن میں نے تم کو سمجھایا ہے۔ اچھا ان کو اوپر بلا لو۔"

"میں نیچے نہیں جاؤں گا" عبد الباقی اس نازک موقع پر بھی وقار اور جرات کا مجسمہ تھا۔ ایک دھاریدار ریشمی سوٹ میں ایک موٹا سا آدمی اپنے ساتھ پولیس مین لیے اوپر آیا۔

"آیئے -- صاحبان -- تشریف رکھیے۔" چچا عبد الباقی نے کہا "سنایئے -- کیسے آنا ہوا۔ بختیار انہیں سگریٹ پیش کرو"۔

"نہیں میں بیٹھوں گا نہیں۔" نووارد نے روکھے پن سے کہا "میں ہیلتھ افسر ہوں۔ آپ کے محلے والوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ آپ نے یہاں مچھلی اسٹاک کی ہے جس کی سڑاند کی وجہ سے ان کی صحت خطرہ میں ہے۔ بڑی سڑاندی اسمیل (SMELL) ہے"۔

"آپ یہاں میونسپل قواعد کے مطابق مچھلی اسٹاک نہیں کر سکتے --یہ کوئی مارکیٹ نہیں مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ گلتی سڑتی مچھلی فوراً یہاں سے اٹھوا کر دور پھینکوانا پڑے گی۔ یہ اب انسانی خوراک کے لیے ٹھیک نہیں رہی۔ پھینکوانے وغیرہ کا خرچہ آپ کو دینا ہوگا۔ اور میونسپل کمیٹی شہریوں کی صحت کو خطرے میں ڈالنے کی بناء پر آپ کے خلاف مقدمہ دائر کرے گی۔"

"سنو" چچا عبد الباقی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "یہ ڈیموکریسی ہے کہ ایک شخص اپنے گھر میں مچھلی بھی اسٹاک نہیں کر سکتا---"

(۱۲)

چچا اور میں بالکونی سے میونسپل کمیٹی کے آدمیوں کو چھکڑوں میں مچھلی کے بورے لادتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ہمارے دل خون کے آنسو رو رہے تھے مگر بے بس تھے۔ پانچ چھ پولیس مین بھی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ ظاہراً یہ مچھلی پھینکوانے کے لیے جا رہی تھی۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ کئی بورے مارکیٹ میں فروخت ہوئے۔

یہ اس مچھلیوں کے قصہ کا خاتمہ تھا-- لیکن یہاں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

اس کے چند دن بعد چچا عبد الباقی اور میں الفنسٹن سٹریٹ پر مٹرگشت کر رہے تھے--

اچانک ہم نے سامنے سے محمد احسن اشرفی، اس کی بیوی اور اشرفی بچوں کی پوری فوج کی فوج کو آتے دیکھا۔ وہ ابھی کچھ دور تھے۔ چچا نے میری بانہہ ٹوہ کر کہا "بختیار۔ ادھر آجاؤ۔" ہم ایک چھوٹی گلی میں ہولیے۔ چچا نے یہاں ایک اسٹال سے دو دو درجن کچے انڈے خریدے اس نے ایک درجن انڈے مجھے دے دیے۔

جب اشرفی کنٹنجنٹ سامنے سڑک سے گذری تو ہم نے ان پر نشانہ باندھ باندھ کر انڈے مارے۔۔ یقین ہے کہ وہ سب اپنے نشانوں پر لگے۔ دوسرے لمحے میں اور چچا عبد الباقی گلی میں بھاگتے ہوئے پیراڈائز کے ہجوم میں مل جل گئے۔ پکچر کا نام "موبی ڈک" تھا اور یہ ایک اچھی پکچر تھی!

محمد خالد اختر

زیبرا سکیم

زیبروں کو درآمد کرنے کا انوکھا خیال چچا عبد الباقی کے ذہن میں پہلے پہل غالباً اس اتوار کو آیا جب ہم ۔۔۔۔۔ چچا عبد الباقی، اس کا سات سالہ لڑکا عبد الرحمن اور میں چڑیا گھر میں جانوروں کا معائنہ کرنے گئے ۔ معائنہ کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے کیوں کہ جس طریق سے چچا جانوروں کو غور اور سنجیدگی سے دیکھتا ہے، اس کے لئے معائنہ کا لفظ ہی مناسب ہے ۔

میں نے غالباً پہلے بھی کہیں عبد الرحمن کا ذکر کیا ہے ۔ وہ نکلے ہوئے کانوں والا ایک شوخ لڑکا ہے جسے اپنے بڑوں کا ذرہ برابر بھی پاس ادب نہیں ۔ ایسے بچوں کی ہی وجہ سے بزرگ حضرات کو قیامت کے قرب کا احساس ہو چلا ہے ۔ ان دنوں میں کچھ روز کے لئے چچا کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا اور ایک طریق سے اس عبد الرحمن کی اتالیقی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا ۔ اپنے شاگرد کی مستقل صحبت چند دنوں سے میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی ۔ عبد الرحمن میرا حد درجہ مشتاق ہو رہا تھا ۔ پل بھر کے لئے مجھے تنہا نہ چھوڑتا اور میں سرد آہیں بھر کر اکثر اس بات پر تعجب کرتا کہ بعض انسان دوسرے انسانوں کے اس قدر مشتاق کیونکر ہو جاتے ہیں ۔ چچا کے مکان پر ابھی مجھے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا اور اس عرصے میں عبد الرحمن مجھ سے میرا مفلر اور سگریٹ لائٹر بطور خود مانگے ہوئے تحفوں کے قبول کر چکا تھا ۔ ایک دو روز وہ مجھے اس بات پر اکسانے میں لگا ہوا تھا کہ میں اپنی کلائی کی گھڑی بھی نذر کر دوں ۔ اس کا اسکول کا کام بھی میں اسے کر کے دے رہا تھا ۔ چچا عبد الباقی اپنے منہ بولے بھتیجے اور نوخیز ہونہار بیٹے کے درمیان اس قدر محبت اور دوستی کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا ۔ اور اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ محبت اور دوستی یک طرفہ ہے پھر بھی وہ یہی ظاہر کرتا جیسے میں عبد الرحمن پر جان چھڑکتا ہوں اور اس سے گہری وابستگی اور انس رکھتا ہوں ۔

انہی دنوں ایک چمکیلی، سنہری اتوار کو چڑیا گھر کے جانور ہمیں دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوتے تھے ۔ چچا عبد الباقی کے ہمراہ چڑیا گھر جانا ایک سعادت ہے ۔ ہمارا جانوروں کے معائنہ کا طریقہ کار یہ تھا کہ ہم ایک جانور کے پنجرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ۔ چچا ہم سے ایک قدم آگے بالکل پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ پہنچ کر رک جاتا ۔ اور عبد الرحمن اور میں اس کے پیچھے صف آرا ہو جاتے ۔ چچا عبد الباقی چشمہ ناک پر ڈھلکائے ہاتھ میں بید کی سوٹی لیے اور مجسم متانت اور وقار کی تصویر بنے جانور کا معائنہ کرتا ۔ معائنے کے دوران میں اپنی سوٹی سے جانور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے اور عبد الرحمن کو اس جانور کی عادات و خصائل، طریق بود و باش، فلسفہ، زندگی وغیرہ

پر ایک بسوط لکچر دیتا ۔ مجھے مختلف جانوروں کے متعلق اس روز کئی قسم کی معلومات حاصل ہوئیں جو بہت عجیب و غریب تھیں ۔ ایک جگہ چچا کا یہ معائنہ پورا کامیاب نہ رہا ۔ بدقسمتی سے جانور نے موقعہ کی سنجیدگی اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا ۔ ہوا یہ کہ چچا عبد الباقی برازیلی بندروں کے جوڑے کے پنجرے کے ساتھ کھڑے ہوئے میرے اور عبد الرحمن کے استفادہ کی خاطر برازیلی بندروں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈال رہے تھے اور چچا کی تقریر سننے کے لیے کئی تماشائی ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے ، خود برازیلی بندروں کا جوڑا چچا کی باتوں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ اس تقریر کے دوران میں چچا نے کسی مسئلے پر زور دینے کے لئے اپنی سوٹی اٹھا کر بندروں کی طرف اشارہ کیا جس پر برازیلیوں میں سے ایک نے نہایت پھرتی اور صفائی سے سلاخوں میں پنجہ نکال سوٹی کو جھپٹ لیا ۔ چچا کی تقریر لوگوں کے قہقہوں میں ختم ہو گئی ۔ چچا نے ہمیں مڑ کر یقین دلایا کہ برازیلیوں نے یہ محض دل لگی کی ہے اور ان کا سوٹی چھین لینے کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ کہ وہ اس سے تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد اسے لوٹا دیں گے ۔ برازیلیوں کی مزاح کی حس اور معقولیت کے بارے میں چچا کی خاص رائے تھی ۔ ہم نے برازیلیوں کو کئی طریقوں سے سوٹی واپس کرنے پر اکسایا ۔ عبد الرحمن نے انہیں دو تین مونگ پھلی کے پیکٹ پیش کیے ۔ مگر برازیلی اپنی مزاح کی حس کو بہت دور لے جانے پر تلے بیٹھے تھے ۔ تھوڑی دیر کے بعد چچا عبد الباقی نے برازیلیوں میں اپنا اعتماد کھو دیا ۔ ان کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی اور ان کو دھمکی دی کہ وہ چڑیا گھر کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر چڑیا گھر کے بعض جانوروں کے برے اخلاق کی شکایت کرے گا اور اس سے اپنے نقصان کے ہرجانے کا مطالبہ کرے گا ۔ اس کی نوبت نہ آئی اور چڑیا گھر کے ایک ملازم نے آخر خود پنجرے کے اندر جا کر چچا کی سوٹی کو برازیلیوں سے رہائی دلوائی ۔

چچا کے سکون طبع کو دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب ہم شیر ببر کے پنجرے کے سامنے کھڑے تھے ۔ یہ شیر ببر ایک معمر حیوان تھا اور سلاخوں کے پاس لیٹا ہوا ہمیں ایک بیزاری کے عالم میں تک رہا تھا ۔ چچا سلاخوں سے آدھ فٹ کے فاصلے پر اپنی سوٹی کو زمین پر ٹیکے شیر ببر کا معائنہ کرنے لگا ۔ وہ ہمیں شیر ببر کی جرأت اور وسعت قلبی اور اس کی خودی پر ایک تقریر کر رہا تھا اور ہم پر واضح کر رہا تھا کہ کس طرح ایک شیر ببر ایک عام شیر سے یعنی اس شیر سے جو ببر نہیں ہوتا ہر لحاظ سے ممتاز ہوتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ ہمیں یہ بتا رہا تھا کہ شیر دریا میں سید ھا تیرتا ہے اور اگر وہ تیرتے ہوئے بہاؤ میں مڑ جائے تو واپس کنارے پر آ کر دوبارہ تیرتا ہے ۔ شیر ببر نے احتجاج کے طور پر اٹھ کر اپنے بڑے ایال دار سر کو جھنجھوڑا اور خوفناک طریق سے دھاڑا ۔ چچا عبد الباقی اور ہم فوراً وہاں سے بھاگے اور زیبروں کے احاطہ کے پاس آ کر دم لیا ۔

احاطے میں دو زیبرے زمردیں گھاس پر ٹہل رہے تھے ـــــــــ وہ چاق و چوبند

دھاری دار زیبرے، بھوری خاکستری کھال پر چوڑی سیاہ دھاریاں خوشنما معلوم ہو رہی تھیں۔ اور چوپایوں کے خلاف اپنی جبلی مخاصمت کے باوجود میں انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ چچا عبد الباقی احاطے کی جالی کے ساتھ لٹکے ہوئے ایک لکڑی کے بورڈ کی طرف چلا گیا جسے چڑیا گھر کے منتظمین نے ان لوگوں کی خاطر لگوایا تھا جو زیبروں میں کسی قسم کی دلچسپی لیتے تھے۔ اس پر انگریزی میں زیبروں کے متعلق ہر نوع کی معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ بورڈ کو بغور پڑھنے کے بعد چچا عبد الباقی ہماری طرف آیا اور اس نے عبد الرحمن اور مجھے فخر سے یہ اطلاع دی کہ احاطے میں وہ جو دو خچر نما جانور ہیں حقیقتاً زیبرے ہیں۔

اس نے ہمیں احاطے والے زیبروں کے گزشتہ سوانح کے بارے میں ایک لیکچر دیا۔ چچا عبد الباقی ان حیوانوں کے اجلے کوٹوں اور چست انداز سے بے حد متاثر معلوم ہوتا تھا اور اس کی رہنمائی میں، ہم نے احاطے کی جالی دار چار دیواری کے گرد چار پانچ چکر لگائے۔ چچا ان چوپایوں کو ہر ممکن زاویے سے دیکھنا چاہتا تھا۔ عبد الرحمن بھی زیبروں کے متعلق کچھ جانتا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ جانتا ہے۔ اس نے اپنی اردو کی کتاب میں زیبروں پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے درمیان جو مجھے علم الحیوانات کے متعلق مکمل معلومات دینے پر مصر تھے میں نے اپنے آپ کو بے حد جاہل محسوس کیا۔ میں نے تہیہ کیا کہ چڑیا گھر سے جاتے ہی زیبروں پر ایک مکمل کتاب پڑھوں گا اور اپنی معلومات عامہ کو وسیع کرنے کی کوشش کروں گا۔ چوپایوں کے بارے میں میری معلومات بہت کم ہیں اور جو کچھ میں ان کے بارے میں جانتا ہوں وہ ہر شخص جانتا ہے۔ مثلاً مجھے یقین ہے کہ بھینس گوشت نہیں کھاتی اور اونٹ درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ دریائی گھوڑے کے تفریحی مشاغل کیا ہوتے ہیں، یا شیر کی معاشرتی اور پرائیویٹ زندگی کس نوعیت کی ہوتی ہے تو میں بالکل کورا ثابت ہوں گا۔ اور بجائے کوئی جواب دینے کے بغلیں جھانکنے لگوں گا۔

چچا عبد الباقی نے اپنا بازو میرے بازو میں دیتے ہوئے کہا "بھئی بختیار! یہ زیبرے اچھے خوبصورت جانور ہیں۔ اگر ان کی دھاریاں نہ ہوں تو یہ خچروں اور گھوڑوں کی طرح مٹیالے اور غیر دلچسپ نظر آنے لگیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ان زیبروں کو وکٹوریا تانگے کے آگے گھوڑوں کی بجائے جوتا جائے تو کیسا رہے گا۔ ذرا تصور کرو کہ کراچی کی وکٹوریوں کے آگے مریل بھورے گھوڑوں کی بجائے چست دھاری دار زیبرے جتے ہوئے ہیں۔۔۔۔ سنو بھئی بختیار کیوں نہ ایک زیبرا درآمد کمپنی کھولی جائے اور نائجیریا سے زیبرے درآمد کئے جائیں اور وہ وکٹوریہ والوں کو مہیا کئے جائیں۔ بڑا اچھا بزنس ہو سکتا ہے۔"

"زیبروں کو گاڑی کے لئے غالباً نہیں سدھایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ میں نے زیبروں کے متعلق یہ بات کہیں پڑھی تھی یا کسی سے سنی تھی۔

"تم کو کس نے بتایا؟" چچا عبد الباقی نے روک کر احتجاج کیا۔ "لوگوں نے شیروں وغیرہ کو سدھا کر چھوٹے چھکڑوں میں جوت رکھا ہے۔ زیبرے تو پھر زیبرے ہیں۔ آؤ ہم زیبرے درآمد کریں گے اور بیچیں گے۔ میں خود ان کو سدھانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ جب وکٹوریا والوں کو پتہ لگے گا کہ انہیں معقول داموں پر خوبصورت چتکبرے زیبرے دستیاب ہو سکتے ہیں تو وہ زیبروں پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"مگر چچا فائدہ کیا۔ گھوڑے کیا کریں گے۔ گھوڑے بے کار ہو جائیں گے"۔

"وقت آرہا ہے جب گھوڑے بیکار ہو جائیں گے۔ بھتیجے بختیار خلجی! واللہ مجھے گھوڑوں کے خلاف کوئی بغض نہیں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مستقبل تاریک ہے۔"

چڑیا گھر کے ایک ملازم کے بتانے پر کہ اب چڑیا گھر بند ہو رہا ہے اور پھر چار بجے شام کو کھلے گا ہم نے زیبروں کو خیرباد کہا اور پھاٹک کی طرف بھاگے۔ زیبروں کی درآمد کی تجویز پر بحث پھاٹک تک ہوتی رہی اور جب ہم وہاں سے گھر کے لیے دوہری چھت والی بس میں سوار ہوئے تو چھت کے اوپر بھی یہ بحث جاری رہی۔ چچا عبد الباقی کی واضح دلیلوں کے باوجود کہ زیبروں کی درآمد بے حد منافع بخش رہے گی، میں ابھی پوری طرح مطمئن نہ ہوا۔ اور میرے شکوک کلی طور پر رفع نہ ہوئے تھے۔

چچا کے ڈرائنگ روم میں شکر کی چائے پیتے ہوئے بھی ہماری گفتگو کا موضوع زیبرے تھے

"دیکھو بھئی بختیار! میری بات سنو۔" چچا نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "فرض کرو ہم پہلے پہل سو زیبرے درآمد کریں اور ان کی پہلی افزائش نسل کا انتظام کریں۔ سال کے اخیر تک اگر ہمارے پاس پانچ سو زیبرے بھی ہوں۔ ممکن ہے ہزار ہوں یا دو ہزار ----- میں کم سے کم تخمینہ لگا رہا ہوں۔ ہاں اگر پانچ سو زیبرے بھی ہوں اور ہم ان کو پانچ سو روپیہ فی زیبرہ کے حساب سے بھی فروخت کریں تو پانچ سو روپیہ ضرب پانچ روپیہ کتنے ہوئے۔؟ عبد الرحمن بھئی پانچسو کو ذرا پانچسو سے ضرب دو۔"

عبد الرحمن نے اپنی کاپی پر ضرب دے کر جواب بتایا۔ "پانچسو پچاس۔"

"پانچ سو پچاس روپئے ہوئے۔ ہاں بھئی بختیار پانچ سو پچاس --- مگر بھئی عبد الرحمن پانچ سو پچاس کیسے ہوئے۔"

"دو لاکھ پچاس ہزار بنتے ہیں۔" میں نے زبانی ضرب دے کر بتایا۔ میری ریاضی عبد الرحمن سے قدرے بہتر ہے۔

"دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ۔ چلو پچاس ہزار روپیہ چھوڑ دو۔ دو لاکھ ہمیں پھر بھی بچتے ہیں

اور کتنی مدت میں ۔ صرف ایک سال کی مدت میں اور پھر ہمیں مزید زیبرے درآمد کرنے کی بھی ضرورت نہیں ۔ ہمارے اپنے زیبرے بڑھتے رہیں گے ۔"

"لیکن چچاوہ تو تم نے سال کے اخیر میں بیچ دیئے تھے ۔"

"نہیں بھئی ۔ سارے کہاں بیچے تھے اور پھر جن کو ہم زیبرے فروخت کریں گے ان کو اس شرط پر فروخت کریں گے کہ ان میں سے جو زیبرے پیدا ہوں گے وہ ہماری ملکیت ہوں گے ۔ ہم ان لوگوں سے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کرائیں گے ۔"

مجھے ابھی تک اس اسکیم کی کامیابی کے بارے میں شکوک تھے ۔ میں نے ماہنامہ " الو " کے اجراء اور دوسری کئی اسکیمات کے حسرت ناک انجام کے متعلق سوچا ۔ ہم نے ان کو کس طمطراق ، کس خود اعتمادی سے شروع کیا تھا اور آخران کا کیا حشر ہوا ۔ وہ تو پھر بھی کسی حد تک معقول اسکیمیں تھیں ۔ یہ زیبروں کی درآمد کی سکیم تو بالکل بے معنی سکیم تھی ۔

" دیکھو میرے بھتیجے بختیار ۔ "چچا نے میرے خیالات بھانپتے ہوئے کہا" جب کوئی باہمت شخص نئی اور انوکھی چیز شروع کرتا ہے تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ لیکن ہمیں بے وقت لوگوں کے قہقہوں سے نہ ڈرنا چاہئے ۔ جب میں نے مرغیوں کی فارمنگ کا آغاز کیا تو کئی میرے اپنے احباب مجھ پر ہنستے تھے اور کہتے تھے "عبد الباقی شرط رہی کہ مہینے کے اندر اندر تم ان مرغیوں کو خود کھا جاوگے ۔"

" اور چچا! تم واقعی کھا گئے ۔ "

" تمہیں کیسے پتا ہے ؟"

"تم نے خود ہی ایک دفعہ بتایا تھا ۔"

" بھئی بختیار ! وہ اور بات ہو گئی تھی ۔ ہم نے آغاز ایک سو مرغیوں سے کیا ۔ انہی دنوں مجھے درد گردہ کی شکایت ہو گئی ۔ ڈاکٹر نے خوراک تجویز کی کہ ہر روز مرغ یخنی پیا کروں ۔ پھر گھر میں روز چار چار مہمان آکر رہنے لگے ۔ وہ مجھ سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں مشورے کرنا چاہتے تھے ۔ مرغیوں کی فارمنگ شروع کرتے ہی میں احباب میں بے حد مقبول ہو گیا تھا اور وہ اکثر شام کو میرے غریب خانہ پر آموجود ہوتے تھے ۔ جب مرغیاں ختم ہو گئیں ، میری مقبولیت فوراً گھٹ گئی ہاں تو بھئی بختیار ! وہ مرغیاں زیادہ تر احباب کھا گئے ۔ جو کچھ تھوڑی بہت بچ گئی تھیں انہیں بالا قساط پڑوسیوں کا ایک بلا پکڑ پکڑ کر کھاتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر یہ تو دوسرے قصے شروع ہو گئے ۔ میں کہہ رہا ہوں کہ زیبروں کا معاملہ دوسرا ہے ۔ تم بھی اس پر سوچو اور میں بھی اس پر غور و فکر کرتا ہوں "

"چچا پہلے یہ تیقن کر لینا چاہئے کہ آیا گھوڑے گاڑی والے زیبرے جوتنے پر آمادہ ہو جائیں گے ؟"

"آمادہ کیوں نہ ہوں گے ۔ آخر انہیں کونسا نقصان ہے ۔ ابھی تو میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ پہلے پہل کوئی نئی بات کی جائے تو ہر کوئی ہنستا ہے ۔ جب پہلے پہل ہنری فورڈ اپنی فیکٹری کی پہلی موٹر کار میں چڑھ کر باہر نکلا تو تمہیں پتا نہیں کہ دیکھنے والوں کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ پڑ گئے ۔ زیبرے آجائیں تو ان کو فروخت کرنے سے پہلے ہم ایک نمائشی زیبرا گاڑی رکھیں گے ۔ اور اس میں بیٹھ کر شام کو ہوا خوری کے لئے میکلوڈ روڈ اور الفنسٹن سٹریٹ میں سے گزرا کریں گے ۔ اس طرح لوگ زیبروں کو وکٹوریا کے آگے جتا ہوا دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے ۔ اور رفتہ رفتہ یہ جدت جڑ پکڑنے لگے گی ۔ یہ نمائشی گاڑی بڑی ضروری ہے ـــ ۔ اب میں تمہیں ایک اور مثال دیتا ہوں ، شروع شروع میں جب میں کراچی آیا تو لوگ میری ترکی ٹوپی پر تعجب کرتے اور ہنستے تھے ۔ اس وقت یہاں بہت کم ترکی ٹوپی پہننے والے لوگ تھے ۔ اب تم خود جانتے ہو ترکی ٹوپی کس قدر عام نظر آتی ہے ۔ کل ہی کی بات ہے میں الفنسٹن سٹریٹ میں سے گزر رہا تھا، سامنے سے چار اچھے بھلے پر وقار شخص ترکی ٹوپیاں پہنے اور ایک قطار میں چلتے میرے پاس سے گزرے ۔ انھوں نے مجھے السلام علیکم کہا ۔ حالانکہ وہ مجھ سے واقف نہ تھے اور مجھ سے پیراڈائز سنیما کا راستہ دریافت کیا ۔ تو یہ بات ہوتی ہے بھئی بختیار! پہلے زیبروں کے خلاف تعصب کو دور کرنا ہے ۔ ایک دفعہ وہ تعصب دور ہو گیا تو زمین ہموار ہے ۔ اور گھوڑوں کے متعلق! میری اس بات کو پتھر پر لکیر سمجھ لو کہ گھوڑوں کا مستقبل قطعاً روشن نہیں تاریک ہے ۔

"تمہاری رائے میں گھوڑوں کا اب کوئی چانس نہیں ۔ انہیں میدان چھوڑ دینا چاہئے " ۔

"زیبروں کے سامنے وہ نہیں ٹھہر سکتے ۔ یہ میرا ایمان ہے ۔"

میرا اب بھی اطمینان نہ ہوا تھا ۔ مگر چچا عبد الباقی نے جمہوری اصول کے مطابق ووٹ لے کر (جس میں اس کے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے دو ووٹ تھے) اس امر کا فیصلہ کر دیا کہ زیبرا امپورٹ کمپنی ضرور قائم کی جائے گی ۔ سرمایہ کی فراہمی کا کام میرے ذمے تھا ۔ اور باقی کاروبار کی شرائط تقریباً وہی تھیں جو پہلی سکیموں میں ہوئی تھیں ۔ چچا عبد الباقی اس بزنس میں آدھے سے زیادہ کا حصے دار ہونے کا روادار نہ تھا ۔ وہ بلا تنخواہ مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرنے پر تیار تھا ۔ اگر میں چاہوں تو عبد الرحمن کو بھی ایک تیسرے شریک کی حیثیت سے لیا جا سکتا تھا ۔ مگر اس کا فیصلہ کلی طور پر میری دلی منشاء پر چھوڑ دیا گیا ۔

"سرمایہ اب کیسے حاصل کیا جائے ؟ " میں نے کہا " میرے پاس تو صرف چار روپئے آٹھ آنے ہیں ۔ اور میرا والد اب روپئے کے معاملے میں سخت گیر ہو گیا ہے ۔ انہیں میری سکیموں پر بالکل اعتماد نہیں ہے ۔"

"ارے بھئی بختیار! " چچا عبد الباقی بولا " لکھ کے تو دیکھو ۔ تین ہزار روپیہ شروع میں کافی

ہوگا ۔ میں نے سنا ہے اس بار ہڈیوں کا نرخ کافی چڑھا ہوا تھا اور انھوں نے ہڈیوں کے کاروبار میں کافی ہاتھ رنگے ہیں ۔ آخر تم ان کے اکلوتے بیٹے اور جائز وارث ہو ۔ ان کا روپیہ تمہارے کام بھی تو آنا چاہیئے ۔ آخر کار تمہارے مستقبل کا سوال ہے ۔ بھئی روپیہ کمانا چاہیے ۔ اتنے تفکرات کے باوجود میں اب بھی جب صبح بستر سے اٹھتا ہوں تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے گاتا ہوں "عبد الباقی دیکھ ایک اور نیا دن طلوع ہوا ہے ۔ کیا تم اسے یونہی بے فائدہ گزر جانے دو گے ؟"

"چچا میں صبح اٹھ کر اپنے آپ کو انہی الفاظ سے مخاطب کرتا ہوں ۔ لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا"

"مجھ پر بھروسہ کرو ۔ "چچا عبد الباقی بولا" زیبرے ہماری مشکلات کو حل کریں گے ۔"

(۲)

جہاں تک سکیم کا تعلق تھا زیبرا درآمد کمپنی کی داغ بیل اسی شام چچا عبد الباقی کے ڈرائنگ روم میں پڑ گئی تھی ۔ مگر سرمائے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس سکیم کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا جاسکا ۔ دن گزرتے گئے ۔ اور اس عرصے میں میں چچا کے مکان سے کھارادر میں ایک فلیٹ میں ایک دوست کے پاس اٹھ آیا ۔ جب بھی میں چچا سے ملتا تو ہماری گفتگو کا موضوع زیبرے ہوتے ۔ میں اپنے والد کو روپوں کے لئے لکھنے سے ہچکچاتا تھا ، کیونکہ میں ان سے اپنی کئی روپیہ کمانے والی سکیموں کے سلسلے میں اتنی مرتبہ روپیہ لے چکا تھا کہ اب ان کا متاثر ہونا محال نظر آتا تھا ۔ اپنے پچھلے خط میں انھوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مجھے ان سے اب کبھی ایک پائی بھی نہ ملے گی ۔ اور یہ کہ جہاں تک روپوں کا سوال تھا میں انہیں بھلا دوں تو بہتر ہے ۔

آخر مجھے لکھنا پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی ۔ واضح الفاظ میں روپے کا مطالبہ کرنے کی بجائے میں نے ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کیا ۔ میں نے پہلے تو خط میں انہیں اس سال کے کاروبار میں خوب منافع کمانے پر مبارکباد دی اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا ، اس کے بعد ان پر یہ واضح کیا کہ میں نے یہاں ایک امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول لیا ہے اور درآمد کا کام باقاعدہ شروع کر دیا ہے ۔ میں نے زیبروں کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا ۔ میرا خیال تھا بوڑھا آدمی میرے اشارے کو بھانپ جائے گا ۔ مگر پہلے تو انھوں نے خط کا جواب ہی نہ دیا ۔ دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ منافع کے متعلق میری اطلاعات نہایت غلط تھیں ۔ اور انہیں امسال کم از کم پچاس ہزار کا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے ۔ انھوں نے میرے درآمد کی کمپنی کے کھولنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور پھر یہ نصیحت بھی کی تھی کہ سرمائے کی کمی سے نہ گھبرانا چاہیئے اور یہ کہ جس وقت انھوں نے ہڈیوں کا دھندا شروع کیا ، ان کی جیب میں کل ساڑھے پانچ آنے تھے ۔

میں نے یہ خط چچا عبد الباقی کو دکھایا ، اور دیر تک ہم بوڑھے آدمی کی خود غرضی اور کوتاہ نظری پر اظہار افسوس کرتے رہے ۔ اس خط کے دوسرے دن ہی مجھے والد کی طرف سے ایک تار موصول

ہوا کہ فوراً آؤ ۔ تمہاری شادی کی بات چیت ہو رہی ہے اور تمہارا ہونے والا خسر تمہیں دیکھنے کا خواہاں ہے ۔

مجھے جانے میں قدرے تامل تھا ۔ مجھے دیکھنے کے بعد پہلے کئی ہونے والے خسر اپنے ارادے تبدیل کر چکے تھے ۔ جب میں نے یہ تار چچا عبد الباقی کو دکھایا تو اس نے مجھے فوراً جانے کا مشورہ دیا ۔ اس نے مجھے کئی ایسے نیک دل خسروں کی مثالیں دیں جنھوں نے شادی کے وقت اپنے دامادوں کو تحفتہً پانچ ہزار یا اس سے زیادہ کے چیک عنایت کیے تھے ۔ چچا عبد الباقی کی رائے میں یہ میرے لیے ایک سنہری موقع تھا ۔ چچا خود مجھے گاڑی پر سوار کرانے اسٹیشن تک آیا ۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ خود مجھے گاڑی پر سوار کرانے نہ آیا تو میں اپنا ارادہ بدل لوں گا ۔ مجھے رخصت کرتے وقت اس نے مجھ سے ساڑھے چار روپئے ٹیکسی کے لیے قرض لیے ۔ چونکہ وہ مجھے سوار کرانے کے لیے آیا تھا اس لیے غالباً وہ یہ مناسب سمجھتا تھا کہ میں اس کو ٹیکسی میں واپس پہنچانے کا خرچہ برداشت کروں ۔ اس دفعہ بھی وہ حسب معمول اپنے پیسے اپنے دوسرے کوٹ کی جیب میں بھول آیا تھا ۔ وہ مجھ سے میری کلائی کی گھڑی بھی ادھار لینا چاہتا تھا ۔ مگر میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے اسے اس بات کا موقع نہ دیا ۔ جب گاڑی نے وسل دی اور رفتہ رفتہ چلنے لگی تو چچا عبد الباقی کچھ دیر پلیٹ فارم پر اس کے ساتھ بھاگتا آیا ۔ اس کی گول مٹول پر وقار اور ہنس مکھ ہلتی ہلاتی ہوئی شخصیت گاڑی کے پلیٹ فارم سے دور تک نکل جانے کے بعد تک مجھے نظر آتی رہی ۔ میری آنکھیں بھیگ سی گئیں ۔ ہم خلجی بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں ۔ میں نے افسوس کیا کہ میں نے اسے اپنی کلائی کی گھڑی کیوں نہ دیدی ۔

جب میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کی گرد اور سیاہی میں ملفوف گھر پہنچا تو بوڑھا آدمی برآمدے میں بیٹھا اپنی داڑھی کو وسمہ لگا رہا تھا ۔ ایک اور چھوٹا سا دبلا شخص جو قدرے ایک بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح تھا سامنے کرسی پر ٹانگ رکھے بیٹھا ایک پلیٹ میں سے چلغوزے کھا رہا تھا ۔ کسی چیز نے مجھے بتایا کہ یہی وہ ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر ہے یعنی میرا ہونے والا سسر ۔ میرا دل میرے بوٹوں تک ڈوب گیا ۔ ہونے والے خسروں کا ہمیشہ مجھ پر یہی اثر ہوتا ہے ۔ ہم خلجی قدرے نروس ہیں ۔

" اچھا تو آپ بتا رہے تھے کہ چک جھنڈو خان میں آپ کے پندرہ مربعے ہیں ۔ آپ کے نام ہیں یا آپ کے رشتہ داروں کے نام ؟ " ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر میرے والد سے پوچھ رہا تھا ۔

" میرے اپنے نام ہیں " ۔ میرے والد نے جواب دیا ۔

" گوجرانوالہ میں کویا دو کوٹھیاں ہیں آپ کی " ۔

" چار ! " میرے باپ نے کہا ۔

" آپ کا بیٹا غالباً اکلوتا ہے " ۔

"ہاں!"

"اب آپ کی عمر کتنی ہو گی؟"

"پچھتر سال۔" میرے باپ نے فخریہ کہا "ابھی تک میرا ایک دانت نہیں ہلا۔ میں آج کل کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہوں"۔

"ذیابیطس کی شکایت تو ضرور ہو گی"۔ اکسائز انسپکٹر نے پر امید لہجے میں پوچھا۔ "آپ شوگر ٹسٹ ضرور کرائیں۔ بعض دفعہ پتا نہیں چلتا۔"

اتنے میں میری موجودگی کا پتہ چلا۔ میرے باپ نے میرا ریٹائرڈ اکسائز انسپکٹر سے تعارف کرایا۔ گفتگو غالباً کچھ اس قسم کی ہوئی۔ "برخوردار بیٹھو! آج کل کہاں ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

"میں کراچی سے آیا ہوں"۔

"کیا کرتے ہیں وہاں کراچی میں"۔

میں بزنس کرتا ہوں ۔۔۔۔ امپورٹ اکسپورٹ"۔

"کونسا بزنس کرتے ہیں"۔

"ڈیزل انجن، ملز، بجلی کی موٹریں۔ حجامت کے استرے۔ زیبرے"۔

اکسائز انسپکٹر زیبروں پر کچھ چونکا۔ مگر پھر غالباً یہ خیال کر کے کہ زیبرے بھی کسی مشینری کا نام ہو گا اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہوں"

"آپ کے پاس وہاں کراچی میں کونسی میک کی کار ہے ۔۔۔۔ شیورلیٹ یا پانٹیک"

"میرے پاس سائیکل ہے۔ ہرکولیس ۱۹۴۳ ماڈل"۔

اکسائز انسپکٹر نے میرے باپ کی طرف قدرے گھور کر دیکھا جس نے اسے بتایا تھا کہ میرے پاس کار ہے۔

"آپ کی تعلیم کہاں تک ہے۔"

"بی اے پلکڈ ہوں"۔

"یعنی بی اے پاس نہیں کر سکے آپ"۔

"پانچ چھ سال کوشش کی تھی مگر یونیورسٹی نے ڈگری دینا مناسب نہیں سمجھا۔"

ریٹائرڈ اکسائز انسپکٹر تو اس کے پندرہ منٹ بعد ہی پہلے سے بھی زیادہ بھگی چڑیا لگتا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔ میرا باپ مجھ سے بے حد خفا ہوا کہ میں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ اس نے مجھے ریٹائرڈ انسپکٹر کے بینک بیلنس اور جائداد کے متعلق بتایا۔ اس نے شکار کو بڑے حیلے اور طریقے سے پھانسا تھا۔ ریٹائرڈ اکسائز انسپکٹر کی تو اس کے بعد کوئی خبر نہ آئی ہاں میرے وہاں جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ چار پانچ ہزار روپئے ادھار لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈیڑھ ہزار تو بوڑھے آدمی سے بعض

عجیب طریقوں سے اینٹھا گیا۔ کچھ میں نے اپنے چند پرانے دوستوں سے لیا جو اب بھٹوں اور کپاس وغیرہ کے کاروبار میں خوب پیسے کمار ہے تھے۔ ہم خلجی جب چاہیں کافی میٹھے اور چار منگ لوگ بن سکتے ہیں۔ اور ہمارے خاندان کے افراد ہمیشہ روپیہ ادھار لینے میں اچھے رہے ہیں۔

جب میں روپیہ لے کر واپس پہنچا تو چچا سے زیادہ خوش آدمی نہ ہو گا۔ اس نے کہا کہ ہم اب اپنی سکیم کو تیزی سے حقیقت بنادیں گے۔ پہلے تو ہم نے میکلوڈ روڈ کی کئی انگریزی اور دوسری کمپنیوں کے چکر کاٹے اور ان کے مینجنگ ڈائرکٹروں سے تخلیہ میں ملاقات کی اور ان سے زیبرے فراہم کرنے کے لئے کہا۔ بہتوں نے سمجھا کہ ہم ان کا مذاق اڑار ہے ہیں۔ اور فوراً ہمیں دفتر سے رخصت ہونے کی درخواست کی۔ بعض نے ہمیں احمقوں کا ایک بے مثل جوڑا سمجھا۔ ایک کمپنی کا ڈائرکٹر تو چچا کے سکیم کی وضاحت کرنے پر اس قدر بے صبر اور غضبناک ہو گیا کہ اس نے ہم سے پوچھا کہ آخر ہمارا اس طرح اس کا وقت ضائع کرنے سے کیا مطلب ہے۔ اور ہمیں تنبیہ کی کہ اگر ہم اسی وقت وہاں سے نہ چلے گئے تو وہ اپنے چوکیداروں کو بلوا کر ہمیں باہر پھینکوا دے گا

"اب ایک ہی صورت ہے۔" چچا عبد الباقی بولا "ان کمپنیوں کو بزنس کرنا ہی نہیں آتا۔ بختیار اب تم کو خود نیروبی جانا پڑے گا۔ وہاں جاتے ہی تم کو پہلے تو ایک شکاری "سفری" کا انتظام کرنا ہو گا۔ میں تمہیں رائڈر ہیگرڈ کے ایک دو ناول "شی" وغیرہ پڑھنے کے لئے دوں گا۔ اس سے تمہیں ایک سفری کے انتظام کرنے کے موٹے موٹے اصولوں کا پتا لگ جائے گا۔ پہلی چیز جو تمہیں کرنی ہوگی وہ ہے ایک اچھے قابل اعتبار زولو مہتمم کا انتخاب جو افریقی جنگلوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ زولو خود ہی سامان اٹھانے والے قلیوں کا انتظام کر دے گا۔ سامان میں تم ایک خیمہ، ایک سوٹ کیس اور کچھ کھانے پکانے کے برتن لے جاسکتے ہو۔ ہاں سانپوں کے کاٹے کے علاج کا بکس ساتھ ضرور رکھنا۔ تم ہر بیسویں قدم پر سانپوں سے دوچار ہو گے۔"

"میں نہیں جارہا" ۔ میں نے جواب دیا۔

آخر بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرا جانا ہر حالت میں ناگزیر ہے۔ اور میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی۔ چچا عبد الباقی اور میں نے ایر لائن اور جہازوں کی کمپنیوں کے دفتروں میں جاکر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور کمپنیوں کے سفری لٹریچر کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا۔ ہم یہ طے نہ کر پائے کہ نیروبی جانے کے لیے میرے لیے کونسا راستہ اختیار کرنا بہتر رہے گا۔ اور اس کا اس قدر چرچا ہوا کہ بہت سے احباب کا خیال تھا کہ میں نیروبی سے واپس آگیا ہوں۔ خود مجھے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا کہ شاید میں نیروبی کا سفر کر آیا ہوں۔ کئی احباب مجھے بازار میں ٹھہرا کر میرے کراچی میں ہونے پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ان کے خیال میں میں ابھی نیروبی وغیرہ میں ہی تھا۔ بے حد سنجیدہ چہروں سے وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ

میں نیروبی سے کب واپس آیا ہوں اور یہ کہ میں کتنے زیبرے ساتھ لاسکا ہوں ۔ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے کافی ہاؤس میں مجھ سے فرمائش کی کہ میں "نقاد" کے خاص نمبر کے لئے نیروبی پر ایک رپورتاژ قلمبند کروں جس میں وہاں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈالوں اور ماہنامے کے قارئین کو زیبروں کے پکڑنے کے بارے میں معلومات بہم پہنچاؤں ۔

اس چرچے اور غل کے باوجود میں نیروبی نہ جاسکا ۔ اول تو پاسپورٹ ہی نہ بن سکا اور پھر نیروبی کی حکومت اپنے جانوروں کو بچانے کی اہمیت کے بارے میں تیار ہو گئی تھی ۔ اور اپنے ملک میں شکاریوں کے آنے پر قدغن لگا رہی تھی ۔ چچا عبد الباقی کی مایوسی دیکھنے کے لائق تھی ۔ مگر میں اپنے دل میں کچھ خوش اور مطمئن تھا ۔ مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور رائڈر ہیگرڈ کے ناول "شی" کو پڑھنے کے بعد تو میں کسی حالت میں بھی افریقہ جانے کو تیار نہ تھا ، اور متحیر تھا کہ لوگ آخر وہاں رہتے کیوں ہیں ۔

(۳)

ایک شام کو میں چچا عبد الباقی سے ملاقات کے لئے گیا تو ایک اور شخص کو اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دیکھا ، وہ ایک لمبا تڑنگا خوفناک شکل کا شخص تھا اور ان شخصوں میں سے تھا جن کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے چہروں سے ہن برستا ہے ۔ مجھے یہ تو اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہن کیا ہوتا ہے مگر اس آدمی کے چہرے سے یہ ہن منوں کے حساب سے برس رہا تھا اس کی آنکھیں چھوٹی زرد اور تاتاری تھیں ، ہونٹ موٹے اور کچھ احمقانہ تھے اور اس کی مونچھیں لمبی اور الجھی ہوئی تھیں ، وہ لمبا گلو بند خاکی اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا ۔ وہ غالباً مگر مچھ کے چمڑے کے اونچی ایڑی والے کیلدار فل بوٹ چڑھائے تھا ۔ ایک چار بور کی رائفل اس کے سامنے میز پر پڑی تھی ۔

میں اس کو دیکھ کر الٹے پاؤں جانے لگا تھا کہ چچا عبد الباقی نے مجھے آواز دی "آؤ بھئی بختیار ہمارا کام بن گیا" ۔ چار و ناچار میں کمرے میں داخل ہوا ۔ چچا ایک دھوتی اور قمیص میں بڑے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور ایک مکمل معتنک شانت بدھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا ، جیسے اس وقت نروان حاصل ہونے والا ہو ۔ اس نے لمبی مونچھوں والے خوفناک اجنبی سے مجھے متعارف کرایا ۔

"بھئی ۔ اچھا ہوا تم آگئے ۔ یہ میجر اے آر مسکین ہیں ۔ بڑے مشہور بگ گیم ہنٹر ہیں ۔ چنانچہ اب پھر بگ گیم کے شکار کے لیے نیروبی پرواز کرنے والے ہیں ۔ ان کو کہیں سے پتا چلا کہ ہمیں زیبروں کی ضرورت ہے اور یہ اسی لیے یہاں مجھے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہمارے لیے وہاں سے پچاس زیبرے ہر ماہ کے حساب سے شپ کر سکتے ہیں ۔۔۔۔

مسکین صاحب یہ محمد بختیار صاحب خلجی میرے حصہ دار ہیں"۔

میجر نے مجھے اپنی پیلی آنکھوں سے دیکھا اور رد عمل کے طور پر سامنے رکھی ہوئی رائفل کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میجر نے اپنی رائفل سے کھیلتے ہوئے مجھے اور چچا عبد الباقی کو مخاطب کیا۔

"ہاں تو مسٹر عبد الباقی۔ بگ گیم ہنٹنگ کے لیے افریقہ کے گھنے زہریلے جنگلات میں کئی کئی ہفتے گھومنا پڑتا ہے۔ اگر آپ حضرات نے ٹارزن کی فلمیں دیکھی ہیں تو آپ قیاس لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کتنے جان جوکھوں اور خطرے کا ہے۔ سفری کے انتظام میں کافی خرچ آجاتا ہے۔ چونکہ میں آپ لوگوں کے کام پر نیروبی جارہا ہوں اس لئے اصولاً تو آپ کو مجھے نیروبی جانے اور وہاں سے واپسی کا کرایہ دینا چاہیئے۔ اور وہاں مہم وغیرہ کا خرچ بھی آپ کے ذمے ہونا چاہیئے۔ مگر میں آپ حضرات سے نہ کرایہ لوں گا اور نہ وہ خرچ جو زیبروں کی مہم کے انتظام پر آئے گا"۔

"یہ آپ کی بڑی عنایت ہے"۔ چچا عبد الباقی نے کہا۔

"------ یہ زیبروں کا پکڑنا سخت مشکل کام ہے۔ میں آپ حضرات کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہوں ---- اچھا فی الحال آپ کو کتنے زیبرے درکار ہیں"۔

"ڈیڑھ سو" چچا عبد الباقی بولا" کیوں بھئی بختیار فی الحال ڈیڑھ سو کافی ہوں گے ؟"

"دو قسم کے زیبرے ہوتے ہیں"۔ شکاری نے کہا" ایک قسم ذرا بڑھیا ہوتی ہے۔ ایک تو سفید زیبرے ہوتے ہیں جن پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔ پھر بھورے زیبرے ہوتے ہیں جن پر سرخ اور ملگجی دھاریاں ہوتی ہیں۔ آپ حضرات کو کون سے زیبرے چاہئیں۔"

"ملے جلے ہوں"۔ چچا عبد الباقی نے کہا" زیادہ تر اگر سفید زیبرے مل سکیں تو اچھا ہے"

"ان کے لئے مجھے نیروبی سے سو میل آگے زینبو دریا میں کئی دن اور کئی راتیں سفر کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ آپ نے "کنگ سالو منز مائنز" اور "ٹارزن کا بیٹا" فلموں میں دیکھا ہو گا۔ سفید زیبرے غوما کنٹری میں پائے جاتے ہیں۔ غوما کنٹری کے لوگ سخت وحشی اور مردم خور ہیں، اور سفید زیبرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لیے اس خطرے کے لحاظ سے جو مجھے غوما کنٹری میں شکار کھیلنے کے لئے مول لینا ہو گا سفید زیبروں کی قیمت عام زیبروں سے زیادہ ہو گی"۔

"عام زیبروں کی قیمت کتنی ہو گی ؟"

عام زیبرے آپ کو غالباً چار سو روپے جوڑے کے پڑیں گے۔ اور سفید کوئی آٹھ سو کے۔ آپ حضرات کل دس بجے میرے ہمراہ ہماری ایسٹ افریقین ٹریڈنگ کمپنی میں آیئے۔ میرا بڑا بھائی اس کا منیجنگ ڈائرکٹر ہے۔ آپ ٹرمز وغیرہ وہیں طے کر سکتے ہیں"۔

اس کے بعد اس نے ہمیں اپنے افریقی سفروں کے نہایت دل دہلا دینے والے قصے سنائے

باتوں کے دوران میں وہ کئی دفعہ جوش میں آجاتا اور ہمیں جانور تصور کر کے ہم پر رائفل سے شست باندھ دیتا۔

"ہاں تو چیتا بس وہاں بیٹھا تھا جہاں بختیار صاحب آپ بیٹھے ہیں۔ میں نے فوراً شست باندھی۔۔۔اور ڈزڈز"۔

چچا عبد الباقی اور میں اسے نیچے سڑک پر چھوڑنے کے لئے آئے۔ چچا عبد الباقی چاہتا تھا کہ میں میجر کو شہر میں لے جاکر کسی اچھے ریسٹوران میں کھانا وغیرہ کھلاؤں اور سنیما وغیرہ پر لے جاؤں۔ چچا نے مجھے ایک طرف لے جاکر کئی ایسے طریقے بتائے جن سے میجر مسکین پر اپنے روپے خرچ کر سکتا تھا۔ میں نے چچا کا ان مفید مشوروں کے لیے شکریہ ادا کیا اور میجر ایک گذرنے والی بس میں دوڑ کر چڑھ گیا۔

"میجر ہے اس کام کے لیے ٹھیک آدمی" چچا عبد الباقی نے کہا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا کہ سب کچھ عبد الباقی پر چھوڑ دو"۔

(۴)

دوسری صبح میجر اے آر مسکین چچا عبد الباقی کے مکان پر آیا اور ہمیں اپنے ساتھ اپنی کمپنی کے دفتر میں لے گیا۔ دفتر کھارادر میں ایک غیر اہم گلی میں تھا۔ اور باہر ایک نئے رنگے ہوئے سائن بورڈ پر "افریقین برادران لمیٹیڈ" لکھا تھا۔ میجر اے آر مسکین تھوڑی دیر کے لئے ہمیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ ایک بڑے کمرے میں جو ایک دفتر کی بجائے ایک رہائشی ڈرائنگ روم سے زیادہ مشابہ تھا ایک بے حد موٹا آدمی میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر آدمی کو اکھاڑے اور دنگل کا خیال آتا تھا۔ یہ آدمی ایک رنگین چھپکلیوں والی بوشرٹ پہنے تھا اور ایک بڑے خوش مذاق دیو کی طرح اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی آلوچوں، سیبوں اور خوبانیوں کی کوئی آدھ درجن پلیٹوں کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی دونوں گالیں فواکہات سے پھولی ہوئی تھیں۔ اور اس کے جبڑوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹی میز پر ٹائپ رائٹر کے پیچھے ایک سیاہ چوبی نما عیسائی ٹائپسٹ لڑکی بیٹھی تھی اور وہ اور اس کا ٹائپ رائٹر اس کمرے میں ایک کاروباری فضا پیدا کرنے کی ہلکی سی کوشش کر رہے تھے۔

خوش مذاق دیو نے کھڑے ہو کر چچا عبد الباقی اور مجھ سے پر جوش طریقے پر ہاتھ ملایا۔ اس کے چہرے پر اس بڑے شمپئن پہلوان کا سا مربیانہ انداز تھا جو اکھاڑے میں چھوٹے اور معمولی پہلوانوں سے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے معانقہ کر رہا ہو۔ اس نے ہمیں بیٹھنے کی دعوت دی اور ہمیں فواکہات میں شرکت کے لئے کہا۔ میز پر اس وقت فواکہات کا صفایا ہو چکا تھا۔

"بھائی تسکین! ان صاحبوں کو زیبروں کی ضرورت ہے۔ یہ ان کو گاڑیوں کے آگے جوتنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں خود چند دنوں میں نیروبی جاکر جلد از جلد ان کو زیبرے شپ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ اب یہاں ہم سے بزنس کی ٹرمز وغیرہ پر بات چیت کرنے آئے ہیں"

تسکین نے ہمیں ایک کاروباری خوش طبعی سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ حضرات مجھے اس ملک میں دو واحد سمجھ دار کاروباری آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ زیبروں کو گاڑیوں میں جوتنے کا خیال خود مجھے آیا تھا۔ مگر میں اور مسکین امپورٹ کے کام میں اس درجہ مصروف ہیں کہ ہم اور کسی بزنس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ کی سکیم نہایت مبارک ہے۔ زیبروں میں روپیہ ہی روپیہ ہے۔"

میجر مسکین نے کہا۔ "میں نے ان کو سفید زیبرے کے لیے پانچسو اور بھورے کے لیے ڈھائی سو روپئے۔ ایف۔او۔آر کراچی پرائس کوٹ کی ہے۔"

تسکین نے ہمیں پرجوش طریق سے یقین دلایا "حضرات یقین رکھیے آپ اس قیمت پر گویا زیبروں کو مفت حاصل کر رہے ہیں۔ ڈھائی سو روپئے میں تو آج کل زیبرا تو زیبرا گدھا بھی نہیں ملتا۔ ہم نے اگلے روز چودھری سرکس کمپنی کے لئے دو سیاہ زیبروں کا ڈیڑھ ہزار کا آرڈر بک کیا ہے۔ چونکہ آپ حضرات ہم سے پہلی بار بزنس کر رہے ہیں۔ اور آپ کا آرڈر بھی بڑا ہے۔ اس لیے آپ کو بہت کم قیمت بتائی گئی ہے۔"

تھوڑی سی اور بات چیت کے بعد چچا عبد الباقی افریقین برادران سے تیس سفید اور سیاہ زیبروں کا آرڈ بک کرنے پر تیار ہو گیا۔ یہ آرڈر کوئی بیس ہزار کا تھا۔ اور افریقین برادران کی بزنس کے شرائط یہ تھیں کہ آرڈر دیتے وقت کل رقم کا ایک چوتھائی حصہ پیشگی ادا کر دیا جائے۔ افریقین برادران ہمارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور آخر میں وہ اس پر رضامند ہو گئے کہ دو ہزار روپیہ پیشگی ادائگی پر ہمارا آرڈر بک کر لیں گے۔

"اور ہم آپ سے ایک اور رعایت کرتے ہیں۔" تسکین نے کہا "ہماری شرائط میں ہے کہ بقیہ رقم اس وقت ادا کرنا پڑتی ہے جب بندرگاہ سے ہمارے پاس انوائس پہنچ جائے کہ مال لاد دیا گیا ہے۔ آپ کو بقیہ رقم اس وقت دینا ہو گی جب زیبرے یہاں ہمارے گودام میں پہنچ جائیں گے۔ ایسی شرائط آپ کو کراچی بھر میں کوئی امپورٹر نہیں دے گا"۔

"آپ زیبروں کو انشور وغیرہ بھی کرانا چاہتے ہیں"۔ میجر مسکین نے کہا

"ضرور!" چچا عبد الباقی نے جواب دیا "میرا خیال ہے انشور کرانا بہتر ہو گا۔"

"پیکنگ آپ کیسی چاہتے ہیں۔" تسکین نے پوچھا۔

"پیکنگ کیا مطلب؟" عبد الباقی بولا "آپ کا کیا مطلب ہے کہ زیبروں کو پیک کیا جائے گا

"یقیناً" تسکین بولا "پیکنگ کے بغیر تو ان کی کھال کی شفافیت اور خوبصورتی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آخر زیبرے ہیں کوئی گھوڑے اور گدھے تو نہیں کہ جیسے ہیں ویسے لاد دیا۔ عموماً ان کو مومی کپڑے میں ملفوف کر کے جہاز پر لادا جاتا ہے"۔

"ہاں تو پیکنگ بھی کرائی جائے۔" چچا عبد الباقی نے کہا۔

عیسائی ٹائپسٹ لڑکی نے ہمارا آرڈر بک کیا اور میں چچا عبد الباقی کو وہیں چھوڑ کر گھر سے دو ہزار روپئے پیشگی کی رقم لانے کے لیے گیا۔ جب میں واپس آیا تو چچا عبد الباقی ٹائپسٹ لڑکی کی بغل میں بیٹھا تھا۔ اور ٹائپ رائٹر کی کلک کلک ظاہر کرتی تھی کہ ہمارا آرڈر بڑی تیزی سے ٹائپ ہو رہا ہے۔ تسکین ٹیلیفون کا رسیو اٹھا کر نیروبی آفس کو ٹرنک کال کر رہا تھا۔" ------ سناؤ ---- کیا کہا؟ دس شیر شپ ہو گئے۔ کب کیے؟ ابے میں پوچھتا ہوں کب کیے؟ ببر تھے نا؟ اور چیتے؟ کتنے؟ چھ؟ ابے بارہ کا آرڈر بھیجا تھا۔ پکڑے نہیں گئے۔ ابے چیتے نہیں پکڑے گئے؟ اچھا اور چاچی کا کیا حال ہے۔ زیبروں کا کیا ہے؟ ابے زیبرے بھئی زیبرے۔ بکرے نہیں زیے (ب) ربے۔ کیا کہا۔ زمیبی کے اوپر چار سو میل چلے گئے ہیں۔ اچھا میں مسکین کو بھیج رہا ہوں۔ سفری کا انتظام کر دینا۔ زیبرا گاڑیوں کے لیے۔ یہاں زیبرے چاہئیں۔ ابے وہ لنگور جو تم نے پچھلی شپمنٹ میں بجھوائے تھے انہیں انشور کیوں نہیں کیا؟ تم بھی نرے لنگور ہو۔ راستے میں جہاز پر سے پانچ تو سمندر میں چھلانگ لگا گئے۔ اب ان کے پیسے تیرا باپ دے گا۔ چودھری سرکس کمپنی والے روز ناک میں دم کرتے ہیں۔ کیا کہا•••••؟

آرڈر آخر بک کر دیا گیا۔ افرقین برادران سے آرڈر کی ایک کاپی اور دو ہزار کی رسید لے کر ہم باہر آگئے۔ چچا عبد الباقی دونوں مسکین اور تسکین کے لیے تعریف اور تحسین سے پر تھا۔

" بزنس مین فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کس چیز میں آج کل روپیہ ہے"۔ اس نے کہا" تم نے دیکھا زیبروں کے نام ہی سے تسکین چونک پڑا۔ بختیار! میں تمہیں بتاؤں اس شخص تسکین کی کھوپڑی میں واقعی کاروباری دماغ ہے۔ یہ دونوں بھائی ہمارے لیے خدا نے رحمت کے فرشتے بنا کر بھجوائے ہیں"۔

(۵)

ہم چوتھے پانچویں روز افریقین برادران میں زیبروں کے متعلق پتا کرنے جاتے۔ تسکین کبھی دفتر میں ہوتا اور کبھی باہر، مگر اس کی ٹائپسٹ مس میسی وہیں ہوتی۔ پہلی بار ہمیں بتایا گیا کہ میجر اے آر مسکین نیروبی میں پہنچ گیا ہے۔ اور سفری کے انتظام کرنے میں مشغول ہے۔ دوسری دفعہ جانے پر پتا لگا کہ وہ زولوشکاریوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ دریائے زمیبی میں ہوچی نوچی کنٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک مہینہ تک وہ وہیں تھا اور چچا عبد الباقی اور میں کچھ فکر مند رہے

کہ کہیں اے آر مسکین کو بوچی ٹوچی کنٹری کے مردم خور حبشی بھون کر نہ کھا گئے ہوں۔ ہمیں اے آر مسکین کے بھونے جانے کی اتنی فکر نہ تھی۔ جتنی اپنے زیبروں کی۔ آخر ایک دن افریقین برادران میں جانے پر تسکین نے ہمیں اطلاع دی کہ تھوڑی دیر ہوئی اس نے نیروبی سے ایک ٹرانک کال موصول کی ہے۔ مسکین دو سو زیبروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ہے اور ان کی شپنگ کا انتظام کیا جارہا ہے۔ دو دن بعد ہمیں بتایا گیا کہ زیبرے ایس ایس ڈھمرا سے شپ ہو چکے ہیں اور دو ہفتے کے اندر اندر کراچی بندرگاہ میں پہنچ جائیں گے۔ چچا عبد الباقی اور میں اس خبر سے دیوانے ہو گئے اور چچا کی کوٹھی کے پچھواڑے ایک احاطے کو زیبروں کے قیام کے لئے صاف کرا دیا گیا۔

"دو ہفتے کے بعد افریقین برادرز میں جانے پر تسکین ہنس ہنس کر ملا۔

"آپ کے زیبرے آگئے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" ہم نے بے تابی سے پوچھا۔

"صبر تو کیجئے"۔ تسکین بولا "میرا کلیرنگ ایجنٹ آج صبح ان کو کلیر کر کے لے آیا ہے۔ چونکہ ان پر بہت پڑ گئی ہے مگر وہ سب نہایت چست حالت میں ہیں۔ اس وقت وہ کلیرنگ ایجنٹ کے گودام میں ہیں۔ ہاں ایک زیبرا میں نے بطور نمونہ اپنے گودام میں منگوا لیا ہے۔ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔"

زیبروں کے آنے کی خبر سن کر ہمارا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ تسکین ہمیں کئی کمروں میں سے لے جاتا ہوا ایک بند کمرے کی طرف لے گیا۔ جس کا دروازہ مقفل تھا۔ ایک کھڑکی میں سے جس میں سلاخیں لگی تھیں۔ ہم نے اندر جھانک کر دیکھا۔ ایک خوبصورت سفید زیبرا اندر کھڑا گھاس کھا رہا تھا۔

"تسکین" چچا عبد الباقی نے کہا "دروازہ کھولو۔ میں اس زیبرے کو تھپکی دینا چاہتا ہوں۔ اور نزدیک سے اس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں"۔

"گودام کی چابی میرے پاس نہیں"۔ تسکین بولا "اور دوسرے زیبرا سفر کی وجہ سے کچھ تھکا ہوا ہے۔ خیر باقی زیبرے بھی سب اسی طرح خوبصورت اور تندرست ہیں۔ آپ شام کو آکر یہاں سے ان کی ڈلیوری لے سکتے ہیں۔ پانچ ٹرکوں کا انتظام آپ کو کرنا ہو گا۔"

جب جانے لگے تو تسکین نے ہمیں بقیہ رقم کی ادائیگی کے لیے کہا۔ ابھی انیس زیبرے آئے تھے۔ اور ہمیں تین ہزار روپیہ اور افریقین برادران کو ادا کرنا تھا۔ بقیہ رقم کے سوال نے اس خوشی کو جو زیبروں کے آجانے سے ہمارے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی قدرے ابر آلود کر دیا۔ تسکین نے مس میسی کو فوراً ہمارا بل ٹائپ کرنے کے لیے کہا۔

"ابھی ہم ایک ہزار روپیہ دے سکتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"آپ پندرہ زیبرے فی الحال لے جا سکتے ہیں"۔ تسکین بولا۔ "مجھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ باقی دو ہزار کے لئے میں ہفتہ تک انتظار کرنے کو تیار ہوں۔"

شام کو ہم پھر افریقن برادران پر دو ٹرک لے کر پہنچے۔ کافی دیر ہم کو گلی میں ٹھیرنا پڑا، اور پھر تسکین باہر آیا۔ اور ہمارے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر ہمیں اپنے کلیرنگ ایجنٹ کے مکان پر لے گیا۔ اب کافی اندھیرا سا ہو چکا تھا۔ کلیرنگ ایجنٹ ایک چھوٹا سا پھرتیلا آدمی تھا۔ جسے آنکھیں مارنے کی بڑی عادت تھی۔ وہ ہمیں اپنے مکان کے پچھواڑے ایک احاطے کی طرف لے گیا۔ اس احاطے میں چالیس پچاس کے لگ بھگ زیبرے ہوں گے۔ بہت سے ابھی موم جاموں میں ملفوف تھے۔ چچا عبد الباقی اور مجھے یہ دیکھ کر کچھ مایوسی ہوئی کہ زیبرے کچھ قد میں چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ تسکین نے ہمیں سمجھایا کہ یہ بڑی جلدی بڑے ہو جائیں گے۔ اور یہ کہ ان کو سدھانا اور گاڑی کے لئے تیار کرنا نسبتاً آسان ہو گا۔

زیبروں کو ٹرکوں میں لادنا کافی مصیبت ثابت ہوا۔ ایک دو نے مجھ پر دو لتیاں بھی چلائیں۔ آخر ڈرائیوروں اور مزدوروں کی مدد سے ہم ان کو ٹرکوں میں لادنے میں کامیاب ہو گئے تسکین بڑا خوش معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کی ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔ چھوٹا کلیرنگ ایجنٹ تسکین کو بار بار آنکھ مار رہا تھا۔

ہم زیبروں کو چچا عبد الباقی کے مکان پر لے آئے۔ یہاں ان کو ٹرکوں سے اتار اگیا۔ اور احاطے میں چھوڑ دیا گیا جو خاص ان کے لئے صاف کر دیا گیا تھا اور جس کے گرد ایک چھوٹی چار دیواری تعمیر کی گئی تھی۔ چچا عبد الباقی کے کئی ہمسائے اپنی کوٹھیوں کی چار دیواری پر سے ہمیں اور ہمارے زیبروں کو دلچسپی اور دبی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھ رہے تھے۔ اور چند چچا عبد الباقی کو زیبروں کی آمد پر مبارکباد دینے کے لئے آئے تھے۔

تسکین ہمارے ساتھ چچا کے مکان پر آیا تھا اور ہمیں زیبروں کی پرورش کے متعلق ہدایات دے رہا تھا۔ ان کو پہلے چند دن صرف دودھ اور تازہ کیلے دیئے جائیں۔ ان کو گرم پانی اور صابن سے ہرگز ہرگز نہ نہلایا جائے۔ بلکہ برش سے رگڑ کر صاف کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم اس قدر مضطرب اور خوش تھے کہ اس کی باتوں پر ذرا توجہ نہ دے رہے تھے۔ جب تسکین نے ہم سے تیس زیبروں کی وصولی کی رسید لے لی اور ایک ہزار روپیہ اپنی جیب میں ڈال لیا تو وہ سیٹی بجاتا ہوا چلا گیا۔

اب کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ زیبرے بڑے خاموش تھے، سفر نے انہیں مضمحل کر دیا تھا۔ چچا عبد الباقی میں اور عبد الرحمن احاطے کی چار دیواری کے باہر سے ان کی سیاہ کھالوں کو دیکھ رہے تھے۔

"بے چارے بڑے بھوکے ہوں گے۔" چچا عبد الباقی نے کہا "بختیار! بازار جاؤ اور ان کے لیے کیلے اور دودھ لے آو۔ تسکین نے کہا ہے کہ پہلے چند دنوں تک ان کو کیلوں اور دودھ کے علاوہ کچھ نہ دیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ تین من دودھ اور بیس درجن کیلے کافی ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں بھئی! آج رات کے لیے تو کچھ کرو۔" چچا عبد الباقی نے کہا" دیکھا بھوک کے مارے ان میں زندگی نہیں آتی۔ کل سے ہمیں باقاعدہ کسی ڈائری اور کسی میوہ منڈی سے انتظام کرنا پڑے گا۔"

اتنے میں زیبروں میں سے ایک نے آواز نکالی۔ یہ آواز کچھ گدھے کے ہنہنانے سے ملتی جلتی تھی۔

"یہ تو گدھے کی سی آواز لگتی ہے"۔ میں نے کہا

"یہ غالباً احاطے سے باہر کسی گدھے کی ہے" چچا عبد الباقی نے کہا" ویسے زیبرے کی آواز بھی گدھے جیسی ہوتی ہے۔"

میں چچا کے گھر سے کچھ مٹکے اور خالی ڈرم لے دکٹوریا میں رکھ کر بازار گیا اور دو تین گھنٹے کے بعد کئی دکانوں پر پھرنے کے بعد دودھ اور کیلے خرید کر لایا۔ زیبروں کو دودھ پلانے کے بعد ہم سو گئے علی الصبح جب میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا تو زیبرے احاطے میں تھے۔ ان کی دھاریوں میں مجھے کچھ عجیب بات معلوم ہوئی۔ دوسرے یہ زیبرے بہت چھوٹے اور بے ہودہ نظر آنے والے حیوان معلوم ہوتے تھے۔ تسکین نے ہمارے لیے اچھے اور بڑھیا نسل کے زیبرے درآمد نہ کیے تھے۔

چچا عبد الباقی اس وقت اپنے سوٹ میں ملبوس کمرے میں آیا۔

"بھئی بختیار۔ تم ابھی تک بستر میں ہو۔ اٹھو بھئی زیبروں کے ناشتہ کا انتظام کرنا ہے اور ان کو نہلا کر پونچھنا ہے، بے چارے بے حد میلے کچیلے دکھائی دے رہے ہیں۔"

عبد الرحمن نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا" میں زیبروں کو نہلاتا ہوں" اور وہ ایک گرم پانی کی بالٹی اور کپڑا لے کر نیچے ان کو نہلانے چلا گیا۔ چچا عبد الباقی میرے پاس بیٹھ کر مجھے حساب کر کے بتانے لگا کہ اب زیبروں کے آجانے کے بعد ان کو پالنے پوسنے سدھانے وغیرہ کے لیے کتنا سرمایہ درکار ہوگا۔ میں اسے صاف صاف کہنے والا تھا کہ میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں کہ عبد الرحمن نے نیچے زیبروں کے پاس سے آواز دی۔

"اباجی" یہ ان زیبروں کی دھاریوں کا رنگ تو کچا ہے۔"

"کچا کیا مطلب؟" چچا عبد الباقی نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے پوچھا۔

"دھونے سے اتر آتا ہے۔ اس زیبرے کو دیکھو میں نے اسے نہلایا ہے اور اس کی دھاریاں مٹ گئی ہیں"۔

"میں چلایا، میرے خدا چچا عبد الباقی! یہ تو گدھے ہیں۔"

اسی وقت ڈھینچوں ڈھینچوں کی متحدہ آواز نیچے سے اٹھی۔ اس دفعہ غلط فہمی کا کوئی احتمال نہیں تھا۔

ہم اسی وقت بھاگے بھاگے افریقن برادران کے دفتر میں پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر

تسکین نے دروازہ کھولا ۔ وہ اپنی بنیان پہنے تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں مگدر تھا ۔

"آیئے آیئے" اس نے پر جوش خوش طبعی سے کہا "میں صبح ڈنٹر پیلنے کا عادی ہوں ۔ "

" تم نے ہم سے دھو کا کیا ہے " ۔ چچا عبد الباقی نے بڑبڑا کر دونوں بازوؤں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا ۔ " وہ زیبرے نہیں وہ سب گدھے نکلے " ۔

" کیا مطلب ہے ؟ " تسکین نے کہا " کل شام تم مجھ سے دیکھ بھال کے بعد زیبرے لے گئے وہ رسید جو تم نے مجھے دی ہے اس میں تم نے صاف لکھا ہے کہ ہم نے تیس زیبرے وصول پائے ۔ اب اگر کوئی راتوں رات زیبرے کھول کے لیجاتا ہے اور ان کی بجائے گدھے چھوڑ جاتا ہے تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں .... لیکن تم کو یہ کیسے یقین ہے کہ وہ زیبرے نہیں ؟ "

" زیبرے نہیں زیبرے نہیں ۔ کیا زیبروں کی آواز ایسی ہوتی ہے ۔ " چچا عبد الباقی نے گدھے کے ہنہنانے کی ایک غیر مکمل سی نقل کی " اور گرم پانی سے دھونے سے ان کی دھاریاں سب دھل گئی ہیں ۔ تم نے یہ دھاریاں گدھوں پر رنگی تھیں " ۔

" آپ صاحبان ذرا ٹھنڈے تو ہوجئے " ۔ تسکین نے کہا " آپ نے ان کو گرم پانی سے دھویا کیا آپ کو معلوم نہیں زیبروں کے لیے گرم پانی مہلک ہے ۔ آپ کو انہیں شیل ۱۰۰ سے دھو کر آئل کلاتھ سے صاف کرنا چاہئے تھا " ۔

" میں تم پر مقدمہ چلاؤں گا ۔ تم نے ہمارے ساتھ دھو کا کیا ہے ۔ "

" تمہاری رسید میرے پاس ہے جس پر تم نے خود لکھا ہے کہ ہم نے تیس زیبرے وصول پائے ۔ "

" تم چار سو بیس ہو ۔ میں تمہاری مونچھیں کھینچ لوں گا " ۔

" کیا ؟ نکل جاؤ ، نکل جاؤ ۔ " تسکین نے مگدر کو دھمکانے کے انداز میں اٹھائے ہوئے گلی کے آخر تک ہمارا تعاقب کیا ۔

ہم نے غصے سے کھولتے ہوئے اور ہانپتے ہوئے بندر روڈ پر آکر دم لیا ۔ چچا عبد الباقی سخت غصے کی حالت میں تھا ۔ اس نے کہا کہ وہ اس دھوکے باز شخص پر مقدمہ چلائے گا ۔ اور اس سے ایک ایک پائی وصول کر کے رہے گا ۔ اور دو تین دن تک میں نے اسے بڑی بڑی قانون کی کتابوں میں منہمک پایا ۔ اس دفعہ کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا جس کے تحت افریقن برادران پر مقدمہ دائر کیا جاسکتا تھا ۔ اور آخر مقدمہ بازی کا ارادہ چھوڑ دیا گیا ۔ ہماری قانونی پوزیشن واضح نہ تھی ۔

اس کے چند دن بعد جب میں افریقن برادران کی کمپنی کے پاس سے گزرا تو نیا رنگا ہوا بورڈ غائب تھا ۔ دو لمبے چوڑے شخص جن کی مونچھیں منڈی ہوئی تھیں ، ہاتھوں میں کتابیں اٹھائے دروازے میں کھڑے مجھے تمسخرانہ طریق سے دیکھ رہے تھے ۔ وہ طالب علم تھے ، اور ان کے چہرے بے حد آشنا لگے ۔ جب میں ان کے پاس سے گزرا تو میں نے ایک لفظ " زیبرے " سنا اور آگے جا کر

مجھے خیال آیا کہ وہ مسکین اور تسکین تھے ۔۔۔۔ مونچھوں کے بغیر ۔!
یہ تھی زیبرا اسکیم!

* . * . * . * . * . * . * . * . * . * . * . *

محمد خالد اختر

رہنمائے فلم بینی

فلم پر جانے سے پہلے یہ طے کر لینا مفید ہے کہ تم کون سی فلم دیکھنا چاہتے ہو۔ اس شہر میں تقریباً سب روزنامے اس مقصد کے لئے شائع کئے جاتے ہیں کہ انھیں پڑھ کر قارئین کو یہ معلومات حاصل ہو سکیں کہ کس سینما حال میں کون سی فلم لگی ہے۔ اس میں کون کون ستارے کام کرتے ہیں اور پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ روزنامے فلموں کے اشتہاروں اور اعلانوں کے بیچ قتل، ڈاکے اور اغوا وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی خبریں بھی درج کر دیتے ہیں لیکن محض تکلفاً اور خانہ پُری کے لئے۔ آخر کاغذ کا پیٹ بھی کسی نہ کسی طرح تو بھرنا ہی ہوتا ہے۔ اور پھر بعض لوگ علی الصبح یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آج کون کون سی پارٹی جلوس نکال رہی ہے، یا فلاں بزرگ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں (اس سے انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ خبروں کے معاملے میں اَپ ٹو ڈیٹ ہیں)

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عقلمند لوگ ہمیشہ فلم کا انتخاب کرنے سے پہلے اپنے روزنامے کی تلاش شروع کرتے ہیں۔ وہ ضرور کہیں نہ کہیں پڑا ہوا مل جاتا ہے۔ پہلے دو تین صفحات کسی ملک میں طلبا کی اسٹرائک یا مالندی میں فوجی انقلاب کی قسم کی اوٹ پٹانگ خبروں سے اَٹے ہوئے ہوں گے جن میں ظاہر ہے تمہیں یا گھر میں کسی اور کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس کے آگے فلمیں ہی فلمیں ہوں گی، کوئی ساتویں پُربہار ہفتے میں، کوئی بیسویں تابڑ توڑ ہفتے میں اور کوئی بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے سلور اور گولڈن جوبلیاں مناتی ہوئی۔ ان کے نام اس طرح کے ہوں گے "تو میری میں تیرا" "تلوار کا دھنی" "کون دلال دی جانے"۔ "شیطانی بلا"۔ "عشق کی گھاتیں" وغیرہ وغیرہ۔ ان اشتہاروں کو غور سے پڑھو۔ پروڈیوسر (پیش کار) ڈائرکٹر (ہدایت کار) اور مکالمہ نویس کے ناموں پر نگاہ ڈالتے ہوئے ستاروں (چاند کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا) کے ناموں پر آ کر رکو۔ یہ بڑا ضروری ہے۔ اگر ستارے شہ سوار، ربابہ، چاچی ستنی اور شیخ ڈم ڈم ہیں تو ظاہر ہے کہ اس فلم کو دیکھے بغیر زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ ذاتی طور پر تم اور جونیر انگریزی فلم "ڈاکٹر بابو کا بھوت" دیکھنا چاہتے ہو مگر گھر کے دوسرے لوگ "تو میری میں تیرا" کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں۔ ایسے معاملے میں "اسٹینڈ" لینا خانگی شکر رنجی کا موجب ہوتا ہے۔ فوراً ہتھیار ڈال دو۔ تمہارے گھر میں ایک اوور کوٹ والا ماموں بمعہ برقعہ پوش ممانی کے مہمان ٹھہرا ہوا

ہے اور وہ پاک پٹن سے اپنی عینک کا نمبر بدلوانے کے لئے آیا ہے اور ممانی بے چاری تو لاتعداد نامعلوم عارضوں کی پوٹ ہے۔ اوورکوٹ والا ماموں فلم "اکبر بادشاہ" دیکھنا چاہتا ہے (وہ پاک پٹن میں تاریخ کا مضمون پڑھاتا ہے) اس کی اس خواہش پر حیرانی کا اظہار کرو اور اسے یوں پچکارو "اکبر بادشاہ! ماموں جان آپ کمال کرتے ہیں۔ مانا کہ ایک وقت وہ بادشاہ تھا لیکن اب وہ مر چکا ہے۔ بھلا مرے ہوئے بادشاہ سے کسی کو کیا حاصل ہوگا" اس فلم بنانے والے کو جی بھر کے گالیاں دو۔ اوورکوٹ والا ماموں ضرور متاثر ہوگا اور اکبر بادشاہ کا پھر نام نہ لے گا۔

فلم کا فیصلہ کر لینے کے بعد مزید وقت ضائع نہ کرو۔ یہ درست ہے کہ دوسرا شو ساڑھے چھ بجے شروع ہوتا ہے اور ابھی صرف چار بجے ہیں لیکن تمہاری گھڑی غلط ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر اوورکوٹ والے ماموں کی جیبی گھڑی بھی چار کا عمل بتا رہی ہے تو تمہاری گھڑی ٹھیک ہوگی۔ یہ کوئی زیادہ وقت نہیں اور تمہیں اور گھر والوں کو بلا تاخیر شو کی تیاری شروع کر دینی چاہیئے۔ خواتین اپنے بناؤ سنگار کے دو گھنٹے کے عرصے کو کچھ وقعت نہیں دیتیں اور ان میں سے ایک کو ابھی نہانا بھی ہے۔

تم اس اثنا میں اپنے کپڑے بدل لیتے ہو اور اپنی ٹائی کو نہ پاکر جونیر کی اسکول کی سرخ ٹائی ادھار مانگتے ہو۔ اپنے بٹوے کو جیب میں ڈالنا نہ بھولو، ورنہ سینما ہاؤس پہنچ کر مفت کی پشیمانی ہوگی اس کے بعد اپنی کار کے گرد ہو جاؤ (ہم فرض کرتے ہیں کہ تم پٹی بورژوا طبقے سے تعلق رکھتے ہو اور ایک سیکنڈ ہینڈ بے بی آسٹن کے خوش قسمت مالک ہو) نہیں نہیں آنکھ نہ جھپکو۔ تمہارے پاس ضرور موٹر کار ہوگی۔ لاہور میں تیسرے پنج سالہ منصوبے کی تکمیل کے بعد ہر تیسرا آدمی موٹر کار ٹیکسی، رکشا یا اسکوٹر چلاتا پھرتا ہے۔ چند بچے کھچے بدنصیب پیدل چلتے ہیں۔ نہیں نہیں مجھے یہ نہ بتاؤ کہ تمہارے پاس موٹر کار نہیں۔ پٹرول کے علاوہ بے بی آسٹن کی ہر ایک چیز کو چیک کرو۔ پانی، آئل، پہیوں کی ہوا۔ اوورکوٹ والا ماموں کافی فربہ اندام، قوی الجثہ شخص ہے۔ اور پہیوں کی ہوا نارمل سے دو پاؤنڈ زیادہ ہونی چاہیئے (یہ فکر نہ کرو کہ اسے بمعہ اوورکوٹ اور ممانی کے اس چھوٹی سی کار میں کیسے سمویا جا سکے گا۔ اس کا انتظام ماموں خود کرے گا) احتیاطاً کار کی چابی سے انجن کو اسٹارٹ کر کے بھی دیکھ لو۔ اگر یہ اسٹارٹ نہیں ہوتا تو گھبرانے یا نبضیں چھوڑ دینے والی کوئی بات نہیں۔ یقیناً تمہاری کار کی بیٹری کمزور ہے۔ اوورکوٹ والے ماموں سے اسے دھکا لگواؤ یہ اس کی صحت کے لئے بھی مفید ہوگا۔ کار آخر اسٹارٹ ہو جائے گی۔ اس وقت تک اسٹارٹ رکھو جب تک کہ خواتین اپنی تیاری مکمل کر کے کار میں نہیں آبیٹھتیں۔ اوورکوٹ والا ماموں پہلے ہی کار میں متمکن ہو چکا ہے۔ ڈرائیور کی سیٹ کے بغل والی سیٹ میں۔ ممانی اور دوسری خواتین کسی نہ کسی طرح ٹھنس ٹھنسا کر اور ایک دوسرے کی گود میں بھر کر پچھلی سیٹ میں سما جاتی ہیں۔ جونیر آگے تمہارے اور ماموں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے۔ گیئر اس کی ٹانگوں کے درمیان ہوگا۔ گھڑی پر وقت دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ساڑھے چھ سے دو منٹ اوپر ہی ہونگے۔

دور کوٹ والے ماموں کی جیبی گھڑی پر بھی یہی وقت ہوگا۔

تم آخر روانہ ہو جاتے ہو۔ گلی میں چند لوگ تمہیں حیرت سے دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ ان کی پروا نہ کرو۔ آنکھیں سیدھی رکھو اور اسٹیرنگ پر ہاتھ مضبوط۔ کسی کو اپنے نیچے نہ لو۔ اس کی سزا آج کل تین سال قید بامشقت ہے۔ جو تیز تمہارے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا اور اودورکوٹ والا ماموں کبھی یہ کہنے کو تیار نہیں ہوگا کہ حادثے کے وقت کار وہ چلا رہا تھا۔ پٹرول گیج کی سوئی کو بار بار دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا کرنے سے تم مفت میں ہراساں ہو گے۔ ذرہ بھر نہ ڈرو، تم سینما ہاؤس ضرور پہنچ جاؤ گے۔ بہادر بے بی آسٹن!

تمہارے پیچھے خواتین میں کچھ اس قسم کا تبادلۂ خیالات ہوگا۔

"باجی! تم نے سنا ہے، ستہ سوار نے ربابہ سے شادی کر لی ہے۔"

"واہ! یہ تو پچھلے ماہ کی خبر ہے۔ اب تو ان کی علیحدگی بھی ہو گئی ہے۔ یہ پچھلا "پردہ سیمیں" جو آیا تھا، اس میں یہ خبر میں نے خود پڑھی ہے۔"

"وجہ کیا ہوئی؟"

"پردہ سیمیں میں لکھا تھا کہ ستہ سوار رات کو خراٹے بھرتا تھا اور ربابہ کو خراٹے لینے والے مرد بالکل پسند نہیں۔"

"آنٹی سیماں کہہ رہی تھی کہ تازہ بتازہ یہ ہے کہ ربابہ نے نعیم کپور سے شادی کر لی ہے۔"

"سچ۔ ہائے۔ نعیم کپور کو کیا سوجھی۔ ربابہ تو اس سے پندرہ سال بڑی ہے۔"

"اس کا کیا۔ محبت میں عمروں کا کیا سوال۔ آنٹی سیماں کہہ رہی تھیں کہ اس نے خود مال پر نعیم کپور کو ربابہ کے پیچھے پیچھے جوتوں کا ڈبہ اٹھا کر چلتے دیکھا۔ دونوں خوب خوش ہیں۔"

"چاچی ہستنی نے بھی تو شادی کر لی ہے۔"

"چوتھی ہے یا پانچویں؟"

"پردہ سیمیں کے مطابق ساتویں۔"

تمہاری بیوی کہتی ہے کہ ممانی بے چاری کے سر میں کچھ درد ہے۔ راستے میں کہیں سے اسپرو مل جائے تو — تم کہو گے کہ وقت نہیں ہے اور کار کی بیٹری کمزور ہے۔ ممانی کے دردِ سر کو نظرانداز کر دو۔ آخر تم موت اور زندگی کی دوڑ دوڑ رہے ہو۔ تم پر جان کی بنی ہے۔ ایسے میں ممانیوں کے دردِ سر تمہیں کیسے متزلزل کر سکتے ہیں۔ ثابت قدم رہو اور ڈرائیو کرتے جاؤ۔ ٹریفک ٹائم ہونے والا ہے اور بے بی آسٹن بیٹری کی خرابی کی وجہ سے صرف "لائٹس آف" چلتی ہے۔

چیرنگ کراس کے پاس پہنچ کر تم پوچھتے ہو" میں بھول گیا" میں تیری تو میرا" کونسے پکچر ہاؤس پر لگی ہے؟"

"اخبار تم نے دیکھا تھا۔"

"میں نے فلم کا نام دیکھا تھا، پکچر ہاؤس کا نام نوٹ نہیں کیا تھا۔ غالباً"ریگزار" تھا۔

"نہیں" ریگزار" پر تو"ماہی دے ماہی" لگی ہوئی ہے۔"

"پھر"بھنگ محل" ہوگا۔"

"وہاں تو دو مہینے سے" رکشے والی" چل رہی ہے۔"

"رکشے والی تو"جہنم" میں لگی ہے۔"

"اور میٹر ہاؤس میں بھلا کونسی فلم ہے۔"

تم چڑ کر کہتے ہو" باقاعدہ" سکرین" پر پڑھنے کے باوجود تم میں سے کوئی یہ بھی نہیں بتا سکتا" تو میرا میں تیری" کہاں لگی ہے"

"میں تیری تو میرا" کوئی تمہیں درست کرتا ہے۔ تم اس درستی پر شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اچانک تمہاری نظر بائیں طرف"الاصلاح" سینما ہاؤس کے قد آدم رنگین اشتہار پر پڑتی ہے، جس میں ملبس فور پہنے گھڑ سواری کی سوٹی ہاتھ میں تھامے کسرتی جسم کی ایک خاتون اٹھلاتی ہوئی ایک چھوٹی مونچھوں والے نوجوان کی سمت بڑھ رہی ہے۔ نیچے درخشاں حروف میں لکھا ہے۔"میں تیری تو میرا۔"

تمہیں اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔ تم کار کو" الاصلاح" کے پچھواڑے پارکنگ سائٹ پر لے جاتے ہو۔ جہاں تم سے اونچے درجے کے بورژوا معززین کی لش لش کرتی کاریں، ایک دوسرے سے چکیلی ناکیں رگڑتی پہلے سے پارک ہیں۔ کار خواہ وہ کتنی ہی خستہ حال اور حقیر ہو آخر کار ہے۔ اور تمہیں جھینپنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ تم کار کو دو جہاز نما کاروں کے درمیان کھڑا کرتے ہو (پٹرول گیج کی سوئی اب زیرو سے اس طرف ہے) اوورکوٹ والا ماموں اور رکوٹ اٹھائے اور دوسرے سوار اس میں سے باہر نکلتے ہیں۔ ممانی کا درد سر اب واقعی زور کر رہا ہے۔"اسپرو" کے لفظ کی بھنک تمہارے کان میں پڑے گی اسے نظر انداز کر دو۔ کار کو لاک کر چکنے کے فوراً بعد بیرٹ کیپ اور ٹخنوں تک لمبے میلے سلیپنگ گاؤن میں ایک اینٹھی داڑھی والا چھوٹا آدمی آئے گا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹی ہے۔ وہ تمہاری بے آسٹن کو پہلے بانیٹ کی طرف سے ایک مکینک کے انداز میں دیکھے گا پھر چکر لگا کر عقب کا جائزہ لے گا (یعنی کار کے عقب کا)

"وائپر ایک۔ سائڈ کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا۔ وھیل کیپ ایک۔" وہ اعلان کرے گا۔ اگر تم اپنی کار کی ان کوتاہیوں سے اچھی طرح واقف ہو تو انہیں یاد دہانی کرانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ تم خود کو قدرے او پر کھینچ کر کہتے ہو"ہاں ٹھیک ہے۔"

اس "چیک اپ" کے بعد تم سب پکچر ہاؤس کے بکنگ ہال میں مارچ کرتے ہو۔ (اوورکوٹ والا سب سے آخر میں آئے) وہ ایک ہاتھ سے اوورکوٹ اٹھائے گا اور دوسرے سے ممانی کے برقعے کو تھامے گا۔ ممانی برقعے میں ہوں گی۔ (پاک بٹن ابھی اتنا "ایڈوانسڈ" نہیں ہوا) پھر تم خوش قسمت ثابت ہوتے ہو۔ اب سات بجنے میں پانچ منٹ رہتے ہیں لیکن فلم شروع نہیں ہوئی۔ فلم لمبی ہے اور ابھی پہلا ساڑھے تین کا شو بھی ختم نہیں ہوا۔ بکنگ آفس کے سامنے کافی طویل کیو ہے۔ تم ایک ہاتھ اپنے بٹوے والی جیب پر رکھے کیو میں کھڑے ہو جاؤ گے۔ ماموں اور دوسرے لوگ اپنی مرضی کے مطابق ہال میں پھریں گے۔ اگر بعض لوگ خواتین کو گھوریں تو تم ان کی طرف بالکل نہ دیکھو۔ غیرت و حمیت کو موقع و محل کے مطابق جوش میں لانا چاہیئے۔ پھر یہ پیوتنک دور ہے، وکٹورین نہیں۔

پہلا شو ختم ہو جاتا ہے اور لوگ شاداں و فرحاں باہر اُمڈتے آتے ہیں۔ کیو حرکت کرنے لگتا ہے۔ اپنے بٹوے والے جیب پر ہاتھ کا دباؤ چند ڈگری بڑھا دو۔ جب کیو میں تم آدھا راستہ طے کر چکو گے تو ایک ننھا سا مونچھوں والا آدمی تمہارے آگے آ کر کیو میں گھس جائے گا۔ اُسے سختی سے کہو کہ وہ زیادتی نہ کرے مگر وہ نہیں سُنے گا اور ایک فراخ مسکراہٹ سے تمہارے دل کو موم کرنے کی سعیِ بے سود کرے گا۔ تمہارے پیچھے کھڑے لوگ بھی مونچھوں والے آدمی کو کیو سے نکل جانے اور اپنے نمبر پر کھڑا ہونے کے لیئے شور مچائیں گے۔ آخر اُسے ہٹا دیا جائے گا۔ یہ اصول کی بات ہے۔ ایک مہذّب قوم ہونے کی حیثیت سے ہم کیو کی خلاف ورزی ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ آخر تم سرکتے سرکتے بکنگ آفس تک جا پہنچتے ہو اور یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہو کہ تم سے اگلا آدمی جو ٹکٹ لے کر بکنگ کی کھڑکی سے ہٹا ہے وہی ننھا مونچھوں والا آدمی ہے۔ وہ تمہیں ایک فاتحانہ مسکراہٹ دے گا۔ اس سے دھول دھپّا اس وقت بے معنیٰ ہوگا۔ ٹکٹ لینے پر توجہ کرو۔ تم پورے چھ ٹکٹ لو گے۔ جونیر کا ہاف ٹکٹ نہیں ہوگا۔ بیس روپے کا چینج لینے کے بعد جب تم حساب لگاؤ گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہیں ایک روپیہ آٹھ آنے اوورچارج کیا گیا ہے اور ٹکٹ پر لکھی قیمت سے چار آنے زائد تم سے وصول ہوئے ہیں۔ یہ ایرکنڈیشنگ کے لیئے ہے اور اگر اس کے لیئے نہیں تو کوئی اور ٹیکس ہوگا۔ غصّہ تو تمہیں آئے گا مگر اُسے پی جاؤ۔ مینیجر سے بھی احتجاج کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اس سے شکایت کرتے ہوئے خفیف لگو گے۔

تم خود کو یوں ٹھنڈا کرو کہ یہ تم نے بکنگ والوں کو ٹِپ دیا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ تمہارے ٹکٹ لیتے ہی بکنگ کی کھڑکی ہاؤس فل ہو جانے کی وجہ سے کھٹ سے بند ہو جائے گی۔ وھاٹ لک بوائے! تم ٹکٹوں کو فاتحانہ لہراتے ہوئے خواتین کی طرف جاؤ گے۔ اور اس طرح محسوس کرو گے کہ جیسے تم سرایڈمنڈ ہلاری کی ٹیم میں انٹارکٹک کے برفانی خطّوں سے لوٹے ہو خواتین قطعاً اس حقیقی مہم جویانہ کارکردگی سے متاثر نہیں ہوں گی۔

"تم نے بڑی دیر کر دی۔"

"ہمارے خالو تو منیجر سے مل کر فوراً ٹکٹ لے آتے ہیں خواہ کتنا رش ہو۔"

"چلو چلو۔"

"ممانی بے چاری کی طبیعت بڑی متلا رہی ہے ــــ اسپرو تو لا دو بے چاری کو۔"

"یہ کیمسٹ کی دوکان نہیں یہاں فلمیں دکھاتے ہیں۔"

"اکبر بادشاہ کل میں اور آپ اکٹھے دیکھیں گے۔" اوورکوٹ والا ماموں کہے گا۔ تم سب قالین بچھی سیڑھیوں سے اوپر جاؤ گے۔ کچھ دیر اپرسٹال کے داخلے پر انتظار کرو گے (اندر سینما ہاؤس کے دوسرے شو کے لئے جھاڑ پونچھ ہو رہی ہے۔ جونیر اس عرصے میں ایک کوکا کولا پئے گا) پھر ایک باوردی "اشر" تمہاری راہنمائی کرتا ہوا تمہیں تمہاری سیٹوں پر لے جائے گا۔ جی رَو سیٹ نمبر اسّی تا پچاسی۔ بیٹھنے کی ترتیب پر تھوڑی سی بحث ہو گی۔ آخر یہ ترتیب بروئے کار لائی جائے گی۔ تم ایک سرے پر، پھر جونیر، ممانی کو چھوڑ کر دوسری خواتین پھر ممانی اور دوسرے سرے پر اوورکوٹ والا ماموں (ماموں اوورکوٹ ساتھ کی خالی سیٹ پر رکھ دے گا مگر فوراً ہی ایک موٹا گنجا آدمی اس سیٹ کا دعویٰ کرے گا اور ماموں کو بادلِ ناخواستہ اوورکوٹ اٹھا کر اپنے زانوؤں پر رکھنا پڑے گا۔ پاکپتن میں تو اوورکوٹ کو سیٹ پر پڑا رہنے دیتے ہیں) خواتین کی ہمراہی میں یہ ترتیب نشست لازمی ہے۔ خواتین کو دونوں اطراف سے گھر کے مردوں کی بھرپور حفاظت میسّر ہو تو وہ فلم کو یکسوئی سے دیکھ سکتی ہیں ورنہ اگر کوئی غیر مرد کسی خاتون کے پہلو میں آ بیٹھے تو توجہ ہٹ جاتی ہے۔ یہ غیر مردوں کے لئے بھی اچھا نہیں کہ وہ کسی اجنبی خاتون کے پاس جا بیٹھیں۔ بعض غیر مرد اس چیز کو پسند کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ والیر برزد ہے یا رائے ڈی جینرو۔ اور مفت میں کبھی کبھار تھپڑ کھا کر اٹھتے ہیں۔

روشنیاں یکلخت مدھم ہو جاتی ہیں۔ سینما کے پردے کو ڈھانپنے والا سنہری اور رنگین اسکرین بیچ میں سے ہٹ کر اطراف میں سرکتا ہے اور سینما کی متحرک تصویریں تمہارے سامنے گونجنے لگتی ہیں۔ اس موقع پر یقیناً تمہارے پیچھے بیٹھا ہوا کوئی آدمی تمہارے کندھے پر ہاتھ رکھے گا اور تمہیں کہے گا کہ تم اپنے سر کو ایک طرف کر کے بیٹھو کیونکہ تمہارا سر اس کے اور فلمی تصویر کے درمیان حائل ہو رہا ہے۔ ایک بار اس کی درخواست مان جاؤ مگر تھوڑی دیر کے بعد اپنے کو اصل مقام پر لے آؤ۔ یہ خودداری کا تقاضا ہے۔ اور پھر سر کو ایک ترچھی غیر آرام دہ پوزیشن میں رہنے دینا (محض اس لئے کہ کوئی اس کی وجہ سے ایک چوتھائی تصویر نہیں دیکھ سکتا) اس بڑے اہم جسمانی عضو کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس سے سرسام وغیرہ کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اگر وہ آدمی تمہیں دوبارہ سر ہٹانے کے لئے کہے تو شائستگی سے

اُسے بتاؤ کہ تمہیں تمہارے سر کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ (تمہیں امید رکھنی چاہیئے کہ وہ اس کے بعد معقول رویّہ اختیار کرے گا اور اپنے سر کے لئے مناسب زاویہ متعیّن کرے گا بشرطیکہ اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی یا خاتون کو اس پر اعتراض نہ ہو)

اصل فلم "میں تیری تو میرا" سے پہلے تم بہت کچھ الم غلم تصویریں دیکھو گے۔ ملکی مصنوعات کے بارے میں تمہیں بیش قیمت معلومات بہم پہنچائی جائیں گی۔ تمہیں یہ پتہ چلے گا کہ مشہور فلم سٹار پرکالہ بک بک صابن کیوں استعمال کرتی ہیں (تمہیں جاتے جاتے پرکالہ کی گوری چٹّی رانوں کی جھلک بھی دکھائی جائے گی) اپنا ٹیلی ویژن سیٹ خریدتے وقت کون سے آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں (اس کی خریداری کی فرمائش گاہک کو گاکر کرنی پڑتی ہے اور دوکاندار بھی آنکھیں مٹکا کر اور اچھل کر گانے کا جواب گانے سے دیتا ہے۔ اس کے بغیر وہ تمہیں نیا ٹیلی ویژن سیٹ نہیں دیں گے) کیبرجی کا لان نسوانی جسم پر کیسے بجتا ہے۔ شطرنج کی بازی ہارنے کے بعد ربانی چائے کا پیالہ پینا کیوں ضروری ہے اور مولا مولا پینے سے طبیعت دھینگا مشتی اور اُودھم مچانے کے لئے کیوں مچلنے لگتی ہے۔ تم ارادہ کرتے ہو کہ آئندہ تم کا بوس ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کرو گے، عف عف سے کپڑے دھلانے پر اصرار کرو گے۔ اور ٹی کیو شرٹ پہن کر ایک منگولین خاتون کو بغل میں بٹھائے ایمپرس کار میں سوار ہو کر جاؤ گے اور ہوٹل واہ واہ میں ڈنر کھاؤ گے۔ او ہوائے وھاٹ اے لائف! پائیریٹ بنک آیٹ یوئر سروس۔ پھر اس ملک کا ہر دوسرا بیمہ دار ویسٹرن ہوائی کمپنی کا بیمہ دار ہے۔ تم بدقسمتی سے پاکیزہ انشورنش کمپنی کے بیمہ دار ہو جس کے بانی بقول کمپنی والوں کے مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ تم فیصلہ کرتے ہو کہ تم جونیر کو بڑے ہونے پر ویسٹرن ہوائی جہاز پالیسی لینے پر اکساؤ گے۔

جینے کے لئے ان ضروری لوازمات کے متعلق سیکھنے کے بعد وہ تمہیں ڈاکو منٹری دکھائیں گے۔ تم سلطان آف بالابو کو ہوائی جہاز سے سیڑھی پر سے اترتے اور وزیر شکاریات بونس واؤچر کو دونوں گالوں پر بوسہ لیتے دیکھو گے۔ وزیرِ شکاریات کے علاوہ دوسرے کئی خوش پوشاک معززین سلطان کے استقبال کے لئے ٹارمیک پر ہوں گے۔ سلطان ان سے صرف بغل گیر ہوگا (وہ غالباً عام وی۔ آئی۔ پی ہیں) پھدکتی ہوئی چال سے گارڈ آف آنر کا معائنہ کرے گا۔ اور اخیر میں سلطان کا پاؤں پھسل جائے گا۔ وہ گرے گا نہیں۔ اتنے سارے آدمیوں کے سامنے گرنے سے بے وقری مول لینا ہے۔ وہ آخر اپنے حرم کے ساتھ ایک مرسڈیز لموسین میں داخل ہوتے دکھایا جاتا ہے۔ جو فراٹے بھرتی ہوئی الٹے رُخ کسی نامعلوم سمت میں غائب ہو جاتی ہے۔ تم سلطان کو پھر نہیں دیکھتے۔ ہاں وزیرِ شکاریات کا آشنا، چشمہ لگا موٹیلا چہرہ تمہیں پھر نظر آتا ہے۔ اس دفعہ وہ ایک شامیانے میں فیتہ کاٹ کر شعبۂ نمود آلو واں کا افتتاح کر رہا ہے۔ پھر کھانا کا تجارتی وفد اور کچھ ملکی سکریٹری قسم کے لوگ میزوں پر بیٹھ کر کسی کاغذ پر دستخط کرتے ہیں جس کے بعد ہر کوئی ہر کسی سے ہاتھ ملاتا ہے اور سب کی مسکراہٹ مصنوعی لگتی ہے۔ ڈاکو منٹری ختم ہوتی ہے اور ٹریلر شروع ہوتے ہیں۔ آنے

والی فلموں میں گانوں کے ٹوٹے ہوئے بول، چیخیں، طوفان آگیں ٹھاہ ٹھاہ ٹھائیں۔ یہاں تم جونیر کو کان میں بتاؤ گے کہ اب اصل فلم شروع ہوئی۔ جونیر یہ اطلاع اپنی امی کو پہنچائے گا جو اسے خالہ گلزار کے کان میں پھونکے گی۔ خالہ گلزار باجی ناہید کو یہ خوش خبری دیں گی جو اسے آگے پاس کر دیں گی اوور کوٹ والا ماموں اس سے محروم رہے گا وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے، منہ کھولے سو رہا ہوگا۔ (اوورکوٹ زانوؤں کی بجائے نیچے پڑا ہوگا)

لیکن فلم شروع نہیں ہوگی۔ روشنیاں ہو جائیں گی اور سنہری اور روپہلی پردہ کے پلو پھر مل جائیں گے۔ تم بلند آواز سے کہو گے "انٹرول" تم سب کو کاکولا پیو گے۔ اوورکوٹ والے ماموں کو کوکاکولا کے لئے جگانا پڑے گا۔ وہ کہے گا "کوکاکولا پاکستان میں بھی ملتا ہے"۔ تم سب لوگ اس قسم کی گفتگو کرو گے۔

"ماموں کو نیند آگئی تھی"

"کیا میں سو رہا تھا؟"

"پاکستان میں اتنا اچھا کھیل نہیں ہوتا"

"یہاں سے اسپرو نہیں مل سکتی؟"

"ہائے مجھے اب خیال آیا۔ میں تو اپنا پرس وہاں بستر پر کھلا چھوڑ آئی۔ نئے نوکر کا بھی اعتبار نہیں"۔

"اس میں کتنی رقم ہے؟"

"پانچ روپے بارہ آنے"

لیکن اب فلم "میں تیری تو میرا" باقاعدہ شروع ہوگی۔ تم ٹائیٹلز کو بغور پڑھو گے۔ جونیر نہ صرف انھیں پڑھے گا بلکہ اونچی آواز میں فخر یہ اپنی اردو دانی جتانے کے لئے ٹائیٹلز کی عبارت کا اعلان کرے گا ــ سپرسانک موڈی ٹون کی پیشکش۔۔۔ کہانی: ایم عبرت فلم ساز: ایم صداقت۔ ہدایات: ایم۔ راحت۔ تم سوچو گے ڈائرکٹر، پروڈیوسر، میوزک ڈائرکٹر اور کہانی لکھنے والا سب غالباً ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں۔

پیچھے بیٹھا ہوا آدمی پھر تمہیں سر کو سرکانے یاد دلانے کے لئے کہے گا۔ تم "ساری" کہہ کر خود کو ممکن نتائج کے لئے پوری طرح لیس کر لو گے۔ گیدی کہیں کا، بعض لوگ واقعی حد ہوتے ہیں۔

پہلا منظر وہی ہوگا جس کے ایک سٹل کو باہر اشتہار میں بھڑکتے رنگوں میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن ــ شنو سوار اور ربابہ گھوڑے پر سوار کسی پہاڑی علاقے۔ غالباً مری میں قدرت کے نظاروں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ربابہ کے بال انگریزی طرز کے ترشے ہوئے ہیں۔ اس نے ایک چست جیکٹ اور بریجیز پہن رکھی ہے۔ تمہیں اس کے سینے کے ابھار

اور کدھوں کے جسم کو دیکھ کر حیرت ہوگی۔ یہ ورزشی زندگی کے "فیل ہیں۔ شہ سوار ایک چھپکلیوں والی بشرٹ اور پلیس فور ڈانٹے ہوئے ہے۔ بشرٹ میں اس کا پیٹ مقتل تھل کرتا نظر آتا ہے۔ تمہیں اس تانگے کے گھوڑے پر رحم آئے گا جس پر وہ سوار ہے۔ پہاڑ بھی کبھی ہلنے لگے گا کیونکہ وہ کارڈبورڈ کا بنا ہوا ہے۔ (وہ دونوں یقیناً ہائی کلاس بورژوا خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں) تم فوراً بھانپ جاؤ گے کہ اب وہ کسی پُرفضا مقام پر گھوڑوں سے اتر کر اور ایک ڈوئیٹ گا کر ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کریں گے۔ بھئی تم کتنے ہوشیار ہو! وہ فی الواقع یہی کریں گے۔ تم ڈوئیٹ نہیں سُن سکو گے جو "میں تیری تو میرا" کی ہائی لائٹ ہے۔ کیونکہ ممانی کی طبیعت شدید بگڑنے لگی ہے اور چونکہ اوورکوٹ والے ماموں پھر سو گئے ہیں اور لیوں بھی پاک ٹین سے آئے ہیں۔ تمہیں باہر اسپرو کی ٹکیا لینے کے لئے جانا پڑے گا۔ تم ممانی کو کوستے ہوئے بادل ناخواستہ اٹھو گے۔ اسپرو کی ٹکیا دستیاب نہیں ہوگی اور نواور بک اسٹال والا بھی اسپرو نہیں رکھتا۔ لامحالہ تم سرد ہواؤں میں ٹھٹھرتے ہوئے "بلیو ہال" کیمسٹ کی دوکان پر جاتے ہو اور آدھ درجن اسپرو خریدتے ہو۔ ایک تم خود نگلتے ہو، تجربے کے طور پر نگلتے ہو، اس کا اثر دیکھنے کے لئے۔ ویسے بھی سب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بیماری کی روک اس کے علاج سے بہتر ہے۔ اسپرو جیب میں ڈال کر تم خراماں خراماں ایر اسٹائل میں داخل ہوتے ہو۔ دروازے پر اشر کوئی نہیں ہے اور کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ تم جھکتے ٹٹولتے آخر اپنی نشست پر جا بیٹھتے ہو اور پھر فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے ہو۔ ایک گھیں گھیں کرتی آواز آتی ہے۔ "دیکھو مسٹر! اندھے ہوئے ہو؟" "دراصل یہ تمہاری سیٹ نہیں۔ یہ "ای" رو میں پندرھویں سیٹ ہے۔ تمہاری سیٹ "جی" رو میں ہے۔ تم آخر اپنی اصل سیٹ پالو گے۔ اور اسپرو کا پیکٹ ممانی کے پاس پہنچانے کے بعد تمہیں جو تیر سے پتہ چلے گا کہ فلم کی ہائی لائٹ جس میں پاگل خانے کے سب پاگل مل کر قوالی گاتے ہیں، ابھی ابھی گذری ہے۔ یہ قوالی قطعاً مِس کرنے کی شے نہ تھی۔ لیکن اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں۔ تھیٹروں میں "ونس مور" کی تالی پیٹنے سے ایک سین کو دوبارہ، بلکہ سہ بارہ دکھایا جاتا تھا۔ فلموں میں یہ دستور نہیں۔ تم اس وقت تک کہانی کی لڑی کو بالکل کھو چکے ہو۔ تم اسکرین پر چہروں کو اُبھرتے، زوردار مکالمے بولتے اور غائب ہوتے دیکھتے ہو اور تعجب کرتے ہو کہ یہ سب کچھ کس سلسلے میں ہو رہا ہے۔ ایک ریل گاڑی اسکرین پر گذرتی ہے، کسی اسٹیشن پر پہونچتی ہے۔ تمہیں لاہور کا پلیٹ فارم نمبر ۴ یاد آجاتا ہے (فلم میں یہ اسٹیشن پریم نگر کا اسٹیشن ہے) گارڈ کی یونیفارم میں ایک صحت مند آدمی ایک خاتون مسافر کے ساتھ کوکاکولا اسٹال پر ایک دوئیٹ گائے گا اور تمہیں یہ دریافت کرنے میں کچھ وقت لگے گا کہ گارڈ کی یونیفارم والا آدمی ہیرو شہ سوار ہے اور غرارے اور کرتی میں ملبوس خاتون مسافر ہیروئن ربابہ ہے۔ وہ یقیناً پہاڑ پر سے لوٹ آئے ہیں۔

پھر ایک پگڑ اور داڑھی والا آدمی پردے پر چھا جاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ یہ شادی اس کے جیتے جی نہیں ہو سکے گی۔ تم پھر مہتابیوں کو چھوٹتے دیکھو گے اور شہنائیوں کو بجتے سنو گے۔ ربابہ کا باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ شیخ ڈم ڈم

کے ہاتھ میں دیتا ہے (وہ ریلوے گارڈوں کو پسند نہیں کرتا۔ سمجھ دار والد!) نہیں نہیں! ربابہ اپنی انگوٹھی کو نگل کر خودکشی نہیں کرے گی۔ وہ آدمی جس سے اس کا بیاہ ہوتا ہے انگلستان سے ایم۔آر۔سی۔پی کر کے اور ڈاکٹر بن کر لوٹتا ہے۔ (انجام میں ایک خودکشی ہوگی مگر یہ ڈاکٹر ہوگا ربابہ نہیں) تمہارے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی میں سے ایک نوجوان یہ فلم غالباً چھٹی بار دیکھ رہا ہے۔ دبے لہجے میں اپنے ساتھی کو آنے والے واقعات سے آگاہ کر رہا ہوگا۔ اس گفتگو سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ فلم کا ہیپی اینڈ ہے کیونکہ ڈاکٹر کی خودکشی سے ہیرو اور ہیروئن کے لئے ازدواجی مسرتوں سے بہرہ ور ہونے کا راستہ صاف ہو جاتا ہے (پگڑ اور داڑھی والا آدمی اس وقت تک مر چکا ہوگا)

جونیر کہتا ہے "امی کہہ رہی ہیں، اسپرو کھانے کے لئے چائے کا آرڈر تو دیں۔"

تم پہلے جونیر کی وساطت سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ چائے نہیں آسکتی۔ پھر موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے بادل ناخواستہ اٹھ کر باہر راسٹوراں میں جاتے ہو۔ جب تم چائے کا پیالہ اٹھا کر لوٹتے ہو تو جونیر سے پتہ چلتا ہے کہ فلم کی تیسری ہائی لائٹ جس میں ڈاکٹر کے کلینک میں سب مریض رات کو تین بجے اٹھ کر قوالی گاتے ہیں، ابھی ابھی گذر چکی ہے۔

فلم آخر ختم ہو جائے گی کیونکہ دنیا میں کسی چیز کو بقا نہیں ہوتی۔ تم سب کھڑے ہو کر قومی ترانہ سنو گے سوائے اوورکوٹ والے ماموں کے (جو مکمل طور پر عالم خواب میں ہوگا) ترانے کے ختم ہونے کے بعد تم سنگل فائل میں "اگزٹ" کی طرف حرکت کرو گے۔ سب سے آگے تم، بیچ میں جونیر اور خواتین۔ اوورکوٹ والا ماموں (جسے ممانی نے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا ہے) اپنا اوورکوٹ اٹھائے قطار کے آخر پر ہوگا۔ تم سب صحیح سلامت کار تک پہنچ جاؤ گے۔ سب کار میں پہلے کی سی ترکیب اور ترتیب سے بیٹھ جائیں گے۔ ڈریسنگ گاؤن والا بوسیدہ آدمی عین اس وقت نمودار ہو جائے گا۔ اس دفعہ وہ تمہیں یہ یاد نہیں دلاتا کہ تمہاری کار کا ایک وائپر ہے، اور صرف ایک دھیلی کپ۔ وہ سیلوٹ کرتا ہے۔ تم جونیر سے چار آنے ادھار لے کر اس کے ہاتھ میں دیتے ہو۔ وہ چلا جاتا ہے مگر کار اسٹارٹ نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے اس میں پٹرول نہ ہو۔ تم سب کار میں سے باہر نکل آؤ۔

خوش قسمتی سے تمہیں ایک ٹیکسی مل جائے گی۔ تم خواتین اور ماموں کو اس میں گھر کے لئے سوار کرا دو گے۔ جونیر اور تم کار کی مشینری سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لئے پیچھے رہ جاؤ گے۔

جونیر تھوڑا تھوڑا مکینک ہے۔ وہ ایک ڈھیلے تار کو ذرا چھیڑتا ہے اور ایک چابی گھمانے سے کار واقعی اسٹارٹ ہو جاتی ہے۔ سیدھے قریب ترین پٹرول پمپ پر جاؤ اور پھر آہستہ آہستہ بغیر لائٹوں کے گھر کا رخ کرو۔ لائٹیں بے شک آف رکھو۔ نو بجے رات کے بعد ٹریفک کے سپاہیوں کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے۔

محمد خالد اختر

کار حاضر ہے

مکرمی

السلام و السلام

آپ کا ملازم ابھی ابھی خط لے کر آیا ہے جس میں آپ نے مجھے مطلع کیا ہے کہ آپ کل صبح مع اہل و عیال پکنک منانے کوٹ رادھا کشن جا رہے ہیں۔ اطلاع کا شکریہ۔ آگے چل آپ نے پوچھا ہے کہ کیا میں آپ کو اپنی کار کوٹ رادھا کشن جانے اور آنے کے لئے دے سکتا ہوں یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات تھی؟ کار آپ کی اپنی ہے، جب چاہیں اور جہاں چاہیں لے جائیں۔ کار خریدنے میں میری اصل غرض و غایت یہی تھی کہ کسی طرح اپنے دوستوں کے کام آسکوں۔ ویسے آپ کو شاید علم نہیں کہ لاہور اور کوٹ رادھا کشن کے درمیان ایک بڑی اچھی اور آرام دہ ریل بھی ہے، بسیں بھی آتی جاتی ہیں۔ اوقات ریلوے انکوائری اور بسوں کے اڈے سے معلوم کئے جا سکتے ہیں اور وہ بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتے۔

آپ نے یہ لکھ کر مجھے بے حد شرمسار کیا کہ کار میں پٹرول آپ خود ڈلوائیں گے، آپ مصر ہیں تو آپ کی مرضی۔ آپ کا خط پہنچنے پر میں نے کار کا پٹرول چیک کیا۔ کم از کم ایک گلاس پٹرول ٹینکی میں موجود ہے۔ جس سے آپ بوچڑ خانے تک بخوبی پہنچ جائیں گے۔ اس سے آگے جا بجا پٹرول پمپ آپ کو ملیں گے۔ کاربوریٹر کی واشر میں خرابی کی وجہ سے کار پٹرول ذرا زیادہ کھانے لگی ہے۔ جاتے ہوئے ذرا کنزمپشن بھی چیک کرا لیجئے تاکہ میں اپنے نکینک کو وثوق سے بتا سکوں۔ پٹرول گیج کی سوئی پر نہ جائیں۔ جب سوئی ¼ کا اشارہ کرنے لگے تو یہ جان لیں کہ پٹرول تقریباً ختم ہونے کو ہے نیز ہوز پائپ سے پانی رستے رہنے کی وجہ سے ریڈی ایٹر بعض وقت یکلخت خالی ہو جاتا ہے۔ روانہ ہوتے وقت پانی کے دو ایک ڈبے ڈکی میں ضرور رکھ لیں اور وقتاً فوقتاً

چیک کرتے جائیں کہ پانی ریڈی ایٹر سے غائب تو نہیں ہوگیا۔
کاریں اور چھوٹے چھوٹے نقص ہیں۔ کوٹ رادھا کشن پہنچنے سے پہلے ہی ان کا آپ کو بخوبی علم ہو جائے گا۔ ٹائی راڈ میں خرابی کی وجہ سے سٹیرنگ میں کچھ 'پلے' (PLAY) آگئی ہے مجھے امید ہے کہ آپ 'پلے' کو ذہن میں رکھ کر سٹیرنگ کاٹیں گے۔ خدا کرے گا کہ سٹیرنگ فری نہ ہوگا ہو گیا تو خدا حافظ۔
ان باتوں کا خاص خیال رکھیں:۔
سٹارٹنگ: چابی لگانے سے کار سٹارٹ نہیں ہو گی۔ یہ نقص ابھی حال ہی میں پیدا ہوا ہے۔ زور سے دھکا لگوا کر سٹارٹ کریں۔ بیٹری کمزور ہے۔
چوک: کار کا چوک نہیں۔ اس 'ناب' کو جو چابی کی جگہ سے دائیں طرف ہے 'چوک' سمجھ کر نہ کھینچیں، وہ وائپرز کی ہے۔ وائپرز نہیں ہیں۔ چند دن ہوئے کسی ضرورتمند نے انھیں اتار لیا تھا اور ان کے ساتھ دو وھیل کپ بھی۔
آئل: پچھلے مہینے سے کار موبل آئل بے تحاشا کھانے لگی ہے۔ مکینک کو دکھایا تھا۔ اس نے انجن کو اوور ہال کرانے کا مشورہ دیا، یہ ہر بیس میل کے بعد آدھا کوارٹ کھاتی ہے، موبل آئل کا ایک گیلن کاٹین ہمراہ رکھیں اور ہر بیس میل کے بعد آدھا آدھا کوارٹ ڈال کر آئل فل رکھتے جائیں۔ آئل گیج چیمبر میں لگا ہے مگر آئل ڈالنے کی جگہ اور ہے۔ جب آپ کار لینے آئیں گے میں سمجھا دوں گا۔ موبل آئل کے بغیر کار چلانا قرینِ مصلحت نہیں۔
ٹائر: دو ٹائر بڑی اچھی حالت میں ہیں۔ میں نے دو ماہ ہوئے انھیں بدلا تھا پچھلے ایک ٹائر میں گیٹس ڈلوایا تھا اور وہ پھول گیا ہے جس سے کار ایک طرف سے جمپ لگا کر چلتی ہے۔ پرانے ٹائروں میں سے ایک کو میں نے سٹپنی کے طور پر رکھا ہوا ہے، اس کا والو تبدیل کر کے ہوا بھروالیں اور ٹیسٹ کروالیں کہ ہوا کہیں سے نکل تو نہیں رہی۔ آخر ہوا ہے نکل بھی تو سکتی ہے۔
لائیٹس: لائیٹس جلانے سے بیٹری بالکل ڈاؤن ہو جائے گی۔ چھوٹی لائیٹس جلا سکتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ شام سے پہلے گھر لوٹ آئیں۔ پانچ چھ گھنٹے پکنک کے لئے بہت کافی ہوتے ہیں۔
بریکیں: بریکیں ہیں تو درست مگر ذرا دیر سے لگتی ہیں۔ دو تین منٹ پہلے لگانی شروع کر دیں۔
دروازے: ایک دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوتا اور کبھی کبھی اچانک کھل جاتا ہے۔ اسے اندر سے پینل کی کسی 'ناب' سے باندھ لیں۔ بچوں کو تاکید کر دیں کہ اس پر زور نہ دیں۔
ہارن: یہ کسی وقت بجتا ہے اور کسی وقت کام چھوڑ جاتا ہے یہی سمجھیں کہ ہارن نہیں ہے۔ انجن کی آواز کسی

حدتک ہارن کا کام دیتی ہے۔

اس کے علاوہ دو تین اور چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو میں بالمشافہ گوش گذار کروں گا۔

بھابی کو میرا سلام کہدیں، بچوں کو پیار

آپ کا نیاز مند

عصمت اللہ خاں (تمغۂ خدمت)

مکرر: آپ نے وعدہ کیا تھا کہ برخوردار عفت اللہ کا پاسپورٹ جلد بنوادیں گے، وہ قول ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ یاد دہانی کی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔

محمد خالد اختر

تبصرے

بستی (ناول)

مصنف ۔۔۔ انتظار حسین **** ناشر ۔۔۔ نقش اول ، کتاب گھر ، لاہور ***** قیمت : ۴۵ روپے

میں ایک انتھک اور عمر بھر کا ناول پڑھنے والا ہوں اور میں نے ہزاروں ناول پڑھ ڈالے ہوں گے ۔ یہ کوئی ڈینگ نہیں بلکہ اسے ایک لت گردانا جاسکتا ہے ۔۔۔ ایک زندگی بھر کی عادت جو سکول اور کالج کے ایام میں مجھے پڑی اور بعد کے آنے والے برسوں میں پختہ ہوتی گئی ۔ اس کا آغاز بچپن اور لڑکپن میں دار الاشاعت پنجاب اور فضل بک ڈپو کی چھپی ہوئی کہانیوں اور جاسوسی ناولوں سے ہوا ، مگر دسویں جماعت میں آنے تک میں انگریزی مہماتی رومانوں اور ناولوں سے متعارف ہوچکا تھا اور وہ میرا اوڑھنا بچھونا بن گئے تھے ۔ میں نے رابرٹ لوئی اسٹیونسن کو دریافت کیا اور رائڈر ہیگرڈ ، فینی مور کوپر ، فریڈرک مریات اور دوسروں کو جن کے نام میرے لیے جادو کے بول تھے اور جن کی ہوشربا کتابیں مجھے حیرت ناک دنیاؤں میں لے جاتی تھیں ۔ اور راتوں کو جگائے رکھتی تھیں ۔ کیسے کہانی کہنے والے یہ لوگ تھے ! کالج کی تعلیم ختم کرنے تک میں تقریباً سارا موپاساں پڑھ چکا تھا اور بہت کچھ وکٹر ہوگو اور ڈوما جس کا ضخیم ناول " کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو " بھی میرے تخیل کو آتشیں کر دیتا ہے ۔ عظیم طالسطائی ، دوستوسکی ، چیخوف ، ترگنیف میری زندگی میں بہت بعد میں آئے ہیں اردو ناول بہت کم پڑھے ہیں اور بعض لوگ میرے یہ کہنے پر میرے لتے لیں گے کہ ناول کی صنف میں اردو میں پڑھنے کے لیے ماسوا چند گنتی کی کتابوں کے کوئی قابل ذکر چیز نہیں ۔ ہم نے بڑے ناول نہیں لکھے ۔ رتن ناتھ سرشار کے " فسانہ آزاد " کو ایک بڑا ناول کہا جاسکتا ہے ۔ اور محمد ہادی رسوا کی " امراؤ جان ادا " ایک فنی شہپارہ ہے مگر عبد الحلیم شرر کے اسلامی تاریخ ناول ایک مذاق ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی تبلیغی ناول اپنی ظرافت کی چاشنی اور بیان کی لطافت کے باوجود محض پند و موعظت کے صحیفے ، وہ ہمارے دلوں کو نہیں ہلاتے ۔ منشی پریم چند نے اردو میں چند اچھے ناول لکھے مگر انہیں اب

کوئی نہیں پڑھتا اور وہ کسی کو یاد نہیں --- اور یہاں ایک طرح ہماری کلاسکی ناول نگاری کی تاریخ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ ناول کے ایک رسیا کی حیثیت سے میرے نزدیک ایک ناول ایسا ہونا چاہیئے جو پڑھنے والے کو پہلے صفحے سے اپنی گرفت میں لے لے۔ اس میں سچے چلتے پھرتے کردار ہوں اور اس میں کہنے کے لیے ایک کہانی ہو۔ پڑھنے کے دوران یہ تمہیں اپنی تگ و تاز اور رنگا رنگی سے مضطرب اور بے کل سا رکھے۔ اس طرح کہ تمہیں کھانے پینے کا ہوش نہ رہے۔ اور جب تم اسے اپنے ہاتھ سے رکھو تو اس کے مختلف نقوش، اس کے مناظر اور واقعات دیر تک تمہارے ذہن میں لو جگاتے رہیں۔ تم محسوس کرو کہ تم ایک انوکھے، خوبصورت تجربے میں سے گذرے ہو اور نئے نظاروں پر تمہارے دل کی کھڑکی وا ہوئی ہے اور تم نے کچھ نئے دوست بنائے ہیں۔ تمہاری زندگی کی حیرت فزائیوں اور انسانوں کی خوشیوں اور غموں کا گیان زیادہ گہرا ہوا ہے۔ اردو میں ایسے کتنے ناول ہیں؟ تم انہیں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتے ہو۔ جو کچھ میں نے ناول کے بارے میں کہا ہے، یہ ناول کی تعریف نہیں۔ مگر اس سے سب اتفاق کریں گے کہ دنیا کے بڑے ناول جن کی مہک ہمارے ذہن سے نہیں مٹتی اور جن سے ہم محبت کرتے ہیں سب میں یہ صفتیں مشترک ہوتی ہیں۔

میں نے حال ہی میں تین ناول پڑھے ہیں۔ فیرل کا "سیج آف کرشنا پور" نوبل پرائز ونر یہودی مصنف آئی۔ جی سنگر کا "سلیو" (SLAVE) اور ایچ۔ ای۔ بیٹس H.E.BATES کا "سکارلٹ سورڈ" (SCARLET SWORD) ۔ پہلا غدر کے زمانے میں لکھنؤ کی ریجنسی کے محاصرے کے بارے میں ہے۔ آئی سنگر کا ناول سترھویں صدی کے پولینڈ کی ایک خوبصورت محبت کی کہانی ہے۔ تیسرا ناول ۱۹۴۷ء میں پٹھانوں اور آفریدیوں کی مقبوضہ کشمیر پر یلغار اور ان کے ایک کیتھولک مشن کے محاصرے کی دہشت ناک کہانی بتاتا ہے۔ تینوں ناولوں میں کردار چلتے پھرتے جیتے جاگتے ہیں اور تم ان کو تقریباً دیکھ سکتے ہو۔ ناول کا زمانہ اور سین آف ایکشن منور و روشن ہے۔ گویا واقعات ہمارے سامنے رونما ہو رہے ہوں۔ اور ہم خود وہاں موجود ہوں۔ ان کی کہانیوں کی دلآویزی تمہیں پہلے صفحے سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے سوائے سنگر کے ناول کے (جسے عظیم کہا جا سکتا ہے)۔ دوسرے دو ناول EXCEPTIONAL نہیں مگر وہ اچھے اور خوبصورت ناول ہیں۔ اور اگر کوئی اردو میں ایسے ناول بھی لکھ سکے تو میرا جی بہت خوش ہوگا۔

انتظار حسین کا ناول "بستی" ابھی ابھی تزک و احتشام سے چھپا ہے، ہمارے اونٹ گارڈ AVANT GARDE نقادوں نے ملک کے رواج کے مطابق اس اونٹ گارڈ لکھنے والے کو خوب چڑھایا ہے اور ناول کی خوبیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ ایک تبصرہ نگار نے اسے اردو کے دس عظیم ناولوں میں سے ایک ہونے کی نوید دی ہے (اگرچہ اس

نے یہ نہیں بتایا کہ دوسرے نو عظیم ناول کونسے ہیں) ایسی تعریف و تحسین کے ڈونگروں میں "بستی" کے متعلق میری توقعات قدرتاً بہت اونچی ہو گئی تھیں مگر جب میں نے اس ناول کو پڑھنا شروع کیا اور پچاس صفحات سے آگے تک پڑھ چکا تو بریمی اور جھاہٹ نے مجھے آن لیا۔ مجھے جل دیا گیا تھا اور میری مایوسی شدید تھی۔ اگر اردو میں ایسے ہی عظیم ناول ہمارا مقدر ہیں تو ہم ان سے لنڈورے ہی بھلے۔ صاف بات یہ ہے کہ "بستی" میری طبعیت کا ناول نہیں (اگر یہ فی الواقع ناول ہے)۔ میری رائے میں "بستی" بے نصیب اردو ناولوں کے تابوت میں ایک اور کیل ہے۔ اردو ادب کے آسمان پر سے اس اداسی اور بیمار ناسٹیلجا کے تنگ و تاریک بادل کب چھٹیں گے کب سورج چمکے گا۔ اور پرندے درختوں پر گائیں گے؟ مجھے یاد ہے انتظار حسین نے ایک دفعہ تحقیر سے سومرسٹ ماہام کو ایسا بزرگ مصنف بتایا تھا جو بیسویں صدی میں اٹھارویں (یا انیسویں صدی کے انداز میں افسانے لکھا کرتا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ایک بڑے اور بے مثل کہانی کہنے والے کو اس اوچھے پن سے اڑانے سے ماہام کے ادبی کارنامے یک قلم ملیامیٹ ہو جائیں گے اور اس بے چارے اٹھارویں صدی کے انداز میں لکھنے والے کو کوئی نہیں پڑھے گا۔ شاید انتظار حسین، اس خود رائی اور خود پسندی کے جذبے کے تحت جو بدقسمتی سے ہمارے ادبی سورماؤں میں عام ہے ایک استاد کی "اچیومنٹ" کو گھٹا کر اپنی قامت بڑھانے کا خواہاں تھا۔۔۔۔ "میری طرف دیکھو میں ایک افسانہ نگار ہوں جو بیسویں صدی بیسویں (یا اکیسویں صدی) کی کہانیاں لکھ رہا ہوں اس لئے ماہام وغیرہ سے بڑا افسانہ نگار ہوں۔" سومرسٹ ماہام عظیم ناول نگار ہو یا نہ ہو اس کے CAKES & ALE اور مون اینڈ سکس پنس جیسے ناولوں اور گرفت میں لے لینے والی کہانیوں نے دنیا کے لاکھوں لوگوں کو بے اندازہ مسرت دی ہے۔ ان کے دلوں کو برچایا اور رجھایا ہے۔ کیا انتظار حسین نے کبھی اس پائے کی ایک چیز لکھی ہے جس پائے کی وہ اٹھارویں صدی کے انداز میں لکھنے والا ہیک مصنف اتنے قدرتی طور پر اور اتنی فراوانی سے لکھ لیا کرتا تھا۔ کیا وہ کبھی CAKES & ALE یا "آف ہیومن بانڈیج" جیسے ناول لکھ سکنے کا سوچ بھی سکتا ہے؟ ادبی امنگ اونچی رکھنے میں کوئی حرج نہیں مگر اپنی صلاحیت اور حد پرواز کی کچھ سوجھ بوجھ ضرور ہونی چاہئے۔ اپنے سے کہیں اچھے اور بڑے لکھنے والوں پر، تراہ۔ تراہ، کرنے سے آدمی صرف اپنی ہی ہنسی اڑاتا ہے اور بڑا لکھنے والا نہیں بن جاتا۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ "بستی" کے پہلے چالیس صفحات جو اس کے ہیرو ذاکر کے روپ نگر میں بچپن اور لڑکپن کا حال، اس کی گھریلو محبت، دو بچوں کی سلگتی ہوئی چاہت کا حال بتاتے ہیں IMPRESSIVE ہیں۔ وہ اچھا ادب ہیں ہم ان میں ناول کو پھیلتے اور پروان چڑھتے دیکھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہم ان کرداروں اور ان کی وابستگیوں اور نفرتوں کو قریب سے جاننے لگیں گے، اور کہانی ہمیں اپنے دام میں لے لے گی ناول اسی رنگ ڈھنگ اور طاقت سے چلتا تو کوئی

شک نہیں کہ اردو میں ایک اچھا قابل وقعت ناول ہوتا مگر جلد ہی ہماری امیدیں زمین پر پہنچ جاتی ہیں۔ چالیس پچاس صفحات اسی تخلیقی اپج کے بعد کہانی نئے ملک پاکستان سے شروع ہوتی ہے تو ناول کے ساتھ کوئی، گھپلا، (ایک لفظ جس کا انتظار حسین بڑا مشتاق ہے) ہو جاتا ہے "ناول کہاں گیا؟" ہم پوچھتے ہیں۔ کیونکہ بقیہ صفحات میں ہمیں شیراز ہوٹل (جو پاک ٹی ہاؤس ہے) میں ذاکر اور اس کے دوستوں کی بے رنگ نیم انٹلیکچوئیل گفتگوئیں سننی پڑتی ہیں جو انتہائی اکتا دینے والی ہیں۔ ایک ناول زندہ کرداروں کے متعلق ہوتا ہے مگر شیراز ہوٹل کی ٹولی کے لوگ سائے سے رہتے ہیں۔ ناولسٹ کی ساری کاریگری اور کرتب بازی کے باوجود ان پتلیوں میں جان نہیں پڑ پاتی۔ ہمیں ان میں یا ان کی INSPID گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ---- اور ہم اس طرح دھوکا دیے جانے پر ناولسٹ کی گردن ناپنا چاہتے ہیں۔ اسے پڑھنے والوں کو یوں LET DOWN کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

جو "گھپلا" ہوا اس کے بارے میں میرا اپنا اندازہ ہے۔ ہیمنگوے نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک لکھنے والے کو اس وقت کبھی نہیں لکھنا چاہیے جب اس کے کنوئیں میں پانی نہ ہو۔ "بستی کے پچاس صفحات میں سے گذرنے کے بعد انتظار حسین کے کنوئیں میں پانی نہ رہا۔ یادوں اور ناسٹیلجیا سے سیراب سوتے خشک ہوگئے۔ مگر اسے اپنا ناول مکمل کرنا تھا اور اس نے پاک ٹی ہاؤس اور اپنی ٹولی کے دوستوں کا سہارا لیا۔ ایک طرح اس ناول کا المیہ بھی پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے ادیبوں کا المیہ ہے جہاں اپنے وطن سے ہجرت کے بعد ناولسٹ نے اپنی زندگی کی بیشتر گھڑیاں ادب و فن پر گفتگو کرنے میں گذاریں۔ ہیمنگوے ہی نے کہیں ان ادیبوں کا ذکر کیا ہے جو زندگی کے رواں دواں تماشے اور اچھے برے تجربے سے بچ کر کافی ہاؤسوں اور چائے خانوں میں پہروں بیٹھے اونچے انٹلیکچوئیل مباحث حل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ذہنوں پر جرثوموں کی طرح پلتے ہیں۔

--- اور انتظار حسین کی تخلیقی صلاحتیں میرے خیال میں ایک خاص قسم کی اور بہت محدود ہیں "بستی" پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ جیتے جاگتے کردار تخلیق کرنے، ایک وسیع کینوس میں دلآویزی سے رنگ بھرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس کی قابلیت ایک ناول نگار کی ہے ہی نہیں۔ حال میں انتظار حسین نے قرۃ العین حیدر کے نئے ناول "آخر شب کے ہمسفر" کا قدرے مربیانہ نوٹس لیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ایک عظیم ناول نہیں۔ مگر یہ ایک شاداب، رنگین تازہ ہوا سے لہکتا ہوا ناول ہے۔ یہ فراواں تخلیقی قدرت کا حامل ہے اور میرے خیال میں یہ ہمارے ادب میں زندہ رہے گا۔ کیا انتظار حسین یہ چیز اپنے ناول "بستی" کے بارے میں کہہ سکتا ہے؟ قرۃ العین حیدر کے شاندار ناول کے سامنے "بستی" محض ایک خام کارانہ کوشش لگتا ہے۔ انتظار حسین کو اپنے بہی خواہ تبصرہ نگاروں کے بھرے میں نہیں آنا چاہیے۔ ایک لکھنے والے کو کچھ

حاصل نہیں ہوگا اگر وہ اپنے آپ کو اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر دیکھے۔
کیا اردو میں کبھی بڑے ناول لکھے جائیں گے؟ کون یہ ناول لکھے گا؟ پاکستان میں آزادی کے بعد چند ایک بہت اچھے ناول لکھے گئے ہیں۔ خدیجہ مستور کا "آنگن"، اکرام اللہ کا "گرگ شب" (توانائی اور طاقت سے لکھا ہوا ایک غیر معمولی ناول جسے تبصرہ نگاروں نے نظر انداز کرنا مناسب جانا) میرے دھیان میں آتے ہیں۔ مگر ایک شگوفے کے چٹکنے سے بہار نہیں آتی اور اردو ناول کا مستقبل بظاہر BLEAK ہے۔
کہا جا رہا ہے کہ اب اردو میں ناول کے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ بہت سے انٹلیکچوئیل لوگ ناول لکھ رہے ہیں۔ اور اگر ان کو ناشر میسر آئے تو وہ چھپ بھی جائیں گے۔ میں انہیں نہیں پڑھوں گا۔ کیونکہ مجھے اٹھارویں صدی کے انداز میں لکھے ہوئے ناول پسند ہیں۔۔۔ اس قسم کے ناول جیسے جین آسٹن انتھنی ٹرالوپ، اسٹیونسن اور کانرڈ لکھا کرتے تھے اور جیسے اس صدی میں گراہم گرین، جان فاولز اور آئی۔ جی۔ سنگر لکھتے ہیں۔ ویسے یہ یقینی ہے کہ انیس سو اسی کے بہترین اردو ناول کا آدم جی کا ادبی انعام "بستی" کو ملے گا۔

بجنگ آمد

تصنیف: کرنل محمد خان: ناشر۔ مکتبہ جدید، لاہور: قیمت ۔ ۵۰/ –

ادب کا مقصد ہمیں زندگی کے تنوع، اس کی رنگا رنگی، اس کی شادمانی اور اس کے اندوہ سے دوچار کرنا ہے، اس کا مقصد ہمیں ہنسانا اور رلانا اور ہمیں یہ احساس دلانا کہ کوئی شخص اپنے آپ میں ایک جزیرہ نہیں ہوتا بلکہ یہ کہ اپنے احساسات و جذبات میں ہم سب ایک دوسرے کے اعضا ہیں۔ ادب کا مقصد یقیناً ہمیں کسی خاص مسلک یا عقیدے کو اپنانے کی تبلیغ کرنا نہیں۔
میں آغاز ہی میں اس بحث کو اس لئے لیے بیٹھا ہوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آج بھی ادب اور غیر ادب میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ بے شمار لوگوں کے لئے وہ سب کچھ جو ڈائجسٹوں میں چھپتا ہے "ادب" ہے اور نسیم حجازی کے ناول ادب عالیہ۔ اس کے برعکس جب ایک ادبی مجلے میں عباس رضوی کی کہانی "لے پیویں گا" شائع ہوتی ہے تو کوئی اس کا نوٹس تک نہیں لیتا۔ یہ ننھی سی شاہکار کہانی اردو کے سب ضخیم اسلامی تاریخی ناولوں پر جو اب تک لکھے گئے ہیں بھاری ہے، اور اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ کوئی تنقید نگار اردو افسانے پر تنقید کرتے وقت اسے درخور اعتنا نہیں سمجھے گا۔ یہ سچ ہے کہ اس ملک میں کوئی ادب کی دو کوڑی جتنی پروا بھی نہیں کرتا کسی کو پڑھنے سے دلچسپی ہے نہ لکھنے سے، اور لکھنے والوں کو کس قدر عجیب، خبطی قبیل کی مخلوق

سمجھا جاتا ہے جو صرف اپنا وقت ضائع کرنا جانتے ہیں۔ اچھی کتابیں برسوں میں بھی نہیں بک سکتیں کیونکہ تعلیم یافتہ لوگ کالج یا یونیورسٹی سے باہر آنے کے بعد روزانہ اخبار اور ڈائجسٹوں کے علاوہ کچھ اور پڑھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ خلاصوں اور فرہنگوں کی مدد سے پڑھی ہوئی چند ادبی کتابیں ان کا کل ذہنی سرمایہ ہوتی ہیں۔ یہ فرضی تعلیم ان کے تخیل کو بھڑکانے اور صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے کی بجائے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لیے کند کردیتی ہے۔ کالج کے کلاس روم میں "ادب" سے تھوڑی بہت شناسائی ان کے لیے کافی ہوتی ہے اور تحصیل علم کے بعد وہ ایک ادبی کتاب کی شکل ہی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ کیا یہی وہ تعلیم ہے جس پر تعلیم داں اتنا زور دیتے ہیں اور جس کو سیاسی بے شعوری سے لے کر طفلانہ بے راہ روی کا تریاق گردانا جاتا ہے۔؟ کیا یہ "تعلیم" ٹھیک نہیں جس کے بغیر ہم موجودہ حالت سے ہم ہزار درجہ بہتر ہوں گے؟

کرنل محمد خاں کی کتاب "بجنگ آمد" کو شکرانے اور انتہائی مسرت کے ساتھ پڑھتے ہوئے مجھے اکثر یہ خیال آتا رہا کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں سے کتنے اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہوں گے۔ کتنوں کو اس انوکھی اور نادر کتاب کی خوبیوں کا احساس ہوگا۔ ایسی کتابیں اول تو ہمارے ادب میں تقریباً ناپید ہیں۔ کوئی انہیں نہیں لکھتا۔ اس سلجھے ہوئے شگفتہ منجھے اسلوب میں تو مطلقاً نہیں لکھتا۔ اس فوجی کے طرز بیاں میں ایک ایسی قدرتی کیفیت ہے جس پر ہمارے بہترین لکھنے والے رشک کرسکتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر دل و دماغ کو مسخر کرلیتی ہے۔ "بجنگ آمد" ایک نیم لفٹین کی فوجی زندگی کی داستان ہے۔ سوانح اور سفری تاثرات اور کھلنڈرے پن کا اتنا کھلتا ہوا امتزاج کہ اسے شروع کرکے بیچ میں چھوڑنا آسان بات نہیں۔ اور جب آدمی اس کے اختتام پر پہنچتا ہے (اور اس آخری کلپانے والے فقرے پر "یہاں سے ایک اور داستان کا آغاز ہوتا ہے") تو وہ اتنے اچھے اور پرمذاق ساتھی سے اتنی جلدی جدا ہوجانے پر رنج محسوس کرتا ہے۔ میں نے اس کتاب کو اول تا آخر ایک نشست میں پڑھا اور اس سارے عرصے میں اکتاہٹ یا کوفت کا ایک لمحہ نہ آیا۔ ختم کرچکنے کے بعد میں نے چاہا کہ کاش یہ کتاب اس سے دوگنی لمبی ہوتی جتنی کہ یہ اب ہے، اور میرے دل میں اس دوسری داستان کو پڑھنے کے لئے جس کی مصنف نے خوش خبری دی تھی ایک بیتابی کا احساس پیدا ہوا۔ اردو میں پچھلے پندرہ بیس برس میں کم ہی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں اور جنہوں نے میری "اور کے لیے ہوس" کو اس قدر تیز کیا ہو۔ یہ ایک "ٹورڈی فورس" ہے۔ بےحد چمکیلا، دلچسپ، پرظرافت اور بے دم کردینے والا تماشا۔

کیا میں اس کتاب کو بہت چڑھا جا رہا ہوں؟ میرے خیال میں بالکل نہیں۔ اردو میں اول تو اس نوع کی کتابیں ہیں ہی کتنی؟ تم ان کو انگلیوں پر گن سکتے ہو۔ میرے ذہن میں دو تین ہی اس وقت آتی ہیں۔ ایک "داستان غدر" تھی جو دلی کے مغل شاہزادے کی خود نوشت آپ بیتی ہے۔

اور جسے لاہور اکادمی نے چھاپا تھا۔ دوسری جو مجھے یاد ہے تھانیسر کے ایک سیاسی قیدی کی انڈیمان میں اسیری کی کہانی تھی۔ ان دونوں کتابوں نے مجھے مسحور کیا۔ لیکن ان میں قدیم رنگ اور متانت تھی اور وہ اس زمانے میں عجائبات کے ضمن میں جگہ پاتی ہیں۔ "بجنگ آمد" دوسری جنگ عظیم کے ایک لفٹیننٹ کی ذاتی، چند ھیا دینے والی کہانی ہے۔ ایک لفٹیننٹ جو صحت مند، نارمل اور خوش ذوق ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اول درجے کا پرفن داستان گو بھی۔ ہم اردو ادب کی دولتمندی اور زرخیزی کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تاہم کبھی کبھی ہمیں اپنے دامن کی تنگی کا احساس ہوتا ہے اور ہم پوچھنے لگتے ہیں کہ یہ اردو ادب کہاں ہے۔ اردو میں دو تین اچھے ناول ہیں اور بلاشبہ چند ایک اعلیٰ پایے کے مختصر افسانے جنہیں یورپی ادب کے شاہکاروں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کو چھوڑ کر ہمارا ادبی چمن کتنا ترسا ہوا، کتنا خشک ہے۔ ہمارے سارے ادب میں ایک بھی سوانح یا سفر و سیاحت، یا بیل لیٹرز کی فسٹ ریٹ کتاب نہیں جو ایک ماڈرن سلجھے ہوئے پڑھنے والے کو مطمئن کر سکے۔ ہم ایک بھی ڈاوٹی، فریا ستارک، تھیسیجر THECICER پیدا نہیں کر پائے۔ سٹیونسن کی "ٹریولز ود اے ڈانکی" سی ایک بھی کتاب ہماری زبان میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی (محمد حسین آزاد ایسی کتاب شاید لکھ سکتے، اگر ان پر آخری عمر میں جنون حملہ آور نہ ہوتا) وہ لوگ جو یہاں ان اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، بالعموم ان کی اعلیٰ توانا روایات سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لیے غیر دلچسپ، بے جان چیزیں لکھتے ہیں جنہیں کوئی ضعیف العقل ہی پڑھ سکتا ہے۔ ایک شخص سوانح لکھنے بیٹھتا ہے اور اپنے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتا ہے۔ ایک سفر نامہ لکھنے کا نیک ارادہ باندھتا ہے اور اس کی بجائے ایک تیسرے درجے کی گائیڈ بک لکھ ڈالتا ہے۔ جس میں قابل دید مقامات کے تذکرے سیدھے سفری بروشرز میں سے ترجمہ کر دیے جاتے ہیں۔ جدید ادب میں ساری ذہنی اپج لے دے کے تنقیدوں اور مقالوں پر صرف ہو رہی ہے جیسا کہ شفیق الرحمن نے ایک دفعہ مجھ سے ہنستے ہوئے کہا "اردو میں ادب اتنا نہیں جتنا اس پر مقالے لکھے جاتے ہیں۔"

جس صنف اور طرز میں "بجنگ آمد" لکھی گئی ہے۔ اس میں وہ ہمارے جدید ادب میں منفرد ہے۔ انگریزی میں اس مقبول صنف میں بہت سی کتابیں اور ان میں سے چند ایک مائنر کلاسک کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ میجر ییس براؤن کی "بنگال لانسر" ان میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب جب چھپی تو فوراً ایک بیسٹ سیلر بن گئی۔ پھر اس پر طویل فراموشی کا دور آیا اور اب میں سنتا ہوں کہ یہ پھر پیپر بیک میں آئی ہے۔ ناولسٹ جان ماسٹرز کی "بیوگلز اینڈ اے ٹائگر" بھی جو کرنل محمد خاں کی کتاب کی طرح دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک ذاتی آپ بیتی ہے۔ ایک ناول کی طرح دلچسپ ہے۔ ونسٹن چرچل کی "سٹوری آف مالاکنڈ رائفلز" اور "ریور وار" بھی اسی طرح کی سوانحی تاریخیں ہیں مگر امپیریلسٹ چرچل کی پرشکوہ فصیح نثر مزاح کے عنصر سے عاری ہے اور صرف اس

کے خاص پرستار ہی اس کی کتابوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ درجنوں اور کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ انگریزی زبان اس خاص صنف میں بے حد مالا مال ہے۔ "بنگال لانسر" کو میں نے چودہ پندرہ سال پہلے پڑھا تھا۔ میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ "بجنگ آمد" ہر لحاظ سے پیٹن براؤن کی کتاب سے بہتر کتاب ہے۔

کرنل محمد خاں اپنی کہانی بڑی خوش طبعی، بے تکلفی اور شگفتگی سے بیان کرتا ہے۔ ایک ایسے منجھے ہوئے طرز بیان میں جس کی ایک فوجی سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کی نثر سورج کی چمک اور صاف ستھری ہوا کی طرح ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اس میں خوف کا ذائقہ بھی آجاتا ہے۔ اور "کھائی" کے کنارے پر اڈتی ہوئی زندگی کی خوفناک خوبصورتی کا بیان بھی (کیونکہ ہمارا نیم لفٹین شمالی افریقہ کے محاذ جنگ میں رومیل سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھیجا گیا اور دو تین دفعہ موت سے اس کی بڑی قریبی علیک سلیک ہوئی) سدی دریغ سے صولوم کی طرف پسپائی کے دوران وہ بال بال بارود سے اڑتے ہوئے بچا اور جب ہم اس کے سارے بریگیڈ کی تباہی کا حال پڑھتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ ہمیں کرنل محمد خاں کے بچ کر آنے پر خدا کا شکر بجالانا چاہیئے۔ اگر وہ مارا جاتا تو ہمارے لئے اتنی پر مسرت کتاب کون لکھ سکتا۔

"بجنگ آمد" میں دوسری جنگ عظیم کی فوجی بیرک لائف کی روشن، ذہن میں رہ جانے والی جھلکیاں ہیں۔ ساتھی افسروں کے تیکھے، استادی سے کھینچے ہوئے مرقعے جن میں محبت اور مزاج کی رنگ آمیزی ہے، ہمیشہ مسرت دیتے ہیں۔ درشت کھردرے کرنل بلمپ ان صفحوں میں کبھی کبھی آن نکلتے ہیں۔ مگر محمد خاں ہمیں ان پر خوب خوب ہنساتا ہے۔ کس قدر HUMAN لکھنے والا وہ ہے، اس کی کتاب خود اس کی اپنی داستان نہیں۔ یہ ان ہزاروں نیم لفٹینوں کی ذاتی اندرونی کہانی ہے جو پچھلی جنگ عظیم میں انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے، ان کے وسوسوں، ان کے جذبات، ان کی امنگوں اور ان کی ذہنی اٹھانوں کی کہانی، بناوٹ کے شائبے کے بغیر لکھی ہوئی اور کافی تندرست مزاج کے ساتھ۔

یہ محض ایک فوجی کے جنگ کے سالوں کے "میمائر" ہی نہیں، یہ ایک اول درجے کی مزاحیہ تخلیق بھی ہے۔ یہ مزاح استادی اور روایتی مزاح کی طرح عبارت آرائی کا محتاج نہیں۔ یہ ایک قدرتی جھرنے کی طرح ابلنے والا مزاح ہے۔ "بجنگ آمد" کو شروع کرنے سے چند دن پہلے میں نے "ایولین واہ" کا جنگی ناول MEN AT ARMS پڑھا تھا۔ واہ ایک بڑا قدرتی مزاح نگار ہے اور کرنل محمد خاں کا مزاح بھی کچھ کچھ واہ کی طرح کا ہے۔ میری رائے میں MEN AT ARMS اور "بجنگ آمد" یہ ایک ہی ذائقے اور ایک ہی قسم کے ذہنی انداز کی کتابیں ہیں۔ اگرچہ ایک ناول ہے اور دوسری کہنے کو ایک میمائر۔ مگر ان دو کتابوں کی صداقت، ان کی قدرتی بے لاگ مزاجی کیفیت، ان کی گہری، غیر محسوس اچھائی، سانجھی ہیں (اور مجھے جس طرح کچھ کچھ شک

ہے کہ MEN AT ARMS کا "پیٹر کروشنک" خود ایولین واہ ہے۔ اسی طرح یہ ناول بھی تھرڈ پرسن میں ایک میمائر ہے)

مصنف ۱۹۴۰ء میں فوج میں بھرتی ہوا۔ بقول اس کے اسے نہ تو ہٹلر کی دل آزاری مقصود تھی، نہ انگریز کی دلجوئی۔ دونوں سے اس کے مراسم دوستانہ تھے۔ صرف لفٹین بننے کا شوق تھا۔ ایک ہلکے پھلکے مفرح انٹرویو کے بعد وہ کمیشن کے لیے منتخب ہوا اور ۸ / اگست کو اسے اوئی۔ ایس مہو میں ٹریننگ کے لیے حاضری کا تار ملا۔ لفٹینی کی شان کو ذہن میں لیے جب وہ فسٹ کلاس کے ڈبے سے مہو کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو ایک کھردرے تین پٹیوں والے گورے سارجنٹ نے اسے اور چند دوسرے ہم جنس حضرات کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور "ایک دو تین بولو" کا حکم دیا نوجوان محمد خاں اور اس کے ساتھیوں کو اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ انہیں کچھ اس قسم کا خیال تھا کہ فوجی بینڈ سے ان کا استقبال ہوگا۔ نو مہینے کی سخت ٹریننگ کے بعد ایک دن لفٹینی کا حکم آہی گیا اور کندھے پر پھول جگمگانے لگے۔ اس کی پوسٹنگ پشاور ڈسٹرکٹ سگنلز میں ہوئی جہاں پہلے ہی روز ریڈیو پر اردو گانے سننے اور ایڈجوٹنٹ سے ایک قدرے معصوم سوال کرنے پر وہاں کے "بلمپ" اس سے کشیدہ خاطر ہوگئے۔ ان بلمپوں نے دس پندرہ دن کے بعد ہی اسے بنوں کی طرف فقیر ایپی کے خلاف لڑنے کے لیے چلتا کیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ لفٹینٹ مام کے بغیر جو فقیر ایپی کی سرکوبی کرنے والے ٹوچی کالم میں تھا۔ ان "بلمپوں" کی برج کی چوکڑی پوری نہ ہوتی تھی اور وہ مام کو کسی طرح واپس بلانا چاہتے تھے۔ اپنے بیرے شیر باز کے ساتھ وہ "میران شاہ" پہنچا تو لال اور لمبی مونچھوں والا مام پہلے ہی اس کا منتظر تھا۔ مام اسے دیکھتے ہی بولا۔ "قصور تمہارا ہے تمہیں برج آنی چاہیئے تھی۔" مام برج کی چوکڑی پوری کرنے پشاور چل دیا اور محمد خاں بریگیڈ کے ہمراہ فقیر ایپی کا قرب حاصل کرنے کے لئے دتاخیل روانہ ہوگیا۔ کچھ دن کی سرحدی قبائلی جنگ کے بعد اسے وائرلیس پیغام پہنچا کہ "پشاور پہنچو۔ تمہاری جگہ مام آرہا ہے" جب وہ پشاور پہنچا تو بلمپوں نے اسے سمندر پار جانے کا حکم سنایا۔ اس کے دوست جان مائٹ نے اسے کہا "یہ ان سارجنٹوں کی سازش ہے، سمندر پار دراصل مام کو جانا چاہیئے تھا۔ وزیرستان کی لڑائی اب ختم ہونے والی ہے۔ دو دن کے لیے مام کو وہاں بھیج دیا ہے۔ وہ کل پرسوں آجائے گا اور یہ مزے سے برج کھیلیں گے۔"

محمد خاں پشاور سے بمبئی پہنچا جہاں وہ کچھ دن ٹرانزٹ کیمپ میں رکھے جانے کے بعد ایک جہاز میں سوار کر دیا گیا۔ جہاز کی منزل مقصود "ٹاپ سیکرٹ" تھی لیکن ہر ایک کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ بصرہ جا رہے ہیں۔ ایک صبح وہ جاگا تو جہاز بصرہ کی بندرگاہ میں لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ بصرے نے نوجوان لفٹینٹ کو کافی مایوس کیا۔ الف لیلہ کی رومان انگیز سرزمین میں اس کی نظر ایک نوٹس بورڈ پر پڑی "سامان پر نگاہ رکھیں اور چوروں سے خبردار رہیں۔" ••••مگر یہ ایک

لمبی داستان ہے ۔ بصرے سے شائبر کیمپ اور پھر حبانیہ کیمپ ، وہاں سے صحرائے کیاوہ ۔ ہمارا نیم لفٹین کچھ دن بغداد کی رنگینیوں سے بھی بہرہ ور ہوا ۔ موصل سے اس کا بریگیڈ طبرق کی سمت روانہ ہوا ۔ جہاں جنزل رومیل ان کی مزاج پرسی کے لیے انتظار کر رہا تھا ۔۔۔۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ۔ یہ ایک جنگ کی کتاب (وار بک) نہیں ہے ۔ یہ نیم لفٹین محمد خاں کی اپنی پر کشش داستان ہے اور توپوں کی باڑ اور ٹینکوں کی گرج میں بھی اس کی باچھیں کھلی رہتی ہیں ۔ میری نظر سے کبھی کوئی ایسی " وار بک " نہیں گذری جس میں اتنے ناقابل فراموش HUMAN واقعاتی ٹکڑے ہوں اور اتنا خوش طبعانہ مزاج ۔ یہ ٹکڑے اس کتاب میں جابجا بکھرے پڑے ہیں ۔ کیڈٹ ارجن سنگھ اور اس کا کرنل شراب میں دھت اور ایک دوسرے کے گلے میں باہیں حمائل کیے ناچتے ہوئے ۔ کپتان راجندر سنگھ بتالیہ کبھی اپنی آرمرڈ کار اور کبھی ٹینک میں شائبہ کیمپ سے بصرے کیبرے دیکھنے کے لیے جاتا ہوا ۔ اس نے فرد جرم لگنے پر اپنی صفائی میں کورٹ کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ ٹریننگ پر جارہا تھا اور کیبرے پر غلطی سے جاپہنچا کیونکہ اس کے قطب نما میں خرابی تھی ، سکھ سپاہی رم لنڈھانے کے بعد ڈھولک اور چمٹے کی تال پر " تیری لونگ داپیا لشکارا تے بالیاں نے ہل ڈک لئے " گاتے ہوئے صولوم کی طرح پسپائی کے دوران ، چندمن چلے پنجابی مزے سے چائے کی کیتلی رکھے ماہیا الاپتے ہوئے جیسے کوئی جنگ نہ ہو اور وہ اپنے " گراں " کی چوپال میں بیٹھے ہوں ۔ ایسی FUNNY اور ہیومن اور پرسوز کہانیاں اس کتاب میں بہت سی ہیں ۔ آدمی کس کا ذکر کرے اور کس کو چھوڑے ۔

" بجنگ آمد " ایک سرخ اور نیلے دیدہ زیب گرد پوش میں آئی ہے اور ایک الٹی رکھی ہوئی آہنی فوجی ٹوپی کی تصویر کے ساتھ جس میں سے سپاہی کی محبوبہ کی تصویر جھانک رہی ہے ۔ یہ ونڈاہک پر نہایت خوبصورت چھپی ہے ۔ یہ جنگ کی کہانی ہے مگر زندگی کی باتیں کرتی ہے ۔۔۔

اور اب " لفٹین محمد خاں ! " تمہاری اگلی داستان ہمیں کب پہنچے گی ؟ خدا کے لئے لکھتے رہو لکھتے رہو ۔ ہماری بھوک کبھی نہیں مٹے گی ۔

پیروڈی

محمد خالد اختر

گھپلا

(ایک ادبی رسالے کا اداریہ)

غریب اردو ادب کے ساتھ کیا کیا گھپلے نہیں ہوئے۔ ہمارے افسانے کا جنازہ تو اُسی دن اٹھ گیا تھا جب منشی پریم چند کی پہلی جدید کہانی شائع ہوئی تھی۔ ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ منشی جی آپ کا نزلہ ہماری داستانوں پر کیوں گرنے لگا ہے آخر میر امّن دہلوی اور رجب علی بیگ سرور کے سروں میں چپکلیوں نے انڈے تو نہیں دیئے تھے کہ ان لوگوں نے اس ملک کی پچھلی پوری تہذیب کی کوکھ میں سے داستان طرازی کی اختراع کی اور ادب کے ایوان میں ان تصویروں کو سلیقے سے سجایا۔ یہ حقیقت ہے کہ منشی پریم چند نے ایسے جدید افسانے لکھ کر جو ہماری تہذیب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں تھے بلکہ باہر سے مستعار تھے، ہماری داستانوں پر کاری وار کیا۔ بات یہیں تک رہتی تو بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی تھی اور ہماری داستانیں کالے پانی جانے سے محفوظ رہ سکتی تھیں۔ مگر منشی پریم چند کے بعد جدیدیت کی کچھ ایسی رو چلی کہ پانی سر سے گزر گیا۔ اس دور میں مجھ جیسے بگڑے دلوں نے داستانوں کی روایت کو پھر سے زندہ کرنے کی ٹھانی مگر یار لوگوں نے اُلٹی میری ٹانگ لی۔ اس بات کو کسی نے نہ سوچا کہ ای۔ ایم فورسٹر، موپاساں اور چیخوف وغیرہ نے ہمارے تہذیبی ورثے میں جنم نہیں لیا تھا۔ ان مغربی مصنّفوں نے کنکوے نہیں اُڑائے تھے وہ گلیوں میں گلّی ڈنڈا نہیں کھیلے تھے۔ اور تو اور انھیں تو کوٹھے پر جا کر طوائف کا گانا سننے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ جو تہذیبی سانچے ان لوگوں نے بنائے وہ ہمارے تہذیبی سانچے نہیں ہیں۔ یہ مانگے کے سانچے ہیں۔ اور مانگے کے سانچوں میں بڑا ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وسوسہ مجھے دن رات کھائے پیے جاتا ہے اور ٹی ہاؤس کے روزانہ پچیس تیس چائے کے پیالے بھی میرے اس دُکھ کا مداوا نہیں بن سکتے۔

بے چارے پریم چند نے تو خیر پھر بھی داستانوں کے اسلوب اور ہیئت کو ایک حد تک قائم رکھا اور اپنے عہد کے مسائل سے روگردانی نہ کی، اُن کا تو فقط اتنا سا قصور تھا کہ انھوں نے مغربی افسانے سے بلاوجہ متاثر ہو کر کہانی کو نئے اسلوب اور نئی ہیئت میں ڈھالنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ قیامت تو اُن کے بعد آنے والے لوگوں نے توڑی۔ وہ تو گویا کلہاڑا لے کر داستانوں پر پل پڑے اور ان کی وہ دُرگت بنائی کہ اب کوئی پڑھے لکھے لوگوں میں قصۂ حاتم طائی یا طوطا مینا

کا ذکر تو کر کے دیکھ لے، لوگ اسے چڑیا گھر پہنچانے کی دھمکی دے ڈالیں گے۔

ویسے یورپ میں بھی بڑا ادب ایک مدّت سے تخلیق نہیں ہو رہا۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا بلکہ اس کے کہنے والے ٹی۔ ایس ایلیٹ ہیں۔ مجھے تو اپنے دھندوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ایلیٹ صاحب کو پڑھوں، البتہ میرے ایک دو کرم فرما ایسے ہیں جو اپنی ساری گفتگو ٹی۔ ایس ایلیٹ کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ایلیٹ کو بھی چھوڑیئے۔ ایک طرف، یہ میں بطور شیخی نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں نے تو یورپ کے مصنفین میں سے ایک آدھ ہی کو بمشکل پڑھا ہوگا۔ پڑھتا رہتا تو کبھی کا انٹلیکچول ہو چکا ہوتا اور میرا بھی وہی حشر ہوتا جو مجھ سے پہلے بیشتر بزرگ ادیبوں کا ہو چکا ہے کہ اُن کو پڑھ کر یوں گمان ہوتا ہے جیسے ڈی۔ ایچ لارنس اور ژاں پال سارترے اردو میں بے پرکی ہانک رہے ہیں۔

یہ ثقہ ادیب جنھوں نے فورسٹر کے کمبل اوڑھ رکھے ہیں کبھی کوئی تخلیقی چیز تخلیق نہیں کر سکے۔ ایلیٹ نے جب انگریزی ادب کے افلاس کا اعلان کیا تھا تو کسی نے اسے نہیں ٹوکا تھا۔ لیکن ہمارے ہاں اردو ادب کے بارے میں اس سے ملتی جلتی بات کہہ بیٹھئے تو سب ہاتھ منہ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ سچ یہ ہے کہ اگر آج کے اردو ادب کے سر میں سُرخاب کا کوئی پر لگا ہے تو وہ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ جو ادب ہماری تہذیبی روایت کے سانچے سے ہٹ کر ڈھالا گیا ہے وہ کارنس پر سجانے کے لائق ہے۔ میر امّن دہلوی کی داستانوں کے بعد سے ہمارے ادب میں کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ نہیں ہوا نہ ہی کام کی کوئی چیز ظہور میں آئی۔ مجھ پر کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے اس خلا کو پُر کرنے کا دورہ پڑتا ہے۔ اور میں نے نانی آماؤں کے خاص اسلوب اور ٹھیٹھ محاوروں میں کئی داستانیں لکھی بھی ہیں جن پر یار لوگ مختصر افسانے کا الزام دھرنے سے نہیں چوکتے۔ لیکن گھپلا یہ ہو گیا ہے کہ ہمارے نوجوان اب اپنی تہذیب اور معاشرت سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ اب کئی برس سے شہروں کی گلیوں میں لڑکے گلی ڈنڈے کی بجائے کرکٹ کھیلتے ہیں۔ جس محلّے میں مَیں رہتا ہوں اس میں صرف ایک مکان کی چھت پر کبوتروں کا کابک میں نے مشاہدہ کیا ہے۔ اور اتنے بڑے شہر میں کابک والی یہ چھت مجھے ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے نئے پُرانے اُجاڑ صورت افسانہ نگاروں کے درمیان میں ہمارا میر امّن دہلوی کھڑا ہے۔ پھر جو نوجوان ہفتے میں ایک آدھ بار اپنے کبوتروں کو اُڑانے آتا ہے اس نے ٹیڈی لباس پہن رکھا ہوتا ہے۔ غرض اس شہر میں ہمارے نوجوان اپنے تہذیبی ورثے کو پسِ پشت ڈالے، ٹیڈی بنے سڑکوں پر پھرتے ہیں۔ شربتِ بادام کی جگہ کوکاکولا نوش کرتے ہیں اور کم بخت "بیٹنبر" کی سی سستی امریکی فلموں پر مچلے جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں بڑا تخلیقی ادب پیدا ہو تو کیوں کر؟ ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ جوں توں کر کے ماضی کی روایات کو دوبارہ زندہ کیا جائے، نئی نسل کو کبوتر بازی کے روحانی اور جسمانی فیوض و برکات سے روشناس کرایا جائے، کرکٹ کلبوں کی بجائے جگہ جگہ گلی ڈنڈا سبھائیں قائم کی جائیں اور نانی آماؤں سے کہا جائے کہ وہ تھوڑا سا وقت نوجوان ادیبوں کو بھی دیا کریں کہ بڑا تخلیقی ادب پیدا ہو۔

ہماری حکومت تو خود اپنی قومی تہذیب کے پیچھے لٹھ لے کر پڑی ہوئی ہے ۔ آئے دن کبھی آتش بازی پر پابندی لگتی ہے ، کبھی گلی ڈنڈے پر ۔ لے دے کے ایک کبوتر بازی رہ گئی ہے سو وہ بے چاری پہلے سے بدنام ہے ۔ یہ سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ مغرب زدہ والدین اپنے لڑکوں کو کبوتر اڑانے پر سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں ۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو یہ سمجھ تو ہے کہ پتلون کے پائنچے کی موری کتنے انچ ہونی چاہیئے یا فلم بجارن میں نیلو نے کون کون سے گانے گائے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کرتے کبوتر اور رنگ کبوتر کی پہچان کیا ہے اور کبوتروں کو اڑانے کے لئے کیا کیا ساز و سامان درکار ہوتا ہے ۔ ہماری تہذیبی روایات کا بیڑا یوں غرق ہو رہا ہے ۔

آتش بازی پر پابندی کی وجہ بڑی دلچسپ ہے ۔ ہوا یہ کہ اس سال آتش بازی کی قومی تقریب میں آدھ درجن بچے آتش بازی کھیلتے ہوئے جھلس گئے یا پھر آتش بازی کے سامان کی دو تین دوکانیں بھک سے اڑ گئیں اور آس پاس کی دو کانوں کو بھی آگ کی نذر کر گئیں ۔ بس صاحب اتنی سی بات پر آتش بازی پر پابندی عائد ہو گئی ۔ میرا دل پوچھنے کو چاہتا ہے کہ اچھا صاحب ! آپ نے ایک قومی تقریب پر جو ہمارے جذبے اور تخلیقی قوت کے شدید اظہار کا وسیلہ تھی پابندی لگا دی مگر گلی ڈنڈے بے چارے نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے اس کو بھی دیس نکالا دے دیا ۔ ٹریفک کے بہاؤ میں دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار پانچ بچوں کا کچلا جانا یا کارپوریشن کے کسی ایک آدھ معزز رکن کی ایک آدھ آنکھ کا پھوٹ جانا کوئی ایسی وجہ نہیں کہ اس کھیل کو جو صدیوں سے ہمارے خون میں رچا ہوا ہے اور جس کا بالواسطہ تعلق ہماری تخلیقی قوت کے اظہار سے ہے ، اس بے پروائی کے ساتھ سولی پر چڑھا دیا جائے ۔ کھلا یہ ہے کہ ان تہذیبی علامتوں پر پابندی کا اثر ہمارے پرانے نئے اور آنے والے ادب پر پڑ رہا ہے اور پڑے گا ۔ جن تہذیبی سانچوں میں ہمارے احساسات نے جنم لیا ہے ، جب وہی نہ رہے تو ہمارا اپنا وجود مشتبہ ہونا لازمی ہے اور جب ہم خود وہ نہیں رہیں گے جو ہمیں ہونا چاہیئے تو ہمارا ادب بھی ڈھول کی طرح بجے گا تو خوب ، مگر اندر سے کھوکھلا ہو گا ۔ مجھے تو حیرت ہے کہ حکومت والوں کو داستانوں پر پابندی لگانے کی کیوں نہ سوجھی ! سارا قصہ ہی پاک ہو جاتا اور ہم سب مزے سے اپنی تہذیب سے لاتعلق ہو کر ڈنڈے بجاتے اور برلب سڑک گول گپے اور چاٹ کھاتے ۔

یہ گول گپوں اور چاٹ کا ذکر میں نے از راہِ احتیاط کیا ہے کیونکہ ہماری مہربان حکومت کے کسی بڑے صاحب بہادر سے یہ خدشہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری ان تہذیبی علامتوں کی بندش کا حکم صادر فرما دے ۔ میں یہ محض فقرے بازی نہیں کر رہا ہوں ۔ حقیقت میں ادب کا مسئلہ اور گول گپوں کا مسئلہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں ۔ گول گپوں کا مسئلہ روز بروز بڑھتا ہوتا جا رہا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ چند ہفتوں کے اندر ان ثقہ لوگوں کی گونجدار آواز میں جو ریڈیو پاکستان سے روز ازل سے خبریں نشر کر رہے ہیں ، یہ اعلان آپ کے کانوں میں آئے کہ حکومت گول گپوں کو بھی گول کر گئی اور اس تہذیبی علامت پر

بھی پابندی عائد ہو گئی۔ حکومت سے یہ کون پوچھے کہ گول گپّے کھائے بغیر تخلیقی اظہار پوری ذات کا اظہار کیسے بنے گا؟ اور ہمارے ملک میں بڑے بڑے شاعر، بڑے بڑے سائنس داں، بڑے پہلوان اور بڑے گنگے باز کیسے پیدا ہوں گے؟ واضح رہے کہ ہابیل قابیل کے زمانے سے گول گپّے کھائے جا رہے ہیں اور میری ذاتی معلومات کے مطابق جو مجھے اپنے سفید کلغی والے ملنگ کبوتر سے حاصل ہوئی ہیں، افلاطون خود گول گپّے کھانے اور کھلانے کا شائق تھا۔ اور ہمارے عسکری صاحب کے لارنس صاحب نے اتنے سارے ناول جو لکھ مارے ہیں تو وہ محض اس لئے کہ انھوں نے افلاطون کو بغور پڑھا ہے۔ میرا کبوتر کبھی غلط معلومات نہیں دیتا۔ کبوتر کو تو چھوڑ یئے۔ وہ تو ایک پارسا فقیر، صوفی مشرب پڑھا لکھا پرندہ ہے۔ میں نے تو کوّے کو بھی کبھی جھوٹ بولتے نہیں سنا۔

ویسے میں شرم سے اقبال کرتا ہوں کہ میرے گھر میں بھی ایک ریڈیو سیٹ ہے جس پر میں کبھی کبھار خبریں سن لیتا ہوں حالانکہ کوّے کی موجودگی میں مجھے فی الحقیقت نہ ریڈیو کی ضرورت ہے نہ اخبارات کی۔ ہر روز صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی کوّا مجھے دنیا کی تازہ ترین خبروں کا خلاصہ سنا دیتا ہے جس طرح بزرگوں کو انقلابِ روس کی خبر اور ان کے بزرگوں کو انقلابِ فرانس کی خبر اُن کے اپنے اپنے دور کے کوّوں نے سنائی تھی اسی طرح انقلابِ پاکستان، انقلابِ مصر، انقلابِ عراق اور انقلابِ یمن کی خبریں مجھے مختلف اوقات میں اُن مختلف کوّوں نے سنائیں جنھیں میرے گھر کا پتہ معلوم تھا۔ اس قسم کے سیاسی انقلابوں اور خلائی پروازوں وغیرہ کی خبریں تو ہرا یرے غیرے کوّے تک سات سمندر پار سے فوراً پہنچ جاتی ہیں۔ مگر چند کوّے ایسے بھی ہیں جو آئندہ ہونے والے واقعات کی بھی پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ ثبوت اس امر کا یہ ہے کہ جب کبھی میرے ہاں خلافِ معمول کوئی مہمان آنے والا ہو تو دوپہر کو ایک خاص کوّا، کہ اب میں اس کی شکل و صورت پہچاننے لگا ہوں، میرے مکان کی منڈیر پر بڑے ثقہ انداز میں دیر تک کائیں کائیں کرتا ہے۔ میں کوّے کی بولی بخوبی سمجھتا ہوں، یہ دوسری بات ہے کہ میں اس بولی میں کلام کرنا پسند نہیں کرتا کہ میرے تلفّظ اور لہجے پر غلط اثر نہ پڑے۔

واضح ہو کہ پرندوں کی بولی پر قدرت حاصل کرنے میں میری قابلیت سے زیادہ محلّے ٹولے کی نانی اماؤں کی اپج کا دخل ہے۔ خدا ان سب کی مغفرت کرے۔ وہ کوّوں سے لے کر میناؤں اور رلو طوطوں تک کی بولی سمجھتی تھیں اور گھنٹوں اُن سے تبادلۂ خیالات کرتی رہتی تھیں۔ میں صرف کوّے کی بولی ہی اُن سے سیکھ سکا کیونکہ سچّے اور سیانے کوّے سے بڑھ کر میرے نزدیک ہماری تہذیب کو انسانی آگہی سے روشناس کرانے والا اور کوئی نہیں۔ نہ ہی خبروں کی معتبر ترتیب و ترسیل کے سلسلے میں کوئی خبر رساں ایجنسی کوّے کے مقابلے میں دم بھر کے لئے ٹھہر سکتی ہے۔ آپ ہی بتایئے آنے مہمان کی خبر ہماری آگہی کے لئے زیادہ اہم ہے یا یہ کہ آٹھ سو طلبا پرچہ سخت ہونے کی وجہ سے امتحان کے کمرے سے واک آؤٹ کر گئے ہمارے لکھنے والوں کو یہ تو پتہ رہتا ہے کہ فورسٹر نے پچھلی جمعرات کو مٹن سینڈوچ کے ساتھ آلو کا بھرتا تناول کیا تھا

مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فیروز پور روڈ پر ایک نہ دو اکٹھے پانچ اہل ذوق مہمان، لاہور اومنی بس سروس کی مدد سے ان کے غریب خانے میں قدم رنجہ فرمانے یلغار کرتے آ رہے ہیں۔ کوّے نے کبھی گپ نہیں کیا۔ کوا کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کم سے کم مجھے تو کوّے نے ہمیشہ بروقت مطلع کر دیا ہے کہ ٹی ہاؤس چلو۔ وہاں اس وقت بحث کی گنجائش پیدا ہو رہی ہے۔ سو میں ٹی ہاؤس پہنچا، محفل جمی تھی میں نے ذرا سی برف لگا دی کہ تھوڑی اور جم جائے۔ ایلیٹ صاحب سے لے کر عسکری صاحب تک کی پگڑی اچھالی گئی۔ سارے افسانوی ادب اور اس عہد کے تخلیقی ادب کے مسائل پر بحثیں ہوئیں۔ چائے کے پیالے پر پیالے پلوائے گئے۔ دراصل ارسطو سے لے کر میر امّن دہلوی کے زمانے تک ان قہوہ گھروں اور چائے خانوں نے تخلیقی ایکا اور صحیح اور صالح عرفان پیدا کرنے میں اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ سنا گیا ہے کہ ایک مشہور ثقہ انگریزی ادیب روزانہ چالیس پیالے چائے کے پیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے دام اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔

کہنا یہ ہے کہ اردو نثر پر بربادی اور تباہی کی گھٹائیں گھر آئی ہیں۔ یہ ابتری اس لئے آئی کہ اس زمانے میں جی رہے ہیں جب ہمارا تخلیقی شعور ابتذال کی طرف مائل ہے۔ اس ملک میں ہمارے لکھنے والوں نے اپنی عظیم تہذیبی علامتوں، کوّے کبوتر اور کنکوّے سے رابطہ توڑ لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا ادب اپنے معاشرے کے مسلسل تخلیقی عمل سے کٹ کر رہ گیا۔ جس شخص نے چڑیا کے گھونسلے سے انڈے نہیں چرائے وہ بڑا ادب بھلا کیسے تخلیق کرے گا؟ لاہور کی سڑکوں پر ٹیڈی لڑکے تو بہت سے پیدا ہو گئے مگر کوئی بڑا عاشق ظہور نہ کر سکا۔ ایک آدھ بڑا عاشق جس کا ظہور اس عہد سے چند سال پہلے کے عہد میں ہوا، مال روڈ کے کسی نہ کسی ہوٹل میں بیٹھا ضرور مل جائے گا۔ مگر اب اسے پہچاننا مشکل ہے کہ کثرتِ چائے نوشی نے عشق کی سکت اس کے بازوؤں میں سے چوس لی ہے۔ کھیلا ذرا زیادہ طول پکڑ گیا ہے۔ یہ طوالت اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ اہلِ بصیرت صورتِ حال کی نزاکت اور نخرے سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں اور میر امّن دہلوی کی داستان طرازی کی اہمیت اور عظمت کو مناسب مقام پر رکھ کر پرکھا جا سکے۔ میر امّن دہلوی اردو کے پہلے اور آخری افسانہ نگار تھے۔ یہ میں فقرہ بازی نہیں کر رہا ہوں، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

"الپ ارسلان" کا مضمون "میر امّن اور جیمز جوائس" اس اشاعت میں شامل کیا جا رہا ہے۔

ہمارے ادب کا سرچشمہ ہماری دادیاں اور نانیاں تھیں۔ ان کے اٹھ جانے سے اور کوکا کولا اور ٹیڈی تہذیب کا دور دورہ ہونے سے ہماری کئی پشتوں سے آئی ہوئی سپلائی لائن میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ ان شگافوں کو بھرنے اور صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے جن حضرات کو دعوت دی گئی ہے۔ ان کے تاثرات ایک دلچسپ مذاکرے کی صورت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ پروفیسر کاؤس جو ٹائپ اینڈ شارٹ ہینڈ نائٹ کالج مجیس پورہ کے

پرنسپل ہیں۔ ڈاکٹر حیدر خوشنویس جو ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہیں اور خوشنویس تخلص کرتے ہیں۔ مولانا ابن الافسر تابوتی جو کرشن نگر میں کچھ کرتے ہیں۔ مشتری نجومی جنھوں نے منشی پریم چند کے خلاف بہت سے افسانے لکھے اس بحث میں شریک نہیں ہوسکے کیونکہ ان دنوں وہ میر امتن دہلوی کی تحریروں میں سے آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافت کا سراغ لگانے میں مصروف ہیں۔

معیاری افسانوں کی ذیل میں اس بار خود اپنا افسانہ "کالی بھیڑ" شریک اشاعت ہے۔ اگرچہ اس رسالہ میں معیاری افسانے چھاپنا ہمارے مسلک کے خلاف ہے مگر چند دوستوں کے اس اصرار پر ایسا کرنا پڑ رہا ہے کہ پانچ چھ غیر معیاری الا بلا افسانوں کے ساتھ اگر ایک آدھ معیاری افسانہ بھی آجائے تو کسی گھپلے کا احتمال نہیں ہے۔ امید ہے کہ اس افسانے کی اشاعت سے رسالے کے غیر معیاری پن پر کوئی ضرب نہیں پڑے گی۔

محمد خالد اختر

عودِ پاک

مختار مسعود کے نام

جناب عالی!

آداب بجا لاتا ہوں۔ آپ کی تصنیف کا رسالہ "آواز دوست" نظر افروز ہوا سبحان اللہ انشا پرداز و زبان کو لباس مکلف اور زیور سخن سے آراستہ کر کے رد کش ماہ تمام بنایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تم کو سخن طرازی میں ید طولیٰ حاصل ہے اور الفاظ کے طوطا مینا اس صناعی سے تراشے ہیں کہ دل الجھنے لگتا ہے۔ ہزار کوشش سے شاہد معنیٰ ہاتھ نہیں آتا اور یہی وجہ ہے دیدہ وروں کی نظر میں اس نگارش کے آناً فاناً کارنامۂ اردو کا درجہ حاصل کرنے کی۔ صاحب! تم نے نثر گلفشاں میں وہ رنگ دکھایا کہ ابوالکلام آزاد نے خلد میں پانی بھرا اور نیاز فتحپوری نے سر پر دھول ڈالی۔ یہ رسالہ فن تاریخ نویسی و سوانح نگاری کا اعجاز ہے اور اس فن کا اس سلطنتِ پاکستان میں آج تمہارا مثیل نہیں جیتے رہو۔ تمہارا اور تمہارے مداحوں کا دم غنیمت ہے۔ سنتے ہیں اس رسالہ کے نقش اول کے انطباع کے دو ماہ بعد سب نسخے ختم ہو گئے اور نقشِ ثانیہ کی نوبت آئی۔ خدا کرے اس رسالے کے پے بہ پے نقوش صفحہ دہر پر ثبت ہوں اور اس کے ساتھ تمہارا نام چہار دانگ عالم میں پھیلے۔ کیوں کر نہ کہوں فقیر کو اس مقبولیت پر رشک نہیں آیا کہ فقیر کا ایک رسالہ موسوم بہ "کھویا ہوا افق" پانچ سال ہوئے کسی نہ کسی طور سے چھپ کر بازار میں آیا تھا، وہ اب تک مہتمم مطبع کے گودام میں پڑا سڑتا ہے۔ میرا کیا منہ کہ پوچھوں کہ رمز، اردو کتابوں کو سپید چکنے کاغذ پر طبع کرانے اور ہاتھوں ہاتھ بکوانے کی کیا ہے۔ یہ رمز کس ولی باکرامت نے تم کو سجھائی۔ باور کرتا ہوں کہ جو مصنف بلند منصب ہوگا اس کی نگارش بھی بلند ہوگی، اخوان باصفا بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفوں کے پل باندھیں گے، صف آرا ہو کر مجرے عرض کریں گے، جو کچھ حضرت کے اس صحیفۂ دانش و آگہی کے بارے میں البعض اشخاص نے لکھا ہے اسے پڑھتا ہوں اور اپنا سر پیٹتا ہوں۔ خلل دماغ کی کئی صورتیں ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اس عمر میں میرے حواس بجا ہیں۔ البتہ تمہارے ثنا خواں اگر فی الواقع صادق الوود ہو شمند ہیں اور ان کے دعوے سچے ہیں

تو اس سال کے ادب کے نوبل پرائز کا تمغہ تم کو ملنا چاہیئے تھا لیکن وہ ایک صاحب آسٹریلیا کے پیٹرک وہائٹ لے اُڑے وہ سعادت حسن منٹو کی طرح جھوٹی سچی داستان طرازی کرتے ہیں یعنی فضول بیکار کی قصہ گوئی جس سے کچھ حاصل نہیں۔ وہ فن تاریخ نگاری اور مردم پرستی سے بیگانہ محض ہیں۔ اس دنیائے دوں کی پرفریب نظارگی سے بے بادہ مست جھومتے ہیں۔ ہر آدمی کو والہانہ محبت سے گلے لگاتے ہیں اور قوم وملت، کالے گورے، ہندو عیسائی میں تمیز نہیں کرتے۔ ان بے چاروں کو تاریخ امم سے کیا علاقہ، ضوابط اخلاق کی تعلیم سے کیا تعلق۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ادب کا نوبل پرائز ملا تو ایک افرنگی اہل نصاریٰ کے یا وہ گو شخص کو جو فسانہ فسوں کہتے ہیں اپنا اور دوسروں کا ضیاع اوقات کرتا ہے۔ خیال باندھتا ہوں کہ سعادت حسن منٹو شراب کی بوتل چولے کی جیب میں ڈالے، سر پر تولیہ لئے، تم کو ٹھنڈی سڑک پر ملا۔ تم اپنی پتلون کوٹ، اینٹھے کالر میں اور اکڑے۔ ایک نگاہ تمسخر انگیز، تحقیر آمیز اس شرابی کبابی پر ڈالی اور اپنا منہ پھیر لیا۔ بالعد اس کے عدالت عالیہ کے سامنے ایک نیم تلے رکے، بڑی نفاست سے واسکٹ کی جیب سے اپنی مطلا آٹوگراف بک نکالی، اور پارکر کے قلم رواں سے اس کے ایک ورق پر خود اپنا ایک آٹوگراف لکھا۔ پھر اپنی بلندی ذوق پر مسکراتے چھڑی ملاتے اپنے ڈھنگ سے کسی بڑے آدمی کی پیہم جستجو میں ٹھنڈی سڑک پر رواں دواں ہوئے۔

سنو صاحب! آواز دوست وہ ہوتی ہے جس کو سن کر دل کی دھڑکن تیز ہو۔ کون ومکاں کے بیچ کے پردے اٹھیں، ہمدردی، دردمندی کے احساسات سینے میں جاگیں۔ تمہاری "آواز دوست" میرے دوست کی آواز نہیں۔ میں اس کو نہیں پہچانتا مگر غالباً کان میرے اس سے ناآشنا نہیں کہ یہ اس طور کی ندائے پرفصاحت بہزار آہنگ اکثر اس سلطنت کے ہر منبر ومحراب، دفتر اخبار، جامعہ کے شہ نشیں سے سامع نواز ہوتی ہے۔ فقیر کے کانوں میں ایسی نداؤں سے خراش لاحق ہوتی ہے، دل ملول ہو جاتا ہے۔ تم نے البتہ بات کہنے کا ایک اپنا ڈھنگ ایجاد کیا ہے۔ الفاظ کے روپ کو غازے کی تابانی دے کر شاہد نگارش کو سنہری روپہلی پیرہن پہنایا ہے۔ ہم نشینان محفل کو شاید تمہارا یہ انداز پسند آئے گا اور پسند آیا ہے جو انھوں نے اسے گھوڑے کی باگ کی مانند اٹھایا۔ میرے لئے تمہاری بات میں لطف نہیں، مزہ نہیں۔ جامعہ کی سند کے حصول کی خاطر جیسے مضامین اختراع کئے جاتے ہیں، ویسا ہی تمہارے رسالے کا اولین مضمون "مینار پاکستان" فقیر کو لگا۔ فرق یہ کہ اس میں علم تاریخ کی خودنمائی اور دھوم دھام کی عبادت آرائی بدرجہ کمال ہے جو ہر کتاب کی دسترس میں نہیں۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے فقیر کو اس طور احساس ہوا کہ گویا کوئی ٹک سک سے درست، جامعہ زیب، عالی مقام شخص مینار پاکستان کے اوپر چڑھ کر اپنی رونمائی کرتا ہے، ساتھ یہ خیال میں رکھے ہے کہ کہیں پتلون میں سلوٹ نہ پڑ جائے اور گردن میں بڑی "ٹائی" کی گرہ

کمسک نہ جائے۔ صاحب، کاش تم 'مینارِ پاکستان' پر یہ شاہکار مضمون بے روح لکھنے کی بجائے اس غریب سخت کوش مزدور کی کہانی لکھتے جس نے اپنے کئی سو رفیقوں کی معیت میں اینٹ اور گارے سے اس مینار کو سربلند کیا۔ ہائے گا گارے اور اینٹ کا مینارِ پاکستان خوبصورت مینار نہیں اور آپ کا اس کے باب میں ہندی کی چندی کرنا بالکل عبث اور بے حصول۔ حضرت آپ کی نظر سے پاکستان کے دہ ہزاروں لاکھوں چلتے پھرتے انسانی مینار کیوں اوجھل ہوئے۔ جو اس مملکت کے ہر قریے اور گاؤں میں اپنے عرقِ بدن سے دن کی روٹی کماتے ہیں، صبر و شکر سے معاش کی چکی میں پستے جاتے ہیں۔ کیسی آوازِ دوست مجھ کو سناتے ہو میں اس کو سننے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

دوسرا مضمون بھی اس رسالے کا فنِ تاریخ اور فنِ سوانح اور فنِ خود پرستی کا اعجاز ہے۔ اللہ اللہ کیسے آپ کو یقین دلاؤں کہ اردو کی نثر میں یہ مضمون گراں بہا و لاجواب ہے۔ گو کہ ہر دو مضامین مشہور ایک طرح اور ایک قماش کے ہیں۔ دوسرے میں، کہ کتاب نے اس سے نام پایا۔ آپ نے چشمِ بد دور کشتِ زبان اردو میں وہ چمن آرائی کی ہے کہ باید و شاید۔ اساطیرِ اہلِ یونان کی حیرت افزائیوں کے بارے میں کس تحقیق و کاوش سے لکھا ہے۔ کون ہے جو یہ حصہ پڑھ کر حضرت کے وسیع المطالعہ، معلوماتِ زمانہ کے خزینہ ہونے سے منکر ہوگا۔ بالتخصیص علمِ اساطیر میں اس ملک میں ماسوا عبدالعزیز خالد کے اور کسی کو ہم آپ کا ہم پلہ نہیں گردانتا۔ مگر عبدالعزیز خالد شاعر ہیں اور نثر و شاعری کے روپ اور آہنگ مختلف ہیں۔ ویسے زبان کے انشا پردازوں میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب بھی علمِ اساطیر پر عبور میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا میدان مخصوص چین اور ہند کی سلطنتوں کے اساطیر ہوئے۔ یونان کے اساطیر سے ان کو سروکار نہیں۔ اب یاد نہیں پڑتا کہ اس مضمون موسوم بہ "آوازِ دوست" میں یونانی اساطیر کا نزول کس ضمن میں ہوا۔ کیونکہ فقیر کے گمان کے مطابق بیشتر مضمون آپ کی آٹوگراف کی کتاب کی کارفرمائیوں کا صحیفہ ہے۔ جس طرح افریقہ میں بگ گیم کے شکاری رائفل و بندوق سے ضیغم، پیل، دلر اور نہنگ دریائی کا شکار کرتے ہیں، اس طرح تم اپنی آٹوگراف کی کتاب کے ہتھیار سے عظیم ہستیوں کے جان لیوا ہو۔ آٹوگراف البتہ کسی خوش نصیب کا اس وقت تک نہیں لیتے جب تک تم کو اس کی عظمت کے بارے میں اطمینانِ کامل نہ ہو جائے۔ صاحب۔ اس میدان میں کیا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہو۔ یہ نہیں کہ ایرے غیرے کے سامنے آٹوگراف کی کتاب کھول کر رکھ دی کہ صاحب اس میں دو حروف اپنی منشا کے تحریر کر دو۔ پہلے اس ہستی کی عادات و خصلات، علم و اخلاق، عقاید دینی و سیاسی وغیرہ کے بارے میں بالتفصیل کوائف جمع کرتے ہو اور پھر غالباً اس کو مختلف صفات کے بدرجۂ فضیلت نمبر دے کر اس کے عظیم یا حقیر ہونے کا فیصلہ کرتے ہو۔ ماشاء اللہ آپ کا کسی کی عظمت کا تعین کرنے کا معیار ازبس کڑا ہے۔ غلطی اس

میں ہو نہیں سکتی۔ اہلِ ہنود خواہ قابل اور اچھے ہوں اور اکثر اہلِ نصاریٰ، آپ کو آٹوگراف دینے کی حسرت دل میں لئے اس جہاں سے گذر گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو آپ نے گھاس نہ ڈالی ہر چند کہ ان کی تمنائے دلی آپ کی آٹوگراف بک میں اپنا نام لکھنے کا اعجاز حاصل کرنے کی تھی۔ بی بی سروجنی نائیڈو کو طوعاً و کرہاً آٹوگراف بک اس لئے پیش کی گئی کہ وہ اہلِ اسلام کی طرفداری ہر معاملے میں کرتی تھیں اور حافظِ قرآن تھیں۔ صاحبِ انگلستان عالی شان کے ٹائن بی مصنف تاریخ دنیائے عالم نے آٹوگراف کی کتاب میں اپنے دستخط کرنے کی سعادت پائی۔ آپ اور ان میں تاریخ دانی قدرِ مشترک تھی ان کے خیالات اہلِ اسلام کے بارے میں تعصب سے بالا تھے۔ خوشا نصیب کہ حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح بانیٔ پاکستان بھی آپ کے عظمت کے پیمانے پر پورے اترے۔ انھیں بھی آٹوگراف میں اپنا نام لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ علامہ اقبال بے چارے رہ گئے۔ واحسرتا! وہ آپ کی نظروں کو جچے نہیں۔ فقیر منش، درویش صفت، قلندرانہ وضع کے شاعر تھے۔ میو روڈ پر اپنی شکستہ حویلی کی ایک کوٹھری میں پڑے حقہ پیتے رہتے تھے اور اکثر گھر پر میلی بنیان اور چادر پہنے رہتے۔ یوگوسلاویہ کے صدر الصدور مارشل ٹیٹو سرکاری دورے پر پاکستان آئے اور شہر لاہور میں ایک دن قیام کیا۔ آپ تب حسنِ اتفاق سے لاہور احاطے کے کمشنر صاحب بہادر تھے۔ آپ کے فرائض میں مارشل ٹیٹو صاحب کی مہمان نوازی اور لاہور شہر کے تاریخی مقامات کی سیر کرانا داخل تھا۔ وہ اشتراکی دہریے عقیدے کے، آپ ان سے آٹوگراف بھلا کیوں لینے لگے۔ مارشل ٹیٹو ایک ہی کائیاں آدمی، سرد و گرم چشیدہ وہ آپ کی نیت کو بھانپ گئے اور آپ کی آٹوگراف بک دیکھنے کی درخواست نہ کی۔ جب مارشل ٹیٹو بادشاہی مسجد دیکھنے گئے تو انھوں نے اور ان کی بیگم نے خوش دلی سے جوتے اتار کر موزے چڑھائے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ ان کی نگاہ اٹھی تو مسجد کے تجمل و شکوہ کی نظارگی سے ان پر سکتہ طاری ہو گیا جب قدرے ہوش میں آئے تو آپ کو ساتھ لیکر موزہ چڑھے پاؤں میں ایک گھنٹہ گھومتے رہے۔ ان کی یہ ادا، اہلِ اسلام کے شعائر سے دلچسپی، آپ کو بھائی۔ وہ عظیم ہستیوں کے زمرے میں آگئے۔ آپ نے آخر ان کو اپنی آٹوگراف بک پیش کر ہی دی۔ اور وہ مارشل ٹیٹو کے دستخطوں سے اب تک گہربار ہے جن اشخاص کو اس میں شک ہو وہ آپ کی آٹوگراف بک کے ایک ورق پر اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اور ہاں صاحب! حسرت موہانی کے سامنے آٹوگراف بک کیوں کر رکھدی؟ کیوں کر آٹوگراف ان سے لینے پر خود کو آمادہ کیا؟ ان کی ناموری، سیاست ہندوستان میں اہمیت، شعائرِ اسلام کی پابندی سب تسلیم۔ لیکن مولانا عمر کا بیشتر حصہ کھرے کانگرسی رہے۔ اہلِ ہنود کے معتبرین سے ان کا یارانہ تھا۔ پھر لباس کی طرف سے بے پروا تھے۔ سوٹ اور ٹائی کبھی نہ پہنا۔ بکس کی بجائے پرانے ٹین کے کنستر میں کپڑے اور سامان رکھ کر اور ہاتھ میں لوٹا لے کر ریل کا سفر کرتے۔ ریل میں تھرڈ کلاس کے ڈبے کو دوسرے ڈبوں پر فوقیت دیتے۔ وہ عظیم آپ کی نگاہِ

ژرف نگاہ میں کس رو سے ہو گئے ؟ صاحب! وہ ورق پھاڑ نہیں سکتے ؟

جستہ جستہ یہ مضمون دیکھنے سے مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ آج کل آپ اپنی آٹو گراف بک ٹھپ کر رکھی ہے۔ اس واسطے کہ چار سوئے عالم میں آپ کو کوئی عظیم آدمی نظر نہیں پڑتا جو آٹو گراف دینے کا استحقاق رکھتا ہو۔ فقیر کو آپ کے اس فیصلے سے سخت حیرت ہوئی۔ یہ کیسے تم سمجھتے ہو کہ عظیم آدمی سب مر گئے۔ فقیر تا حال جیتا ہے۔ ایک عرصہ سے ملتان میں محلہ شمس آباد میں قیام پذیر ہے۔ حال ہی میں ایک دوست کی عنایت سے قیمتی لارنس پور کی ٹویڈ اور گرے غلالین کا جوڑا خرید کر ایک درزی کو دیا ہے، وہ چند دنوں تک سل جائے گا۔ دیکھو! آٹو گراف بک کو ہوا دو، اور جب دل چاہے آکر آٹو گراف لے جاؤ۔ میں بالعموم گھر پر ہی موجود ہوتا ہوں۔ کہیں آتا جاتا نہیں۔ لیکن تم کو جلدی کرنا پڑے گی۔ خدا جانے کب بارگاہِ ایزدی سے حکم رہائی آجائے اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ۔ چار پانچ اور عظیم اشخاص بھی فقیر کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ وہ بھی آٹو گراف دینے میں تامل نہیں کریں گے۔ دو ان میں سے صرف اپنے انگوٹھوں کے نشان لگائیں گے۔ میں نے ان کو کہلا بھیجا ہے کہ چند دن ملتان سے باہر نہ جائیں۔ خدا جانے تم کب آٹو گراف لینے وارد ہو جاؤ۔

واہ! واہ! ہمارے حضرت مختار مسعود صاحب دام اقبالہٗ نے عظمتِ انسان کو پرکھنے کی خاطر کیسی کسوٹی بنائی! اوّل آدمی کا مشہور و معزز ہونا، اس کا اہل اسلام ہونا یا اہلِ اسلام سے مہر و محبت رکھنا، سوم خوش پوش ہونا اور پوشاک میں اعلیٰ ذوق رکھنا، چہارم جامعہ علی گڑھ کا سند یافتہ ہونا، پنجم .... مگر کہاں تک شمار کرتا جاؤں۔ علامہ محمد اقبال لاہوری رحمۃ اللہ علیہ میں دو اوصاف تو کچھ کچھ موجود تھے۔ بقیہ دو کے باب میں وہ کورے تھے۔ آپ کی نگاہ میں وہ چڑھتے کیوں کر۔ حکیم الامت کہلائے مگر خالی خولی باتیں بنانے والے، شعر گھڑنے والے، عمل سے کوسوں دور۔ ہر چند کہ دوسروں کو شاہین ہی تصور کر کر پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرتے پر اکساتے رہے مگر خود لاہور کی میو روڈ کی کوٹھی میں اپنی چارپائی سے نہ سرکے۔ دراصل یہ بات بھی ہے کہ مردانِ باعمل و باجبروت تم کو پسند ہیں۔ شعراء اور اُدباء کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس واسطے کہ عمل سے گریزاں رہتے ہیں۔ آپ کو اپنا عظمت کا معیار مبارک! ایک رند مشرب سعادت حسن منٹو کا معیار عظمتِ انسانی کے بارے میں جداگانہ تھا۔ اس مرحوم نے ایک بار نشۂ شراب میں فقیر سے کہا "یار بابو گوپی چند بہت بڑا آدمی تھا"— جو باتیں اس نے مجھ کو اپنے یار گوپی چند کی سنائیں، تم ان کو سنو تو غضب سے لرزنے لگو۔

اس سعادت حسن منٹو کے نزدیک بمبئی کی ایک ادھیڑ عمر کی طوائف موذیل بھی عظیم عورت تھی۔ سنو صاحب! آپ کس لئے منہ بناتے ہیں؟ وہ خود بھی تو اسی ڈھنگ و قماش کا تھا۔ تماشا گاہِ عالم میں بے راہ روی سے سیر کرنے والا، اوباشوں اُچکوں میں مہر و وفا ڈھونڈنے والا، آٹو گراف بک اس نے ساری عمر جیب میں نہ رکھی اور نہ کسی کو پیش کی۔ وہ ملاقاتی کی

ظاہری اور باطنی آٹوگراف اپنی لوحِ ذہن پر محفوظ کرلیتا تھا۔ اور ایک عالم کو بے باکی سے دکھلاتا تھا۔ الغرض حضرت! یہ آوارہ مزاج، عیاش طبع شخص سنّتّے سے اکھڑا تھا۔ توبہ! توبہ!! توبہ!!! بابو گوپی چند ذات کا کھتری اور موذیل آتش پرست پارسن! یہ عظمتِ انسانی کا تاج ان زندیقوں کے سر پر دَھرتا ہے۔

بہرحال کتاب تم نے دھوم دھام کی لکھی ہے۔ گلشنِ فصاحت کی باغبانی اس طور کی آگے کسی نے کی نہیں۔ بلند پروازی و نازک خیالی اس روپ کی مولانا ابوالکلام کو کہاں میسّر! حسّاس طبع لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس نگارش میں سراسر تصنّع و آورد ہے اور خیالات اس کے کم نظری اور خود بینی کے مظہر ہیں تو وہ بکتے رہیں۔ یقین مانئے گا۔ فقیر تمہارے اس رسالے کو تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہے، اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر پڑھتا ہے۔ وائے حسرت! گزرگاہِ ہستی کی ترپن منزلیں طے کر چکا آج تک کسی کو فقیر سے آٹوگراف لینے کی توفیق نہ ہوئی، ماسوا ایک موقع پر۔ شیخی بگھارنے کی خاطر نہیں کہتا۔ میں ایک بار جہاز میں سوار ہو کر انگلستان عالیشان میں گیا۔ وہاں چند طالب علم ممالکِ شرق و غرب و حبش سے آئے ہوئے۔ ویلز کے صوبے میں بغرضِ سیر گئے۔ میں اس جماعت میں شامل تھا۔ ہمارے "ٹور" کے منصرم ہمیں ایک کوئلے کی کان میں کام کرنے والوں کے گاؤں میں لے گئے۔ بچوں کی ایک فوج ہمیں عجوبے گمان کر کر ہمارے جلو میں ہوئی۔ انھوں نے غالباً گمان کیا کہ ہم اہلِ حبش کے مطرب و نواسنج ہیں جو وہاں کے اسکول میں بینڈ باجہ بجا کر ان کے دل شاد کریں گے۔ یہاں ایک چھوٹا سا چپٹی ناک والا لڑکا میری صورت سے متاثر ہو کر میرے پاس آیا اور کہا "معاف کیجئے۔ کیا آپ مجھ کو آٹوگراف دیں گے؟" اس نے اپنی آٹوگراف بُک میرے سامنے کر دی۔ میں نے مسرّت سے فخر کی مونچھوں پر تاؤ دیا۔ حضرت! یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے آٹوگراف کی درخواست کی۔ میں چاہتا تھا اس چھوٹے لڑکے کو سینے سے لگالوں۔ کندھوں پہ بٹھاؤں۔ جب میں آٹوگراف بُک میں دستخط رقم کر رہا تھا وہ جھجکتا بولا "پلیز! کیا آپ اس بینڈ کے ماسٹر ہیں؟" باور کیجئے یہ سُن کر ساری سرخوشی پر اوس پڑ گئی۔ جذباتِ دلی سخت مجروح ہوئے۔ خیر یہ تو دل لگی ہے۔ تم بتاؤ، آٹوگراف دینے میں وہاں خود بھیجوں یا تم یہاں آؤ گے؟ اس شہر کے ریسٹ ہاؤس میں قیام و طعام کا اچھا انتظام ہے۔ جواب آنے پر اگلا خط لکھوں گا۔

زیادہ حدِّ ادب

طالبِ کرم۔ خضر قطب

محمد خالد اختر

ننھا مانجھی

میں نے اپنے ننھے مانجھی کو پہلی بار چھوٹی گھونگھے جیسی کشتی کے پاس جون ۱۹۳۸ء کی ایک سہ پہر کو دیکھا۔ دریا اپنے پاٹ میں چار دریاؤں ستلج، سندھ، جہلم اور راوی کے پانی لیے بل کھاتی اور پھنکارتی ہوئی موجوں اور بھنوروں کا سمندر ہو رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی اور تم پر لا کنارہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹی دم کٹی سی ٹرین نے ایک گھنٹہ پہلے مجھے گنبدوں اور کھجوروں والے ٹرمینس ریلوے اسٹیشن پر اتارا تھا اور میں وہاں سے اپنا تھیلا کندھے پر رکھے اور ایک سوٹ کیس اٹھائے ایک دیہاتی باتونی لڑکے کی رہنمائی میں ریلوے لائن کی پٹڑی پر چلتا ہوا (کیونکہ ارد گرد طغیانی کی وجہ سے سب پانی تھا اور پٹڑی ہی سب سے اونچی جگہ تھی) پی ڈبلیو ڈی کی فیری لانچ کو پکڑنے دریا کے کنارے پہنچا تھا۔ میری بد قسمتی کہ میں فیری لانچ کو نہ پکڑ سکا۔ ابھی ہم تین سے دو فرلانگ دور تھے کہ کنارے سے ایک "ہانک" سنائی دی اور ایک سبز اور سفید مکان نما چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔

"سائیں" ۔ الجھے ہوئے بالوں والے دیہاتی لڑکے نے جس کا نام گامن تھا کہا "بیڑی وینندی پئی اے۔ تساں ہن کل فجرای ونج سکدے او"۔

میں نے خواہ مخواہ کے غصے میں سارا الزام اس پر دھرا کہ اس نے اپنی باتوں میں مجھے دیر کرادی ہے ورنہ میں فیری کو پکڑ لیتا۔ ہم کنارے پر پہنچے۔ فیری لانچ اب کافی دور جا چکی تھی۔ میں اس کے انجنوں کی چگ چگ کو سن سکتا تھا۔ مچھیروں کی مستولوں والی دو تین کشتیاں پر موج پانیوں پر اچھل رہی تھیں اور ٹوکریاں بننے والے خانہ بدوش اپنی اپنی سرکنڈوں کی جھونپڑیوں میں کنارے پر پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ موسم زدہ جھریوں والے بوڑھے اور چمکیلے سیاہ جسموں والے بے پروا نوجوان اور رنگدار پھٹی ہوئی چھینٹ کے گھگھروں میں صحت مند جسموں اور کھرے پتیل کی سی رنگت والی عورتیں، جن کو دیکھنے سے دل میں گویا ایک پھانس اٹک جاتی تھی اور لاتعداد الجھے ہوئے بالوں والے چھوٹے بچے جو اپنے بڑوں کی مصروفیات اور دھندوں سے بے خبر شور مچاتے ہوئے پانی میں کھیل رہے تھے۔

مجھے اس شام اپنے دریائی چچا احمد یار کے پاس پہنچنا تھا۔ اس گھر میں سب میرا انتظار کر رہے ہونگے۔ میں واپس اس سبز روضوں اور کھجور کے جھنڈوں والے گاؤں چاچڑاں میں رات

بسر کرنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر فیری لانچ جا چکی تھی اور دریا کے پرلے کنارے پر جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

"سائیاں"۔ گامن نے کہا "رات اساڈے گھر رہو۔ تساڈی خدمت کریساں نئے مٹھ مروڑے ویساں، میرا بابا فرید رح سائیں دیاں کافیاں خوب نال گاندا اے۔ تے ساڈی ہک پکری اے۔ سائیں کوں ادوا کھیر پویساں، ڈھاڈا مٹھا اے۔ فجر بن حال میں سائیں کوں بیری تے چڑھا ویساں"

میں نے مستولوں والی کشتی کے ایک بوڑھے لمبی موچھوں اور پٹوں والے مچھیرے سے دریافت کیا کہ آیا وہ مجھے دوسرے کنارے پر مٹھن کوٹ لے جائے گا۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور دریا کی سمت اشارہ کیا جو اپنی ناچتی ہوئی شوریدہ لہروں سے واقعی خطرناک اور جان لیوا نظر آرہا تھا اس نے کہا "پند بھی بہت زیادہ ہے اور ہوا الٹے رخ کی ہے۔ اس وقت کوئی تمہیں مٹھن کوٹ نہیں لے جائے گا"۔

میں مایوس ہو گیا میرے چچا نے میرے آنے کی خوشی میں اپنی ضرب المثل دریا دلی سے بڑا تکلف کر رکھا ہو گا اور اسے مایوسی ہو گی۔ تب میں نے اپنے ننھے مانجھی کو دیکھا۔

وہ اپنی اچھلتی ہوئی گھونگھے نما کشتی کے پاس ایک لمبا بانس لیے کھڑا تھا، بمشکل بارہ تیرہ برس کا لڑکا، ایک لنگوٹی میں، اس کے بال گھنے گھنگھریالے تھے، اور اس کا بدن چمکیلا اور لچکیلا اور سنہری تھا اور وہ اپنے بانس کے ساتھ ایسی بے پروائی اور ایسے بانکپن سے کھڑا تھا جیسے وہ ایک چھوٹا سا دیوتا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دلیری اور خود اعتمادی تھی اور اس کا چہرہ خوبصورت اور مسکراتا ہوا تھا۔ جنگلوں، دریاؤں اور کھلے خطوں کی ایک مخلوق!

ایک لمحے کے لئے میں نے تاسف سے اپنے غلط خوراک پر پلے ہوئے پلپلے توند یلے، آرام کے عادی جسم کے بارے میں سوچا۔ شہروں میں رہتے ہوئے انسان نے خود کو غالباً خدا کی بدصورت ترین مخلوق بنالیا تھا۔ آہ! یہ تہذیب کی نت نئی بڑھتی ہوئی آسائشیں! شہری آدمی کو آخر کس بات کا ناز تھا۔

ننھے مانجھی نے خود ہی مجھ سے پوچھا "سائیاں۔ پار جاسیں"؟

"تمہاری کشتی کمزور ہے۔ یہ ڈوب جائے گی چھوٹے لڑکے۔" میں نے کہا

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی لوک گیتوں کا ایک سر تھی۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانت چمکے۔

اپنے تمباکو سے میلے کچیلے پیلے دانتوں کا سوچ کر حسرت کی چھری سی میرے سینے میں اتر گئی۔

"واہ سائیاں واہ۔" وہ بولا "میری بیڑی نہیں بڈ دی (ڈوبتی) یہ پانی دی مچھی اے دریا دی

چھل تے اتوں پکھی دانگوں اڈ جاندی اے ۔"

اس نے بتایا کہ وہ ہر روز پرلے ساحل سے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اس کشتی میں یہاں آتا ہے اور سرِشام لوٹتا ہے ۔

"دریا میرا گھر ہے ۔" اس نے سادگی سے کہا" سائیاں میں دریا وچ پڑھیا ہویا آں ۔ دریا میرا سنگتی ہے ۔ وہ میری اور میری کشتی کی حفاظت کرتا ہے " ۔

ایک جنگلی وحشی لڑکے سے اتنی عقل کی باتیں سن کر میں حیران رہ گیا ۔ کس نے اس کو یہ باتیں سکھائی تھیں!

" تم سکول میں پڑھتے ہو ؟ " میں نے پوچھا ۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ایسی دانائی صرف سکول میں سیکھی جا سکتی ہے ۔ یہ بھولتے ہوئے کہ مادرِ فطرت خود بہترین استاد ہے

وہ پھر ہنسا اور اس کے جواب نے مجھے مزید حیران کر دیا" میرا سکول سائیاں زمین ہے اور دریا ہے " ۔

گامن مجھ سے چمٹا ہوا تھا ۔ وہ کبھی میرے کوٹ کو اور کبھی میرے بازوؤں کو کھینچتا ۔ وہ خلوص سے چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شہر میں اس کے کچے مکان میں رات گزاروں ، اس کی بکری کا تازہ بھرا دودھ پیوں اور اس کے بابا سے فرید رح کی کافیاں سنوں ۔

"سائیاں دریا ایکدم خطرناک ہے ۔ میرے ساتھ آؤ ۔ ۔ ۔ " گامن بولا ۔

اس پر ننھا منّا مجھی زور سے ہنسا " خطرناک ! " اور چھلانگ لگا کر اپنی کشتی میں سوار ہو گیا ۔ " میں اب جا رہا ہوں تم آنا چاہتے ہو تو آ سکتے ہو " ۔

میں نہیں جانتا کہ اس وقت میرے دل میں کیا آئی ۔ نہ جانے یہ اپنے ہنس مکھ ، شکرے کی آنکھ والے چچا کی میرے نہ پہنچنے پر مایوسی کی فکر تھی اور اس بھنے ہوئے مرغ کا خیال تھا جو وہ اپنی خاص نگرانی میں پکوا رہا ہو گا یا یہ دریا کا وسیع حسن و جمال تھا کہ یا پھر یہ اس جنگلی وحشی لڑکے کی خود اعتمادی سے بھری ہنسی تھی ۔ میں نے یک لخت اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا ۔ زندگی میں ایسے بہادر لمحے آتے ہیں جب آدمی جان کی بازی لگا دیتا ہے ۔

" ٹھہرو میں تمہارے ساتھ آ رہا ہوں " ۔

" نہ نہ سائیاں ، کملا نہ بنو با ۔ ایہہ چھوکرا پجوڑا ہے ۔ کشتی بڈ ویسی ۔ " مگر میں تو اب اپنے تھیلے اور سوٹ کیس کے ساتھ کشتی میں تھا اور کنارے پر حواس باختہ گامن کو احتجاج کرتے چھوڑ کر ننھا منّا مجھی اپنی مچھی جیسی کشتی کو بھنور بیلے ، لپٹتے پانیوں میں لے جا رہا تھا ۔ وہ ایک یونانی دیوتا کی طرح حسین لگ رہا تھا ۔ اس کے گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے ۔ کچھ دیر کے لئے میں اس کے اس دم سلاوک والے انسانی حسن میں کھو گیا اور اس خطرے کو بھول گیا جس میں میں کود پڑا

تھا۔

جب میں نے اچھی طرح اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ پانی کی لہریں غصیلے سانپوں کی طرح کشتی کے کناروں پر شوکتی ہوئی آتی تھیں۔ میں پانچ منٹ کے اندر سر تا سر بھیگ گیا۔ کشتی میں بھی پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ مگر ننھا مانجھی صرف مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے پر فکر یا خطرے کی کوئی علامت نہ تھی۔ کشتی ایک نازک گھونگھے کی طرح کبھی ادھر لڑھکتی جاتی کبھی ادھر، اور کبھی سر کے بل اپنی دو سواریوں سمیت پانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتی معلوم ہوتی لیکن پھر یہ صحیح سلامت لہروں پر سوار نکل آتی۔ پہلے پندرہ بیس منٹ تک میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہا اور میری ہڈیوں کا گودا تک ڈر اور سہم سے گویا جم گیا۔ پھر لڑکے کی خود اعتمادی اور مسکراہٹ اور اس عجیب و غریب کشتی کی خطرے کے مقابلے میں چستی کو دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہونے لگا۔ میں نے اس عرصے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اور نہ ہی لڑکا کچھ بولا۔ اپنے مطمئن انداز کے باوجود اس کی رگ رگ چوکنا تھی۔ آنے والے خطرے کی بو وہ ایک جنگلی جانور کی طرح پا لیتا اور اپنے چپو کی مناسب جنبش سے وہ اس پر قابو حاصل کر لیتا۔ اپنے خوف سے کچھ خلاصی پا کر میں نے دریا کے منظر کو دیکھا۔ یہ ایک پر تجمل، ہولناک اور بے حد خوبصورت منظر تھا۔ سہ پہر کے سونے سے رنگے ہوئے، اچھلتے، بپھرتے اور شوکتے ہوئے پانی۔ ہم ایک دو "جزیروں" کے پاس سے گذرے۔ سیلاب میں آدھی ڈوبی ہوئی بستیاں، لوگ ڈھکیوں پر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے اور کھجوروں کی چوٹیاں پانی پر جھومتی ہوئی۔ میں نے سوہنے (یہ اس ننھے مانجھی کا نام تھا اور کتنا مناسب) سے پوچھا کہ یہ لوگ ڈرتے نہیں؟ اس نے کہا "نہیں یہ لوگ دریائی ہیں اور دریا پر وہ اتنے ہی محفوظ ہیں جتنے زمین پر"۔

اس وقت دریا میں سوائے سوہنے کی چھوٹی کشتی کے اور کوئی کشتی نہیں تھی۔ ہم بھی بانس اور کبھی چپو کی مدد سے پہلے ہوا اور بہاؤ کی مخالف سمت گئے۔ پھر ننھے مانجھی نے کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ میں اپنا بانس گاڑ دیا اور سرکنڈوں سے بنا ہوا ایک بادبان جو اس نے تختوں کے نیچے رکھا تھا، نکال کر اسے مہارت سے اس بانس پر باندھ دیا۔ اس نے یہ سب کچھ مکمل اطمینان اور لاپروائی سے کیا جیسے یہ دنیا کی آسان ترین چیز ہو، محض بچے کا کھیل۔ اس کے لئے واقعی یہ کھیل تھا۔ اس کے بعد وہ چین سے بیٹھ گیا اور میں نے اسے ایک سگریٹ سلگا کر دیا وہ بڑا خوش ہوا اور اسے ایک جوان کی طرح پینے لگا۔

"اب کوئی فکر کی بات نہیں، بیڑی ہمیں خود بخود دریا پر لے جائے گی۔ سائیاں، دریا میرا بھی سنگتی ہے اور میری بیڑی کا بھی۔ سائیاں تم اب تک تو سمجھ گئے ہو گے۔"

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں اور مٹھن کوٹ کس کے پاس

جارہاہوں۔میں نے اسے اپنے چچا کا نام بتایا تو اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا پھر اس پر پہلی سی چمک عود کر آئی۔ "اساں سوہنے سائیں دی رعیت ہاں۔ میں تینکوں اتھے لے جاساں"۔

شام پڑنے لگی تھی اور پرلا کنارہ جس کی طرف ہم جا رہے تھے، کھجوروں اور روضوں کی ایک دھند سا بن رہا تھا۔۔۔ دریا کے بہاؤ کی سمت ایک دو میل دور سوہنا کبھی کبھی اپنے گھونگھے کو سیدھی سمت پر رکھنے کے لئے چپو چلا دیتا اور بس۔

وہ گانے لگا۔ اس کی آواز میں ایک وحشیانہ تموج تھا ایک آزاد الاپ تھی۔۔ اپنے دریا سے مستعار لی ہوئی الاپ۔ یہ اس کے دیس کا نغمہ تھا۔ جہاں آدمی قدرت کے ساتھ ہم آہنگی سے رہتا تھا اور تنومند اور دلیر اور جیالا ہو کر پروان چڑھتا تھا۔

میری بیڑی وہندی پئی اے
نچدی کھلدی وہندی پئی اے
دریاواں دی مچھی اے
سوہنی اے تے سسی اے
میری بیڑی وہندی پئی اے
بھلن تے سنسار دریاوے
تر کندے سنگھاڑ دریادے
بیڑی دے ہن یار سبھانے

" بڑا اچھا گیت ہے سوہنا۔ یہ گیت کس کا ہے؟"

میرے یہ کہنے سے وہ بڑا خوش ہوا "یہ گیت میں نے خود بنایا ہے۔ میں نے اور کئی گیت بنائے ہیں جب میں مچھلی کے شکار پر آتا ہوں تو گیت خود بخود میری زبان پر آجاتے ہیں۔ بہت سے تو مجھے بھول بھی گئے ہیں۔ مگر کیا ہوا۔ نئے گیت میں آسانی سے بنا لیتا ہوں"۔

سوہنے میں ایک شاعر کی روح تھی اور جب شام گہری ہوئی تو میں نے اپنے خوف کو بالکل بھلا کر اس سے مختلف سوال پوچھنے شروع کیے۔ اس سے زیادہ پرکشش اور حیران کن لڑکا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک چوہڑے کا بیٹا ہے اور اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں ٹوکریاں بن کر پیٹ پالتی ہے اور وہ اپنی چھوٹی کشتی میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ وہ بہت غریب ہیں اور دنوں تک ان کی خوراک میں ابلی ہوئی مچھلی اور بھنے ہوئے باجرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انہیں ہفتوں تک کھانا نصیب نہیں ہوتا۔

یہ کشتی جس میں ہم اس غصیلے پانی پر سفر کر رہے تھے سوہنے نے خود اپنے ہاتھ سے ایک

کھجور کے تنے کو کھو کھلا کر کے اور کچھ تختے جوڑ کر بنائی تھی اس میں بیٹھ کر وہ اکیلا مچھلی پکڑنے جاتا ۔۔۔۔ کانٹے اور ڈور کے بغیر اس ۔ کے پاس ایک پھٹا پرانا جال تھا جو ایک شناسا مچھیرے نے اسے دیا تھا ۔ اسے ایسی آوازیں نکالنی آتی تھیں ۔ خاص قسم کی سیٹیاں اور کلسکاریاں اور لوریاں کہ جن کو سن کر مچھلیاں خود بخود کشتی کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں ۔

"سائیاں ۔۔ مسکوں مچھی آون دا آپے آپ پتہ چل ویندا اے ۔" اس نے کہا ۔

سوہنا میں وہ چھٹی حس تھی جو قدرت کے سب جنگلی جانوروں میں پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسی حس سے ہوا کے پرندے طوفان کے آنے سے گھنٹوں پہلے خبردار ہو جاتے ہیں اور شکاری کتے خرگوش کے قدموں سے اس کی بو پاکر اپنے کان کھڑے کر لیتے ہیں اور چمگادڑ اپنی آنکھوں کے بغیر سب رکاوٹوں سے بچتی بچاتی اڑتی ہے ۔ اب بھی روہی میں ایسے لوگ ہیں جو زمین کے نیچے پانی کو سونگھ لیتے ہیں اور کبھی ایسے ریڈ انڈین بھی ہوتے تھے جو ایک ٹہنی کی ہلکی سی چیخ سے یہ بتا سکتے تھے کہ ان کی کھوج میں کون دشمن آرہا ہے ۔

سب مخلوقات جو قدرت کے ساتھ یکجان ہو کر رہتی ہے اس چھٹی حس کی مالک ہوتی ہے اور یہ باعث حیرت نہیں کہ ننھے مانجھی کو یہ پتہ چل جاتا تھا کہ مچھلی آرہی ہے ۔

جب مچھلی نزدیک آجاتی تو وہ اپنے منہ میں چاقو اور ہاتھ میں جال لیے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ۔ وہ کبھی کشتی میں سے جال نہیں پھینکتا تھا کیونکہ جال پھٹا پرانا تھا اور اس میں سے مچھلی نکل جانے کا خطرہ تھا ۔ پانی میں وہ مچھلیوں کو جال میں پکڑنے کی کوشش کرتا ۔ یہ کوشش اکثر بار آور ہوتی لیکن اگر مچھلی جال میں کسی وجہ سے نہ آتی تو وہ اپنے ہاتھ استعمال کرتا ۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ مچھلی کے شکار کے وقت منہ میں چاقو کیوں دابے رکھتا ہے ۔ اس نے کہا کہ دریا میں ایک بڑی اچھی مچھلی بھلن ہوتی ہے جب مچھلیاں اس کی کشتی کی طرف آتی ہیں تو بعض دفعہ یہ بھلن ان کے پیچھے پیچھے آپہنچتی ہے ۔ یہ گدھے جتنی بڑی ہوتی ہے اور بڑی طاقتور ہوتی ہے ۔

"ایہہ چاقو ، سائیاں ، بھلن کو مارنے کے لئے ہے ۔ میں بھلن کے پیٹ کے نیچے تیر کر جاتا ہوں اور دو تین بار اس کے پیٹ میں چاقو گھونپتا ہوں ۔ اپنے قد وقامت کے باوجود یہ آسانی سے مرجاتی ہے" ۔

سوہنے نے مجھے اپنی بائیں ٹانگ دکھائی ۔ یہاں گھٹنے سے لے کر ایڑی تک ایک گھاؤ کا نشان تھا ۔ "سائیاں بوجھو ۔ یہ کیسے ہوا" ۔

"مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا ۔

"تم کو یقین نہ آئے گا سوہنے سائیاں ۔ ایک دفعہ میں پار کے علاقے میں بیڑی میں مچھلی

پکڑنے گیا بڑی دیر تک کوئی مچھلی نہ آئی۔ میں نے سمجھا کہ اس حصے کی سب مچھلیاں کہیں چلی گئی ہیں۔ پھر جب میں گھر کا رخ کرنے لگا تو مچھلیوں کا لشکر بیڑی کی طرف تیرتا ہوا آیا۔ لیکن اس کے پیچھے گدھے جتنی بڑی بھلن تھی۔ میں چاقو منہ میں دابے پانی میں اتر گیا۔ اب بھلن مچھلیوں کو کھاتی ہے اور سنسار بھلن کا شکار کرتا ہے۔ اس وقت بھلن کے پیچھے پیچھے ایک سنسار بھی بھلن کو کھانے چلا آیا تھا۔ یہ مجھے پتہ نہ تھا۔ میں بھلن کے پیٹ میں چاقو گھونپنے لگا تھا کہ نیچے سے سنسار نے اپنے جبڑے میں میری ٹانگ کو پکڑ لیا۔ سائیاں تم یقین نہیں کرو گے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس بحال رکھے۔ میرے باپ نے ایک بار بتایا تھا کہ سنسار کی آنکھیں اگر اندھی کردو تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ بس سائیاں میں تیر کر سنسار کے دہانے کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں چاقو سے دو گھونپے دیئے۔ بڑا لہو بہا۔ سنسار تکلیف سے تڑپنے لگا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں بچ کر اپنی کشتی میں چڑھ آیا مگر میری ٹانگ بالکل لو تھڑا ہو گئی۔ ہسپتال میں وہ اسے کاٹنے لگے تھے پر بڑے ڈاکٹر نے کاٹنے نہ دیا۔ مجھے ہسپتال میں چار پانچ مہینے رہنا پڑا اور میری ٹانگ اب سوائے اس نشان کے بالکل ٹھیک ہے"۔

ننھا مانجھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے چمکیلے چہرے پر صاف صاف لکھا تھا۔ میں سچ بول رہا ہوں!

پھر اس نے کہا" سائیاں۔ میں مچھیاں کوں سڈاں ؟اس ڈار وچ مچھیاں ہن"۔ وہ سیٹیاں بجانے لگا اور اپنے ہاتھوں کو ایک خاص انداز میں بجانے لگا۔ تھوڑی دیر میں پانی میں مچھلیوں کے اچھلنے کی حرکت پیدا ہونے لگی ننھے مانجھی کو پانی میں نہ اترنا پڑا کیونکہ ایک مچھلی چھلانگ لگا کر کشتی میں آکر گری۔ تڑپتی ہوئی۔

میں یہ کہنا بھول گیا کہ ہم اب پر سکون پانی میں تھے ـــــ دریا کی چھل کے بنائے ہوئے ٹاپو میں۔ ہم اس پتن سے گذر آئے تھے جہاں فیری لنگر ڈالے تھی اور اب کھجوروں کے جھنڈوں میں سے اندھیرے سبز راستوں میں شپ شپاتے گذر رہے تھے۔ کشتی میں سے کھجوروں کے گچھے توڑتے ہوئے ہم آخر خشکی پر آئے۔ مغرب کی سمت ایک سفیدی نے ہمیں بتایا کہ چاند ابھر آیا ہے۔

ننھے مانجھی نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور ہم سونی سڑک پر چل پڑے۔ میرا دریائی چچا شہر کی ایک دو منزلہ حویلی میں رہتا تھا۔ میں وہاں پہلی دفعہ آیا تھا لیکن سوہنے کو اس جگہ کا پتہ تھا وہ مجھے وہاں لے گیا۔

میرے چچا نے مجھے خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہی! اس کا چہرہ مسکراہٹوں سے شکن آلود ہو گیا۔ کیونکہ اب تک وہ میرے آنے سے مایوس ہو چکا تھا۔

جب میں اس سے مل رہا تھا تو سوہنا دروازے میں کھڑا تھا۔ میں سوہنے کو دو روپے دینے لگا تو میرے چچا کا مسکراہٹوں میں لپٹا چہرہ درشت اور سخت ہو گیا۔ وہ سوہنے پر برسا" او چوہڑے دے بچے تینکوں ساڈے خاندان تو پیسے لیندیاں شرم نہیں آندی؟"

سوہنا چلا گیا۔ میرا چچا ان علاقوں میں ایک سخت اور جابر آدمی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس کا نام لینے سے سوہنے کے چہرے کی رنگت کیوں بدلی تھی۔

(۲)

میں مٹھن کوٹ میں دو ہفتے رہا۔ مجھے اپنے چچا سے آبائی زمین کے معاملات طے کرنا تھے مگر اس کے زرخیز دماغ میں دوسرے ارادے تھے۔ البتہ یہ میرے ذاتی معاملات ہیں اور یہاں مجھے ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے۔

ایک دفعہ میں نے خواجہ غلام فرید کے روضے کی عقبی گلی میں سوہنے کو پھر دیکھا۔ سوہنا مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دریائی ماہوؤں کے کنارے پر سرکنڈوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس میں مٹی کے دو تین برتنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یا پھر سیپوں کا ایک ہار اور ایک بنسری دیوار سے لٹک رہی تھی۔ سوہنا یہاں اکیلا رہتا تھا۔ اس نے کچھ افسوس سے کہا کہ اس کی ماں نے شادی کر لی ہے اور وہ اس کا خاوند علی پور چلے گئے ہیں۔ جہاں اس کے سوتیلے باپ کی لوہارے کی ایک دوکان ہے۔

"سوہنا" میں نے پوچھا" تمہارے پاس چارپائی نہیں؟"

"میں زمین پر سوتا ہوں، سوندھی بجری زمین پر"۔ اس نے سرکنڈوں کی ایک چٹائی مجھے دکھائی" میں اس پر سوتا ہوں۔ یہ میرا وچھاون ہے۔"

"تم سانپوں سے نہیں ڈرتے؟" میں نے پوچھا۔ میں خود سانپوں سے بے حد ڈرتا تھا اور ان کے ڈراؤنے خواب دیکھا کرتا تھا۔

"سانپ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں تو ان کے ساتھ کھیلتا ہوں"۔

"اور تم سردیوں میں کیا کرتے ہو؟ تمہارے پاس لحاف نہیں اور تم ٹھٹھر جاتے ہو گے!"

"مجھے سردی نہیں لگتی۔ جب سردی سخت پڑتی ہے تو سائیاں پتہ ہے میں کیا کرتا ہوں؟ میں بہت سا گڑ کھا لیتا ہوں اور اپنے وچھاون پر لیٹ جاتا ہوں۔ یہ بڑا لمبا ہے۔ اس لیے اس کے آدھے حصے کو الٹا کر اپنے اوپر اوڑھ لیتا ہوں۔ میں اتنا گرم ہو جاتا ہوں جتنا سیڑا (خرگوش) اپنے بھٹ میں۔

میں نے اسے کہا کہ وہ میرے ساتھ سکھر چلے ۔ میں اسے وہاں کسی فیکٹری میں نوکر کرادوں گا مگر وہ سوچ میں کھو گیا ۔ اس نے اپنا سر ہلایا "میں اپنی بیڑی اور دریا کو نہیں چھوڑ سکتا سائیاں ۔ میں فیکٹری میں کام کرنا نہیں چاہتا" ۔

پھر اس نے کہا "سائیاں ، میں تیڈی کیا خدمت کروں ۔ میری پاس کچھ مکھانے ہیں " وہ ایک پیالے میں مکھانے لے آیا ۔ اور ہم کھانے لگے ۔ یہ غریبانہ مہمان نوازی ایک بادشاہ کی ضیافت سے کہیں اچھی تھی ۔ پھر اس نے بنسری دیوار سے اتار لی ۔ اور اسے بجانے لگا ۔

"سوہنا تم نے کوئی نئے گیت بنائے ہیں ۔ ؟"

"بہت سے ۔ ہر روز جب میں اپنی بیڑی میں مچھلیاں پکڑنے جاتا ہوں نئے گیت بناتا ہوں ۔ کبھی میرے ساتھ شکار پر چلو ۔ میں تمہیں بہت سے گیت سناؤں گا ۔

میں نے اسے تین روپے دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا ۔ سوہنا ایک خود دار لڑکا تھا ۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے اپنی کشتی میں مٹھن کوٹ لے کر آیا تھا اور میں نے اسے کوئی اجرت نہ دی تھی ۔ اس نے کچھ نہ کہا ۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ بازار میں لے آیا ۔ اور اسے اس کی پسند کی چیزیں خرید دیں ۔ ایک نیا چاقو ۔ ایک سیر نمک ، آدھ سیر گڑ ، چائے کا ڈبہ ، بچی ، تھوڑا سا رنگدار لٹھا ، وہ بڑا خوش ہوا ۔ اور اس نے کہا اب وہ بادشاہزادے کی طرح رہے گا ۔

وہ اس وقت تک مجھے چھوڑنے پر تیار نہ ہوا جب تک میں نے اس سے وعدہ نہ کر لیا کہ میں کسی دن اس کے ساتھ شکار پر جاؤں گا ۔

(۳)

میں اس کے ساتھ مچھلی کے شکار پر نہ جا سکا اور اگرچہ میری رخصت کے چند دن باقی تھے مگر دوسرے ہی دن اپنے دریائی چچا سے ایک جھگڑے کی وجہ سے مٹھن کوٹ چھوڑنا پڑا ۔ دریا کے پتن پر جاتے ہوئے میں سوہنے کی جھونپڑی میں جھانکا مگر ننھا مچھی وہاں نہ تھا ساتھ کی جھونپڑی میں ٹوکریاں بننے والی ایک بوڑھی عورت نے مجھے بتایا کہ لڑکا شکار پر گیا ہے ۔ "اللہ اس کو حیاتی دے بڑا نیک لڑکا ہے ۔ مچھی لاتا ہے تو بچوں کو تقسیم کرتا پھرتا ہے ۔ میں اس کے لئے دعا مانگتی رہتی ہوں کہ رب اسے نظر بد سے محفوظ رکھے ۔"

مجھے اس سے نہ ملنے کا افسوس ہوا میں فیری لانچ کے پتن پر پہنچا اور ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا ریل کے ڈبے کے سے کمرے میں بڑا حبس تھا اس لئے میں سامنے عرشے پر پتوار کے پاس ایک چارپائی پر جا بیٹھا جو دراصل ایک ترکی ٹوپی والے تحمل تحمل کرتے مخدوم کے لئے بچھائی گئی تھی ۔ میں نے پتلون کوٹ پہن رکھا تھا اس لئے کسی نے اعتراض نہ کیا ۔ مخدوم کے پاؤں

دبانے کے لئے چار نوکر تھے اور ایک اس کا حقہ بھرنے پر مامور تھا۔ میں نے مخدوم کے ساتھ حقہ پیا اور ہم نے بہت سی باتیں کیں۔۔۔۔ اوقاف کی "چیرہ دستی" کی، روحانیت کی کمی کی اور شکار کی ایسے موقعوں پر آدمی خود کو بڑھا کر ظاہر کرے تو ٹھیک رہتا ہے۔ اس لئے میں نے مخدوم پر یہ ظاہر کیا کہ میں شکار پور میں فارسٹ آفیسر تھا۔ پھر میں نے اسے اگلی سردیوں میں وہاں شکار پر آنے کی دعوت دی۔ فیری لانچ ابھی منجدھار میں تھی کہ مجھے ننھے ماہگی کی بیڑی دکھائی دی۔۔ بالکل ننھی سی ڈونگی! ننھا ماہگی پانی میں تھا۔ مچھلیاں پکڑتا ہوا، دھوپ میں ایک یونانی دیوتے کی طرح حسین اور جیالا۔

اس نے ایک دفعہ بھی فیری لانچ کی طرف نہ دیکھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے میں بہت مصروف تھا "اب دیکھو" مخدوم نے کہا "اب ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں نے اپنے پرانے وفادار مدار المہام کو بھی چھٹی دے دی ہے۔ گورنمنٹ کہتی ہے کہ ان کی املاک چھین لو۔ کل کو کہے گی۔ کہ ان کے شکاری کتے بھی چھین لو۔ آخر کتے بھی تو املاک میں شامل ہیں۔"

میں نے اتفاق کیا۔ اس گئے گذرے زمانے میں روحانیت کی اقدار واقعی مٹ رہی تھیں۔

(۴)

چار پانچ سال بعد میں علی پور میں سینئر کمپاؤنڈر مقرر ہوا۔ ہماری بیشتر آبائی جائیداد مٹھن کوٹ کے پاس تھی اور میں نے کوشش کر کے اپنی تبدیلی علی پور میں کرائی تاکہ جائیداد کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں مٹھن کوٹ اپنے چچا سے ملنے نہ گیا۔ ہمارے تعلقات بعض خاندانی معاملات کی وجہ سے کشیدہ اور تلخ ہو چکے تھے۔ چار سال پہلے سکھر میں میں نے ایک سندھی تاجر کے گھرانے میں شادی کر لی تھی اور اب ہمارے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ شادی ایک عجیب تجربہ ہے۔ یہ ساری کی ساری گلابوں کی سیج نہیں جیسے کہ پہلے پہل نظر آتی ہے۔ آزاد منش آدمی کو تو یہ بالکل راس نہیں آتی۔ اور وہ کئی بار مضطرب ہو کر ان بندھنوں کو توڑ کر جنگلوں میں بھاگ جانا چاہتا ہے۔ ہمارے درمیان اخراجات پر اکثر جو تم پیزار ہونے لگتی تھی۔ عورتیں عموماً تنگ دل اور ارضی ہوتی ہیں اور جب ان کے بچے ہو جاتے ہیں تو ان کی ساری محبت اور دلچسپی بچوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان کے خاوند ان کے لئے صرف ضروریات مہیا کرنے کے آلے بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان تلخ جھگڑوں کے بعد ہم بعض دفعہ دنوں ایک دوسرے سے نہ بولتے اور ان دنوں ستا ہوا اور تھکا ہوا میں دریا پر مچھلیاں پکڑتے ہوئے ننھے ماہگی کے بارے میں سوچتا۔۔۔ ہواؤں کی طرح آزاد اور گیت گاتا ہوا۔ سوہنا کتنے مزے کی زندگی گذار رہا ہو گا۔

ایک دن سوہنا آگیا۔ مجھ پر اس صبح تاریک موڈ طاری تھا اور میں ہسپتال کے دواخانے

میں بیٹھا ہسپتال کے اردلی بخش کو نمبر ایک سے لیکر نمبر دس تک مکسچر بنانے کی ہدایات بے پروایانہ انداز میں دے رہا تھا ۔ تب میں نے کھڑکی میں سے سوہنے کو دیکھا ۔ دبلا اور پیلا سوہنا ۔ بالکل ایک مختلف سوہنا ۔ اس کے ساتھ رنگدار چھینٹ کے کرتے اور گھگھرے میں ایک دیہاتی عورت تھی پینتیس چھتیس سال کی ۔ مگر ابھی تک جوانی کی سج دھج لیے ہوئے اور نخزیلی ۔ سوہنا اس کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے تھا اور گھسٹتے ہوئے چل رہا تھا ۔ وہ بیمار تھا ۔

میں نے اسے کھڑکی میں سے آواز دی " سوہنے " اور میں باہر برآمدے میں آگیا ۔ سوہنے کے چہرے پر مجھے دیکھ کر پہلی سی مسکراہٹ آگئی " سائیاں " مجھ سے ہاتھ ملا کر اس نے کہا " سائیاں تم یہاں کہاں ؟ "

میں اسے اپنے دواخانے میں لے آیا اور سہارا دے کر اسٹول پر بٹھا دیا ۔ عورت اطمینان سے پھسکڑا لگا کر ایک دلرباحیوان کی طرح فرش پر بیٹھ گئی ۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ آیا سوہنا نے شادی کر لی ہے ۔ ان علاقوں میں وٹے کے رواج کی وجہ سے سولہ سال کے لڑکے کے ساتھ اپنے سے کافی زیادہ عمر کی عورت کا بیاہ ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ۔ سوہنے نے مجھے اس شش و پنج میں سے خود ہی نکالا " سائیاں ایہہ میری اماں بی بی اے " ۔

دریائی علاقے کی عورتیں اپنی جوانی کے رنگ روپ کو دیر تک قائم رکھتی ہیں ۔

" سوہنا تم بیمار ہو ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟ "

سوہنا نے مجھے بتایا کہ وہ پچھلے چار پانچ ماہ سے ایک عجیب پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہے ۔ پہلے پہل اس نے توجہ نہ دی اور مچھلیاں پکڑنے کے کام کو جاری رکھا ۔ لیکن اب وہ کافی بیمار ہو گیا تھا اچانک اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سن ہو جاتے تھے ۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا ۔ اور ایک دو دن پہلے اسے خون کی قے ہوئی تھی ۔

" ڈاکدار صاحب " سوہنے کی ماں نے کہا " میرا سوہنا پتر ککھ ہو گیا ہے ایدے چہرے ول دیکھ ڈاکدار صاحب ۔ میرے سوہنے نوں ٹھیک کر دے " ۔

مجھے سوہنے کی بیماری کا سن کر بڑا دکھ ہوا ۔ کسی طرح میرے دل میں یہ بات نہ آتی تھی کہ سوہنا بھی سب کی طرح بیمار پڑ سکتا ہے ۔

سوہنے نے کہا " جب میں بیمار پڑ گیا تو میں اپنے ماما کے ساتھ بس میں بیٹھ کر اپنی اماں بی بی کے پاس علی پور میں آگیا ۔ میری اماں بی بی یہاں یار و لوہار سے بیاہی ہوئی ہے ۔ میرا ستریا باپ بڑا اچھا آدمی ہے ۔ پنج وقت وا نمازی " ۔

سوہنا اپنی اماں بی بی کے دوسری شادی کر لینے کو بالکل قدرتی بات سمجھتا تھا اور ایک طرح اسے غرور تھا کہ اس کی ماں ایک خاوند کو پھانسنے اور اپنا گھر بسانے میں کامیاب ہو گئی ہے

اس کے دل میں اس کا ذرا ملال نہ تھا۔۔۔یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ تہذیب کے "طیبو" ہی ہر بات کو عجیب بنا ڈالتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر سے کہہ کر سوہنے اور اس کی ماں کو ہسپتال میں ایک چھوٹی سی الگ کوٹھڑی لے دی۔ ڈاکٹر مریضوں کو ہسپتال میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ اس سے اس کا کام بڑھ جاتا تھا اور بعض قیمتی دوائیں جو بازار میں فروخت ہو سکتی تھیں، ضائع ہو جاتی تھیں۔ مگر میں نے اس سے کہا کہ سوہنا میرا قریبی عزیز ہے۔ یوں وہ مان گیا۔

سوہنے کو دق کی قسم کی کوئی بیماری تھی اگرچہ پوری طرح اس کی تشخیص نہ ہو سکی۔ میں اس کا بھائی کی طرح خیال رکھتا۔ اسے وقت پر دوا ملنے اور ٹیکے بہم پہنچانے کی فکر کرتا۔ اور شام کو کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر اس کی باتیں سنتا۔ جب بھی میں جاتا اس کا چہرہ کھل اٹھتا اور ایک پیلی سی مسکراہٹ اس پر آجاتی۔ اس کی ماں سب دیہاتی عورتوں کی طرح حوصلہ مند اور محنتی تھی۔ وہ شام کو کوٹھڑی کے باہر ریت پر بیٹھ کر اپنے بیٹے کے لئے روٹی پکاتی۔ بعض وقت یار دو لوہار آتا۔ بھاری بھر کم، چوڑا چکلا چہرہ۔ مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، وہ ہمیشہ سوہنے کے لئے کچھ نہ کچھ چیز لے کر آتا۔ سوہنے میں کوئی ایسی بات تھی۔ اس کی گفتگو کا ایسا سبھاؤ تھا کہ ہر کوئی اس سے محبت کرنے لگتا تھا۔

لیکن ہماری تمام تر توجہ کے باوجود سوہنے کی حالت ابتر ہوتی گئی اور وہ ماضی کے سوہنے کا ایک ہیولا سا رہ گیا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں اب پتلی سوکھی لکڑیاں نظر آتی تھیں۔ اب مجھے احساس ہونے لگا کہ ہواؤں اور دریاؤں کا پالا سوہنا ہمارے پاس سے چلا جائے گا۔ لیکن وہ کیسے مر سکتا تھا! وہ جو قدرت کے عناصر میں سے ایک تھا! دریا جس کا بھائی تھا اور بیڑی جس کی بیوی اور محبوبہ تھی! وہ جو لہروں پر بادشاہ کی طرح سوار ہوتا تھا اور دیوتاؤں کی طرح گیت گاتا تھا! مچھلیوں کو کلکاریوں سے بلا لینے والا سوہنا! بھلن اور مگر مچھ سے کشتی لڑنے والا سوہنا! وہ بھلا کیسے مر سکتا تھا

ایک شام میں اس کی کوٹھڑی میں گیا۔ اتنی کمزوری کے باوجود اس کی آنکھوں میں وہی روشنی تھی۔ اس نے کہا "سائیاں۔ میں اچھا ہو جاؤں گا تو ہم چھل پر مچھلیاں پکڑنے جائیں گے"۔

"ہاں ہاں سوہنا! تم اچھے ہو جاؤ گے"۔

پھر وہ اداس ہو گیا "میری بیڑی میرے واسطے مونجھ گئی ہوسی۔ سائیاں میں مر گیا تے میری بیڑی دا کیا ہوسی؟"

"تم جلد اچھے ہو جاؤ گے سوہنے"۔

"نہیں اب نہیں سائیاں" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "حیاتی کتنی سوہنی شئے ہے

سائیاں میں مرویساں تے تاں دریا مسکیوں یاد کریسی کہ کوئی حوصلہ والا انکا میڈی چھاتی دے چڑھ کے نگدا ایا (گاتا تھا) میری مچھیاں پو چھیسن (پوچھیں گی) کہ چھوما جیا ما۔ نجمی کتھاں این جیہڑا اککاریاں نال انہاں کوسڈ دیندا ایا۔ میں بن شکار تے کدے نہیں جانساں سائیں۔ میں کدھے بور دریا دل دیندا پیاباں۔"

اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں، کسی دور کے دیس کی طرف۔ پھر اس پر کھانسی کا ایک سخت دورا پڑا۔ کھانستے کھانستے اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ جھٹ لیٹ گیا۔ اس کی ماں بھاگتی بھاگتی اندر آئی اور اپنے بیٹے سے روتی ہوئی لپٹ گئی۔ او میرے سوہنے لعل۔ او میرے سوہنے پتر"

میں بھاگا بھاگا کورامین لانے گیا لیکن جب میں لوٹا تو سوہنا بہت دور جا چکا تھا۔

اس کی ماں چھاتی پیٹ کر بین کر رہی تھی مگر سوہنا جیسے چپ چاپ سو رہا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ زندگی اور موت کے بڑے پر شور دریا پر تن تنہا مچھلی اور بھلن کا شکار کرنے چلا گیا تھا، میرا ننھا نجمی!۔

محمد خالد اختر

کھویا ہوا افق

وہ سرائے جس میں جاکر میں ٹھہرا، ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے تھی، جو دراصل یاتریوں کے لیے مخصوص تھی۔ میرا کمرہ داخلے کے دروازے کے بائیں جانب اوپر کی منزل پر تھا کمرے کے دروازے پر ایک چھوٹی سی آہنی تختی لگی ہوئی تھی جس پر ایک مربعے میں چند نیک فال بند سے مندرج تھے۔

اگر اندر کا دروازہ اور باہر کا سلاخوں والا دروازہ دونوں کھلے ہوتے تو چڑیا گھر کے کسی پنجرے میں رہنے کا احساس ہوتا اور مجھے تو کئی بار محسوس ہوا کہ اپنی سرخ ٹائی، سبز ہیٹ اور بی۔ اے کی ڈگری کے باوجود میں کوئی بہتر قسم کا لنگور ہوں، جو کھڑکی میں سے نیچے اسٹیشن کے سامنے بیٹھے ہوئے بندروں کو پہچان کر بھائی بندی کے جذبے کے تحت مسکرا رہا ہے۔

صبح ہوتے ہی میں بندروں اور دیوتاؤں کے اس مسکن کو جسے ہردوار کہتے ہیں، کھوجنے کے لئے نکل پڑا۔ میں نے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا اور اپنے سبز فیلٹ کے اگلے گھیرے کو نیچے کھینچ لیا تھا۔

کسی اجنبی جگہ کو دیکھنے اور اس کا بنظر غائر مشاہدہ کرنے کا بہترین طریقہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کی گلیوں، اس کے کوچوں اور بازاروں میں کھو دے۔ میں نے آج تک کبھی کسی جگہ کے قابل دید مقامات کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا۔ ہمیشہ اپنی دریافتوں پر کولمبس کی طرح اچانک اور ناگہانی آنکلتا ہوں اور مجھے اس میں لطف آتا ہے۔

ڈسمبر کے آخری دن تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں اس طرف ہولیا جدھر کو پوڑی ہے۔ خدا کی سیڑھی۔ "ہر" تک لے جانے والا یہ راستہ ایک فراخ سیمنٹ کی بنی ہوئی سڑک ہے دو کانیں بند تھیں مگر بندر جو انسان کے مقابلے میں زیادہ سحر خیز حیوان ہے جاگ رہے تھے اور ہر جگہ موجود تھے۔

خدا معلوم وہ میرے متعلق کیا سوچتے تھے۔ بظاہر ان کے انداز سے ایک برترانہ حقارت سی ٹپکتی تھی۔ غالباً وہ اس شہر کو اپنا شہر سمجھتے تھے اور انسانوں کو غاصب اور ناخواندہ مہمان۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو چھوڑ کر دوسرے حیوانوں سے ان کے مراسم نہایت خوشگوار اور مہذبانہ تھے۔ ایک جگہ میں نے دس بارہ بندروں اور ایک نوعمر سانڈ کو مکمل اتفاق سے کچھ کھاتے ہوئے بھی

دیکھا۔

اپنے بائیں طرف مکانوں سے دور -- بہت دور، میں نے سورج کو چند گلاب کی پہاڑیوں کے اوپر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ ان پہاڑیوں پر زرد لمبی گھاس سونے کی تاروں کی گچھیاں لگتی تھی۔ ایک پہاڑی پر چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے دل میں کہا "یہ ہے وہ رومان، جس کو ڈھونڈنے تم اتنی دور آئے ہو--"

میرے سامنے ایک دیوار پر لکھا تھا---ذب ذب کلوریم----آنکھوں کی ہر بیماری کا واحد علاج---ساتھ ہی بڑے بڑے حروف میں ہمیشہ اور بلاناغہ ناز بیوٹی اور ناز اسنو استعمال کرنے کی ہدایت تھی---اس سے نیچے اردو ادب کی سب سے مشہور تصنیف کا اشتہار تھا-- "ہدایت نامہ خاوند، مصنفہ کو یراج ہرنام داس بی اے۔"

میں لاہور سے اور کئی چیزوں کے علاوہ جس شخص سے بھاگا تھا وہ حضرت کو یراج ہرنام داس بی اے بھی تھے، جو دیواروں پر، مندروں پر، مناروں پر، ہر جگہ اپنے مختلف ہدایت ناموں سمیت موجود ہوتے، اور اب بھی یہاں براجمان تھے۔

سڑک کے خاتمے پر میں پوڑی پر پہنچ گیا۔ اب زندگی اور حرکت کے آثار پیدا ہو رہے تھے وہ مخلوق جو ارتقاء کے مختلف مرحلے طے کر کے بندر سے انسان میں تبدیل ہو چکی تھی اپنے اپنے کاموں پر نکل رہی تھی۔

پوڑی پر ایک بورڈ منتظمین کی طرف سے آویزاں تھا "پوڑی پر سوائے ہندوؤں کے اور کسی غیر مذہب کے آدمی کو جانے کی اجازت نہیں"۔ میں بزدل آدمی ہوں اور اس قسم کے نوٹسوں کا پاس کرنے والا انسان ہوں--- سڑک پر کچھ آگے نکل گیا۔ ایک طرف گدلے پانی کا تالاب تھا، جس میں بھارے جسم کی ایک عورت اپنے کپڑوں اور اپنی عینک سمیت کھڑی بار بار ڈبکیاں لگا رہی تھی روئی کی طرح گول عینک لگا کر بے حد سنجیدہ چہرہ پانی کے اوپر اٹھتا اور پھر نیچے چلا جاتا---- اپنے گمان میں وہ اپنے پچھلے پاپ دھو رہی تھی---اس بے حد متین، سنجیدہ اور عینک لگے چہرے کے ساتھ--!

میں اب ریلوے لائن پر پہنچ گیا اور یہاں واپس پوڑی کی طرف مڑا۔ گنگا کا پاٹ یہاں بہت ہی تنگ ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر بازار اور گھاٹوں کے درمیان ایک دیوار ہے۔ شیشے کے چوکور لال مینوں والی سفید دیوار۔ اس پر بھی ایک نوٹس لگا تھا اور دیوار کے اوپر سے دوسری طرف جھانکنے سے منع کرتا تھا۔ مگر میں طویل قامت انسان ہوں--- پنجوں کے بل کھڑے ہوئے بغیر میں نے ممنوعہ منظر کی ایک جھلک دیکھ لی ••••• لیکن یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ میں نے کیا دیکھا۔

میں نے دل کڑا کیا۔ کسی کو بھلا کیا پتا ہے کہ میں مسلمان ہوں ۔۔۔۔ بازار کی چند پر پیچ گلیاں طے کیں اور گھاٹ پر پہنچ گیا۔ یہ اصلی پوڑی تھی جہاں بھگوان کسی زمانے میں اترے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں پانڈوں کا ہاتھ پکڑ کر انسان اپنے تمام پاپوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

گھاٹ، دھوپ میں چمک رہا تھا ۔۔۔۔ دائیں ہاتھ دو کانیں، جو تشیوں اور جڑی بوٹیاں بیچنے والے ویدوں کے اسٹال تھے اور بائیں ہاتھ گنگا ۔۔۔۔ تیز رو اور بے پروا۔ بڑی تیزی سے اپنے دو ہزار میل لمبے سفر پر سمندر سے ملنے جاری تھی۔

گھاٹ زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی سے پر شور اور پر رنگ تھا۔ غلیظ چائے اور مٹھائیوں کی دو کانیں، خوانچے والے، بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے بیٹھے ہوئے جٹا دھاری سادھو ۔۔۔ آگے بڑھا تو گھاٹ کے فرش پر بیٹھی ہوئی حجاموں کی فوج نے جو یاتریوں کو چھیلنے کے انتظار میں تھی، مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض نے مجھے صاحب بہادر کہہ کر دعوت دی، بعض نے مہاراج، بعض نے راجہ صاحب اور چند نے محض رائے صاحب ۔۔۔۔!

ایک ننھے خوبصورت پل پر سے گذر کر میں چھوٹے گھاٹ پر آیا، جس پر دھوپ میں چند عورتیں اپنے کپڑے اور بال سکھا رہی تھیں اور جٹا دھاری سادھو چھتریوں کے نیچے آسن جمائے آنکھیں سینک رہے تھے اور چند گزرنے والی استریوں سے یقیناً گیان دھیان کی باتیں کر رہے تھے۔

رات کو میں دیر تک سرائے کے کمرے میں لیٹا رہا۔ دس بجے منشی نے بجلی اوف کر دی تھی، لیکن میں دیا جلا کر، اس کی مدھم پیلی روشنی میں ایک بجے تک جاسوسی ناول "الماری کا مردہ" پڑھنے میں مشغول رہا ۔۔۔ یہ جاسوسی ناول بھی کتنی ذہانت اور کاریگری سے لکھے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اس آدمی کے لیے جو کہ فرار چاہتا ہے ۔۔۔۔!

پڑھتے پڑھتے سو گیا ۔۔۔۔ اس کے باوجود کہ میں نے الماری میں سے مردے نکلنے والے کئی خواب دیکھے، میری نیند گہری اور پر سکون تھی۔

دوسرے دن میں رڑکی چلا گیا ۔۔۔۔ صبح اٹھنے پر زندگی مجھے ایک بار سی لگ رہی تھی ۔۔۔ ایک بیزار کن مشغلہ ۔۔۔ زندگی کی خواہش بھی جنسی خواہش کی مانند کبھی چوٹی پر ہوتی ہے، کبھی نشیب میں۔

میں ہر کی پوڑی کی سڑک پر اتر آیا ۔۔۔ سامنے سے ایک لاری آ رہی تھی۔ اس میں بیٹھ گیا ۔۔۔ سفر بے حد طویل اور اکتا دینے والا ثابت ہوا۔ لاری بہادر پور کے گاؤں پر پندرہ منٹ کے لیے رکی۔ یہ گاؤں چند دو کانوں پر مشتمل تھا۔ ایک دکان پر میلے سے بورڈ پر غلام قادر باربر لکھا ہوا تھا۔ نیچے قینچیوں، استروں اور صابونوں کی ہاتھ سے کھینچی ہوئی میڑھی میڑھی تصویریں تھیں۔ میں نے سوچا یہ حجامت کرانے کا بہت ہی نادر موقع ہے۔ لاری ڈرائیور سے کہہ کر میں غلام قادر باربر کی

دوکان میں داخل ہوا۔ اس اچھے آدمی نے اس خلق اور کشادہ پیشانی سے میرا استقبال کیا جیسے میں اس کا ماں جایا بھائی ہوں۔

شیو کراتے ہوئے میں نے اس کو بار بر کے بجائے بالبر لکھنے کی غلطی بتائی۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا "جی نہیں۔۔۔ اصل میں بالبر ہی صحیح ہے بار بر غلط ہے۔ بالبر بال سے بنا ہے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اسے بگاڑ کر بار بر کر دیا ہے"۔ میں نے اس دلیل کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا

کچھ دیر رڑکی میں بے مقصد آوارہ پھرتا رہا۔ پھر لاری میں واپس ہردوار لوٹ آیا۔ بہادر پور کچھ دیر کے لئے رکے۔ غلام قادر بالبر کی پروقار ہستی دوکان کے باہر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے ہاتھ ہلایا، اس پر اس نے دھیان نہ دیا۔

رات کو میں ہردوار کے واحد سنیما "گنگا ٹاکیز" میں فلم "موجی جیون" دیکھنے گیا اشتہاروں کی پہلی سلائیڈ نمودار ہوئی۔ ہدایت نامہ خاوند۔ مصنفہ کو یراج ہر نام دس بی۔اے۔۔۔۔ میرے خدا۔۔۔یہ حضرت یہاں بھی موجود تھے۔

پکچر کا انجام نہیر ہوا تو میں اداسی سے منہ لٹکائے واپس اپنے سرائے کے پنجرے کو لوٹا۔۔۔۔ اسٹیشن کے سامنے سے گذرتے وقت سیڑھیوں پر ایک دم فراخ مسکراہٹ سے میری مڈبھیڑ ہوئی۔۔۔۔ سیاہ اچکن اور سفید طرے دار پگڑی میں ایک بہت ہی فراخ مسکراہٹ۔۔۔یہ "ٹ" تھا۔۔۔ پر "ٹ" یہاں کہاں؟

اس اچانک مڈبھیڑ کا اثر کچھ دور ہوا تو میں نے "ٹ" سے پوچھا "مجھے یوں تمہارے یہاں آنکلنے کا وہم و گمان بھی نہ تھا"۔

"ٹ" مسکرا دیا۔۔۔۔۔ وہی فراخ مسکراہٹ

"تم آئے کیوں؟"

وہی فراخ مسکراہٹ پھر "چلو آؤ چائے پئیں۔۔۔ میں بھوکا ہوں!"

ہم ریلوے اسٹیشن کے ڈائننگ روم میں جا بیٹھے۔"ٹ" نے چائے اور توسوں کا آرڈر دیا اور بھویں اٹھا کر گویا میرا وزن کرتے ہوئے کہا "تو یہاں تم رومان تلاش کر رہے ہو۔۔۔ کوئی ملا بھی؟"۔

میں نے جواب دیا "پالیا ہے صرف دم کی کسر باقی ہے"۔

ایک فراخ مسکراہٹ کے بعد "سچ؟"

"سچ!۔۔۔۔۔۔یہ بتاؤ تم کب آئے؟"

"چھ بجے کی گاڑی۔۔۔۔ سیدھا سرائے گیا۔۔۔ بڑی مشکلوں سے پتا چلا کہ تم وہیں ہو

----اپنا صحیح نام تم نے کیوں درج نہ کرایا"۔

"اوہ ---- میں اس کے متعلق لکھنا بھول ہی گیا ---- بات یہ ہے کہ میں اپنی خودی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں ---ہر پرانی چیز انسان کو ماضی کی طرف کھینچتی ہے"۔

"ٹ" نے چائے پیالی میں انڈیلی" تم اپنے آپ سے بھاگنا چاہتے ہو --- کیا فی الواقع ایسا ممکن ہے؟

"میرا خیال ہے --- اگر انسان اس کا فی الواقع متمنی ہو"۔

چائے خلاف معمول بہت اچھی تھی۔

"ٹ" نے پوچھا" تم یوں ایکا ایکی کیوں اٹھ بھاگے؟"۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "ٹ" تمہیں یاد ہو گا۔ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو میں نے ایک نظم لکھی تھی ---- ایک چھوٹی سی، احمقانہ، ناپختہ، اور بے جوڑ سی چیز۔ آؤ نکل چلیں ------ آؤ بھاگ چلیں ہمار ایہاں سانس گھٹتا ہے ---- تم میرا مذاق اڑایا کرتے تھے ---- مگر "ٹ" میں سچ کہتا ہوں، انگریزی ضرب المثل کے مطابق یہ میرے جذبات آنے والے حادثات کا پیش خیمہ تھے ----- میں یہاں کیوں بھاگ آیا ہوں ---- اس کی وجہ سمجھنے میں اب تمہیں کوئی زیادہ وقت نہ ہونی چاہیئے۔"

"ٹ" بولا" زندگی کو سنوارنا چاہیے نہ کہ بگاڑنا۔" میں نے کہا" تم زندگی کا سنوارنا کسے کہتے ہو --- یہ کہ میں امتحان پاس کر لوں۔ ایک محفوظ مگر بے روح ملازمت حاصل کر لوں۔ ایک بے وقوف باتونی عورت اپنی یا میری موت تک میری زندگی کے ساتھ چپک جائے ----- یہ رسمی رواجی زندگی معاف کرنا ایک تیندوہ ہے جو انسان کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتی ہے ---- بھئی میں زندگی کے فلسفے میں اسٹیونسن کا چیلا ہوں --- میں تو ایک سیلانی آوارہ گرد کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں اور سیلانی آوارہ گردی کی طرح سڑک کے کنارے چلتا چلتا جھاڑی کی اوٹ میں اس خوبصورت زندگی کو الوداع کہوں گا۔"

"ٹ" نے میری بات سن کر صرف اس قدر کہا" میں تمہیں لینے آیا ہوں اور تمہیں چلنا ہو گا"۔

اس کے لہجے میں بلا کا تیقن تھا۔ میں نے ہولے سے کہا" اچھا"

"ٹ" کی آمد سے رومان ہمیشہ یوں ہی ختم ہو جایا کرتا تھا ---- واپس جانا پڑتا تھا --- واپس اسی دنیا میں --

دوسرے دن "ٹ" اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سرائے سے باہر نکلے۔ پہلے ڈاکخانے گئے پھر اسپورٹس کا سامان بیچنے والی دوکان میں "ٹ" کو ڈمبل اور سینے کو کشادہ کرنے والے اسپرنگوں کو دیکھنے اور آزمانے کا خبط ہے۔ اس کے بعد "ٹ" کا پروگرام کنگنوں اور چوڑیوں کی دوکان پر

جانے کا تھا۔ اس نے کہا کہ چوڑی گری ہردوار کی خاص صنعت ہے، حالانکہ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ہردوار کی صنعت صرف روحانیت ہے۔۔۔۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی اور صنعت پنپ ہی نہیں سکتی۔

"ٹ" عجیب و غریب آدمی ہے بہت ہی خوش کلام۔ سوکھے سے سوکھے موضوع پر ہری بھری گفتگو کر سکتا ہے۔ ہر چیز سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ڈمبلوں اور سینہ کشادہ کرنے والے اسپرنگوں سے لے کر ریشمی اور سوتی کپڑوں تک۔ کپڑوں کی حس اس میں بہت تیکھی ہے۔ چنانچہ اس نے ہردوار کے تمام بزازوں کو اپنی اس حس کا شکار بنایا۔ ایک گرہ کپڑا نہ لیا، لیکن تعجب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا چہرہ بیسیوں تھان کھولنے پر بھی ہشاش بشاش رہا۔

کچھ وقت یوں گزار کر ہم گھاٹ پر نکل آئے۔ سورج کی چمکیلی روشنی میں گھاٹ اپنی جملہ رنگینیوں سمیت پورے جوبن پر تھا۔ تصویروں کا ایک جھرمٹ تھا جو کھلے آسمان تلے کھل رہا تھا میں اور "ٹ" دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پاٹ شالوں، اسٹالوں، سادھوؤں اور حاموں کے پاس سے گزرتے ہوئے سفید پل پر آئے جو اس گھاٹ کو برلا ماور والے گھاٹ سے ملاتا ہے۔ "ٹ" ہر چیز میں دلچسپی لے رہا تھا۔ بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے بھبھوت ملے سادھو، تلک لگانے والے پانڈو ڈبکیاں لگانے والے یاتری۔۔۔ ہر ایک میں "ٹ" کے لئے دلچسپی کا سامان موجود تھا اور میرا "ٹ" کو گردوپیش کی چیزوں سے متعارف کرانے اور ان کو دکھانے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں اپنی جاگیر پر اپنے کسی دوست کو ادھر ادھر پھرا رہا ہوں۔

کچھ دیر گھومنے کے بعد ہم سڑک پر جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھے تو راستے میں ہمیں ایک عجیب و غریب عورت ملی۔

میں یہاں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک جو کچھ میں نے لکھا دراصل اسی عجیب و غریب عورت کے لئے لکھا۔۔۔۔ کہ میں اس سے ملا۔۔۔۔ میں نے اسے دیکھا۔۔۔۔ میں نے اسے محسوس کیا۔۔۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو گھاٹ پر بھیک مانگ کر پیٹ بھرتی اور تن ڈھانکتی ہیں۔۔۔ لیکن وہ ان سے بے حد مختلف تھی، اس لئے کہ وہ عورت تھی، لیکن اس کا ایک ایک خط و خال کہتا تھا کہ وہ عورت سے یا تو بہت زیادہ ہے، یا بہت کم۔۔۔۔۔ لیکن یہ کمی بھی بہت گہری تھی یعنی کہ اگر تھی۔

اس کی آنکھیں صاف اور بے باک تھیں۔۔۔ لیکن اس بے باکی میں دور، بہت ہی دور ایک بہت ہی بھولی نگاہ جیسے پڑے پڑے گرد آلود ہو گئی تھی۔۔۔۔ نچلا ہونٹ کچھ عجیب مزاحیہ انداز میں نیچے لٹکا ہوا تھا۔۔۔ اس کے دونوں ہونٹ آپس میں کبھی نہیں ملتے تھے، شاید اس خوف سے کہ اگر ملے تو ایک دوسرے سے چپک جائیں۔

اس کا سراپا مل جل کر، سر کشی، یا گستاخی اور ایک جلتی ہوئی خواہش یا جلی ہوئی خواہش کا تاثر تھا۔

مجھے معلوم نہیں میرے ان الفاظ کا مطلب بھی ہے یا نہیں ۔۔۔۔ وہ ایک جلی ہوئی عورت تھی جس کے بل ابھی تک نہیں گئے تھے۔

پل پر ہمارے سامنے آتے ہی اس نے عجیب مزاحیہ انداز میں کہا "آؤ باتیں کریں ۔۔ وہاں اس گھاٹ پر گنگامائی کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں"۔

"باتیں کریں" "ٹ" نے اپنے ہونٹوں پر وہ خاص مسکراہٹ پیدا کی جو وہ عورتوں کے دل جیتنے کے لئے استعمال کیا کرتا ہے ۔۔۔ یہ مسکراہٹ بے حد میٹھی اور چمکیلی مسکراہٹ ہوتی ہے جس میں ایک دلگیر بانکے کا احساس تنہائی صاف پڑھا جا سکتا ہے۔

"ٹ" مکمل ترین پیشہ ور عاشق ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس عورت کے لئے اس نے یہ حربہ کیوں استعمال کیا۔ لیکن میں نے سوچا کہ عورت کوئی بھی ہو، اس کے اندر جذبہ۔ ترحم کو متحرک کرنا شاید ضروری ہوتا ہے۔

"ٹ" نے پھر اس سے بڑی ملائی سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟"

وہ عورت خلا میں دیکھتی ہوئی بولی "میرا نام؟ ۔۔۔ میرے تو بہت سے نام ہیں ۔۔۔ جانکی بائی ۔ سینہ پربھا ۔ دھرتی ماتا ۔ سیتا ۔ مدر انڈیا"۔

لب دہان، ایسا جیسا بچے کا ہو، مگر قبل از وقت بڑا ہو گیا ہو ۔۔۔ صاف اور بے لاگ آنکھوں میں ایک ناقابل بیان یاس تھی ۔۔۔۔ ایک کھوئی ہوئی روشنی۔

"ٹ" نے دلچسپی لیتے ہوئے صرف اس قدر کہا "خوب"

اس عورت نے جس کے اتنے سارے نام تھے، دریا کی جھلملاتی ہوئی وسعت کی سمت اپنے نیلے بھورے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "آؤ نا، وہاں گنگامائی کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔"

"ٹ" بولا "ہمیں بیٹھ جاتے ہیں ۔۔ باتیں ہی ہیا کہیں کر لیں ۔۔۔ کیوں؟"

"اچھا"

وہ مان گئی۔ ہم تینوں پل کے فرش پر منڈیر کے پاس بیٹھ گئے ۔۔۔ "ٹ" میں اور اس عورت کے علاوہ بیسیوں قسم کے ملنگ، یاتری، سادھو، پانڈے، لچے لفنگے اس پل پر سے گزر رہے تھے۔ ان میں اکثر متجسس نگاہوں سے ہمیں دیکھتے ۔ غالباً سوچتے تھے کہ ہم گھاٹ کی اس عورت کے ساتھ بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔

منڈیر کے نیچے پوتر تالاب تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ ڈبکی لگانے کے بعد جس وقت انسانی مینڈکیاں باہر نکلتیں تو پہلے سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز اور غلیظ دکھائی دیتیں ۔ تعجب

ہے کہ وہ پانی جو انکے جسم کی غلاظت دور نہیں کرتا تھا، کیونکہ انکی روح کو مصفی کر دیتا تھا۔
تقریباً تین ساڑھے تین فٹ گہرے پانی میں چھ سات لڑکیاں اور عورتیں اپنی ساڑھیوں اور دھوتیوں سمیت کھڑی ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ جب باہر ابھرتیں تو ایک عجیب انداز سے مسکراتیں ۔۔۔۔ ان کے جسم کے تمام تر خد و خال ۔۔۔۔ تمام ابھار اور خم ۔۔۔۔۔ تمام راز اور اسرار جامے سے باہر تھے ۔۔۔ "ٹ" بہت ہی پر سکون مبصر ہے۔ وہ اس نظارے کو بھی دیکھ رہا تھا اور گھاٹ کی اس بھکارن کی طرف بھی متوجہ تھا۔ چنانچہ جب اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب سے ریڈ لیمپ سگرٹوں کا پیکٹ نکالا اور ہماری طرف بڑھایا تو "ٹ" نے شکریہ ادا کر کے ایک سگریٹ لیا۔
اس عورت نے ہم سب کے سگریٹ سلگائے، ایک اپنے لیے سلگایا۔ پھر باتیں شروع ہو گئیں۔
"ٹ" نے پوچھا "آپ کون ہیں ۔۔۔۔ کیا کرتی ہیں؟"
عورت نے جواب دیا "تم نے پریم ادیب کا نام نہیں سنا ۔۔۔۔ اس نے ہمارے ساتھ بیوفائی کیا۔ ہم ادھر اس کے سنگ پھلم کمپنی میں ہیروئن کا پارٹ کرتے تھے۔ اس نے ہمارے ساتھ شادی کا وعدہ کیا ۔۔۔۔ پر وہ ایک عورت لے آیا ۔۔۔ ہم یہاں گنگا مائی کے چرنوں میں جیون بتانے کے لئے آ گئے"۔
"ٹ" نے میری طرف دیکھا۔ ایک صرف فلموں سے اس کی کوئی دلچسپی نہیں، میں نے اس کو بتایا پریم ادیب ایک ایکٹر ہے، کافی مشہور ایکٹر ہے۔
"ٹ" نے اس عورت سے پوچھا "ادھر فلم میں آپ کا نام کیا تھا؟"
اس نے فوراً ہی جواب دیا "سبھانا سمرتھ"
ظاہر ہے کہ وہ سوبھنا سمرتھ نہیں تھی۔ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا "ہرگز نہیں ۔۔۔۔ "ٹ" یہ جھوٹ کہتی ہے"۔
مایوسی کا بہت ہی گہرا سایہ اس عورت کے چہرے پر پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد گزر گیا ۔۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں نے اس کی خود فریبی کے آئینے کو ٹھیس پہنچائی۔
وہ اصرار کرنے لگی "نہیں ۔۔۔۔ میں سبھانا سمرتھ ہوں ۔۔۔۔ میں ہی سبھانا سمرتھ ہوں ۔۔۔ سبھانا سمرتھ ہی تو ہوں ۔۔۔۔ سبھانا سمرتھ!"
اس تکرار سے وہ مجھے نہیں، دراصل خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ سبھانا سمرتھ ہے ۔۔۔۔۔ میں جھوٹا ہوں اور وہ سچی ہے ۔۔۔۔۔ اپنے کو مزید یقین دلانے کی خاطر اس نے ایک فلمی گیت دھیمے دھیمے سروں میں گانا شروع کیا۔ آواز میں فن نہیں تھا، لیکن درد

موجود تھا۔

"ٹ" نے پوچھا آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

اس نے جواب دیا "ہم ۔۔۔۔ہم امرتسر کے رہنے والے ہیں"

"اوہ۔۔۔۔آپ کا نام"

"ٹ" نے جواب دیا "رام چندر!" ۔۔۔۔ ہونٹوں پر وہی فراخ مسکراہٹ تھی۔

عورت نے "ٹ" کی طرف غور سے دیکھا "تمہاری شکل بھی رام کی سی ہے"۔ مجھ سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا "تمہارا نام"

"میرا۔۔۔۔مرلی دھر" مجھے کبھی کوئی رومانی نام نہیں سوجھا۔

عورت مسکرائی "تمہارے ہاتھ میں مرلی تو ہے نہیں"۔

میں جھینپ گیا۔۔۔۔ مگر ہر دوار میں جہاں ہر اترے تھے، گلابی فضاء میں ریڈ لیمپ کا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے، مجھے ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ رومان میری زندگی کے کندھوں سے چھو گیا ہے۔۔۔۔۔ میرا نہیں کسی اور کا ۔۔۔۔ پر جانا پہچانا ہوا۔

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ نیچے تالاب میں عورتیں اپنے گناہ دھوتی رہیں۔ کبھی کبھی "ٹ" کی نگاہ اس طرف اٹھ جاتی تھی۔ دفعتاً جانکی یا سبھاما انتہائی طیش میں اٹھی اور پل کی منڈیر کے پاس جاکر اس نے نہانے والیوں کو ایسی ایسی ننگی گالیاں دیں کہ وہ بوکھلا کر اپنے پاپ دھونے چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔ جب وہ "ٹ" کے پاس آکر بیٹھی تو اس نے اس سے پوچھا "تم نے بھگا کیوں دیا ان کو"

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ خلا میں چند منٹ دیکھ کر اپنی آنکھوں میں سے غصے کا میل صاف کر کے وہ "ٹ" سے مخاطب ہوئی۔ ہمیں ایک کمبل لے دو رام ۔۔۔رات کو بہت ٹھنڈ لگتی ہے۔"

مجھے حیرت ہے "ٹ" نے بڑے روکھے انداز میں اس سے کہا "ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

عورت نے بڑے بھول پنے سے کہا "ہمیں لے دو گے کمبل؟"

"ٹ" نے پھر اسی روکھے انداز میں جواب دیا "نہیں" لیکن فوراً ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ "آپ ہمارے ساتھ چلئے ۔۔۔یہاں گھاٹ پر کیا پڑا ہے ۔۔۔۔ہم تینوں اکٹھے رہیں گے ۔۔۔اچھا؟"

"میں ۔۔۔ میں کہاں رہوں گی؟"

"جہاں ہم دونوں رہیں گے ۔۔۔ہمارے ساتھ"

عورت کی آنکھوں میں وہ جو "دور" "بہت ہی دور ایک گرد آلود سی چیز تھی روشن ہوئی ۔۔۔

اور پھر یہی چیز دو موٹے موٹے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئی ۔۔۔۔۔ ممنون و متشکر لہجے میں اس نے کہا" رام بھی ایسے ہی تھے "۔

یہ کہہ کر وہ خلا میں گھورنے لگی ۔۔۔۔ " ٹ " نے پوچھا" کیسے ؟"

" آپ جیسے ۔۔۔۔ بالکل آپ جیسے ۔۔۔۔ آپ ہی کی طرح سندر اور بھگت " خلا میں گڑی ہوئی نگاہیں " ٹ " کی طرف پھیر کر اس نے بچوں کی طرح کہا" تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے ؟"

" ٹ " نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا" یہ کیسے لگتے ہیں تمہیں ؟"

عورت نے بڑے وثوق سے جواب دیا" یہ ۔۔۔۔۔ یہ لکشمن ہیں ۔۔۔۔ لکشمن " کہاں میں اور کہاں پر سکون رام کا البیلا، جان پر کھیل جانے والا بھائی لکشمن، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لکشمن کی شان میں مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے ۔

" ٹ " نے پھر بڑے پیار سے عورت سے پوچھا" آپ کون ہیں ؟"

عورت پھر اسی وثوق سے بولی " میں ۔۔۔۔ سیتے ۔۔۔۔ میں سیتے ہوں "

" ٹ " کے لہجے میں فرزندانہ ساجذبہ پیدا ہو گیا" سیتے نہیں ۔۔۔ کوشلیا ۔۔۔ رام لکشمن کی ماں کوشلیا! "

" سیتے نہیں ؟ " اس کے لہجے میں انتہائی استعجاب تھا ۔۔۔۔۔ اس بچے کا استعجاب جس کے یقین کامل کو یہ کہہ کر بدلنے کی کوشش کی جائے " بھاپو نہیں ماموں " اور وہ منہ کھولے کہے "ماموں ؟ "۔

" ٹ " نے قطعیت کے ساتھ کہا" نہیں "۔

" نہیں " اور اس کئی ناموں والی عورت کی آنکھوں سے کئی آنسو چھلک پڑے۔

" ٹ " کا لہجہ فوراً ہی بے حد ملائم ہو گیا" تم ہمارے ساتھ چلو ۔۔۔ ہم تمہیں اپنی ماں کی طرح چاہیں گے ۔۔۔ تمہاری سیوا کریں گے ۔۔۔۔ ہم تمہیں اپنے محبت بھرے دل دیں گے "!

" دل ؟ " اس عورت کی آنکھیں کھل کر ڈراؤنی سی ہو گئیں ۔۔ " دل ؟ کہاں ہے دل ۔۔۔؟ لاؤ کہاں ہے تمہارا محبت بھرا دل ؟ " اس نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں والا ہاتھ یوں بڑھایا، جیسے وہ " ٹ " کا دل نوچ کر باہر نکال لے گی ۔۔۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا " ماں سے محبت نہیں ہو سکتی ۔۔۔ محبت استری سے ہوتی ہے ۔ شیو کی پاربتی سے، شام کی رادھے سے، رام کی سیتے سے ۔۔۔۔ میں تمہاری سیتے ہوں ۔ میں تم سے اسی طرح محبت کیا کروں گی جس طرح سیتے رام سے کیا کرتی تھی ۔ "

" ٹ " اور میں دونوں سمجھ گئے تھے کہ یہ عورت محبت کی بھوکی ہے ۔۔۔۔ اور بھی زیادہ بھوکی ہے ۔ اس لیے کہ اس کے آگے ایک بار ٹکڑے ڈال کر ہٹالیے گئے ہیں ۔ وہ بھیک مانگ رہی

تھی ۔ ایک حفاظت کرنے والے پچکارنے والے مضبوط ہاتھ کی ۔۔۔ اور "ٹ" اس سے ممتا طلب کر رہا تھا جو وہ اپنے وجود میں کسی اور کے لئے محفوظ رکھنا چاہتی تھی ۔۔۔ اس نئے جیو کے لئے جس کی دھندلی دھندلی تصویریں وہ ہزاروں بار اپنی کوکھ میں بنا اور مٹا چکی ہوگی ۔

"ٹ" نے بڑی بے جگری کے ساتھ اس سے کہا "نہیں بیتے نہیں" ۔

عورت مایوس ہو گئی اور خلا میں دیکھنے لگی، جہاں شاید اس کا رام کھو گیا تھا ۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک تازہ کوشش کی ۔۔۔۔۔۔ "ٹ" سے مخاطب ہو کر اس نے بڑے ہی دل کو موم کر دینے والے لہجے میں کہنا شروع کیا "تیرہ سال سے گنگا مائی کے چرنوں میں پڑی راہ دیکھ رہی ہوں ۔۔۔۔۔ میرا رام ایک دن آئے گا، ضرور آئے گا" پھر اس نے ہولے سے کہا "گنگا مائی نے مجھے وچن دیا تھا ۔۔۔۔۔ پانی کی بوندوں نے میرے کان میں بتایا تھا" جانکی چنتا نہ کر تیرا رام ضرور آئے گا" اس کی آواز بلند ہو گئی "سو آج میرا رام آگیا ۔۔۔۔ میں نے کل رات جاڑے میں کانپتے کانپتے ایک سپنا بھی دیکھا تھا ۔" جیسے اس نے آنکھیں بند کر کے خواب کو یاد کیا "جیسے رام اور لکشمن دونوں میرے دوارے بھوکے اور پیاسے آئے ہیں ۔۔۔۔۔ رام تمہاری شکل کے تھے اور لکشمن ان کی شکل میں ۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا اور "ٹ" کی طرف بھیک مانگنے والی آنکھوں سے دیکھا ۔ مگر اسے خواب کا جواب نہ ملا ۔

بے حد مایوس ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جس طرح ایک سایہ چلتا ہے وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اتر کر روانہ ہو گئی، اور تھوڑی دیر بعد گھاٹ کے ان گنت روشنی کے دھبوں میں گم ہو گئی ۔

میں سوچ رہا تھا کہ کئی نئاموں والی عورت جو تیرہ سال سے گنگا مائی کے چرنوں میں اپنے رام کا انتظار کر رہی ہے، شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی سے چلی گئی ہے ۔۔۔ اور میں رام کا کردار اپنے کردار میں سمو تا رہ گیا ہوں ۔۔۔۔۔ انسان بھی کس قدر کمزور، کس قدر عاجز اور کس قدر قابل رحم حد تک بیوقوف ہے ۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت کب تک اپنے موہوم رام کا انتظار کرتی رہے گی؟ ۔۔۔ کب تک یونہی محبت کی بھیک مانگتی رہے گی؟ کب تک؟ ۔۔۔۔ ایک روز یونہی خلا میں دیکھتی دیکھتی مر جائے گی ۔

کیا دوسرے جیون میں اپنے رام کو پالے گی؟ ۔۔۔۔ کون جانے؟

میں نے سوچا اس عورت نے چوریاں کی ہوں گی اور یقیناً پانڈوؤں، سادھوؤں اور حجاموں کے مکر وہ بازوؤں میں بھی لیٹی ہوگی ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ عورت جس کے بہت سے نام تھے اور جس کی روح گنگا جل سے کہیں زیادہ پوتر تھی ۔

محمد خالد اختر

لالٹین

میرے خسر مستری مہتاب دین کا نام تم نے سنا ہو گا •••• اس لیے نہیں کہ وہ حکومت کا کوئی وزیر ہے یا کسی فلم کا ڈائرکٹر ہے، کسی جماعت کا لیڈر ہے، وہ تو ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے "ہے" کی جگہ پر "تھا" کہنا چاہیئے تھا۔ اس لیے کہ پچھلے مہینے کی پندرہ کو جمعہ کے مبارک روز شام کے پانچ بجے، مستری موصوف کے فانی اور مستعار حصے کو میری آنکھوں کے سامنے سائیں ڈورے شاہ کے گورستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے غیر فانی اور دائمی حصے کے متعلق، جس کو اصطلاح عام میں روح کہا جاتا ہے، میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ کہاں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر مجھے بالکل کوئی تعجب نہیں ہو گا اگر وہ حصہ سیدھا بہشت میں گیا ہو۔ مستری مہتاب دین ان بے ضرر، محنتی، غیر دلچسپ انسانی روبوٹوں میں سے تھا جو عمداً گناہ کرنے کے اتنے ہی نااہل ہوتے ہیں جتنے نیکی کے ایک مثبت عمل کے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اپنی بیوی کا وفادار تھا، ایک مہربان اور منصف باپ تھا اور پانچوں نمازیں بلا ناغہ ادا کرتا تھا۔ مختصراً وہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو سیدھے بہشت میں جاتے ہیں (اگر تم بہشت کی قسم کی چیزوں میں یقین رکھتے ہو تو!)۔ ہاں، اگر تم نے (غالباً) اس کا نام سنا ہو گا تو حال میں، اخباروں میں، ایک خوفناک حادثے کے ضمن میں، جس میں ۔۔۔ مگر شاید تم نے نہیں سنا اور مجھے تمہاری خاطر یہ کہانی خراب نہیں کرنی چاہیئے۔

مستری مہتاب دین سے میری واقفیت تین چار سال سے تھی ۔۔۔ اس وقت سے جب میں پہلے پہل اپنے مربی اور مہربان خان بہادر سخاوت علی کے توسط سے مل رائٹ شاپ میں بطور ایک غیر تربیت یافتہ مزدور بھرتی ہوا اور مستری کے ساتھ کام سیکھنے پر لگا دیا گیا۔ انسانیت کو کئی ایک لحاظ سے کئی ایک اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے ۔۔۔ زندہ دل اور مردہ دل ۔۔ باتونی اور چپ وغیرہ وغیرہ، اور میں نے بھی ایک تقسیم کا سوچا ہے جو اپنے طور پر اتنی ہی اچھی ہے جتنی کوئی اور۔ مجھ سے پوچھو تو دنیا میں دو قسم کے آدمی بس رہے ہیں ۔۔۔ ایک وہ جو مستری ہیں اور دوسرے وہ جو مستری نہیں ہیں۔ کم از کم میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ مستریوں اور غیر مستریوں میں نفسیاتی لحاظ سے جو تفاوت کی خلیج ہے وہ کبھی پاٹی نہیں جا سکتی۔ میں نے کئی ایک مستریوں کے تحت کام کیا ہے، ایک دو سے میرے دوستانہ مراسم یہاں تک بڑھے ہوئے ہیں کہ میں ان کو ان کے نام سے بلاتا ہوں۔ اس لیے ان کے متعلق میری رائے ایک ایسے آدمی کی رائے ہے جو "جانتا" ہے۔ میں یہ اقرار کرنے کو تیار ہوں کہ وہ سب قابل قدر آدمی ہوتے ہیں۔

اور پنسل اور پیمانے کے ایسے ایسے عجائبات کر سکتے ہیں جو کم از کم میرے لئے تو حیران کن اور قابل رشک ہیں مگر وہ "مستریانہ" فضیلت، وہ خاموش برتری کا انداز جس سے وہ باقی انسانیت سے ایک الگ اور ممتاز حیثیت کا دعویٰ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، ایک ایسی خصوصیت ہے جو خالص مستریانہ ہے ۔ یہ نہیں کہ ان کا اس "احساس برتری" میں کچھ اپنا قصور ہے ۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر کل تم خود مستری بن جاؤ تو تم بھی اس برگزیدہ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت میں کچھ الگ سی، کچھ سنجیدہ سی اور کچھ پدرانہ سی شفقت کی نمائش کرنے کی کوشش کرو گے ۔ پرانی روایات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور میں خود جس دن سے مستری بنا ہوں بے حد متین اور اتنا ذمہ دار ہو گیا ہوں جیسے ایک دم میری زندگی کے دس مزید سال گزر گئے ہوں ۔ مستری بننے سے پہلے میں زور زور سے ہنسنے کے لیے مشہور تھا ۔ اب میں صرف مسکراتا ہوں اور مستری اور غیر مستری میں یہی ایک نمایاں فرق ہے ۔ مگر یہ سب بحث غیر ضروری ہے اور اس تاریخ سے اس کا چنداں تعلق بھی نہیں ۔ پھر بھی اس سے تم کو میرے مرحوم خسر کے کردار کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنی جماعت کا ایک مکمل نمائندہ تھا ۔

مہتاب دین مل رائٹ شاپ میں ہیڈ مستری تھا ۔۔۔ بھاری گٹھا ہوا جسم ۔۔ کندھوں سے کچھ آگے کو جھکا ہوا ۔ چھوٹی مہین آنکھوں پر عینک لگی ہوئی ۔ تنگ ماتھے پر گہری مستقل لکیریں ہٹلر کی سی تراش کی مونچھیں ۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے وہ اپنی جماعت کا ایک صحیح نمونہ تھا ۔ اس جیسے دس ہزار اور ہوں گے ۔ ورکشاپ کے بیس برس اور ایک محنتی، دقت طلب عادت کی بدولت اس نے اپنے کام میں ایک حقیقی قابلیت اور مہارت حاصل کر لی تھی ۔ سکھ چارج مین کو چھوڑ کر وہ شاپ میں سب سے زیادہ اہم اور معتبر آدمی تھا ۔ ایک طرح اسی کی وجہ سے شاپ کی سوراخ کرنے اور کاٹنے والی مشینیں سارا سارا دن گھر گھراتی رہتی تھیں ۔ اسی کے بنائے ہوئے ماپ کے پورے دائروں میں وہ سوراخ کرتی تھیں اور اسی کی کھنچی ہوئی سطروں پر وہ کاٹتی تھیں ۔ یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ اگر وہ کسی دن نہ آسکتا تو شاپ کے کام کی کیا حالت ہوتی ۔ غالباً شاپ کی آدھی مشینوں کو بیکار رکا رہنا پڑتا ۔ مگر مہتاب دین سورج کی طرح پابند اور گھڑی کی طرح باقاعدہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ نہ تو کبھی بیمار ہوا اور نہ ہی کسی اور وجہ نے کبھی اسے اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر کیا ۔

پہلے پہل مجھے اس کے ساتھ ہی کام پر لگایا گیا اور یہ اس کی بردباری اور تحمل کی دلیل ہے کہ جتنا عرصہ میں نے اس کے ساتھ کام کیا اس نے کبھی میرے ساتھ غصے یا خفگی کا اظہار نہیں کیا ۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کے لیے زیادہ کارآمد نہ تھا ۔ کئی کاموں کو میں نے بگاڑا ہو گا ۔ میں نیا آدمی تھا اور اپنے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا ۔ مجھے غلط فہمی تھی کہ خدا نے مجھ کو مختلف اور بہتر چیزوں کے لیے پیدا کیا ہے اور ہمیشہ میرے دماغ میں سنیما کا ایکٹر یا کتابوں کا مصنف بننے کی

خواہشیں لبی رہتی تھیں۔ اندریں حالات کام میں دلچسپی خاک لیتا۔ میری بجائے شاید ایک گوریلا مستری کا زیادہ معاون اور مددگار ہو سکتا۔ شروع شروع میں مستری اور میرے تعلقات میں کچھ کھنچاؤ اور دوری سی رہی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ایک مستری (اور پھر ہیڈ مستری) اور ایک معمولی ورکر میں اصل دوستی ہے ہی ناممکن۔ دوسرے میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ایسا ہی محسوس کرتا جیسا کہ ایک کند ذہن لڑکا اپنے سکول ماسٹر کے سامنے۔ کبھی کبھی میں مستری کو ادھر ادھر کی باتوں سے ہنسانے کی کوشش کرتا لیکن اگر کبھی وہ مجھے ممنون کرنے کے خیال سے مسکراتا بھی تو بڑی برتری اور دوری کے انداز میں۔ میرا مطلب ہے کہ مستری اور میں کبھی "لنگوٹیئے" نہیں بن سکے۔ ان آخری دنوں میں بھی نہیں۔ اگرچہ اس نے کبھی کسی لفظ یا اشارے سے مجھ پر اس قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا پھر بھی میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مستری مہتاب دین میری پیشہ ورانہ نااہلیت کو اور ہر بات میں میری سنجیدگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر مستری اس قدر نیک دل اور متحمل نہ ہوتا تو خان بہادر کے مربیانہ رسوخ کے باوجود میں شاپ سے کبھی کا بغیر نوٹس کے نکالا جا چکا ہوتا۔ اس صورت میں اب غالباً میرا خسر کوئی اور ہوتا۔

میں اور مستری مہتاب دین ایک ہی گلی میں رہتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم ہمسائے تھے۔ تم نے وہ گلی ضرور دیکھی ہوگی جو ہوٹل ڈی ریولی کی بغل میں سے ہوتی ہوئی لنڈے بازار میں مسجد شہید گنج کے سامنے آنکلتی ہے اور تم نے اس طرح جاتے ہوئے اپنے بائیں کو ان سیاہ اور مایوس کن بالاخانوں کی قطار بھی دیکھی ہوگی جن کی لکڑی کی عجیب منقش بالکنیوں پر ہمیشہ غلیظ اور دبیز پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس قسم کے بالاخانے تم کسی وقت ریلوے روڈ یا کسی اور روڈ پر بھی دیکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ علم نہیں کہ ان کو کس نے ایجاد کیا۔ کون ان کا پہلا نقشہ گر تھا۔ مگر وہ جو ایک دائمی اور مستقل انحطاط کی حالت ان پر چھائی رہتی ہے میرے لیے ان کو رومانس کی چیزیں بنا دیتی ہے۔ تم نے گذرتے وقت کئی دفعہ تعجب کیا ہوگا کہ ان بالاخانوں میں کس قسم کے لوگ رہتے ہونگے اور شاید تمہارے تصور نے خوبصورت اور مہ چہرہ زلیخاؤں کے خواب دیکھے ہوں گے جو ان دبیز پردوں کے پیچھے ساری عمر ایک اداس کنوار پن میں گزار دیتی ہیں اور بوڑھی چڑیلیں ہو کر مرجاتی ہیں، یا کبھی تم کچھ کچھ یہ امید کرنے لگ جاتے ہوگے کہ کوئی ہاتھی دانت جیسا زرد سپید ہاتھ جس کے اوپر نازک کلائی پر طلائی کنگن ٹمٹما اور کھنکھنا رہے ہوں گے، تم کو پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے کسی الغوزے یا طنبورے پر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا اور ہوشربا الف لیلوی گانے کی لہریں نیچے تمہارے کانوں میں آئیں گی اور کوئی بوڑھا سفید مہربان داڑھی والا آدمی، شاید بخارا کا کوئی سوداگر بچہ، تم کو ہاتھ کی جنبش سے اوپر آنے کا اشارہ کرے گا۔ میرے دوستو۔ ان بالاخانوں میں نہ تو کوئی بخارا کا سوداگر بچہ ہے اور نہ اپنی جوانی کے کھنڈروں میں بیٹھی ہوئی زلیخائیں۔ ان میں ٹھوس اور معتبر اور سنجیدہ آدمی رہتے ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ زندگی کوئی مذاق نہیں اور

اس کے ساتھ سنجیدگی سے نمٹنا چاہیئے۔ ان بالاخانوں میں سے ایک میں مستری مہتاب دین اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور اگر اب بھی تم ان مکانوں کے متعلق رومانی خیالات رکھنے یا سوچنے پر اصرار کرو تو یقیناً تم باؤلے ہو۔۔۔ میری طرح۔

اسی گلی کے نکڑ پر میرا یا یوں کہو کہ میرے دوست شیخ شیر علی شیر فروش کا بالا خانہ ہے اور اس کے نیچے اس کی دوکان ہے جس پر ہر وقت خالص دودھ مل سکتا ہے۔ دودھ خالص ہونے کی میں خود گواہی دیتا ہوں۔ مجھے دن میں کئی بار وہاں دودھ پینے کا اتفاق ہوتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ میں نے ہمیشہ دودھ عمدہ اور خالص پایا۔ شیخ شیر علی طبعاً دوسرے شیر فروشوں کی طرح ملاوٹ کی قسم کی چھوٹی اور ذلیل کمینگیوں پر اتر ہی نہیں سکتا۔ اگر تم کو اس دوکان کے پاس سے کبھی گزرنے کا اتفاق ہوا ہے تو تم نے ایک اونچے گنبد نما سر اور چشموں والے ادبی ڈھال کے چہرے والے آدمی کو دودھ کی ایک بڑی کڑھائی میں چمچہ پھیرتے دیکھا ہوگا اور اگر تم چہروں کو یاد رکھنے والے آدمی ہو تو وہ چہرہ جلدی نہیں بھول سکتے۔ میرا یہ دوست ایک شاعر ہے۔ ایک فلاسفر ہے۔ ان سڑی شاعروں، اور فلاسفروں میں سے نہیں جو سوائے اپنے آپ کے ساری دنیا سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کے متعلق اس کی ایک اپنی انفرادی روشن فلاسفی ہے اور اس کے لیے کڑھتے ہوئے دودھ میں اتنا ہی رومان، اتنی ہی شعریت ہے جتنی کہ ایک خوبصورت عورت میں۔ بے حد قابل اور ذکی ہے میرا یہ دوست۔ اس نے کچھ جدت پسند شاعری بھی لکھی ہے میرا مطلب اس شاعری سے ہے جس کا ایک مصرع بہت لمبا ہوتا ہے اور دوسرا بالکل چھوٹا اور جس کا مطلب صرف لکھنے والا شاعر ہی سمجھ سکتا ہے اور وہ ایک معرکتہ الآرا علمی مضمون "قرون وسطےٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت" کا بھی مصنف ہے جو ان اصحاب کے لیے جو بھینسوں میں کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ میں نے اس کو ابھی تک نہیں پڑھا کیونکہ مجھے بھینسیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ اس کے علاوہ شیخ شیر علی نے فلم کمپنی کے لیے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ منظر نامہ اور مکالمہ اور سب کچھ۔ اس کا نام "دوشیزہ فرانس عرف محبوبہ مصر" ہے۔ سچے عشق کی کہانی ہے۔ خاص کر آخری سین بے حد دردناک ہے جس میں شیخ کے لڑکے ہیرو اور شیخ کی لڑکی ہیروئن (ایک دوسرے شیخ کی) کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قبروں میں سے آسمان کی طرف اٹھتی اور گاتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ شیخ شیر علی نے یہ ڈرامہ مشہور فلم کمپنی فصلی بٹیرے لمیٹیڈ کو بھیجا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر فصلی بٹیرے تھوڑے بہت بھی اہل نظر ہوئے تو فوراً اس ڈرامے کو اپنی اگلی فلم کے لئے خرید لیں گے۔ وہ ڈرامے کو چھ سات ہزار سے کم میں قطعاً نہیں بیچے گا۔ غالباً فصلی بٹیرے اس کو اپنی فلم کمپنی میں مستقل مکالمہ نویس کے عہدے کی پیش کش بھیجیں گے۔ اس صورت میں اس کا وعدہ ہے کہ وہ دودھ کی یہ دوکان مجھے سونپ جائے گا۔

ہماری دوکان کے سامنے ایک دو گھر چھوڑ کر محمد الدین درزی کی دوکان کے اوپر مستری

مہتاب دین کا بالا خانہ تھا۔ جس کی بالکنی پر ہمیشہ تاریک اور غلیظ بوریاں لٹکتی رہتی تھیں۔ سورج کتنا ہی چمکیلا کیوں نہ ہو اور آسمان کتنا ہی نیلا جس وقت تمہاری نظر ان تاریک بوریوں پر پڑتی (میری نظر اکثر ان پر پڑتی تھی) آسمان بھورا اور میلا سا ہو جاتا اور کثیف سے بادل تمہاری روح پر چھا جاتے اور تم کو مستری مہتاب دین پر اس کے مستری ہونے کے باوجود رحم سا آنے لگتا پھر مستری مہتاب دین ایک غیر دلچسپ معمولی سا آدمی تھا اور میں جانتا تھا کہ تصور کی بلند ترین پرواز بھی اسے بخارا کے سوداگر بچے میں تبدیل نہیں کر سکتی اور اس لیے وہ عجیب اسرار اور رومانیت کا ہالہ جو مجھے ساتھ کے بالا خانوں کے گرد نظر آتا تھا اور جو ان کی دائمی غلاظت کو ایک خوبصورت رومان کی شکل دے دیتا تھا، مستری کے بالا خانہ کے گرد مجھے نظر نہ آتا۔۔ (یہ احساسات اس دن سے پہلے کے ہیں جس دن میں نے ورکشاپ سے لوٹتے وقت بوری کے پیچھے سے ہاتھی دانت جیسے ایک زرد و سفید ہاتھ کو باہر گلی میں کدو کے چھلکے پھینکتے دیکھا۔ اس دن سے تو میرا یہ عالم تھا کہ میری نظریں ہمیشہ ان تاریک غلیظ بوریوں پر یوں گڑی رہتیں جس طرح وہ دنیا کے خوبصورت ترین اور عجائب ترین حریری پردے ہوں۔ اس دن سے بوڑھا مستری مہتاب دین بھی مجھے کچھ کچھ مہربان داڑھی والا بخارا کا سوداگر بچہ لگنے لگا۔ اگرچہ اس خود فریبی کی تکمیل میں ایک خرابی یہ تھی کہ مستری مہتاب کی داڑھی نہ تھی۔ تاہم ان سب باتوں کا ذکر مناسب موقع پر تفصیل سے آئے گا۔ پہلے میں تم کو لالٹین کے بارے میں بتالوں۔۔۔ یا لالٹین کے ڈھانچے کے بارے میں جس کا اس تاریخ میں اتنا ہی اہم مقام ہے جتنا کسی اور انسانی کردار کا۔ تب بھی یہ لالٹین میرے لیے زندہ تھی۔۔۔ معصوم اور بے ضرر اور بے کار، بعد میں یہ میرے گمانوں سے بھی کئی حصے زیادہ زندہ نکلی اور پھر اتنی معصوم اور بے ضرر بھی نہیں جتنی یہ نظر آتی تھی)۔

مستری مہتاب دین کے بالا خانے کے نیچے اس دروازے پر جہاں سے سیڑھیاں اوپر چڑھتی تھیں کوئی پچیس فٹ اوپر یہ لالٹین اٹکی تھی۔۔۔ ایک ٹوٹا ہوا۔۔ زنگ خوردہ لالٹین کا ڈھانچا جس کا لوہا اب سیاہی مائل سرخ ہو کر بھر بھرا رہا تھا، دیوار میں سے نکلتا ہوا لوہے کا ایک بازو اس کو گلی کے اوپر سہارا دیئے ہوئے تھا اور لوہے کا بازو کئی برس سے یہ کام کرنے کی وجہ سے کچھ تھک گیا تھا یا اندر سے دیوار میں اس کی نشست کھلی اور کھوکھلی ہو گئی تھی کیونکہ اب وہ بازو کچھ نیچے جھک آیا تھا اور اس کے ساتھ لالٹین کا ڈھانچا بھی۔ میرے خیال میں شاید ہی کبھی کسی نے اس کی طرف دھیان دیا ہو مگر اس کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا کہ شاید اس کو روشن ہوئے عمریں بیت گئی ہوں گی اور یہ کہ اب اس میں کبھی روشنی نہیں ٹمٹمائے گی۔ وہ ایک خاموش اور رومانی دنیا کی نشانی تھی۔۔۔ پھر یہ بجلی کے اونچے بدصورت کھمبے اس روشنی اور رومان میں کریہہ بدتمیز اجنبیوں اور غیر ملکیوں کی طرح گھس آئے تھے۔ پہلے بڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر اور بعد میں ان چھوٹی گلیوں میں بھی اور وہ چوکور خود پوش لالٹینیں جو گلیوں کی نکڑوں پر سے اندھیری راتوں کو

جگاتی تھیں اور شہر کے رہنے والوں اور باہر کے مسافروں کے لئے لامحدود ممکنات کی حامل تھیں۔ جن کی مدھم زرد کانپتی روشنیوں میں گدڑی والا فقیر ایک بھیس بدلا ہوا ہارون الرشید لگنے لگتا تھا اور ناممکن ترین باتیں سچی ہونے لگتی تھیں ۔۔۔ وہ چوکور خود پوش لالٹینیں ماضی کی چیزیں ہو گئیں ۔ لوگ ان کو دیواروں میں سے اکھاڑ کر لے گئے ۔ اب ان دنوں تم لاہور کے سارے گلی کوچے چھان مارو، تم کو شاید ہی لالٹین کا کوئی پرانا ڈھانچا کسی دیوار کے کونے میں اٹکا ہوا مل سکے ۔ کیونکہ جنگ کے بعد سے لوہا مہنگا ہو گیا ہے ۔ لوگ اب ٹھوس اور لالچی بن گئے ہیں اور دیوار میں لگی ہوئی لالٹین کی رومانیت اور شعریت کو وہ نہیں سمجھ سکتے ۔ ایسے زمانے میں اس لالٹین کے ڈھانچے کا دیوار میں اٹکا رہ جانا مجھے ایک عجیب بات لگا ۔ غالباً کبھی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں گیا تھا کیونکہ یہ بہت اونچی تھی اور دیوار کی طرح بے رنگ تھی ۔ اگر کسی نے کبھی اس کی طرف دھیان دیا بھی ہو تو اس کا لوہا اس قدر زنگ خوردہ اور بیکار ہو چکا تھا کہ اس کو چاندی کے سکوں میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ یا شاید اسے ابھی اپنی قسمت کی تکمیل کرنی تھی اور انسانوں کے اس ڈرامے میں کرم کے لکھے کے مطابق وہ آخری اور خوفناک پارٹ ادا کرنا تھا جس کے لیے یہ اتنے برس سے اس دیوار میں اس خطرناک حالت میں اٹکی ہوئی تھی ۔ ان دنوں جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے ماضی کی یہ نشانی مجھے بالکل معصوم اور بے ضرر سی نظر آتی تھی اور اس چیلنج میں جو وہ بجلی کے کھمبوں کو دیتی معلوم ہوتی تھی ایک دیدہ دلیری اور بہادری کا انداز تھا ۔ اس بے چاری حرماں نصیب لالٹین پر ایک الگ کہانی لکھی جا سکتی ہے ۔ اور اگر کوئی شاعر اس کو دیکھ پاتا تو اس پر ایک رباعی کی صورت میں ایک چھوٹا سا خوبصورت کتبہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا جو اس لالٹین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر فانی بنا دیتا ۔

شاید تم اس لالٹین کے اس قدر طویل بیان سے اکتا گئے ہو گے لیکن یہ لالٹین اس تاریخ کے اہم کرداروں میں سے ہے اور میں اس کو آسانی سے چار پانچ سطروں میں ٹال دینا انصاف سے بعید سمجھتا تھا ۔ ہاں اگر تمہاری خوشی یہی ہے تو میں اب اس کا ذکر نہیں کروں گا ۔۔۔ البتہ میں آخری صفحے کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ وہاں تو وہ خود آ ٹپکتی ہے۔ بہر حال اب میں اسے چھوڑتا ہوں اور اپنی کہانی جاری رکھتا ہوں ۔

ہمسائے ہونے کے باوجود شاذ و نادر ہی میں اور مستری مہتاب دین گلی میں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوں گے ۔ کبھی بہت سویرے جب ورکشاپ کی ٹرین کو پکڑنے کے لیے گلی میں سے دوڑتا ہوا جاتا تو وہ مجھے ایک مطمئن چال سے خراماں خراماں جاتا ہوا ملتا ۔ " ابھی وقت ہے ۔ " وہ اپنی چوڑی موٹی اور بھاری جیبی گھڑی کو مسترت انہ خود اعتمادی سے دیکھ کر مجھے بتاتا اور پھر ہم اکٹھے ہی ریلوے اسٹیشن کے اس یارڈ تک جاتے جہاں سے ہماری ورکشاپ کی گاڑی چلتی ہے ۔ اکٹھے ہی ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھتے اور اکٹھے ہی پکی صبح میں انجنوں اور ریلوے لائنوں

اور سگنلوں کے پاس تیس میل کی رفتار پر گڑگڑاتے ہوئے گزرتے۔ ورکشاپ میں تو میں ہمیشہ رہتا ہی اس کے ساتھ تھا۔ ورکشاپ سے واپسی کے وقت ہم قدرتاً ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے۔ میں اس وقت جب کہ جسم اور دماغ بالکل تھکے ہوئے ہوتے تھے اس سنجیدہ اور غیر دلچسپ معمر آدمی کی صحبت پر اپنے ہم عمر بے فکروں کی صحبت کو ترجیح دیتا تھا۔ مستری کا بظاہر ایک کافی گہرا دوست تھا جو ساتھ کی لوکو شاپ میں کرین پر کام کرتا تھا۔ وہ اور مستری ورکشاپ سے ہمیشہ اکٹھے لوٹتے۔ کبھی کبھی وہ چھٹی کا سائرن بولنے سے کچھ پہلے ہی شاپ کے باہر آکر مستری کا انتظار کرتا۔

اس کا نام مستری رحیم بخش تھا۔ وہ ایک موٹا بھاری، عامیانہ قسم کا آدمی تھا۔۔۔ ایک لمبی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی والا آدمی جو بائلروں کی صحبت میں رہ رہ کر اب خود اس حد تک ایک بائلر لگنے لگ گیا تھا جس حد تک ایک انسان بائلر لگ سکتا ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے اور وحشیانہ سے تھے۔ اس کی آنکھیں بالکل چھوٹی تھیں اور ان میں ایک عیارانہ دمک سی تھی۔ میں کئی دفعہ تعجب کرتا کہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش عادات اور طبعیت کے اتنے اختلافات کے باوجود کیونکر اتنے گہرے دوست ہیں۔ میں نے سوچا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مستری مہتاب دین اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے کسی سے اختلاف رائے نہیں رکھتا اور فوراً ہر شخص سے ہر معاملے میں اتفاق کر لیتا ہے اور رحیم بخش جیسے شوریدہ اور ژولیدہ آدمی کو جسے اور کوئی منہ لگنے نہیں دیتا مستری مہتاب دین میں ایک ایسا آدمی مل گیا ہے جو اس کی ہر بات میں ایک شاگردانہ انداز کی ہاں میں ہاں ملانے کو تیار رہتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ مستری رحیم بخش ہی تھا جو مستری مہتاب دین کی سوسائٹی کا متلاشی تھا۔ شاید روح کے کسی سکون اور اطمینان کی خاطر جو مستری کی صحبت میں اسے حاصل ہوتا تھا۔ کئی دفعہ وہ ہماری مل رائٹ شاپ میں آجاتا اور دیر تک ریلوے ورکشاپ کی اندرونی سیاست پر باتیں کرتا رہتا۔ اپنے چارج مینوں کو برا بھلا کہتا۔ اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کرتا اور جب وہ آدھ گھنٹے میں ایک سو ایک موضوعات پر بول چکتا اور مستری مہتاب دین اس کی ہر بات سے فوراً اتفاق کر چکتا تو وہ واپس اپنی شاپ میں اپنے کام پر چلا جاتا۔ اسے اپنی آواز سے محبت تھی جو کچھ اس قسم کی تھی جیسے ریل کے ڈبے کی آواز جب بریک لگا دی گئی ہو۔ میں اس سے قدرتاً نفرت کرنے لگ گیا۔ میں نے اس کی کبھی پروانہ کی۔ کبھی کبھی وہ ایک خاص پدرانہ انداز میں میری طرف دیکھکر مستری مہتاب دین سے پوچھتا "مہتا بیا۔ یہ ہمارا چھوکرا اسمعیل کچھ سیکھ بھی رہا ہے؟۔۔۔۔" جیسے وہ ذاتی طور پر میری تربیت کا ذمہ دار اور میرا نگران ہو۔ ایسے وقت وہ مجھے بڑا برا لگتا۔ آدمی کے لیے اس کا ایک باپ ہی بہت کافی ہوتا ہے۔

مستری مہتاب دین کا شام کا وقت عموماً ان موٹی بوریوں کے پیچھے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گذرتا۔ تفریحات اور کھیل تماشے اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے تھے۔۔ ہاں ایک دفعہ میں نے اس کو مستری رحیم بخش کے ہمراہ ایک سنیما میں دیکھا۔ غالباً اس کا یہ دوست جس کے

سامنے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا، اس کو بوریوں کے پردے والی بالکنی کے سکون سے کھینچ کر یہاں لے آیا ہو گا ۔۔۔ کچھ ساتھ کی خاطر اور کچھ شاید اس لیے کہ مستری مہتاب دین دونوں کے ٹکٹ خریدے گا ۔۔۔۔ (انھوں نے غالباً مجھے نہ دیکھا ۔۔۔ فلم شاید "تھمپڑ" تھی جو ڈائرکٹر "مارد ھاڑ" کی ہدایت کی ہوئی ہے ۔ پہلا ہفتہ تھا ۔ رش بڑا زبردست تھا ۔ میں لوگوں کے سروں کے اوپر لیٹا ہوا ہاتھ ٹکٹ کی کھڑکی کے اندر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ میرے عزیز دوست شیخ شیر علی نے مجھے پچھے ٹانگوں سے سہارا دے رکھا تھا ۔ آہ وہ بے فکری کے پیارے دن!)

عموماً میرا شام کا وقت بھی شیخ شیر علی سے مصنفوں اور کتابوں کی باتیں کرتے گذرتا ۔ شاید ہی کسی شخص کو ان حیران کن آدمیوں کے متعلق جو کتابیں اور افسانے اور نظمیں لکھتے ہیں اتنی معلومات ہونگی جتنی شیخ شیر علی کو ۔ اس کی باتوں میں گہری عقیدت سے زیادہ رشک کا رنگ ہوتا تھا ۔ مجھ سے پوچھو تو واقعی وہ لوگ کمال کرتے ہیں ۔ مجھے تو ایک خط لکھنا پڑتا ہے تو مصیبت پڑ جاتی ہے "آپ کی خیریت خیر مطلوب" سے آگے ایک لفظ نہیں سوجھتا ۔ (شیخ شیر علی کے کہنے پر میں نے ایک جاسوسی ناول "خوفناک نقاب پوش" کا آغاز کیا تھا مگر پہلے باب کے بعد جس میں ہیرو ہیروئن کو دیکھکر فوراً غش کھاکر گر پڑتا ہے اور اسے ہسپتال پہنچایا جاتا ہے میری ساری خلاقانہ طاقتیں جواب دے گئیں) ۔ خود شیخ شیر علی جو فی الواقع ایک جینئیس ایک نابغہ ہے ابھی تک اپنا نام کسی رسالے میں چھپا ہوا نہیں دیکھ سکا ۔ اس کا معرکتہ الآرا مضمون "قرون وسطے کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت" پانچ چھ رسالوں سے واپس آچکا ہے ۔ اور تو اور مدیر رسالہ "مویشی" تک نے بھی اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا ۔ اگرچہ میں نے یہ کہہ کر شیر علی کی ڈھارس بندھائی کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضمون اشاعت کے قابل نہیں ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ غافل لوگ بھینسوں کے ماضی یا مستقبل سے قطعاً بے پروا ہیں ۔ پھر بھی "مویشی" والا معاملہ ایسا تھا کہ اس کا جواب میرے پاس بھی نہ تھا ۔

مہینے میں چار پانچ بار مستری دین ہماری دوکان پر دودھ پینے آتا ۔۔۔ کبھی اکیلا اور کبھی مستری رحیم بخش کے ہمراہ ۔ ایسے موقعوں پر میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ۔ میں فیاضانہ لہجے میں کہتا "بھائی شیر علی ۔ مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی ذرا زیادہ ڈالنا ۔" مجھے اب تک صرف اس قدر اثر اور رسوخ حاصل ہو سکا کہ لوگوں کے دودھ میں زیادہ بالائی ڈلوادوں اور وہ بھی صرف شیخ شیر علی کی دوکان پر ۔ مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی زیادہ ڈلوانے سے مجھے یہ قطعاً غلط فہمی نہ تھی کہ وہ میری اس فیاضانہ سفارش کی وجہ سے میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا ۔ اس کی توقع ہی فضول تھی ۔ میرے متعلق جو مستری کی رائے ان دنوں تھی اس کا مجھے بخوبی علم تھا اور تم بھی اس کو جانتے ہی ہو ۔ میں فقط اس کو اپنا ممنون کرنے کا خواہشمند تھا ۔ دراصل میں مستری کو اپنی طاقت اور رسوخ کے مطابق ممنون کر کے صرف اپنی خود بینی کے جذبہ

کو تسکین پہنچا رہا تھا۔ (اگر تم کو زیادہ بالائی والا دودھ پینے کا شوق ہے تو میں دوست بنانے کے لئے مناسب ترین آدمی ہوں)۔

اور اب میں اس شام پر آتا ہوں جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ جب شرارت کا آغاز ہوا جب ایک چھوٹے ہاتھی دانت جیسے سفید ہاتھ نے بوری کے پردے سے باہر ایک تھالی کو اوندھا کر کدو کے چھلکے تقریباً میرے سر پر الٹ دیئے۔۔۔ مجھے تاریخ بھی یاد ہے۔ اگرچہ میں اس قسم کا آدمی ہوں جو کئی دفعہ سال تک بھول جاتا ہوں۔ مئی کے مہینے کی ستائیس تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ میں معمول کے مطابق شام کو ریلوے اسٹیشن سے اکیلا واپس آ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن یہ بالاخانے مجھے روز سے کہیں زیادہ مایوس کن اور دل ڈھا دینے والے معلوم ہوئے۔ ان کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا جیسے کسی نے کیچڑ سے بھرا ہوا ہاتھ میرے دل پر رکھ دیا ہو اور میں کچھ سوچنے سا لگ گیا کہ آخر میں نے اب تک خودکشی کیوں نہیں کی۔ اصل میں اس روز میرے ساتھ ورکشاپ میں بعض باتیں ناخوشگوار ہو گئی تھیں اور اس وقت مجھے زندگی کچھ زیادہ روشن نظر نہیں آ رہی تھی۔ مستری مہتاب دین نے مجھے لوہے کا ایک ٹکڑا ماپ کے مطابق فائل کرنے کو دیا تھا اور میں نے غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے اس کو اتنا زیادہ فائل کر دیا تھا کہ اس کی لمبائی ماپ سے آدھا انچ کم ہو کر رہ گئی تھی۔ مستری نے مجھے ایک لفظ بھی نہ کہا مگر میں اس کی آنکھوں میں اور بشرے پر لکھی ہوئی خفگی اور ناراضی پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے سارا دن مجھے کام میں مدد دینے یا نہ دینے کے لیے بلایا تک نہیں اور میں نے بھی شرمندگی اور خفت کی وجہ سے اس کے سامنے آنے کی بجائے شاپ میں ادھر ادھر گھوم کر وقت گزارنے کو بہتر سمجھا۔ یہ ہے بھی وقت گزارنے کا ایک نہایت خوشگوار طریقہ۔ میں ایک جگہ ورک مینوں میں کھڑا ہوا ان کے ساتھ گپیں ہانکنے لگا۔ وہ کام چھوڑ کر ہنس رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ میں ایک فلم میں ایک مشہور مزاحیہ ایکٹر کی نقل اتار رہا تھا کہ کیبن میں فورمین کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ غصے میں بھاگتا ہوا آیا اور جو الفاظ اس نے میرے بارے میں استعمال کیے وہ تمہیں بتاؤں تو تم یقین ہی نہیں کرو گے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری ڈیوٹی کہاں تھی۔ میں نے جواب دیا کہ میں مستری مہتاب دین کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا "تم اس وقت مستری مہتاب دین کے پاس کیوں نہیں ہو؟" میں حاضر جواب نہیں ہوں۔ میں نے جلدی میں ایک نہایت احمقانہ جواب دیا "میں مستری مہتاب دین کو ڈھونڈنے ہی جا رہا ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں گم ہو گیا ہے"۔ فورمین نے میرے بارے میں چند مزید ناشائستہ کلمات استعمال کیے جو یہاں جگہ کی قلت کی وجہ سے لکھے نہیں جا سکتے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر میرے چارج مین کے روبرو لے گیا۔ سکھ چارج مین نیک دل آدمی تھا۔ وہ کسی کا برا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے مہتاب دین کے ساتھ کام کرتے دیکھا تھا۔ مستری مہتاب دین کو بلوایا گیا۔ فورمین نے پوچھا "ویل مستری صاحب، یہ آدمی ابھی تمہارے

ساتھ کام کرتا؟" مستری مہتاب دین نے پہلے مجھے ایک روٹھے ہوئے باپ کی طرح دیکھا اور پھر فورمین کو جواب دیا "ہاں صاحب ابھی میرے ساتھ کام کر رہا تھا" ------ میں نے پہلے بھی تم کو بتایا ہے کہ مستری مرحوم دل کا صاف تھا مگر یہ کہہ کر تو اس نے گویا مجھے بے داموں مول لے لیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کو گلے لگالوں اور اس کو اس کی ہونٹوں کی مکھیوں (میرا مطلب اس کی مونچھوں سے ہے) کے اوپر چوم لوں۔ فورمین مجھے مستری کے حوالے کر کے چلا گیا اور یوں میری خلاصی ہوئی۔ مگر اس واقعے کی ندامت ابھی میرے دل سے گئی نہ تھی۔ کبھی سوچتا کہ یہ ورکشاپ کی نوکری میرے بس کی نہیں اسے چھوڑ دوں۔ پھر خان بہادر کی ناراضی کا خیال آتا۔ کبھی دل میں فیصلہ کرتا کہ یہاں میرا کیریکٹر تباہ ہو رہا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ رائل بینڈ میں نوکری کر لوں یا سالویشن آرمی میں شامل ہو جاؤں یا کافی ہاؤس میں پارٹ ٹائم بیرا بن جاؤں۔ وہاں کے دو تین بیرے میرے دوست تھے اور رائل بینڈ میں میرا ایک دوست جھانگی رام ملازم تھا۔ میں نے اس کو ایک دو بار شادیوں پر اپنی سرخ کاڑھی ہوئی شاندار یونیفارم میں بینڈ کے ساتھ بگل پھونکتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک بھی کیا تھا۔

یہی خیالات لیے ان بالاخانوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ مجھے وہ سفید ہاتھی دانت کی انگلیاں بورے سے باہر ایک تھالی اوندھاتی نظر آئیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس سپنے کی چکاچوند نے مجھے اس درجہ محو کر دیا کہ کم سے کم اس وقت مجھے مطلق پتہ نہیں کہ وہ اوندھاتی ہوئی چیز کیا تھی جو مجھ سے ایک قدم آگے نالے میں گری۔ پرانے ناولوں کے مصنفوں کے مطابق مجھے وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑنا چاہیئے تھا۔ مگر میں نے سوچا کہ بر سر بازار بے ہوش ہو کر گرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور میں نے اس کو (بے ہوش ہونے کو) کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید لمبی مخروطی انگلیاں ناچنے لگیں۔ میں وہاں سے ہٹا تو جب جا کر معلوم ہوا کہ تھالی میں سے کدو کے چھلکے گرے تھے)۔

یہ بالاخانہ وہی تھا جس میں مستری مہتاب دین رہتا تھا۔ اور ان انگلیوں کی مالکہ یقیناً اس کی لڑکی رضیہ کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ رضیہ کا نام میں نے ایک دو دفعہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش کی باتوں میں سن لیا تھا۔ پھر ایک دفعہ میرے سامنے مستری مہتاب دین نے رضیہ کے رشتے کے بارے میں مستری رحیم بخش سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ کسی اچھے بر پر نظر رکھے۔ تب اس کا صرف نام ہی سنکر ایک گرم سیال سی دمک میرے سارے بدن میں سرایت کر گئی تھی اور اب رضیہ کی دو انگلیاں دیکھ کر تو میں اس کا غلام ہو گیا تھا۔ مجھے یکلخت خیال آیا کہ میری عمر اب پچیس کے لگ بھگ ہونے والی ہے اور مجھے اب تک ایک شادی شدہ آدمی ہونا چاہیئے تھا۔ کیا رضیہ میری بیوی بن سکے گی؟ لیکن مستری مہتاب دین نہیں مانے گا۔ وہ مجھے ایک نکما بے کار آدمی سمجھتا ہے جسے کام کرنے یا سیکھنے کا بالکل شوق نہیں۔ میں اس کی نظر میں مستقل

مزاج لڑکا نہیں تھا۔ میں اب خوب دل لگاکر کام کروں گا اور مستری مہتاب دین کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دوں گا۔

رات کو میں اور شیر علی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بعد میں شیر علی کو نیند آنے لگی اور مجھے اس کو جگانے کے لیے کئی بار اس کے چٹکی لینا پڑی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح شام سے میں بالکل نیا آدمی ہو گیا ہوں اور شادی کتنی اچھی چیز ہے۔ ان باتوں کا شیر علی پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ عورتوں کی پوری نسل ہی کے خلاف ہے۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے تجربہ حاصل تھا کہ جس آدمی پر ایک بار صنف نازک کا جادو چل جائے اس کو سمجھانا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر ایک سچا اور وفادار دوست ہونے کی حیثیت سے اس نے مجھے چند ذہانت بھری تجویزیں بتائیں جن پر عمل کر کے میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے بعد میں یہ بھی جتادیا کہ اس کی رائے میں منزل مقصود اس قابل ہی نہیں تھی کہ اس کے لیے اتنا قیمتی وقت برباد کیا جائے۔

میں نے کڑک کر کہا "ابے چغد قنا تیئے میں نے رضیہ کے بارے میں تمہاری رائے پوچھی ہی کب تھی؟"

اس نے جواب دیا "مگر کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ جن سفید انگلیوں نے تمہیں پاگل بنادیا ہے، وہ شاید رضیہ کی نہ ہوں اس کی ماں کی ہوں۔ مستری مہتاب دین کی بیوی کی"۔

اس امکان کا مجھے گمان ہی نہیں تھا کہ وہ انگلیاں رضیہ کے علاوہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر میں اس بارے میں شبہ کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ ان انگلیوں میں جو چمک تھی، وہ ادھیڑ عمر کی کسی عورت کی انگلیوں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ شیر علی نے مجھے جو تجویزیں بتائیں ان میں سے پہلی تو یہ تھی کہ میں ورکشاپ میں جی لگاکر کام کروں۔ مستری مہتاب دین کے سامنے ہمیشہ ایک برخوردار بنا رہوں اور اس کی موجودگی میں کسی سے کوئی مذاق نہ کروں۔ وجہ یہ تھی کہ مستری سنجیدہ اور متین لوگوں کو بہت وقعت کی نظر دیکھتا تھا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ (اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا دوست شیر علی مستری کے خانگی حالات کے متعلق کافی واقفیت رکھتا تھا) مستری مہتاب دین کے دو چھوٹے لڑکے آوارہ تھے۔ پڑھنا پڑھانا تو ایک طرف، وہ سارا سارا دن گلی کے لونڈوں کے ساتھ کنکوا بازی میں گزارتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو جس کی عمر یہی کوئی دس برس کی ہوگی، ایک دفعہ ایک فلم کی اشتہاری پارٹی کے ہمراہ ایک پوسٹر اٹھائے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

شیر علی نے کہا "اگر تم مستری کے لڑکوں میں سے کبھی کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کان سے پکڑ کر اسے فوراً مستری کے سامنے لے آؤ۔ اس طرح مستری محسوس کرنے لگے گا کہ تمہیں اس کے بیٹوں کا خاص خیال ہے۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں تم کو اپنے گھر کا آدمی سمجھنے لگے گا۔" تیسری

تجویز یہ تھی کہ مستری مہتاب دین کی بیوی حکیم علم علی، مشہور موجد سرمہ ---- کی تیسری بیٹی تھی حکیم صاحب کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی بھی ان کا سرمہ استعمال کرے گا وہ دن کو تارے دیکھنے لگے گا۔ چنانچہ شہر لاہور میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو دن کے وقت صرف تارے ہی نظر آتے ہیں اور حکیم صاحب مرحوم کی روح کو دعائیں دیتے ہیں۔

شیر علی نے کہا کہ جب بھی تم مستری مہتاب دین سے ملو باتوں باتوں میں حکیم علم علی مرحوم کے سرمے کا ذکر ضرور لے آؤ۔ یہ ذکر ذرا اونچی آواز میں کرنا تاکہ اندر مستری کی بیوی بھی سن لے۔ مثلاً تم قسم کھا کر ایک مادر زاد اندھے کا ذکر کر سکتے ہو جس نے مرحوم کا مشہور سرمہ استعمال کیا تو ایک ہفتے کے بعد دیکھنے لگا۔ یا تم اپنی ہی مثال دے سکتے ہو کہ جن دنوں تم یہ سرمہ استعمال کرتے تھے، تم نے عید کا چاند دو بجے دوپہری دیکھ لیا تھا یا اسی قسم کی خرافات۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم مستری کی بیوی کے دل میں گھر کر سکتے ہو اور پھر ایسا وقت بھی آسکتا ہے، جب وہ اپنے مستری سے صاف صاف کہہ دے کہ اس دنیا میں رضیہ کے لئے مناسب ترین رشتہ تمہارا ہی ہے۔ میری طرف سے لکھ کر رکھ لو کہ جو شخص کسی عورت کے باپ کی تعریف کرے گا وہ اسے اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھنے لگے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم حکیم کا ذکر اتنی عقیدت سے کرو گے تو مستری کی بیوی چق اٹھا کر بے دھڑک اندر چلی آئے گی اور تمہیں بیٹا کہہ کر اپنے والد مرحوم کی طبابت کا کوئی اور محیر العقول معجزہ سنا دیگی۔ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں"۔

دوسرے دن صبح میں اٹھا تو اس پختہ ارادے کے ساتھ کہ آج میں مستری کے قلعے پر بلہ بول دوں گا اور اسے فتح کر کے رہوں گا۔ ورکشاپ میں میں نے پورا دن لگا کر مستری کا ساتھ دیا اور مناسب حد تک مودب رہا۔ شام کو واپس آکر میں مستری کے بیٹوں کو ڈھونڈھنے نکل کھڑا ہوا۔ اس دن تو میری تلاش ناکام رہی۔ مگر دوسری شب کو میں نے ریوالی سنیما کے پاس دو لڑکے دیکھے جو فلم "تھپڑ" پر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مستری مہتاب دین کا لڑکا تھا۔ میں نے لپک کر کہا "اے فضلو! تم کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو۔" پھر میں نے مستری کے بیٹے کو بازو سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا گلی میں لے چلا۔ اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کی بار بار کوشش کی اور میری شان میں کچھ ناشائستہ کلمات بھی استعمال کیے۔ جو طوالت کے خوف سے یہاں نہیں لکھے جاسکتے۔ لڑکے نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کھڑکیوں میں سے کئی عورتیں چقیں ہٹا کر جھانکنے لگی تھیں۔ مستری مہتاب دین بھی سیڑھیاں اترا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا "یہ سنیما کے آس پاس آوارہ گردی کر رہا تھا۔ اس لیے میں اسے پکڑ لایا ہوں"۔

"مگر میں نے اسے آج خود ہی سنیما دیکھنے کی اجازت دی تھی!" مستری حیران ہو کر بولا۔

"مگر ----" میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ آخر میں کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ میں جب آج بھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا کہنا چاہئے تھا تو کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آتی۔

"خیر کوئی بات نہیں" مستری بولا" جاؤ فضلو سنیما دیکھو"۔

خاصی دیر کے بعد میں صرف اتنا کہہ پایا" اس نے راستے میں میرا ہاتھ کاٹنے کی بھی کوشش کی۔" مگر افسوس کہ میرے اس فقرے کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ یکسر الٹا اثر ہوا۔ سب لوگ مسکرانے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھے بھی مسکرا دینا چاہیئے تھا۔ سو میں بھی مسکرانے لگا۔ بہت عجیب مسکراہٹ جو دکھائی دیتی بھی ہے اور نہیں بھی دکھائی دیتی۔

شیر علی کا بتایا ہوا پانسہ بالکل الٹا پڑا تھا مگر مستری مہتاب دین میری نیک نیتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میرے سینے میں خالص سونے کا دل ہے۔ اس واقعے یا حادثے کے تین دن بعد مستری نے مجھے اور شیخ شیر علی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی کس بلا کا شاطر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ سارا دن میں رات کے کھانے کے خواب دیکھتا رہا۔ میں آئینہ کم ہی دیکھتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آئینہ دیکھنے کے فوراً بعد جو پہلا خیال میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ خود کشی کر لینی چاہیئے۔ اس کے باوجود میں لاہور کے کم سے کم تین ایسے آدمیوں کا نام لے سکتا ہوں جن کے مقابلے میں مجھے بڑے اعتماد کے ساتھ خوبصورت کہا جا سکتا ہے اور پھر اصل چیز تو انسان کا دل ہوتا ہے اور اب تک پیارے قارئین تم پر ثابت ہو چکا ہو گا کہ میرا دل سونے کا ہے۔ اس روز میں نے کوئی دو گھنٹے بناؤ سنگھار میں صرف کیے۔ چار بجے کے قریب مولوی کرم الہیٰ حجام کی دوکان پر (جو ہائی اسکول میں میرا کلاس فیلو تھا) دوبارہ داڑھی منڈائی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور مختلف زاویوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کس زاویے سے میں ذرا خوبصورت یا کم بدصورت نظر آ سکتا ہوں۔ کسی بھی زاویے کا یہ نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ مگر میں شاید ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ساتھ آئینے پوری طرح انصاف نہیں کرتے۔ میک اپ کے بعد کپڑوں کا مسئلہ سامنے آیا۔ نتھو دھوبی کی لانڈری میں جا کر میں نے اس سے کسی گاہک کے کپڑے کرائے پر لیے۔ یہ سوٹ ایک بہت چھوٹی ٹانگوں والے بہت موٹے آدمی کا تھا۔ نتیجہ یہ کہ کوٹ بالکل ڈھیلا تھا اور پتلون میرے ٹخنوں سے چار ایک انگل اونچی تھی۔ وہاں سے میں شیخ شیر علی کو دم بخود کرنے کے لیے اس کی دوکان پر پہنچا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر کچھ یوں ڈالی جیسے مجھے پہچانا تک نہیں اور ایک گاہک کو آنکھ مار کر اسے اپنے مذاق میں شامل کرتے ہوئے بولا" کیوں صاحب بہادر دودھ پیئیں گے؟" فوراً بعد مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی مجھے بنا رہا تھا اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں اس لباس میں پروفیسر لگتا ہوں۔ لوہے کے گولے اور کیلیں نگلنے والا پروفیسر۔

شام کو شیخ شیر علی اور میں مستری مہتاب دین کے بالاخانے پر پہنچے۔ مستری کی بیٹھک ایک سستے شریفانہ انداز میں سجائی گئی تھی۔ دو تین پرانے صوفے تھے اور دیواروں پر "بعد مدت کے لائے ہو تشریف" کے اکٹھے تین طغرے تھے۔ ترک رہنماؤں کی رنگین تصویریں تھیں۔ ایک

کونے میں گراموفون رکھا تھا جس پر قالو قوال کا ایک ریکارڈ بج رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک چغد قسم کا نوجوان بیٹھا سر دھن رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور بولا "السلام علیکم پروفیسر صاحب"۔ اس کے بعد بھی مجھے پروفیسر کہنے پر مصر رہا۔ بلکہ کھانے کے بعد تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سب حاضرین کو تاش کے کھیلوں سے محظوظ کروں۔ میرا ذاتی نظریہ ہے کہ مذاق کی ایک حد ہونی چاہیئے اور حد سے باہر جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاق کرنے والے کی تربیت میں غفلت برتی گئی ہے۔ اس کے باوجود دعوت بہت کامیاب رہی۔ مستری مہتاب دین ہمیں فقیروں کی کرامات سناتا رہا۔ اس نے بتایا کہ کسی فقیر نے ایک جھاڑی کے سائے میں آرام کیا اور جب وہاں سے اٹھا تو جھاڑی کو دعا دے گیا۔ ایک بار مستری مہتاب دین اپنے سات دوستوں کے ہمراہ اس جھاڑی کے پاس سے گزرا۔ جھاڑی کے پتوں کا رنگ ایسا تھا کہ دیکھتے ہی اشتہا پیدا ہو جاتی تھی۔ دوستوں میں سے ایک آدمی نے اس جھاڑی کے چند پتے کھا لیے اور یکایک اس کی بھوک اتنی بڑھ گئی کہ پہلے تو آٹھ آدمیوں کا بندھا ہوا کھانا چٹ کر لیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا "بھاگ جاو، ورنہ میں تم کو بھی کھا جاؤں گا۔" سب دوست اسے مذاق سمجھ کر زور زور سے ہنسنے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں کو کھا گیا۔ سوائے مستری مہتاب دین کے جس کی طرف رخ کرنے کے بعد اسے ایک ڈکار آئی اور اس کی بھوک مٹ گئی۔ ان باتوں نے کمرے میں ایسی فضا پیدا کر دی جس میں اگر کوئی غیر ممکن الوقوع کہانی بھی سنائی جاتی تو اس پر فوراً یقین کر لیا جاتا۔ اس فضا نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں نے حکیم حاجی علم علی کے مشہور سرمے کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور اس مادر زاد اندھے کا ذکر کیا جس نے یہ سرمہ استعمال کرنے کے بعد عید کا چاند دن کے دو بجے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے یہ باتیں اونچے لہجے میں اور بڑے والہانہ پن سے سنائیں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے پرلی طرف مستری کی بیوی اور اس کی بیٹی سب کچھ سن رہی ہیں۔

اس کھانے کے بعد دوسرے ہی دن مستری مہتاب دین نے ورکشاپ میں اپنے لڑکوں کی پڑھائی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا اور اسی شام میں ٹیوٹر کی حیثیت سے ان لڑکوں کو مستری کی بیٹھک میں پڑھانے کے لیے جانے لگا (میں مڈل پاس ہوں) میں وہاں زیادہ دیر تک تو نہ ٹھہرتا مگر جتنی دیر ٹھہرتا، زنانے کے دروازے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ رضیہ یا اس کی ماں کا مجھے زیادہ واضح طور پر دیکھنا میرے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو گا۔ (میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ میں صورت شکل کا کچھ ایسا ہی ہوں) تیسرے دن میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک نئی روشنی دیکھی جو ایک آدمی کی آنکھوں میں اس شخص کو دیکھ کر آجاتی ہے جس کو وہ دامادی کا شرف بخشنے کا آرزو مند ہو۔ مستری رحیم بخش سے اب وہ بظاہر بہت کچھ کھنچ گیا تھا اور ان کے تعلقات کے درمیان یقیناً موٹے موٹے پردے حائل ہو رہے تھے۔ رحیم بخش اب بھی

کبھی کبھی مہتاب دین سے گپیں ہانکنے کے لیے مل رائٹ شاپ میں آتا مگر دس بارہ منٹ بھی نہ ٹھہرتا اور اب جو باتیں وہ دونوں کرتے ان میں وہ پرانا بہاؤ بے تکلفی اور دوستی کی گرمی یکسر مفقود ہوتی۔ میرے لیے یہ معمہ سمجھ سے بالا تھا کہ کس طرح دو پرانے دوست بغیر کسی نمایاں وجہ کے ایک دوسرے سے کھنچے جا رہے تھے۔ لیکن میں دل ہی دل میں حالات کی اس روش پر خوش تھا ایک تو یہ سرخ داڑھی والا آدمی مجھے مطلق نہیں بھاتا تھا۔ دوسرے مستری سے اس کی بے رخی اور کھنچاؤ میرے حق میں مفید ثابت ہو رہا تھا۔ میں رفتہ رفتہ مستری مہتاب دین کی دوستی اور اعتماد حاصل کر رہا تھا اور ایک لحاظ سے اس سرخ داڑھی والے آدمی کی جگہ پر قابض ہو رہا تھا۔

میں نے حالات کی اس غیر متوقع اور مبارک تبدیلی کا شیخ شیر علی سے ذکر کیا۔ اس نے مجھے کڑھائی کے اوپر سے رحم اور ترس کی نظروں سے دیکھا۔ وہ مجھے اس بے وقوف بکرے کی مانند سمجھ رہا تھا جو خود ہی قربان ہونے کے لئے بھاگا جا رہا ہو۔

اس نے کہا "اب تمہارے لیے مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ تم صاف تباہی کے گڑھے کی طرف جا رہے ہو"۔

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بوڑھے مہتاب دین کے دل نے اب تم کو اپنا داماد قبول کر لیا ہے۔ صرف تمہارے ارادہ جتانے کی دیر ہے اور بوڑھا اچھل پڑے گا۔ میں تمہیں بتاؤں وہ اب صرف تمہاری منشاء معلوم کرنے کے انتظار میں ہے۔ اب تباہی سے تمہارا اچنا مجھے محال دکھائی دیتا ہے"۔

"گدھے! اس کی انگلیاں سفید، لمبی اور مخروطی ہیں"۔

"تو کیا ہوا!" شیخ شیر علی بولا۔ "کئی عورتوں کی انگلیاں سفید، لمبی اور مخروطی ہوتی ہیں۔ خود میری انگلیاں لمبی اور مخروطی ہیں"۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو داد بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

یہی ہے میرا دوست شیر علی۔ صنف نازک سے نفرت کرنے والا۔ تاہم وہ ایک دوست کی خاطر سر کٹانے کو بھی تیار رہتا ہے۔ میں نے بمشکل اس کو اس بات پر رضامند کر ہی لیا کہ وہ اس کام کو انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لے اور مناسب طریق پر مستری مہتاب سے مجھے فرزندی میں قبول کرنے کی درخواست کرے۔

"مگر ایک بات میں تم کو پہلے سے بتا دوں۔" شیخ شیر علی بولا "جب تمہاری بیوی آجائے گی تو تمہیں اپنے لیے ایک الگ مکان ڈھونڈنا پڑے گا۔ میں اپنے گھر میں کسی بے وقوف اور ہر بات میں دخل دینے والی باتونی عورت کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اعصاب کے لیے نقصان دہ ہے"۔

"نہیں۔ نیا مکان ڈھونڈنے کی نوبت ہی نہیں آئیگی۔" میں نے اسے تسلی دی "ابھی چند

دنوں میں تم کو فصلی بٹیروں سے مکالمہ نویس کے عہدہ کی پیش کش آجائے گی اور تم کو یہ مکان ہمیں سونپ کر مستقل طور پر بمبئی چلے جانا ہوگا۔ پھر بھی جب تم کبھی لاہور آؤ تو یہ یاد رکھنا کہ ہمارے مکان کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔ مردانے کی بیٹھک میں ایک بستر ہمیشہ تمہارے لیے بچھا رہے گا اور میں اور رضیہ تمہارے لیے چائے کی ایک پیالی اور ایک رکابی زیادہ خرید لیں گے اور ہم انہیں کسی اور کو ہاتھ نہیں لگانے دینگے۔ یہ تمہارے چچا شیخ شیر علی کے بیلے ہیں، ہم اپنے ننھوں سے کہیں گے۔"

اب یہ بتانا باعث طوالت ہوگا کہ کس طرح اسی شام شیخ علی مستری مہتاب دین سے اکیلا ملنے کے لیے اس کے بالا خانے میں گیا اور کس طرح انھوں نے خوش اسلوبی سے اس معاملے کو طے کیا اور کس طرح جب شیخ نے مستری سے رخصت چاہی تو مستری کی عینک خوشی سے چمک رہی تھی معاملے کے طے پانے میں بالکل کوئی دیر نہ لگی کیونکہ جتنا میں داماد بننے کے لیے بے صبر تھا اسی قدر مستری خسر بننے کے لیے بے تاب تھا۔ دوسری صبح جب ورکشاپ کی طرف جاتے ہوئے مستری مہتاب دین مجھے گلی میں ملا تو میں کچھ جھنیپ سا گیا۔۔۔ سکول کے لڑکے کی طرح جو اپنی کسی شرارت پر شرمندہ ہو۔ مستری مہتاب دین بے حد خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عینک ٹمٹماتی تھی اسے یقیناً مجھ میں وہ تمام خوبیاں اور اچھی عادات و صفات نظر آرہی تھیں جن کی ایک مکمل اور مثالی داماد سے خواہش کی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود گاڑی میں ورکشاپ پہنچنے تک مہتاب دین کے چہرہ پر کبھی کبھی ایک تاریک سایہ سا آجاتا جس طرح کوئی ضدی تکلیف دہ بھوت اس کی خوشیوں کے آنگن میں گھس آنے پر مصر ہو۔ کیا اس بھوت کا مجھ سے کوئی تعلق ہے؟ شاید مستری میرے چال چلن سے پوری طرح مطمئن نہیں؟ مگر اسی دن مجھ کو معلوم ہوگیا کہ اس تاریک سائے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ اسی لمحے جب مستری رحیم بخش مل رائٹ شاپ میں مستری مہتاب دین کو ملنے کے لئے آیا۔

ہم کسی تھیسے پر بولٹوں کا نشان لگا رہے تھے۔۔۔ خسر اور داماد دونوں خوشی اور اطمینان کی ایک ابدی جنت میں بیٹھے ہوئے تھے جس وقت وہ سرخ داڑھی والا آدمی ایک انسانی بائلر کی طرح دندناتا ہوا شاپ کے اندر آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک کینہ ور اور خطرناک سی نظر رکی ہوئی تھی جس طرح ایک حملہ آور مرکھنے بیل میں ہوتی ہے اور اس کو دیکھکر مستری مہتاب دین کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑگیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر مجھ پر فوراً اس حقیقت کا انکشاف ہوگیا کہ پچھلے چند دن انہیں نہ صرف ایک دوسرے سے دور بے اعتنائی اور بے تعلقی کے صحرا میں لے گئے تھے بلکہ انہیں ایک دوسرے کے خوفناک جانی دشمنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

"مبارک ہو بھئی" اس نے بڑے طنز سے ہنستے اور مجھے کندھے سے پکڑتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں مطلق کوئی ہنسی نہ تھی۔ صرف ایک خوفناک دمک تھی۔

مستری مہتاب دین سے اس نے صرف ایک پر معنی لہجے میں یہی کہا" کہو تم آج شام کو گھر ہی پر ہو گے ؟ مجھے تم سے ایک دو باتیں کرنی ہیں" ۔

اور اس کے بعد وہ چلا گیا ۔ میرے اعصاب بالکل تندرست ہیں ۔ مگر میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کے جانے کے آدھے گھنٹے کے بعد تک میں بالکل اپنے آپ میں نہیں تھا ۔ میں نے اور مستری مہتاب دین نے تپیے کے اوپر سے ایک دوسرے کو دیکھا ۔ اس کے چہرے پر وہ سیاہ سایہ زیادہ گھنا ہو گیا ۔ مبارک ؟ ایسی خوفناک مبارک کبھی کسی نے کسی کو نہ دی ہوگی ۔۔۔ مبارک ، جو ایک دھمکی معلوم ہوتی تھی ۔۔۔ اس کو میری منگنی کے بارے میں بتایا کس نے تھا ؟ شاید مہتاب دین اور میری نئی نئی دوستی سے اس نے یہ نتیجہ خود ہی اخذ کر لیا تھا اور پھر ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں !

اس کے باوجود اگر شام کو میری ملاقات اس نوجوان سے نہ ہو جاتی جس سے مجھے مستری کے کھانے پر بار بار " پروفیسر " کہنے پر نفرت ہو گئی تھی تو میں اس واقعہ کا زیادہ خیال نہ کرتا ۔ اس نوجوان کا نام میں نہیں بتاؤں گا اور کہانی کے مقصد کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں ۔ وہ مال پر ایک فوٹو گراف کمپنی میں ملازم ہے اور مستری مہتاب دین کی بیوی رشتے سے اس کی پھوپھی لگتی ہے ۔ میں اور شیخ شیر علی اپنے ادبی دیوتاؤں کی تلاش میں رات کو کھانا کھانے ایک ہوٹل میں گئے اور جب ہم کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کھانا آنے سے مایوس ہو کر چند سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمیوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے یکایک ایک گرجتی ہوئی " ہیلو پروفیسر " نے ہمیں چونکا دیا اور پیشتر اس کے کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ پروفیسر کہنے والا کون ہے وہی نوجوان ہمارے سامنے کرسی پر آ بیٹھا ۔

اس وقت مجھے اس کے " ہیلو پروفیسر " میں طنز آمیز تمسخر کی ذرا سی آنچ بھی معلوم نہ ہوئی اور نہ ہی مجھے اس کا " پروفیسر " کہنا زیادہ برا لگا ۔ کیونکہ سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمی بھی اچانک مجھے دلچسپی اور رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ۔۔۔ انھوں نے غالباً یہ سمجھا کہ میں اصلی پروفیسر ہوں ۔

" بڑی بھوک لگی ہے :" اس نے کہا " کھانے کا آرڈر دیا ہے یا کھا چکے ہو ؟ اچھا ۔ بہت اچھا ۔۔۔ ہاں بھئی مبارک ہو ۔ پھوپھی نے آج صبح مجھے بتایا ۔ وہ پہلے بھی تمہی کو چاہتی تھیں ۔ صرف بوڑھا مہتاب دین شش و پنج میں تھا ۔ وہ بھی تمہارے خلاف نہیں تھا مگر اس کے دل پر کچھ اور سوار تھا ۔ تمہیں بتاؤں ؟ اس کے دل پر کچھ عرصے سے وہ مستری رحیم بخش سوار تھا ۔

خیر تم خوش قسمت ہو پروفیسر ۔ میرا مطلب ہے اپنی شکل و صورت کے مقابلے میں تمہاری قسمت بہت اچھی ہے ۔ رضیہ ہزاروں میں ایک لڑکی ہے ۔ مجھے مٹھائی کھلاؤ ۔ میں نے اور پھوپھی نے زور دار طریق پر بوڑھے مہتاب دین کے سامنے تمہارے حق میں وکالت کی " ہمیں

پروفیسر چاہیئے ۔ پروفیسر جیسا اور کوئی نہیں" ۔ ہم نے مہتاب دین سے اصرار کیا اور آخر اسے منوا کے چھوڑا ۔ میری پیٹھ ٹھونکو ۔ تمہاری کامیابی کا سہرا میرے سر ہے" ۔

بعد کی باتوں نے جو اس نوجوان نے مرغ پلاؤ اور شاہی ٹکڑوں کو "نگلتے" ہوئے کیں (کھانے کا لفظ اس کے لیے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ مہینوں کا بھوکا معلوم ہوتا تھا) ہم پر واضح کر دیا کہ وہ اپنی پھوپھی کے گھر کے اندرونی حالات سے کماحقہ واقفیت رکھتا ہے اور یہ کہ اس کی پھوپھی گھر کی کوئی بات اس سے چھپا کر نہیں رکھتی ۔ بلکہ وہ اس کا ہمراز اور مشیر تھا ۔ بظاہر اسے اپنی پھوپھی کے خانگی معاملات پر بر سر بازار ایک مکمل اجنبی سے بحث کرنے میں بھی کوئی عذر نہیں تھا ۔

"رضیہ بڑی اچھی لڑکی ہے ۔۔ نہایت خوبصورت لڑکی ۔" اس نے اونچی آواز میں ہمیں اور سارے ہوٹل کو سناتے ہوئے کہا ۔ "میں سمجھتا ہوں تم واقعی قابل رشک ہو ۔ وہ ایسی بیوی ہے جس پر ایک پروفیسر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے" ۔

اس نے ہمیں اس سرخ داڑھی والے آدمی مستری رحیم بخش کے بارے میں چند ایسی باتیں سنائیں جس سے میرا خون کھولنے لگ گیا اور اس سے میری نفرت دو چند ہو گئی ۔۔ گھناؤنی شرمناک باتیں اور بالکل غیر متوقع ۔ مستری رحیم بخش ایک یہودی تھا ۔۔ میرا مطلب ہے اس کی عادات یہودیوں کی سی تھیں ۔ اور وہ اپنے ہمسایوں کو سود پر روپیہ دینے کا عادی تھا ۔ کوئی عادت انسان کے بدترین اور اسفل ترین جذبات کو اس حد تک سطح پر نہیں لاتی جتنی یہ سود خوری کی عادت ۔ مستری مہتاب دین بھی اس سرخ داڑھی والے آدمی کے قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا ۔۔۔ قرضہ جو پہلے پہل مستری نے دوستانہ انداز میں تھوڑا تھوڑا کر کے لینا شروع کیا تھا اور جو اب دو ہزار تک پہنچ چکا تھا ۔ رحیم بخش کی پہلی بیوی دو تین سال ہوئے مر چکی تھی اور اس کی لومڑی کی سی آنکھیں ایک عرصہ سے رضیہ پر تھیں ۔ جب تم ایک آدمی کے مقروض ہوتے ہو تو کسی وجہ سے اس کے روبرو تم میں ایک احساس کمتری سا پیدا ہو جاتا ہے ۔ تم اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتے ۔ کمزور سادہ لوح آدمی اپنے قرضخواہ کے ہاتھوں میں آسانی سے کٹ پتلی بن جاتا ہے ۔ بعینہ یہی کیفیت مستری مہتاب دین کی ہوئی ۔ رحیم بخش نے مستری مہتاب دین کو ایک پاکباز اور صاف دل سیدھا آدمی سمجھ کر اس پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور چالاکی کی باتیں کر کے اس سے یہ زبانی اقرار لینے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ وہ رضیہ کا رشتہ مستری رحیم بخش سے کر دے گا ۔ اس کے عوض مستری رحیم بخش یہ لکھ دینے کو تیار تھا کہ وہ مہتاب دین سے قرضے کی ایک ایک پائی وصول کر چکا ہے! ۔

دوسری دن مستری مہتاب دین زیادہ خوش تھا ۔ رات کو مستری رحیم بخش نہیں آیا ۔ میں نے لڑکوں سے فارغ ہو کر مستری سے باتیں شروع کیں اور رات کو جو کچھ سنا تھا اس کا ذکر

چھیڑا ۔۔۔ مگر احتیاط کے ساتھ تاکہ اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ میری کیا غرض ہے ۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ دو ہزار کوئی بڑی رقم نہیں اور انشاء اللہ ہم دونوں مل کر مستری رحیم بخش کے قرضے کی ایک ایک پائی چکادیں گے ۔ مستری کے دل پر اس بات کا بے حد اثر ہوا کہ میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا ۔ مستری کو اب میری موجودگی سے اطمینان محسوس ہوتا تھا ۔

شیخ شیر علی نے مستری سے دوبارہ مل کر میری شادی کی تاریخ بھی طے کرلی ۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں ۔۔۔ دن اسی طرح کسی واقعے کے بغیر گزرنے لگے ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دن میرے لیے سخت انتظار اور بے پایاں خوشی کے دن تھے ۔ ایک شام میں نے دروازے کے پیچھے سے رضیہ کی جھلک بھی دیکھ لی تھی ۔ خوبصورتی اور معصومیت کا وہ لشکارا اب بھی میرے دل کو منور کردیتا ہے ۔۔۔ اب میں مزید انتظار نہیں کرسکتا تھا ۔ میری نیندیں اس کے خوابوں سے چھلکنے لگی تھیں ۔ رضیہ کی ماں اب مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی بلکہ میرے سامنے بے دھڑک آتی جاتی اور کھلم کھلا باتیں کرتی ، وہ کافی باتونی عورت تھی (کون عورت باتونی نہیں ہے !) اور اس میں ایک دلچسپ قوت بیانیہ تھی جس سے وہ معمولی واقعات اور عام لوگوں پر ایسا رنگ چڑھاتی تھی کہ وہ آسانی سے بھلائے نہیں جاسکتے تھے ۔ اس کی باتیں سننے کے بعد اس کا باپ ایک عام سرمے کا بازاری موجد معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک پہنچا ہوا ولی جس کا سرمہ اس کا ایک ادنیٰ ترین کرشمہ ہو ۔ وہ دیندار بھی تھی اور صفائی پسند بھی ۔ اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا کہ رضیہ نے بھی یہ ساری صفات اپنی ماں سے ورثے میں پائی ہوں گی ۔ وہ بھی اتنی ہی دلچسپ باتیں کرتی ہوگی ۔ وہ بھی دیندار اور صفائی پسند ہوگی ۔ میں جلد ہی رضیہ کی ماں کا لاڈلا اور چہیتا بن گیا کیونکہ مجھے بڑی بوڑھیوں کو خوش کرنے کا ایک قدرتی ملکہ حاصل ہے ۔۔۔ وہ پھٹی ہوئی بوسیدہ بوریوں والا بالا خانہ اب میرے لئے چمکتی ہوئی چلمنوں والا شاندار محل تھا جس کے گرد میرے خواب منڈلاتے تھے اور وہ بدنصیب لالٹین بھی ۔۔۔ (مگر میں اپنا وعدہ بھول رہا ہوں اور پھر اس کا ذکر کر بیٹھا ہوں !) وہ لالٹین جو بس دیوار میں ذرا سی اٹکی ہوئی تھی میرے تصور میں کئی دفعہ جلنے لگ جاتی ۔

اور اب میں ستمبر کی پہلی کے خوفناک دن پر آتا ہوں ۔۔۔ وہ دن جب تقدیر کی ضرب پڑی ۔ بجلی کی طرح ناگہانی اور لرزہ خیز ۔ تقدیر کی ضرب ۔ انسانوں پر ہمیشہ اچانک آپڑتی ہے اور میرے خیال میں یہ مشیت کے لیے اچھی بات نہیں کہ (مگر نعوذ باللہ میں مشیت سے جھگڑنے والا کون) ۔ حسب معمول میں اور مستری مہتاب دین اکٹھے علی الصبح ورکشاپ جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے ۔ مجھے یاد ہے جب گاڑی چلی تو کسی نے زور زور سے نعت گانی شروع کردی ۔ فوراً ہی سارا ڈبہ گانے والے کا ساتھ دینے لگا اور میں اور مستری مہتاب دین بھی آہستہ آہستہ نعت کے

الفاظ گانے والے کے پیچھے دہرانے لگے ۔ میں نے دیکھا کہ وہ محبت اور مذہبی عقیدت کا جذبہ جو سادہ اور نیک طبیعتوں میں اس قدر قوی ہوتا ہے مستری مہتاب دین پر طاری ہونے لگا ۔۔۔ اس حد تک کہ اس کا بدن تھرکنے لگا اور اس کی عینک بھیگ گئی اور اس کے شیشے دھندلا گئے ۔ وہ عقیدت و وارفتگی سے کانپتی ہوئی آواز میں گائے جارہا تھا ۔ اس وقت اسے یوں عقیدت سے گاتا دیکھتے ہوئے مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ آج یہ سسکتی ہوئی گاڑی اسے آخری بار ورکشاپ کی طرف لے جارہی تھی ۔۔۔ جہاں اس کے ماضی کا زیادہ تر حصہ پڑا ہوا تھا ، جہاں اس نے اپنی بڑی لڑائیاں فتح کی تھیں ، جہاں مشینیں اس کے اشارہ کی منتظر کھڑی رہتی تھیں ۔

ورکشاپ میں مستری مہتاب دین بڑے اچھے موڈ میں تھا ۔ میں نے شاید یہ ذکر نہیں کیا کہ اس سے ایک دن پہلے اس کو ہیڈ مستری بنادیا گیا تھا اور یہ امر قدرتی طور پر اس کی خوشی اور اطمینان کا موجب تھا ۔ اس دن بھی میں نے اس کو ہنستے ہوئے تو نہیں دیکھا البتہ اس کی مسکراہٹیں پہلے سے زیادہ فراخ تھیں ۔ ہم ایک گھنٹہ اکٹھے مل رائٹ شاپ میں کام کرتے رہے ، اس کے بعد چارج مین نے مجھے ورک مینوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ بنیٹ فیکٹری میں واٹر پائپ لگانے کے لیے بھیج دیا ۔ جب میں واپس آیا تو مستری مہتاب دین اپنے اوزار وغیرہ اٹھائے کچھ جھکا ہوا سا ، مل رائٹ شاپ سے باہر لوکو شاپ کی طرف آرہا تھا ۔ جہاں لوہے اور بھاپ کے ان محیر العقول دیوؤں کی (جن کو تم آہنی پٹریوں پر بھاگتے ہوئے دیکھتے ہو) مرمت اور فٹنگ ہوتی ہے ۔ اسے Comp.air پر کچھ کام کرنا تھا جو مل رائٹ شاپ میں دستیاب نہ تھی ۔ میں بھی مستری مہتاب دین کے ساتھ ہولیا کیونکہ لوکو شاپ دیکھنے کا جو موقعہ بھی آئے میں ، ہمیشہ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں ۔۔۔ ہم ان ایک سو من کے K۔B پائپ کے دیوؤں کے پاس سے گزرے جو لوکو شاپ کے باہر بے کار اور ابدی انتظار میں کھڑے ہوئے تھے ۔ کیونکہ وہ ایک ریلوے انکوائری بورڈ کی تحقیق کے مطابق بھاگتے بھاگتے لوہے کی پٹریوں سے نیچے اتر جانے کا رجحان رکھتے ہیں ۔ اب انہیں شریر لڑکوں کی طرح ، ایک طرف بے کار کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں وہ کوئی شرارت نہیں کر سکتے تھے ، شاید کبھی اب ریل گاڑی نہیں کھینچیں گے ۔ ان کے غرور اور طاقت کے دن ختم ہو چکے ہیں ۔ مستری مہتاب دین نے فخریہ ان میں سے ایک انجن کی طرف اشارہ کیا جس کے پہیوں کی فٹنگ ۱۹۲۹ء میں اس نے کی تھی ۔ انجنوں کے پاس سے ہوتے ہوئے ہم لوکو شاپ میں داخل ہوئے ۔ مشینوں اور کلوں کی مسلسل گڑگڑ ، غیر زمینی بدروحوں کی طرح چیختی ہوئی Comp.air کی سوراخ کرنے والی سوئیاں گڑگڑاتی ہوئی ٹرالیاں ، کلہاڑے اور ہتھوڑے کا شور ، شعلوں کی لمبی لکیریں اندھیرے میں زبانوں کی طرح لپکتی اور غائب ہوتی ہوئیں ۔ درمیان میں کہیں کہیں انجنوں کے مہیب اور سیاہ ڈھانچے کھڑے ہیں ۔۔۔ خاموش اور بے حس ، جن کی تیمار داری کے لئے لاتعداد مشینیں سارا دن گڑگڑاتی رہتی ہیں اور ہزاروں آدمی اپنا پسینہ بہاتے اور اپنے کپڑے

سیاہ کرتے ہیں ۔ کہیں کہیں دیو ہیکل کرینوں کے آہنی پنجے نگاہ کو روکتے ہیں ---۔ آہنی پنجے جو گزرنے والوں اور کام کرنے والوں کے سروں کے اوپر دھمکی کے انداز میں جھولتے رہتے ہیں، آہنی پنجے جو بڑھائے جاسکتے ہیں اور سمیٹے جاسکتے ہیں،ہیں جو دو دو من بھاری پہیے کو اس طرح آسانی سے اوپر اٹھالیتے ہیں جیسے ہم روئی کا پھاہا اٹھاتے ہیں ۔ میں مسحور سا ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک آہنی پنجے کو ایک بائلر کو دبوچے اور اس کو دور ایک انجن کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھنے لگا ۔ آہنی پنجے کی حرکت کو کرین کے اوپر ٹرالی میں بیٹھا ہوا سرخ داڑھی والا آدمی کنٹرول کر رہا تھا ---۔ ٹرالی اوپر اپنی پٹڑیوں پر دوڑ رہی تھی اور اس بائلر کو اپنی منزل پر لیے جارہی تھی ۔

مستری مہتاب دین کچھ عرصے کے لیے ایک کیبن میں ایک اسسٹنٹ چارج مین سے باتیں کرنے کے لیے رکا ۔ اسسٹنٹ چارج مین نے ایک خالی Comp.air کی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا جس پر اس وقت کوئی کام نہیں کر رہا تھا اور جسے مستری مہتاب دین اپنے استعمال میں لاسکتا تھا ۔ میں نے پہلے Comp.air سے سوراخ ہوتے نہیں دیکھا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا ۔ ہم دونوں اس ٹیوب کے پاس جابیٹھے اور مستری مہتاب دین پنسل سے اپنے نشانات کو زیادہ واضح کرنے لگا ۔ ہمارے پاس ہی بائیں طرف ایک انجن کا آدھا اگلا ڈھانچا کھڑا تھا ۔ چار پانچ آدمی کوئلے سے سیاہ اوورآلوں میں کھڑے ہوئے امید اور انتظار کے عالم میں اوپر چھت کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور آسمان سے کسی نعمت کے اترنے کے امیدوار ہیں ۔ ان میں سے ایک بے چین لہجے میں چلارہا تھا "ذرا آگے ...... اور دائیں .... شاباش" ۔

مستری مہتاب دین یلکخت اٹھ کھڑا ہوا ۔ Comp.air کی ٹیوب ذرا دور اور کچھ اونچی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے اس تک ہاتھ نہیں پہنچاسکتا تھا ۔ میں نے انجن کے گرد کھڑے ہوئے آدمیوں کی نگاہوں کے مرکز کی طرف دیکھا ۔ یہ مرکز اوپر کرین کی ٹرالی تھی جو اپنے آہنی جھولتے ہوئے ہاتھ میں ایک گول سلنڈر نما بائلر کو اٹھائے اس کو انجن کی طرف لارہی تھی ۔ پھر یکایک میں نے دیکھا کہ مستری مہتاب دین ٹھیک اس انجن اور اس آتے ہوئے آہنی پنجے کے درمیان کھڑا ہوا تھا ۔ میں اس کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے چلایا ۔ اسی وقت انجن کے گرد کھڑے ہوئے دوسرے آدمی بھی چلّائے ۔ میرے چلّانے پر اس نے جلدی سے منہ میری طرف پھیرا اور عین اسی وقت بائلر ٹھیک اس کے منہ کے اوپر آکر لگا ---۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ایک لٹو پر کھڑا ہوں ۔ ساری ورکشاپ میری آنکھوں کے سامنے گھوم سی گئی ۔ پھر میں نے ایک پل کے لئے بائلر کی چمکتی ہوئی پتیل کو رم کو دیکھا جو مستری مہتاب دین کو ٹھوڑی سے جکڑے فرش پر گھسیٹ رہی تھی -----۔ جب کہیں وہ آہنی پنجا اور وہ بائلر اپنے دیوانے سفر کو روک سکے ۔ مستری مہتاب دین کا جسم ایک گٹھڑی کی طرح نیچے فرش پر گرا ۔ یہ سانحہ اتنا ہولناک اور اچانک تھا کہ اب بھی

مجھے یہ ایک مبہم سا بد خواب معلوم ہوتا ہے ---- میرے گرد ایک ہزار آدمیوں کا شور تھا ۔ ہم سب مستری کے جسم کی طرف بھاگے ۔ میری آنکھوں کے سامنے اب بھی چرے ہوئے جبڑے کا عکس سا ہے ۔ اوور آل میں ملبوس ایک آدمی نے خون میں لتھڑے ہوئے جسم پر سیدھا ہوتے ہوئے کہا --

"---مر گیا---"

بہت سے آدمی اوپر ٹرالی کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ میں نے بھی اوپر دیکھا ۔ کرین کی ٹرالی میں بیٹھا ہوا آدمی اوپر سے جھکا ہوا نیچے لپنے کیبے کو دیکھ رہا تھا ۔ اس کی داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ تھی اور مجھے اس کے موٹے ہونٹوں میں ایک خوفناک سی ہنسی چنگاریاں چھوڑتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ وہ مستری رحیم بخش تھا ۔

بعد میں سب نے کہا کہ یہ ایک حادثہ تھا --- ایک بہت افسوسناک حادثہ ۔ مگر اس حادثے کے متعلق میرے لپنے خیالات تھے اور میں نے ان خیالات کو لپنے تک ہی رکھا ۔ شاپ میں سب سے زیادہ مغموم خود مستری رحیم بخش معلوم ہوتا تھا ۔ جس کی سرخ داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی اور جو ہر ایک سے کہتا پھرتا تھا کہ وہ لپنے ایک ہی اور بہترین دوست کا قاتل ہے ۔ دوسرے ورکمین اس کی ڈھارس بندھاتے ، اس سے ہمدردی جتاتے اور اسے اطمینان دلاتے کہ اس میں اس کا مطلق قصور نہیں تھا اور مستری مہتاب دین کو موت قدرت کی طرف سے آئی تھی ۔

(بعد میں انکوائری کمیٹی نے مستری رحیم بخش کو صاف بری کر دیا --- اسے آئندہ صرف محتاط رہنے کی "سزا" دی گئی ۔ شاید یہ حادثہ ہی تھا ۔)

ان دنوں کا روزنامچہ لکھنا ، لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوگا ۔ یہ وہی پرانی رونے دھونے اور رنج والم کی کہانی ہے جو گھر کے روٹی کمانے والے کی موت کے بعد ہمارے ہزاروں گھروں میں دہرائی جاتی ہے ۔ بیوہ اور رضیہ کا غم بیان کرنے کی بجائے تصور کیا جاسکتا ہے ۔ میں اس بارے میں صرف اسی قدر لکھوں گا کہ میں مرحوم کی تجہیز و تکفین سے لے کر بعد کی دلدوز گھڑیوں تک اس غمزدہ کنبے کے لیے ڈھارس اور امید کا باعث بنا ۔ بیوہ مجھ پر بیٹے کا دعویٰ رکھنے لگی اور میں بھی اسے اپنی ماں سمجھنے لگا ۔

ان آدمیوں میں سے جو مرحوم کی ماتم پرسی اور چہلم پر آئے مرحوم کے کچھ گوجرانوالہ کے رشتہ دار بھی تھے --- معمولی چھوٹے سے آدمی جنھوں نے رسم کے طریقے پر بیوہ اور بچوں کو گوجرانوالہ چلنے اور ان کے پاس رہنے کا مشورہ دیا ۔ بیوہ نے جو ایک خوددار عورت تھی اور رشتہ داروں کے ٹکڑوں پر پلنا غلط سمجھتی تھی انکار کر دیا ۔ پھر اس کو میرا بڑا سہارا تھا ۔ ان رشتہ داروں کے علاوہ ورکشاپ کے کئی ورکمین ماتم پرسی اور ہمدردی کے لئے آئے کیونکہ اپنی دینداری

اور خوش خلقی کی وجہ سے مرحوم مستری ورک مینوں میں کافی ہر دلعزیز تھا۔ ان لوگوں میں مستری رحیم بخش بھی شامل تھا اور اس کا غم دوسروں کے غم سے زیادہ گہرا اور حقیقی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پاس عورتوں کی طرح آنسوؤں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا جسے وہ بات بات پر بہانے کو تیار تھا (مگر مجھے کسی کی نیت پر شک کرنے کا حق نہیں پہنچتا) بیوہ بھی اپنے غم کے شدید ترین لمحوں میں چیخ چیخ کر مستری رحیم بخش کو اپنے خاوند کا قاتل بتلاتی تھی اور اس کو غائبانہ ہزاروں بددعائیں ارسال کرتی تھی، اپنے پرسکون لمحات میں اس بات کو ماننے لگی تھی کہ اس کا خاوند ایک حادثے میں مرا ہے۔ مجھے بھی کچھ کچھ یقین ہو گیا کہ مرحوم کی موت ایک حادثہ تھا۔ اگرچہ اس یقین نے اس نفرت کو جو میرے دل میں اس سرخ داڑھی والے آدمی کے خلاف گھر کر چکی تھی کسی طرح بھی کم نہ کیا۔

مستری مہتاب دین کی موت کے ڈیڑھ مہینے بعد شیخ شیر علی کی دوکان پر بیٹھا اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ مشورہ کر رہا تھا کہ مستری کا چھوٹا لڑکا فضل پیغام لایا کہ اماں بلاتی ہیں۔ چھوٹا لڑکا کچھ ڈرا اور سہما ہوا سا تھا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھے بغیر بالاخانے کا رخ کیا۔ اوپر پہنچا تو اندر کمرے میں سے وہ گھٹتی ہوئی شوریدہ آواز سنائی دی جو میری اسقدر جانی پہچانی تھی اور جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ بیوہ کچھ ڈری اور سکڑی ہوئی نیچے دری پر بیٹھی تھی۔ مستری رحیم بخش لنڈے بازار کے ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ خود اعتمادی سی تھی اور ہونٹوں میں دبکی ہوئی غولانہ مسکراہٹ جو میں نے اس وقت اس کے چہرے پر دیکھی تھی جب وہ مرالی میں جھکا ہوا نیچے مستری کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی میرے کان میں کہہ رہا تھا "یہی قاتل ہے۔ قاتل یہی ہے"۔ اس نے میری آمد کو مطلق کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی گھٹتی ہوئی قابل نفرت آواز میں کہہ رہا تھا "مرحوم میرا تین ہزار روپئے کا مقروض ہے۔ بے شک بہن، یہ سنگ دلی معلوم ہوتی ہے کہ میں اب اس روپئے کا تقاضا کروں جبکہ مرحوم کے خاندان پر یکلخت اتنی سخت مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ مگر میں کیا کروں مجھے فی الواقع اس روپئے کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ نواں کوٹ میں میرے مکان کی تعمیر صرف روپئے کی کمی کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔"

"مگر تمہارے وہ کاغذات کہاں ہیں جن پر قرضے کی لکھت پڑھت ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے ایک کینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے جواب دیا "بے شک مرحوم میرا بہترین دوست تھا مگر روپئے کے معاملے میں یہ میری پرانی عادت ہے کہ میں زبانی قول قرار سے لکھت پڑھت کو زیادہ محفوظ سمجھتا رہا ہوں۔ میرا مقولہ ہے کہ "حساب۔ حساب ہے"۔ اس نے اپنے لمبے بھورے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے کاغذات کا ایک پلندہ نکالتے ہوئے کہا

"کاغذات اب بھی میرے پاس ہیں۔ یہ سرکاری اسٹامپ والے کاغذ ہیں اور ان پر مرحوم کے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ اس نے فلاں فلاں تاریخ کو مجھ سے اتنا قرضہ لیا۔ عام آدمیوں سے میں روپئے کے پیچھے چار آنہ سالانہ سود لیتا ہوں مگر مرحوم کو میں نے بغیر سود کے قرض دیا تھا۔"

"تین ہزار روپیہ!" بیوہ گڑگڑاتے لہجے میں بولی "دیکھو بھائی رحیم بخش۔ تم اس کے اتنے گہرے دوست تھے۔ تمہیں معلوم ہے ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی ہے۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں گھر کا کمانے والا چل بسا ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ اس مہینے مکان کا کرایہ کیسے چکاؤں گی۔ میں تمہاری پائی پائی ادا کروں گی مگر مجھے کم از کم تین چار مہینے کی مہلت تو دو"۔

"میں اس روپئے کا بالکل تقاضانہ کرتا"۔ مستری رحیم بخش بولا "اگر میرے نواں کوٹ والے مکان کی تعمیر روپئے کی کمی کی وجہ سے رک نہ جاتی۔ تعمیر کے رکنے سے مجھے مالی نقصان ہو رہا ہے۔ اس وقت تک وہ مکان کرایہ پر چڑھا ہوا ہوتا۔ اب میں انتظار نہیں کر سکتا۔"

تھوڑی دیر تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ اس آدمی کی سنگ دلی اور بے حسی نے ہمیں کچھ عرصے کے لئے مبہوت کر دیا۔ اس کے چہرے پر وہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ ایک اطمینان سا جیسا شاید اس مکڑے کو محسوس ہوتا ہوگا جو ایک مکھی کو اپنے جالے میں پھنسا ہوا دیکھ لیتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صورت کیا تھی جس کی طرف اس مکار بوڑھے نے اشارہ کیا تھا۔۔۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا! بیوہ بھی دل میں جانتی تھی کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ اس بوڑھے کے ہاتھ میں دینے پر اس کی موت کو ترجیح دے سکتی تھی۔ مگر عورت ایک کمزور مخلوق ہے۔۔۔ کمزور اور متلون مزاج۔۔۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ مستری رحیم بخش کے پھیلائے ہوئے جال میں کوئی چیز پھنس کر تڑپنے لگی ہے۔

بیوہ شاید اب بھی منت سماجت سے اس سنگ دل کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی مگر میں بول پڑا۔ "مستری رحیم بخش۔ تم ان عورتوں کو زیادہ تنگ نہ کرو۔ تم میرے ساتھ نیچے دوکان پر چلو۔ تمہارا سارا روپیہ میں چکاؤں گا۔۔۔ میں"۔ اگرچہ مجھے اس کا ذرہ برابر بھی پتہ نہ تھا کہ میں اتنا سارا قرضہ کیسے چکا سکونگا۔

بیوہ نے مجھے کچھ تشکر اور کچھ شک کی نظروں سے دیکھا۔ بوڑھا رحیم بخش اسی کمینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیخ شیر علی کا بنک میں کچھ روپیہ جمع ہے۔ شاید وہ مجھے ادھار روپئے پر رضامند ہو جائے یا شاید قانونی طور پر کوئی ایسا رخنہ مل جائے جس سے یہ بوڑھا مستری، بیوہ سے قرضہ وصول کرنے کا حقدار ثابت نہ ہو سکے۔ جو کچھ بھی ہو اس بات کا میرے دل میں پختہ ارادہ تھا کہ اب میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا کہ بوڑھا دوبارہ جاکر بیوہ اور رضیہ کو کڑھائے اور رلائے۔ جس وقت ہم بالاخانے سے اترے، رحیم بخش میرے ساتھ دوکان پر چلنے کی بجائے مجھے سیڑھیوں کے دروازے کے سامنے روک کر

کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لومڑی کی سی عیاری تھی۔ وہ شاید اس شبے میں مبتلا ہو رہا تھا کہ کہیں میں سچ مچ ہی اس کا قرضہ چکادوں اور بیوہ کو اس کے چنگل سے رہائی مل جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔

"میری بات سنو" ۔ وہ کہنے لگا "تم اس معاملے میں کیوں پڑتے ہو۔ تم نے کیا سارے جہاں کے دکھ درد کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ کیا یہ لوگ تمہارے قریبی رشتہ دار لگتے ہیں کہ تم ان کی خاطر تین ہزار سے ہاتھ دھونے کو تیار ہو رہے ہو؟ تم کو آج کے زمانے میں شاید روپئے کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہیں" ۔۔۔ پھر اس نے اچانک پینترا بدلا "میری بات سنو۔ مجھ سے ایک ہزار روپئے لو اور اس معاملے میں دخل نہ دو۔ تم اس بات میں آدہی نہیں ۔۔۔ میں ۔۔۔۔"

وہ اپنے فقرے کو مکمل نہ کر سکا۔ اس کی گھٹی آواز فوراً گویا کٹ کر رہ گئی۔ اوپر خطرناک طور سے اٹکی ہوئی اس لالٹین کے ڈھانچے نے یہی لمحہ اپنے گرنے کے لیے چنا۔ میں نے لالٹین کو اس کے سر کے اوپر تڑاخ سے گرتے دیکھا۔ اس نے قدرتی طور پر اپنے بازو سر کو بچانے اور مقدر کے اس وار کو روکنے کے ارادے سے اٹھانے چاہے مگر لالٹین تو ہاتھ اٹھنے سے پہلے گر چکی تھی۔ اور مستری رحیم بخش دروازے سے باہر آخری سیڑھی پر منہ کے بل جا گرا تھا ۔۔۔ ایک لمحے تک وہ درد اور تکلیف سے کلبلاتا رہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ لالٹین اس کے سر کے اوپر بیس فٹ کی بلندی سے گری تھی اور گری بھی سیدھی اپنی بھالا نما دم کے بل جو ٹھوس لوہے کی تھی اور لالٹین کا سب سے بھاری حصہ تھی۔ وہ نوکدار دم اس ساری قوت کے ساتھ جو بیس فٹ کی بلندی نے اس میں پیدا کر دی تھی اس کے سر میں آگڑی اور اس کی پیشانی کو چھیدتی ہوئی نیچے سڑک پر کسمساتی ہوئی جا پڑی۔ شیخ شیر علی نے اپنی دوکان سے لالٹین کو مستری رحیم بخش کے سر پر گرتے ہوئے دیکھا۔ دو تین راہ چلتوں اور دو کانداروں نے بھی یہ منظر دیکھا اور وہ بھاگتے ہوئے آپہنچے ۔۔۔

جلدی سے مستری رحیم بخش کو ایک فوجی ٹرک میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ مگر میں نے سنا ہے کہ وہ رستے ہی میں مر گیا ۔۔۔ ایک حادثہ ۔۔۔۔ نہایت افسوسناک حادثہ ۔۔۔۔

رضیہ اب میری بیوی ہے اور ہم دونوں شیخ شیر علی کے بالاخانے میں رہتے ہیں۔ شیخ شیر علی کو ابھی تک فصلی بٹیر لمیٹیڈ سے مکالمہ نویسی کی پیش کش نہیں آئی اور اس لیے اس نے چار و ناچار اپنے آپ کو ایک باتونی عورت کی موجودگی برداشت کرنے پر رضامند کر لیا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس طرح کچھ عرصے تک اس کے اعصاب پر غیر موافق اثر پڑے گا مگر اس کا تو وہ بھی اقرار کرے گا کہ جو کھانے رضیہ بناتی ہے وہ بے حد لذیذ ہوتے ہیں اور ہوٹل کے کھانوں سے کہیں زیادہ ٹھوس اور قوت بخش۔ کہتے ہیں ایک اچھی بیوی اپنے ساتھ اچھی قسمت بھی لاتی ہے دوسری بیویوں کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں مگر رضیہ کی صورت میں یہ بالکل درست ہے۔ شادی کے دوسرے ہی دن مجھے فورمین نے بلا کر یہ خوشخبری دی کہ مجھے اس مہینے سے مستری بنادیا گیا ہے

(خان بہادر کا اس میں مطلق کوئی ہاتھ نہیں) رضیہ صرف میرے لیے ہی خوش قسمتی نہ لائی بلکہ میرے دوستوں کے لئے بھی کیونکہ جس روز مجھے مستری بنایا گیا شیخ شیر علی کو مدیر رسالہ " بھینس کا خط موصول ہوا جس میں اس کے مضمون " قرون وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت " کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور استدعا کی گئی تھی کہ آئندہ بھی اسی پائے کے مضامین سے رسالے کی قلمی معاونت کو جاری رکھا جائے۔

اور کل ہی مجھے الہ دین انار کلی میں ملا۔ اسے کنڈکٹر سے ترقی دے کر چیکر بنا دیا گیا ہے ---ایک دم چیکر!

•-•-•-•-•-•-•-•-•-•-•-•-•-•

جیلانی بانو

کھیل کا تماشائی

ڈرامہ شروع ہو رہا تھا۔
دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر ہونٹ ہلانے کی پریکٹیس کر لی تھی میں نے۔
سیاہ ڈاڑھی والا ہمارا اونچا پورا ڈائریکٹر، بھگوان داس، اسٹیج کے بیچ میں کھڑا چلا رہا تھا۔ اسی کے اشاروں پر مجھے مڑ جانا تھا، آگے بڑھنا تھا، تھم جانا تھا۔
prompter اپنی کتاب کھولے میری طرف جھکا ہوا تھا۔
"تم بھولے بھٹکے اس گاؤں میں آنکلے ہو۔ وہ تمہارے پیچھے دوڑے گا۔ اگر تم اپنا بچاؤ نہیں کر سکے تو مارے جاؤ گے۔"
میرے قتل کا منظر دیکھنے کے لئے ہزاروں تماشائی منتظر ہیں۔
منہ پر مکھوٹا باندھے، ہاتھ میں تلوار لیے، وہ میرے سر پر آکھڑا ہوا، جیسے مجھ پر وار کرنا تھا۔
"بچاؤ، بچاؤ۔" میں دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر چلایا۔
"بھاگو بھاگو۔" یہ میرے ڈائیلاگس تھے۔ مگر میری بجائے ہال میں بیٹھے ہوئے تماشائی چلانے لگے۔
ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔
(ہم یہ ڈرامہ نکڑ پر نہیں کر رہے تھے)
رائٹر نے بڑے سوچ بچار کے بعد سکرپٹ لکھا تھا۔ بھگوان داس نے بڑی محنت سے سیٹ تیار کیے تھے۔ جیسے بھگوان اس دنیا کو سنوارتا ہے۔ مگر ہال میں بیٹھے ایک آدمی نے دوسرے کو چاقو مار کے ڈرامے کو کلائمکس پر پہنچا دیا تھا۔ اب ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ تماشائی ہمارا ڈرامہ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ بھگوان داس گھبرا گیا۔ کیونکہ شہر کے منچ پر بھگوان نے ایک دوسرا ڈرامہ شروع کر دیا تھا۔ لوگ گولیوں کی زد سے بچنے کے لئے چلاتے ہوئے دوڑ رہے تھے۔
تباہی کا اتنا بڑا اسیٹ اوپر والا بھگوان اتنی جلدی جانے کیسے تیار کر لیتا ہے!
وہ بھی ہمارے ڈائریکٹر کی طرح زمانے کا رخ پہچان گیا ہے۔ قتل و غارت گری کے ...بنے نئے اور انوکھے منظر دکھائے جانے لگے ہیں۔" (لوگوں کا تمالیاتی ذوق بلند ہو گیا ہے)"
بھگوان داس یہ بات بار بار اپنے آرٹسٹوں سے کہتا ہے۔
"اب تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میں کل صبح تمہیں نہرو اسکوائر پر ملوں گا۔" گھپ اندھیاری میں

کہیں سے بھگوان داس کی آواز ابھری اور ڈوب گئی۔
(بھگوان کے وعدے مجھے ہمیشہ آگے کی طرف ڈھکیلتے رہے ہیں)
"بچاؤ۔ بچاؤ۔" میں چلاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ گھپ اندھیاری میں، روتے چلاتے لوگوں کے ساتھ ساتھ۔۔۔ کچھ چیزیں مجھ سے دور ہو جاتی ہیں۔ مگر قریب کچھ نہیں آتا۔
اب میرے ساتھ ساتھ کرفیو کی کالی رات بھاگ رہی ہے اور اوپر تاروں سے جھلملاتا ہوا آسمان پھیلا ہے۔
ہر چوراہے پر وہ مجھے گھیر لیتے ہیں۔ میرا خوف سے ٹھنڈا بدن چھو کر پوچھتے ہیں۔
"کیا یہ زندہ ہے۔۔۔۔؟"
"نہیں میں مر چکا ہوں۔" میں ان سے التجا کرتا ہوں۔
انہیں میری بات پر یقین آگیا۔ مر جانے کے اعتراف ہی تو موت ہے
وہ آگے بڑھ گئے۔ زندہ لوگوں کو مارنے کے لئے۔
تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں برچھے چمکاتا ہوا ایک اور ہجوم میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ وہ سب میری تلاش میں ہیں۔ کیونکہ انہیں مجھے مارنے کا اختیار ہے۔ وہ مجھے کب سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ کب سے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ مجھ سے بہتر ہیں کہ اپنے مشن کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ بار بار سوچتا ہوں۔ رک جاؤں۔۔۔۔؟ بھاگتا رہوں۔۔۔۔؟
موت میرے پیچھے آرہی ہے تو کتنے دکھ، کتنے پچھتاوے میرے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے مذہب کے اصول بھی بھلا دیے تھے۔ مگر اسٹیج پر اوتاروں، دیوتاؤں کے وچار چلا چلا کر تماشائیوں کو سناتا رہا ہوں۔ وہ سب بھولے بھالے تماشائی، جو مجھے بھگوان کے روپ میں دیکھ کر خوف سے سر جھکا لیتے تھے۔ رام بن کر چودہ برس کے بن باس کی ایکٹنگ مجھے اتنا تھکا دیتی تھی کہ پردہ گرتے ہی رام کا وستر اتار پھینکتا تھا۔ لوگوں کی تالیاں میرا سر اونچا کر دیتی تھیں۔
مگر میں رام کے روپ میں تھوڑی دیر جینے کی ہمت کبھی نہ کر سکا۔ اسٹیج کے پیچھے جانے کے بعد مجھے سنسار میں پھیلا انیائے نظر آیا نہ میں نے کسی کی ایک چھوٹی سی خوشی پوری کرنے کے لئے اپنے من کو مارنے کی بات سوچی۔
میں ہر جگہ سے کتنی جلدی گذر گیا۔ فیصلے کی گھڑی کبھی نہیں آئی۔
مگر اب میں چلا چلا کر لوگوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ مجھے مت مارو، میں نے بھگوان کے روپ دھارے ہیں۔ تم نے مجھے رام کی شکل میں دیکھا ہے۔
ہر طرف میری آواز گونج رہی ہے۔ ہر طرف سے مارنے والے مجھے گھیر رہے ہیں۔
اونچی بلڈنگوں والے لوگ اپنی کھڑکیاں کھول کر میرے مرنے کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے کیمروں کا فوکس میرے اوپر کر دیا ہے۔ اس فلم کو وہ دنیا کی مہنگی مارکیٹ میں بیچ کر اس سال

کانیشنل اوارڈ حاصل کرینگے (دنیا آرٹ کی قدر کرتی ہے)
اسی لئے تو مجھے اس دنیا سے اتنا پیار ہے۔ جیسے یہ دنیا خدا نے نہیں، میں نے بنای ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میری موت اور حیات بھگوان داس کے ہاتھ میں تھی۔
"اگر اپنا بچاو نہ کر سکے تو مارے جاوگے۔" اسٹیج پر تلوار اٹھانے والا میرا دشمن شاید اب بھی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ اسی لئے میں بھاگ رہا ہوں۔ کہیں چھپ جانا چاہتا ہوں۔
اب صرف اس کے وار سے بچنا ہی میری زندگی کا مقصد رہ گیا ہے۔
"کون ہے تو۔۔۔۔؟" میرا دشمن مجھ سے پوچھ رہا ہے۔
"یہ سوال تو میں نے بھی اپنے آپ سے کئی بار کیا ہے۔ جب بھی بھگوان داس نے میرا چہرہ میک اپ میں چھپا کر مجھے ایک نئے کردار میں ڈھالا، میں اپنے آپ کو بھول جاتا تھا۔ مجھے جو ڈائیلاگس بولنے تھے، وہ کوئی اور لکھتا تھا۔
میں اسے کیا جواب دیتا۔۔۔؟ بھاگتا رہا۔ جب ہمارے پاس کوئی جواب نہ ہو تو بھاگ جانا ہی بہتر ہے۔
"بچاو۔ بچاو۔۔۔" میں چلانے لگا۔
اب وہ میری گردن پر وار کرنے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی تلوار سے میری گردن اڑا دے، میرا گھونسہ اس کا منہہ توڑ دے گا۔ اسے مار ڈالنے کے خوف سے میں لڑکھڑانے لگا ہوں۔
"مجھے مت مارو۔" میں اپنے پیچھے آنے والے سائے سے کہتا ہوں۔
"کیوں۔۔۔! کیوں نہ ماروں، تمہیں زندہ رکھنے کا کوئی جواز تو ہونا چاہیئے۔"
یہ بات تو میں نے بھی کئی بار سوچی تھی۔ میرے زندہ رہنے کا مصرف کیا ہے۔۔۔؟ میری ماں کہتی تھی کہ خدا کی طرح میرے ماں باپ بھی میری پیدائش نہیں چاہتے تھے۔ شاید انہیں بھی اس جھمیلے کا اندازہ تھا کہ اس ضدی انسان کے لئے ایک کائنات تخلیق کرنا پڑے گی انہیں، صحیفے اتارنا ہونگے۔ اوتاروں پیغامبروں کا تانتا بندھ جائے گا، مجھے راہ راست پر لانے کے لئے۔۔۔۔۔ کونسی راہ پر۔۔۔۔؟
"اگر میں نے تمہیں مار ڈالا تو میرا کیا ہوگا۔۔۔؟" میں گھبرا کر اس سے پوچھتا ہوں۔
"بھول جاو اس خوش فہمی کو۔" وہ ہنس کر کہتا ہے "تم میرے وار سے نہیں بچ سکتے اب۔"
مجھے کہاں کہاں نہیں ہونا چاہیئے۔ میں ان جگہوں کو الانگھتا ہوا بھاگ رہا ہوں۔
مگر موت میرے بہت قریب آگئی ہے۔ اب بھگوان داس کے اسٹیج پر مجھے اپنی موت کا سین نظر آرہا ہے۔ ہزاروں سوگوار مرد، ہاتھوں میں پھول مالائیں لیے، روتی ہوئی عورتیں، ٹی۔ وی پر نیتاوں کے بھاشن۔
"بہت عظیم فن کار تھا وہ، ہزاروں دلوں کو خوش کرنے والا عظیم آرٹسٹ،

اس کی موت دیش کا بہت بڑا نقصان ہے۔"
اب میں لوہے کا بت بنا شہر کے کسی چوراہے پر کھڑا ہوں۔ ہاتھ اٹھائے، دنیا کو فن کے لازوال ہونے کا یقین دلا رہا ہوں، ہال میں بیٹھے ہوئے تماشائیوں سے کہہ رہا ہوں۔
"کیا تم گواہی دو گے کہ کرفیو کی اس کالی رات میں کہاں کہاں بھاگتا پھرا۔ میں نے کتنے لوگوں کو پکارا کہ مجھے بچالو۔۔۔ تم سب کو۔۔۔۔ جو میری عمدہ اداکاری پر تالیاں پیٹتے رہے ہو۔ مگر جب پردہ گر جاتا ہے تو گھپ اندھیاری میں ڈوب جانے والے فن کار کو بھول جاتے ہو۔ ماضی کے اسٹیج پر کتنے سوانگ رچائے میں نے۔ کبھی بہادر سورما بنا۔ کبھی جی جان سے گذر جانے والا عاشق، اور کبھی ایسا دیوتا جس کے آگے سب سر جھکا دیتے ہیں۔
میں نے اپنے آپ کو کتنے معنی دیے۔ مگر دنیا نے مجھے بے معنی ہی سمجھا۔
اب میرے آگے صرف آج ہے۔ اب۔ اور کچھ نہیں۔
"شاید میں پہلے اسے مار ڈالوں۔۔۔ پھر میرا کیا ہوگا۔۔۔۔؟"
ہم دونوں میں سے کسی ایک کو قاتل بننا ہے۔ جب میں اپنے آپ کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو رونے لگتا ہوں۔ جب اسے قتل کر دیتا ہوں تو چلانے لگتا ہوں۔
"بچاؤ۔ بچاؤ۔"
کسی کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ یہ میری آواز ہے۔ ہر طرف سے میرے رونے کی آواز آرہی ہے جیسے بھگوان داس نے اسٹیج کے سب مائیک بند کر کے صرف میرے رونے کی آواز ابھار دی ہے اب میں خود ہی اداکار تھا، خود ہی اس کھیل کا تماشائی بنا، ایک نہتے انسان کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے منہ پر بندھے ہوئے مکھوٹے گر چکے ہیں۔ اسٹیج پر ادا کرنے والے ڈائیلاگس وہ بھول چکا ہے۔ ایک ایک کر کے وہ سارے لبادے گر چکے ہیں، جو اس نے دیوتاؤں اور سورماؤں کا سوانگ رچاتے وقت اپنے اوپر ڈال لیے تھے۔
"بھگوان۔۔۔ او بھگوان داس، تم کہاں ہو۔۔۔؟"
میری چیخیں سن کر وہ ہنسنے لگتا ہے۔
"بھگوان کو پکار کر میری ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے۔۔۔"
مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ امن کا پرچار کرنے والے ہاتھوں میں بڑی بڑی تختیاں اٹھائے دکھوں کا بیوپار کرنے والے، سڑکوں پر نعرے لگا رہے تھے۔۔
یہ لوگ صرف لاشیں گننے کے لیے آتے ہیں۔ سڑکوں پر بہتے ہوئے خون کو الگ الگ نام دینے کے لیے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ موت آگئی ہے۔
چمکتے ہوئے برچھے لہراتے، لاٹھیاں گھماتے مارنے والے ہمارے سر پر آپہنچے تھے۔
"ہمیں مت مارو۔" ہم دونوں خوشامد کرنے لگے۔

"میں ہندو نہیں ہوں۔ میں مسلمان نہیں ہوں، اللہ کی قسم، بھگوان کی سوگند۔"
ہم دونوں اپنے ڈائیلاگس بھول کر، ایک دوسرے کے مکالمے دہرانے لگے۔
"بتاؤ یار، انہیں کیا ماریں! ضمیر سے خالی بدن ہو چکے ہیں سالوں کے۔"
یہ کس کے ڈائیلاگس تھے۔ اسٹیج پر تو یہ اداکار نظر نہیں آتے۔ بس صرف ان کی آواز ہمیشہ کلائمکس سین کا مزہ خراب کر دیتی ہے۔
"اگر میں آج تیرے ساتھ نہ ہوتا تو ابھی ڈھیر ہو جاتا تو۔"
"اب تو ڈھیر ہو جانے کو تیار ہو جا۔ وہ سامنے ہندو اسکوائر نظر آرہا ہے۔ وہاں مجھے بھگوان مل جائے گا۔"
"اور میرے لوگوں کی بستی آگئی ہے۔"
"نہیں نہیں۔ تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" میں نے ڈر کے مارے چلا کر کہا۔
اس کے حملے سے بچاؤ کرتے کرتے میں اپنے قاتل کا عادی ہو گیا تھا۔ آگے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اپنے قاتل کی للکار ہی تو مجھے آگے کی طرف دوڑا رہی ہے۔
پھر جانے کدھر سے وہ سب نکل آئے۔ رام اور رحیم کے رکھوالوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وہ سب چاروں طرف سے ہم پر جھپٹ پڑے، تو وہ مجھ سے یوں لپٹ گیا، جیسے سایہ اپنے بدن میں سما جائے۔
اب میں ایک ہاتھ سے اسے تھامے ہوئے تھا، دوسرے ہاتھ سے اسے ڈھکیل رہا تھا۔
آگے کہاں پاؤں بڑھاتا۔۔۔؟ سامنے ایک لاش پڑی تھی۔
"یہ تمہاری لاش ہے۔"
"میری۔۔۔؟ نہیں، تمہاری۔۔۔۔"
ہم نے لات مار کے لاش کو گٹر میں ڈھکیل دیا۔۔۔۔۔۔

عابد سہیل

"کھیل کا تماشائی" — ایک تبصرہ

(تبصرہ مصنف کے نام کو مخفی رکھ کر کرایا گیا ہے)

"کھیل کا تماشائی" ایک مشکل افسانہ ہے۔ مشکل یوں کہ نہ اس میں علامت کی ایسی کارفرمائی ہے کہ جس کے سہارے جس طرح جی چاہے اس کی تاویل کر دی جائے۔ نہ نثر کا وہ جادو ہے جو قاری کو واقعات اور کشمکش سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کر لے، نہ اساطیر کے حوالے سے حال کو ماضی میں لے جانے یا ماضی کو حال تک کھینچ لانے کی کوئی کوشش اور نہ سیدھا سادا بیان کا وہ انداز جس میں ایک واقعہ کی چول دوسرے واقعہ کے ساتھ زمانی تسلسل میں بیٹھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک مخصوص فضا ہے، واقعات میں ایک ترتیب ہے جو جگہ جگہ بے ترتیب بھی ہو جاتی ہے لیکن دو چار پیراگرافوں کے بعد اس "بے ترتیبی کی ترتیب" کی افادیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔

اس افسانے پر غور و خوض عنوان ہی سے کیوں نہ شروع کیا جائے کہ عنوان بھی افسانے کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ "کھیل کا تماشائی" کے مطالعے کے بعد پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ اس کے کرداروں اور تماشائیوں کا نہایت تیزی کے ساتھ مکھوٹے تبدیل کرنا ہے۔ تماشائی بالکل بے نام ہونے کے باوجود کھیل میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ڈائرکٹر ہے۔ ایک Prompter ہے۔ لیکن دونوں شاید ایک ہی ہیں۔ عام طور سے Prompter پردے کے پیچھے ہوتا ہے اور اس کھیل میں تو اُسے یقیناً اسٹیج پر نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ "دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر ہونٹ ہلانے کی پریکٹس کر لی تھی میں نے" لیکن اس ڈرامے میں یعنی کہانی کے ڈرامے میں وہ اپنی کتاب کھولے اسٹیج کے بیچ میں کھڑا ہے گویا اسے احساس تک نہیں کہ دوسروں کو اپنی کہی ہوئی بات پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرنا کچھ ایسا پسندیدہ عمل نہیں۔ یہی حال ڈائرکٹر کا ہے۔ نام بھی اس کا توجہ طلب ہے۔ "بھگوان داس" یعنی بھگوان کا خادم یا اس کی ایما پر کام کرنے والا۔ یہ ریہرسل نہیں ہے کیونکہ ہزاروں تماشائی ہال میں موجود ہیں۔ اس کی یہ ہدایت کہ "تم بھولے بھٹکے اس گاؤں میں آنکلے ہو۔ وہ تمہارے پیچھے دوڑے گا۔ اگر تم اپنا بچاؤ نہ کر سکے تو مارے جاؤگے"

کچھ اس قسم کی ہے جو ڈرامے کی ریہرسل کے بالکل ابتدائی مرحلے میں دی جاتی ہے۔ لیکن اُسے نہ تماشائیوں کی فکر ہے نہ کردار کی کیوں کہ شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ دونوں پوری طرح اس کی گرفت میں ہیں۔

انسانی ذہن کے ارتقا میں پہلی منزل ہوتی ہے Thinking by doing (گڑیا ایک جگہ سے اٹھاکر دوسری جگہ رکھتے ہوئے یہ کہنا "اچھا تو یہ گڑیا اٹھاکر یہاں رکھ دی") دوسری منزل ہوتی ہے Thinking by saying۔ (ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے کہنا کہ "اچھا تو اب وہاں چلیں") مجرد فکر کی منزل سب سے آخر میں اس وقت آتی ہے جب انسان اشیا اور الفاظ کا سہارا لئے بغیر خیالات کی جمع تفریق کرلیتا ہے۔ افسانوی ادب میں عموماً اور ڈرامے میں خصوصاً ذہنی ارتقا کی اول الذکر دونوں منزلوں سے خوب خوب کام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں "بچاؤ بچاؤ" اور "بھاگو بھاگو" بڑے سوچ بچار کے بعد لکھے جانے والے اسکرپٹ میں واقعی بڑے سوچ بچار کے بعد لکھے گئے ہیں۔ یہ دونوں فقرے فطری ردِّ عمل بھی ہیں اور انسانی ذہن کے ارتقا کی ابتدائی منزلوں کا پتہ بھی دیتے ہیں۔ یہ ابتدائی منزلیں تمدّن کی ابتدائی منزلیں بھی ہیں جن کی جانب متمدّن ہونے کے بعد ہم مراجعت کر رہے ہیں۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، یہ الفاظ کردار نے ادا کئے بھی تھے یا نہیں کیوں کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس نے دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر ہونٹ ہلانے کی پریکٹس کرلی تھی۔ ایک اور توجہ طلب امر یہ ہے کہ ہزاروں تماشائیوں میں سے ایک پر بھی "بچاؤ بچاؤ" کا ردِّ عمل نہیں ہوتا لیکن "بھاگو بھاگو" سنتے ہی سب تماشائی چلّانے لگتے ہیں اور بھگدڑ بھی مچ جاتی ہے۔

چاقو زنی کی واردات کے بعد کا یہ جملہ بہت اہم ہے "تباہی کا اتنا بڑا اسیٹ اوپر والا بھگوان اتنی جلدی جانے کیسے تیار کرلیتا ہے۔" اس جملے میں "اوپر والا" بھگوان کا رشتہ بھگوان داس سے جوڑتا ہے۔ بعض باتیں دونوں میں مشترک ہیں۔ مثلاً دونوں ہی:

(۱) لوگوں کو دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر ہونٹ ہلانے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔
(۲) دونوں کے PROMPTERS نظر تو آتے ہیں لیکن اُن پر لوگوں کی توجہ نہیں جاتی۔
(۳) دونوں ریہرسل کے چکر میں نہیں پڑتے۔
(۴) قتل اور غارت گری کے نئے اور انوکھے منظر دونوں کے لئے "لوگوں کے جمالیاتی ذوق" میں بلندی کے مظہر ہیں۔

اس افسانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ نہ کوئی روایتی ہیرو ہے نہ ولین اگرچہ موجود دونوں ہی ہیں لیکن

اُنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدا میں جو "میں" ہیرو معلوم ہوتا ہے اس میں نہ قوّتِ عمل ہے نہ قوّتِ ارادہ۔ دوسروں کی کہی ہوئی باتیں "دہرانے" میں اس کا حصّہ صرف ہونٹوں کی جنبش تک محدود ہوتا ہے۔ وہ یہ تک فیصلہ نہیں کر پاتا کہ رُک جانا بہتر ہوگا یا بھاگ جانا، اور اسٹیج پر اوتاروں اور دیوتاؤں کے وچار چلّا چلّا کر تماشائیوں کو سنانے اور رام بن کر چودہ برس تک ایکٹنگ کرنے کے بعد بھی رام کے روپ میں جینے کی ہمّت نہیں کر پاتا۔ یعنی ساری زندگی ایسا سب کچھ کرنے میں گزار دیتا ہے جس کی حرارت وہ اپنے دل میں ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں کرتا۔ یہ دُہری بلکہ تہری زندگی ایک لمحہ اُسے جیتے رہنے کا احساس دلاتی ہے تو دوسرے ہی لمحے مر جانے کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ روایتی ہیرو اور ولین نہ ہونے کے باوجود اسٹیج کے سارے کردار ذرا ذرا میں ہیرو سے ولین اور ولین سے ہیرو بن جاتے ہیں اور "میں" اور "وہ" ایک دوسرے کے لئے اس طرح لازم و ملزوم بن جاتے ہیں کہ "میں ایک ہاتھ سے اُسے تھامے ہوئے تھا دوسرے ہاتھ سے اُسے ڈھکیل رہا تھا" حتّٰی کہ دونوں اس لاش کو جو وہاں نہیں ہے لات مار کے گڑھے میں ڈھکیل دیتے ہیں۔

لیکن اس افسانے میں ایسا بولتا کردار ہے جسے "میں" سے بہتر قرار دیا جا سکے۔ بھگوان داس، Prompter، ڈرامے کا مصنف یا میں کا ہمزاد یا موت کا تماشہ دیکھنے اور اس کی فلم تیار کر کے نیشنل ایوارڈ حاصل کرنے کا متمنّی؟ کوئی نہیں۔

منفی بلکہ "ناکرداروں" (NON-CHARAETES) کے اس افسانے میں کیا کوئی مثبت کردار نہیں ہے؟ بظاہر تو نہیں لیکن حقیقتاً ہر جگہ ہے۔ ایک ایسا کردار جو اپنی عدم موجودگی میں اپنی موجودگی کا احساس برابر دلاتا ہے۔ اس افسانے کی یہ ایک بڑی خوبی ہے۔

اس افسانے میں طاقت مالک کے ہاتھ سے اُس کے خادم اور خادم کے ہاتھ سے اُس کے مالک کے ہاتھوں میں اس سہولت سے منتقل ہوتی ہے کہ جب تک خاص توجہ سے مطالعہ نہ کیا جائے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میری موت اور حیات بھگوان داس کے ہاتھ میں تھی۔"

اس طاقت سے "کھیل کا تماشائی" میں کہیں یہ نہیں ظاہر کیا گیا ہے کہ اب بھگوان داس کے ہاتھ محروم ہو چکے ہیں لیکن بعد کے واقعات اس جانب اشارہ ضرور کرتے ہیں اور پھر بھگوان کا اسٹیج اصل رزم گاہ بن جاتا ہے، جہاں "ہزاروں سوگوار مرد، ہاتھوں میں پھول، مالائیں لئے روتی ہوئی عورتیں، ٹی۔ وی پر نیتاؤں کے بھاشن:

"بہت عظیم فن کار تھا وہ۔ ہزاروں دلوں کو خوش کرنے والا عظیم آرٹسٹ۔ اُس کی

موت دیش کا بہت بڑا نقصان ہے۔"

بھگوان اور بھگوان داس کے رشتہ میں ایک قسم کا Parallelism ہے۔ دونوں ایک ہی سمت بڑھتے اور مراجعت کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے نامکمل کاموں کی تکمیل بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے۔ اسی طرح کا دوسرا Parallelism "میں" اور راس "میں" کے دشمن کے درمیان بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں ہیں لیکن ان کے بیچ کا فاصلہ قائم رہتا ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو تو دوسرے کا وجود ممکن نہ ہوگا۔ دونوں میں سے کسی ایک کو قاتل بننا ہے اور کسی ایک کو مقتول لیکن جب "میں" خود کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو رونے لگتا ہے اور جب دوسرے کو قتل کرتا ہے تو چلّانے لگتا ہے "بچاؤ، بچاؤ" (یعنی مجھے بچاؤ)

متوازی خطوں کی اس کہانی میں جہاں ایک دوسرے کے قریب آئے بغیر ہی سارے کھیل کھیلے جاتے ہیں بڑی فن کاری ہے جس کی ایک معمولی سی مثال یہ جملہ ہے۔

"میں ہندو نہیں ہوں، میں مسلمان نہیں ہوں۔ اللہ کی قسم، بھگوان کی قسم۔"

ہندو کے ساتھ اللہ اور مسلمان کے ساتھ بھگوان کے التزام میں بڑا گہرا طنز ہے۔

"کھیل کا تماشائی" افسانے کی تفہیم کے بنیادی مسائل کے سلسلے میں بعض ایسے سوالات اٹھاتا ہے جو اُن پر از سرِ نو غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ غزل میں جس طرح بحر، زمین، ردیف اور قافیہ وغیرہ کے طے شدہ اصول ہیں کیا افسانے کے سلسلے میں اسی طرح کے متعین اصول بنائے جا سکتے ہیں؟ شاید نہیں۔ کیوں کہ کم از کم افسانے کی حد تک سنہرا اصول یہ ہے کہ کوئی سنہرا اصول نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ افسانوی تخلیق میں وقت کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ اس "وقت" سے تو جس کے اور چھور متعین ہوں فرار ممکن ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ظرفِ وقت کے بغیر کچھ ہو سکے؟ اسی افسانے کو لیجیے۔ کسی مخصوص تاریخ، سن یاد ہے کا تعین کرنا تو غلط ہوگا لیکن کیا یہ افسانہ کسی ایسے دور میں لکھا جا سکتا تھا جب اقتدار کو مکمل بالا دستی حاصل ہو، زندگی میں اتھل پتھل نہ ہو، خیر و شر کے درمیان فرق اس حد تک نہ مٹ گیا ہو کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو جائے اور ان کے مبادلہ پذیر (INTER CHANG ABLE) ہونے کا احساس ہو۔ ظاہر ہے یہ، اس سے ملتی جلتی یا کسی بھی قسم کی صورتِ حال وقت کی کار فرمائی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس افسانے کے ابتدائی جملے "ڈرامہ شروع ہو رہا تھا" اور آخری جملے "ہم نے لات مار کے لاش کو

گٹر میں ڈھکیل دیا" سے باہر نکلیے تو کم از کم مندرجہ ذیل سوالات فوراً ذہن میں سر اُٹھاتے ہیں۔

(۱) کیا یہ افسانہ کسی ایسے زمانے کا احساس نہیں دلاتا جس کا سامنا قاری گزشتہ چند برسوں سے کر رہا ہے؟ اور "میرے لوگوں کی بستی" کا ذکر کیا غیروں کی بستی کو پیشِ منظر میں نہیں لے آتا؟ اور ہم آپ سب ہی جانتے ہیں کہ "اپنی" اور "پرائی" بستیوں کا خیال کن دنوں میں اور کن حالات میں ذہن پر چھا جاتا ہے۔

(۲) "بھگوان" اور "بھگوان داس" اور "رام اور رحیم کے رکھوالوں" کی معنویت جو اس افسانے سے برآمد ہوتی ہے کیا صرف ان الفاظ کا نتیجہ ہے جو اس میں استعمال ہوئے ہیں اور کیا افسانے سے باہر کی زندگی کے بغیر یہ الفاظ اپنی بیشتر معنوی تہوں سے محروم نہیں ہو جاتے [ایک بات اور۔ پہلے رام و رحیم ہمارے رکھوالے ہوتے تھے، اب ہم اُن کے رکھوالے بن گئے ہیں۔]

(۳) اس افسانے میں واقعاتی بے ترتیبی کیا آج کی زندگی کا اشاریہ نہیں؟

(۴) "کھیل کا تماشائی" کی زبان خاصی کھردری ہے۔ یہ کھردرا پن زبان پر مصنف کی عدم قدرت کا نتیجہ ہے یا صورتِ حال کی نوعیت کا؟

(۵) کیا اس افسانے کو پلاٹ کی اُن چھ قسموں میں سے جن کے بارے میں ایک عرصے تک یہ خیال رہا کہ اُن کے آگے بس اندھی گلی ہے کسی ایک قسم میں فٹ کیا جا سکتا ہے؟

یہ افسانہ "علامتی" نہیں لیکن اس میں علامتیں ہیں۔ اسکرپٹ، رائٹر، ڈائرکٹر، اسٹیج، Prompter، مکھوٹا، سیٹ، بھگوان، بھگوان داس، رام اور رحیم، انسانی المیہ کو کیمرے کے فوکس میں لانے والے (کیا آپ کو سورت نہیں یاد آیا) تماشائی، میک اپ اور لاش وغیرہ علامتیں بھی ہیں لیکن ان کے معنی متعین نہیں ہیں جس کے سبب ان کے سہارے کے بغیر بھی معنیاتی نظم (PATTERN) کی ایک سطح فوراً ذہن میں ابھرتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ علامتی مفہوم جوں جوں اپنے بال و پر وا کرتا ہے یہ معنیاتی نظم بسیط تر ہو جاتا ہے۔ علامتی اظہار کے لئے غیر علامتی اظہار کا سہارا ضروری ہے، اس کے بغیر علامت یا تو اُس جسم کی طرح ہوتی ہے جو دیکھ تو سکتا ہے لیکن جنبش نہیں کر سکتا یا اس جسم کی طرح جو حرکت تو کر سکتا ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا [مثال سانکھ درشن سے ماخوذ ہے]

افسانہ نگار علامتوں کا استعمال نہایت چابکدستی سے کرتا ہے جس کی وجہ سے نہ لغوی معنی معنیاتی نظم کی دنیا محدود کرتے ہیں نہ علامتی معنی سے اس نظم کی کاٹ کم ہوتی ہے۔

"کھیل کا تماشائی" کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے محدود عرصے اور دائرے میں بھی سمجھا جا سکتا ہے اور

بسیط عرصے اور دائرے میں بھی۔ ڈرامے کا اسٹیج سکڑ کر کوئی چھوٹا موٹا شہر رہ جائے یا پھیل کر ساری دنیا بن جائے افسانے کے واقعات اور کردار اپنے آپ کو خود بخود صورتِ حال کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

تین چار صفحات کے اس افسانے نے بحث کے بہت سے دروازے کھول دیئے ہیں جن سے انصاف کرنا فی الوقت ممکن نہیں۔ بعض پہلوؤں کا ذکر تو اشارتاً بھی نہ کیا جاسکا۔

سوغات کے مدیر نے مصنف کا نام نہیں ظاہر ہونے دیا تاکہ ردِّ عمل ہر قسم کے میلانِ خاطر سے محفوظ رہے میں نے تحریر پہچاننے کی کوشش کی، جو بالکل اجنبی یا اَن دیکھی نہیں معلوم ہوتی لیکن نام تک رسائی نہ ہوسکی۔
یہ طریقِ کار میں خود بھی اپنا چکا ہوں اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ لیکن ہر نثری افسانوی تخلیق تین دائرے ضرور بناتی ہے۔ ایک تو مصنف کی فکر اور اس کے قریبی اور فوری سروکاروں کے خارج کی دنیا سے ٹکراؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کا دائرہ، دوسرا اس تصادم کے نتیجہ اور مصنف کی فکر کے اتصال سے وجود میں آنے والا دائرہ اور تیسرا ان دونوں اور تخلیق کے درمیان باہم دگر اثر انداز ہونے کا دائرہ جو تخلیق کی وہ شکل ہوتی ہے جو قاری کے سامنے پیش کی جاتی ہے اسے (END PRODUCT) بھی کہا جاسکتا ہے۔ اول الذکر دونوں دائروں تک رسائی اس کی ساری یا کم از کم اہم تخلیقات کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ موجودہ صورت میں صرف END-RESULT ہی پیشِ نظر ہوتا ہے اور بہت کچھ سر پر سے گزر جاتا ہے۔ اس نکتۂ نظر کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ کیا مصنف کی پہلی تصنیف سے انصاف نہیں کیا جاسکتا؟ یہ دلیل بے حد وزنی ہے اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔
اس افسانے کے مطالعے سے تین بالکل دوسری قسم کی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ انھیں بھی کیوں نہ ظاہر کردیا جائے۔

(۱) مصنف کو افسانہ نگاری شروع کئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔

(۲) یا اس نے جان بوجھ کر ایک مختلف قسم کا افسانہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) بعض مقامات پر زبان کا استعمال اپنے مروّجہ طریقِ کار سے بالکل مختلف ہے ۔۔ اور اگر یہ جان بوجھ کر کیا گیا ہے تو بڑے دل گردے کی بات ہے۔

سید محمد اشرف

قربانی کا جانور

ظفر بھونچکا بیٹھا تھا۔

عائشہ نے سویوں کا پیالہ ہاتھوں میں دیتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کیا کہا میڈم نے ؟"

"کہا کہ لڑکا ۱۳۔ ۱۴ سال کا ہو۔ کسی اچھے گھر کا ہو۔ گھریلو کام کاج کا تھوڑا بہت تجربہ ہو۔ آنکھ نہ ملاتا ہو۔ صاف ستھرا رہتا ہو۔ تنخواہ زیادہ نہ مانگے۔ ناغہ نہ کرے۔ مہینے پچھے پگار اور روزانہ تین وقت کا کھانا بھی تو ملے گا"۔

"پھر ؟"

"پھر کیا ؟"

"مطلب کہیں تلاش کیا ؟"

"تلاش کا کون سا وقت ملا۔ بقر عید کی نماز کے بعد سید صاحب کو سلام کرنے چلا گیا تھا۔ وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ نوکر اتنی آسانی سے تھوڑے ہی مل پاتے ہیں۔ پھر اتنی زیادہ شرطیں۔ مجھے تو بہت مشکل نظر آتا ہے"۔ ظفر کی آواز بھر آگئی۔

"آپ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ ہم لوگ اپنا تیوہار کیوں خراب کریں۔ ایک آدھ ہفتے میں تلاش کر لیں گے"۔ عائشہ نے دلاسہ دیا۔

"میڈم نے کہا ہے پرسوں تک انتظام ہو جانا چاہئے۔ پرانی والی بائی اپنے وطن واپس چلی گئی ہے"۔ ظفر نے جواب دیا۔

ایک آدھ ہفتے گھر کا کام خود نہیں سنبھال پائیں گی کیا۔۔۔ اتنی نازک ہیں ؟" ۔ عائشہ عورت بن گئی۔

"تم بات سمجھتی نہیں ہو۔ بلا وجہ کی بحث کرتی ہو۔ مکان کے لیے اپلائی کیا ہے عائشہ۔ صاحب دو چار دن کے اندر فیصلہ کرنے والے ہیں کہ مکان کس کو ملے گا"۔ ظفر نے سمجھایا۔

مکان کا ذکر سن کر عائشہ کے ماتھے کی سلوٹیں کھل گئیں۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ قریب بیٹھ کر پوچھا۔

"ظفر تم نے وہ مکان دیکھا ہے۔ کتنے کمرے ہیں ؟"

"دو روم ہال کچن۔ ایک چھوٹی سی بالکنی بھی۔"

"بالکنی بھی۔ سچ مچ۔" عائشہ کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا اور اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے نگاہیں گھما

کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ چودہ بائی بارہ کا چوتھے مالے کا تاریک کمرہ۔ ٹوٹے شیشے کی کھڑکی کے پاس ڈبل بیڈ جس کے نیچے ایک دوسرے سے ملاکر رکھے ٹرنک اور سوٹ کیس۔ دروازے کے پاس میز پر رکھائی وی۔ اسی میز کے نیچے دری کے چوکور ٹکڑے پر بچوں کے کورس کی کتابیں کاپیاں۔ کمرے کے بیچ میں بڑی میز جس پر گیس کا چولہا اور برتنوں کا ٹھابا۔ کمرے کے درمیان میں کمرے کو بیچ سے دو کرتی ہوئی الگنی جس پہ لٹکے ہوئے ہر سائز کے گیلے گیلے کپڑے، بچوں کو ڈانٹتے وقت ان کا چہرہ دیکھنے کے لیے جن کو دائیں بائیں سر کانا پڑتا ہے۔ دروازے کے پیچھے بڑوں اور بچوں کے جوتے چپلیں جس کی وجہ سے دروازہ پورا نہیں کھل پاتا تھا۔ ضروریات کے لیے دوسرے مالے پر اتر کر مشترکہ غسل خانہ اور لیٹرین۔ باتھ روم کا خیال آتے ہیں اس نے نگاہیں گھمانا بند کر کے ذہن دوڑانا شروع کر دیا تھا۔ دو کمرے۔ ہال اور کچن الگ اور اس پر سے ایک بالکونی بھی جہاں گھر بھر کے کپڑے سکھائے جاسکتے ہیں۔ بمبئی میں تو یہ عیش نہیں عیاشی ہوگی۔ کچن کے پلیٹ فارم پر چولہا رکھا ہو تو مکان گھر لگنے لگتا ہے۔ وہیں کے وہیں برتن دھونے کے لیے نل بھی ضرور ہوگا۔ کبھی سرکاری گھروں میں ہوتا ہے۔ دو مالے نیچے برتن لاد کر نہیں اترنا ہوگا۔ ہال کو ڈرائنگ روم بنائیں گے جیسا لکھنؤ میں رکاب گنج والے مکان میں بنایا تھا۔ اپنا فرنیچر اور دیگر سامان بھی منگالیں گے جو اسی مکان کے ایک کمرے میں بند پڑا سڑ رہا ہوگا اور جسے ہٹانے کے لئے مالک مکان کا ایک اور نئے کرایے دار کے تین خط آچکے ہیں۔

ایک کمرہ بچوں کا۔ وہیں ان کی میز کرسی کتابیں کاپیاں اور کپڑوں کے ٹرنک۔ دوسرے کمرے میں صرف ایک الماری اور ڈبل بیڈ۔ عائشہ نے چپکے سے نگاہیں اٹھاکر شوق کے ساتھ اپنے ادھیڑ ہوتے شوہر کو دیکھا۔ بڑے ہوتے بچوں کی موجودگی میں تو ظفر کے پاس بیٹھنے تک میں حجاب آتا ہے۔ ظفر نے کچھ سوچتے سوچتے نگاہیں اٹھائیں، بیوی کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھا، مسکرانے کی کوشش کی اور بولا۔

"میں بھی وہی سب کچھ سوچ رہا ہوں عشو۔ مگر خالی سوچنے سے کیا ہوگا۔"

"ایسا کرتے ہیں آج بقر عید میں کسی سے ملنے نہیں جائیں گے۔" عائشہ بولی۔ "بچوں کو پڑوس میں چھوڑ کر شہر کا ایک چکر لگاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی لڑکا مل ہی جائے گا۔ آپ بکرا بھی نہیں لائے۔"

"وقت ہی کہاں ملا عائشہ۔ بتایا تو، صاحب کے یہاں سے سیدھا گھر ہی آرہا ہوں۔ ویسے بھی، ہم نے پچھلے سال کب قربانی دی تھی۔"

"اس کا نتیجہ دیکھ تو لیا۔ اچھے بھلے لکھنؤ میں بیٹھے تھے۔ اچانک آپ کو بمبئی دے مارا جہاں یہ کھٹولے برابر کا کمرہ رہنے کو ملا ہے۔"

ظفر چپ رہا۔ عائشہ کو یہ وار خالی جاتا نظر آیا۔ اس نے کچھ بلندی سے معاملہ پھر اپنے ہاتھ میں لیا

"آپ صاحب نصاب ہیں۔"؟

"تمہارے زیور اور سرکاری فنڈ کی وجہ سے۔"

"ہیں تو؟"

"ہاں ہوں تو۔"

"صاحب نصاب پر قربانی فرض ہے؟"

"ہاں" ظفر نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

"یہ فرض پورا نہ ہو تو آخرت میں معلوم ہے کیا ہوتا ہے؟۔"

"کیا ہوتا ہے"؟ ظفر نے بن کر پوچھا۔ کل ہی اس سلسلے میں عائشہ نے قربانی کی اہمیت، قربانی کے جانور کی تندرستی، عدم ادائیگی کی سزا، پل صراط کی باریکی اور تیزی، دوزخ کی آگ اور قیامت کے عذاب کا نقشہ معہ تفصیلی جزئیات کھینچا تھا۔

ظفر نے دیکھا ایک بڑے سے میدان میں ہزار باہزار خلقت جمع ہے۔ ریت کے ایک بڑے سے میدان میں ایک قد آدم ترازو رکھا ہے۔ اس کے ایک پلڑے میں اس کے نیک اعمال ہیں اور دوسرے میں بداعمالیاں۔ دوسرا پلڑا بوجھ کے سبب زمین سے لگا جا رہا ہے۔ اور وہیں سب کے درمیان مگر سب سے جدا، خدائے ذوالجلال ایک نور کے پیکر کی صورت میں جلوہ گر ہے اور اس پیکر پر نگاہیں نہیں ٹھہر رہی ہیں۔ وہیں نزدیک ہی نیک اعمال کا معلن سفید پروں والا فرشتہ شرمندہ کھڑا ظفر کو دیکھ رہا ہے۔ اور ادھر سرخ پروں والا فرشتہ بلند آواز میں اعلان کر رہا ہے کہ زرینہ خاتون کے بیٹے ظفر احمد نے فلاں سن میں صاحب نصاب ہونے کے باوجود بقر عید کے موقع پر قربانی نہیں کی۔ اس نے بچپن سے سن رکھا تھا کہ قیامت میں لوگوں کو ان کی ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ سرخ فرشتے کے اس اعلان پر اس کے سارے دوست احباب کھڑے کھڑے تکھنے لگ رہے ہیں۔ پھر وہ دوست احباب مضبوط اونٹوں، تندرست گایوں بھینسوں اور خوبصورت بکروں اور مینڈھوں پر بیٹھ کر مسکراتے ہوئے فخریہ انداز سے پل صراط پار کر رہے ہیں۔ اور جب وہ عائشہ اور بچوں کو لے کر پل پار کرنے کے لیے آگے بڑھا تو پل کو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے تیز پایا۔ پہلا قدم رکھتے ہی سب کے بدن بیچ سے دو ہو گئے اور نیچے اس آگ میں گر کر انگاروں کی طرح بھڑکنے لگے جس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے دوست احباب پیچھے مڑ کر نیچے دیکھتے ہوئے آپس میں کہہ رہے ہیں کہ اگر ظفر نے قربانی دی ہوتی تو اس وقت وہ بھی اسی جانور کو سواری بنا کر اطمینان سے یہ پل پار کر رہا ہوتا۔

"چلو پہلے لڑکے کو تلاش کر لائیں"۔ عائشہ اسے وہاں سے کھینچ لائی۔ قربانی کا وقت تو تین دن تک رہتا ہے۔

دوپہر سے گھومتے گھومتے شام ہو گئی۔ کئی بسیں بدلیں۔ دو دفعہ ٹیکسی بھی کرنا پڑی مگر کوئی

نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ دونوں غروب ہوتے سورج کے سامنے حاجی علی کی درگاہ کے مقابل سمندر کی فصیل پر خاموش بیٹھے تھے۔ ۱۲۔ ۱۳ برس کا ایک لڑکا بھیک مانگتا ان کے پاس آیا۔ ظفر نے گردن موڑ کر دیکھا اور بیزاری سے منھ پھیر لیا۔ مگر عائشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"سنو ظفر اس سے بات کریں۔؟"

ظفر نے اسے پھر دیکھنا ضروری سمجھا۔ وہ میلے میلے کپڑے پہنے، ہاتھوں میں گندی گندی پٹیاں باندھے، خالی خالی آنکھیں لیے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ عورت مرد کو آپس میں سرگوشیاں کرتے سن کر اسے بھیک ملنے کی امید بندھ گئی تھی۔

"کام کرو گے۔ گھر کا۔ "؟۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے" وہاں تین وقت کا کھانا ملے گا بجلی کا پنکھا ہر وقت چلے گا۔ نہانے کو ملے گا۔ صاف کپڑے بھی۔" اس کے گردن پر جمے میل کو دیکھ کر اور میڈم کے اسی عمر کے بچوں کا خیال کر کے اس نے یہ بات کہی تھی۔

لڑکے نے اس کی باتیں بہت مایوسی سے سنیں۔

" نئیں۔ اپن کو اسی جگہ بیچ دھندا کرنا ہے۔ اپنے والے سب لوگ ادھر بیچ ہیں۔ اماں، باپ، بہنیں سب۔"

وہ دونوں ہکا بکا اسے دیکھتے رہے اور وہ آگے بڑھ کر کسی دوسرے آدمی سے دھندا کرنے لگا۔

وہ دونوں بہت ناامید گھر واپس آئے۔ بچوں کو ان حرکتوں پر ڈانٹ کر سو گئے جو ان کے خیال کے مطابق ان کی غیر موجودگی میں بچوں نے کی ہوں گی۔

دوسرے دن آفس میں صاحب نے نوکر کے بارے میں پوچھا۔

"آپ کل تک انتظار کریں سر۔ تقریباً سارا انتظام ہو چکا ہے۔"

وہ گھبراہٹ میں جھوٹ بول گیا۔ وہ آفس کے وقت سے پہلے ہی گھر واپس آگیا۔ عائشہ دروازے پر اس کی منتظر تھی۔

"بتایئے اندر کون ہے۔؟"

"کیا کوئی مہمان آیا ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"مہمان ہی سمجھ لیجئے"۔

وہ جلدی سے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے وسط میں بڑی میز کے پایے سے بندھا، ایک سیاہ بکرا دونوں ٹانگیں جوڑے، سر نیوڑھائے، سینگ تانے اس کا منتظر تھا۔

"یہ تم نے اچھا کیا۔ مجھے تو وقت ہی نہیں مل پا رہا تھا۔" ظفر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر بکرے کا بھرپور جائزہ لیا۔ قریب آکر اس کے دونوں کان غور سے دیکھے اور ان کو چھوا۔ پھر اس کی دم دیکھی۔ پھر آگے آکر اس کے سینگوں کا بغور معاینہ کیا۔ پھر پیچھے جاکر اس کی ٹانگیں ایک ایک کر کے دیکھیں۔

"کیا دیکھ رہے ہیں اتنے غور سے"؟ عائشہ نے پوچھا۔

"کوئی عضو، کوئی حصہ کٹا پھٹا، ٹوٹا پھوٹا نہیں ہونا چاہیئے۔ جانور مکمل طور سے تندرست ہونا چاہیئے۔ یہ ہماری پل صراط کی سواری ہے عائشہ۔"

"بے شک" عائشہ نے خدا ترسی والے انداز میں تائید کی۔ دونوں بچے بکرے کو گیہوں کے دانے اور روٹی کے ٹکڑے کھلانے لگے۔

"آفس میں صاحب نے نوکر کے بارے میں پوچھا تو میرے منھ سے نکل گیا کہ تقریباً سارا انتظام ہو گیا ہے۔ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہ رہا تھا مگر انجانے میں ایسا ہو گیا۔"

"جھوٹ کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ کل اپنا تیوہار چھوڑ کر شہر بھر میں مارے مارے نہیں پھرتے رہے کیا۔ قربانی تک نہیں کر پائے۔ ہماری نیت تو یہی رہی نا کہ نوکر مل جائے۔"

"نیت کا ثواب صرف اللہ میاں والے کاموں میں ملتا ہے۔ صاحب اور میڈم کو نوکر چاہیئے۔ نوکر تلاش کرنے کی نیت نہیں۔"

"تم کل کی چھٹی لے لو۔ کل دن بھر میں کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا"۔ عائشہ نے اسے مشورہ دیا۔

ظفر کو اس کی بات معقول لگی۔ نیچے جاکر اس نے پبلک بوتھ سے صاحب کے مکان پر فون کیا

دوسری طرف میڈم نے فون اٹھایا۔ وہ گھبرا گیا۔

"دراصل بات یہ ہے میڈم کہ لڑکے کو اس کے گھر سے لانے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ اس لئے صاحب سے کل کی چھٹی کی بات کرنی تھی۔"

"آپ چھٹی کی فکر نہ کریں۔ بس نوکر پانچ بجے شام تک ضرور پہنچا دیں۔ آپ کو یاد ہے نا میں نے اس کے بارے میں کیا کیا بتایا تھا۔ زیادہ سیلری تو نہیں مانگتا ہے"؟

"جی ہاں ویسا ہی تلاش کیا ہے۔ جی نہیں پگار زیادہ نہیں ہے"۔

وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتا جا رہا تھا۔ "صاحب کو میری مکان والی بات ضرور یاد دلا دیجئے گا پلیز۔

"میں کہدوں گی۔ مگر صاحب آج کل آپ سے بہت زیادہ خوش نظر نہیں آرہے ہیں۔" میڈم نے جذبے سے عاری آواز میں اسے مطلع کیا۔ اس اطلاع سے اسکا دل بجھ گیا۔ وہ چپ کھڑا رہ گیا۔ میڈم کو اس کی خاموشی پر شاید رحم آگیا۔

"کل جب آپ نوکر لے کر آئیں گے تو شاید صاحب خوش ہو جائیں۔ اسی موقعے پر آپ کے جانے کے بعد میں ریکمنڈ کر دوں گی۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ میڈم" فون رکھ کر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ناامید نہیں تھا

صبح ۸ بجے سے ۴ بجے شام تک تلاش کرنے پر نوکر ضرور مل جائے گا۔
"اسے قصائی کے یہاں جاکر ذبح کرا دیجئے۔ کل معلوم نہیں وقت ملے نہ ملے۔"
"تم فکر مت کرو عائشہ۔ ویسے بھی اب جوگیشوری تک جاتے جاتے رات ہو جائے گی۔ کل شام تک بہت وقت پڑا ہے۔" ظفر نے اسے تھپتھپایا۔
"بس کل مغرب تک کا وقت ہے اس کی قربانی کا۔ پھر قبول نہیں ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ قیامت کے روز سفید پروں والا فرشتہ ہماری وجہ سے شرمندہ ہوگا اور سرخ پروں والا فرشتہ ہمارے اعمال کی خبر فوراً اللہ تعالیٰ کو دے گا" ۔ عائشہ نے پھر آخرت کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا۔
"تم بے فکر رہو عائشہ" ظفر نے بکرے کو کونے میں باندھتے ہوئے جواب دیا۔ اور اس کی پھیلائی ہوئی گندگی کو سمیٹ کر عائشہ نے باہر رکھے کوڑے دان میں ڈال دیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اس پر آج کا اخبار ڈھک دیا۔
صبح آٹھ بجے آٹو میں بیٹھ کر دونوں نے نقشہ بنایا کہ شہر کو کیسے کیسے کور کرنا ہے۔
بیچ بیچ میں عائشہ نئے مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں کے رنگ کے بارے میں اس سے پوچھتی رہی۔
آرے ملک کالونی کے پارک کے اطراف تمام جھگیوں کے چکر لگا کر جوگیشوری، اندھیری، ساتنا کروز، کالینہ، کرلا اور پھر ہائی وے پر آکر باندرہ تک کے تمام امکانی مقامات دیکھ ڈالے۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا ایک بج گیا۔ عائشہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے انڈین آئیل کی عمارت کے پیچھے پھیلی ہوئی تمام انسانی آبادی اجنبی محسوس ہوئی۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے مکانوں کے مکینوں کے خلاف ایک زبردست نفرت کا جذبہ اس کے دل میں شعلہ بن کر اٹھا۔ وہ شعلہ آہستہ آہستہ بیٹھ گیا اور سینے میں گھٹن سی ہونے لگی۔ اس نے روہانسے انداز سے ظفر کی طرف دیکھا۔
اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ظفر کا دل بھی کمزور ہو گیا۔ وہ دونوں وہیں ایک پلیا پر بیٹھ گئے۔ اس کے آگے آٹو نہیں جاتا "بمبئی" میں ٹیکسی کرنی پڑے گی۔
"چلو دور تک اور دیکھ آئیں"۔ ظفر نے امید بندھائی۔
"آپ سوچ لیں ایسا نہ ہو کہ قربانی بھی اکارت جائے۔ اب وقت زیادہ نہیں بچا ہے۔" عائشہ نے اندیشہ ظاہر کیا۔
اس اندیشے کے طائر اس کے کانوں کے پاس بھی پھڑپھڑائے تھے مگر اس نے ہمت بندھائی۔
"تم فکر مت کرو عائشہ۔ دونوں کام وقت سے ہو جائیں گے"۔
اس نے شوہروں والے سرپرستانہ انداز میں تسلی دی۔ شیواجی پارک کے آس پاس اکثر بیسیوں لڑکے نظر آتے تھے۔ مگر آج سب غائب تھے۔
آگے بڑھے تو پریل کے بعد لال باغ میں بوٹ پالش کرتا ایک لڑکا نظر آیا۔ اس سے معاملت

کی بات کی تو اس نے ہنس کر بتایا کہ وہ ایک دن میں اسی روپئے کماتا ہے۔ ظفر نے جلدی جلدی حساب لگا کر اس کی ماہانہ آمدنی کا موازنہ اپنی تنخواہ سے کیا اور گھبرا کر عائشہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے ہو لیا۔

بھارت ماتا والی سڑک سے ورلی پہنچے۔ وہاں میلیہ ہوٹل کے پاس ایک سرخ بتی پر جب ٹیکسی رکی تو ایک ۱۳۔ ۱۴ برس کے سیاہ فام لڑکے نے ٹیکسی کا شیشہ ایک میلے کپڑے سے اور گندہ کیا اور ان دونوں کے سامنے آکر ہاتھ پھیلا دیے۔

"کام کرو گے۔ گھر کا" عائشہ نے شیشہ کھول کر بے تابی سے پوچھا۔

"کروں گا۔"

"کیا کہا" ؟ عائشہ اور ظفر دونوں کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کروں گا۔ کیا ملے گا؟"

"تین وقت کا کھانا، صاف کپڑے، بجلی کا پنکھا، بستر بھی ملے گا اور ساتھ میں پیسے بھی۔ پہلے کہیں کام کیا ہے۔ ؟ عائشہ نے جلدی جلدی جملے ادا کیے۔

"ہاں۔ پیچھو والی بلڈنگ میں گیارہ مالے پر برتن مانجھے۔" بتی ہری ہو گئی تھی۔ دونوں جلدی جلدی ٹیکسی سے اترے۔ پیسے ادا کیے اور لڑکے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے تھامے فٹ پاتھ پر آئے دونوں کے دل باغ باغ تھے۔

لڑکے کا گھر تنگ گلی میں تھا جس کی ابتداء سڑک سے ہوتی تھی اور انتہاء اس جھگی پر جا کر ہوتی تھی جو لگ بھگ آدھی کے قریب سمندر کی کیچڑ کے اوپر جھکی ہوئی تھی (وہ جنوبی ہند کی ایک مزدور پیشہ عورت کا چوتھا بیٹا تھا جس کی ماں ابھی دو سال پہلے ایک شرابی کی جھگی میں آبسی تھی)۔

"پیسہ ۔۔۔ ؟" ماں کے شرابی مرد نے ہاتھ نچا کر پوچھا۔

ظفر نے گھڑی دیکھی چار بج رہے تھے۔ عائشہ نے بھی وقت دیکھ لیا۔ ظفر نے معاملت کی باتیں جلدی جلدی طے کیں اور اپنا پتہ اور سو روپئے کا ایک نوٹ دے کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر ماں اور اس کے مرد کو دلاسے دیتے ہوئے تیزی سے گلی کے باہر آئے اور ایک ٹیکسی رکوا کر تینوں سوار ہوئے۔ ماں گلی کے موڑ تک لڑکے کو چھوڑنے آئی تھی۔ وہ اپنی زبان میں لڑکے کو کچھ سمجھاتی جارہی تھی۔ لڑکا سر ہلا ہلا کر تمام باتوں کا اقرار کرتا جارہا تھا۔

ورلی سے گورے گاؤں تک ظفر نے لڑکے کا جائزہ لے کر پورا منصوبہ بنالیا کہ کس طرح اسے دو گھنٹے کے اندر اندر اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ صاحب اور میڈم کے سامنے پیش کرتے وقت شرمندگی نہ ہو۔ وہ اسے کچھ سمجھاتا بھی جارہا تھا۔

ورلی سے گورے گاؤں تک عائشہ نئے ملنے والے مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے ٹانگتی رہی اور نئے بیڈ روم کی چادر کی سلوٹوں کو دور کرتی رہی۔

ورلی سے گورے گاؤں تک لڑکا بونقوں کی طرح بیٹھا سوچتا رہا کہ تین وقت کھانا کھانے میں

کتنا مزہ آئے گا۔

اپنی بلڈنگ میں پہنچ کر، دوسرے مالے پر بنے باتھ روم میں جاکر ظفر نے اسے پہلے رن صابن سے صاف کیا اور لائف بوائے سے نہلایا۔ نیل کٹر سے ناخن تراشے اور ناخنوں کا میل اچھی طرح صاف کیا جو ناخن ترشنے کے باوجود انگلیوں کے سروں پر ویسا کا ویسا ہی جمارہ گیا تھا۔ اپنے بیٹے کے کپڑے پہنائے۔ پھر عائشہ نے اس کے بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی۔ اب وہ بالکل تیار تھا۔

اوپر سے دونوں بچے بکرے کو لے کر نیچے اترے۔

"پاپا پاپا ہم نے اسے آج خوب روٹی کھلائی اور خوب نہلایا اور اپنی تولیہ سے صاف کیا"۔ بچوں نے داد طلب نظروں سے باپ کو دیکھا۔

"جلدی کیجئے۔ بکرا ابھی ساتھ لے جایئے۔ راستے میں ذبح کرا دیجئے گا۔" عائشہ بولی "بہت کم وقت رہ گیا ہے۔" ظفر نے دیکھا کہ عائشہ کی آنکھوں میں سفید پروں اور سرخ پروں والے فرشتے پھڑپھڑا رہے تھے۔

"تم فکر مت کرو عائشہ" ظفر نے حسب معمول اسے دلاسہ دیا۔ اور ایک ہاتھ میں بکرے کی رسی اور دوسرے میں بچے کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔

آٹو رکشہ کے ڈرائیور کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے بکرے اور لڑکے کو سوار کرایا۔ گھڑی دیکھی۔ سورج ڈوبنے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"ذرا جلدی کرو ڈرائیور صاحب" اس نے بے تابی کے ساتھ ڈرائیور کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اپن بہت تیز چل رہا ہے صاحب۔ ایروپلین مافک۔" ظفر اس کے مزاح سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔ چہرہ نکال کر اونچی اونچی بلڈنگوں پر سمٹتی ہوئی پھیکی پھیکی سورج کی روشنی کو دیکھتا رہا۔

اچانک ایک اندیشے نے پر پھڑپھڑائے۔ کہیں دیر ہو جانے کی وجہ سے صاحب اور میڈم نے کوئی دوسرا نوکر نہ رکھ لیا ہو۔ ہو سکتا ہے صاحب نے دفتر میں کسی اور سے بھی کہہ رکھا ہو۔ وہ یہ سوچ سوچ کر بدمزہ ہو رہا تھا۔ وہ دیر تک یہی سوچتا رہا۔

اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹرافک کے شور میں پیچھے سے مغرب کی اذان کی آواز اس کے کان میں آئی ہو۔

"جوگیشوری کی طرف۔ جوگیشوری کی طرف موڑ لو۔ بکرا قربان کرنا ہے ڈرائیور صاحب۔" ظفر چلایا۔

ڈرائیور نے آٹو کنارے کر کے بتایا۔

جوگیشوری تو نکل گیا صاحب۔ اپن لوگ سانتا کروز کے پاس آگئے۔ وہ دیکھو سامنے

ایروپلین اڑا۔"

ظفر نے دیکھارن وے پر ایک سفید پروں والا فرشتہ اس کی سمت آتے آتے ایک طرف کو مڑا اور دور آسمان کی طرف اڑ گیا۔

بکرے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"پھر بھی جو گیشوری چلو۔ اسے لے کر کہاں جائیں گے۔" ظفر نے کمزور آواز میں کہا۔

"قربانی کا وقت نکل گیا۔ اب اس جانور کے آدھے پیسے مل پائیں گے"۔ جو گیشوری میں قصائی بولا۔

جب وہ آدھے پیسے لے کر آٹو میں بیٹھ کر روانہ ہوا تو اس نے دیکھا سرخ پروں والا فرشتہ ہاتھ میں ننگی چھری لیے بکرے کو اپنے گھر کی طرف ہانک رہا ہے۔ جس سڑک پر آٹو دوڑ رہا تھا وہ اسے بال سے زیادہ باریک اور قصائی کی چھری سے زیادہ دھار دار محسوس ہوئی۔ ایک اور خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ کہیں صاحب اور میڈم نے دیر ہو جانے کی وجہ سے کسی اور کالایا ہوا نوکر نہ رکھ لیا ہو۔

مرے مرے قدموں سے صاحب کے گھر کی سیڑھیاں چڑھ کر جب اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو یہ دیکھ کر اس کا دل خوش ہو گیا کہ دروازہ کسی نوکر نے نہیں صاحب کے بیٹے نے کھولا تھا۔

"آیئے پاپا اور ممی آپ کا کتنی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ہیں۔" صاحب کے بیٹے نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ڈرائنگ روم کے وسط میں ایک نور کا پیکر جلوہ گر تھا اور اس کے نزدیک ہی ساڑی پہنے سفید پروں والا فرشتہ کھڑا تھا جو آنے والوں کو شفقت کے ساتھ مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

وارث علوی

"قربانی کا بکرا" ــــ ایک تجزیہ

افسانہ "قربانی" کی سب سے بڑی کمزوری اس کا مصنوعی پن ہے۔ ہر چیز بناوٹی ہے۔ پلاٹ ایک مخصوص انجام پر پہنچنے کے لئے گھڑا گیا ہے اور اس کی تعمیر میں واقعات کے حقیقی اور نفسیاتی تقاضوں کا کوئی خیال نہیں کیا گیا۔ ایک نوکر تلاش کر کے دوسرے دن شام تک صاحب کے بنگلے پر پہنچانے کی شرط یا پابندی قصوں اور داستانوں میں چل سکتی ہے، حقیقت پسند افسانوں میں نہیں۔ ظفر اپنے صاحب سے کہہ سکتا ہے۔ "سر! یہ وقت تو بہت کم ہے، پھر ہمارا بقرعید کا تہوار ہے، مجھے قربانی بھی کرنی ہے، ایک ہفتہ کا وقت دیجئے۔ میں ضرور کوئی نہ کوئی نوکر تلاش کر دوں گا۔" افسر لوگ اتنے نامعقول نہیں ہوتے کہ اتنی معقول بات کو بھی قبول نہ کریں۔ یعنی یہ معقولیت حقیقت پسندی پر مبنی ہے اور زیر تبصرہ افسانے کا حقیقت پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ محض خیالی افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار سانڈ کی طرح آزاد ہے، جہاں جی چاہے سینگ مار سکتا ہے۔

افسر اور اس کی بیوی بھی فلمی ولن نظر آتے ہیں لیکن اُن کی بدمعاشی کا سارا زور اس مطالبے پر صرف ہو جاتا ہے کہ کل شام تک نوکر حاضر ہو جانا چاہئے۔ اگر نہ ہوا تو افسانے کے ہیرو ظفر کو خدشہ ہے کہ جو مکان صاحب اسے الاٹ کرنے والے ہیں وہ نہیں کریں گے۔ بمبئی جیسے شہر میں ایک فلیٹ کا الاٹ کرنا وہ بھی ایک نوکر فراہم کرنے کے عوض ــــ فلمی بدمعاشوں کے مطالبے تو بہت آبرو باختہ ہوتے ہیں۔ یہاں پھر واقعیت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ تجارتی لین دین میں فریقین کے شرائط اور مطالبے مساوی ہوتے ہیں۔ فلیٹ الاٹ کرنے کا جس کے پاس اقتدار ہوتا ہے وہ اگر شریف النفس ہے تو حقدار کو حق دیتا ہے اور اگر بدمعاش ہے تو قیمت وصول کرتا ہے۔ نوکر کے لئے جان پہچان والوں سے کہا جاتا ہے، عوض میں بدلہ چکانے کا وعدہ نہیں ہوتا۔ ایسے وعدے تو بیوی تلاش کرنے کے لئے بھی نہیں کئے جاتے۔ آدمی رشتہ ڈھونڈنے والوں کا ممنون ہوتا ہے مقروض نہیں۔

دراصل قربانی کا اور نوکر فراہم کرنے کا وقت افسانہ نگار نے نہایت بھونڈے طریقے پر تنگ رکھا ہے تاکہ لڑکے اور بکرے کی ریس کے ذریعہ تحیّر پیدا کیا جائے کہ دیکھیں وقت پر بکرا قتل خانے پہنچتا ہے یا لڑکا

صاحب کے آستانے۔ افسانہ اگر مزاحیہ ہوتا اور یہ کام چچا چھکّن کے ذمّہ ہوتا تو اس نوع کے سچویشن سے کچھ ظرافت پیدا ہو جاتی۔ لیکن آج کل ہمارے یہاں افسانہ نگاری کا کام اتنا گمبھیر ہو گیا ہے کہ منقطع صورتوں کی پوری کھیپ کی کھیپ ڈربوں میں انڈا سیتی ہوئی مرغیوں کی طرح کوئی کارنمایاں کرتی نظر آتی ہے۔ پریم چند سے لے کر قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین تک ایک بھی ایسا افسانہ نگار آپ کو نظر نہیں آئے گا جو اپنی منفرد حسِ مزاح نہ رکھتا ہو۔ نہ جانے کیوں نئے لکھنے والے اس ورثے سے محروم ہیں۔

چلئے تحیّر ہی سہی، ہم بھی دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ بکرا قربان ہوتا ہے یا فلیٹ الاٹ ہوتا ہے۔ افسوس! دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔ قتل خانے تک پہنچتے پہنچتے شام ہو جاتی ہے اور قربانی کا وقت نکل جاتا ہے۔ لہٰذا قربان کرنے کی بجائے بکرا قصائی کو بیچ کر پیسے کھرے کر لئے جاتے ہیں اور پھر عین وقتِ معیّنہ پر ملازم لڑکے کو لے کر صاحب کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ گویا فلیٹ بھی مل گیا۔ تحیّر پیدا کرو کے تحیر کے جذبے کی تسکین نہ کرنا ہماری فلموں، ٹی۔وی سیریلوں، ناولوں اور افسانوں کی وہ مشترک بیماری ہے جو عموماً تخیلی طور پر بانجھ، انتہائی پس ماندہ اور جاہل معاشروں میں پیدا ہوتی ہے۔ قوّتِ ایجاد کی اسی کمی کا نتیجہ ہے کہ ہم پلاٹ، کہانی اور فنتاسی پر مبنی وہ تفریحی ادب جو سراغ رسانی کے قصّوں، اڈونچر ناولوں اور سائنسی فکشن سے عبارت ہے، بالکل پیدا نہ کر سکے۔ پلاٹ کا مطلب ہے واقعات کی ترتیب، تنظیم، معنی خیز صورتِ حال کی ایجاد، عمل کی حرکت اور رفتار، گتھیوں کا پیدا ہونا اور الجھنا، سلجھتے سلجھتے پھر الجھنا، تصادم، تضاد، متوازیت، تحیّر، تجسّس، نقطۂ عروج، غیر متوقع انجام یا حیرت زا خاتمہ ــــ ہم تو دامن جھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لو بچّو! جوتی نہ اس ہاتھ میں ہے نہ اس ہاتھ میں۔ کھیل ختم۔ پیسہ ہضم!

اس خوف سے کہ اگر قربانی نہ کی گئی تو قیامت میں ان کا کیا حشر ہوگا، ظفر یا عائشہ یا دونوں کا قیامت کے متعلق اس طرح سوچنا جیسا کہ افسانے میں بیان کیا گیا ہے فطری نہیں بلکہ زبردستی ٹھونسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ قربانی نہ کرنے کی صورت میں کسی بڑے احساسِ گناہ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اگر عاقبت میں سزا کا خیال بھی آتا ہے تو خیال ہی کی صورت آتا ہے جو سبک رفتار ہوتا ہے، وعظ کی صورت نہیں کہ روزِ حشر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ اگر کردار کا تخیّل اس قدر مذہب زدہ ہوتا تو ظاہر ہے یہ افسانہ کردار کا ہوتا پلاٹ کا نہیں۔ یعنی کردار مذہب کے معاملے میں سریع الحس ہی نہیں بلکہ اعصاب زدہ ہوتا کہ چھوٹی سی کوتاہی پر تصوّرِ عذاب سے کانپنے لگتا۔ اس قسم کی کردار نگاری افسانہ نگار کے بس کا روگ نہیں تھی کیونکہ آرٹ اور

نفسیات دونوں پر اُس کی گرفت کمزور ہے۔ بغیر آرٹ کے نفسیاتی دروں بینی یا طنز و ظرافت جو اس قسم کے کردار کے لئے ضروری ہے، پیدا نہیں ہوتی۔ اسی لئے افسانہ نگار غیر فنکارانہ طریقہ استعمال کرتا ہے۔ وہ قیامت، پل صراط اور جہنم کا بیان ایک واعظ ہی کی طرح کرتا ہے۔ یہ بیان کردار کی سائیکی کا جزو نہیں بنتا کیونکہ کردار کو مذہبی اعتبار سے ذکی الحس یا OBSESSIVE نہیں بنایا گیا۔ دوسری صورت میں اس کے ہونے کا جواز صرف یہ تھا کہ بیانیہ میں طنز و مزاج کا عنصر ہوتا۔ بصورت موجودہ یہ سپاٹ بیانیہ جو نتیجے پر ملاّنی کے وعظ کی طرح بے کیف ہے، افسانے میں محض اس لئے ہے کہ توبۃ النصوح سے نصیحت لینے کی تعلیم افسانہ نگار کو نہیں ملی۔

یہ افسانہ POINTLESS ہے۔ تجربہ، تعمیم اور خیال کی بات جانے دیجئے، چٹکلہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ نکتہ آفرینی کی کوشش تک نہیں۔ جس سے افسانہ نگار کے ذہن کی غیر تخلیقی بلکہ غیر ایجادی حالت کا پتہ چلتا ہے مثلاً کچھ مماثلت ملازم لڑکے اور قربانی کے بکرے میں پیدا کی جا سکتی تھی۔ دونوں کا خریدا جانا، دونوں کا قصائی کے حوالے کرنا یا بکرے کا رسیاں تڑا کر بھاگ نکلنا اور لڑکے کا اُسے دوڑ کر پکڑ لانا۔ یا کسی بھی لڑکے کے نہ ملنے کی صورت میں انتہائی مجبوری اور کرب کے عالم میں خود اپنے لڑکے کو بطور ملازم کے پیش کرنا گویا یہ بتانا کہ دورِ جدید کے انتزال میں سنّتِ ابراہیمی کی تقلید کسی پیروڈی کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ ایسی نکتہ آفرینیوں کو دیکھ کر نقّاد کم از کم یہ تو کہتا کہ کوشش ہے جو کامیاب نہیں ہوئی۔

ایک اچھا اور تکمیل یافتہ افسانہ متبادل قرأت کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ نکتہ آفرینی کی بات میں نے اس لئے کی کہ مذکورہ افسانہ کلاس روم سطح سے بلند نہیں ہوتا۔ ایسی مبتدیانہ کوششوں کو کلاس روم یا ورک شاپ میں بار بار لکھوانا پڑتا ہے۔ یہاں تو کاتا اور لے دوڑی والا معاملہ ہے۔ ہم لوگ محنت اور عرق ریزی سے بھاگتے ہیں حالانکہ فن کاری میں الہام پانچ فیصد اور خون پسینہ پچّانوے فیصد ہوتا ہے۔ افسانے کو کئی بار لکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر نئے نکات سوجھتے ہیں۔ واقعات اور کردار بدل جاتے ہیں اور افسانہ ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ چھٹی کوشش میں نہ نوکر رہے نہ بکرا، صرف میاں بیوی اور صاحب رہ جائیں، یعنی وہی ازلی مثلّث جو ہزاروں کہانیوں کا سرچشمہ ہے۔ ہر وہ کوشش اچھی کوشش ہے (چاہے وہ چھٹی بار ہی ہو) جو افسانہ نگار کو اُس مقام پر لے آئے جہاں سے کام کا آغاز پھر سے کیا جاتا ہے۔

سیّد محمد اشرف

"قربانی کا بکرا" —— تجزیے پر تبصرہ

میری کہانی "قربانی کا جانور" پر کسی کے تبصرے نما تجزیے پر مجھ سے کسی تحریر کی توقع میرے ساتھ زیادتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ میں اس عقیدے کا ماننے والا ہوں کہ کہانی بذاتِ خود اپنا دفاع ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی کہانی سے متعلق کسی کی تحریر پر کچھ لکھنے کے لئے جس معروضیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تین دن کے قلیل عرصے میں حاصل نہیں کی جاسکتی — محمود ایاز صاحب نے اپنی ہدایت کی تعمیل میں صرف اتنا ہی وقت دیا ہے سال بھر میں ایک یا دو کہانی لکھنے والا یہ ٹوٹا پھوٹا افسانہ نگار اتنے کم وقت میں تو کسی کو ڈھنگ کا خط بھی نہیں لکھ پاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں جواب میں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ بندہ پرور آپ نے جو لکھا وہ میرے لئے بلاتشبیہ و بلاتمثیل قرآن و حدیث کی مثل ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ آئندہ کہانی نہیں لکھوں گا — ایک کم نویس افسانہ نگار کو ایسا ہی کرنا بھی چاہیئے — لیکن کیوں کہ فاضل تنقید نگار نے افسانے کے فن پر بھی اپنی قیمتی رائیں دی ہیں اس لئے خیال آیا کہ معذرت آمیز لہجے کو شرافت پر نہیں، افسانے کے فن کے بارے میں تنقید نگار کی آراء کی قبولیت پر محمول کیا جائے گا۔ یہ گوارا کرنا ذرا مشکل تھا کہ افسانے کے فن پر جس کا جو دل چاہے وہ لکھے اور اس لکھنے پر داد کا بھی خواہاں ہو۔ کہانی کا فن غریب کی جورو نہیں کہ محلے کا ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اُسے بھابی کہہ کر مخاطب کرے اور اس تخاطب کی لذّت سے کام و دہن کو شاد کرے۔ فاضل نقّاد نے اپنی اس تحریر میں، جسے تجزیہ ماننے پر اصرار کیا گیا ہے، افسانے کے فن پر اپنی رائے دینے کے ساتھ ساتھ "قربانی کا جانور" پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ سہولت کے پیشِ نظر اس تحریر کو بھی دو حصّوں میں تقسیم کیا جارہا ہے — یعنی فنِ افسانہ پر تبصرہ نگار کی آراء کا جواب، اور افسانے "قربانی کا جانور" پر ان کی تنقید سے متعلق چند کلمات۔

(۱)

"تجزیے" کو پڑھ کر تجزیہ نگار کے فنِ افسانہ نگاری سے متعلق افکار کو اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے۔

(۱) افسانے کو حقیقت پسند ہونا چاہیئے، افسانے میں بناوٹ نہیں ہونا چاہیئے۔ افسانے میں معقولیت ہونا چاہیئے۔ افسانے کو خیالی نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) افسانے کے پلاٹ میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہونا ضروری ہیں:

واقعات کی ترتیب و تنظیم۔

معنی خیز صورتِ حال کی ایجاد۔

عمل کی حرکت و رفتار۔

گتھیوں کا پیدا ہونا اور الجھنا، سلجھتے سلجھتے پھر الجھنا۔

تصادم، تضاد۔

متوازنیت (؟)

تحیر، تجسس۔

نقطۂ عروج۔

غیر متوقع انجام یا حیرت زا خاتمہ۔

(۳) افسانہ یا تو کردار کا ہو یا پلاٹ کا۔

(۴) کہانی سے مندرجہ ذیل مطالبات مزید ہیں۔

(ا) افسانے میں تجربہ ہو۔

(ب) افسانے میں تعمیم ہو۔

(ج) افسانے میں خیال ہو۔

(د) افسانے میں نکتہ آفرینی ہو۔

افسانے کی تعریف میں فاضل نقاد نے اُن تمام خصوصیات کو یکجا کر دیا ہے جو جامعہ اردو کے امتحان "ادیب ماہر" کے نصاب میں شامل، داستان، ناول اور افسانے کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ نقاد کا مطالبہ ہے کہ کہانی، کہانی نہ ہو، داستان، ناول اور افسانے کا ملغوبہ ہو ــ مندرجہ بالا خصوصیات ــ خصوصاً تحیر، تجسس گتھیوں کا پیدا ہونا اور الجھنا، سلجھتے سلجھتے پھر الجھ جانا، غیر متوقع انجام اور حیرت زا خاتمہ ــ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نقاد کہانی نہیں پڑھنا چاہتا، ایک تیسرے درجے کی، مار دھاڑ اور جاسوسی سے بھرپور

ہندی فلم دیکھنا چاہتا ہے جس کے اختتام میں ہمیشہ کوئی خلافِ توقع چیز برآمد ہوتی ہے جیسے بکس کے اندر کٹا ہوا سر یا بوری کے اندر ہاتھی کا بچہ۔ غیر متوقع انجام یا حیرت زا خاتمے کو ہی اگر کہانی کی خصوصیت مان لیا جائے تو منٹو کا "نیا قانون"، کرشن چندر کا "آدھے گھنٹے کا خدا"، بیدی کا "اپنے دکھ مجھے دے دو"، عصمت چغتائی کا "چوتھی کا جوڑا"، قرۃ العین حیدر کے بیشتر افسانے، رفیق حسین، انتظار حسین اور اشفاق احمد کے اکثر افسانے ــــ بارگاہِ تنقید کی اس نرالی منطق کے آگے سخت معتوب ٹھیریں گے ــــ اردو کہانی غیر متوقع انجام اور حیرت زا خاتمہ پیش کرنے کے مرحلے سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے افسانے سے اس خصوصیت کا مطالبہ کبھی نہیں کیا گیا۔ داستان کی بات اور تھی۔

واقعات کی ترتیب، تنظیم ــــ یہ عمل بھی کوئی میکانکی عمل نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی کہانی واقعے کی زمانی رفتار سے آگے بڑھتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زمانہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ کبھی فلش بیک کا انتظام کیا جاتا ہے اور کبھی فلش بیک میں ایک اور فلش بیک کا اہتمام کیا جاتا ہے جیسے عزیز احمد کی طویل کہانی "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" میں تیمور کے واقعات داستان گو کی زبان میں سنائے جا رہے ہیں جن کا بہت عمدہ تجزیہ نیر مسعود نے اپنے اس مضمون میں کیا تھا جو سوغات میں چھپ چکا ہے۔

عمل کی حرکت و رفتار ــــ فکشن میں عمل کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی رفتار کیا ہو یہ تخلیق کار کے اپنے معاملات ہیں ــــ ہر افسانہ نگار کا اپنے ہر افسانے میں عمل کی رفتار سے متعلق الگ الگ رویہ ہوتا ہے۔ کرشن چندر کے "گڑھا" میں کردار کا عمل ایک گڑھے کے اندر پابند ہے۔ کردار کی سوچ اس عمل کو اُجاگر کرتی ہے۔ اسی کرشن چندر کے افسانے "آدھے گھنٹے کا خدا" میں عمل کی رفتار بہت تیز ہے لیکن انجام تک آتے آتے جسمانی عمل بالکل ختم ہو گیا ہے اور اب صرف ذہنی عمل جاری ہے کہ زمین کے اس قطعے پر کہانی کا ہیرو آدھے گھنٹے تک بغیر ہلے جلے اپنی زندگی اور اپنی سوچ کا مالک ہے۔ اس کے بعد اُس کے دشمن آکر اسے ختم کر دیں گے۔ "کالو بھنگی" میں کردار عمل سے بے نیاز ہے کہ اُس کا خالق اپنی سوچ کے سہارے اس کردار کو چمکا رہا ہے۔

گتھیوں کا پیدا ہونا، سلجھتے سلجھتے پھر الجھنا، تصادم، تضاد ــــ یہ خصوصیات کسی کہانی کی لازمی خصوصیات نہیں ہیں۔ ایسا مطالبہ داستانوں اور ناولوں سے کیا جانا چاہئے۔ انتظار حسین کے افسانے "زرد کتا" میں ایسی کوئی گتھی نظر نہیں آتی جو سلجھتے سلجھتے پھر الجھ گئی ہو۔ منٹو کے "ٹھنڈا گوشت" میں ایسا کوئی معاملہ نظر نہیں آتا جو سلجھتے سلجھتے پھر الجھ گیا ہو۔ گتھیوں کا پیچ در پیچ پڑنا دراصل ڈرامے کی خصوصیت ہے، کہانی کی نہیں۔ یہ خصوصیت داستانوں

میں بھی ہوتی ہے۔ یہی حال تصادم اور تضاد کا بھی ہے۔ تصادم اور تضاد اگر کہانی میں ہے تو اسی قدر اچھا لگتا ہے جو کہانی کے بنیادی نکتے کو واضح کرنے میں مدد دے۔

متوازنیت (۹) یہ لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید اس سے مراد ہے توازن۔ لیکن اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ توازن کن دو باتوں کے درمیان ہونا چاہئے۔ کردار اور پلاٹ کے درمیان، آغاز اور انجام کے مابین یا بیان اور واقعے کے بیچ۔ توازن بھی اوپر سے نہیں لادا جاسکتا۔ ضروری چیز یہ ہے کہ افسانہ نگار زندگی کے جس گوشے کو قاری کے سامنے لارہا ہے وہ پوری تخلیقی قوت کے ساتھ سامنے آسکایا نہیں۔ منٹو کی کہانی "کھول دو" پڑھئے۔ ایک واقعہ ہے جو بے محابہ آگے بڑھتا جارہا ہے اور تین صفحات کے اندر ختم ہوجاتا ہے۔ اتنی کم مدت میں کہ قاری کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آتی کہ کس کس چیز میں توازن تھا اور کہاں یہ توازن واقعے کی تیز رفتاری میں ٹوٹ گیا۔ قاری یہ تجزیہ کرنے سے پہلے ہی کہانی کے کردار ڈاکٹر کی طرح پسینے میں ڈوب جاتا ہے جس نے فساد کی ماری بیٹی کے باپ سے ہوا آنے کے لئے کھڑکی کھولنے کو کہا تھا اور بے ہوشی کے عالم میں ہوش میں آتی ہوئی اس کی بیٹی نے "کھول دو" کا لفظ سن کر عادت کے مطابق شلوار کھول کر نیچے سرکادی تھی اور لڑکی کا باپ خوشی سے چیخ پڑا تھا کہ میری بیٹی زندہ ہے — کہانی مکمل بھی ہوگئی۔ کہانی نے قاری کو ہلاکر بھی رکھ دیا۔ اب آپ ڈھونڈتے رہئے توازن اور عدم توازن — یہ پورا پیراگراف یہ سوچ کر لکھا گیا ہے کہ تنقید نگار نے "متوازنیت" جیسے نئے نویلے شبد سے توازن مراد لیا ہے۔

تحیر و تجسس — کیا اس سلسلے میں صرف اتنا کہنا کافی نہیں ہوگا کہ کہانی جاسوسی ناول کا بدل نہیں ہوتی۔ اردو کے مشہور و معروف افسانے مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں جو ان خصوصیات سے بے نیاز ہونے کے باوجود اعلیٰ درجے کے افسانے مانے گئے — "موذیل"، "پیتل کا گھنٹہ"، "دو ہاتھ"، "لاجونتی" وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کسی کہانی میں بھی ابن صفی کی طرح تجسس نہیں پیدا کیا گیا (میں ابن صفی کو بھی اردو کے اچھے ادیبوں میں شمار کرتا ہوں)

نقطۂ عروج — یہ ضروری نہیں ہے کہ یقینی طور پر ہر افسانے میں ایک نقطۂ عروج ہو پھر انجام کا مرحلہ آئے۔ منٹو کے افسانے "کھول دو" کا ذکر آچکا ہے۔ اس کا نقطۂ عروج ہی دراصل اس کا خاتمہ بھی ہے۔ اس کے برعکس مثالیں بھی ہیں کہ رفیق حسین کے افسانے "آئینۂ حیرت" میں نقطۂ عروج کا دائرہ کئی صفحات پر محیط ہے یعنی افسانے کا وہ حصہ جب لینڈ سلائڈ کی جزئیات نگاری کی گئی ہے۔ اس خوبصورت حصے کا بہت خوب صورت تجزیہ شمس الحق عثمانی نے اپنے وقیع مضمون میں کیا ہے جو سوغات میں شائع ہوا ہے۔ (تمام تر

مثالیں اردو کے معروف افسانوں اور ان مضامین سے دی جارہی ہیں جو سوغات میں شائع ہوئے ہیں تاکہ قارئین سہولت کے ساتھ رجوع کرسکیں)

افسانے میں حقیقت پسندی اور معقولیت وغیرہ ــــ افسانے کی حقیقت پسندی اس سائنسی حقیقت پسندی سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کا مطالبہ ہمارے تنقید نگار نے کیا ہے یعنی وہ حقیقت پسندی جو دو اور دو کو جوڑ کر چار بناتی ہے ۔ کہانی کی اپنی دنیا، اپنی وابستگیاں ہوتی ہیں اور کہانی کے اندر جو حقیقت بیان کی جاتی ہے وہ کہانی کے کرداروں اور واقعات کے تناظر میں ہی دیکھی جانی چاہئے ۔ یہی حال عقلیت یا معقولیت کا ہے ۔ کہانی میں ہم اس RATIONAL ذہن کی توقع نہیں کرتے جس کا ذکر منطق پڑھانے والے کرتے ہیں ۔ کہانی کی منطق اس کے باطن سے پھوٹتی ہے ۔ کہانی کے اندر چھپا ہوا استدلال اس استدلال سے مختلف ہوتا ہے جس کے بارے میں رومی ہمیں بتا چکے ہیں ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اگر منطق والی معقولیت کا مطالبہ کہانی سے کیا جانے لگے تو دنیا کی کسی بھی زبان کی بڑی سے بڑی کہانی میں سو سو عیب نکالے جاسکتے ہیں ۔ اسی ضمن میں کہانی میں صنّاعی پر بھی گفتگو کی جاسکتی ہے ۔ خود فاضل نقّاد کا یہ کہنا ہے کہ الہام ۵ رفیصد ہوتا ہے باقی پچانوے فیصد خون پسینہ ہوتا ہے ۔ یہ پچانوے فیصد کیا ہوتا ہے ۔ یہی تو ہوتا ہے کہانی کو بنانا، ڈھالنا اور اس مقصود مرحلے تک پہنچانا جو افسانہ نگار کا مدّعا ہوتا ہے ۔ کہانی یا فکشن بھی اسی تخلیقی عمل کا حصّہ ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس میر تقی میر کا فتویٰ ہے کہ ادب تخلیق کرنا دراصل صنّاعی ہی ہے ۔ ع صنّاع ہیں سب خوار، ازآں جملہ ہوں میں بھی ۔ آتش بھی اس سلسلے میں راہ ہموار کر گئے ہیں ۔ ان کا وہ شعر بہتوں کو یاد ہوگا جس میں انھوں نے اپنی صنّاعی کا ذکر اپنی "مرصّع سازی" کے پردے میں کیا ہے ۔

ہمارے نقّاد کا یہ مطالبہ بھی افسانہ نگار کے ساتھ زیادتی ہے کہ افسانے کو خیالی نہیں ہونا چاہئے ۔ افسانہ تو افسانہ نگار کے خیال کے سہارے ہی آگے بڑھتا ہے ۔ اگر وہ خیالی نہیں ہوگا تو کیا اخبار کی خبر ہوگا ۔ البتہ افسانہ نگار کے خیالات دنیا کی معروف حقیقتوں سے متصادم نہیں ہونے چاہئیں یعنی اسے یہ نہیں لکھنا چاہئے کہ میں اسٹیمر میں بیٹھا، اسٹارٹ کیا اور ہوا میں اڑنے لگا ۔ ایسی پرواز کا حق صرف نقّاد کو ہے افسانہ نگار کو نہیں ۔

فاضل نقّاد کا یہ بھی اصرار ہے کہ افسانہ یا تو کردار کا ہو یا پلاٹ کا ــــ کہانی میں ایسی تخصیص صرف پیشہ ورانہ تنقید ہی کرسکتی ہے ۔ پلاٹ اور کردار آپس میں گتھے ہوئے ہوتے ہیں ۔ اشفاق احمد کی معرکۃ الآرا کہانی

"گڈریا" کا کردار وہ ہندو استاد اس پلاٹ سے الگ کوئی کردار بن ہی نہیں سکتا جو اشفاق احمد نے اس کہانی میں سجایا ہے۔ "کفن" کے باپ بیٹے کا کردار اس روپ میں جلوہ گر ہو ہی نہیں سکتا اگر کہانی میں اس مخصوص پلاٹ کو نہ برتا جاتا۔ منٹو کی کہانی "ہتک" کی سوگندھی اس کہانی کے پلاٹ کی وجہ سے یاد رہ جاتی ہے۔ صرف کردار نگاری خاکوں میں ہوتی ہے، افسانوں میں نہیں۔

افسانے میں تجربہ ہو، تفہیم ہو، خیال ہو، نکتہ آفرینی ہو ۔۔۔ ان خصوصیات سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار اپنے تجربے کو من وعن بیان کردے۔ اسے کہانی کو بنانا پڑتا ہے۔ ایک طرف تو یہ مطالبہ ہے کہ کہانی خیالی نہ ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو اور دوسری طرف اسی مضمون میں یہ فرمایا جاتا ہے کہ کہانی میں خیال ہو۔ ان لفظوں کی پکڑ خوردہ گیری معلوم ہوتی ہے اس لئے صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ کہانی میں تجربہ، خیال اور نکتہ آفرینی آپس میں مل کر شیرازہ بندی کرتے ہیں، ان میں سے کسی پر بھی ضرورت سے زیادہ اصرار کہانی کو مجروح کردیتا ہے۔ نکتہ آفرینی کی خصوصیت تو ادب کے ہر شعبہ میں لازم ہے بالکل اسی طرح جیسے تنقید کے لئے نکتہ سنجی ضروری ہے ۔۔۔ اس طرف بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

کہانی میں ان خصوصیات کو کسی میکانکی عمل کی طرح نہیں برتا جاسکتا۔ یہ خصوصیات باہر سے درآمد نہیں کی جاتیں۔ کہانی کا کونسا جز کب کہانی میں داخل ہوگا یہ لکھنے والے کے تخیل پر منحصر ہے۔ یہ شاید ایک بہت پیچیدہ عمل ہے۔ اسے کوشش کرکے کسی حد تک سمجھا تو جاسکتا ہے لیکن بعینہٖ سمجھانا بہت مشکل کام ہے۔ خدا اس دن سے بچائے جب افسانہ تبصرہ نگاروں کے فارمولوں کا پابند ہوکر "دو دونی چار" کرنے لگے۔

(۲)

لکھنے والا صرف ایک بات کا طالب ہوتا ہے کہ اس کے افسانے کو ایک آزاد قرأت عطا کی جائے یعنی اُسے پڑھ لیا جائے۔ مجھے فاضل تبصرہ نگار سے ایک نرم نرم سا شکوہ ہے کہ انھوں نے کہانی پڑھنے کی زحمت نہیں گوارا کی۔ انھوں نے ایک پھبتی کسی ہے کہ کاتا اور لے دوڑی۔ ان کی پھبتی خود اُن پر ہی صادق آتی ہے۔ اس تبصرے میں تو "لے دوڑنے" کی اتنی جلدی پڑی تھی کہ وہ کاتنا ہی بھول گئے یعنی پوری کہانی پڑھنا ہی بھول گئے۔ ان کے نہ پڑھنے کو مثالوں سے ثابت کیا جائے گا۔ ایک معتبر ناول نگار اور افسانہ نگار نے ایک واقعہ سنایا کہ علی گڑھ کے ایک سیمنار میں ایک نقّاد نے "آگ کے دریا" پر دیر تک تقریر کی۔ سیمنار کے ایک دن اُن کی تقریر کی تعریف کرنے کے بعد اس ناول نگار نے نقّاد سے "آگ کا دریا" کی کاپی مانگ کر پڑھنا چاہی تو معلوم ہوا کہ

نقاد نے اب تک "آگ کا دریا" نہیں پڑھا تھا، کتاب کے صفحات کاٹے ہی نہیں گئے تھے، جوں کے توں تھے ـــ فاضل تبصرہ نگار نے تنقید کی اسی روایت پر عمل کیا ہے ـــ کہانی کو بغیر پڑھے کہانی سے جو مطالبات کئے گئے ہیں اور جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ اُس بوڑھے، کمزور اور عیاش شوہر کی مانند ہیں جو اپنی نوجوان بیوی سے لطف اندوز نہ ہو پانے کے بعد اپنی کمزوریوں پر دھیان دئیے بغیر اپنی بیاہتا پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور پھر حقیقت کا ادراک ہونے پر چڑچڑے پن کو ہی اپنے دفاع میں استعمال کرے ـ ایسے شخص کو لطفِ صحبت ملتا ہے نہ لطف اولاد ـ یعنی نہ کہانی پڑھنے کا لطف ملتا ہے نہ اس کے نتیجے میں اچھی تنقید میسر آتی ہے ـ

یہ تحریر، جس کا مصنف اُسے تجزیہ منوانے پر مُصر ہے، افسانے کے مشمولات پر نہیں، خود اس کے الجھے الجھے تاثرات پر مبنی ہے ـ تجزیے کا مطلب ہوتا ہے فن پارے کے تمام اجزا کا معروضی انداز میں بیان اور اُس کی قدر و قیمت کا تعین ـ اِس تجزیے میں کہانی کے کسی جُز سے بحث نہیں کی گئی ہے، صرف اس بات پر اصرار کیا گیا ہے کہ ایسا واقعہ نہیں پیش آسکتا ـ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی پیشہ ور نقاد ہے جسے ایک ساتھ کئی رسالوں میں چھپنے کے لئے اپنے مضامین بھیجنے کی جلدی ہے اور اس جلدی میں وہ تخلیق کے اندر جھانکنے کے بجائے اپنے مفروضات کو اپنے "تجزیے" کی بنیاد بنا رہا ہے ـ ظاہر ہے کہ مفروضات پر بحث نہیں ہو سکتی (لیکن کرنا پڑ رہی ہے) پیشہ ور نقاد کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہ تخلیق کی قرأت سے زیادہ اپنے مفروضات اور واہموں پر تکیہ کرتا ہے ـ ایسے نقاد اُن باتوں کے عدم کا اظہار کرتے ہیں جو تحریر میں موجود ہیں اور اُن چیزوں کی موجودگی کی شکایت کرتے ہیں جو افسانے میں تحریر ہی نہیں ہوئیں ـ

آئیے دیکھیں کہ اس کہانی میں کیا بیان کیا گیا ہے ـــ پھر اسے "تجزیے" کی روشنی میں بھی دیکھیں گے ـــ

یہ کہانی کروڑوں انسانوں کے نمائندے، ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ایک بڑے شہر میں، سرکاری دفتر میں ماتحت ملازم ہے ـ یہ اوسط درجے کا مذہبی ذہن رکھنے والا شخص ہے جس کے دل میں تھوڑا تھوڑا خوفِ خدا ہے اور جسے بمبئی جیسے بڑے شہر میں ایک مناسب مکان کی ضرورت ہے جس میں اُس کے بیوی بچے بغیر کسی تکلیف کے رہ سکیں ـ اس کا افسر اُسے مکان الاٹ کر سکتا ہے، افسر کے گھر کی پُرانی خادمہ اپنے وطن واپس چلی گئی ہے افسر کی بیوی اپنے شوہر کے ماتحت سے ایک مناسب نوکر کا انتظام کرنے کے لئے کہتی ہے اور اُسے تین دن کا وقت دیتی ہے ـ دونوں کے درمیان ایک سمجھوتہ سا ہو جاتا ہے کہ ماتحت ان کے لئے ایک نوکر کا انتظام کر دے گا اور افسر اس کے نام مکان الاٹ کر دے گا ـ اب ایک کشمکش شروع ہوتی ہے ـ ایک تو تین دن کے اندر نوکر کا انتظام

کرنا ہے۔ دوسرے اسی درمیان بقرعید کے موقع پر قربانی بھی کرنا ہے جو پچھلے سال قضا ہو چکی ہے۔ بیوی ایک اوسط درجے کی گھریلو مذہبی عورت ہے جو قربانی کی عدم ادائیگی سے ہراساں ہے کیونکہ پچھلے سال کی عدم ادائیگی کا خمیازہ بھگت چکی ہے۔ کہانی ایک ایسے نکتے پر پہنچ جاتی ہے جہاں ماتحت اور اس کی بیوی قربانی کی جزا کی شکل میں سفید پروں والے فرشتے کی خدا کے حضور میں سفارش اور عدم ادائیگی کی صورت میں عذاب کے فرشتے کی خدا کے دربار میں شکایت کا نقشہ کھینچنے لگتے ہیں۔ بہت جستجو اور تلاش کے بعد حسبِ منشا ایک لڑکا مل سکا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں قربانی کا وقت نکل گیا۔ قربانی کی عدم ادائیگی کی سزا کے خیال میں یہ خوف بھی شامل ہو گیا کہ نوکر کے پہنچانے میں جو تاخیر ہوئی ہے اس درمیان افسر نے کسی اور ماتحت کے لائے ہوئے نوکر کو قبول کر کے مکان الاٹ نہ کر دیا ہو۔ وہ جب نوکر کو لے کر افسر کے گھر پہنچتا ہے تو معلوم ہوا کہ مکان کسی اور کو الاٹ نہیں ہوا اور افسر اُسی کا انتظار کر رہا ہے۔ اِس خلافِ توقع صورتِ حال کو دیکھ کر وہ ماتحت اس دنیا کی ضروریات کی فراہمی سے وابستہ مکروہات کے اس نازک ترین لمحے میں خود کو پاتا ہے کہ بقرعید کی قربانی کی عدمِ ادائیگی کی سزا، قہرِ خدا، اور عذاب کے فرشتے کی ندا، سب کو یکسر فراموش کر دیتا ہے اور سامنے بیٹھا اپنا افسر اُسے خدا کے نورانی پیکر میں جلوہ گر نظر آنے لگتا ہے، جس کے پہلو میں اُس کی بیگم سفید پروں والے نیکی کے فرشتے کی شکل میں بیٹھی ہے جو آپ اپنے شوہر سے اُن کے ماتحت کی سفارش کرے گی۔

زمینی ضرورتوں کے جبر کے موضوع پر لکھی گئی یہ نازک کہانی تبصرہ نگار یا تجزیہ نگار سے شکایت کر رہی ہے کہ اسے ٹھیک سے پڑھا نہیں گیا ہے۔ صرف چند پھڑکتے ہوئے بھڑکو جملوں کا اُگال باہر نکالنے کے لئے "تجزیہ" لکھا گیا ہے۔ کچھ لکھنے والوں کی کمزوری ہوتی ہے کہ جب چند نیم فحش، بظاہر دلچسپی پیدا کرنے والے، قادر خانی ڈائیلاگ ٹائپ جملے تیار ہو جاتے ہیں تو وہ ان جملوں کو کھپانے کی خاطر مضمون لکھ دیتے ہیں۔ اس قسم کے تحریری مضمون اصولی تنقید کے ضمن میں تو چل جاتے ہیں۔ کبھی کبھی غزل اور نظم کے بارے میں بھی چل جاتے ہیں کہ شاعری اشاروں، دھندلکوں اور سایوں جیسا تاثر پیش کرتی ہے لیکن فکشن ایسی ناقص تنقید، برداشت نہیں کر پاتا کہ افسانے میں دھندلکے اور سایے نہیں، واضح تصویریں ہوتی ہیں۔ فکشن اپنے مکان اور اپنے زمان سے واضح سروکار رکھتا ہے۔ یہ سروکار براہِ راست نہ بھی ہو تب بھی واضح ہوتا ہے۔ اسی لئے فکشن پر تنقید لکھنے کے لئے فن پارے کو پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ افسانے کا جو تجزیہ افسانے کی قرأت کا ثبوت نہ پیش کر سکے اُسے تجزیہ نہیں کہیں گے، کسی چڑچڑے نقّاد کی ہرزہ سرائی کہیں گے۔

فاضل نقّاد نے افسانے کا مطالعہ نہیں کیا، اِس کے ثبوت مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) نقّاد نے پہلے ہی پیراگراف میں لکھا ہے کہ کہانی میں ایک نوکر تلاش کر کے دوسرے دن شام تک صاحب کے بنگلے پہنچانے کی شرط یا پابندی ہے جو قصّوں یا داستانوں میں چل سکتی ہے ـــ اگر کہانی کے پہلے ہی صفحے کو غور سے پڑھا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ نوکر تلاش کرنے کے لئے تین دن کا وقت مِلا ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں تین دن کا وقت حقیقت کے عین مطابق ہے۔ (میری زندگی تو قصبوں میں گزری ہے البتّہ بڑے شہروں میں رہنے والے یا بڑے شہروں کے معاملات سے دلچسپی رکھنے والے اس بارے میں زیادہ بہتر رائے دے سکتے ہیں)

(۲) تجزیہ نگار نے ابتدا ہی یہاں سے کی ہے کہ ماتحت اس افسر سے ایک ہفتے کا وقت مانگ سکتا تھا ـــ اگر افسانے کو پڑھا ہوتا تو علم ہوتا کہ یہ راستہ خود عائشہ نے تجویز کیا تھا لیکن اس پر عمل اس لئے ممکن نہیں تھا کہ افسر کی پرانی خادمہ اپنے وطن واپس جا چکی ہے اور اب ان کے گھر کوئی کام کرنے والا نہیں ہے۔ اسی لئے انھیں عجلت ہے۔ پھر بھی وہ اپنے ماتحت سے اس بات کے طالب نہیں ہیں کہ نوکر کا بندوبست اسی دن ہو جائے۔ ماتحت کو تین دن کا وقت ملا ہے جس کا ذکر افسانے کے پہلے ہی صفحے پر ہے۔ افسانے کے اس حصّے کو نہ پڑھنے یا پڑھنے کے باوجود نظرانداز کرنے کی وجہ اور کچھ نہیں ہے، سانڈ اور سینگوں والا جملہ لکھنے کی جلدی ہے جس پر نقّاد کو قارئین سے داد کی خاصی توقّع معلوم ہوتی ہے۔

(۳) درمیان میں فاضل نقّاد نے افسانہ نگار کو یہ مشورہ دیا ہے کہ نکتہ آفرینی کے لئے کچھ مماثلت ملازم لڑکے اور قربانی کے بکرے میں پیدا کی جا سکتی تھی ـــ کاش افسانے کو پڑھ لیا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ یہ مماثلت اس مختصر کہانی میں تین جگہ بیان کی گئی ہے۔

(ا) "ایک ہاتھ میں بکرے کی رسّی اور دوسرے میں بچّے کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔"

(ب) "آٹو رکشہ کے ڈرائیور کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے بکرے اور لڑکے کو سوار کرایا۔"

(ج) "اپنی بلڈنگ میں پہنچ کر، دوسرے مالے پر بنے باتھ روم میں جا کر ظفر نے پہلے اُسے رِن صابن سے صاف کیا اور لائف بوائے سے نہلایا۔ نیل کٹر سے ناخن تراشے اور ناخنوں کا میل اچھی طرح صاف کیا جو ناخن تراشنے کے باوجود انگلیوں کے پوروں پر ویسا کا ویسا ہی جما رہ گیا تھا۔ اپنے بیٹے کے کپڑے پہنائے۔ پھر عائشہ نے اس کے بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی۔ اب وہ بالکل تیار تھا۔ اوپر سے دونوں

بچے بکرے کو لے کر نیچے اترے۔ "پاپا۔ پاپا۔ ہم نے اسے آج خوب روٹی کھلائی اور خوب نہلایا اور اپنی تولیہ سے صاف کیا۔" بچوں نے دادطلب نظروں سے باپ کو دیکھا۔"

— معلوم نہیں کیوں فاضل نقاد بکرے اور لڑکے کے درمیان مماثلت ظاہر کرنے کے لئے اس سے زیادہ بیانات کے طلب گار ہیں۔ کہانی کہانی ہوتی ہے کوئی ایسا مضمون نہیں جس میں تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کہانی واقعہ کو لے کر آگے بڑھتی رہتی ہے، کسی جگہ رُک کر انچ ٹیپ لے کر قد، سینے، لمبائی کی پیمائش کا اندراج نہیں کرتی۔ لڑکے اور بکرے میں مماثلتوں کا براہِ راست بیان جہاں جہاں ہوا ہے وہ مقامات مثال میں پیش کئے جاچکے۔ کچھ باتوں کا بیان اشاروں میں بھی ہوتا ہے جیسے لڑکا اور بکرا دونوں ہی خرید کر حاصل کئے گئے ہیں۔ ایک کو آسمانی خدا کے حضور نذر کرنا ہے، دوسرے کو زمینی اربابِ حل وعقد کے سپرد کرنا ہے۔ بکرے کی قربانی پیش کرنے پر آخرت میں جزا ملے گی اور لڑکے کو پیش کرنے پر ارضی انعام۔ کہانی میں ہر چیز کا براہِ راست بیان نہیں کیا جاتا۔ بہت سی باتیں قاری کی فہم وفراست پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو کہانی واقعات ومعاملات کی کھتونی بن کر رہ جائے۔ لیکن یہ تمام معاملات ایماندار قاری کے ساتھ کئے جاتے ہیں، اُس نقاد کے ساتھ نہیں جو اپنی اس صلاحیت پر ایمان لاچکا ہو کر بغیر پڑھے بھی کسی فن پارے پر صفحات کے صفحات سیاہ کئے جاسکتے ہیں — اگر آئندہ کسی ایسے مبصر کو تکلیفِ تجزیہ دینا مقصود ہو تو براہِ کرم پہلے سے مطلع کیا جائے تاکہ افسانے کے واقعات اور اشارات کے بارے میں ایک نوٹ علیحدہ سے منسلک کیا جاسکے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تجزیے سے پہلے افسانے کو پڑھا نہیں گیا۔ اگر پڑھا بھی گیا تو نظر انداز کر دیا گیا تاکہ کچھ بھکڑ جملے لکھ کر داد کے لئے قاری کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر بیٹھا جاسکے۔

اِس تجزیے میں سارا زور کہانی کے واقعے کی واقعیت کی نفی پر صرف کیا گیا ہے۔ کہانی کے موضوع اور آرٹ سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ فنِ افسانہ کی خصوصیات کا بیان کیا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ "قربانی کا جانور" میں ان خصوصیات کی کمی کہاں کہاں ہے — کیونکہ بیشتر حصّہ کہانی کی واقعیت پر صرف ہوا ہے اِس لئے افسانے کے واقعے سے متعلق تجزیہ نگار کے واہموں اور مفروضات کا مختصر بیان اور ان کا جواب مندرجہ ذیل ہے:

تجزیہ نگار نے کئی بار اس بات کو دہرایا ہے کہ نوکر لانے کے لئے صرف اگلے دن کا وقت دیا گیا ہے۔ تجزیہ نگار کے نزدیک ایسی پابندی داستانوں میں ہوتی ہے، کہانیوں میں نہیں — اوّل تو یہ کہ قارئین کو کہانی پڑھ کر علم ہو چکا ہوگا کہ نوکر فراہم کرنے کے لئے ماتحت کو تین دن کا وقت ملا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وقت کی کمی

اور پابندی ہی تو کہانی میں ایک اندرونی اضطراب پیدا کرتی ہے جو آہستہ آہستہ نقطۂ عروج تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔

تجزیہ نگار کے نزدیک بمبئی شہر میں فلیٹ الاٹ کرنے کے عوض نوکر فراہم کرنا واقعیت کے خلاف ہے کیوں کہ تجارتی لین دین میں فریقین کی شرائط اور مطالبے مساوی ہوتے ہیں۔

اوّل تو تجزیہ نگار کو یہ وہم دور کرنا چاہئے کہ یہ تجارتی لین دین نہیں ہے، نوکرشاہی کے عبرت ناک خاموش معاہدے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ فریقین کی شرائط اور مطالبے تبھی مساوی ہو سکتے ہیں جب فریقین برابر کے ہوں۔ افسر اور ماتحت کے درمیان یہ خاموش لین دین ترقی پذیر ملکوں کی نوکرشاہی کی ایک اہم خصوصیت ہے جسے کم پڑھا لکھا عام آدمی بھی جانتا ہے نہ کہ "تجزیہ نگار" جیسے عالم حضرات۔

تجزیہ نگار نے یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ قربانی کا وقت نکل جانے کے بعد ظفر نے بکرا بیچ کر پیسے کھرے کر لئے۔ یہ مفروضہ افسانے میں بیان کئے گئے "واقعے کے خلاف ہے۔ کیوں کہ ظفر نے بکرا بیچا نہیں بلکہ آدھے داموں میں واپس کیا ہے اور اس عمل سے اُسے خوشی نہیں خوف محسوس ہوا ہے جس کا بیان افسانے میں واضح ہے کہ بکرے کو واپس لے جانے والا قصائی اُسے عذاب کے سرخ پروں والے فرشتے کی مانند نظر آیا تھا۔

افسانے کی واقعیت کے بیان میں تجزیہ نگار نے یہ ملحوظ نہیں رکھا کہ یہ کہانی زمان و مکان کی پابند ہے۔ یعنی مکانی طور پر اس کا تعلق بمبئی جیسے بڑے شہر سے ہے جہاں مکان کے نام پر ڈربہ بھی آسانی سے میسّر نہیں آتا۔ زمان کے اعتبار سے اس کا زمانہ عصر موجود ہے، جہاں قدم قدم پر سودے بازیاں زندگی کا شعار بن گئی ہیں۔ اس افسانے کے کردار نوکرشاہی کے وہ افراد ہیں جن کے نزدیک ساری قباحتیں مباح کا درجہ حاصل کر گئی ہیں۔ اس افسانے کے زمان، مکان اور کرداروں پر اگر ذرا سا بھی غور کر لیا جاتا تو افسانے میں بیان کئے ہوئے واقعے سے تجزیہ نگار کو اتنا چڑچڑاپن نہیں پیدا ہوتا۔

اِس تجزیے میں انسانی فطرت، نفسیات اور مذہبی شعائر کی پابندی سے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مختصرًا یہ کہ تجزیہ نگار کے مطابق ظفر اور اس کی بیوی کو جو خوفِ خدا اور حشر کی سزا کا خیال ہے وہ فطری نہیں ہے اور اِس کردار کی نفسیات کے مطابق نہیں ہے۔ فاضل تجزیہ نگار کا خیال ہے کہ "لوگ قربانی نہ کرنے کی صورت میں کسی بڑے احساسِ گناہ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ سزا کا خیال اس صورت میں نہیں آتا کہ حشر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔"

جس کردار کے گرد یہ کہانی گھومتی ہے اس کا نام ظفر ہے۔ کہانی میں اُسے سخت مذہبی انسان نہیں دکھایا گیا

ہے ۔ وہ ایک اوسط درجے کا مسلمان ہے ۔ کہانی کے مشمولات اس بات پر گواہ ہیں کہ ظفر ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہے جس کا بڑا سبب نوکر کی تلاش ہے ۔ اس نے پچھلے سال بھی قربانی نہیں دی تھی ۔ وہ اس مرتبہ بھی اپنی بیوی کے اصرار کے باوجود قربانی کی بات ہونے پر موضوع بدلنے کی کوشش کرتا ہے ۔ حتّٰی کہ وہ بکرا ابھی خود خرید کر نہیں لاتا بلکہ اُسے خریدنے کا خیال بھی نہیں آتا ۔ لیکن اس کہانی کا ایک اہم کردار عائشہ بھی ہے ۔ یہ ان لاکھوں عورتوں کی نمائندہ ہے جو اپنے شوہر اور بچّوں سے بے حد محبت کرتی ہیں اور ان کے آرام کی فراہمی کو مقصودِ حیات بنا لیتی ہیں ۔ بمبئی تبادلہ ہونے پر جب طرح طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو دل میں خوفِ خدا رکھنے والی وہ بیاہتا اِن تکلیفوں کا رِشتہ اس امر سے جوڑ کر دیکھتی ہے ۔ کیوں کہ پچھلے سال بھی خدا کی نافرمانی سرزد ہوئی تھی اِسی لئے لکھنؤ جیسی آرام دہ جگہ سے اُٹھا کر بمبئی جیسی تکلیف دہ جگہ تبادلہ ہو گیا ۔ جب اس کا شوہر اس زمینی سزا سے متفق نہیں ہوتا تب وہ جان بوجھ کر ، ڈرانے کے نقطۂ نظر سے اپنے شوہر کے سامنے میدانِ حشر کی سزاؤں کا نقشہ کھینچتی ہے ۔ ظفر جو نوکر کی فراہمی کی سخت کشمکش میں گرفتار ہے ، آہستہ آہستہ اپنی بیوی کے بیانات کے غلبے میں آجاتا ہے اور اب افسانے میں ایک دوہری کشمکش یعنی قربانی کے لئے وقتِ معیّنہ کے اندر بکرے کو قربان کرنے کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے ۔ یہ کشمکش کہانی کے واقعات کے ساتھ ساتھ الجھتی چلی جاتی ہے کہ نوکری کے ایک متوقع امیدوار نے انکار کر دیا ہے اور دوسرا متوقع امیدوار اس تنخواہ پر راضی نہیں جو افسر کے یہاں مِل سکتی ہے ۔ اب یہ کشمکش اس تحیّر کو آہستہ آہستہ گہرا کرتی ہے کہ آیا مطلوبہ نوکر وقت کے اندر مل سکے گا کہ نہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ قربانی کا جانور وقت کے اندر اندر قربان کیا جا سکے گا کہ نہیں — یہ تحیّر اور تجسّس دیر تک چلتا ہے حتّٰی کہ کہانی کا نقطۂ عروج آجاتا ہے یعنی یہ کہ قربانی کا وقت نکل گیا ۔ کہانی یہاں ایک المیے سے دوچار ہوتی ہے کہ خوفِ خدا رکھنے والے ، زمینی ضرورتوں کے مارے ، یہ مجبور میاں بیوی اس بار بھی خدا والے معاملے میں ہار گئے ۔ مگر یہ تجسّس ابھی برقرار ہے کہ نوکر کو افسر کے گھر تک بروقت پہنچایا جا سکا کہ نہیں ۔ اور تبھی وہ عبرت ناک لمحہ سامنے آتا ہے جب ظفر کو معلوم ہوتا ہے کہ آسمانی خدا کے یہاں وہ ضرور ہار گیا لیکن زمینی خدا کی بارگاہ میں وہ باریاب ہے اور تبھی وہ عبرت ناک اور حیرت زا لمحہ ایک پیکر کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آتا ہے کہ ارضی ضروریات کی فراہمی کی سرخوشی میں ظفر میدانِ حشر ، نیکی کے فرشتے ، اور خدائے ذوالجلال کو یکسر بھول جاتا ہے اور اپنے افسر کا ڈرائنگ روم اُسے میدانِ حشر نظر آنے لگتا ہے جہاں اس کا زمینی خدا بیٹھا ہے جس کے پہلو میں ماتحت کی سفارش کرنے والی افسر کی بیوی نیکی کا فرشتہ بنی بیٹھی ہے ۔ افسانے کے خاتمے پر ظفر کی سوچ کی یہ قلبِ ماہیت ہی دراصل افسانے

کا وہ مخصوص نکتہ ہے جو پورے افسانے کی گرہوں کو کھول دیتا ہے اور ظفر کے اصل کردار سے قاری کو متعارف کراتا ہے۔ قاری ظفر کے کردار کے اس اِدراک کے باوجود ظفر سے نفرت نہیں کرتا۔ کہ قاری ظفر کی زندگی، اس کی سوچ، اس کی ضرورتوں اور نفسیات سے واقف ہے۔

تجزیہ نگار نے ابتدا میں جن جن خصوصیات کا ذکر فنِ افسانہ کے تعلق سے کیا تھا وہ کسی نہ کسی صورت اور مقدار میں اِس افسانے میں موجود ہیں جن کا ذکر اوپر ابھی ہوا ہے۔ لیکن یہ کسی ایسے میکانکی عمل کے ماتحت نہیں لائی گئی ہیں جن کا تجزیہ نگار مطالعہ کرتا ہے۔ تجزیہ نگار اپنے نفسِ امّارہ کے مطالبوں سے پریشان ہے۔ تبھی تو افسانہ نگار کو روایتی نقّادوں کی طرح مشورے پر مشورہ دیئے چلا جا رہا ہے۔

پہلا مشورہ یہ ہے کہ "انتہائی مجبوری اور کرب کے عالم میں خود اپنے لڑکے کو بطورِ ملازم کے پیش کرتا، گویا کہ یہ بتاتا کہ دورِ جدید کے ابتذال میں سنّتِ ابراہیمی کی تقلید کسی پیروڈی کی شکل اختیار کر گئی ہے۔"

یہ انجام کئی وجہوں سے نہیں ہو پاتا جاسکتا تھا۔ اوّل تو یہ کہ یہ افسانہ نگار اس عقیدے کا حامل ہے کہ... حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبیح اللہ کی قربانی کسی مجبوری اور کرب کی حالت میں نہیں بلکہ صبر، شکر اور سرخوشی کے عالم میں پیش کی تھی۔

دویم یہ کہ خود اپنے بیٹے کو ملازم کے طور پر پیش کرنے سے افسانے میں ایک نہایت غیر فطری ترحم کا سا انداز آجاتا۔ جن بچوں کی خوشی کے لئے مکان حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ان بچوں کو ہی اپنے ماں باپ اور متوقع مکان سے الگ کر کے نوکر بنا دینا نہ تو واقعیت کے مطابق ہے، نہ انسانی فطرت سے لاگ کھاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اپنے بیٹے کو ملازم کی شکل میں پیش کرنا تو بہت سامنے کا مصرع تھا ــ جینوین شاعر کی طرح ہی سچّا کہانی کار بھی سامنے کے مصرعوں کو جھوٹن کے نوالے سمجھتا ہے اور ہاتھ نہیں لگاتا اور ان افراد کے لئے خیر و برکت کی دعا کرتا ہے جو ایسی جھوٹنوں کو اپنی نفیس پلیٹوں میں سجا کر دوسروں کے سامنے قورمہ کہہ کر پیش کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ان کے مستعار دسترخوان سے وہ لوگ بھی خوشہ چینی کریں جو پہلے ہی اپنی روکھی سوکھی میں مست، صبر و شکر کے ساتھ زندگی جی رہے ہیں۔

چوتھی بات یہ کہ سنتِ ابراہیمی کی پیروڈی سے زیادہ میدانِ حشر کی پیروڈی میں تاثر پیدا ہوا ہے۔

تجزیہ نگار جب بیٹے کو ملازم کے روپ میں پیش کرنے پر مکمّل مطمئن نہیں ہوا تو اپنے تجزیے کے آخر تک آتے آتے اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کر ہی دیا کہ ماتحت کو براہِ راست اپنی بیوی اپنے افسر کی خدمت میں

پیش کرنی چاہیئے تھی۔

اگر ایسا ہوا ہوتا تو اوّل تو یہ کہ اس کہانی کی باطنی روح سے اس انجام کی کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ افسانے کا ایک ایک واقعہ اس مفروضہ یا موعودہ اختتام کے خلاف جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر خدانخواستہ ایسا انجام ہوتا تو یہ کہانی ہندی فلموں کا چربہ ہو کر رہ جاتی — میں شروع میں ہی تجزیہ نگار کے اُس شوق کے متعلق لکھ چکا ہوں جو انھیں ہندی فلموں سے ہے۔

تجزیہ نگار نے لکھا ہے کہ قربانی نہ کر پانے پر کوئی بڑا احساسِ گناہ نہیں ہوتا۔

اوّل تو افسانہ نگار نے اس بات پر اصرار نہیں کیا ہے کہ واقعتاً کوئی بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ البتہ کہانی میں جو کردار ڈھالا گیا ہے وہ اُسے گناہ سمجھ کر ہی اس کی سزا کے خوف سے میدانِ حشر کا نقشہ دیکھنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اُس کی بیاہتا بار بار اُسے اتنی شدّ و مد کے ساتھ تاکید کرتی ہے کہ اس کا ذہن عارضی طور پر اپنی بیوی کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور ایسا اکثر ہم اپنی اس دنیا میں دیکھتے ہیں مثلاً جب فاضل تجزیہ نگاروں کے تجزیے اور ان تجزیوں میں ان کے اپنے مفروضات اور واہموں پر اصرار پڑھتے ہیں تو عارضی طور پر ہی سہی، اصل فن پارے سے کچھ دیر کے لئے مشکوک ہو جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بقرعید کی قربانی تو صاحبِ نصاب پر فرض کا حکم رکھتی ہے اور سال میں ایک بار آتی ہے۔ ہم نے ایسے بیشتر افراد کو دیکھا ہے جو صرف جمعہ پابندی سے پڑھتے ہیں اور اگر کبھی جمعہ قضا ہو جائے تو اگلے جمعے تک رہ رہ کر قلق ہوتا ہے — اس بھری پُری دنیا میں تو ایسے عقیدت مندوں کی بھی کمی نہیں ہے جو جمعرات کی جمعرات کسی بزرگ ولی اللہ کے مزار پر نذر گزارنے میں بھی ناغے کے روادار نہیں ہوتے اور اگر کبھی ناغہ ہو جائے تو عرصے تک غمگین و متفکّر رہتے ہیں۔

دراصل افسانے میں احکامِ شریعت اور اُن سے وابستہ سزا و جزا کا کوئی شرعی بیان نہیں ہے بلکہ ایک عام مسلمان میاں بیوی کی مذہب اور اس کے شعائر سے متعلق نفسیات کا سرسری ذکر ہے جو افسانے کے تانے بانے کے لئے ضروری تھا — جب عائشہ میدانِ حشر کا نقشہ کھینچتی ہے تو بقول تجزیہ نگار اس کا بیان "مُلّایانہ" نہیں بلکہ اُس معصوم بھولی بھالی خانہ دار مذہبی عورت کا بیان ہے جو جان بوجھ کر اپنے شوہر کو ڈرا ڈرا کر مہمیز کر رہی ہے — اس عورت کے مکالموں میں چھپی معصومیت اور شگفتگی کاش تجزیہ نگار کو نظر آ سکتی۔

تجزیہ نگار کو اس کہانی میں کوئی فلمی انجام نظر نہیں آتا اس لئے وہ چیں بہ جبیں ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ تحیّر کا جذبہ پیدا کر کے تحیّر کی تسکین نہیں کی گئی۔ چلئے انھوں نے یہ تو مان لیا کہ کہانی میں تحیّر کا عنصر ہے، حالانکہ اسی تحریر میں وہ تحیّر کے عنصر کے فقدان کی شکایت کر چکے ہیں۔ لگتا ہے تجزیہ نگار نے کہانی کا کوئی انجام پہلے سے سوچ لیا تھا۔ وہ انجام نہ دیکھ کر انھیں پوری کہانی، کہانی کے واقعے اور واقعے کی حقیقت سے شکایت پیدا ہو گئی۔ اس کہانی میں تحیّر کے جذبے کی تسکین کے لئے کسی فارمولہ ٹائپ انجام کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے یعنی ایسا انجام جس کی خواہش فاضل تجزیہ نگار نے کی ہے۔ یہ کہانی اپنے انجام تک آتے آتے ایک فطری اختتام تک پہنچتی ہے۔ یہ انجام ایک ایسا مرحلہ ہے جہاں حیرت کا عنصر بھی ہے اور عبرت کا بھی۔ ارضی ضرورتوں کے جبر کے شکنجے میں کسا ہوا انسان کتنا قابلِ رحم ہے اور یہ کہ اس کے حواس کتنے مغلوب ہیں کہ وہ آسمانی خدا کی قہاری کو یکسر فراموش کر کے زمینی خداؤں کی رزّاقی پر ایمان لے آیا ہے۔ کہانی میں وِلن نظر آنے والے افسر اور اس کی بیوی انجام تک آتے آتے خدا اور نیکی کے فرشتے میں بدل جاتے ہیں کہ زندہ رہنے کی ضرورتوں کی تکمیل ان ہی خداؤں کی خوشنودی پر منحصر ہے۔

انور خاں

"جل ترنگ"

صبح سے وہ کام میں جتی ہوئی تھی ۔ ناشتے کے بعد ہی اس نے ناصر سے مرغی منگوائی تھی ۔ عمدہ، خوشبودار باسمتی چاول پکتے پکتے سب کی بھوک تیز ہو چلی تھی ۔ گرم گرم نان کے ساتھ مرغی کا سالن، دہی ٹماٹر کا رائتہ اور پھر چاول ۔ تینوں کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے ۔ دنوں بعد انہیں کھانے میں اس قدر لطف آیا تھا ۔ ناصر کچھ زیادہ ہی کھا گیا اور کھاتے ہی جو لیٹا تو ابھی صبیحہ نے دسترخوان سمیٹا بھی نہ تھا کہ اس کے خراٹوں کی آواز ان کے مختصر سے فلیٹ میں گونجنے لگی ۔

صبیحہ نوید سے کئی بار ٹی وی بند کرنے کے لئے کہہ چکی تھی ۔ دوسرے چھوٹے بچوں کی طرح وہ بھی ٹی ۔ وی بالکل قریب سے دیکھتا تھا اور صبیحہ کو فکر لگی رہتی تھی کہ اس کی آنکھیں متاثر ہوں گی ۔ لیکن نوید نے ٹی ۔ وی اسی وقت بند کیا جب بچوں کی دل چسپی کے سارے پروگرام ختم ہو چکے تھے ۔

ٹی ۔ وی بند ہوتے ہی فلیٹ میں خاموشی چھا گئی ۔ صبیحہ کو ایک طرف جہاں سکون و فراغت کا احساس ہوا وہیں مسلسل کام کی تھکن غالب آئی اور وہ لیٹ گئی اسے لیٹتے دیکھ کر نوید بھی اس کے پاس آکر لیٹ گیا اور جلد ہی دونوں کی آنکھ لگ گئی ۔

چار بجے کے قریب صبیحہ کی آنکھ کھلی ۔ گھڑی دیکھ کر وہ چونک اٹھی آج ہینگنگ گارڈن جانے کا پروگرام انہوں نے بنا رکھا تھا اس نے فوراً اٹھ کر گیس جلائی اور چائے کی پتیلی چولھے پر رکھی ۔

چائے کی خوشبو ناصر کی ناک میں پہنچی تو وہ بیدار ہو گیا ۔ صبیحہ نے مسکرا کر اس سے کہا:

"اٹھیے جناب چار بج رہے ہیں ۔ ہینگنگ گارڈن چلنا ہے یا نہیں ؟"

"ہاں چلنا تو ہے ۔" ناصر نے جماہی لیتے ہوئے کہا ۔ "ہم لوگ سو گئے ۔ اب سستی آرہی ہے ۔"

"کچھ بھی ہو آج تو چلنا ہی ہے" صبیحہ نے کہا "نوید کب سے گارڈن چلنے کی ضد کر رہا ہے ۔ کہہ رہا تھا ۔ اسے میوزیکل فاؤنٹن دیکھنا ہے ۔"

"ہاں ۔ اس کی تعریف تو میں نے بھی سنی ہے ۔" ناصر نے کہا ۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد ٹیکسی سے اتر کر صبیحہ نوید اور ناصر کے ساتھ پارک کی طرف بڑھی تو اس کے پیر منوں وزنی ہو رہے تھے ۔ اس کا جسم آگے بڑھنے سے انکاری تھا اور وہ بالکل بے کیف تھی ۔ حالانکہ کئی دنوں سے وہ اس پروگرام کا بڑے اشتیاق سے انتظار کر رہی تھی ۔

پارک میں داخل ہوتے ہی نوید نے کلکاری مار کر بڑے سے پلاسٹک بال کو جو اس کے ہاتھ میں تھا ہوا میں اچھالا اور پیر سے ٹھوکر لگائی۔ بال اڑ کر چند گز دور جا گرا۔ وہ بال کے پیچھے دوڑا اور اس کے پیچھے ناصر۔ صبیحہ پارک کے گیٹ کے قریب ہی ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر ناصر اس کے پاس آیا۔

"ارے تم یہیں بیٹھ گئیں؟" اس نے کہا "آؤ ذرا آگے چل کر کسی اچھی سی جگہ بیٹھیں۔" صبیحہ اٹھی اور ناصر کے ساتھ دھیرے دھیرے چلنے لگی۔

جوان، بوڑھے بھدے مرد، عورتیں اور جوان لڑکے لڑکیاں وزن کم کرنے کے لئے تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ ایک گوشے میں چند بوڑھے بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے۔ کئی خاندان گھر کے تمام افراد کے ساتھ تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ اس نے سوچا۔

"میں جب بھی یہاں آتا ہوں۔ جی خوش ہو جاتا ہے۔" ناصر کہہ رہا تھا۔ دور دور تک پھیلی ہریالی، الگ الگ قسموں کے خوشنما پھول، گھاس کے قطعوں پر کھیلتے بچے، نو عمر لڑکے، لڑکیاں، پیار سے ایک دوسرے کو نہارتے نوجوان جوڑے۔ اتنی بلندی پر آکر ہمیشہ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان میری دسترس میں ہے۔ میں چاہوں تو اچھل کر چھولوں۔"

ناصر پوری قوت سے اچھلا

"دیکھیے وہ جگہ خالی ہے۔" صبیحہ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ "وہاں گھاس بھی ہے اور سایہ بھی"

ناصر اور صبیحہ اس قطعہ میں داخل ہوئے۔ وہاں دو خاندان اور تھے۔ ایک کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ تھا اور دوسرے خاندان میں ایک نو عمر لڑکی۔ یہ لوگ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے۔ نوید نے جلد ہی بچے سے دوستی کر لی اور وہ دونوں کھیلنے لگے۔ نو عمر لڑکی انہیں دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو باغات بہت پسند ہیں۔" صبیحہ نے کہا۔

"ہاں۔ دیکھو نا۔ یہاں آنے کا بالکل بھی موڈ نہ تھا۔ مگر اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں بھی دوڑوں، بھاگوں۔ میں جب بھی کسی باغ میں آتا ہوں۔ بالکل فریش ہو جاتا ہوں۔" وہ لیٹ کر آسمان کو تکنے لگا۔

"پھر تو آپ کو یہاں اکثر آنا چاہئیے"۔ صبیحہ نے کہا۔

"یہ گارڈن تو بہت دور ہے۔" ناصر نے کہا۔ "لیکن میرے دفتر کے نزدیک ایک پارک ہے۔ دفتر سے چھوٹنے کے بعد میں کبھی کبھی وہاں چلا جاتا ہوں۔"

"اس طرح پارک میں اکیلے بیٹھے آپ کو الجھن نہیں ہوتی؟"

"نہیں تو، پارک میں اکیلے بھی بڑا لطف آتا ہے [illegible] میں لسٹ جاتا ہوں۔ دیر تک

آسمان میں آنکھ مچولی کھیلتے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے بادلوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ جب بچے کھیل رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ ان کے ساتھ دوڑ رہا ہوں، بھاگ رہا ہوں۔ ایک متحرک، امنگوں بھری زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اکیلے بیٹھے طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے ہیں۔"

"کیسے خیالات؟" اب صبیحہ کو بھی اچھا لگ رہا تھا۔ کیفی دور ہو چکی تھی۔

"تم سنو گی تو ہنسو گی"

"جیسے؟"

"کبھی خیال آتا ہے۔ زندگی میں کتنی یکسانیت ہے۔ بچپن ہنستے کھیلتے بے خبری میں گزر گیا۔ جوانی تعلیم، گھر بار اور ملازمت میں۔ ابھی زندگی ٹھیک سے سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ بڑھاپے نے دستک دی۔ سب ایک ہی سکرپٹ کو جی رہے ہیں۔"

صبیحہ ہنسی۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ لاکھوں لوگ ایک ہی وقت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی دو انسانوں کی زندگی یکساں نہیں ہوتی" اس نے کہا۔

"یہ تو صحیح ہے۔" ناصر نے کہا "لیکن ہر انسان کو۔۔۔ اور انسان کیا کائنات کی ہر جاندار چیز جیسے ایک سے مراحل سے گزرتی ہے۔ انسان، درخت، پھول، حیوان، چرند، پرند۔ اس پھول کو ہی دیکھ لو۔ اب یہ دوبارہ کلی نہیں بن سکتا۔ یا مرجھانے کے بعد، ہم چاہیں کہ یہ پہلے کی طرح تر و تازہ ہو جائے اور درخت میں اسی طرح شاخ پر لگ جائے جیسے پہلے تھا تو نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن آپ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتے ہی کیوں ہیں"۔ صبیحہ نے مسکرا کر کہا۔ "ہمارے ذہن میں تو ایسی باتیں نہیں آتیں۔"

"بھئی میں تو بظاہر نارمل زندگی گزار بھی لیتا ہوں۔ تم نے تو لوگوں کو اور بھی حیران کر رکھا ہے۔" ناصر ہنسا۔

"میں نے؟" صبیحہ حیران ہوئی۔ "وہ کیسے؟"

"تمہارے متعلق مشہور ہے کہ اچھی خاصی محفل جمی ہوئی ہے۔ باتیں ہو رہی ہے۔ لطیفے چل رہے ہیں۔ تم یہ کہہ کر چلی جاتی ہو کہ، میں بور ہو رہی ہوں۔، کسی کے منہ پر کہہ دیتی ہو کہ وہ خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ کسی لڑکی کو یہ کہہ کر نروس کر دیتی ہو کہ وہ اس لباس میں بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔"

"اللہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ" صبیحہ کچھ کھسیا گئی۔ "میں نے کب۔۔۔"

"وہ کل ناہید سے تم نے کیا کہا تھا؟"

"وہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔"

"اور یاد ہے۔ تم نے وہ لیکچرر جمیل احمد سے کیا کہا تھا؟"
"کب؟"
"جب اس نے کلاس میں پوچھا تھا کہ کس کو پانچوں کلمے یاد ہیں۔"
"تو اور کیا کہتی؟ کیا اس بے وقوف لیکچرر کو پتہ نہیں تھا کہ وہ اردو کا پیریڈ لے رہا ہے۔ دینیات کا نہیں۔"
"مگر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ دوسری لڑکیوں نے کیسے فرفر کلمے سنا دیے تھے"
"مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔"
"اسی لیے تو لوگ تمہیں کچھ ابنارمل سمجھتے ہیں"
"اس میں میرا کیا قصور ہے۔" صبیحہ کچھ روہانسی ہو گئی۔
"سچ پوچھو تو تمہاری یہی ادا مجھے پسند آئی تھی۔" ناصر نے اس کی دلدہی کی۔
"لیکن کبھی کبھی اگر کچھ باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے یا اپنے ساتھیوں کی خاطر خاموش رہیں تو حرج ہی کیا ہے"
"میں کیا کروں۔" صبیحہ نے کہا" مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اور اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میں ابنارمل ہوں۔"
"ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم ابنارمل ہو۔ وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم عام عورتوں یا انسانوں سے الگ ہو۔"
"یہ آپ خواہ مخواہ مجھے بنا رہے ہیں۔" صبیحہ کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "مجھے کبھی یہ خوش فہمی نہیں ہوئی کہ میں بہت حسین ہوں یا اوروں سے کچھ الگ ہوں۔"
"یہ تمہارا خیال ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے شادی کا پیغام بھجوایا تھا تو اسی لئے کہ تم مجھے ایک بالکل منفرد لڑکی نظر آئیں۔"
"خیر، اب تو یہ غلط فہمی دور ہو گئی ہو گی۔"
"بالکل نہیں۔" "اچھا یہ بتاؤ تم نے یہ رشتہ منظور کیسے کر لیا۔"
"کیوں نہ کرتی۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ مہذب ہیں۔ وجیہہ ہیں اور نرم مزاج بھی"
"بس یہی وجہ تھی۔"
اور کیا۔ میں نے تو یہی سوچا کہ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ اتنا اچھا شوہر مجھے مل رہا ہے"
ناصر کو پتہ نہیں کیوں۔ کچھ مایوسی ہوئی۔ شاید وہ کچھ اور سننا چاہتا تھا۔
"آؤ، ذرا چہل قدمی کریں۔" اس نے کہا۔
"نوید کو ساتھ لے کر وہ روش پر ٹہلنے لگے۔

"آج آپ کچھ زیادہ ہی موڈ میں ہیں۔" صبیحہ نے کہا۔
ناصر نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"آپ نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا" صبیحہ نے چھیڑا۔
"کس بات کا؟"
"آپ نے ہماری بات کاٹ کر دوسرا ہی قصہ چھیڑ دیا۔ اچھا یہ بتایئے کہ آپ اور کیا کیا سوچتے ہیں۔"
"مذاق کر رہی ہو مجھ سے"
"بالکل نہیں۔ مجھے تو لوگوں نے خواہ مخواہ ہی ابنارمل مشہور کر دیا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ آپ جو کچھ زیادہ ہی نارمل بنتے ہیں۔ آپ کے اندر"۔
"ہو سکتا ہے۔ پتہ ہے تمھیں مجھے کبھی کبھی کیا خیال آتا ہے؟"
"کیا خیال آتا ہے؟"
"یہی کہ زندگی ہم بسر نہیں کر رہے"
"پھر؟"
"وہ تو خود ہی بسر ہو رہی ہے"
"آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ پتہ نہیں آپ نے مجھ ایسی لڑکی سے شادی کیسے کر لی۔"
"یہ تمہارا وہم ہے۔" ناصر نے ہنس کر کہا "تمہارا سلیقہ تو مشہور ہے۔" "بھئی ہم تو تم پر فدا ہیں۔ جو لباس پہنتی ہو ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے لیے ہی بنا ہے۔ لفظ جامہ زیبی کا مطلب مجھے تمہیں دیکھ کر ہی سمجھ میں آیا"
"آپ جانتے ہیں یہی باتیں مجھے پسند نہیں آتیں۔" صبیحہ کچھ شرما گئی۔
"تمہیں تو تصنع اور بناوٹ سے چڑ ہے نا" ناصر کی آنکھیں چمکنے لگیں "اور تم جانتی ہو کہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔"
"آئیے واپس چلیں"
"تم کہتی ہو کہ تمہیں تصنع اور جھوٹ پسند نہیں۔" ناصر نے چھیڑا "پھر یہ سچ سے وحشت کیوں۔"
"اس بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں" صبیحہ نے بات کو ٹالا۔ "کیا وقت ہو رہا ہے؟"
"ساڑھے سات بج رہے ہیں"
"چلیے وہیں چلتے ہیں۔ ورنہ پھر جگہ نہیں ملے گی"۔
وہ کملا نہرو پارک کی طرف بڑھے۔ نوید کے لیے انہوں نے بسکٹ خریدے۔ ناصر کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے گنے کا رس پیا۔ صبیحہ نے تھمس اپ۔ ناصر نے اسے بھیل پوری

دلوانی چاہی لیکن صبیحہ نے انکار کر دیا۔ دوپہر میں انہوں نے اتنا کھالیا تھا کہ بھوک کا احساس ہی ختم ہو گیا تھا۔

فوارے کے پاس پہنچ تو وقت ہو چکا تھا۔ سب بنچیں بھر چکی تھیں۔ لوگ کیاریوں کی منڈیروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تینوں بھی ایک منڈیر پر بیٹھ گئے۔

فوارے کے پاس بیٹھتے ہی انہیں ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ابھی شو شروع نہیں ہوا تھا لیکن فوارہ جاری تھا۔ پانی کا اچھلنا اور کافی بلندی تک جانا بھی آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ اچانک ایک فلمی دھن بجنا شروع ہوئی اور فوارے کا پانی رنگ دار دھاریوں کی شکل میں اچھلنے لگا۔ پھر تیزی سے رنگ بدلنے لگے۔ موسیقی کے ساتھ رنگوں کا بدلنا، ان کا طرح طرح کے ڈیزائن بنانا بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ بچے کھلکھلا کر قہقہے لگاتے، تالیاں بجاتے۔ سب کے چہروں پر اطمینان اور مسرت کا تاثر تھا۔ نوید بالکل مبہوت فوارے کو دیکھ رہا تھا۔

ناصر کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر دباؤ سا محسوس ہوا۔ وہ چونکا۔ صبیحہ کی انگلیاں اس کی انگلیوں سے کھیل رہی تھیں وہ صبیحہ کی طرف مڑا۔ صبیحہ اسے پیار بھری نگاہوں سے نہار رہی تھی وہ مسکرایا اور دونوں کی ہتھیلیاں ایک سخت گرفت میں بندھ گئیں۔ صبیحہ اس سے بالکل سٹ کر بیٹھی تھی اور اس کے پہلو کی آنچ ناصر کو محسوس ہو رہی تھی۔ موسیقی اور رنگوں کے تال میل کے ساتھ پانی کے اچھال نے اس کی ساری حسوں کو بیدار کر دیا تھا۔

صبیحہ نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ ناصر نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تو وہ اور سمٹ گئی اور صبیحہ کی گرم سانسیں اس کے گالوں سے ٹکرا کر اسے بے چین کرنے لگیں۔

اس دوران ایک بار اس نے صبیحہ کو غور سے دیکھا۔ تیزی سے بدلتے رنگوں کی چھوٹ اس کے چہرے پر بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ کبھی اسی کا چہرہ نارنجی ہو جاتا، کبھی گلابی، کبھی نیلی روشنی اسے بالکل بدل دیتی۔ وہ کچھ دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ یہاں تک صبیحہ کو اس کی گرم نگاہوں کا احساس ہوا اور اس نے سر اٹھا کر پیار سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی۔

ناصر کا جی چاہا کہ وہ صبیحہ کے گالوں پر ہونٹ رکھ دے لیکن آس پاس بیٹھے لوگوں کے خیال سے باز رہا۔

صبیحہ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور اتنی سمٹ گئی کہ دونوں کے گال مس ہونے لگے۔

"ناصر!" اس نے کہا۔

ناصر نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ۔۔۔ آپ بہت اچھے ہیں۔"

شاید وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ شاید ناصر کچھ سمجھ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہا ہے وہ صحیح ہے۔

"کچھ کہا تم نے؟" وہ انجان بن گیا۔ جیسے کچھ نہ سنا ہو۔

"آپ بہت اچھے ہیں" اس نے سرگوشی کی۔

" اس نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے شانوں سے الگ کیا۔ صبیحہ بھی سنبھل کر بیٹھی۔

"چلیں؟" ناصر نے دھیمے سے کہا۔

صبیحہ نے پیار سے تاکا۔ اس کی نگاہوں میں شوخی تھی۔ وہ اٹھی۔ ساڑی کا پلو ٹھیک کیا اور اس کا بازو تھام لیا۔ نوید کو ناصر نے گود میں اٹھالیا۔ وہ فوارے کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا پارک سے باہر آکر انہوں نے ٹیکسی کی۔

بھوک جاگ اٹھی تھی۔ صبیحہ نے آتے ہی کپڑے بدلے اور دسترخوان بچھایا۔

کھاتے ہوئے ناصر کی نظر صبیحہ کی میکسی پر گئی۔ میکسی نئی تھی۔ انہوں نے چند روز قبل بازار سے خریدی تھی۔ ایک ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر کھیل گیا۔ وہ چاند کو دیکھنے لگا جو مکمل دائرے کی شکل میں جھانک رہا تھا۔

نوید کی آنکھیں کھاتے ہوئے ہی بوجھل ہو چکی تھی۔ وہ بستر پر پڑتے ہی بے خبر ہو گیا۔

ناصر اخبار دیکھنے لگا۔ صبیحہ نے جلدی جلدی کام سمیٹا اور بستر پر آکر لیٹ گئی۔ ناصر نے اخبار موڑ کر تپائی پر رکھا، بتی بجھائی اور صبیحہ کے پہلو میں آکر لیٹ گیا۔

بتی بجھتے ہی چاند کی دودھیا روشنی کمرے میں پھیل گئی۔

صبیحہ کے ہاتھ ناصر کے سینے کے بالوں سے الجھنے لگے۔ ناصر اسی طرح لیٹا رہا۔ صبیحہ کے گرم، گداز جسم کا دباؤ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے اس کے لئے بالآخر ناقابل برداشت ہو گیا اور اس نے اسے اپنے اوپر کھینچ لیا۔

صبیحہ نے اس کے ایک ایک بوسے کا جواب دیا۔ بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پہل وہ کر رہی تھی۔ جب ناصر نے کروٹ بدلی اور اسے اپنی بانہوں میں چھپالیا تو اس کی سپردگی مکمل اور غیر مشروط تھی۔ اس نے ناصر کے ذہن میں چھپے جیسے ہر سوال کا جواب دے دیا تھا۔

دودھیا چاند کی کرنوں میں نہاکر وہ اٹھا تو پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

باہر فضا میں خموشی تھی لیکن خموشی بولتی ہوئی سی تھی۔ شجر، حجر، راستے، مکانات سب چاند کے سحر میں تھے۔ اس نے مڑ کر صبیحہ کی طرف دیکھا، وہ اسی حالت میں سو گئی تھی۔ اس کے صندلی جسم پر پسینے کی بوندیں دودھیا روشنی میں موتی کی طرح چمک رہی تھیں۔

چاند کا سارا سونا اس کی دسترس میں تھا۔ وہ جس چیز کو چھولے سونے کی ہوجائے۔ لیکن اس کا جسم تکان سے چور ہورہا تھا۔ اسے بڑے زوروں کی پیاس لگی۔ کئی گلاس پانی وہ غٹاغٹ چڑھا گیا۔ پھر بستر کے قریب آکر صبیحہ کے جسم کو حسرت سے نہارنے لگا جو چاند کی روشنی میں سونے کی طرح دمک رہا تھا دل میں خواہش اٹھی کہ صبیحہ کے جسم کو چھوئے۔ اس پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔ وہ ڈرا کہ کہیں سچ مچ وہ سونے کی نہ ہوجائے۔ وہ باز رہا اور آہستہ سے اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ تبھی صبیحہ نے کروٹ لی اور اس کی بانہوں میں سمٹتی ہوئی گہری نیند میں ڈوب گئی۔

محسن خان

"جل ترنگ" ___ ایک تبصرہ

(تبصرہ مصنّف کے نام کو مخفی رکھ کر کرایا گیا ہے)

"جل ترنگ" بیانیہ طریقِ اظہار کا افسانہ ہے۔ معصوم خواہشوں اور امنگوں کا افسانہ۔ روز مرّہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات فن کارانہ بصیرت اور ہنرمندی کے ساتھ ترتیب دے کر ایسی دنیا خلق کی گئی ہے جو گو کہ ہماری دیکھی ہوئی ہے مگر اس امکانی اور پُر مسرّت دنیا کی سی انوکھی اور دُھلی دُھلی سی ہے جس کے ہم خواب دیکھتے ہیں۔ اس کے کردار بھی اپنے رویّوں اور گفتگو سے عام کرداروں کی طرح ہمارے سامنے آتے ہیں۔ افسانے کا موضوع نیا ہے اور نہ مرکزی خیال میں چونکا دینے والی کیفیت۔ افسانے میں ابتدا سے ایک خوش گوار کیفیت پیدا ہوتی ہے جو روشنی کے پھیلاؤ اور گہرائی کی مانند کرداروں سے زندگی کے گہرے تعلق کو جوڑتی چلی جاتی ہے۔ انوکھے پن اور تحیّر کی کیفیت تخلیق کے معیار کو بلند کرتی ہے۔ یہ انوکھا پن اور تحیّر فن کار کی زندگی کے تئیں مثبت اور حقیقت پسندانہ رویّے اور اس انفرادی قوت میں مضمر ہے جو کسی اعلیٰ فنکار کی شخصیت کا لازمی جُز ہے۔ افسانہ جل ترنگ میں چھوٹے چھوٹے، معنیٰ خیز جملوں سے کرداروں کی ذات کی پیچیدگیوں اور تہوں کو بڑے سہج انداز میں کھولا گیا ہے۔ زبان کے تخلیقی استعمال سے عام واقعات میں زندگی کی گہری معنویت کے ساتھ ایک اسراری فضا قائم ہوئی ہے۔ حالاں کہ افسانہ بیانیہ میں لکھا گیا ہے مگر یہ اس غیر ضروری وضاحتی بیانیہ سے مختلف ہے جس میں کرداروں کے ظاہر و باطن کی تمام گرہیں کھول دی جاتی ہیں اور افسانے سے فطری ابہام اور تحیّر ختم ہو جاتا ہے۔ افسانے میں تین کردار ہیں۔ شوہر، بیوی اور ان کا معصوم بچّہ۔ افسانہ صبح کے معمولات سے شروع ہوتا ہے بیوی روزمرّہ کے کاموں سے فارغ ہو کر کھانا لگاتی ہے۔ تینوں کھانا کھاتے ہیں۔ کھانا کھا کر سو جاتے ہیں پھر شام کو ایک پارک میں پکنک کے لئے جاتے ہیں، وہاں بچّہ اپنی دلچسپیوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ شوہر اور بیوی اپنی زندگی کے بعض ناقابلِ فراموش پہلوؤں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں، نئے نئے لوگوں، بچوں کو دیکھتے ہیں، خوبصورت مناظر

سے محظوظ ہوتے ہیں۔ شام کو گھر آکر ایک دوسرے سے آسودگی حاصل کر کے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ اِس طرح صبح کے معمولات سے شروع ہو کر افسانہ شب خوابی پر ختم ہو جاتا ہے۔ افسانہ اِس طرح شروع ہوتا ہے۔

"صبح سے وہ کام میں جُٹی ہوئی تھی۔ ناشتے کے بعد ہی اُس نے ناصر سے مرغی منگوائی تھی عمدہ خوشبودار باسمتی چاول پکتے پکتے سب کی بھوک تیز ہو چلی تھی، گرم گرم نان کے ساتھ مرغی کا سالن، دہی، ٹماٹر کا رائتہ اور پھر چاول ــ تینوں کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے دِنوں بعد انھیں کھانے میں اس قدر لطف آیا تھا۔"

اس واقعہ میں بظاہر کوئی دلچسپ یا قابلِ ذکر پہلو نہیں مگر غور کیجئے تو اس اقتباس کا آخری جملہ "دنوں بعد انھیں کھانے میں اس قدر لطف آیا تھا" معنیٰ خیز اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ دنوں بعد انھوں نے جی کر کے کھانا کھایا تھا۔ اس کی وضاحت سے افسانے کے تاثر میں شاید وہ شدّت پیدا نہ ہو پاتی جو اشاروں اور کنایوں سے صورتِ حال کے بیان کر دینے میں پیدا ہوئی۔ افسانے کی فضا اور مرکزی خیال میں دوسرے غیر تشریحی پہلوؤں کے ساتھ اس امر کی از خود وضاحت ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے اسی طرزِ اظہار کو اخیر تک برقرار رکھا ہے۔ پورا ماجرا پیچیدہ طرزِ اظہار کی بجائے ایجاز اور سادگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ کسی آرزو یا امید کی شدت نہیں۔ افسانے کی یہ عمارت جو نفاست کے ساتھ انتہائی متوازن انداز میں تعمیر کی گئی ہے اپنے تعمیری عمل کے دوران ایک ذراسی بے احتیاطی سے زمین بوس ہو سکتی تھی مگر جل ترنگ کا خالق رمز شناس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لفظوں سے مفہوم کا کیا رشتہ ہے۔ ایک لفظ سے دوسرے لفظ اور ایک واقعے سے دوسرے واقعہ میں گہرا ربط پیدا کرنے اور جہانِ معنیٰ آباد کرنے کے لئے جس اطمینان اور فنکارانہ بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ افسانہ نگار کے ہاں موجود ہے۔

دونوں کی شادی ہوئے عرصہ گزر چکا ہے، اِس طویل عرصے میں کہ جب ان کا بچّہ اپنے پیروں پر دوڑنے لگا ہے، انھوں نے اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں اکثر باتیں کی ہوں گی۔ ایک دوسرے کو خوبیوں اور خامیوں کا احساس دلایا ہوگا لیکن افسانہ پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے کرداروں نے آج ہی زندگی جینا شروع کی ہے، چیزوں کو آج پہچانا اور اپنے بدن کی سرگوشیوں کو آج ہی سُنا ہے۔ یہ بالکل سچّا اور فطری احساس ہے۔ ہم اکثر ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اپنے مدار پر چل پڑی ہے، چیزیں اپنے ٹھکانوں پر آگئی ہیں، درخت، پھول، ہوا، پانی غرضیکہ قدرت کی تمام تر رنگا رنگی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر وجود کو

مکمل اور مربوط ہونے کا احساس دلاتی ہے اور اسی کے ساتھ کہیں، زیریں سطح پر موہوم سا حادثہ رونما ہوتا رہتا ہے۔ ناصر اپنی بیوی سے کہتا ہے ...... "پارک میں اکیلے بھی بڑا لطف آتا ہے۔ کبھی میں لیٹ جاتا ہوں۔ دیر تک آسمان میں آنکھ مچولی کھیلتے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے بادلوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ جب بچے کھیل رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ ان کے ساتھ دوڑ رہا ہوں، بھاگ رہا ہوں۔ ایک متحرک، امنگوں بھری زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اکیلے بیٹھے طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے ہیں۔"

"کیسے خیالات؟" اب صبیحہ کو بھی اچھا لگ رہا تھا۔ بے کیفی دور ہو چکی تھی۔

"تم سنو گی تو ہنسو گی۔"

"جیسے ___"

"کبھی خیال آتا ہے، زندگی میں کتنی یکسانیت ہے۔ بچپن، ہنستے کھیلتے بے خبری میں گزر گیا۔ جوانی، تعلیم، گھر بار اور ملازمت میں۔ ابھی زندگی ٹھیک سے سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی کہ بڑھاپے نے دستک دے دی۔ سب ایک ہی سکرپٹ کو جی رہے ہیں۔"

دنیا میں کروڑوں لوگ ایک ہی طرح سے زندگی گزارتے ہیں اور زندگی کی یہ یکسانیت انھیں بے کیف اور بے چین نہیں کرتی مگر بعض لوگ نہ صرف اپنے طرزِ فکر بلکہ رویّوں سے اُس بھنور کی مانند جو یک رنگی اور یکسانیت کے ساتھ بہتے ہوئے پانی میں انفرادیت قائم کرتا ہے، دوسروں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ افسانے کے کردار بھی کسی حد تک عام انسانوں سے مختلف بلکہ ABNORMAL واقع ہوئے ہیں۔ خود انھیں بھی اس ABNORMALTY کا احساس ہے۔ دراصل افسانہ نگار نے انسانی نفسیات کے اُس انتہائی لطیف و نازک پہلو کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے کہ زندگی کی یکسانیت اور مادی مسائل انسان کی فطری خواہشوں کو ماند کر دیتے ہیں اور اس کی شدت فنا کے احساس کو تقویت دیتی ہے۔ ایک جگہ افسانے کا کردار ناصر کہتا ہے ...... "لیکن ہر انسان ___ اور انسان کیا کائنات کی ہر جاندار چیز جیسے ایک سے مراحل سے گزرتی ہے۔ انسان، درخت، پھول، حیوان، چرند، پرند ___ اس پھول کو ہی دیکھ لو۔ اب یہ دوبارہ کلی نہیں بن سکتا۔ یا مرجھانے کے بعد ہم چاہیں کہ یہ پہلے کی طرح تر و تازہ ہو جائے اور درخت میں اسی طرح شاخ پر لگ جائے، جیسے پہلے تھا، تو نہیں ہو سکتا۔"

زندگی کی اس سفّاک حقیقت کی ترجمانی کے بعد افسانہ نگار ایک دوسرا منظر پیش کرتا ہے۔

"ناصر کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر دباؤ سا محسوس ہوا۔ وہ چونکا۔ صبیحہ کی انگلیاں، اس کی انگلیوں سے کھیل

رہی تھیں۔ وہ صبیحہ کی طرف مڑا۔ صبیحہ اسے پیار بھری نگاہوں سے نہار رہی تھی۔ وہ مسکرایا اور دونوں کی ہتھیلیاں ایک سخت گرفت میں بندھ گئیں ..... موسیقی اور رنگوں کے تال میل کے ساتھ پانی کے اچھال نے ان کی ساری حسوں کو بیدار کر دیا تھا۔"

زندگی کی یکسانیت انسان کے باطن میں حزن پیدا کرتی ہے۔ حزن کے اسی احساس کی شدت سے فنا کا احساس جنم لیتا ہے مگر دوسری طرف کوئی غیر مرئی طاقت، فطرت کی کوئی جولانی، کچھ دیر کے لئے ہی سہی، حزن کے اس احساس کو خوش گوار کیفیت کی تہہ میں دبا دیتی ہے۔ چیزیں خوش رنگ معلوم ہونے لگتی ہیں اور زندگی بڑی بامعنیٰ اور حسین لگنے لگتی ہے۔ دراصل کیفیتوں کے اس پُراسرار تغیر میں ہی زندگی کا حسن ہے۔ روشنی کے عکس سے پانی کے بدلتے ہوئے رنگ، درخت، پھول، چاند اور دوسرے فطری عناصر کی انسانی جذبات کے ساتھ ہم آہنگی اور ان کے علامتی بیان نے افسانے میں آفاقیت پیدا کر دی ہے۔ افسانہ خواب کی طرح شروع ہوتا ہے اور خوبصورت تعبیر پر ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں ــــ افسانے کے آخری اقتباس میں ایک جگہ افسانہ نگار نے لکھا ہے۔

"چاند کا سارا سونا اس کی دسترس میں تھا وہ جس چیز کو چھولے وہ سونے کی ہو جائے۔"

میرے خیال میں چاند کی مناسبت سے چاندی لکھنا چاہئے تھا، نا کہ سونا۔ بہرحال ــــ مجموعی طور پر، زبان کے تخلیقی استعمال، خوبصورت اسلوب اور مرکزی خیال کی انفرادیت نے متاثر کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ افسانہ پڑھ کر جس خوش گوار کیفیت کا احساس ہوا اُس کے اظہار سے قاصر ہوں اور وارث علوی صاحب کے وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو انھوں نے ضمیرالدین احمد کے افسانے "سوکھے ساون" کے بارے میں لکھے تھے۔

"سوکھے ساون" (جل ترنگ) دراصل خواہش کی بیداری کا، تمنّا کی انگڑائی کا، نشاطِ نَو روز کا افسانہ ہے۔"

آصف فرخی

بمبئی

نئے شہروں میں، اجنبی ہوٹلوں کی نامانوس تنہائی میں اسی طرح کی باتیں یاد آتی ہیں مجھے۔ پوری شدت کے ساتھ اچانک یاد آکر حیران کر دیتی ہے کوئی چھوٹی سی تفصیل۔ جانے کب کی اٹکی ہوئی اس یاد کو مال کریا اس سے آنکھیں چرا کر آگے بڑھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے بعض مرتبہ۔ پھر یہ اندازہ بھی نہیں ہو پاتا کہ اس وقت بیٹھے بٹھائے یا چلتے چلاتے یہ بات جو آخر یاد آئی تو کیوں آئی۔ ہم کون ہیں، کہاں کے ہیں اور کس جگہ پر ہیں، ان سب سے کوئی تعلق غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتا دبے پاؤں آکر ذہن پر طاری ہو جانے والی اس بات کا۔ اور اس وقت تو میں اکیلا بھی نہیں تھا۔ نہیں، اکیلا پن تھا تو سہی، مگر اندر تھا، خاموش آنکھوں کے پیچھے کہیں گہرائی میں یوں دیکھا جائے تو ہوٹل کے کمرے میں ایک بھلا آدمی میرے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اصل تنہائی، روح فرسا اور جان لیوا، ہمیشہ کسی اور شخص کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ شاید اسی جھونک میں، کوئی جواب نہیں دیا تھا میں نے جب فضل صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا تھا کہ لاؤنج میں چلتے ہو چائے پینے کے لئے؟ جوتے پہنے پہنے یوں ہی بستر پر لیٹا رہا میں اور ٹی وی کے چینل بدل بدل کر دیکھتا رہا۔ سرخ رنگ میں دائیں جانب ابھر آتا تھا چینل کا نمبر، جب اسکرین پر تصویر بدلتی تھی۔ کئی ایک تھے چینل اور ہر ایک پر جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اس میں اپنی ایک کیفیت اپنی ایک بات ضرور ہوگی۔ لیکن اب کون اس کی تفصیلات سمیٹے، کہاں تک جوڑ جوڑ کر تصویریں بنائے جائے۔ ان بدلتی ہوئی تصویروں سے بھی تنگ آگیا تھا میں۔ اگر کمرے میں ساری شام بند رہ کر ٹی وی ہی دیکھنا تھا تو ہوائی جہاز کا سفر ناحق کیا۔ اس سے پہلے کہ اندر سے اٹھنے والے طعنے کی آواز سنائی دے میں نے اپنے آپ کو بستر سے اٹھالیا۔ کمرے کے دروازے پر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا، مٹی کی مستقل رنگت اختیار کر لینے والے، پامال قالین سے ڈھکا برآمدہ بھی اتنا ہی سونا تھا جیسے کوئی بات یاد آتے آتے پلٹ رہی ہو۔ میں نے جیب پر ہاتھ مار کر اطمینان کیا کہ چابی رکھی ہوئی ہے اور

دروازے کے خود کار قفل کو بند ہوتے ہوئے سنا۔ خالی کمرے کے اندر بستی ہوئی تنہائی سے منقطع ہونے والے تعلق کی واضح آواز۔ اب میں کمرے کے باہر تھا۔ رنگین پایوں والی کرسی پر فضل صاحب بیٹھے تھے اور چائے کی پیالی ان کے ہاتھوں میں تھی "کیا ہوا؟" ان کی بھنویں سوالیہ انداز میں اٹھ گئیں۔

"بمبئی" میں نے جواب دیا۔ اور پھر فوراً جیب میں رکھی ہوئی چابی کو تھپتھپاتا ہوا، الٹے پیروں کمرے میں واپس آگیا۔

میں نے ٹی وی کھولا، پھر فوراً ہی بند کر دیا۔ میں نے جوتے اب بھی نہیں اتارے۔ میں نے تکیہ ترچھا کر کے گردن کے نیچے رکھ لیا۔ بمبئی۔ اس وقت اچانک خیال آیا کہ آخر، یہی نام کیوں لیا تھا مظہر ماموں نے؟ اس سے پہلے جب بھی یہ بات یاد آئی، اور ایسی کوئی خاص یاد بھی نہیں آئی، تو اس کے بے تکے پن پر ہنسی آئی تھی۔ لیکن اس نام کی کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کیا انہوں نے کوئی سفر کیا تھا بمبئی کا اور اس سے کوئی یاد وابستہ تھی؟ یہ تو امی نے کبھی بتایا ہی نہیں یا اس سے دل چسپی محض اس نام کے صوتی تاثر کی وجہ سے تھی، بم بئی؟ اب یوں تو ایک سے ایک نام کے شہر پڑے ہوئے ہیں، ترچنا پلی، جلپائے گوڑی، ٹونڈلہ اور باپوڑا اور جانے کیا کیا، ان میں سے کوئی نام کیوں نہیں چن لیا؟ یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ نام کسی مقبول عام فلمی گانے میں آیا ہو اور وہاں سے یاد رہ گیا گانا بھلا کون سا ہو گا وہ۔ "ای ہے بمبئی نگریا، تو دیکھ ببوا۔" فوراً ذہن میں آواز ابھری۔ نہیں، یہ تو ایسا پرانا نہیں ہے اور شاید امیتابھ بچن کی کسی فلم کا ہے۔ "بمبئی سے آیا میرا دوست، دوست کو سلام کرو، رات کو کھاؤ پیو، دن کو آرام کرو ---" یہ بھی اتنا پرانا نہیں کہ مظہر ماموں نے اس وقت سنا ہو جب انہوں نے یہ نام لیا تھا۔ نئے گانوں میں صرف ایک ہی گانا تھا جو میں نے ان کو گاتے ہوئے سنا تھا۔ وہ امیتابھ بچن کی سی بھاری، گو نجیلی آواز بنا کر گاتے "لونگا الچی کا بیڑا لگایا۔ کھاوے گوری کا یار۔ بلم ترسے" اور میں سوچتا تھا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ بدلتے ہوئے چینل کی طرح ذہن پر کئی گانے جلدی جلدی گزرنے لگے۔ ایک پر تصویر رک گئی۔ "میرا بمبئی سے بالم آیا رے ہو بابوجی ---" اس گانے میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ اسے بار بار دہرایا جائے، یا اس کے نام میں سے ہر بات کا جواب تلاش کیا جائے۔ میں یہ تصور کرتا ہوں کہ یہ اس طرح ہوا ہو گا کہ کسی نے کسی بات پر جواب میں کہا ہو گا "بمبئی"۔ اور مظہر ماموں نے سنا نہیں ہو گا۔ پھر پوچھا ہو گا کہ "کیا؟" تو کہنے والے نے ذرا چڑ کر، زور دے کر کہا ہو گا، "بم بئی" بس اسی وقت سے اس نام کی رٹ لگائی ہو گی انہوں نے۔ ورنہ گھروں میں جگہوں کے نام اس طرح بلا سبب تو نہیں لیے جاتے۔ خیر، یہ بات یقینی ہے کہ اس طرح بار بار نام لینے کا بمبئی کے کسی حالیہ واقعے سے تعلق ممکن نہیں تھا۔ سنجیدگی اور مذاق میں مظہر ماموں کی یہ عادت سی تھی کہ ایک لفظ یا ایک فقرے کو بار بار دہرائے جاتے۔ پڑوس

کے کوارٹر میں جو طوطا پلا ہوا تھا اس کو بہت پڑھانے کی کوشش کی، "بولو رادھا کرشن" - مگر طوطا جواب میں وہی ایک بات کہتا کہ "میں" - اب دن بھر اسے یہی سبق پڑھائے جارہے ہیں - امی بتاتی ہیں کہ نانی جان نے ٹوک دیا تھا کہ یہ کفر کیوں رٹا رہے ہو بے زبان کو، تو مظہر ماموں نے منہ پھلا لیا تھا - پھر کئی دن تک نانی جان ان سے جو بات کہتیں، وہ یہی جواب دیتے: "بولو رادھا کرشن، میں - " امی بتاتی ہیں کہ یہی انہوں نے بمبئی کے ساتھ بھی کیا - اب گھر میں جو بھی بات ان سے پوچھی جارہی ہے، اس کا ایک جواب ہے - بمبئی -

"مظہر بیٹے، کھانا کھاؤ گے ؟"

"بمبئی"

"کیا کہیں سے کھا کر آئے ہو ؟"

"بمبئی -"

"سیدھا جواب دو، پہیلیاں مت بجھاؤ"

"بمبئی -"

"اچھا تو رہو پھر فاقے سے"

"بمبئی -"

"جاؤ بھاڑ میں"

"بمبئی -"

"ہر بات کی حد ہوتی ہے"

"بمبئی -"

"یہ کیا زٹلگار کھی ہے، بمبئی، بمبئی - - - -"

"بمبئی -"

نہیں معلوم کیسے ختم ہوا ہو گا یہ بے ربط سلسلہ - ایسی باتیں بڑی جلدی آئی گئی ہو جاتی ہیں - چل نکلی ہو گی کوئی اور بات - یا پھر سب بھول بھال گئے ہوں گے یہ بے بات کی بات - امی کو ذرا نہیں یاد کہ یہ کیسے ختم ہوئی - میں نے ان سے کئی مرتبہ پوچھا - انہوں نے ذہن پر زور بھی ڈالا، اور میرے اصرار پر یاد کرنے کی کوشش کی - لیکن ہر بار جھنجھلا گئیں کہ "ایک آدھ دفعہ ذکر ہوا، یہ بات ختم ہو گئی - اور کیا بتاؤں تم کو ؟ تم بھی بس ایک ہی بات کو لے کر بیٹھ جاتے ہو - - - شاید ان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ایک واضح خاتمہ نہیں ہوتا ایسی باتوں کا - یعنی اتنا واضح جیسے دروازے کے خود کار قفل کا بند ہونا - روزمرہ کے معمولی واقعات میں سے نکل کر آتی ہیں یہ باتیں، پھر ان ہی میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں - ریت میں اتر جانے والی بوند کی طرح - اس سے زیادہ کوئی کچھ نہیں بتا سکتا -

ریت اور بوند، بمبئی اور مظہر ماموں ۔۔۔ بلکہ مظہر ماموں اور بمبئی ۔۔۔۔ مجھے پوری کوشش کرنا پڑی کہ وہ منظر یاد نہ آئے جب اس بات کا خاتمہ مظہر ماموں کے ساتھ ہوا تھا ۔ کنٹونمنٹ میں بہت بڑا گھر ملا ہوا تھا ان کو جہاں گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لئے ہم لوگ راولپنڈی آئے ہوئے تھے ، رات کو سوتے سے اٹھ کر سگریٹ پینے کے دوران ، اڑتی ہوئی چنگاری سے مچھر دانی میں آگ لگ جانے کے بعد ان کا چہرہ ، جس پر سے جابجا گوشت اڑ گیا تھا ، اور میرے سارے بچپن کو ماتم میں مبتلا آنگن کی طرح بھر دینے والا امی کا بین "بھائی ، بھائی ۔۔۔" میں نے تیزی سے چینل بدل دیا اور مظہر ماموں کے بجائے جہاز کی لینڈنگ کو دھیان میں لانے لگا ، بلکہ خاص وہ لمحہ جب جہاز کے اندر سے پہیے نکل کر زمین کو چھو لیتے ہیں ، تو اس لمس کا احساس ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ہوتا ہے ، اور میں تو جیسے ہر سفر میں اسی لمحے کا انتظار کرتا ہوں جب نیچی اڑان کرتا ہوا جہاز پہلی بار زمین کو چھو لیتا ہے ۔۔۔ رواں پرواز کے بعد جھٹکا آتا ہے اور ہم تھوڑا آگے کو ہو جاتے ہیں ۔ اور سارے مسافر اطمینان کا سانس لے کر حفاظتی پیٹیوں کے بکل کھولنے لگتے ہیں ۔

بکل کھولنے کی چٹاچٹ آواز آتی ہے کہ ایک دم سے جہاز کی ساری بتیاں جل اٹھتی ہیں ۔ جیسے کوئی نیند سے چونک اٹھا ہو ۔

چونکا تو میں اس وقت تھا جب فضل صاحب نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور کہا تھا کہ "اٹھ جاؤ ، مسافر اترنے لگے ہیں ۔" خاموشی کے ساتھ اٹھ کر اپنا دستی سامان اوپر سے اتارنے لگا تھا

سیڑھی جہاز کے دروازے سے لگ چکی تھی اور مسافروں کی سانپ جیسی قطار حرکت کر رہی تھی ۔ میرے آگے فضل صاحب ایک وقت میں ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے ۔

ہر قدم کے بعد کیا کرنا تھا ، یہ پہلے سے معلوم تھا ۔ مجھے کچھ کہنے سننے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی ۔ نہ کچھ سوچنے کی ۔

آسمان پر اندھیرا چھانا ابھی شروع ہی ہوا تھا مگر بتیاں جلا دی گئی تھیں ۔ جھٹ پٹے کی پھیکی بے رونق ، اداس ، روشنیاں ، ایئر پورٹ کے لاؤنج سے قدم باہر رکھتے ہی ایک ہجوم ہم پر پل پڑا ، "ٹیکسی چاہیئے ؟" ۔ "کدھر چلیں گے ؟" ۔ "گاڑی ؟" "رینٹ اے کار ؟" ۔ فضل صاحب نے شلوار قمیص پہنے ہوئے اور راستے میں کھڑے ہوئے ایک پستہ قد آدمی کو تقریباً دھکیل دیا ۔ "کیوں کر لیں رینٹ اے کار ؟ کہہ دیا نہیں چاہیئے ۔ کہیں نہیں جانا ہمیں ان پیلی پیلی ٹیکسیوں میں ۔" انہوں نے جھلا کر کہا ۔

اس میں غصہ کرنے کی کیا بات ہے ؟ میں نے سوچا ۔ میری آنکھوں میں وہ بہت ہلکے درجے کی سرپرائز برقرار تھی جو ایک پلے کارڈ پر اپنا اور فضل صاحب کا نام لکھا ہوا دیکھ کر مسلسل ہوئے چلی جا رہی تھی ۔ پلے کارڈ ، وردی پہنے ہوئے ڈرائیور نے اٹھا رکھا تھا جب ہم کو

لانے کے لئے ہوٹل کی طرف سے بھیجا گیا تھا جو ہمیں کسی اور طرح سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ حیرت اس بات کی نہیں تھی کہ کسی کو ہمیں لینے کے لئے بھیجا گیا ہے بلکہ اس بات پر تھی کہ پلے کارڈ اٹھائے ہوئے وہ شخص کسی مظاہرے میں آیا ہوا الگ رہا تھا۔ جیسے ہمارے ناموں اور ہماری آمد پر خاموش احتجاج کر رہا ہو۔

اب بھی کچھ بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ذہن بھی کوئی خاص بات نہیں سوچ رہا تھا۔ ہوٹل میں چیک ان کرتے ہوئے بھی زیادہ کہنے سننے کی ضرورت پڑی، نہ کچھ سوچنے کی۔ استقبالیہ کاونٹر کے رجسٹر پر خانہ پری کرتا رہا۔ نام، پتہ، تفصیلات کی بھرمار، اور ایسے سوالات سے ہوٹل والوں کو کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ "اس شہر میں آمد کا مقصد؟ کاروبار یا تفریح؟ آپ کے سفر کی اگلی منزل؟" ہاں، یہ اندراج کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ یہ سب کس قدر غیر ضروری ہے۔ ہوٹل کے رجسٹر چھپے ہوئے خانے، ایک آدمی کی خاموش اور پر سکون، مگر اندر سے رستی ہوئی تنہائی کی پیمائش تو کر نہیں کر سکتے۔ ورنہ اس سے کیا فرق پڑ جائے گا کہ آپ جس فلائٹ سے آئے ہیں، اس کا نمبر کیا ہے؟

ایسی ساری تفصیلات کے غیر ضروری بلکہ گم راہ کن ہونے کا احساس اس وقت اور ہوا جب فضل صاحب اپنا سوٹ کیس کھول کر سامان کمرے میں رکھنے لگے۔ میں کچھ دیر تک چپ چاپ دیکھتا رہا۔ خاموشی اب چبھنے لگی تھی۔ اسے توڑنا ضروری تھا۔ اس لیے محض کچھ بولنے کی خاطر ان سے کہا: "سامان تو آپ ایسے جما رہے ہیں جیسے اب یہیں قیام کا ارادہ ہے۔"

وہ ہنس دیے۔ "کیا پتہ اسی کی نوبت آجائے۔" ان کی کھنکتی ہوئی ہنسی میں تلخی کا ایک شائبہ تھا۔

یا مجھے ایسا محسوس ہوا۔

مگر میں نے اس سے آگے کوئی سوال نہیں کیا۔ شاید وہ اسے پسند نہ کریں۔ پھر میں خود کون سی باتیں کرید کرید کر پوچھنا چاہتا تھا۔ میرا مقصد تو بس خاموشی کو توڑنا تھا، اس سے پہلے کہ وہ تکلیف دہ بن جائے۔ سفر کے یہ چند دن تو ان کے ہی ساتھ گزارنے تھے۔

میرے دفتر کے ساتھی تھے وہ، جہاں لوگ انہیں "اللہ کا فضل" کہتے تھے۔ کبھی پکارنے کے لیے اور کبھی چھیڑنے کے لیے۔ ڈھلتی عمر کے باوجود چہرے مہرے پر وجاہت تھی۔ بات بھی قرینے سے کرتے تھے۔ دفتری معاملات میں سوجھ بوجھ خاصی تھی، اس لئے میرا ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ دفتر میں بھی اور بعض مرتبہ، دفتری اوقات کے بعد ان کے گھر پر بھی۔ دفتر کے ایسے دوستوں کے ساتھ مجھے یہ سہولت رہی ہے کہ آپ خود ہی فاصلے کا تعین کر سکتے ہیں، اپنا کوئی حصار توڑنا نہیں پڑتا۔

قربت اور بے تکلفی کے ایک جبر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ان لوگوں کے ساتھ سفر

مجھے اذیت دیتے ہیں اور میں نہ جانے کب کب کی باتیں یاد کیے جاتا ہوں ۔ ڈاک کے ان ٹکٹوں کی طرح جن کے لفافے پر مہر لگنے سے رہ گئی ہو اور کسی نے یہ سوچ کر، پانی میں بھگو کر اتار لیا ہو کہ یہ دوبارہ کام آجائیں گے ۔ مگر کبھی کام آئی ہیں ایسی چیزیں ؟ کسی کونے میں رکھ کر بھلا دی جاتی ہیں، اور چند لمحے کے کام میں مشغول رکھنے کے علاوہ کسی مصرف کی نہیں ہوتیں ۔ چائے پی کر اور کچھ دیر باہر ٹہل کر واپس آئے تھے فضل صاحب اور بغیر استری کی، شکنوں بھری شلوار کے اوپر جرسی پہنے ہوئے میں انہیں دیکھ رہا تھا ۔ انہوں نے اپنے آپ کو بالکل ڈھیلا چھوڑا ہوا تھا ۔ ان کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے بہت دیر جوتے میں بند رہنے کے بعد، موزے اتار کر پیر باہر نکل آیا ہے اور پسیجتی ہوئی بو دے رہا ہے ۔ وہی پیر، جسے بند جوتے کے اندر کوئی نہیں دیکھ سکتا ۔

اب سونے کی کرنا چاہیے ، میں نے ارادہ کیا ۔ کپڑے بدلنے کے لئے غسل خانے چلا گیا ۔ دانت صاف کرنے کے لئے بیسن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شیلف پر ان کی چیزیں پہلے سے رکھی نظر آئیں ۔ گلاس میں ٹوتھ برش رکھا تھا اور اس کے قریب ہی ٹیوب پڑی ہوئی تھی ۔ کچھ دنوں سے استعمال میں رہی ہوگی یہ ٹیوب ، مگر کوئی چوتھائی خالی ہونے کے باوجود اس کا سڈول پن ، جو پوری بھری ہوئی نئی حالت میں ہوتا ہے ، ختم نہیں ہوا تھا ۔ اس کو پیچھے کی طرف سے ہی برابر دبایا جاتا رہا تھا ۔ ایک ترتیب سے خالی ہو رہی تھی وہ ٹیوب ، میری ٹیوب کی طرح جگہ جگہ سے پچکی ہوئی نہیں تھی ۔ کسی خاص احساس کے بغیر میں نے وہی ٹیوب اٹھالی اور احتیاط کے ساتھ اس کو دبا کر اپنے برش پر پیسٹ نکال لیا ۔

کلی کے ساتھ میں نے تھوک دیا اور بستر پر آن کر لیٹ رہا ۔

فضل صاحب اپنے بستر پر لیٹ چکے تھے ۔ ڈھیلے کپڑوں میں ان کا جسم سانس کے ساتھ ہلتا ہوا نظر آرہا تھا ۔

" بتی بند کردوں یا جلنے دوں ؟ آپ سوتے میں بالکل اندھیرا پسند کرتے ہیں یا تھوڑی بہت روشنی چاہتے ہیں ؟ " میں نے ان سے پوچھا ۔ میں ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا چاہتا تھا ۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں میرے رویے سے شکایت ہو ۔

" آپ اپنی سہولت دیکھ لیجئے ۔ ہماری قسمت میں تو اب اندھیرے ہی لکھے ہیں ۔ " ان کی آواز آئی ۔

ان کا مذاق کا موڈ ابھی ختم نہیں ہوا، میں نے کچھ کوفت کے ساتھ سوچا ۔

مگر یہ آواز میں ہلکی سی لرزش کیوں تھی ؟ میں خاموش ہی رہا ۔ اس خوف سے کہ یہ فوراً ہی آبلے کی طرح پھوٹ نہ پڑیں ۔ پھر میرا ذہن کہیں اور تھا اس میں پرچھائیاں گڈمڈ ہو رہی تھیں ۔ امی مظہر ماموں، امی کے پڑوس والوں کا طوطا، رادھا کرشن میں، گرمی کی دوپہروں میں کوارٹر کے سامنے سائیکل چلاتے ہوئے لڑکے مظہر ماموں کا وہ چہرہ جس پر عینک کے گول شیشے دو مجبور

آنکھوں کے آگے رو ک بنے ہوئے تھے۔ بے تکی فلمی گانے جو بیٹھے بٹھائے یوں ہی گنگنائے جاتے ہیں اور تھوڑے ہی دنوں میں ان پر ہنسی آنا بھی بند ہو جاتی ہے۔ "میں تو دلی سے دلہن لایا ری ۔۔۔ میرا تو بمبئی سے بالم آیا رے، او بابوجی ۔۔۔۔ "بم ہے۔ جگد میبے، اکڑ بکڑ، بمبے بھوں ۔۔۔
لیکن اس آواز کی لرزش بڑھ گئی تھی جب وہ اس کمرے میں گونجی۔ "ہوٹل میں قیام کی بات میں نے یوں ہی نہیں کہہ دی ہے۔ آپ کی بھابھی نے بھی حد کر دی ہے۔ کسی دن میں کچھ کر نہ بیٹھوں پھر بعد میں مجھے بھی افسوس ہو گا۔۔۔"

غسل خانے کی بتی جلتی چھوڑ دی تھی میں نے۔ اس کے اجالے کا ایک چوکور ٹکڑا۔ دائیں جانب کمرے کے قالین پر پڑ رہا تھا۔

"بات بات میں شک کیے جاتی ہے۔ میں کہیں چلا جاؤں، اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال آتا ہے کہ ضرور وہی چکر ہے۔ خود کہیں جانا پڑے تو گھر میں گھستے ہی بچوں سے پوچھتی ہے، تمہارے ڈیڈی کہاں گئے تھے؟ بات بات پر کڑھتی رہتی ہے۔ پھر بیٹھ کر روتی ہے۔ کتنی دفعہ سمجھایا ہے میں نے کہ پروین، دیکھ، کسی چیز کی کمی ہے تیرے لئے؟ اچھا کھاتی ہے، اچھا پہنتی ہے، گھر ہے، بچے ہیں، اور میرا امزاج بھی جانتی ہے۔ کہ میں ادھر ادھر منہ مارنے والوں میں سے نہیں اچھی خاصی ہنسی ہوتی ہے، مجھے گھر میں آتا دیکھ کر منہ بن جاتا ہے اس کا۔ ہر بات میں مجھ پر شک کرتی ہے۔ کوئی بات کہہ دوں، اسے سچ نہیں مانتی۔ کہتی ہے مجھ سے چھپاتے ہو، تم اصل میں اس کے چکر میں ہو۔ کتنی بار سمجھایا کہ تمہارا، اس کا کیا مقابلہ؟ لیکن بات سننے کی روادار نہیں۔ کچھ نہ بھی کہے، تب بھی جتنی دیر میں سامنے رہوں، کن انکھیوں سے میری طرف دیکھے جاتی ہے۔ ٹھنڈے سانس بھرتی ہے، کبھی خود ہی بڑبڑانے لگتی ہے۔۔۔"

کسی خاص بات سے شک ہوا ہے ان کو؟ میں نے ایک سوال پوچھنا چاہا، سوال تو میرے ذہن میں اور بھی آئے۔ لیکن اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ میرے سوال کو کس طرح لیں گے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ مجھے سنا ہی رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے خود ہی اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہے ہوں۔

سوال کا موقع دیے بغیر وہ بولے جا رہے تھے۔ "زبیدہ کے آنے کے بعد سے تو اس کی بے اعتباری کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ کہتی ہے کہ تم جان بوجھ کر اسے یہاں لائے ہو۔ آپ خود ہی جانیے، میں نے زبیدہ کو نوکری دلوانے میں سفارش تک نہیں کی۔ بچپن سے ہم لوگوں کا ملنا جلنا ہے۔ اس کے گھر روز کا آنا جانا، اور اس کے بھائیوں سے دانت کاٹی دوستی، اگر اس کے ساتھ کچھ کرنا ہوتا تو چپلے نہ کر گزرتا، دفتر میں لا کر بٹھاتا؟ اتنا سمجھایا کہ دفتر میں چار لوگوں کے درمیان ایک عزت بنی ہوئی ہے۔ کس کو اچھا لگتا ہے جب تم دو دو ٹکے کے چپراسیوں، چوکیداروں کو گھر بلا کر پوچھتی ہو کہ آج صاحب کے پاس کون کون آیا تھا۔ کل کو یہی لوگ باتیں کریں گے۔ آپ سونا تو

نہیں چاہ رہے ؟ میری باتوں سے اکتا تو نہیں گئے ؟ میں بھی کس سے کہوں ؟ آپ زبیدہ کو ایک طرف رکھیے اور ایک طرف اسے ، میں کوئی پاگل ہوں کہ گھر میں اچھی بھلی بیوی کو چھوڑ کر دوسرے گھروں میں نظریں دوڑاتا رہوں ؟ زبیدہ کے گھر آنا جانا کب کا چھوڑ دیا میں نے ۔ اس کے بھائی پوچھتے بھی رہے کہ کس بات پر ناراضگی ہے ؟ وہ کوئی بچے تو نہیں ہیں جو سمجھ نہ جائیں ۔ اور ایک زبیدہ ہی کی بات نہیں ۔ اس سے پہلے وہ شہناز تھی وہی ذرا ابھاری بدن کی ۔ یاد ہے ناں ، آپ کو ؟ اس پر کیا کچھ بہتان نہیں باندھے ۔ سو تو نہیں گئے آپ ؟"

میں سویا تو نہیں تھا ۔ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا ۔

"بچے بڑے ہو گئے ہیں ۔ وہ ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں ۔ اپنے باپ کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے ؟ اور خود پروین نے اپنا جو حال بنالیا ہے ۔ کہتی ہے ، ایک پل چین نہیں آتا ہر بات کا ذمہ دار مجھی کو ٹھہراتی ہے ۔ کھانسی بھی آتی ہے تو کہتی ہے ، تم تو مجھے خون تھکوا کر چھوڑو گے ۔ میرا دماغ ماؤف نہ ہو جائے تو اور کیا ہو ۔ آپ ہی انصاف کیجئے ۔ ۔ ۔ "

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھ سے کس بات کی توقع کی جارہی ہے ۔

"ہر بات میں شک ، ہر بات میں شک ، میں جو بھی کرتا ہوں ، اس کو اس میں ایک ہی بات نظر آتی ہے ۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے ، وہی ایک بات ۔ ۔ ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا ہو گیا ہے ۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ "

"بمبئی ۔ ۔ ۔ " میرے منہ سے اچانک نکلا ۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟"

"بمبئی ۔ " میں نے جواب دیا ۔

"میں سمجھا نہیں ؟" فضل صاحب کے لہجے میں حیرت تھی ۔ انتہا سے زیادہ حیرت ۔

مگر میری سمجھ میں آگیا تھا ۔ آئندہ ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آنے والا ہے ، اس کا نام میری سمجھ میں آگیا تھا ۔

اس وقت امی کی بتائی ہوئی ، مظہر ماموں کی وہ بات یاد نہ آتی تو یہ نام کیسے سمجھ میں آتا ؟

یہی نام ، بمبئی ۔

محسن خان

نیند

مجھے خوب زور کی نیند آرہی ہے ۔ میں سو جانا چاہتی ہوں ۔ ایسی گہری نیند کہ جس کے بعد وجود کا احساس ہی نہ رہے آتی ہی کب ہے ۔ رات گئے تک کام دھندوں کی مصروفیت اور بچوں کے شور وغل سے اعصاب شل ہو جاتے ہیں ، پنڈلیاں پھڑکنے لگتی ہیں اور ایسی ہلکی ، اچٹتی ہوئی نیند آتی ہے جیسے سفر کے دوران آجاتی ہے کہ اک ذرا سی نامانوس آہٹ ہوئی یا کوئی موڑ آیا اور آنکھ کھل گئی ۔ ایسے میں خواب بھی ایسے بے کیف اور بے چین کر دینے والے آتے ہیں جن سے فرحت اور تازگی ملنے کے بجائے تکان کا احساس ہونے لگتا ہے ۔ سر بھاری ہو جاتا ہے اور ذہن سارا دن پریشان رہتا ہے ۔ جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو ۔ شادی سے پہلے ایسی کیفیت کبھی نہیں رہی ۔ ہاں کسی کی ڈانٹ پھٹکار یا کچھ مخصوص دنوں میں یہ حال ہو جاتا تھا کہ چادر سے منہہ ڈھانپ کے پڑ جاتی گھٹتی رہتی اور اس کیفیت میں غافل ہو جاتی ۔ مگر عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ ادھر لیٹی نہیں کہ سو گئی پھر کوئی ہزار بار پکارے مجھے خبر کہاں اور خواب بھی اچھے اچھے آتے تھے ۔ اماں میری اس عادت سے بہت چڑتی تھیں ۔ کہتی تھیں ایسی گھوڑے بیچ کے سوتی ہے کہ دنیا جہاں کا ہوش ہی نہیں رہتا ۔ بالکل بچوں کی سی صفتیں ہیں ۔ ان کی موہوم سی آواز جو اکثر خواب کا حصہ بن جاتی تھی ، مجھے سنائی دیتی تھی ۔۔

" ما نگیں کہیں ہیں تو ہاتھ کہیں ہیں ، جاے تک کا ہوش نہیں ۔۔۔ یہ بھی خیال نہیں کہ گھر میں باپ اور جوان جوان بھائی بھی ہیں ۔۔۔ پرائے گھر میں جائے گی تو روز ڈانٹی جائے گی " ۔ پھر جیسے اپنے آپ سے کہتیں " پہلے مجھے بھی ایسی ہی بے خبری کی نیند آیا کرتی تھی مگر اب جانے کہاں اڑ گئی ۔ آنکھیں نیند سے خالی ہو گئیں ۔ "

میری آنکھیں بھی نیند سے خالی ہو گئی ہیں ۔ بے خودی کا سادہ خمار جانے کہاں چلا گیا ۔ پہروں نیند کا انتظار کرتی ہوں مگر نہیں آتی ۔ ہاں ، کبھی کبھار اک عجیب طرح کی ، غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے ، جیسی اس وقت ہے ۔ پپوٹے بوجھل ہوتے جا رہے ہیں ، آنکھوں کے ڈھیلے ٹیکے پڑ رہے ہیں اور دماغ اس طرح سنسنا رہا ہے جیسے ہانڈی میں ابال آرہا ہو ۔ ایسی کیفیت میں نمک کی چائے پینے سے طبیعت سنبھل جاتی ہے اور ذرا دیر کے لئے نیند بھی بھاگ جاتی ہے ۔ چائے پی لوں ورنہ آدھی رات تلک جاگنا مشکل ہو جائے گا ۔ سوچا تھا آج رات میں رفعت کی فراک سیوں گی ۔ اس کے پاس گت کی کوئی فراک نہیں رہی ۔ صبح اٹھ کے روئے گی کہ میرے لئے فراک کیوں نہیں

سی ۔ روز کوئی بہانہ کر دیتی ہوں ۔۔ باجی کو خط بھی لکھنا تھا ۔ کتنے دن ہو گئے ہیں ان کا خط آئے ہوئے اور میں اب تک جواب نہیں دے سکی ۔ سوچتی ہوں گی اب کہکشاں کو مجھ سے محبت نہیں رہی ۔ کیا کروں ۔ روزانہ سوچتی ہوں کہ آج لکھوں گی کل لکھوں گی مگر نہیں لکھ پاتی ۔

پہلے کیسا انتظار رہتا تھا باجی کے خطوں کا اور کیسے اہتمام سے جواب لکھا کرتی تھی ۔ یہ بھی ایک طرح کا مشغلہ تھا ۔ اب لکھنے بیٹھتی ہوں تو سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کیا لکھوں ۔ بیچ بیچ میں کوئی کام یاد آجاتا ہے اور اٹھ کھڑی ہوتی ہوں ۔ قلم کاغذ بھی ایسے ٹھکانے پر رکھ دیتی ہوں کہ ڈھونڈے نہیں ملتے ۔ باجی بھی اب عادی ہوتی جارہی ہیں ۔ پہلے ہر خط میں میری سرد مہری کی شکایت ضرور کرتی تھیں مگر اب نہیں کرتیں ۔ اور اب ان کے خط بھی اس پابندی سے نہیں آتے ۔

نیند کا جھونکا پھر آگیا ۔ چائے بنالوں ورنہ سو گئی تو پھر آنکھ نہیں کھلے گی ۔ خفا ہوں گے ، کہیں گے میرا انتظار نہیں کر سکتی تھیں ۔ ایسے موقعوں پر میرا جلدی سو جانا انہیں اچھا نہیں لگتا ۔ مجھے بھی بڑی الجھن ہوتی ہے ۔ جاگنے کی بہت کوشش کرتی ہوں مگر نہ آنکھیں کھلتی ہیں نہ کچھ سمجھ میں آتا ہے ۔ پچھلی مرتبہ ایسی ہی بے تحاشا نیند آگئی تھی اور کیسا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا ۔ لگتا تھا کسی نے خوب زور سے دبوچ لیا ہو اور گلا گھونٹے دے رہا ہو ۔ بری بری آوازیں نکلنے لگی تھیں اور اس دن انھوں نے کیسا غصہ کیا تھا مجھ پہ ، زور سے چیخے تھے ۔۔ "یہ کیا پڑی ہوئی ہو مردوں کی طرح ۔۔۔ ، ہاتھوں میں دم ہے نہ پیروں میں جان ۔ کبھی جو ساتھ دیتی ہو ۔۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جرم کر رہے ہوں" ۔ شروع میں میں ان کی باتوں کی پروا نہیں کرتی تھی مگر اب یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اگر میں نے اسی طرح بے پروائی برتی تو ایک نہ ایک دن اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا ۔ ویسے بھی اب میں روز بہ روز بد شکل اور بد وضع ہوتی جارہی ہوں ۔ مذاق مذاق میں کہہ بھی دیتے ہیں ۔ اس دن لائٹ جلا کے مجھے دیکھا تھا اور کتنا ہنسے تھے ، مجھ پہ ۔

اب یہ بدن میں نے اپنے ہاتھ سے تو بنایا نہیں ۔۔ اللہ میاں جس کو جیسا چاہیں بنادیں ۔ پہلے تو میرا بدن ایسا نہیں تھا ۔ شکل کی بھی سب لوگ تعریف کرتے تھے ۔ اب بھی بعض دنوں میں جب ذرا سکون ملتا ہے ، اچھی لگنے لگتی ہوں ۔

چائے میں نمک زیادہ پڑ گیا ، چلو ٹھیک ہے ، اب دیر تلک نیند نہیں آئے گی ۔ مگر یہ نیند آتی خوب زور سے ہے ، سو جاتی ہوں تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا ۔ خواب بھی سب یاد رہتے ہیں ۔ بیچ بیچ سے ٹوٹتے نہیں ۔ ایسی نیند کے بعد صبح جلدی اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ جی چاہتا ہے بس سوتی ہی رہوں اور اچھے اچھے خواب دیکھتی رہوں ۔

آج ہوا نہیں چل رہی ، جب ہوا نہیں چلتی تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب چیزیں کسی خیال میں کھو گئی ہوں یا گہری نیند سو گئی ہوں ۔ ایسے میں بڑا ہول آتا ہے ۔ رات بھی تو زیادہ ہو گئی ہے

۔۔ سب کے گھروں میں روشنیاں بجھ چکی ہیں ۔ جب زمین پہ روشنی ہوتی ہے تو آسمان دکھائی نہیں دیتا ۔ اندھیرا ہوتا ہے تو دکھائی دیتا ہے ۔ اب اس وقت نیچے روشنی نہیں ہے تو آسمان دکھائی دے رہا ہے ۔ ستارے کیسے چمک رہے ہیں ۔ کس قدر ستارے ہیں آسمان میں ۔ گننے بیٹھوں تو عمر گزر جائے اور گنائے نہ گنیں ۔ یہ ستارے جو یہاں سے اتنے چھوٹے چھوٹے سے دکھائی دیتے ہیں ، سنا ہے اتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں کہ ان پر دنیائیں آباد ہو سکتی ہیں ۔۔ یہاں تک سنا ہے کہ بعض ستارے تو ایسے بھی ہیں کہ جن پر ہماری ہی جیسی مخلوق آباد ہے ۔ پتہ نہیں سچ ہے کہ جھوٹ یہاں سے تو وہی ستارے نظر آتے ہے جنہیں بچپن سے دیکھتی آرہی ہوں ۔ آج جانے کتنے دنوں کے بعد آسمان کی طرف دیکھ رہی ہوں ۔ پہلے جب اپنے گھر کے آنگن میں لیٹ کے آسمان کی طرف دیکھتی تھی تو کتنا اچھا لگتا تھا ۔ دور دور تک پھیلے ہوئے ستارے ، گھٹتا بڑھتا ہوا چاند ، جو کبھی مشرق کی طرف سے اٹھتا تھا کبھی مغرب کی طرف سے اور ستاروں کے بیچ میں وہ آڑی ترچھی ، سفید کامدار دوپٹے کی سی کہکشاں ۔۔ اب تو مہینوں یہی خیال نہیں آتا کہ آسمان بھی ہے ، اس میں ستارے ہیں اور چاند بھی ہے ۔

پتہ نہیں کہاں چلے گئے ۔ کہہ کے گئے تھے سو نامت جلدی آجاؤں گا ۔ انہیں بھی کیسے کیسے تماشے سوجھتے ہیں ۔ موسم بدلنے کا اثر ہوتا ہے یا کیا کہ بعض دنوں میں بالکل بدل جاتے ہیں ۔ ذرا ذرا سی باتوں پر توجہ دینے لگتے ہیں ۔ خوب باتیں کرتے ہیں اور جی کھول کے ہنستے ہیں ۔ بچوں کی سی کیفیت ہو جاتی ہے ۔ اور بعض دنوں میں چپ سادھ لیتے ہیں ۔ کسی بات کا جواب دینا بھی گورا نہیں کرتے ۔ مجھے تو ان کی یہ عادت اچھی لگتی ہے نہ وہ عادت ۔ جی چاہتا ہے کہ بس انسانوں کی طرح رہیں ۔ ابا کی بھی ایسی عادتیں تھیں ۔ عام طور پر خاموشی اختیار کیے رہتے تھے ، خوب غصہ کرتے تھے اور کبھی کبھی خوب خوش نظر آتے تھے ۔ ہر بات کا جواب رسانیت سے دیتے ۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ بعض دنوں میں ابا کو کیا ہو جاتا ہے کہ ابا ابا ہی نہیں لگتے ۔ اماں صحیح کہتی تھیں ۔ مردوں کا مزاج کوئی نہیں سمجھ سکتا ۔

گجرا بھی الجھ گیا ۔ نیند کا جھونکا جو آگیا تھا ۔ پتہ نہیں میک اپ ٹھیک سے ہوا بھی یا نہیں ، قریب سے آئینہ دیکھ لوں ورنہ ذرا بھی کسر رہ گئی تو یہی کہیں گے کہ تم کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ۔ بے دلی کے ساتھ بیٹھی انتظار کر رہی ہو ۔ صبح سے شام تک جھاڑتی پونچھتی رہتی ہوں مگر یہ گرد تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتی ۔ روز آئینہ صاف کرتی ہوں اور گرد آکے پھر بیٹھ جاتی ہے ۔ میک اپ تو ٹھیک ہی ہے ۔ ٹھیک کیا ہے بس ہے ان کا دل رکھنے کو ۔ آنکھیں کیسی حلقوں میں گھسی جا رہی ہیں جیسے برسوں کی بیماری کے بعد بستر سے اٹھی ہوں ابھی ۔ بڑی عورتوں پر کچھ اچھا نہیں لگتا ۔ نہ بدن پر کپڑے نہ چہرے پر میک اپ ۔

نمک کی چائے پیتے ہی آنکھیں جیسے کھل سی گئیں ۔ اب کچھ دیر تک جاگ سکوں گی ۔ سہاگ رات کا جوڑا پہن لوں ورنہ آگئے تو کہیں گے ابھی تلک وہی چیکٹ کپڑے پہنے بیٹھی ہو ۔ نہائی بھی نہیں ۔ اب کون نہا تا رات کے وقت ۔ بال گیلے کر لوں گی کہہ دوں گی نہائی تھی ۔ پاوڈر تو لگا ہی لیا ہے ۔ سہاگ رات کا یہ جوڑا اب کتنا بھاری لگنے لگا ہے پتہ نہیں ۔ چوتھی چالوں تک کیسے سنبھالا تھا اسے میں نے جی چاہتا ہے کسی دن اس کو چپکے سے ادھیڑ کے رفعت کا سوٹ بنا دوں ۔ مگر ڈر لگتا ہے خفا ہوں گے ۔ کہیں گے تم نے مجھے جلانے کے لئے کیا ہے یہ سب کچھ ۔ پتہ نہیں ابھی اور کتنے دنوں تک ۔

سہاگ رات کے اس جوڑے میں بج بج کے ان کا انتظار کرنا پڑے گا ۔ موسم بدل رہا ہے رات میں خنکی ہو جاتی ہے مگر دن میں کیسی تڑاخے کی دھوپ نکلتی ہے ۔ پھول جلدی مرجھا جاتے ہیں آج پیڑوں میں پانی بھی نہیں ڈالا ۔ روزانہ پانی ملتا رہے تو یہ کتنی جلدی بڑھتے ہیں اور کیسے تر و تازہ رہتے ہیں ۔ سنا ہے رات کے وقت پیڑوں میں پانی ڈالنا اچھا نہیں ہوتا ۔ صبح ڈالوں گی ۔ رات کے وقت پیڑ پودوں کے پاس جانا بھی نہیں چاہیے ۔ سائے کا اثر ہو جاتا ہے ۔ سانپ بچھوؤں کا بھی ڈر ہوتا ہے ۔ اف ۔ اس موذی کا خیال آتے ہی جھر جھری آجاتی ہے اور بدن میں سر سراہٹ کا سا احساس ہونے لگتا ہے ۔ ابھی تک اسی طرح یاد ہے ، جیسے کل کی بات ہو ۔ ایک بار آنگن میں لیٹی ہوئی بے خبر سو رہی تھی ۔ پتہ نہیں کیا بجا تھا ۔ بہت رات ہو گئی تھی ۔ کسی چیز کا لجلجا اور ٹھنڈا ٹھنڈا سالمس محسوس ہوا ۔ کوئی چیز سر سراتی ہوئی پیروں کے اوپر سے پیٹ کی طرف جاری ہو ۔ جلدی سے ، گھبرا کے اٹھ بیٹھی ۔ دوڑ کے چراغ لائی اور اس کی لو اونچی کر کے دیکھا تو دل کی دھڑکن بند سی ہو گئی اور سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا ۔ بے جان سی ہو کر اماں کے پلنگ پر ڈھ گئی پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا ۔ دیر کے بعد ہوش و حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ سب لوگ میرے اوپر چراغ کی روشنی کیے میرے بدن میں سانپ کے کاٹے کا نشان ڈھونڈھ رہے ہیں ۔ ایک دن پہلے برتن دھوتے وقت پتیلی کی دھار سے انگلی کٹ گئی تھی ۔ اماں کے ڈر سے چھپائے رہی تھی کہ ڈانٹیں گی ۔ کس پھوہڑ پن سے کام کرتی ہو کہ روزانہ کوئی نہ کوئی زخم ہو جاتا ہے ۔ زخم کا نشان نمایاں تھا ۔ اماں اسی انگلی کو پکڑے بیٹھی تھیں ۔ کلائی پر ایک ڈوری اتنی سختی سے باندھ دی گئی تھی کہ اگر زیادہ دیر تک بندھی رہتی تو ••••• خون کا دوران بالکل ہی بند ہو جاتا اور انگلیاں بے حس ہو جاتیں ۔ کچھ دیر تک تو مجھے بھی وہم رہا کہ یہ سانپ کے کاٹے کا نشان ہے ۔ مگر کچھ دیر کے بعد ، جب ہوش و حواس بالکل درست ہو گئے اور آواز قابو میں آئی تو میں نے ٹھہر ٹھہر کے ، بیماروں کے سے لہجے میں واقعہ بیان کیا ۔ پھر یہ واقعہ جو ایک حادثہ بنتے بنتے رہ گیا تھا ، اک دلچسپ لطیفہ سا بن کے رہ گیا اور اس میں کلیاں پھندنے لگتے چلے گئے ۔ ابا کی غیر موجودگی میں یہ واقعہ

ڈرامائی انداز میں بیان کیا جاتا۔ رفعت باجی نڈھال سی ہو کر پلنگ پر گر جاتیں اور اسی انداز اور اسی کیفیت کے ساتھ بیان کرتیں جیسے میں نے بیان کیا تھا۔ میں چڑتی تھی۔ پیر ٹپکتی تھی۔ اب خیال آتا ہے تو سب کچھ اچھا لگتا ہے ••••••اگر سانپ کاٹ ہی لیتا اور میں مر گئی ہوتی تو، •••••• یہ واقعہ بیان کر کر کے سب لوگ رویا کرتے ••••بھائی جان نے سانپ کو مار ڈالا تھا۔ گھورے پر پڑا ہوا مردہ سانپ، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خوب چوڑے پھن والا، پتلا پتلا سا۔ اس کے اوپر بنے ہوئے سیاہی مائل پھولوں کے سے ٹپے دھوپ میں کیسے چمک رہے تھے۔ دو تین دن کے بعد، جب ہوا چلی تھی تو کیسا تعفن گھر میں بھر گیا تھا۔ پھر بھائی جان اسے اٹھا کے کہیں دور پھینک آئے تھے۔ اس کے بعد جب بھی سانپ کا خیال آتا تو تعفن کا احساس ضرور ہوتا، اب بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ مرا ہوا سانپ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر مہینوں یہی احساس رہا کہ سانپ مرا نہیں ہے یہ بھی وہم رہا کہ سانپ اپنی پتلیوں پہ بھائی جان کا عکس چھوڑ گیا ہوگا اور ایک نہ ایک دن اس کی مادہ انتقام ضرور لے گی۔ کتنے دنوں تک پاؤں پھیلا کے سو نہیں سکی۔ سانپ مر گیا تھا مگر اپنا ٹھنڈا ٹھنڈا سا رونگٹے کھڑے کر دینے والا لمس میرے بدن پر اور دھوپ میں چمکتے ہوئے سیاہی مائل پھول میری آنکھوں میں چھوڑ گیا تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے اس موذی کا خیال آگیا۔ جہاں پیڑ پودے ہوتے ہیں اور زمین میں نمی ہوتی ہے یہ موذی آجاتا ہے۔ یہاں سے ہٹ جانا چاہئے۔ جس دن یہ دیر میں لوٹتے ہیں کیسا ہول آتا ہے۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے اب تو خیر اتنا احساس نہیں ہوتا شادی کے بعد شروع شروع میں بڑا ڈر لگتا تھا۔ جہاں گلیوں میں سناٹا ہوا اور گھروں کی روشنیاں بجھیں نہیں کہ دل بیٹھنے لگتا تھا۔ اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی تھی مگر کہیں اک ذرا آہٹ ہوئی اور لگتا تھا کہ اب کوئی دیوار پر سے پھاندا کہ جب پھاندا۔ کمرے میں ہوتی تھی تو برآمدے سے ڈر لگتا تھا اور برآمدے میں ہوتی تھی تو کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

گل دان پر بھی روزانہ گرد جم جاتی ہے۔ پھول بھی کمہلا گئے۔ صبح تازے پھول لگادوں گی کسی دن بازار سے نقلی پھول لا کے سجادوں گی۔ روزانہ پھول سجانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ ویسے بھی اب ان پھولوں میں خوشبو کہاں ہوتی ہے۔ کل اس ڈائننگ ٹیبل کو دوسری طرف کر دوں گی۔ ٹی وی بھی کہیں اور رکھ دوں گی۔ چیزیں ایک جگہ پر زیادہ دنوں تک اچھی نہیں لگتیں، کشش ختم ہو جاتی ہے۔ ہوائی جہاز جارہا ہے۔ یہ روزانہ، اسی وقت یہاں سے گزرتا ہے۔ کیسی عادی سی ہو گئی ہوں اس کی آواز کی۔ اگر کسی دن نہ گزرے تو ضرور کچھ کمی کا احساس ہوگا۔۔۔۔۔ نیند آرہی ہو اور سونے کو نہ ملے تو کیسا عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ ذہن ماؤف سا ہو جاتا ہے اور پپوٹے آپ ہی آپ ایک دوسرے میں چمٹنے لگتے ہیں۔ چلو شادی والا البم ہی دیکھتے ہیں۔ کتنے دنوں سے نہیں دیکھا۔ اکثر سوچتی ہوں کہ کسی دن ایک نیا البم لا کے اس میں فوٹو لگادوں گی مگر سوچتی ہی رہ جاتی

ہوں ۔ہو بھی تو گیا ہے کتنا پرانا ۔ شادی کے وقت کا ہے ۔ ہوں ۔۔۔ یہ ہے میری شادی کے وقت کی تصویر ۔۔۔ شادی کے وقت میں کیسی اچھی لگتی تھی ۔۔ کھلایا بھی تو تھا امی نے خوب میوہ کہ سسرال جائے تو تندرست ہو کے جائے نہ معلوم وہاں کتنا کام کرنا پڑے اور اچھا کھانے پینے کو ملے کہ نہ ملے ۔ جنھوں نے مجھے پہلے دیکھا تھا اب دیکھتی ہیں تو حیرت کرتی ہیں کہ آئیں یہ کہکشاں ہے ، کیا ہو گیا ہے اس کو ۔ آئینہ دیکھتی ہوں تو اپنے آپ کو پہچانا نہیں جاتا ۔۔۔ اس وقت ابا کیسے ٹھاٹھے تھے ۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اتنی جلدی مرجائیں گے ۔ کتنے جھمیلے چھوڑ گئے ہیں ابا اپنے پیچھے ۔ جانے کیا سوجھی تھی کہ دوسری شادی کر بیٹھے ۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ محلے والوں نے ان کا خوب مذاق اڑایا تھا ۔۔ ٹھیک تو ہنستے تھے لوگ ۔ بھلا اس عمر میں شادی کی کیا ضرورت تھی ، اور وہ بھی ایک جوان لڑکی سے ۔ پھر ہم لوگوں کی پیدائش پر ان کا اور مذاق اڑایا گیا ۔ شادی تو کی ہی تھی آدھا درجن بچے اور پیدا کر دیئے ۔ ابا کے تیرہ اولادیں ہوئیں ۔ آٹھ میری پہلی والی اماں سے اور پانچ میری سگی امی سے ۔ دو بچے ضائع ہو گئے وہ الگ ۔ اسی میں تو امی کی صحت خراب ہو گئی تھی ۔ توبہ ہے ۔ ابا نے تو کچھ سوچا سمجھا ہی نہیں ۔ اگر ابا دوسری شادی نہ کر لیتے تو گھر جہنم نہ بنتا ۔ ابا کے مرنے کے بعد امی بھی بجھ سی گئی تھیں ۔ سہاگ اجڑنے کے بعد بھلا کون عورت خوش رہ سکتی ہے ۔ چہ چہ چہ ۔۔۔ بے چاری زہرا باجی ۔۔ ان کی تصویروں میں کیسی معصومیت اور بے کسی جھلکتی ہے ۔ آدمی لاکھ مسکرائے ، ہنسنے کی کوشش کرے مگر چہرے کی بناوٹ اور آنکھوں کا رنگ سب کچھ بتادیتا ہے ۔ اگر ابا دوسری شادی نہ کر لیتے تو زہرا باجی اتنی جلدی نہ مرتیں ۔ ایک تو اپنی اماں کی موت کا دکھ ، بیماری اوپر سے میری امی کی زیادتیاں ۔ کتنے دکھ جھیلے تھے بے چاری نے ۔ اللہ میاں کے گھر ان کو اس کا اجر ضرور ملے گا ۔

ان تصویروں کو دیکھتی ہوں تو ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں ۔ جی چاہتا ہے پھر وہی دن لوٹ آئیں جی گھبرا گیا آہ ۔ جماہیاں لیتے منہ دکھنے لگا ۔ بچے دن بھر شور مچاتے ہیں اور رات میں کیسی بے خبری کے ساتھ سوتے ہیں ۔ لو اس کمبخت ماری نے ابھی سے پیشاب کر دیا ۔ اب صبح لادی دھونا پڑے گی ۔ شاید دروازے پر دستک ہوئی ہے ۔ کچھ بھی نہیں ہے ۔ جب انتظار کرتی ہوں تو ذرا ذرا دیر کے بعد یہی احساس ہوتا ہے ۔۔۔ ایک بجنے کو ہے ۔ یہ گھڑی کی سوئی بھی خوب ہے ایسا لگتا ہے کہ جب اس پر نظر پڑتی ہے تو یہ چلنا شروع کر دیتی ہے ۔ اب غور کر رہی ہوں تو اس کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے ۔ روشنی آنکھوں میں لگ رہی ہے ۔ بجھا دوں گی تو نیند آجائے گی ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں ۔ چلو پیڑوں میں پانی ڈالتے ہیں رات ہے تو کیا ہوا ۔ آخر جاگتے رہنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی ہو گا ۔

انگریزی: ہائنرس بائل
ترجمہ: نثار احمد صدیقی

انتظار

میری زندگی کا انحصار صرف ایک منٹ امید اور ۲۳ گھنٹے ۵۹ منٹ ناامیدی پر ہے۔ ایک منٹ امید ہی مجھے بار بار اسٹیشن لے جاتی ہے کہ شاید تیرہ بیس کی ٹرین سے وہ آہی جائے۔ اسٹیشن ماسٹر اور سارے اسٹاف سوچ رہے ہیں کہ یہ بے چارہ روزانہ آکر یوں ہی واپس چلا جاتا ہے مجھے یہ سارے لوگ بے وقوف سمجھتے ہیں تاکہ میں آنا چھوڑ دوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ صرف بے وقوفی ہے۔ مجھے اب وہاں نہیں جانا چاہیے، وہاں جانے میں کوئی بات نہیں ہے لیکن وہاں مجھے جانا ہی پڑتا ہے۔ ایک منٹ کی امید اور تیئیس گھنٹے ۵۹ منٹ کی ناامیدی پر ہی زندہ ہوں، کوئی اسے میرا خبط بھی نہیں کہہ سکتا۔ مجھے اب وہاں نہیں جانا چاہیے۔ اس سے ملتا ہی کیا ہے؟ یہی چیز مجھے مار رہی ہے۔ یہی اس سے مل رہا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو مارنا، پھر مجھے جانا ہی چاہیے۔ ہاں۔! وہاں جانا ضروری ہے۔ آنے والی گاڑی بھی آجاتی ہے۔ تیرہ بیس کی گاڑی ٹھیک وقت پر آتی ہے۔ میں، میں ہمیشہ بہت نزدیک سے اسے دیکھتا ہوں، بہت ہی نزدیک سے۔۔۔!

جیسے ہی میں نکلتا ہوں، سگنل کی جھنڈی لیے ہوئے وہ آدمی بجھ جاتا ہے، وہ اپنی جھونپڑی سے نکلتا ہے۔ جبکہ گھنٹی کی آواز مجھے پہلے ہی سنائی دے جاتی ہے۔ تب میں بھی باہر نکل کر اس کے پاس جاتا ہوں، وہ مجھے جانتا ہے۔ اس کا چہرہ اداس سا ہے۔ کچھ گھبرایا ہوا ہے۔ ہاں! وہ سگنل کی جھنڈی والا آدمی خوف زدہ ہے۔ وہ آدمی سوچتا رہتا ہے کہ کسی دن میں اس پر حملہ کردونگا، میں اسے جان سے ماردونگا۔ اور ریل کی پٹری پر ڈال دونگا۔ اور تیرہ بیس والی گاڑی اس کے اوپر سے گذر جائے گی۔۔۔ کیونکہ اس جھنڈی والے آدمی کو مجھ پر یقین نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا وہ معصوم ہونے کا فریب دے رہا ہے، ہوسکتا ہے یہ اس کا خیال ہو۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں اس کا ڈر صحیح ہے اس کے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ موجود ہے۔ میں کسی دن اچانک اس کی ہی جھنڈی کے ڈنڈے سے اس پر حملہ کردونگا۔ میں بھی اس پر یقین نہیں کرتا۔ شاید ان لوگوں سے ملا ہوا ہے۔ اس کے پاس جھونپڑی میں ٹیلی فون بھی تو ہے۔ اسے صرف نمبر ڈائل کرنے کی دیر ہے وہ ان سے بات کرسکتا ہے۔ بلا سکتا ہے۔ ریلوے کے لوگوں میں تو ایک دوسرے سے

سیدھے فون پر بات ہوتی ہے۔ شاید وہ ریسیور اٹھا کر لائن سے دو اسٹیشن پہلے کے لوگوں سے کہے گا اسے اتار لو، گرفتار کر لو، اس کو آنے مت دو، ایسے بھی نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔! ہاں۔ وہی لڑکی، بھورے بالوں والی، جس نے سبز بلاوز اور ساڑی پہن رکھی ہے۔ ہاں اسی سے جس نے اس لڑکی کو پکڑ رکھا ہے۔ وہ ہنستا ہے۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے اسے ہنسنے دو، اس لڑکی کو پکڑے رہنے دو، وہ ٹیلیفون پکڑے ہوئے بھی ہنستا رہتا ہے۔ پھر وہ باہر آتا ہے۔ اپنا معصوم چہرے لئے ہوئے جب وہ مجھے اپنی طرف کڑی نگاہ سے دیکھتا ہے تو ہمیشہ کی طرح بغیر پوچھے ہی مجھ سے کہنے لگتا ہے۔ حضور! دیری کی کوئی خبر نہیں ہے۔۔۔؟ آج بھی ٹرین ٹھیک وقت پر آرہی ہے۔ میں پاگل سا ہوتا جارہا ہوں۔ لگتا نہیں کبھی میں اس آدمی پر یقین کر پاؤنگا۔ اسکی پیٹھ ہمیشہ میری طرف ہی رہتی ہے۔

میں جانتا ہوں وہ آنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے لکھا تھا۔۔۔ "میں تمہیں چاہتی ہوں، اور میں تیرہ بیس کی گاڑی سے آرہی ہوں۔ میں وہاں تیرہ بیس پر پہنچ جاؤنگی۔۔۔۔" یہ اس نے تین ماہ قبل لکھا تھا۔ ٹھیک تین ماہ چار دن قبل۔ پر اسے زبردستی ٹھہرالیا گیا ہے۔ وہ لوگ نہیں چاہتے کہ وہ میرے پاس آئے۔ وہ سب میرے خلاف ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایک منٹ امید سے زیادہ کچھ ہو۔۔۔!

میرا انتظار اب ختم ہوگیا ہے۔ آج مجھے اگر وہ مل جائے تو آخری یاد بن جائے گی۔ میں پاگل پن میں تین ماہ چار دن سے اپنی ہی چربی کھا رہا ہوں۔ یا پھر میری چربی مجھے کھائے جارہی ہے۔ ہر چیز چلی گئی۔ یہاں تک کہ میز پوش بھی نہیں رہا۔ انہوں نے بہت ہی مشکلیں پیدا کردی ہیں۔ وہ گروپ تو اب بھی ایک ہی جگہ بیٹھتا ہے۔ جیسے سکھ اور خوشی انہیں کی جاگیر ہے۔ سب کچھ ان کے ہی پاس ہے۔ بس وہ دن بھر میں ایک منٹ کی امید ہی دے سکتے ہیں۔ ۲۳ گھنٹے ۵۹ منٹ تک ان سب چیزوں سے بچے رہیں۔ میں کس طرح اپنا وقت گذار رہا ہوں۔ وہ مجھ سے ہمدردی بھی ظاہر نہیں کرسکتے، ان سب چیزوں کی انہیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ سب کچھ اپنے ہی پاس کیوں رکھتے ہیں؟ کیا روپیہ ہی سب کچھ ہے؟ وہ مجھے پانے کے لئے کچھ کیوں نہیں دیتے۔؟ وہ میرے لئے آرام کو بھی مہنگا کیوں بنا دیتے ہیں۔ وہ مجھے ہک پر لٹکائے رکھنا چاہتے ہیں۔۔۔

مجھے کم از کم اپنے لئے ایمان دار ہونے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ جب شروع میں ہی لوگ ٹرین سے اترے تھے۔ اور ان میں وہ نہیں تھی۔ تبھی مجھے امید چھوڑ دینی چاہئے تھی۔ خوش فہمی جلدی ہی ختم ہوجانی چاہئے تھی۔ پر یہ کام دیر سے ہوا ہے۔ آدمی کو ایمان داری سے سامنا کرنا چاہئے، ٹرین جب دکھائی پڑتی ہے تو خوشیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن کل ایسا نہیں ہوا۔ ٹرین کے ٹھیرتے ہی امید کا قلعہ مسمار ہوگیا۔ جیسے ہی ٹرین ٹھہری دروازے کھلے، لوگ اترے، لیکن وہ ان لوگوں میں نہیں تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ کیا ابھی ۳۰ سیکنڈ باقی ہیں؟ مجھ میں ایماندار ہونے کی طاقت نہیں ہے۔ صرف ایک سیکنڈ اور پھر ۲۳ گھنٹے ۵۹ سیکنڈ ناامیدی کے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں

ہے ۔ کوئی اختتام تو ہونا چاہیئے ۔ ہر ذی روح کو زندہ رہنے کے لئے امید کے لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ کم از کم دن بھر میں انہیں ایک سیکنڈ تو چاہئیے ۔ ان لوگوں کو کم سے کم یہ سیکنڈ مجھ سے نہیں چھیننا چاہیئے ۔ وہ تو میری امید کے لمحوں کو اور بھی کم کر رہے ہیں ۔۔۔۔

اب صرف میرے پاس والد صاحب کی ایک گھڑی بچ رہی ہے ۔ اس سے کچھ دن تو گذارا چل سکتا ہے ۔ کوئی نہیں بتا سکتا اس سے کتنا مل جائے گا ۔ اس سے جو کچھ ملے گا وہ جانے کے کرائے کے لئے کافی ہو سکتا ہے ۔ شاید کوئی ایسا شریف کنڈکٹر نکل آئے جو گھڑی لیکر واپسی کے کرائے کے لئے بھی روپے دے ۔ لیکن مجھے دوبار کی واپسی کے کرائے کی ضرورت ہوگی ۔ ساڑھے بارہ بج گئے ۔ اب مجھے تیار ہونا چاہیئے ۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا ۔ وہ میں نے ٹکٹ کے لئے دے دیا ۔ یہاں تک کہ میرے پاس پورے راستے کا ٹکٹ ہے ۔ "ایک گھڑی" چلّا رہا ہوں ۔ ایک سو میں یہ گھڑی ۔ ایک بہترین گھڑی جو کہیں سے بھی ٹوٹی پھوٹی نہیں ہے ۔ میرے والد صاحب کی گھڑی ، لوگ سوچتے ہیں میں مجرم ہوں ۔ اب گاڑی آنے میں چند منٹ ہی رہ گئے ہیں ۔ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں ۔ کیا میں آج کی گاڑی نہیں دیکھ پاؤنگا ۔ ایسا نہ ہو آج کی گاڑی سے آجائے ۔۔۔۔؟

پہلا آدمی جو مجھے ملتا ہے ۔ اس سے میں کہتا ہوں ۔ "مجھے اس گھڑی کے بدلے ایک سو روپے دو ، وہ زیادہ ہی دیتا ہے ۔ ٹرین آنے سے آدھ منٹ پہلے ہی میں سیڑھیوں پر ہوتا ہوں ، میں نے سگنل مین سے اپنے آپ کو دور رکھا ۔ وہ بھیڑ کے درمیان میں کھڑا تھا ۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ جاتی ہے ۔ وہ چلاتا ہے اور وہ مجھے پکڑنے کے لئے ، اپنے گروپ کے ساتھیوں کو بتاتا ہے ۔ وہ مجھے پکڑ لینے کا اشارہ کرتا ہے ۔ وہ اپنی جھونپڑی سے نکل کر میری طرف بڑھتے ہیں ۔ وہ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں ۔ میں ان پر ہنستا ہوں ، اس لیے ہنستا ہوں کہ ٹرین آگئی ہے اور جب تک وہ لوگ مجھے پکڑنے آئیں گے وہ میری باہوں میں ہوگی ۔۔۔۔!!!

بازگشت

نظیر صدّیقی
فضیل جعفری
ڈاکٹر محمّد منصور عالم
شفیق فاطمہ شعریٰ
آصف فرّخی
سیّد محمّد اشرف
انور خان
صلاح الدّین پرویز
امتیاز احمد
ارشد عبد الحمید

انور قمر
حبیب حق
حسرت سہروردی
رخسانہ عابدی
یوسف عارفی
شافع قدوائی
شاہد اختر
محمّد علوی
حُسین الحق
مسعود علی بیگ

"سوغات کا یہ تیسرا دور پہلے دو ادوار سے بھی زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ آپ کو برصغیر کے بہترین لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے۔ اتفاق و اختلاف اپنی جگہ پر مگر سارے مندرجات پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے آپ کے پاس جیمس جوائس سے متعلق اپنا مضمون بھیجا تھا یا اس کے بھیجنے کی اجازت چاہی تھی کہ آپ نے لکھا ہے: "جوائس کو گولی ماریئے اور جدید غزل وغیرہ پر لکھئے جس سے آپ کو مناسبت بھی ہے"۔

آپ کا خط پڑھتے وقت خیال آیا کہ آپ نے تازہ شمارے (۴) میں جن جدید غزل گو شاعروں کی غزلیں شائع کی ہیں انہی پر کچھ اظہار خیال کر ڈالوں، لیکن اچانک ایک اور خیال آگیا۔ وہ یہ کہ میں نے اپنی کتاب "جدید اردو غزل ۔۔۔ ایک مطالعہ" (۱۹۸۴ء) میں غالبؔ سے لے کر ۱۹۸۰ء تک تمام غزل گو شاعروں پر اظہار خیال کر ڈالا ہے لیکن میرے اشعار کا ایک چھوٹا سا مجموعہ جو "حسرتِ اظہار" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا اور جس کے نسخے برصغیر کے تمام اہلِ نظر کے پاس بھیجے گئے تھے اس پر آج تک کسی نے چار سطریں بھی نہیں لکھیں یعنی اگر لکھیں تو کتاب کی رسید کے طور پر نہ کہ تنقیدی جائزے کے طور پر، تو کیا میری شاعری اتنی ناقابلِ توجہ ہے کہ نہ اس کا کوئی ذکر کیا جائے نہ اس پر کوئی بحث کی جائے نہ اس کے کسی شعر کا کہیں کوئی حوالہ دیا جائے۔ ویسے گزشتہ ۴۵ سال کے دوران یہ سلوک میری تمام تر تخلیقات کے ساتھ روا رکھا گیا ہے جس کے ادبی اور غیر ادبی اسباب میری سمجھ میں آتے ہیں۔ جو شخص نہ دائیں بازو کا ہو نہ بائیں بازو کا۔ نہ اِن کے حامیوں میں سے ہو نہ اُن کے حواریوں میں سے۔ جو نہ کسی کو نقصان پہنچا سکے نہ فائدہ۔ جو نہ کسی بڑی کرسی پر بیٹھا ہو نہ بڑی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کے ساتھ پبلک ریلیشننگ کا قائل ہو تو ایسے لکھنے والے کا یہ حشر ہونا ہی تھا کہ اُسے ہر معاملے میں نظر انداز کیا جائے تاکہ وہ اپنی موت آپ مر جائے۔ میں نے اپنی طرف اہلِ قلم اور اہلِ نظر کے اس رویّے کے پیشِ نظر ایک شعر کہا تھا ؎

وہ میرے حق سے کم سہی جو کچھ ملا، ملا
اِس سلسلے میں سلسلہ جنباں کبھی نہ تھا

مادّی زندگی میں فلسفۂ قناعت پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی زندگی میں بھی فلسفۂ قناعت پر عمل کرتا رہا ہوں لیکن ایک سوال کبھی کبھار کی خلش ضرور بنتا رہا ہے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۸۰ء میں جب میں نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کی غزلوں کا جائزہ لکھا تھا تو میں ایک مشہور شاعر کے دو یا چار مجموعے پڑھنے کے باوجود دو چار اچھے شعر نہ نکال سکا تھا۔ اس بنا پر مجھے یہ خیال ظاہر کرنا پڑا تھا کہ غزل کے دو یا چار مجموعے شائع کرنا تو آسان ہے لیکن غزل کے دو چار شعر کہنا بہت مشکل ہے۔ اِس رائے پر متذکرہ شاعر بہت آزردہ رہے اور غالباً اب بھی آزردہ ہیں۔ چونکہ میرا شعری مجموعہ (جو مکمل، نامکمل غزلوں اور غزل کے متفرق شعروں پر مشتمل ہے) ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا تھا اس لئے مجھے اس کا

ذکر بھی اپنے تنقیدی جائزے میں مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوا۔ میں نے اپنی شاعری کے بارے میں نہ کوئی خیال ظاہر کیا نہ کوئی دعوٰی کیا۔ "نقش فریادی" ساغر کی کتاب "حسرت اظہار" جو کل ۸۰ صفحات کو محیط ہے میں نے اس میں سے پندرہ بیس شعر قارئین کے سامنے پیش کر دیئے۔ بہت سے قارئین کو میرے مضمون میں میرا اشعار کا ہونا بہت برا لگا کیونکہ یہ روایتی انکسار کے خلاف بات تھی کہ میں نے بہت سے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اپنے پندرہ بیس اشعار پیش کر دیئے تھے۔ میں نے انسانی حد تک ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میں اپنے اشعار کا انتخاب بھی اسی معیار سے کروں جس سے دوسروں کے اشعار کا انتخاب کرتا ہوں۔

تقریباً دس سال کے بعد آج جب کہ میں اپنے اشعار کا انتخاب دوبارہ کر رہا ہوں تو مجھے پوری دیانت داری کے ساتھ محسوس ہو رہا ہے کہ میرے اچھے اشعار پندرہ بیس سے کہیں زیادہ ہیں۔ مجھے یہ دعوٰی ہرگز نہیں کہ میں نے کوئی عہد آفریں شاعری کی ہے یا میں اردو شاعری کے Trend setters میں سے ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اردو شاعری کے بہت اچھے شعری سرمائے میں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ میرے اشعار زبان و بیان اور قواعد و عروض کی خامیوں سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ میرے اشعار کی مقدار کم سہی لیکن موضوعات کے اعتبار سے میری شاعری کا Range خاصا وسیع ہے۔ اس میں عشق و محبت کے تجربات، اپنے زمانے کے حالات و حوادث، انسانی تعلقات (Human relationship) کے بہت سے اہم گوشے، خدا، انسان اور کائنات کے باہمی رشتے، مذہب اور مابعد الطبیعیات کی طرف میرے رویے اور زندگی سے متعلق میری بصیرتیں سبھی کچھ موجود ہیں۔ حسن خیال سے قطع نظر حسن بیان کے اعتبار سے بھی میرے اشعار توجہ کے مستحق ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود میری شاعری کیوں نظر انداز ہوتی رہی ہے اس پر غور کرنا دوسروں کا بھی بلکہ دوسروں ہی کا فرض ہے۔ میں اپنے عہد کے سخن شناس اور صاحب نظر طبقے سے درخواست کے طور پر نہیں بلکہ ایک مطالبے کے طور پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ "آنکھ رکھتا ہے تو پہچان ہمیں"۔ اگر "سوغات" کی وساطت سے میری باتیں صحیح قارئین و ناقدین تک پہنچ جائیں تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔

نظیر صدیقی — کراچی

"آنکھ رکھتا ہے تو پہچان ہمیں"

(تخاطب اپنے عہد کے سخن شناسوں سے ہے)

ترے کرم کے فسانے بہت سنے یا رب ۔۔۔ ہماری کوئی دعا تو نے بھی سنی ہوتی

یوں تو یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ۔۔۔ لیکن مرے گناہ پہ کس کی نظر نہیں

ہر فرض ایک رسم ہے ہر رسم ایک فرض
اب فرض ہو کہ رسم، ادا کچھ تو کیجیے

تماشا ایک ہی ہے تم اُسے جس دوربیں دیکھو
وہی بھولی ہوئی منزل وہی بھٹکے ہوئے راہی

نہیں ہے وہ نہ سہی دیکھ جستجو کا کمال
خدا کسے نہ ملا اور کہاں کہاں نہ ملا

سچ ہے کہ تیرے ساتھ کسی نے وفا نہ کی
پھر بھی نظیرؔ سارا جہاں بے وفا نہیں

وہ شکوے جن سے محبت کی تھاہ ملتی ہے
سوا ہیں حرفِ محبت سے بھی وہ قیمت میں

غنیمت ہے اے دل فریبِ مسرّت
کہ ممکن ہے یہ بھی میسّر نہ آئے

رائگاں نہیں جاتی دل پہ جو گزرتی ہے
آدمی بکھرتا ہے شاعری نکھرتی ہے

رات سے شکایت کیا بس تمہیں سے کہنا ہے
تم ذرا ٹھہر جاؤ رات کب ٹھہرتی ہے

کیوں بنا درویش تو، کیوں تو نے دی دنیا تیاگ
دکھ کا باعث دل ہے پیارے ہو سکے تو دل سے بھاگ

اور تو رکھا ہی کیا ہے شاعری میں اے نظیرؔ
ہاں بس اتنا ہے کہ دل کے روگ بن جاتے ہیں راگ

صاحبِ دیدۂ و دل کون نہیں ہے لیکن
خوش دلی اور وسیع النظری مشکل ہے

گرچہ ہیں ایک ہی منزل کے مسافر سب لوگ
کس قدر ہم قدمی، ہم سفری مشکل ہے

جو لوگ موت کو ظالم قرار دیتے ہیں
خدا ملائے انہیں زندگی کے ماروں سے

دل کو جو کچھ بھی گماں ہو عقل کہتی ہے یہی
سینکڑوں سے تم ہو بہتر، تم سے بہتر سینکڑوں

دیکھیے! دیکھنے میں کیا آئے
یوں تو ہم نے سنا بہت کچھ ہے

مرنے کا صلہ کیا ہے اسے کون بتائے
جینے کی سزا ہر کس و ناکس پہ عیاں ہے

اک زندگی ہے وہ جو بسر کر رہا ہوں میں
اور ایک وہ کہ جس کے لیے مر رہا ہوں میں

دنیا کی سمت بڑھنے سے آتا ہے یہ خیال
باقی جو عمر ہے اسے تنہا گزار دیں

جس کے لئے زمانے سے جھگڑا لیا تھا مول
دن رات بات بات پہ جھگڑا اسی سے ہے

حیات بخش مسرّت کا ذکر ہی کیا ہے
ہمیں تو کوئی غمِ دل نواز بھی نہ ملا

کوئی تو ہوگا دلِ کس مپرس کا پُرساں
تمام عمر اسی انتظار میں گزری

امیدوں کے چراغ ایک ایک کرکے بجھ گئے آخر
مگر یہ کیا کہ بزمِ آرزو برہم نہیں ہوتی

زندگی جس طرح بھی گزری ہو
عہدِ رفتہ عزیز ہوتا ہے

دل اداس رہتا ہے جی نڈھال رہتا ہے
حال پوچھنے والے اب یہ حال رہتا ہے

بچھڑ کے تم سے دل کی بزم آرائی نہیں جاتی
مگر یہ کیا کہ ملتے ہو تو تنہائی نہیں جاتی

بہت ممنون ہوں سعیِ تلافی کے لئے لیکن
جو سمجھو تو مجھے تم سے شکایت اور ہی کچھ ہے

کسی کی مہربانی سے محبت مطمئن کیا ہو
محبت تو محبت سے بھی آسودہ نہیں ہوتی

یادِ ماضی تلخ ہے ، تصویرِ فردا دل شکن
اے غمِ امروز اب تو ہی بتا ہم کیا کریں

ہوا یہی کہ وہ تکمیل تک پہنچ نہ سکا
بہت لطیف تھی تمہید جس فسانے کی

انہیں خبر نہیں وہ خود بھی آزمائے گئے
جنہیں تھی فکر بہت مجھ کو آزمانے کی

کوئی کلی نہ رہی پھر بھی مسکرائے بغیر
سزا اگرچہ مقرر نہ تھی مسکرانے کی

نہ تھا ارماں مگر آنا پڑا ہے
نہیں خواہش مگر جانا پڑے گا

یہی ہے زندگی تو پھر یقیں ہے
کبھی بے موت مرجانا پڑے گا

حیات اک لفظِ بے معنیٰ ہے اس کو
کوئی مفہوم پہنانا پڑے گا

جس درجہ نیک ہونے کی ملتی رہی ہے داد
اُس درجہ نیک بننے کا ارماں کبھی نہ تھا

لکھوں وہی جو دیکھ رہا ہوں یہاں وہاں ق
یہ حوصلہ وہ ہے کہ جو ارزاں کبھی نہ تھا

دیکھوں وہی جو دیکھ رہی ہے نظر مری
ممکن سہی یہ کام پر آساں کبھی نہ تھا

ہمارا ہر مرض مہلک، سمجھ میں کچھ نہیں آتا
دوائے بے اثر کب تک، دعائے نارسا کب تک

کمالِ علم و حکمت کی جلو میں
فسادِ علم و حکمت کم نہیں ہے

وہ چاہے دوستی ہو یا محبت
کوئی رشتہ یہاں محکم نہیں ہے

تجھے اے دل گِلا ہے جن سے اتنا
اُنہیں بھی تجھ سے شکوہ کم نہیں ہے

بہت ثواب سہی پاکباز رہنے کے
جہاں میں رہ کے کوئی پاکباز کیونکر ہو

ابھی سے وہ دامن چھڑانے لگے ہو ؟
جو اب تک مرے ہاتھ آیا نہیں ہے

یہ احساس کیوں ہے کہ کھونے لگا ہوں
ابھی تو تمہیں میں نے پایا نہیں ہے

نظیرؔ اتنے شکوے ہیں دنیا سے تم کو
ابھی تم نے دنیا کو سمجھا نہیں ہے

ہائے وہ باتیں کہ جن کے رازداں باقی نہیں
آہ وہ قدریں کہ جن کے قدرداں مارے گئے

معلوم ہے جو کچھ مجھے فردا سے ملے گا فردا مرے ماضی کے گناہوں کی سزا ہے
باقی ہے فقط قاتل و مقتول کا رشتہ جس سمت ، جہاں دیکھیے مقتل کی فضا ہے

اہل کمال کو نظیرؔ اہل جہاں نے کیا دیا اہل جہاں کو کیا نہیں اہل کمال دے گئے

کس قوت سے درد کا اظہار ہے دنیا ہر دل کو گِلا ہے کہ دل آزار ہے دنیا

جو لوگ سادہ دل تھے پُرکار ہوگئے ہیں اب آدمی کے رشتے دشوار ہوگئے ہیں

کبھی ہم سے محبت تھی مگر اب بے شناسائی نہ جانے وہ خطا کیا تھی کہ جس کی یہ سزا پائی
تمنا کیوں کہوں اُس کو مجھے تو تیرا سودا تھا مگر باقی رہا اب میں تمنائی نہ سودائی
جو میں شاکی ہوں دنیا سے تو دنیا مجھ سے شاکی ہے نہ میں دنیا کو راس آیا نہ دنیا مجھ کو راس آئی

عقل منکر ہو خدا سے تو دعا کس سے کریں زندگی! تیری جفاؤں کا گِلا کس سے کریں
جب سے ٹوٹا ہے تعلق یہی الجھن ہے ہمیں اب جفا کس کی سہیں اور وفا کس سے کریں

نئی دنیا کو آنکھوں میں نمی اچھی نہیں لگتی مجھے احساس کی اتنی کمی اچھی نہیں لگتی
نہیں دعویٰ کہ مجھ کو آرزوئے مرگ رہتی ہے بس اتنا جانتا ہوں زندگی اچھی نہیں لگتی

ہوس کی آگ بجھی دل کی تشنگی ہے وہی سکونِ جاں سے تہی میری زندگی ہے وہی
کوئی قصور تو ثابت نہ ہو سکا لیکن جو بدگماں تھے اُنہیں مجھ سے برہمی ہے وہی

دلِ خوددار پر گراں گزرا بہتے دریا میں ہاتھ دھونا بھی

"حسرتِ اظہار" کے بعد کے اشعار

کبھی ممکن نہ ہو جس سے سلام اور پیام دل اُسی شخص سے رہتا ہے سدا محوِ کلام
مجھ کو آغاز کی خوبی سے خوشی کیونکر ہو اپنے آغاز کا پابند نہیں ہے انجام

اک ایسی بات آکر بس گئی دل میں کہ اب جس کا نہ ہونا بھی قیامت اور ہونا بھی نہیں ممکن
بہ شکلِ زندگی وہ بوجھ سر پر آ پڑا میرے جسے ڈھونا ہے لازم اور ڈھونا بھی نہیں ممکن

بن جائیے کسی کی ضرورت تو خیر ہے ورنہ پھر آپ اپنی ضرورت خریدیے

بے سود ہے یہ کام بھی لیکن مفر کہاں
عبرت سرائے دہر میں عبرت خرید یئے

آتی نہیں ہے راس اگر دل کو بے حسی
پھر دل کو خون کیجئے حسرت خریدیئے

گزری ہے جس میں عمر وہ دنیا ہی اور ہے
دیکھا تھا جس کا خواب وہ دنیا ہی اور تھی

چاہت نے حُسن کو بھی حسین تر بنا دیا
چاہا جسے وہ صورتِ زیبا ہی اور تھی

مرتے رہے ہیں جن کی تمنّا میں ہم نظیرؔ
کیا کیجئے کہ اُن کی تمنّا ہی اور تھی

محبّت کے کئی معنیٰ ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے
مجھے تیرے، تجھے میرے بدن کی بھی ضرورت ہے

عمر باقی رہ گئی ہے زندگی باقی نہیں
کاروبارِ زندگی میں دلکشی باقی نہیں

میرا احوال پوچھنے والے
اب یہاں کہنے کو رہا کیا ہے

"سوغات کا تازہ شمارہ مجموعی اعتبار سے بہت پسند آیا۔ مجھے آپ کے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ ہم لوگ اب "وقتی غم اور غصّے کے سیدھے سادے مؤثر اظہار" پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔ میری سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آتی کہ شہر جل رہا ہے، فسادات ہو رہے ہیں، یا زلزلے میں ہزاروں جانیں چلی گئیں اور شعراء حضرات گھر میں بیٹھے اطمینان کے ساتھ فسادات اور زلزلے وغیرہ پر نظموں، غزلوں کے انبار لگاتے جارہے ہیں مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارا ادبی کلچر ہی زوال آمادہ ہوگیا ہے۔ شعرائے کرام کے ذہنی پھکڑپن کا یہ عالم ہے کہ انہیں ہر چھوٹا بڑا سانحہ، واقعۂ کربلا معلوم ہوتا ہے، ہر مرنے والا حُسین بن جاتا ہے اور ہر ظالم یزید نظر آتا ہے۔

افسانوں کے سلسلے میں آپ نے اداریے میں لکھا ہے کہ "سوغات میں افسانے اس لئے نہیں آرہے ہیں کہ ایسے افسانے جو "سوغات" شائع کرسکے وصول نہیں ہورہے ہیں"۔ ذاتی طور پر مجھے اس صورت حال کا قطعاً افسوس نہیں ہے تخلیقی تنقید لکھنے والوں کو خدا اچھا رکھے اور اُن کی عمریں دراز کرے، ان اربابِ علم نے تنقید کو فکشن سے اس درجہ قریب کردیا ہے کہ اب افسانوں کی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ایک طویل اور قدرے بحث طلب مسئلہ ہے۔ اگر ملاقات ہوئی تو مفصل گفتگو ہوگی۔ انشاء اللہ۔

شعری حصّے میں حمید نسیم اور احمد جاوید کی غزلوں کا انتخاب بطورِ خاص پسند آیا۔ اگر ان دونوں کی شاعری کے بارے میں ایک ایک مفصّل مضمون بھی شائع ہوجاتا تو بڑی اچھی بات ہوتی۔ خیر جو بھی ہے وہ غنیمت ہے ہندوستانی شعراء (یعنی اکثریت) ان دونوں کے کلام سے ناواقف ہیں۔ احمد جاوید کی غزلیں میں نے بھی پہلے پہل

"روایت" میں پڑھی تھیں۔ ان کا پتہ بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔ میں احمد جاوید سے متعلق ایک مضمون لکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ یوں سمجھئے کہ ہزاروں خواہشوں میں سے یہ بھی ایک خواہش ہے۔

میں نے رفیق حسین مرحوم کے وہ سبھی افسانے (۶ عدد) پڑھ ڈالے جو سوغات میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں لکھے گئے سوانحی اور تنقیدی مضامین کا بھی بساط بھر مطالعہ کیا۔ سوانحی مضامین کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ جہاں تک تنقیدی مضامین کا تعلق ہے اُن میں کچھ زیادہ ہی جوش وخروش اور غیظ وغضب کا اظہار ہوا ہے۔ نقادانِ کرام نے رفیق حسین کے تعلق سے اردو تنقید کی جس بے توجہی کی شکایت کی ہے وہ بڑی حد تک غلط اور نری جذباتیت پر مبنی ہے۔ رفیق حسین کا افسانوی انداز (اسلوب نہیں) دلچسپ اور شگفتہ ہے۔ آزادی سے پہلے والے متوسط اور کہیں کہیں اعلیٰ متوسط گھرانوں کی روزمرّہ زندگی کی تصویر کشی بھی بڑے دلکش پیرائے میں کی گئی ہے، لیکن ان افسانوں میں انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اترنے اور ان سے متعلق پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کا فقدان ہے۔

رفیق حسین صاحب کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ اس وقت ترقی پسند تحریک اپنی عمر کے دس سال پورے کر چکی تھی۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور کئی دوسرے بے حد اہم فکشن رائٹرز سامنے آچکے تھے۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد بھی ان لوگوں نے جو کچھ لکھا اس نے نہ صرف اردو افسانے کو کہیں سے کہیں پہنچادیا بلکہ رفیق حسین کی افسانہ نگاری کو IRRELEVANT بنا کر رکھ دیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ رفیق حسین کی موت سے آٹھ، نو برس پہلے ہی منشی پریم چند اردو فکشن کو نہ صرف ایک زبردست انقلاب سے دوچار کر چکے تھے بلکہ اس جہانِ فانی کو الوداع بھی کہہ چکے تھے۔

بھولے بسرے فن کاروں کو ہم عصر قارئین سے متعارف کرانا ضروری ہے۔ گم شدہ جواہر پاروں کی دریافت بھی ضروری ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے مجموعی سیاق وسباق اور تناظر کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ رفیق حسین کے بارے میں سوغات میں جن لوگوں نے بھی لکھا ہے ان کے ہمدردانہ رویّے کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ مجھے تو اس بات کی بھی خوشی ہے کہ اِن تحریروں کے طفیل، بیسویں صدی کی اس آخری دہائی میں، نثر میں ہی سہی لیکن قصیدہ نگاری کی صنف بھی دوبارہ زندہ ہوگئی ــ چہرہ، سراپا، گریز اور تشبیب، غرضیکہ وہ کون سا پہلو ہے جو ان مضامین میں جلوہ گر نہیں ہے!۔

شاید یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے رفیق حسین کے جانور بھی زیادہ متاثر نہیں کرسکے۔ "کلوا" میں اسی نام کے کتّے کا کردار اور "کفارہ" میں شیر صاحب اور بیگم شیر کے کردار خاصے CONCOCTED معلوم ہوتے ہیں۔ اس تنقید کے باوجود اگر یہ گوشہ اچھا لگا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ رفیق حسین مرحوم نے جو بھی لکھا ہے وہ ہمارا ادبی ورثہ ہے۔ ورثہ کے

حصول اور بازیابی کے لئے تو ہمارے یہاں جانیں تک چلی جاتی ہیں۔" فضیل جعفری

"سوغات کا پانچواں شمارہ میں نے پڑھا۔ بیشتر تخلیقات اور مضامین پسند آئے۔ خالد علوی کی حمد بہت دلکش اور فکر خیز ہے۔ جو لوگ خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، اُن کو سوچنا چاہئے کہ بہت سے کام ان کی مرضی کے خلاف کیوں ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایک قول یاد آتا ہے جو حضرت علیؓ سے منسوب ہے۔ "میں نے شکستِ عزائم سے خدا کو پہچانا۔" یہ حمد اسی خیال کا موثر شعری اظہار ہے۔

محمد صلاح الدین پرویز نے حضرت زینبؓ کی اچھی پینٹنگس پیش کی ہیں۔ اور یہ تاثر بھی پیدا کیا ہے کہ شاعری مصوری سے افضل ہے۔ مگر "کولاژ" میں بات تجسیم سے آگے نہ بڑھی۔ ہم صبح، دھوپ، شام، رات کو الگ الگ نظمیں کیوں نہ سمجھیں؟ "شام" میں لفظ شام کئی معنوں میں استعمال ہو گیا ہے، جو کرشن کی سانولی صورت کی طرح محبوب و دل نواز ہے۔ مگر دوسری نظم "کیا شام ہوئی" ذہن کو دیر تک لطف اندوز ہونے نہیں دیتی۔ موجودہ فساد زدہ فضا میں حیرانی سے کسی معصوم بچے کا شام کا قیاس کرنا شام کی آفتوں کا اشاریہ تو ہے مگر نظم میں کچھ تشریت بھی ہے اور "کچھ زلف و آنکھ" کی ترکیب کھٹکتی ہے۔

صلاح الدین محمود کی نظم "پر آنے والی بارش کا ماضی" میں ابہام کچھ زیادہ ہے جو مجھ پر ابھی منکشف نہیں ہوا۔ وہ ابہام اشفاق حسین کی نظم "وہ آنکھیں پوچھتی ہیں" میں نہیں ہے۔ عنایت کی نظروں کا یہ پوچھنا کہ "میرے سایے میں تمہیں آرام آخر کیوں نہیں ہے"، بالکل فطری ہے۔ اور سارے سکھ کے باوجود شاعر کا زندگی کے نامہربان مقتول موسم کو یاد کرنا بھی عصرِ جدید میں بالکل فطری ہے۔

خالد سہیل کی نظمیں دلفریب ہیں۔ بیکاری اور تنہائی میں وہی ہوتا ہے جس کا نقش شاعر نے "مونیکو بے جمیکا کی باتیں" اور "خود فریبی" میں مرتب کیا ہے۔ پیکر تراشی پر اُن کی خاص توجہ ہے اور خوبی یہ ہے کہ مختلف قسم کے پیکر یہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ بیکاری اور مجبوری میں انسان اسی طرح کے بے ربط پیکر اپنے ذہن میں بناتا رہتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اقبال کرشن کی نظم "اسفارُ البحور" نامکمل ہے۔ کیونکہ ابھی کئی بحری سفر باقی ہیں۔ ان کی بحریہ شاعری عروض کے طالب علموں کو بلکہ استادوں کو بھی ہر طرح کی مثالیں فراہم کردے گی اور یہ گلہ ختم ہو جائے گا کہ بعض بحروں میں شعر نہیں ملتے یہ نظم غالباً ایسی ہی کسی عروضی کتاب کا حصہ ہے۔ ورنہ بحروں کا ڈھنڈورا پیٹنا چہ معنی دارد! عنوان ہوتے تو کیا بُرا تھا؟ موضوعات کے لحاظ سے ان نظموں کو عنوان دینا چاہیں تو وہ یہ ہوں گے:

سفر در بحر کامل ——— انا سوختہ

سفر در بحر متدارک ——— سعی

سفر در بحر ہزج مقبوض ـــــ لذیذ بود حکایت

سفر در بحر رمل ـــــ معصومیت

سفر در بحر متقارب مقبوض اثلم ـــــ کرتوت

نظمیں اچھی ہیں ۔ تاثر پیدا کرتی ہیں ـــ اجنبی بجرہ ڈوبتی ناؤ ۔ ناخدا اور آبلہ پا ۔ آبلہ یہاں عجیب لطف دے رہا ہے ۔ مگر کرشنا جی نے کچھ گڑبڑ بھی کی ہے ـــ "نہ کبھی کسی کو خدا کہا نہ کبھی کسی کی ثنا پڑھی" ـــ تو "اے خدا ، سب کے خدا" دوسری جگہ کیسے کہا ۔ اور یہ کیسا سوال ہے کہ کیا تو اپنا بھی ہے خدا ؟ اسے معصومیت کہیں ؟ کہ یہ بنی اسرائیل کا نیا سوال ہے ؟

غزلوں میں معنویت بھی ہے اور حسن ادا بھی ۔ جو شعر مجھے پسند آئے اُن میں سے چند آپ بھی سنئے ۔ یہ احمد جاوید کے ہیں

جو ہے آباد تری آئینہ سامانی سے ہم اُسی خانۂ حیرت میں بسر کرتے ہیں

وہ بادشاہِ فراق و وصال ہے اس نے جو بار سب سے گراں تھا غلام پر رکھا

ہوئی ہے ختم در و بام کی کم اسبابی میسر آج وہ سامانِ انہدام ہوا

"نشتر" کے متعلق مضامین معلوماتی ہیں ۔ جناب یوسف سرمست اور عظیم الشان صدیقی صاحب نے تحقیق و تجزیہ کا حق ادا کیا ہے ۔ مضامین تحقیقی ہیں ۔

رفیق حسین کی مختصر خود نوشت میں بعض باتیں متضاد ہیں ۔ نیر مسعود صاحب نے اپنے مضمون میں ان کی تطبیق کی کوشش کی ہے ۔ وہ بڑے سلیقے سے صاف ستھرے انداز میں ٹو دی پوائنٹ لکھتے ہیں ۔ اس لئے ان کے مقالوں میں وقار ، اختصار ، جامعیت ، علمیت اور ادبی کشش ہوتی ہے ۔ وہ موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات کو فراہم کرتے ہیں اور ترکِ لایعنی میں یقین رکھتے ہیں ۔

آپ نے اپنے اداریے میں "سوغات" میں افسانہ شائع نہ ہونے کی لوگوں کی شکایت درج کی ہے لیکن اس شمارے میں تو آپ نے سید رفیق حسین کے چھ افسانے شائع کر کے شکایت کو صفر کر دیا ہے ۔ اردو افسانوں کی فضائے عمومی میں یہ افسانے نئے ستیارے ہیں ۔ ان پر الگ سے کچھ لکھنے کی ضرورت ہے ۔

آپ کی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ آپ کو معیاری افسانے نہیں ملتے ۔ نہیں ملتے تو اس کے ذمہ دار آپ بھی ہوں گے ۔ میں نے ابھی حال میں ممتاز مفتی ، اقبال مجید ، منیر الدین احمد ، اوپیندر ناتھ اشک وغیرہ کو پڑھا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ پہلے طاؤس ناچے کہ پہلے جنگل ہرا ہو ۔ سب ہوگا ۔ مگر 'پہلے آپ ۔ نہیں پہلے آپ' کی کشمکش سے نکل کر پہلے آپ حاصل کرنے کی کوشش تو کیجئے ۔ معیاری افسانے کی تلاش ناممکن کی جستجو نہیں ہے ۔

آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ عموماً اچھے افسانے نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ اور نئے لکھنے والوں کی نفسیات تحسین اندازی پر آپ کی گرفت بھی درست ہے اور یہ تنبیہ بھی بجا ہے کہ محض توصیف سے کچھ نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہمارے پاس قیمتی مال ہے تو وہ اپنی توصیف کرا ہی لے گا۔ اگر کوئی ناشناس ہو یا بخل سے کام لے تو اس سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ خوبی فضا میں گونجتی ہے اور گراں گوشوں کو بھی متوجہ کرتی ہے۔ اس لئے اصل شے اپنا اثاثہ ہے۔ آج کے لکھنے والے عجلت میں رہتے ہیں۔ ان کو صبر کا یارا نہیں۔ ایک تحریر شائع ہوئی اور مبصر / نقاد سے داد طلب ہو بیٹھے! ۔ مگر ضمیر الدین احمد مرحوم کو دیکھئے۔ ان کی ادبی زندگی کے پچاس سال میں پچاس سے بھی کم افسانے ہیں۔ وہ بھی "بہت سوں کی نگاہ سے اوجھل رہے"۔ اور وہ داد طلب کبھی نہ ہوئے۔ بے التفاتی کا شکوہ کبھی نہ کیا۔ لکھتے رہے۔ اور ان کے فن نے نقادوں کی توجہ کو کھینچ لیا۔ آج ان کے فن کی قدر و قیمت مسلّم ہے۔ وارث علوی نے ضمیر شناسی کی اچھی کوشش کی ہے۔ ادب کی دنیا میں شہرت کا دور رس لازماً ادیب کی حیاتِ ارضی سے ہی منسلک نہیں ہے۔

اس شمارے کا سب سے بڑا عیب آصف فرخی کا مضمون ہے اور مضمون کا سب سے بڑا عیب آصف فرخی کا بے لگام "لکھاڑ پاپن" ہے۔ وہ کیا لکھتے ہیں؟ ۔ آئینے کو بھی حیرت ہوتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میں عرض کروں کہ آوارہ خوانی اور آوارہ نگاری دونوں معیوب ہیں۔ فرخی صاحب کی نوشت و خواند میں کوئی ضابطہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تنقید کے اصول اور تحریر کے آداب سے مطلق بے پروا رہتے ہیں۔ یہ چیز انھیں تکبّر کی سرحد میں لے جاتی ہے۔ اور بار بار تنقیص پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں لیکن تنقیدی مضمون لکھتے وقت بھی افسانوی حصار سے نہیں نکلتے۔ کسی موضوع پر کوئی مقالہ کیسے لکھا جاتا ہے، علمیت سے بھرپور سنجیدہ، مختصر اور جامع اور براہِ راست موضوع سے متعلق گفتگو کیسے کی جاتی ہے۔ غیر ضروری الفاظ و اشارات سے کیسے بچا جاتا ہے اور اپنی بصیرت (دوسروں کی نہیں) کو نمایاں کرنے میں نمائش سے کس طرح پرہیز کیا جاتا ہے۔ اِن باتوں سے وہ ضرور واقف ہوں گے۔ مگر کسی پڑاؤ اور ٹھہراؤ کے بغیر مسلسل خامہ فرسائی کرتے جانا اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے اپنے خیالوں کو حصّوں میں نہ بانٹنا کیا ظاہر کرتا ہے؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بظاہر ان کا مدّعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس نے شیطان کی آنت کا صرف نام سُن رکھا ہو، وہ اُن کے مضمون "ناول کی داستان" کو دیکھ لے۔

بہت سی باتیں جاننا ایک بات ہے۔ غور و فکر کرنا اور نئی ممکنہ بات کا پتہ لگانا دوسری بات ہے اور اپنی یافت کو اختصار و تنظیم سے موزوں پیرایے میں پیش کرنا تیسری بات ہے۔ آصف صاحب صرف پہلی بات سے سروکار رکھتے ہیں اور ایک چوتھی بات کو، وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ جارحانہ انداز اختیار کیا جائے، اہمیت دیتے ہیں۔ میرے نزدیک، ایک

ادیب کے لئے بہت سی باتیں جاننا اتنی بڑی خوبی نہیں ہے، جتنی بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی دانش کو ایک نظام بخشا جائے۔ اس میں جوہر پینتش پیدا کیا جائے۔ فقط بہت زیادہ جاننے اور سب کو قلم سے انڈیلنے سے تحریر میں انتشارِ خیال پیدا ہوجاتا ہے اور متواتر جارحانہ انداز سنجیدہ قارئین کے صبر و تحمل کو وحشی کی طرح چھیڑتا ہے۔ مجھے یہ دونوں صفتیں آصف فرخی میں نظر آتی ہیں۔ "اردو ناول کی داستان" اور "زبان بے زبانی" ان کی بیّن مثالیں ہیں۔ کوئی سخت گیر سپاہی بھی اپنے قیدیوں کو یوں نہیں گھسیٹتا جیسے آصف صاحب نے اپنے قاریوں کو گھسیٹا ہے۔ ان کے ساتھ چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور کاہے کو کوئی ان کے ساتھ چلے گا؟ حاصل؟

میں سوغات پڑھ رہا تھا تو بازار میں ذہنِ جدید بھی آگیا۔ اس میں بھی آصف فرخی نظر آئے۔ اور حسبِ معمول اپنا منصب نبھاتے ہوئے۔ میں نے ذہنِ جدید کو بھی سوغات کے حوالے سے اپنا تاثر لکھ بھیجا ہے۔ "زبان بے زبانی" میں وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے نقاد زیادہ بولنے لگے ہیں" (اور حد تو یہ ہے کہ انتظار حسین جیسے فنکار کا ایک اقتباس نقل کرکے لکھتے ہیں کہ "یہاں تو انتظار صاحب بھی بول پڑے ہیں"۔ صـ۳۳۷) اور صـ۳۳۹ پر انھوں نے لکھا ہے کہ "ان نقادوں میں مہم جو زیادہ ہیں، طلسم کشا کم، بہت کم"۔ یہ باتیں خود ان پر بھی صادق آتی ہیں۔ اور طلسم کشائی کی بھی انھوں نے خوب کہی! ان کی زبان تنقیدی نہیں، داستانی ہے۔ وہ چھوٹے مضامین بھی لکھیں گے تو داستانی لفاظی ضرور رہے گی۔ اگر وہ نہ سنبھلے تو اپنی لیاقت کو لفاظی میں گم کردیں گے۔ وہ ایک پاؤ دودھ میں اتنا پانی ملا دیتے ہیں کہ بس پانی دودھ میں دھلا ہوا دکھائی دے! آپ اس کو متھتے رہئے۔ ملائی ہرگز نہ نکلے گی!

آپ سوغات کے صفحات کم بھاری کھئے۔ نرخ، بالا نہ کیجئے۔ داستانیہ مضامین کو ایڈٹ کیجئے یا مصنفوں سے امورِ متعلقہ بموضوع کو دوبارہ لکھوائیے۔ عنوان کا تقاضا طوالت ہو تو کئی حصوں میں بٹوائیے۔ للّٰہ قاریوں پر کرم کیجئے۔

تبصرے سب وقیع ہیں اور کتابوں کا سیر حاصل تعارف کراتے ہیں۔ بعض تبصروں میں کالے کالے دھبّوں کے باوجود تفصیلی تجزیہ کام کا ہے اور بعض تبصرے بصیرت کا چراغ جلاتے ہیں۔"

ڈاکٹر محمد منصور عالم۔ گیا (بہار)

"نیا سوغات ملا۔ احمد جاوید کی غزلیں واقعی ایک تحفہ ہیں، سوغات کے قارئین کے لئے۔ جس پایہ کی غزلیں ہیں اسی پایہ کا تبصرہ بھی اداریے کی زینت ہے۔

اس شاعر کا خط بھی معرکے کی چیز ہے۔ اتنا خوبصورت انکسار! وہ بھی روزِ روشن میں۔!

حاصلِ سوغات وارث علوی کا مضمون ہے۔ اس پر تخلیقی کاوش کے فن پارے کا گمان گزرتا ہے۔ حالانکہ کہیں بھی تنقیدی لب ولہجہ سے انحراف نہیں کیا گیا ہے۔

ضمیرالدین احمد پر لکھنے کے لئے ایسے ہی قدوقامت کے نقاد کی ضرورت تھی۔

بیس قیامت شوقیامت راہی

میراجی اور رفیق حسین کے گوشوں نے کتاب ۵ کو ایک یادگار دستاویز بنا دیا ہے۔ یہ ایک ضخیم شمارے میں زمانے کو سمیٹنے کا عمل ہے۔ اور اگر آپ برا نہ مانیں تو اس کو "جناتی عمل" بھی کہہ سکتے ہیں۔

میراجی کی نایاب نمائندہ نظموں کے بغیر اُن کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ اور اُن کی تصویر کا ایک رُخ "مشرق و مغرب کے نغمے" سے بھی عبارت ہے۔ اس کتاب کے انقلاب آفریں مضامین کی بازگشت بہت کم سنائی دیتی ہے۔

شمس الحق عثمانی نے "آئینۂ حیرت" کا فنکارانہ جاں فشانی سے جائزہ لیا ہے۔ آصف فرخی کا مضمون بھی رفیق حسین کو شایانِ شان خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ اُن کا دوسرا مضمون فرصت سے پڑھنا ہوگا۔ ویسے ناول کے آغاز وارتقا پر لکھنا ریسرچ اسکالرس کی "زمینوں" پر قبضہ گیری تو نہیں ــ؟

میری نظم کے آخری صفحے سے پہلے کے دو صفحات کی ترتیب بدل گئی ہے۔ شاید اس وجہ سے جو بات کہی گئی ہے وہ پوری طرح واضح نہ ہو سکی ہو۔

ابتدا میں اپنی ایک نظم میں نے والد صاحب کو دکھائی تھی۔ پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا۔ "نظم تو بہت اچھی ہے لیکن سمجھے گا کون؟" اور ایسا لگا کہ انھوں نے بڑی طمانیت محسوس کی اس بات سے کہ "سمجھے گا کون"۔ دراصل وہ چاہتے بھی یہی تھے۔ تو جب بھی میں سنتی ہوں کہ نظم سمجھ میں نہیں آئی تو مجھے اپنے ابا کی یہ بات یاد آتی ہے۔"

شفیق فاطمہ شعریٰ۔ حیدرآباد

"سوغات کے تازہ شمارے کی خبر حیدرآباد پہنچتے ہی مل گئی تھی۔ پھر اتنا صبر کہاں ہوتا کہ کراچی واپس جاؤں اور اپنی کاپی کے ڈاک سے پہنچنے کا انتظار کروں۔ مغنی تبسم صاحب نے مہربانی کی اور اپنی کاپی مجھے عنایت کر دی۔ میں نے حیدرآباد سے دلی واپس جاتے ہوئے جہاز میں ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ کئی چیزیں پہلی نظر میں توجہ طلب معلوم ہوئیں، لیکن اطمینان سے پڑھنے کا موقع کراچی واپس آکر ہی ملا ہے۔ ایسے بھرپور رسالے سے آخر سرسری تو نہیں گزرا جا سکتا۔

رسالے کے پہلے ہی مضمون کا عنوان دیکھ کر جی خوش ہوا۔ ضمیرالدین احمد کے افسانوں پر وارث علوی کی تحریر دیکھ کر خیال ہوا کہ یہ تو دو آتشہ ہو گیا میرے لئے۔ میرے انتہائی پسندیدہ افسانہ نگار پر میرے محترم اور پسندیدہ ناقد کا مضمون سب سے پہلے وہی پڑھا اور بہت مایوسی ہوئی۔ مضمون کسی اعتبار سے بُرا نہیں ہے مگر وارث علوی کا نام آتے ہی جو توقع بندھتی ہے، وہ پوری نہیں ہوئی۔ یعنی ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا والی کیفیت پیدا ہونی چاہئے تھی۔ مگر اس کے بجائے، خود وارث علوی کے الفاظ میں، تحریر معمولی ہے جس میں ریڑھ کی ہڈی نہیں۔ دراصل میں اس قسم کے تعمیم زدہ بیانات

سے سخت الرجک ہوچکا ہوں کہ "افسانہ ایک دلفریب نغمہ ہے" (صفحہ ۱) یا "افسانے کا تاثر کیف وانبساط اور حُسن وشباب کا ہے" (صفحہ ۲) ایسے فقرے تو کرشن چندر پر ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے مضامین میں مل جاتے ہیں۔ اور ایسے ہی مضامین میں سجتے بھی ہیں۔ وارث علوی صاحب نے بیدی اور منٹو کے سلسلے میں جس گہرائی، نکتہ آفرینی اور ذہنی عوامی کا مظاہرہ کیا ہے، اِس مضمون میں یہ سارے اوصاف نہ جانے کہاں گم ہو کر رہ گئے۔ "پاتال" جیسے افسانے کا ذکر انہوں نے محض ایک پیراگراف میں کیا ہے۔ کئی ایک اہم افسانوں کا ذکر ہی رہ گیا ہے۔ پھر مضمون کا conclusion بھی مجھے بہت بے ڈھب معلوم ہوا۔ وارث علوی نے منٹو کا نام لے کر stock in trade تو ظاہر کر دیا ہے، مگر اس سے وہ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ تو بڑی سطحی سی بات ہے کہ چونکہ ضمیر چچا نے بھی جنس پر اور عورتوں پر افسانے لکھے تھے اس لئے ان کا نام آتے ہی منٹو کا ذکر چھیڑ دیا جائے۔ وارث علوی صاحب خود کہتے ہیں کہ وہ منٹو سے مختلف افسانہ نگار ہیں اور یہ کہ اُن کا کوئی افسانہ منٹو کے براہِ راست اثر کی غمازی نہیں کرتا۔ (صفحہ ۶۳) پھر وہ منٹو اور عصمت کے قبیلے کے افسانہ نگار کیسے ہو گئے؟ بات یہ نہیں کہ وہ اس قبیلے کے افسانہ نگار ہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ وارث علوی اس قبیلے کے نقاد ہیں۔ وارث علوی صاحب منٹو، بیدی اور عصمت کے رسیا ہیں اور ان کو اردو افسانوی روایت کا مرکز سمجھتے ہیں۔ اس میں ظاہر ہے کہ کوئی بات غلط نہیں ہے۔ مجھے اعتراض اس وقت ہوتا ہے جب وارث علوی تمام و کمال افسانے کو اپنے اس معیار کے حوالے سے دیکھتے ہیں اور جس کو اس کے مطابق نہیں پاتے اس کا حق ادا نہیں کر پاتے۔ ضمیر الدین احمد کے افسانوں کا منٹو کے حوالے سے جائزہ سود مند ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے افسانوں کی انفرادیت پھر کن عناصر میں مُرتکز ہے اور اُس تک ہماری رسائی کیسے ہو؟ اس سوال کی بابت نیّر مسعود کے مختصر مضمون میں چند اشارے تو ہمیں ملتے ہیں مگر وارث علوی سے کچھ ایسی مدد نہیں ملتی۔ شاید ضمیر چچا مرحوم بھی اپنے ان نقادوں کے سامنے تشنہ فریاد ہیں۔

"ٹیڑھی لکیر" پر شمیم حنفی صاحب کا مضمون اچھا لگا۔ اس میں عصمت کے بارے میں کئی ایک باتیں ایسی کہی گئی ہیں جو مجھے perceptive معلوم ہوئی ہیں۔ مجھے اس مضمون کے صرف ایک نکتے سے اختلاف ہے، اور وہ ہے "معصومہ" کے بارے میں، اس ناول کو شمیم صاحب نے "سودائی"، "ضدّی" اور "جنگلی کبوتر" کے ساتھ ہی شامل کیا ہے۔ مجھے یہ ناول پسند ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں جابجا جھول ہیں، جبکہ یہ ناول کسا کسایا ہے۔ اس میں عصمت کو اپنے اندازِ بیان پر پورا اعتماد ہے اور وہ بہت چابک دستی کے ساتھ، بڑے شوخ رنگ لگا کر ایک مکمّل تصویر بنا دیتی ہیں۔ ٹیڑھی لکیر میں لوگوں کو شاید اس لئے زیادہ اپیل محسوس ہوتی ہے کہ اس کا کینوس وسیع ہے۔ میراجی پر رشید امجد کا مضمون دلچسپ ہے اِس لئے کہ اس میں مصنّف نے محنت کر کے میراجی پر لکھی جانے والی تنقید کا جائزہ مرتّب کر دیا ہے۔

اس شمارے کی جان تو رفیق حسین کا خصوصی مطالعہ ہے۔ اس کی وجہ سے ہی میں اس شمارے کا اتنی بے چینی سے

انتظار کر رہا تھا۔ اس میں کمال تو شمس الحق صاحب نے کیا ہے۔ میں ان کا مضمون پڑھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ ہمارے ہاں ان دنوں بعض لوگ تنقید میں متن کی اہمیت، ساختیات اور ردِ تعبیر کا نعرہ بلند کر رہے ہیں، لیکن جدید تنقید میں ایسے اور کتنے مقالے ہیں جو متن کو اس گہری شناسائی اور محبت کے پیدا کردہ احترام کے ساتھ چھیڑ سکتے ہوں۔ افسانے کی پرتیں آہستہ روی کے ساتھ مگر بڑے واضح انداز میں کھلتی جاتی ہیں۔ اس مضمون کے اور نیر مسعود صاحب کے مضمون کے بعد اپنی تحریر پر شرم سی آئی۔ یہ مضمون outdated تو ہو ہی گیا تھا، اتنے عمدہ مقالوں کے بعد غیر ضروری بھی ہو گیا اس لئے کہ میں نے رفیق حسین کے بارے میں نو مسلموں کے سے جوش کے ساتھ بات کی ہے، اس کی ضرورت ان مقالوں کے بعد نہیں رہی۔ نیر صاحب نے افسانے کے پارکھ کی نظر سے ہی نہیں بلکہ محقق کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ اس کی ضرورت کا احساس حیدر آباد میں ہوا۔ غیر مدوّن افسانے "حضرت وہ تو نکل گئے" کا عکس جب میں نے آپ کو بھیجا تھا تو اس کے مآخذ کے طور پر بشیر ہندی کے مرتب کردہ مجموعے کا حوالہ دیا تھا، کیونکہ یہ افسانہ میں نے وہیں دیکھا تھا۔ حیدر آباد کے سفر کے دوران مغنی تبسم صاحب نے ایوانِ اردو بلایا اور اس ادارے کی لائبریری دکھاتے ہوئے کہنے لگے کہ یہاں "ساقی" کے دہلی والے دور کا پورا فائل موجود ہے۔ میں نے یوں ہی ایک جلد اٹھائی اور ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ فہرست میں اس افسانے کے عنوان پر نظر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ افسانہ تو "ساقی" میں چھپا ہوا ہے۔ بشیر ہندی نے وہیں سے نقل کیا ہوگا، یا رفیق حسین نے خود ہی تازہ افسانے کے طور پر بھیجا ہوگا۔ ساقی کے اسی فائل میں چائے پر ایک انشائیہ بھی نظر آیا جو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یعنی اب بھی اور چیزوں کے سامنے آنے کا امکان باقی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حیدر آباد کے کوئی ادب دوست ساقی کی ان جلدوں کو کھنگال کر رفیق حسین کی ایسی تحریروں کو جمع کر دیں۔

بمبئی کے افسانہ نگاروں پر انور خان کا مضمون دلچسپ ہے۔ اس میں معاصر افسانے کے حوالے سے جو کہا گیا ہے وہ خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگا کہ انور خان کے دو الگ الگ مضامین یہاں آکر condense ہو گئے ہیں: بمبئی اور عصری افسانے پر جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، اسی تھیسس کو develop کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی بجائے خود اپنی ایک اہمیت ہے، صرف یہی نہیں کہ اس سے علی امام نقوی کے افسانوں کے مطالعے کی راہ ہموار ہو۔ علی امام نقوی کی کتاب میں شمیم حنفی صاحب سے مانگ کر لایا ہوں، ابھی پڑھی نہیں ہے اس لئے اُس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ انور خان نے اس کے بارے میں جو لکھا ہے وہ کیسا لکھا ہے۔ مگر ایسا ضرور لگا کہ اُن کا یہ جائزہ مزید وسعت کا طالب تھا۔ اور انھیں اس اہم افسانہ نگار کا سیر حاصل جائزہ لینا چاہیئے۔

ناول پر میرے مضمون میں کئی غلطیاں رہ گئیں۔ اپنی ہی تحریر دوبارہ پڑھنے پر جو اُلجھن اور کوفت ہوتی ہے،

اُس کا تو ذکر ہی کیا۔ نواب آزاد کی کتاب "نوابی دربار" کے بارے میں آپ نے میرا خط چھاپ دیا، مگر مجھے لگا کہ بات پھر بھی واضح نہیں ہوئی۔ مجھے اس کتاب کا جائزہ تفصیل کے ساتھ لینا چاہئے تھا کہ اسے ناول کے proto type کے قریب تر اس لئے محسوس کیا ہے کہ اس میں مکالمے تو ہیں مگر ڈراماتی عمل نہیں ہے۔ آنٹ جولیا والی کتاب کے مصنّف کا نام میں نے نہ جانے کس دُھن میں غلط لکھ دیا۔ اس کے مصنف کا نام برگاس لوسا VARGAS LLOSA ہے۔ یہ کتابت کی غلطی نہیں، میرے حافظے کی غلطی ہے۔ لمبے لمبے مضمون لکھنے سے یہی نقصان ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو اس کے بارے میں خط بھی لکھا تھا، ملا ہوگا۔

"نشتر" والی بحث خوب چل پڑی ہے۔ اگر اس کے بارے میں علم ہوتا تو اپنا مضمون کچھ وقت کے لئے اور روک لیتا۔ شاعری والے حصّے میں حمید نسیم صاحب اور احمد جاوید کی غزلیں ہی ہیں جو کچھ ہیں۔ ان کے علاوہ باقی سب خیریت ہے۔ ان غزلوں میں سے بعض یہاں پہلے چھپی ہیں اور میں دیکھ چکا ہوں، اس لئے مجھے اس پورے حصّے میں سرپرائز کا لطف بھی نہیں آیا۔ باقی جو نظمیں ہیں، اُن سے معاصر شاعری کی کوئی امید افزا تصویر سامنے نہیں آتی۔ افسانے کو آپ پہلے ہی عاق کئے ہوئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ سوغات کہیں صرف تنقیدی فورم بن کر نہ رہ جائے۔ ایسے فورم کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ مسلّم لیکن یہ تخلیقی ادب کی جگہ بہرحال نہیں لے سکتا۔ انور خان، علی امام نقوی، سلام بن رزّاق، انور قمر، سید محمد اشرف اور قمر احسن سے لے کر محسن خان تک، کئی ایک افسانہ نگاروں کی موجودگی میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اچھا افسانہ نہیں لکھا جا رہا۔ مجھے اس ادارتی پالیسی سے بہرحال اختلاف ہے کہ افسانے شامل ہی نہ کئے جائیں۔

اخترالایمان کی خود نوشت اچھی جا رہی ہے۔ ارے ہاں وہ "آنگن" اور نسوانی کردار والا مضمون نئی بات کہہ رہا ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں افسانوی ادب کی تنقید میں ایسے ایسے مُقطّع مُقطّع لوگ پڑے ہوئے ہیں کہ نیا خیال قریب سے گزر جائے تو تپ لرزہ چڑھ جاتی ہے۔ ایسے نقّادوں کو "سوغات" کی دُھونی دینی چاہئیے۔" آصف فرّخی۔ کراچی

"سوغات کے جاری ہونے کے بعد اب پاکستانی رسائل کا انتظار نہیں رہتا۔ گوشوں کے سلسلے نے رسالے کو بہت جاندار بنا دیا ہے۔

رفیق حسین کی کہانیوں کا انتخاب اس سے بہتر ممکن تھا۔ ان کی بہترین کہانیوں کو جمع کر کے آج کے قاری تک پہنچانے کا ایک اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ نیّر مسعود صاحب کے دونوں مضامین اچھے ہیں۔ پہلے مضمون کو بہت وسعت دی جا سکتی تھی۔ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ نیّر مسعود صاحب اس افسانہ نگار کی جزئیات کی دُنیا سے خوب واقف ہیں۔ وہ اگر چاہتے تو رفیق حسین کی ہر کہانی کے اندرون کا اتنا ہی گہرا جائزہ لے سکتے تھے جتنا شمس الحق عثمانی کے باکمال قلم نے لیا ہے۔ "آئینۂ حیرت کے لشکارے" پڑھ کر احساس ہوا کہ اردو افسانے کی تنقید

اتنی کم مایہ بھی نہیں۔ اردو کے کسی بھی افسانہ نگار کے کسی بھی افسانے پر اتنا جامع، گہرا اور سچا مضمون اب تک نہیں پڑھا تھا۔ عثمانی دلی مبارک باد قبول کریں۔

اقبال کرشن صاحب نے نیرّ مسعود کی "اردو زبان" میں کچھ اصلاحات کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ادب کی زبان گرامر سے بندھی ہوئی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ افسانے میں کسی کسی جگہ ایک مخصوص بہاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر گرامر والی نثر اس مقصود بہاؤ کو روک دیتی ہے اور کہانی میں بناوٹ کا شائبہ در آتا ہے۔ کہانی کی نثر کا محاورہ کچھ اور ہوتا ہے اور اس "کچھ اور" کو سمجھنا شاید خوردہ گیری کے ذیل میں گنا جائے۔ شاعری میں بے شمار ایسی مثالیں ہیں جہاں قواعد کی زبان کو رد کر کے شاعر نے متروک الفاظ، محاورات اور ضمائر سے کام لیا ہے اور وہی "کم زور زبان" شاعری میں اس کی طاقت بن گئی ہے۔ میر کا کوئی دیوان اٹھا لیجئے، میری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ زبان و ادب کے بارے میں نیرّ مسعود نو دو لیتے نہیں ہیں۔ میراث میں بھی بہت کچھ پایا ہے اور خود اپنے زورِ بازو سے بھی اس جائداد میں اضافہ کیا ہے۔ اردو و فارسی کے اس پایے کے عالم اور تخلیق فن کار کے بارے میں ایسے بے محابہ، جارحانہ اور سرسری جملے لکھنا اقبال کرشن صاحب کے لیے موزوں نہیں تھا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھوں گا کہ وہ گالیوں تک کی تقطیع کر لیتے ہیں ورنہ فیض کی نظم اور اس پر عرفان صدیقی صاحب کے تجزیے کے بارے میں ان کے مجذوبانہ کلمات پر لکھنے کو جی تو بہت چاہ رہا ہے۔ احمد جاوید کی غزلیں۔ سبحان اللہ!" سید محمد اشرف، بمبئی

"اس شمارے کے سارے ہی مضامین عمدہ ہیں۔ رشید امجد، شمس الحق عثمانی، وارث علوی اور شمیم حنفی کے مضامین بالخصوص پسند آئے۔ رشید امجد نے میراجی کے متعلق اس قدر حقائق اور آراء یکجا کی ہیں کہ اُن کی روشنی میں قاری خود میراجی کی شخصیت پر غور کر کے کوئی رائے قائم کر سکتا ہے۔ الطاف فاطمہ کا مضمون بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ آصف فرخی کے مضامین اُن کے وسیع مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔ رفیق حسین کے افسانوں نے اِس شمارے میں افسانوں کی کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ حمید نسیم پر تبصرہ بھی عمدہ ہے۔ پڑھنے کے بعد جی چاہا کہ اس ادیب کی کتاب منگوا کر پڑھی جائے۔ ابوالکلام قاسمی البتہ جدیدیت سے کچھ زیادہ باخبر نہیں معلوم ہوتے۔ غیر رسمی انداز، روزمرہ بول چال کی زبان، بے تکلف، بعض اوقات غیر سنجیدہ انداز اور کبھی کبھی بھکّڑپن جدید شاعری کی عام خصوصیات ہیں۔ محمد علوی، ظفر اقبال، ندا فاضلی، عادل منصوری اور ایسے دوسرے شاعروں کی شاعری اِس کی بیّن مثال ہے۔ ابوالکلام قاسمی کلاسیکی ذہن کے آدمی ہیں، وہ جذباتیت، خود ضبطی کے فقدان، استعاراتی جہت اور فنّی تدبیر کاری کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔ باقر مہدی کی ایک نظم "بلڈ پریشر کی ایک نظم" کا حوالہ دیتے ہوئے وہ اس کا موازنہ غزل کے ایک شعر سے کرتے ہیں۔ غزل کا مزاج اور خاص کر کلاسیکی مزاج ہم پر

اِس قدر حاوی ہے کہ ہم نظم میں بھی غزل کی خوبیاں تلاش کرتے ہیں۔ جدیدیت بنیادی طور پر ادب کو مدرسے سے باہر نکالنے کا رجحان تھا۔ ہمارے ناقد کھینچ تان کر اُسے پھر مدرسے میں لے آئے ہیں اور اس پر نازاں ہیں جو دراصل شرم کی بات ہے۔

باقر مہدی کی ایک اور نظم "تصویر کا دوسرا رُخ" کا ذکر انھوں نے "بدم نثری" کے عنوان سے کیا ہے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ قاسمی نے کتاب دلجمعی سے پڑھی بھی ہے یا وہ یوں ہی سرسری گزر گئے اور اپنے تعصبات کو تنقیدی اصطلاحوں میں بیان کر گئے۔ اِس نظم پر گفتگو کرتے ہوئے وہ یہ فراموش کر گئے کہ یہ نظم ایمرجنسی کے دوران لکھی گئی تھی۔ اُن دِنوں سردار جعفری ایمرجنسی کو حرفِ حق دے رہے تھے۔ حکومت سے خطاب یافتہ انقلابی شاعر ایسے موقع پر تصوّف کی بات کرے تو اور کیا ردّ عمل ممکن ہے؟ سردار جعفری کے اربابِ اقتدار سے گہرے تعلقات ہیں، یہ ہر کوئی جانتا ہے۔ اور وہ اپنے اِن "تعلقات" کی اچھی طرح حفاظت بھی کرتے ہیں: بمبئی کے حالیہ فسادات میں بڑے بڑے صنعت کار، فلمی، ادبی شخصیتیں چیخ پڑیں۔ مہاراشٹرا اردو اکیڈمی کے گیارہ ممبران نے استعفیٰ دے دیا لیکن سردار جعفری نے سچ بولنے کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ جو ممبر استعفیٰ دے رہے تھے انھیں بھی روکنے کی کوشش کی۔ آفتاب احمد خان نے اپنے ایک خط میں فیض کی دو نظموں اور دو قطعات کے حوالے سے اُن کے سیاسی رویّے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے دونوں ادیبوں کے عملی رویّوں* کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ باقر مہدی اپنی نظم میں اِسی رویّے کا مذاق اڑاتے ہیں۔

خیال ہوتا ہے کہ آج جب اصرار کیا جاتا ہے کہ شاعری کو پہلے شاعری کے طور پر دیکھنا چاہیے تو اُس کے پیچھے ایک منافق ذہن کام کرتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے چھوٹے چھوٹے فائدوں اور مصلحتوں کے لیے سمجھوتے کرتے رہیں، اربابِ اقتدار سے دوستی بھی رہے، حق بات بھی نہ کہنی پڑے اور ادب میں استادی بھی مسلّم رہے۔ اِسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ آج کا دور مفاہمت کا دور ہے۔ ایسے ماحول میں باقر مہدی جیسے ادیب ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں اور اُن کی اہمیت اور اُن کے فن کی قدر و قیمت کو کم کر کے دکھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی کا تبصرہ کچھ اسی طرح کی کوشش ہے یا پھر اُن کی معصومیت کا آئینہ دار ہے۔"

انور خان۔ بمبئی

* تبصرہ شعری مجموعے پر ہے، ادیبوں کا عملی رویّہ زیرِ بحث نہیں ہے۔ سردار جعفری کی "سمجھوتہ بازی" کی مذمّت یا باقر مہدی کی "سرکشی" اور "ریڈکلزم" کی تعریف اپنی جگہ، لیکن جن لوگوں کو ترقی پسندوں سے پروپیگنڈہ پر شاعری کو قربان کر دینے کی شکایت تھی ان کے شعری مجموعوں میں "شاعری" کی تلاش پر برہمی ناقابلِ فہم ہے۔ (م۔ ا)

"باہر سے لوٹا تو میز پر "سوغات" ملا۔ پورا دن، پوری رات اس کو پڑھا۔ سوغات نمبر۵ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

کمپوزنگ نے اس کی خوبصورتی کو بہت بڑھا دیا ہے۔ رفیق حسین صاحب کا گوشہ بہت اچھا ہے، پچھلے سارے گوشوں سے اچھا۔ اُن کے افسانوں کی معصومیت نے بہت متاثر کیا۔ احمد جاوید کی غزلیں بھی بہت اچھی لگیں۔ اُن کی غزلوں میں ایک سچی شاعری کی لَے ہے۔ آج سے کچھ سال پہلے کسی رسالے میں ان کی ایک غزل چھپی تھی اور سراج منیر (مرحوم) اور میں نے اس غزل پر کئی رَت جگے کئے تھے۔ آپ سچے فن کاروں کو تلاش کر کے چھاپ رہے ہیں، اِس کے لئے آپ کو بہت بہت مبارکباد! رفعت سروش صاحب کی نظم "صبیحہ کے نام" بہت پُرکشش اور نازک سی نظم ہے۔ اچھی لگی۔ شمس الحق عثمانی واقعی بہت اچھی تنقید لکھ رہے ہیں۔ شاید سب سے اچھی ــــ "بازگشت" لاجواب ہے۔

انشاءاللہ سوغات ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور تخلیقی ادب کی فضا، بھی فضا پھر سے قائم ہو جائے گی۔" صلاح الدین پرویز

(ریاض)

"سوغات کا پانچواں شمارہ حسبِ سابق خوب ہے۔ وارث علوی اور شمیم حنفی کے مضامین خوب ہیں۔ احمد جاوید کی تعریف کچھ زیادہ ہو گئی۔ "اس آباد خرابے میں" تو مستقل انبساط کا سامان ہے ہی، اس بار علی گڑھ کے ذکر اور رشید صاحب کے مخصوص جملوں نے اس میں اور بھی لطف پیدا کر دیا۔ "بمبئی کا عصری افسانہ" اور "نسوانی کردار" والے مضمون میں دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ علی امام نقوی کے مجموعے "گھٹتے بڑھتے سائے" کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مجموعے کے افسانے "ڈونگروا ڑی کے گدھ" سے آگے کا سفر کرتے ہیں؟ کیا نقوی کے فن نے اس پر کوئی اضافہ کیا ہے؟ اور اس کا جواب نفی میں ہے۔ ادھر نقوی کا ایک افسانہ "دیوث" چھپا ہے، جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔ اس مجموعے میں "چھب" نسبتاً غنیمت کہانی ہے۔ پھر ان تمام کہانیوں کو بمبئی کی کہانی کہنا بھی مناسب نہیں۔ نقوی کے یہاں در اصل طنز کی کاٹ بڑی جاندار ہوتی ہے۔ دیوث، ڈونگروا ڑی کے گدھ اور گھٹتے بڑھتے سائے، ان کی اسی ہنرمندی کا ثبوت ہیں۔ موجودہ حالات پر ہمارے فن کاروں کی خاموشی کا آپ نے جو ذکر کیا ہے، اس کا سبب واقعی سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ نے عرفان صدیقی کی غزل کا ذکر کیا ہے۔ شہریار صاحب کی تازہ غزلوں میں بھی یہ آثار ملتے ہیں۔

حال میں مظہر امام صاحب کی ایک پرانی نظم "۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء" پڑھنے کا موقع ملا تو اس نے موجودہ حالات میں کچھ زیادہ ہی متاثر کیا۔ خصوصاً آخری مصرعوں نے ــ حسینۂ صبح موت کے آہنی شکنجے میں گھر گئی ہے / وہ رو رہی ہے / وہ چیختی ہے / شبِ سیہ کا ڈراؤنا بھوت خنجر سے سر ہلا رہا ہے / وہ اپنی ہیبت سے آنے والے زمانے کا منہ چڑھا رہا ہے / اور اس کا پُر ہول قہقہہ جیسے کہہ رہا ہو / میں جاوداں ہوں / میں جاوداں ہوں / میں جاوداں ہوں

اس واقعہ (۶ دسمبر ۱۹۹۲ء) سے قبل ہی ہم جس تہذیبی شکست و ریخت سے دوچار ہو چکے ہیں، مذہب سے بے گانگی، اپنی بنیادوں سے بے تعلقی اور زندگی کی بھاگ دوڑ کی پیدا کردہ خود غرضی اور بے حسی وغیرہ کا بھی ممکن ہے

اس میں ہاتھ ہو، جس کے سبب ہم کسی چیز کے بارے میں شدت سے محسوس کرنے ،جذبات میں بہہ جانے (یہ جذباتیت کا شکار ہونا نہیں بلکہ اپنے جذبات کے تئیں ایماندار ہونا ہے) اور اپنے جذبات کو کسی طویل مدت تک سہارنے کی قوت کھوچکے ہیں۔ پھر بڑی تخلیق کہاں سے آئے گی۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنی جس جذباتیت کی وجہ سے بدنام ہیں وہ بھی دراصل ایک ڈھکوسلہ ہے۔ چونکہ ہمارا ایک STERIO TYPE بن چکا ہے، اس لئے ہم اسے ڈھو رہے ہیں۔ آپ کسی کی موت پر جنازے کے ساتھ جانے والوں کو دیکھ لیجئے۔ متوفی کے قریبی رشتہ دار اور گھر والوں کے لئے بھی یہ محض ایک فرض کی ادائگی ہوتی ہے۔ غم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی یہی حال اجتماعی مسائل کا بھی ہے۔ ہم کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ اُس کے جذبات کیا ہیں یا وہ کیسے پوز کر رہا ہے، ویسے ہی ہم بھی پوز کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ دوسروں کی نظر میں سُبک نہیں ہونا چاہتے اور دوسرے بھی یہ اسی لئے کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ ہماری آپ کی نظر میں سُبک نہیں ہونا چاہتے۔ محرّم کے موقع پر مجالس عزا کی کوئی تصویر دیکھ لیجئے۔ ماتم کی بجائے ماتم کی ایکٹنگ ہوتی ہے (اس کے صحیح یا غلط ہونے سے یہاں بحث نہیں) خیر۔ گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا۔ وہ جو اک رکھتے تھے ہم حسرتِ تعمیر سو ہے۔

ضمیر الدین احمد کی افسانہ نگاری پر وارث علوی صاحب کا مضمون لطف دے گیا۔ اس دوران ضمیر الدین احمد کی کتاب "خاطرِ معصوم" بھی سرور صاحب کے یہاں سے پڑھنے کو مل گئی۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ضمیر الدین احمد کے یہاں جنس کے مہذّب استعمال اور جنسی جذبات کی تہذیب کا ہُنر کہاں سے آیا اور کیسے۔ کلاسیکی شاعری کی رمزیت اور اشاریت سے افسانے کی تخلیق میں استفادہ کرنے کا سہرا شاید اکیلے ضمیر الدین احمد کے ہی سر ہے۔ سوکھے ساون، تشنۂ فریاد، اور پروائی یا پچھم سے چلی پروا، کے جیسے غضب کے تجزیے علوی صاحب نے کئے ہیں ان کی داد نہیں دی جا سکتی۔ اور دوسرے افسانوں کے تجزیے میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ سوکھے ساون کے سلسلے میں غالب کے مصرع ؎ گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے، کی علوی صاحب نے کیا خوب داد دی ہے۔ اردو میں ایسے شاہکار (میں شاہکار کے استعمال میں غلطی تو نہیں کر رہا ہوں) افسانوں کے ایسے شاہکار تجزیے وارث علوی کے علاوہ کون اور کتنے لوگ کر سکتے ہیں۔ جس طرح ضمیر الدین احمد کے افسانے (بالخصوص مذکورہ تین افسانے) افسانہ نگاروں کے لئے ایک چیلنج ہیں ویسے ہی اُن کے تجزیے بھی تجزیہ نگاروں کے لئے! سُنا ہے لکھنؤ کے سیمینار میں بیدی کے افسانے "جوگیا" پر بھی اُنہوں نے ایسا ہی تجزیہ پڑھا تھا۔ کہیں چھپے تو پڑھوں۔

"ٹیڑھی لکیر" پر پروفیسر شمیم حنفی کا مضمون بھی خوب ہے۔ عصمت کے بارے میں شمیم صاحب کا یہ فرمانا کہ "ایک غیر معمولی قسم کی تخلیقیت کے عنصر پر گرفت سے عصمت کے فنّی کمال اور اظہار کی طاقت کا پتہ چلتا ہے مگر اسی

کے ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ایک طرح کی اوسطیت یا عمومیت عصمت کی بہت بڑی مجبوری تھی، ایسی کہ وہ اپنے مزاج کی بے دریغ آتش فشانی کے باوجود اس مجبوری پر قابو پانے میں ناکام رہیں۔ اور "ٹیڑھی لکیر" جیسا ناول جس کی اٹھان میں ایک نہایت منفرد اور اردو کی حد تک شاید ایک بے مثال ناول بننے کے امکانات موجود تھے، عصمت کی بعض مجبوریوں کے سبب انجام کار بجھی ہوئی آگ بن کر رہ گیا۔" بڑی جرأت کی بات ہے لیکن حقیقت پر مبنی۔

آصف فرخی کی یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ درمیانی درجہ کے فن کاروں اور فن پاروں کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیئے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ (۱) اپنے تخلیقی عمل کے سلسلے میں آصف مطالعے کے جس دور سے گذرے یا گذر رہے ہیں اور بقدر ضرورت جو نوٹس لے رہے ہیں انہیں اس مضمون میں جمع کر دیا ہے (۲) آصف کا خیال رفیق حسین والے گوشے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ یعنی اگر ہم ضمیر الدین احمد کو یاد رکھیں تو رفیق حسین کو بھی بھولیں نہیں۔ جیسے سرسید کو ان کی ماں نے کہا تھا کہ بیٹا کبھی کبھی پیدل بھی چل لیا کرو۔ تو یہ پیدل چلنا بھی اہم ہے۔ ہاں نیر مسعود اور وارث علوی صاحبان اگر ٹھان لیں کہ اس پیدل سوار کو شہسوار ثابت کرنا ہے تو دوسری بات ہے۔ فی الحال ایک پیدل سوار کا ذکر ضروری ہے جسے آپ نے شہسوار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی شمس الحق عثمانی، بیدی نامہ اور آئینہ حیرت کے لشکارے کے مصنّف۔ بیدی نامہ ایک گوارہ کتاب ہے جس کی بیدی پر لکھے گئے اچھے مضامین کی موجودگی میں کوئی بڑی حیثیت نہیں ہے۔ تنقید اب اردو میں بھی تاثرات کے دائرے سے بہت آگے نکل چکی ہے۔

سیاہ/سپاہ پر قاسمی صاحب کی تحریر کو تبصرے کے بجائے مضمون والے حصّے میں ہونا چاہیئے تھا۔ اس کو پڑھنے کا لطف وارث علوی صاحب کے مضمون کے ساتھ پڑھنے میں آیا۔ ایسی جرأت، بے باکی، شرافت اور تہذیب کے ساتھ ہمارے یہاں کتنے لوگ تنقید لکھ سکتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک سینئر معاصر کے بارے میں۔ پھر ان سب کے باوجود کوئی ادعائیت نہیں، کسی کی توہین کا جذبہ نہیں، کسی طرح کی کلبیت کا اظہار نہیں، کوئی جملہ بازی کوئی غیر سنجیدہ گفتگو نہیں۔ رشید احمد صدیقی نے کتنے پتے کی بات کہی تھی "اچھے آدمی بن جائیے، اچھا لکھنے لگیں گے۔" ہمارے یہاں ستم یہ ہوا کہ تہذیب کا لفظ بحث و مباحثہ کا حصّہ بن کر رہ گیا اور وہ بھی صرف اسم کی حیثیت سے۔ کاش ہم فعل کی حیثیت سے اس کا استعمال جانتے! جذبات کی تہذیب، احساسات کی تہذیب، افکار کی تہذیب، نگارشات کی تہذیب، یہ سب چیزیں ایک ساتھ جمع ہوتی ہیں تب تہذیب جنم لیتی ہے (بطور اسم) بہرحال باقر مہدی کی شاعری پر تبصرہ ایک مدلّل اور وقیع تحریر ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ صاحبان کے درمیان جو ایک عجیب سی بحث چھڑی ہوئی ہے وہ افسوسناک ہے۔ مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ معاملہ اب پیراں نمی پرند مریداں می پرانند کا ہو گیا ہے۔"

امتیاز احمد علی گڑھ

"سوغات کی سوغات تازہ شمارے کی صورت میں ملی۔ حیران ہوں کہ آپ شمارہ در شمارہ ادب کے اس EXTRAVAGANZA کا اہتمام پوری مستعدی اور تخلیقی معیار کے ساتھ کس طرح کر لیتے ہیں۔ گزشتہ برسوں میں "شب خون" کی ناہمواری اشاعت نے اردو میں متحرک تخلیقیت کو خاصا متاثر کیا تھا۔ اب سنا ہے کہ "شب خون" کو افسیٹ پر تواتر کے ساتھ شائع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ لیکن صاحب جس بات سے میں خوف زدہ ہوں وہ یہ ہے کہ تقریباً تمام رسائل میں تنقید تخلیق کا حق مار رہی ہے۔ تازہ "سوغات" کو ہی لے لیجیے۔ یہ شمارہ ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور میں نے باقاعدہ گن کر دیکھا ہے کہ اس میں کل ۱۳۵ صفحات تخلیقات کے حصے میں آئے ہیں گویا تخلیقی ادب محض ۲۴ فی صد صفحات کو محیط ہے۔ ظاہر ہے کہ تخلیقی معیار کو اعداد و شمار کی منطق سے کوئی علاقہ نہیں لیکن اس کے باوجود تشویش ضرور ہوتی ہے۔ اس صورت حال سے دو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ تخلیقی ادب کے فن کاروں پر مکمل جمود طاری ہے۔ یا پھر جیسا ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ ادب کے اعلیٰ معیار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ یہ عبوری دور ہے لیکن اس دور سے گزرنے کے لئے نو واردانِ بساطِ ادب کی طرف توجہ دینا اشد ضروری ہے۔ نئے فن کار "سوغات" کے معیار پر صد فی صد پورے نہ اتریں یہ ممکن ہے۔ لیکن نئے تخلیق کاروں میں تخلیقی امکانات کا سرے سے فقدان ہو یہ بات ماننے میں نہیں آتی۔ چنانچہ امکانات کی تلاش بھی ادبی رسائل کے مدیران کا فرضِ کفایہ قرار پاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کو نئے فن کاروں سے کوئی بیر ہے۔ نہ مجھے آپ کے ادبی خلوص پر کوئی شک ہے لیکن نئے لوگوں کے لئے آپ کے دل میں جو ہمدردی ہے وہ معیار سے سمجھوتا کئے بغیر کچھ اور رلیز ہو تو بات بن سکتی ہے۔ سوال ارتقا کے تسلسل کا ہے۔ سریندر پرکاش یا انتظار حسین پر اردو افسانہ ختم نہیں ہوگا۔ اسے کوئی نہ کوئی انور خان، علی امام نقوی یا محسن خان میسر آتا رہے گا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ایک حد کے بعد آزمودہ سے آزمودہ فن کار بھی چوکنے لگتا ہے۔ تمام تر عقیدت کے باوجود مجھے محمد علوی کے تازہ مجموعے "چوتھا آسمان" میں وہ لطف نہیں آیا جو ان کے سابق مجموعے "خالی مکان" سے حاصل ہوا تھا۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ افکار یا اسالیب کی تازگی ابتدا میں متحیر کرتی ہے اور رفتہ رفتہ مانوسیت میں تبدیل ہو کر اپنی کشش کی قوت کھو بیٹھتی ہے۔ چنانچہ تازگی کی تلاش از سرِ نو جاری رہتی ہے۔ آپ نے میری غزلیں شائع کیں اس سے میری انا کو تسکین مل سکتی ہے لیکن یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ نئی نسل میں متعدد فن کار اپنی انفرادیت کے ساتھ سرگرمِ کار ہیں۔ مجموعی طور پر نئی نسل کے شعرا میں امکانات کا ایک جہان آباد ہے۔ یہ طے ہے کہ آج نہیں تو کل ان میں سے مستحق شعرا کا حق انہیں ضرور ملے گا۔ بالکل یہی بات افسانوں کے نئے خالقین کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ پھر یہ شروعات "سوغات" کے ذریعے کیوں نہ ہو؟

آج کی تمام اردو دنیا کو "سوغات" کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعے سکہ بند تنقیدی جبر کا ازالہ ہو رہا

ہے۔ ضمیر الدین احمد، اختر الایمان، سید رفیق حسین، نیر مسعود اور مشتاق احمد یوسفی وغیرہم کے فن پر آپ نے جو مقالات شائع کئے ہیں ان سے ہمارے ان بزرگوں کا حق بھی ادا ہو رہا ہے مجھ ایسے مبتدیوں کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔

تازہ شمارے میں حمید نسیم کی چار اور احمد جاوید کی چوبیس غزلیں "سوغات" کے باقی مندرجات پر بھاری ہیں۔ نہ جانے کیوں احمد جاوید کے اسلوب پر مجھے ۱۹۸۰ء کے آس پاس اپنی تخلیقی شناخت قائم کرنے والی نسل کے لہجے کا گمان ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی آواز ہماری ہی آواز ہے۔ ممکن ہو تو احمد جاوید کی مزید غزلیں شائع فرمائیے۔"

ارشد عبدالحمید۔ اجمیر

"انور خان کے مضمون "بمبئی کا عصری افسانہ" (مطبوعہ سوغات ع۵) سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ انور خان کے سارے ہم عصر افسانہ نگار اپنے پیش رو افسانہ نگاروں سے مطمئن نہیں اور اُن کے ادبی مقام کو بھی تسلیم نہیں کرتے، اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اِس مراسلے کے ذریعے اِس غلط فہمی کو دور کر دوں۔ میرے نزدیک یہ بات یوں بھی اہم ہے کہ ہمارے پیش رو افسانہ نگاروں نے، جن کی عالمی ادب میں بھی حیثیت مسلّم ہے، اپنے پیش رووں کے بارے میں کبھی ایسی بات نہیں کی۔

اور پھر میں انور خان کے قائم کئے ہوئے اس مفروضے سے بھی اتفاق نہیں کرتا کہ اُن افسانہ نگاروں کے افسانوں میں مقامی زندگی کا فقدان ہے۔ اور اگر ہے تو وہ مبنی بر حقیقت نہیں یا مقامی روایات اور اقدار کے مطابق نہیں۔

میں انور خان کے اس دعوے کو بھی بجا نہیں سمجھتا کہ یہ خصوصیت بمبئی کے عصری افسانہ نگاروں کے افسانوں میں موجود ہے۔

انور خان نے اپنے مضمون میں اِس بات کی وضاحت بھی نہیں کی ہے کہ افسانوں میں اس خصوصیت کے ہونے یا نہ ہونے سے افسانوں کے ادبی معیار پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ اِس بات کی وضاحت کر دیتے تو بہتر ہوتا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ باقاعدہ مطالعے سے ادب کے طالب علم میں کسی حد تک ناقدانہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ایسا طالب علم اپنی طبیعت کے خاصے اور ناقدانہ صلاحیت کے مطابق کسی صنف یا موضوع کو اپنے مطالعے کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ چنانچہ افسانہ ایک ایسی ہی صنف ہے جس سے مجھے شغف ہو گیا ہے۔ لیکن میں کبھی یہ دیکھنے کے لئے افسانے نہیں پڑھتا کہ وہ مقامی زندگی کی کیفیات سے معمور ہیں یا نہیں۔ میں تو افسانے اس نیت سے پڑھتا ہوں کہ مجھے ان سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ دورانِ مطالعہ اگر ناقدانہ شوق چرّاتا ہے تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ اُن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، کیا وہ قابلِ یقین ہیں ـــ جو کردار پیش ہوئے ہیں اُن کی زندگی، روح، حرکت اور حرارت سے محروم تو نہیں۔ فن کار نے بیانِ واقعہ میں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے، کیا ان میں اعتدال اور توازن ہے۔ جس موضوع پر افسانہ لکھا گیا ہے، کیا وہ آفاقی ہے۔ مزید یہ کہ میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ اِس افسانے میں اپنے آپ کو کس حد تک

شریک کر پاتا ہوں۔ اور افسانہ نگار نے اظہارِ بیان میں ادبی روایات کا احترام ملحوظ رکھا ہے یا نہیں۔ جن افسانوں میں مجھے یہ خوبیاں مل جاتی ہیں، وہ مجھے پسند آجاتے ہیں۔

میں کبھی کبھار غیر مُلکی ادیبوں کے افسانے بھی پڑھ لیتا ہوں، جن میں موپاساں، چیخف، کافکا، ہیمنگوے، مارکیز اور زکریا تامر وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن انور خان کا مضمون پڑھ لینے کے بعد میرے دل میں خدشہ پیدا ہوگیا ہے کہ آئندہ میرے لیے اِن ادیبوں کو پڑھنا مشکل ہوگا۔ مشکل اس لئے کہ میں ان حضرات کے افسانے انور خان کے نقطۂ نظر سے پڑھوں گا اور اگر میں نے وہ افسانے اُس ڈھنگ سے پڑھ لئے تو میرے سامنے ایک اَور مشکل آکھڑی ہوگی، چونکہ میں اُن ملکوں کی مقامی زندگی یا اُن کے ETHOS یا وہاں کی سماجیات سے واقف نہیں ہوں اِس لئے اُن افسانوں میں اِس ضمن میں کہی ہوئی باتوں کی تصدیق یا توثیق نہیں کر سکوں گا۔ لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں اُن افسانوں سے لُطف حاصل نہیں کر پاؤں گا جو افسانوں کے مطالعے کی میری پہلی شرط ہوا کرتی ہے۔

یہ بات تو میں نے مذاقاً کہہ دی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ افسانہ نگار حقائق کے پیش کرنے میں کسی مورّخ، ماہرِ اقتصادیات یا سائنس داں کی طرح پابند نہیں ہوتا۔ چونکہ اِن حضرات کا علم مبنی بر حقائق ہی ہوتا ہے اس لئے اظہارِ بیان میں وہ حقائق سے گریز نہیں کر سکتے۔ جب کہ یہ اختیار افسانہ نگار کو حاصل ہوتا ہے۔

ہر سچا فن کار اپنے تجربات اور مشاہدے کی بنیاد پر کوئی چیز لکھتا ہے اور موضوع و کردار کا انتخاب بھی وہ اپنی شخصیت کے خاصّے کے مطابق ہی کرتا ہے۔ چنانچہ کسی تخلیق میں "کیا نہیں ہے" کی نشاندہی کرنے کے بجائے اگر ہم "جو موجود ہے" کا تجزیہ کریں تو میرے خیال سے اُس فن پارے کی تعیّنِ قدر کے سلسلے میں یہ بہتر اور بجا اپروچ ہوگا۔

مجھے انور خان کے بعض تعمیمی ریمارکس پر بھی حیرت ہے جو اُنہوں نے منٹو کے چند کرداروں کے تعلق سے دیئے ہیں۔ مثلاً ممّد بھائی کو انہوں نے جاہل کہا ہے۔ موذیل کے انڈر ویئر نہ پہننے اور عطا یزدانی کی بیوی طاہرہ کے پیٹی کوٹ نہ ہونے پر ازار بند سے ساڑی اڑس کر پہن لینے کے عمل کو انہوں نے منٹو کی ہیجان پسند طبیعت کی اختراع بتایا ہے۔ اِسی طرح شاردا کی صفائی پسندی اور رام سروپ کے خالی بوتلیں اور ڈبّے جمع کرنے کی عادت کو اُن کے سنکی پن سے تعبیر کیا ہے۔

ممّد بھائی ممکن ہے ناخواندہ ہو لیکن جاہل نہیں تھا۔ سادہ لوح تھا، ورنہ وہ کیوں راوی کا علاج کرواتا اور بُڑھیا کی بیٹی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والے کا کام تمام کر دیتا، سزا کے ڈر سے مونچھیں کٹواتا اور پھر اُس پر تاسّف کا اظہار کرتا۔

اسی طرح موذیل کا انڈر ویئر نہ پہننا یا طاہرہ کا ازار بند سے ساڑی اُڑس کر پہن لینا میرے خیال سے ایک علامتی بیان ہے۔ اُن کے مزاج کو سمجھنے کا اشاریہ، جو یہ بات بآسانی ہم پر واضح کر دیتا ہے کہ موذیل اور طاہرہ

آزاد خیال عورتیں تھیں، جن کے آگے رسمی طور طریقوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی — منٹو نے انڈر ویر کو اسی افسانے میں متنازع فیہ مسئلہ بنا کر ترلوچن کے مذہبی ضابطوں پر بھی چوٹ کی ہے :

... مجھے معلوم ہے تم پتلون کے نیچے ایک سلی سلا انڈر ویر پہنتے ہو۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے۔ تم ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا دھرم تمہارے انڈر ویر میں چھپا بیٹھا ہے۔

اور شاردا کی صفائی پسندی، رام سروپ کی بوتلیں اور ڈبے جمع کرنے کی عادت میرے خیال سے اُن کی شخصیت کے پیچ و خم کا اظہار ہیں اور نفسیاتی گتھیوں کی علامتیں۔ ہم ان کرداروں کے ظواہر کا خول توڑ کر شعور کی سطح کے نیچے، بہت گہرائی میں، لاشعور کی تہوں میں، حقیقت کی تلاش کر سکتے ہیں۔

میری انور خان سے گزارش ہے کہ وہ منٹو کے افسانے: رام کھلاون، ننگی آوازیں اور دس روپے۔ بیدی کے: بولو وہ بڈھا، جوگیا، مکتی بودھ، ایک باپ بکاؤ ہے اور صرف ایک سگریٹ۔ کرشن چندر کے: مہالکشمی کا پل، چندرو کی دنیا اور ایرانی پلاؤ — ضرور پڑھیں۔ مجھے امید ہے کہ انہیں یہ افسانے مقامی زندگی سے آباد ملیں گے۔

اور اگر آخر میں یہ بھی عرض کر دوں تو بے جا نہ ہو کہ میرے خیال سے انور خان نے زیرِ نظر مضمون میں تین مختلف موضوعات کو مربوط کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی بنا پر مضمون اُلجھاؤ اور پراگندہ ذہنی کا مظہر بن گیا ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ علی امام نقوی کے فن کے ساتھ وہ انصاف نہیں کر سکے اور ایک زندہ ادیب اُن کے شوقِ صحرا نوردی کی نذر ہو گیا۔

ابھی میں مراسلے کی آخری سطریں ہی لکھ رہا تھا کہ مجھے سمرسیٹ مام کے مضمون "شارٹ اسٹوری" میں برسوں پہلے پڑھی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ جی چاہتا ہے کہ اُسے یہاں نقل کر دوں :

... ہمیں ایک ناول نگار کی کسی دوسرے ناول نگار کے ناولوں پر لکھی ہوئی تنقید پڑھتے ہوئے محتاط رہنا چاہئے۔ محتاط اس لئے کہ وہ اُن خصوصیات کی ضرور تعریف کرے جو بذاتِ خود اُس کے اپنے ناولوں میں موجود ہوں گی۔ لیکن اُسے اُن باتوں میں کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی، جن کا اُس کی اپنی تحریر میں فقدان ہو گا۔

چونکہ ہر کلیے میں استثنا ہوتا ہے ممکن ہے کہ انور خان بھی مام کے اس بیان سے مستثنیٰ ہوں۔"

انور قمر۔ بمبئی

" واللہ! کیا زبردست شمارہ نکالا ہے۔ طبیعت، بقول میر امّن، باغ باغ ہو گئی۔ ایک ننھی سی درخواست ہے۔ آپ "سوغات" کے صفحات بڑھنے دیں۔ مزہ آئے گا جب آپ چھ ماہ کے بعد ایک ہزار صفحات کے شمارے نکالا کریں گے۔ قیمت

ضرور بڑھادیں۔

سب سے پہلے تو میں شکریہ اس بات کا ادا کر دوں کہ آپ نے احمد جاوید صاحب کی اتنی ساری غزلیں ایک ساتھ شائع کیں۔ اعظم الدولہ سرور نے جو آتش کے بارے میں کہا ہے وہی بات یاد آگئی یعنی کہ "مضامین نازک از طبعش می تراود" ان غزلوں کو دیکھ کر یقین مستحکم ہو گیا کہ غزل اردو ادب کی آبرو ہے۔ سچ مچ غزلوں کے سہارے ہم سانس لیتے ہیں۔ ہم جیسے جو گاہے گاہے ایک آدھ ادنیٰ قسم کی نظم کہہ لیتے ہیں، وہ غزل گو شعراء کے خاکِ پا ہیں۔ حمید نسیم صاحب کی غزلیں بس ٹھیک ہیں۔ اُن کی "ناممکن کی جستجو" یقیناً دلچسپ کتاب رہی ہوگی۔ پاکستان کے سینئر ادیبوں کے ہاں ذاتی سرگزشتیں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ ہمارے سردار جعفری جیسے حضرات کیوں نہیں اپنی روداد لکھتے، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اختر الایمان صاحب تو لکھ رہے ہیں، اور عمدہ لکھ رہے ہیں، لیکن اُن کی روداد جب مکمل ہوگی، تو کتاب کی صورت میں آنے سے پہلے اُسے از سرِ نو ترتیب دینا ہوگا۔ اُن سے تو میری استدعا ہوگی کہ وہ ذرا تفصیل سے لکھیں۔ میں ان کے علی گڑھ کے تاثرات کے متعلق جاننا چاہوں گا۔ حیات اللہ انصاری سردار جعفری جیسے صاحبان کے زمانے کے علی گڑھ کے بارے میں معلومات کی ضرورت ہے، خصوصاً یہ جاننے کے لئے کہ مسلم دانشوران نے کیسے ایک وسیع ہندوستانی سیکولر اسپیس میں آتے آتے ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ مسلم لیگ کے محدود سے رقبے میں خود کو محصور کر لیا؟ یہ ایک المیہ تھا جس کا ایک نتیجہ ہم نے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ایودھیا میں دیکھا۔ مولانا وحید الدین احمد خان صاحب ایک حد تک درست فرماتے ہیں: "مسلمانوں کو اپنے گرد بنائے گئے حصاروں کو توڑنا پڑے گا۔" لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ مسلمان کا ان حصاروں سے باہر آنا ذرا دشوار کام ہے۔

نظموں میں مجھے صلاح الدین پرویز کی "کولاژ" اور "کیا شام ہوگئی؟" پسند آئیں۔ مستقل کوشش نے اُن کے ہاں اب ایک ٹھہراؤ اور نغمگی پیدا کر دی ہے۔ اقبال کرشن صاحب شاعری سے زیادہ تکنیک کے دیوانے ہیں۔ خدا مبارک کرے۔

میں وارث علوی صاحب کے مضامین پڑھتے ہوئے ذرا گھبرا جاتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی تنقید اعلیٰ پائے کی ہے، اور اُن کی کتب مبنی بھی۔ لیکن جب بھی وہ لکھنے پر اُتر آتے ہیں (اور وہ تو غالباً دن کے اٹھارہ گھنٹے لکھنے میں صرف کرتے ہیں) تو اشہبِ قلم کو دوڑاتے چلے جاتے ہیں۔ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں ــــ اور ضمیر الدین احمد کے افسانوں کا تجزیہ انھوں نے خوب کیا ہے ــــ اسے وہ کم تر الفاظ میں بخوبی بیان کر سکتے ہیں۔ جریدے میں لکھے گئے نثر پاروں اور کتابوں کے لئے لکھے گئے ابواب میں فرق ہوا کرتا ہے جسے وارث صاحب جیسے ذہین نقاد ضرور جانتے ہوں گے۔ اب تو کوئی غالباً ممتاز حسین مرحوم کے ابتدائی تنقیدی مضامین کو نہیں پڑھتا۔ ان سے بہت ساری باتیں اب بھی سیکھی جا سکتی ہیں، خصوصاً کم الفاظ میں زیادہ باتیں کہنا۔

آپ نے آصف فرخی کا گویا ایک رسالہ شامل کر لیا ہے۔ وہ بھی قلم پر قابو نہیں رکھ پاتے۔ اردو کے نقاد غالباً سرور صاحب کے تتبع میں، تنقید نگاری میں شاعری پر اتر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی بھی کولرج، ٹرے لنگ، لیسلی فیلڈنگ، اہاب حسن کی مانند تنقید کیوں نہیں لکھتا؟ واقعہ یہ ہے کہ ہماری شعریات تقریباً مکمل طور پر شاعری کے دائرے میں محصور ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی شکایت بڑی حد تک غلط ہے۔ آصف فرخی صاحب نے انگریزی الفاظ کا (بے جا؟) استعمال بہت زیادہ کیا ہے۔ دوئم، اُن کا مضمون ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔

ایک بات جو کہ مجھے جدید اردو نقادوں کے یہاں انتہائی رکیک سی لگتی ہے وہ اُن کی ترقی پسند مصنفین پر الزامات لگانے کی، اور اُن کو بُرا بھلا کہنے کی خاصیت ہے۔ حتّٰی کہ اختر الایمان صاحب جیسے تجربہ کار شاعر کے یہاں بھی یہ بات موجود ہے۔ میں مارکسزم کو معاشرے اور تاریخ کو سمجھنے اور اُن کا تجزیہ کرنے میں انتہائی کار آمد سمجھتا ہوں۔ بھیمڑی کانفرنس کی قرار دادیں مجھے بھی پسند نہیں لیکن اس وجہ سے میں کرشن چندر یا خواجہ احمد عبّاس یا عصمت چغتائی یا احمد ندیم قاسمی کو تھرڈ کلاس افسانہ نگار نہیں سمجھتا۔ اور کسی بھی ہاتھی دانت کے مینار میں بیٹھے ہوئے دانش وَر کو اس کا احساس رہا ہے کہ ان "نچلے درجے" کے مصنفین نے غریبوں اور لاچاروں، مصیبت زدوں اور آفت کے ماروں کے بارے میں کتنی کوششیں کی ہیں؟ تہذیب کا ایک بڑا مقصد گرے ہوئے طبقے کو اوپر لانے کی جدّوجہد بھی ہے۔ روس یا ہنگری میں اگر نام نہاد کمیونسٹوں نے ظلم و زیادتیاں کیں تو مارکسزم سے اس کا کیا علاقہ؟ آصف فرخی صاحب نے بغیر سوچے سمجھے جو کرشن چندر پر بندوق چلائی ہے وہ اُنہیں زیب نہیں دیتا۔

آصف فرخی نے غالباً باختن کو انگریزی ترجمے میں پڑھا ہے۔ انہیں چاہیئے تھا کہ وہ باختن کے حوالوں کا اردو ترجمہ پیش کرتے۔ انگریزی ترجمے کو من و عن نقل کر دینا درست نہیں۔ ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ باختن پر ترقی پسندوں نے غور نہیں کیا۔ نیو لفٹ نے (خصوصاً جب کہ امریکہ میں نیو لفٹ کا زور یونیورسٹیوں میں تھا۔ گو اب بھی ہے لیکن ذرا مجہول قسم کا) باختن پر اٹھائے گئے سوالات پر خوب بحثیں کی ہیں۔ اُن کا یہ کہنا کہ مارکسسٹوں نے اِسے نظر انداز کیا ہے، قطعی بے بنیاد ہے۔ انھیں تو پتہ ہو گا کہ میدویدیف کے ساتھ مل کر میخائیل باختن نے جو کتاب لکھی تھی، انگریزی ترجمے میں اُس کا سب ٹائٹل "اے کریٹیکل انٹروڈکشن ٹو سوشیولوجیکل پوئیٹکس" ہے۔

آپ کا گوشۂ سید رفیق حسین بہت ہی عمدہ ہے، غالباً سب سے عمدہ گوشہ۔ مجھے جہاں تک یاد آتا ہے میں نے بچپن میں اُن کے افسانوں کا مجموعہ پڑھا تھا۔ ضرور وہ "آئینۂ حیرت" ہی رہا ہو گا۔ پتہ نہیں وہ کتاب مجھے کہاں ملی تھی اور کہاں گم ہو گئی۔ شمس الحق عثمانی کا تجزیہ بہت ہی عمدہ ہے۔ انھوں نے نقّالی کم اور کام کی باتیں زیادہ کی ہیں۔ شاید بیدی کے مطالعے کا اثر ہے۔ "نیم کی نمکولی" اردو کے زبردست افسانوں میں سے ہے، گو اُسے ذرا ترتیب

دینے کی ضرورت تھی۔ ۱۹۰۵ء میں رفیق حسین مرحوم کوئی دس برس کے رہے ہوں گے پر اُن کا اُس دور کا مطالعہ حیرت انگیز اور زبردست ہے۔ کرداروں کی ایک بھیڑ ہے جو چلی آرہی ہے۔ ایک دوسرے سے گُتھے ہوئے کردار ہیں، جو اپنی شان رکھتے ہیں۔ غالباً ہر عظیم فکشن تھوڑی سی ایڈیٹنگ چاہتا ہے۔ چاہے لیو ٹالسٹائے لکھے، چاہے سعادت حسن منٹو۔ امریکہ میں فکشن کی ایڈیٹنگ کی روایت زبردست رہی ہے۔ ہیمنگوے کے ناشر کے پاس ایک زبردست ایڈیٹر تھا، جس کا نام ابھی مجھے یاد نہیں آرہا، اس نے کئی ایک زبردست ناولوں کو بڑی خوبی سے ایڈٹ کیا تھا۔ اب تو زمانہ یہ آگیا ہے کہ کمپیوٹر پینل پر ہی ایڈیٹنگ شروع ہو جاتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ وِکرم سیٹھ کے ناول "اے سوٹیبل بوائے" کی صحیح ایڈیٹنگ نہیں ہو سکی۔ میں نیّر مسعود صاحب کی اس بات پر صاد کرتا ہوں کہ ہمیں رفیق حسین مرحوم کے غیر مطبوعہ افسانوں کی تلاش ہونی چاہئے۔ اُن کے کاغذات لکھنؤ ہی میں کہیں ہونے چاہئیں۔ یا پاکستان جاکر لاپتہ ہو گئے۔ اِس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اردو، فارسی و عربی کے کتنے ذخائر تقسیم ہند کی بدولت غارت ہو گئے۔ میں میرٹھ کے علاقے کے چند دیہاتوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہاں ایسی غارت گری ہوئی، غالباً غالب کا "نسخۂ امروہہ" اسی تباہی کی بدولت پردۂ ظہور پر آیا۔

رشید امجد صاحب نے میراجی کے بارے میں جتنی باتیں بتائی ہیں اُن میں سے کئی ایک کے بارے میں مجھے واقفیت نہ تھی، خصوصاً یہ کہ تقسیم ہند سے پہلے وہ جنوبی ہند میں رہ چکے تھے۔ میراجی اردو شاعری کے ایک قابلِ قدر شاعر تھے۔ میراجی کی شاعری پر ایک عمدہ مضمون لکھوائیں۔ کم از کم ہندوستان میں عام پڑھنے والوں کو میراجی کے متعلق واقفیت کم ہے۔ امید ہے اخترالایمان صاحب اپنی سرگزشت میں میراجی پر تفصیل سے لکھیں گے۔

میں نے کلاسیکی یونانی زبان بڑی ہی محنت سے سیکھی تھی۔ اس سے کئی ترجمے اردو میں کئے ہیں۔ خصوصاً کئی ایک نظموں اور ڈراموں کے حصّوں کے۔ سنا ہے کہ "سوغات" کے پُرانے دور میں ترجمے شامل ہوا کرتے تھے۔ اگر آپ چاہیں تو میں کئی ایک روانہ کر سکتا ہوں۔"

حبیب حق۔ پوسا (بہار)

ایک بات میں کہنی قطعی طور پر بھول گیا۔ پرویز اختر صاحب نے ٹھیک گرفت کی ہے۔ میری نظم "پہلی رطن" (نمبر ۴: ص ۳۴۳) سطر ۱۲ میں کتابت کی غلطی ہے۔ صحیح مصرع یوں ہے:

اور تھنوں سے پانی کے قطرے حادثات کی مانند ٹپک رہے تھے

براہِ کرم تصحیح کرا دیں۔

جبیب حق

"سوغات نمبر ۵ کے بارے میں عرض ہے کہ اس کی تمام مشمولات خوب ہیں۔ "اُس آباد خرابے میں" اخترالایمان کی

خود نوشت بہت خوب ہے ۔ اس کو جاری رہنا چاہئے ۔ نثر میں خود نوشت کا ایک خاص مقام ہے اور ہمارے ادب میں اس کا فقدان ہے ۔

"میراجی کے بارے میں ایک خط" بہت ہی اہم شخصیتوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہے ۔ اچھا کیا آپ نے اس کو محفوظ کر لیا ۔ سید رفیق حسین کے افسانوں کو منظر عام پر لاکر آپ نے بڑی خدمت کی ہے ۔

غزلوں میں حمید نسیم کے یہ شعر بہت پسند آئے :

ایسی بھی کوئی ننھی تھی غم روزگار میں — ہر سانحے میں دیتی رہی دل کو حوصلہ

گزرے جو ماہ و سال ترے انتظار میں — تو ملتفت ہوا تو کھلا کام آ گئے

ہر ایک مرحلۂ جاں میں میرے ساتھ ہے دل — یہی تو یار ہے اک ، اور غمگسار ہے کون

احمد جاوید کو میں آپ کی دریافت کہوں گا ۔

ڈاکٹر عزیز تمنائی کے مجموعۂ کلام "سرہانے کا چراغ" پر تبصرے میں بڑا اچھا ہوتا اگر آپ چند منتخب اشعار بھی شامل کر لیتے ۔

"بازگشت" میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں ایک خط نے متوجہ کیا ۔ حبیب حق نے پتے کی بات کہی ہے ۔ انہوں نے دوسری زبانوں کے الفاظ کو جن کا استعمال ناگزیر ہے اردو رسم الخط میں لکھنے کا مشورہ دیا ہے ۔ مجھے اس تجویز سے پورا اتفاق ہے ۔ یوں بھی آئے دن انگریزی ، فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کو انگریزی رسم الخط میں اردو نثر میں خواہی نخواہی ٹھونسنے کی وبا پھیلی ہوئی ہے ۔ حالانکہ انھیں خیالات کو اپنی زبان میں پیش کرنے کے لئے کئی الفاظ موجود ہیں ۔"

حسرت سہروردی ۔ تریچناپلی

"میں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ادبی سرگرمیوں سے واقف رہنے کی کوشش کرتی ہوں ۔ اس ضمن میں "سوغات" نے نہ صرف میری معلومات میں اضافہ کیا ہے بلکہ بعض ادبی مسائل کو انسانی مسائل کی سطح پر لا کھڑا کیا ہے ۔ میں نے سوغات کے سبھی شمارے پڑھے ہیں ۔ پانچواں شمارہ پڑھنے کے بعد خیال ہوا کہ میں بھی اپنے تاثرات بھیجوں ۔ سوغات ، ایک معیاری رسالہ ہے ، اسی لئے ادبی حلقوں میں جس شدت اور کثرت سے اس رسالے کی پذیرائی ہوئی ہے وہ بہت کم رسالوں کو نصیب آئی ہوگی ۔ تازہ شمارے میں مجھے تین مضمون بہت اچھے لگے ۔ وارث علوی کا مضمون "ضمیر الدین احمد کی افسانہ نگاری" ، شمیم حنفی کا مضمون "عصمت کی ٹیڑھی لکیر" اور ابو الکلام قاسمی صاحب کا مضمون (تبصرہ) جو باقر مہدی کی شعری کلیات "سیاہ / سیاہ" پر ہے ۔

وارث علوی صاحب کا مضمون "ضمیر الدین احمد کی افسانہ نگاری" اپنی تجزیاتی خوبیوں کی وجہ سے متاثر کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ادھر وارث علوی نے اپنے موضوع پر آزادانہ اظہارِ خیال کے بجائے موضوع کے تجزیے کی طرف توجہ دینا شروع کی ہے۔ سوغات کے پہلے شمارے میں ضمیر الدین احمد کے افسانے چھپے تھے اور ان افسانوں پر نیّر مسعود نے مختصر مگر اعلیٰ درجے کا مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں وارث علوی نے اپنے وسیع مطالعے کے ذریعے افسانے کی فنی اور فکری جہات سے روشناس کرایا ہے۔ فکشن کے فن اور انسانی نفسیات کا جس قدر وسیع مطالعہ وارث علوی کا ہے اس کا اندازہ اُن کے مضامین پڑھنے سے ہوتا ہے۔ بیدی کے افسانوں پر لکھتے ہوئے وارث علوی نے لکھا تھا کہ عورت کے سلسلے میں میرا مطالعہ اور مشاہدہ کمزور ہے لیکن یہ مضمون اور دوسرے مضامین ان کے اس انکسار کی تردید کرتے ہیں۔ عورت کی نفسیات کی باریک سے باریک تہوں تک پہنچنے کی جو کوشش ضمیر الدین احمد نے کی ہے، اُس نفسیات کی تشریح و تعبیر میں، ضمیر احمد کے حوالے سے ہی سہی، وارث علوی نے کچھ کم دروں بینی کا ثبوت نہیں دیا۔ اس مضمون میں انھوں نے سوکھے ساون، تشنہ فریاد اور پروائی جیسے غیر معمولی افسانوں کا بہت اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔

شمیم حنفی کا مضمون "عصمت کی ٹیڑھی لکیر" اپنی جامعیت اور اختصار کی وجہ سے متاثر کرتا ہے۔ ہاں اقتباسات کا کثرت سے استعمال ذرا کھٹکتا ہے۔

باقر مہدی کی شعری کلیات "سیاہ/سیاہ" پر ابو الکلام قاسمی صاحب کا مضمون بھی تجزیاتی نوعیت کا ہے ابو الکلام قاسمی صاحب کی تنقید کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ وہ موضوع کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔

اختر الایمان کی خود نوشت کی دلچسپی ابتدا سے لے کر اب تک ویسی ہی برقرار ہے۔ خود نوشت کے اس حصے میں انھوں نے ادبی رجحانات کے سلسلے میں جو باتیں کیں وہ بڑی اہم ہیں۔

تحقیقی مضامین میں میراجی کی شخصیت پر رشید امجد کا مضمون پڑھا جو بہت محققانہ ہے۔ اس مضمون کے ذریعے میراجی کے بارے میں بعض انکشافات حیرت انگیز ہیں۔

آصف فرخی کے مضمون کو پڑھنے کے بعد ایسا لگا کہ انہوں نے بہت سے دقیانوسی محققوں کی طرح چند گرے پڑے ناولوں کو ادبی تاریخ میں بحال کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ پہلے ایسے مزاروں کے کتبہ خواں تو نہ تھے۔

اس شمارے کا تخلیقی حصہ سوائے احمد جاوید کی شاعری کے کافی کمزور ہے۔ نہ ہی کوئی افسانہ ہے جو اثر چھوڑتا ہو اور نہ ہی بیشتر شعری تخلیقات متاثر کرتی ہیں۔ معیاری تخلیقات کی وجہ سے ہی رسالہ سوغات ہر طرح ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ مجھے یہ بات بھی اچھی لگتی ہے کہ اداریے میں مدیر کی پسند اور تعصبات کا اظہار بھی

ہوتا رہتا ہے۔"

رخسانہ عابدی۔ علی گڑھ

"سوغات (۵) میں سید رفیق حسین پر خصوصی مطالعہ آج کے افسانے سے مایوس قاری کو سنبھالا دیتا ہے۔ سید رفیق حسین کے منتخب افسانے بار بار پڑھے جانے کی چیز ہیں۔ الطاف فاطمہ کا "خزاں کے رنگ" معلومات آفریں ہے۔ آصف فرخی کبھی کبھار اپنے مقالوں میں بہت لمبے سفر پر نکل جاتے ہیں لیکن اس بار سید رفیق حسین کے افسانوں کے ساتھ جن افسانوں اور نظموں کا تقابلی ذکر ہوا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

"اس آباد خرابے میں" ـــ رشید احمد صدیقی کے حوالے سے "خواب باقی ہیں" کا ایک پیراگراف لفظ بہ لفظ نقل ہوا ہے۔

یوسف عارفی

(۱)

"یہ شمارہ بھی خوب ہے۔ خصوصاً وارث علوی کا مضمون۔ وارث علوی نے تجزیاتی انداز اختیار کیا ہے جس کے باعث مضمون کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔ آپ نے احمد جاوید کی غزل کے حوالے سے بہت اہم نکات اٹھائے ہیں۔ یقیناً احمد جاوید کی شاعری چیزے دگر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آصف فرخی کا ناول سے متعلق مضمون بہت اچھا ہے۔ انہوں نے باختن کے حوالے سے خیال انگیز نکات اٹھائے ہیں۔ رفیق حسین کا گوشہ متاثر نہ کر سکا۔ معاف کیجئے گا مجھے ان کی کہانیاں بھی کوئی خاص نہیں لگیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا میرے Limitations کے باعث ہوا ہو۔ اسی طرح خلیل مامون کا "سات سماوات" پر تبصرہ بھی زیادہ پسند نہیں آیا۔

سوغات نے ہمیشہ نئے ادبی نظریات کی پذیرائی کی ہے۔ تاہم پچھلے چند شماروں سے آپ کے اداریوں سے احساس ہوتا ہے کہ آپ تاثراتی انداز کی تنقید کو دوبارہ مقبول بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ آپ نے شمس الحق کی کتاب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہاں تنقید اور تخلیق کا فرق مٹ گیا ہے۔ تنقید کی یہ معراج نہیں ہے کہ وہ تخلیق کا درجہ اختیار کر لے۔ تنقید ایک باقاعدہ اختصاصی شعبۂ علم ہے جس کا تمسخر سوغات جیسے موقر ادبی جریدے کے شایانِ شان نہیں ہے۔"

شافع قدوائی

(۲)

"سوغات کے تازہ شمارے میں اپنے مضمون "نیر مسعود کے افسانے: چند نمایاں پہلو" سے متعلق حیدرآباد لٹریری فورم کی روداد میں یہ معرکے کا تنقیدی جملہ نظر سے گزرا کہ "چونکہ نیر مسعود نے شفاف، نرم اور سبک نثر لکھی ہے لہٰذا ان پر تنقید بھی نرم پیرائے میں ہونی چاہیئے تھی" ظاہر ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں شفاف اور نرم و سبک نثر کو ایک باضابطہ اختصاصی شعبۂ علم کے مماثل سمجھا جاتا ہو اور تاثراتی تنقید کو اعتبار حاصل ہو وہاں موضوع کی

نشاندہی سے عاری تکنیکی نوعیت کا استدلالی، ہیئتی مقالہ کیسے مطبوعِ خاطر ہو سکتا ہے۔ مضمون پر اقتباسات اور اصطلاحوں سے گراں بار ہونے کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ فکشن تنقید میں متن کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے لہٰذا مثالوں (اقتباسات) سے گریز کیا جاتا ہے۔ میں نے نیّر مسعود کے فن کے مابہ الامتیاز عناصر کی وضاحت کے لئے ان کے افسانوں سے اقتباسات نقل کئے تھے تاکہ ان کے امتیازی خصائص واضح ہو جائیں مثلاً قولِ محال اور فنکشنل نثر وغیرہ کی متعدد مثالیں دی گئی تھیں۔

مضمون کی نوعیت بنیادی طور پر توضیحی و تشریحی تھی۔ لہٰذا اقداری فیصلوں۔ Value Judgements سے عمداً اجتناب کیا گیا تھا۔ فنکشنل نثر کو نیّر مسعود کے افسانوں کی بنیادی characteristic کہا گیا تھا خوبی نہیں۔ یہ سوال اٹھایا ہی نہیں گیا تھا کہ اس نوع کی نثر نیّر مسعود کے افسانے یا کسی تخلیقی فن پارے کی خوبی ہے۔ فنکشنل نثر کا استعمال افسانے کے تاثر میں اضافہ کرتا ہے یا اسے مجروح کرتا ہے اس بحث کو بھی مضمون کے دائرے سے باہر رکھا گیا تھا۔ انور خان نے لکھا ہے کہ نیّر مسعود کے ہاں سیاسی اور سماجی concerns کا احساس نہیں ہوتا جبکہ مارکیز اور رشدی کے ہاں عصری مسائل کا اظہار بیش از بیش موجود ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ مگر نیّر مسعود کی حالیہ کہانیاں عصری واقعات کے بالواسطہ اظہار سے عبارت ہیں۔ مثلاً افسانے "اہرام مصر کا میر محاسب" اور "سلطان مظفر کا واقعہ نویس" علی الترتیب بابری مسجد کے انہدام اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں کی نمایاں تمثیل کے طور پر ابھرتے ہیں۔

بازگشت میں شامل بعض خطوط سے نہ صرف مکتوب نگاروں کی عجلت پسندی، علمیت اور ہمہ دانی کی بھونڈی نمائش اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان سے pretensions اور Inhibitions کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی نوع کا ایک خط علی گڑھ کے ایک صاحب (جو خیر سے مدرس بھی ہیں) کا ہے جنہوں نے ہر چند کہ مضمون سے متعلق تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے مگر تحریر سے ان کی تعجیل پسندی (کاتا اور لے دوڑی) یا بہ الفاظ دیگر Jumping to the conclusion کی روش بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نفسِ موضوع پر اظہارِ خیال سے قبل بہتر ہوتا اگر مضمون کے عنوان، مقدمات، نتائج اور مستعمل اصطلاحوں کا بغور مطالعہ کر لیا جاتا مگر افسوس ہے کہ وفورِ شوق میں مکتوب نگار نے عنوان اور اصطلاحیں تک نقل کرنے میں غلطی کی ہے اور پھر اس بنیاد پر پیغمبرانہ خود اعتمادی (جو قابلِ رشک ہے) کے ساتھ اقداری فیصلے صادر فرمائے ہیں۔ مثلاً مضمون میں نیّر مسعود کے افسانوں میں قاضی افضال حسین کے حوالے سے ریاضیاتی توازن Geometrical Equilibrium کا ذکر کیا گیا تھا۔

کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی۔ جبکہ مکتوب نگار نے Equilibrium کو order میں
تبدیل کر دیا گویا یہ دونوں ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ اور Equilibrium کا فرق اہلِ نظر سے مخفی نہیں اگر ان کا
تعلق محض لسانیات سے مدرسانہ نوعیت کا نہ ہو — اسی طرح یہ قول "فیصل "خصوصی مطالعہ ایک توضیحی و تجرباتی قسم
کا مضمون ہے" بھی محلِ نظر ہے — خصوصی مطالعے کے عنوان سے کوئی تحریر شریکِ اشاعت نہیں ہے۔ جب
مضمون کا عنوان تک ذہن میں محفوظ نہ ہو تو اس پر حکم لگانا کیا ضروری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تنقید کا لسانیات سے بڑا گہرا تعلق ہے تاہم تنقیدی اصطلاحیں محض لسانیات کی درسی کتابوں
سے سمجھی نہیں جا سکتیں۔ فنکشنل نثر سے مراد اطلاع کی بے کم و کاست ترسیل ہے۔ فنکشنل نثر کے تفاعل پر بہت اچھی بحث
Jhon Fiske کی کتاب Introduction to communication Studies. ہے جو ۱۹۸۲ء میں
سے شائع ہوئی۔ ویسے فنکشنل نثر کا تصور بہت پرانا ہے اور یہ ایجادِ بندہ قسم کی کوئی چیز نہیں
ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے درج ذیل کتابوں سے رجوع کیا جائے۔

1. The nature of narrative Robert scholes and R-Kellog OUP; London 1968
2. A Theory of Narrative: Franz r..Stanzel, Cambridge University Press U.K.

فنکشنل نثر کو تخلیقیت (چہ معنیٰ دارد؟) یا ادبیت سے عاری سمجھنا ایک نوع کی Naivety ہے۔ یہ
اطلاع بھی شاید خالی از دلچسپی نہ ہو کہ Transformational Grammer. میں بھی اب Government
Barriers اور Bindings پر زور دیا جانے لگا ہے۔ قولِ محال سے متعلق اعتراض کے سلسلے میں عرض
ہے کہ اگر Kate Hambu... کی کتاب The Logic. of Literature
اور The Dynamics of Literary response, کی تصنیف
کا مطالعہ نہ بھی کیا گیا ہو اور صرف M.H Abrams کی عام فہم A glossary of literary terms
پر ہی نظر ڈالی جائے تو Paradox اور Oxymoron کا فرق واضح ہو جاتا۔ نے
paradox. کے متعلق لکھا ہے۔

A paradox is a statement which seems on its face to be self-contradictory or absurd, yet turns out to have a valid meaning (A glossary of literary

اس آسان اور سادہ تعریف کی روشنی میں مضمون میں شامل اس مثال "مجھے یقین تھا کہ وقت کی جو رفتار مکان کے اندر

ہے۔ باہر نہیں" کے بارے میں یہ تنقیدی محاکمہ کہ یہ کسی اعتبار سے قول محال کے ضمن میں نہیں آتی، اس ادبی اصطلاح کے وسیع تر مفہوم سے عدم واقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

مکتوب نگار نے ڈیوڈ لاج کا ایک قول بھی اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے کہ انسانی تجربہ Symmetrical نہیں ہوتا یہ پوری سچائی نہیں ہے۔ متعدّد ناقدین اور تخلیقی فن کاروں نے اس نقطۂ نظر سے شدّ و مد کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ Milan Kundera نے اپنی کتاب The Art of Novel میں تجربے کے Symmetrical ہونے پر اصرار کیا ہے۔ ویسے افسانہ انسانی تجربے کا اظہار ہے بھی یا نہیں، یہ ایک الگ تفصیل طلب اور لائقِ بحث موضوع ہے جس کا فی الحال موقع نہیں ہے۔

فکشن تنقید کی نارسائی اور بے بضاعتی کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ تنقید میں فنّی خصوصیات کے نام پر محض پلاٹ، کردار، مکالمہ اور کہانی پن وغیرہ کی "سطحی اور سرسری بحثیں" کی جاتی ہیں۔ یہاں زور سطحی اور سرسری بحث پر ہے اور اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ مکالمہ، کردار اور پلاٹ کی بحثیں بے معنی ہیں۔ مکتوب نگار کا یہ اعتراض بھی ان کی سہل نگاری پر دال ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ نیّر مسعود کے جن امتیازی خصائص کا ذکر کیا گیا تھا وہ بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی موجود ہوں۔ میں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ یہ characteristic صرف اور صرف نیّر مسعود سے مختص ہیں۔ یہ تنقیدی پیمانے نہ تو ابدی اور نہ ازلی ہیں۔ اور نہ مجھے حرف آخر لکھنے کا شوق ہے۔" شافع قدوائی۔ علی گڑھ

"نقشِ اوّل" میں آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کو معیاری کہانیاں "سوغات" میں اشاعت کے لئے نہیں مل رہی ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز ہے۔ اس لئے نہیں کہ اچھی کہانیاں لکھی نہیں جا رہی ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ کہانیاں آپ تک پہونچ نہیں رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نئے لکھنے والے سوغات کے معیار سے یا آپ اداریے میں جو تبصرے مشمولات پر کرتے ہیں، اُن سے ڈر کر آپ کو افسانے نہیں بھیج رہے ہیں؟؟

انور خان نے اپنے مضمون میں دلچسپ سوالات اٹھائے ہیں لیکن ان کی اس بات سے اتفاق مشکل ہے کہ آج کے نئے افسانہ نگار بمبئی اور اس کے مسائل سے اپنے پیشرو افسانہ نگاروں سے بہتر واقف ہیں یا بہتر طور پر اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان مسائل پر منٹو اور کرشن چندر سے بہتر کا تو کیا سوال اُس سطح کی بھی کہانیاں آج کے افسانہ نگاروں نے نہیں لکھی ہیں۔

اس MELTING POT کے رہنے والے اردو کے ایک درجن سے زیادہ افسانہ نگاروں میں سے کسی نے بھی بمبئی شہر کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ سیّد محمد اشرف نے کئی اچھی کہانیاں لکھی ہیں اور جب وہ کانپور سے بمبئی گئے تو ایک

مبہم سی امید جاگی کہ اب شاید اُن کے قلم سے بمبئی پر کوئی زبردست افسانہ نکلے۔

دراصل بمبئی دس پندرہ ۱۵ صفحات کے افسانے کی گرفت میں آنے والی چیز بھی نہیں ہے۔ اسے تو ایک ناول میں ہی پکڑا جا سکتا ہے۔ لیکن "متین بتی کے راما" جیسے ناول میں نہیں۔ ویسے کسی سیمنار میں رام لعل کا یہ کہنا کہ علی امام نقوی کی یہ کہانی منٹو سے آنکھ ملاتی ہے یا انور خان یہ کہہ دیں کہ فلاں کہانی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے ساتھ رکھی جا سکتی ہے تو ان باتوں کو قبول کرنے کے لئے بڑی معصومی کی ضرورت ہے۔ علی امام نقوی کی کہانی کو میں بُرا نہیں کہتا بلکہ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ضرور ہونی چاہئے۔ لیکن ایسے مبالغے سے کام نہیں لینا چاہئے کہ سچ کی شکل نہ پہچانی جائے۔"

شاہد اختر۔ کانپور

"رفیق حسین کی کہانیاں۔ احمد جاوید کی غزلیں اور الطاف فاطمہ کا خاکہ بے حد پسند آئے ــــ اور صلاح الدین پرویز کی نظمیں بھی۔"

محمد علوی۔ احمد آباد

"وارث علوی، شمیم حنفی اور انور خان کے مضامین حسبِ سابق بھرپور، پُرازمعلومات اور دلچسپ ہیں۔ معین الدین جینابڑے نے "آنگن" پر گفتگو کرتے ہوئے ماخذ اور حوالوں کے ضمن میں بڑی سہل پسندی کا ثبوت دیا "آنگن" جیسے ناول پر تنقیدی ماخذات کا اب ایسا بھی کال نہیں پڑ گیا ہے۔ جمید نسیم اور احمد جاوید کی غزلیں بار بار پڑھ رہا ہوں مگر احمد جاوید کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے آپ نے اردو میں موجود تصوّف اور عشقِ حقیقی کی شاعری کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا، بندہ اُس رائے سے اتفاق کے اسباب تلاش کر رہا ہے اور اسباب مہیّا نہیں ہو رہے ہیں۔

آصف فرّخی کا مضمون "اردو ناول کی داستان" بہت اچھا ہے، بہت ہی اچھا ہے مگر آصف کا انداز بالکل "چل رے خامہ بسم اللہ" کہہ کے شروع ہو جانے کا ہے۔ اور اُس کے بعد "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"۔ آصف کے علم اور آصف کی فکر نے آپس میں ایسی کُشتی کھیلی کہ دونوں شہ زور بھی نظر آتے ہیں اور مجروح بھی۔

اور چونکہ مضمون اچھا ہے، مضمون کے پیچھے ایک فکر کام کر رہی ہے اِس لئے سوالات بھی سر اُٹھاتے ہیں۔

پہلا سوال تو عبدالغفور شہباز ہی کے حوالے سے کہ اگر "کیفیات و حوادث و انقلابات جو نثر میں زیادہ ہیں" وہی اصلِ اصولِ سخنوری قرار دیئے جا سکتے ہیں تو اُسلوب و متن کی ہم رشتگی سے قطعِ نظر کیا حوادث و انقلابات خارجی مظاہر کا استعارہ نہیں؟ یا پولیٹیکل کا زاویہ متساوی الساقین نہیں؟ اور ایسے میں کیا شہباز چپکے سے اُسی کوچے میں داخل ہوتے نہیں دکھائی دیتے، جہاں سے آصف اردو ناول کو باہر نکال لانا چاہتے ہیں؟

دوسرا سوال: اگر آصف کا یہ استنباط صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ نوبت آگئی کہ فنِ نثر کو گرفت میں لائے بغیر ادب تو کیا خود فنِ شاعری کا مطالعہ بھی ادھورا ہے۔ اور عذرا پاؤنڈ کی یہ بصیرت آصف کو بھاتی ہے تو پھر صاحب! فاروقی کے اُس کلیے کا کیا ہوگا جس کے مطابق "نثر شاعری سے کمتر ہے"!

تیسرا سوال صفحہ ۱۰۳ کے حوالے سے کیا جاسکتا ہے کہ ترقی پسندی کی آئیڈیالوجی تو واقعی انفرادی و شخصی تجربے برداشت نہیں کرسکتی مگر غیر ترقی پسند حسن عسکری، سلیم احمد، سراج منیر، شمیم حنفی اور (جماعت) اسلامی ادب کے علَم بردار ڈاکٹر عبدالمغنی وغیرہ جس VALUE ORIENTATION کا علَم اٹھائے ہوئے ہیں وہاں فرد و شخص اہم ہیں یا قدریں؟

پھر اگلا سوال صفحہ ۱۰۲ کے حوالے سے: آصف بتاتے ہیں کہ ناول کا ڈسکورس (یا روسی اصطلاح میں SJUZET) یا (بقول فاروقی صاحب) نفسِ مطلب IAN WATT کی نظر میں تین سماجی مظاہر (معاشی انفرادیت، درمیانی طبقے کا فروغ اور عورتوں کی سماجی حیثیت میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں) کے سبب اپنا قیام و استقرار کرتا نظر آتا ہے۔ مگر اس اطلاع کے بعد آصف کا یہ اعلان کہ "مغربی ادب کی صورتِ حال سے زبردستی کی مطابقت پیدا کئے بغیر بھی یہ بالکل واضح ہے کہ ایسے مظاہر کی کار فرمائی اردو ناول کے فروغ میں بھی موجود ہے۔" اپنا جواز فراہم نہیں کرپاتا کیوں کہ جب بقول آصف بھی "ایسے مظاہر کی کار فرمائی اردو ناول کے فروغ میں موجود ہے" تو اگر کسی نے اُس کی مطابقت مغربی ادب کی معاصر صورتِ حال سے کر دی تو آخر کون سی آفت ٹوٹ پڑی؟ آخر آصف بھی تو عبدالغفور شہباز کے ذکر میں جان ڈی گراس اور انجم کسمنڈوی کے ناول "نشتر" کے ذکر میں PREVOST اور MANON LESCAUT - کو فوراً یاد کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مغربی ادب کی صورتِ حال سے زبردستی کی مطابقت پر چراغ پا آصف خود بھی ناول کے فروغ میں ایسے مظاہر کی کار فرمائی کے لئے ۱۸۵۷ء کے بعد اُبھرنے والے طبقات کی معاشی اور ثقافتی خواہشات کا اثر ادبی ماحول پر تلاش کرنے لگتے ہیں اور اُنھیں اِس کا بھی احساس ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد معاشرہ شدید بحران سے دوچار تھا (صفحہ ۱۰۳) اور آگے چل کر برملا یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ:

> "اردو میں ناول کا ظہور پوری طرح COINSIDE کرتا ہے۔ انگریزوں کے ہندوستان پر نوآبادیاتی تسلّط اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے سماجی نظام میں شکست و ریخت کے وسیع عمل کے ساتھ، اس بات کو صرف ایک تاریخی حادثہ یا محض ایک اتفاق قرار دینا مشکل ہوگا... ۱۸۵۷ء کی کشمکش اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والی سماجی تبدیلیاں ہندوستان میں آئے دن ہونے والی اقتدار کی کشمکش، دراصل دو تہذیبوں

کی باہمی چپقلش تھی۔ اس چپقلش کا سیاسی طور پر جو بھی نتیجہ برآمد ہوا ہو، اس نے دراصل اُس پوری تہذیب کو چیلنج کر دیا جس پر افراد کا بھی اور قوم کا بھی شناخت نامہ استوار تھا۔" (ص ۱۱۲-۱۱۳)

تو ایسے میں کیا یہ سوال نامناسب ہوگا کہ جب سیاسی ٹکراؤ تہذیبی ٹکراؤ بن ہی گیا تھا اور سرسید اور مالویجی SYNTHESIS کی تلاش میں تھے ہی اور سائنٹفک سوسائٹی نئے مغربی آثار و علوم سے واقف کرانے کے لئے ہی قائم کی گئی تھی تو اگر ہندوستان میں پنپنے والی نئی معاشی انفرادیت، درمیانی طبقے کے فروغ اور عورتوں کی سماجی حیثیت میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مراحل کی کچھ مطابقتیں مغربی ادب کی معاصر صورتِ حال سے بھی تلاش کر لی گئیں تو یہ عمل آپ کو اتنا قابلِ اعتراض کیوں محسوس ہوا جبکہ ہند و فرنگ کے درمیان تہذیبی تبادلہ (۵۷ کے بعد) ایک تاریخی حقیقت ہے اور "صاحب لوگوں کے ہندوستانیوں پر اثرات" ایک افسوس ناک مگر ناگزیر سچ!

اسی طرح قمر رئیس کے خیالات سے آصف جہاں جہاں اختلاف کرتے ہیں وہاں بھی عجب صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ آصف قمر رئیس صاحب کے خیالات کو رد بھی کرتے ہیں مگر فی الواقع اُن خیالات کی تردید نہیں ہو پاتی۔ مثلاً آصف کا یہ خیال تو صحیح ہے کہ: "ادب کی دنیا میں اگر داستانوں کی کوئی اہمیت ہے تو اُن کی اپنی صنفی و انفرادی خصوصیات کی بنا پر ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ ناول کا پیش خیمہ سمجھی گئیں، اور اسی لئے بقول شمس الرحمٰن فاروقی صاحب: ایسی تحریریں خال خال ہیں جن میں داستان کو ناول کی بھونڈی اور PRIMITIVE شکل نہ قرار دیا جائے۔" یہاں تک تو بات صحیح اور صاف ہے لیکن پھر جب آصف قمر رئیس صاحب کا یہ بیان کہ "ناول کے شجرۂ نسب میں داستان کا نام سب سے آخر میں آئے گا۔" اُن بیانات کے ساتھ نتھی کر دیتے ہیں جن میں ناول کو داستان کا اگلا قدم قرار دیا گیا تھا تو معاملہ گنجلک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قمر رئیس اپنے بیان کے آخر میں جب یہ کہتے ہیں کہ "فلاں فلاں ناول اپنے محرکات اور ماہیت کے اعتبار سے داستانوں سے دور اور ناول سے بہت قریب ہیں" تو آصف اس بیان کے فوراً بعد ایک ضرب لگاتے ہیں کہ "داستان سے دور ہونا ناول سے قربت کی نشانی نہیں"۔ جب کہ ان دونوں مقامات پر آصف کا دامن چھوٹا ہے اور آصف اپنے قاری کو جو یقین دلانا چاہتے ہیں اُن کی تحریر وہ یقین دلانے میں کامیاب نہیں۔ نتیجتاً قمر رئیس صاحب کی بات ہی صحیح معلوم ہونے لگتی ہے۔

ایسی ہی ایک صورتِ حال ص ۱۰۵ پر اُبھرتی ہے جب آصف باختن کے خیال سے متفق کرتے ہیں کہ "ناول کے باقاعدہ ورود سے پہلے متنوع اصناف کا ایک پورا ذخیرہ موجود ہے جو دوسرے کے کلام اور زبان کی نقالی، عکاسی استہزا اور نمائندگی کر رہے تھے اور انھوں نے ناول کی آمد سے پہلے ہی اِس کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔" اور

باختی کے اِس خیال کو آصف کاٹتے نہیں بلکہ اُس کی توسیع کرتے ہوئے مطابقت دکھانے کی خاطر انشاء کی "دریائے لطافت" کا ذکر کرتے ہیں۔ چلئے ٹھیک ہی ہے لیکن پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تب صلا پر قمر رئیس کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد کہ "سفرناموں، ڈائریوں، انشائیوں، آپ بیتیوں، مکاتیب اور نثری تمثیلوں جیسی جدید اصناف میں عصری زندگی اور بدلتی ہوئی حقیقتوں کا احساس واوراک ناول کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔" فوراً آصف کی حسِ اختلاف کیوں جاگ پڑی اور وہ یہ کیسے کہہ اُٹھے کہ "اِن سب کو پیش روی کی ایک ہی نظریاتی کڑی سے ہانکا نہیں جاسکتا۔" جب کہ باختی ناول سے پہلے متنوع اصناف کے اُس ذخیرے کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے ناول سے پہلے ہی اس کے لئے راستہ ہموار کیا، تو آصف کو یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔

پھر تحقیقی لحاظ سے بھی کئی تضادات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً پہلا تضاد تو یہی کہ آصف خود ہی "نوابی دربار" کا ڈراما ہونا تسلیم کرتے ہیں (سوغات ۵ صلا) اور پھر خود ہی دعویٰ کرتے ہیں کہ مرزا محمد سعید اور کشن پرشاد کول کے بجائے "نوابی دربار کے مصنف نواب سید محمد آزاد کا نام آنا چاہئے تاکہ اُن غیر معمولی ناول نگاروں کی کہکشاں مکمل ہو، جن میں اپنی ایک نوم ضیا سی فرد رہے۔"

پھر دوسرا تحقیقی مطالعہ "نشتر" کے سلسلے میں: اِسی شمارے میں شامل عظیم الشان صدیقی اور یوسف سرمست کے مضامین کی روشنی میں پانچ صفحات پر پھیلی انجم کسمنڈوی کے ناول "نشتر" پر آصف فرخی کی پُرعقیدت گفتگو کا جواز کیا ہے؟ جب ابھی تک یہ ثابت نہ ہو سکا کہ واقعی یہ ۱۷۹۰ء کے لگ بھگ لکھا گیا ناول ہے تو پھر اُس کے حوالے سے اتنے دعاوی کی اوقات کیا ہے؟

برسبیلِ تذکرہ: راقم الحروف نے عینی صاحبہ کی خبر کے مطابق خدا بخش لائبریری اور خدا بخش لائبریری میں موجود پٹنہ ضلع کی متعدد نجی لائبریریوں کا کیٹلاگ دیکھ ڈالا مگر حسن شاہ کا کوئی ناول نہیں ملا۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ پٹنہ کی اُس نجی لائبریری کا پتہ بتا کر اردو کے قارئین کو شک وشبہ کے اندھے کنویں سے باہر نکال لائیں۔ یہ میری دست بستہ گزارش ہے!

تیسرا تحقیقی تضاد "افسانۂ نادر جہاں" کے سلسلے میں۔ یہ کیا ستم ہے کہ نیّر مسعود صاحب تو آصف کو بوضاحت وصراحت مطلع کر رہے ہیں کہ "مسعود حسین رضوی صاحب مرحوم نے عباس حسین ہوش کی بیوہ سے فسانۂ نادر جہاں کا حقِ اشاعت خرید کر اُسے چھاپ دیا تھا" حد یہ کہ نیّر مسعود صاحب نے اُس معاہدے کا کاغذ بھی دیکھا تھا۔ مگر اُس کے بعد بھی آصف فرخی اس بات پر بضد ہیں کہ "اِس بارے میں علی عباس حسینی صاحب کی شہادت کو کافی

سمجھنا چاہئے۔" کیوں بھئی؟ آخر کیوں؟

اور صفحہ ۱۸۴ پر آصف فرخی کا اعلان: "اردو ناول کا سنہری دور نذیر احمد سے شروع ہوکر اور اپنے مخصوص لب و لہجے کو اظہار کی مکمل صورت عطا کر کے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اپنی موت مرگیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہے پریم چند سے بانو قدسیہ کے راجہ گدھ تک، وہ ناول کے زوال کی کہانی ہے۔" یہ ایسا ہولناک اور دل دہلا دینے والا اعلان ہے کہ اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ بالکل رفیق حسین کے افسانے "آئینۂ حیرت" میں لینڈ سلیپ کا منظر۔ آصف نے انتہائے محبت میں ناول کا بچہ ترقی پسند کانچ سے اٹھالیا اور وہاں سے لے کے بھاگے تو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ ناول کی عمارت میں تو وہ پہلے ہی فتیلہ لگا چکے، ایسی تباہی کا منظر کچی بیٹھ جاتا ہے، اور آئینۂ حیرت میں تو ایک بچہ بچ جاتا ہے مگر یہاں؟ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

آصف نے بالکل اسی طرح دھواں دھار لکھنے کا نمونہ اپنے دوسرے مضمون "زبانِ بے زبانی" میں پیش کیا ہے پہلے صفحہ ۳۳۸ پر لکھتے ہیں: "پچھلے چند برسوں سے افسانے کی روایت کا ذکر بھی ہونے لگا ہے، تنقید کی اس بہتات سے ہمیں اتنا تو پتہ چلا کہ اردو افسانہ بار روایت ہے، یہ روایت کیسی ہے اور کیا ہے اِس بارے میں یہ نقّاد ہمیں نہیں بتاتے۔" پھر صفحہ ۳۴۷ پر خود آصف کو احساس ہوتا ہے کہ "رفیق حسین کی انفرادیت کی تحسین ہمیں اس افسانوی روایت کے دائرۂ کار میں رہ کر ہی کرنی چاہئے جس کے وہ باکمال اور ہنرمند عامل ہیں" مگر پھر صفحہ ۳۵۰ پر ایک تیسرا مشورہ دیتے ہیں کہ "رفیق حسین کے یہاں ایسی نئی اور اچھوتی منزل ہائے فکر و فن ہیں، جو اردو افسانے کی پوری روایت میں ایک نادر کارنامے کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اب انصاف شرط ہے۔ تینوں بیانات کو بیک وقت سامنے رکھئے تو نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے؟

(۱) اردو افسانے کی روایت کا شور تو ناقدوں نے بہت مچایا مگر یہ روایت کیا ہے اِس کا پتہ نہیں چلتا۔

(۲) رفیق حسین کے افسانوں کی تفہیم "اُن کی افسانوی روایت" کے دائرے میں رہ کر ہی کرنا چاہئے۔

(۳) رفیق حسین کے افسانے اردو افسانے کی پوری روایت میں ایک نادر کارنامہ ہیں۔

تو بھائی اگر رفیق حسین کے افسانے اردو افسانے کی روایت میں ایک نادر کارنامہ ہیں تو گویا وہ اردو کی غالب افسانوی روایت سے الگ کوئی شے ہیں اور اگر الگ ہیں تو گویا اُن کی افسانوی روایت ایک الگ افسانوی روایت ہے جس کے دائرے میں رہ کر آپ اُن کے افسانوں کی تفہیم کی تعلیم دے رہے ہیں۔

مگر آصف ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ نے اپنے اتنے طویل مضمون میں رفیق حسین کی افسانوی روایت کا

تعارف کب کرایا اور کہاں کرایا ؟ آپ کا یہ شکوہ تو تسلیم (ایک منٹ کے لئے) کہ اردو ناقدوں نے افسانے کی روایت کا غوغا مچایا مگر تعارف نہ کرایا، تو بندہ پرور ! یہی سہوِ بشری آپ سے بھی سرزد ہوا ہے۔

دوسری بات یہ کہ آپ رفیق حسین کے افسانوں کو اُنہی کی افسانوی روایت کا ایک حصّہ قرار دے رہے ہیں، جب کہ روایت کبھی بھی شخصی معاملہ نہیں ہوتی، یہ تو ایک ایسا شخصی عمل ہے جو اشخاص کے ذریعے (فردی طور پر) ایک طویل سفر طے کر کے اپنے کو شخصی سے اجتماعی میں ٹرانسفارم کرتا ہے اور تب عمل سے آگے بڑھ کر رویّہ اور روایت بن پاتا ہے۔

اسی طرح ص۳۴۲ پر آصف لکھتے ہیں کہ "جن ڈیڑھ دو نقّادوں نے رفیق حسین کے بارے میں لکھا ہے اُن سب نے یک زبان ہو کر اُن کے محض ایک ہی پہلو کی تعریف کی ہے کہ رفیق حسین نے جانوروں کے افسانے لکھے ہیں۔" لیکن ص۳۴۹ سطر ۲۰ پر اُن کا خیال بدل جاتا ہے، یہاں وہ رقم طراز ہیں "شمیم احمد کے نزدیک رفیق حسین نے ایک شکاری کی حیثیت سے نہیں لکھا ہے اور نہ وہ محض جنگل کے مشاہدات کے ضمن میں آتے ہیں، شمیم احمد کے اس تجزیے سے اختلاف کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے، یہ تجزیہ میرے نزدیک بہت بیش قیمت ہے کہ شکاری افسانوں سے بلند تر اور مختلف تر ثابت کر کے شمیم احمد نے وہ بنیاد فراہم کر دی کہ جس پر رفیق حسین کے افسانوں کی تشریح و تعبیر سودمند ہو گی۔"

اب غور کرنے کی بات ہے کہ پہلے تعمیمی انداز اختیار کرتے ہوئے رفیق حسین کے تمام ڈیڑھ دو ناقدوں (آصف غالباً ۱۰ ناقد = ۱ ناقد کے قائل ہیں) کو کم نظر ثابت کر دیا گیا اور پھر اُسی ڈیڑھ دو میں سے ایک ناقد شمیم احمد کی رائے کو رفیق حسین کے افسانوں کی تشریح و تعبیر کے لئے سود مند بنیاد مان لیا۔

ایسی ہی رواداری ص۳۵۳ پر نظر آتی ہے جب وہ "اَن داتا" "مدن سینا اور صدیاں" "دیپک راگ" اور "میگھ ملہار" کا تو تذکرہ کرتے ہیں مگر اختر اورینوی کے افسانے "کیچلیاں اور بالِ جبریل" کو بھول جاتے ہیں، حالاں کہ خود آصف ہی اپنے مضمون "اردو ناول کی داستان" ص۱۴۹ پر شاکی ہیں کہ "اب اختر اورینوی کو بھی فراموش کیا جا رہا ہے۔"

بھول چوک کا یہی عمل "فسانۂ اکبر" کے ذیل میں کار فرما نظر آتا ہے جب آصف "سیمیا" اور "مادگر" وغیرہ تک کو یاد کر لیتے ہیں مگر "زرین تاج" اور "روشنی کی رفتار" کو بھول جاتے ہیں۔

قصّہ مختصر یہ کہ آصف میں ایک مکمّل ناقد موجود ہے، بشرطیکہ وہ اپنے پچھلے لکھے ہوئے لفظ کو بھی یاد کرتے

چلیں اور سچ کو سچ ماننے کی عادت ڈالیں خواہ یہ مہا لکشمی کے پُل کے اِس طرف ہو یا اُس طرف!

شمس الحق عثمانی کا مضمون "آئینۂ حیرت کے لشکارے" واقعی ویسا ہی مکمّل اور خوب صورت مضمون ہے جیسی عثمانی سے اُمید کی جا سکتی ہے۔ رفیق حسین کو میں نے غالباً بیس پچیس برس پہلے پڑھا تھا، آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی، مقدور ہو تو نقد سے پوچھوں....."

عثمانی نے اپنے مضمون میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے البتّہ پروفیسر دیاشنکر وجد کے تعارف میں ذرا ابہام پیدا ہو جاتا ہے جب کہ معاملہ بالکل سامنے کا ہے۔ وجد کے بے سرو پا بیانات جن میں — AND THEN MY LORD — کی تکرار ہے، واضح طور پر کئی اطراف میں اپنے TENTACLES پھیلاتے ہیں۔

(۱) وجد اس کائنات میں انسانی اعمال کے بے مقصد ہونے کا استعارہ کرتے ہیں۔

(۲) قریشی کے بچّے کے لئے بندر زادے کی ہوا بھی "اعمالِ وجد" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

(۳) وجد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا مگر وہ خواہ نخواہ ہر جگہ آموجود ہوتے ہیں، اور آدم زاد وجد کی طرح غیر آدم زاد بندریا بھی خواہ نخواہ ہے۔ خود اپنے شوہرِ نامدار کے لئے بھی جو اَب کئی عدد بیویوں کے مالک ہیں۔

(۴) وجد کائنات میں جبرِ مشیّت کا استعارہ ہیں، یہی جبرِ مشیّت بندریا، بندریا کے بچّے اور مسٹر قریشی، سب کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے۔

غرض آئینۂ حیرت میں جو ڈرامہ چل رہا ہے وہ خود کوئی PLANNED ڈرامہ نہیں ہے، بس یوں ہے کہ زندگی اچانک ہی کہیں نہ کہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور کہیں نہ کہیں ختم ہو جاتی ہے۔ پروفیسر دیاشنکر دوبے کے بے سوچے سمجھے اچانک ہی ادا کئے جانے والے مکالمات کی طرح۔ وجد اَرحم اُلرّاحمین پر ایک طنز ہیں اور طنز کا یہ سلسلہ رفیق حسین کے افسانوی نظام کا ایک کارگر DEVICE ہے اور یقیناً یہ طنز باقر مہدی والا تمسخر محض نہیں ہے جسے ابوالکلام قاسمی نے بجا طور پر رد کیا ہے۔"

تحسین الحق۔ بودھ گیا

"سوغات کا یہ شمارہ بہت عمدہ اور قابلِ قدر ہے۔ رشید امجد ایک اچّھے کہانی کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ میرا جی پر اُن کے مضمون سے اندازہ ہوا کہ وہ کمال کے محقّق بھی ہیں۔ ایسے وقیع مضمون کے لئے انہیں جتنی مبارکباد دی جائے کم ہوگی۔ وارث علوی کی تحریروں میں اِدھر ایک قابلِ لحاظ تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اب اُن کے ہاں تجزیہ، تفہیم اور توضیح جیسے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ضمیر الدین احمد پر اُن کا مقالہ شاندار ہے اسے پڑھ کر

تو ضمیر الدین کی کہانیاں بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ اسی طرح آصف فرّخی کا مضمون "اردو ناول کی داستان" بڑے معرکے کی چیز ہے۔ انھوں نے ناول کی تاریخ و تنقید میں بنیادی الجھنوں، دقّتوں اور GAPS کو بڑے موثر ڈھنگ سے نمایاں کر دیا ہے۔ اردو ناول پر لکھتے وقت اس پورے CENARIO کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آصف فرّخی بہت اچھے انداز میں استدلال کرتے ہیں اور بڑا جی لگا کر لکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ انگریزی الفاظ اصطلاحیں اور حوالے اُن کے اسلوب کو کہیں بھی بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ فی زمانہ یہ خوبی بڑی نایاب شے ہے۔ یہ تینوں مضامین واقعی قابلِ داد ہیں۔

عقیدت پر شمیم حنفی کا مضمون ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ رفیق حسین کی کہانیاں اور اُن کے متعلق ڈھیر سی تحقیقی معلومات فراہم کرنے کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اُن کی کہانیاں کیسی سیدھی سادھی اور جیتی جاگتی پُر فضا کہانیاں ہیں۔ خصوصی مطالعے کے ضمن میں آصف فرّخی کا مضمون بہت خوب ہے۔ کچھ تحریروں میں محض سوانحی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی کا یہ بیان "اِن افسانوں میں جانوروں کی نفسیات کے علاوہ جو بجائے خود ہر افسانے کی ایک نادر خوبی ہے ایک اور خوبی بھی ہے، انسانی سرشت کی تحلیل کہانی کے پیرایے میں۔ یہ دونوں خوبیاں ہر افسانے میں آپ کو متوازی نظر آئیں گی۔" (ص: ۳۷۱) صحیح، لیکن "تحلیل" کے عمل میں رفیق حسین کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، یہ امر بحث طلب ہے۔ شمس الحق عثمانی کا مضمون "آئینۂ حیرت کے لشکارے" بالکل متاثر نہیں کرتا، اور یہ بھی عرض کر دوں کہ اُن کا جو جملہ آپ نے نقل کیا ہے اُس پر داد ہی دی جا سکتی ہے اور بس۔

شاعری کے حصّے میں حمید نسیم کی غزلیں اچھی ہیں۔ اور احمد جاوید کے یہاں تو کمال کے اشعار موجود ہیں ــــ صلاح الدین پرویز کی نظم "کیا شام ہوئی" بہت اچھی ہے۔ خالد علوی نے اپنی نظم کو "حمد" کا عنوان دیکر خوب شرارت کی ہے۔

شافع قدوائی کے مضمون پر، ایسا محسوس ہوا کہ کچھ زیادہ ہی ردِّ عمل ظاہر کیا گیا ہے۔ ایک صاحب تو اُن کے فیلڈ تک کو بیچ میں لے آئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادب اور صحافت دو مختلف ڈسپلنز ہیں لیکن قدوائی صاحب اپنی منظّم کاوش اور تجزیاتی پیش کش کے لئے بہر حال قابلِ تعریف ہیں، صحافت جیسے موضوع اور اُس کی تدریس سے وابستگی کے باوجود ادبی تخلیقات پر بالتفصیل لکھنا بجائے خود بڑے حوصلے کی بات ہے۔ رُوداد کے ضمن میں ساٹھ اقتباسات اور بیس اصطلاحوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ اصطلاحوں سے بدکنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اصطلاحوں کو INTERNALIZE کیا گیا ہے یا نہیں۔ کبھی کبھی محض اصطلاحوں کی ریل پیل کو علم اور فکر سمجھ لیا جاتا ہے اور ابتدا میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ "سیاہ/سپاہ" پر ابو الکلام قاسمی کا تبصرہ بہت جامع ہے اور ایک اہم مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔" مسعود علی بیگ۔ علی گڑھ